دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

# ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

اکتوبر 2017

نگران اعلیٰ

معراج رسول

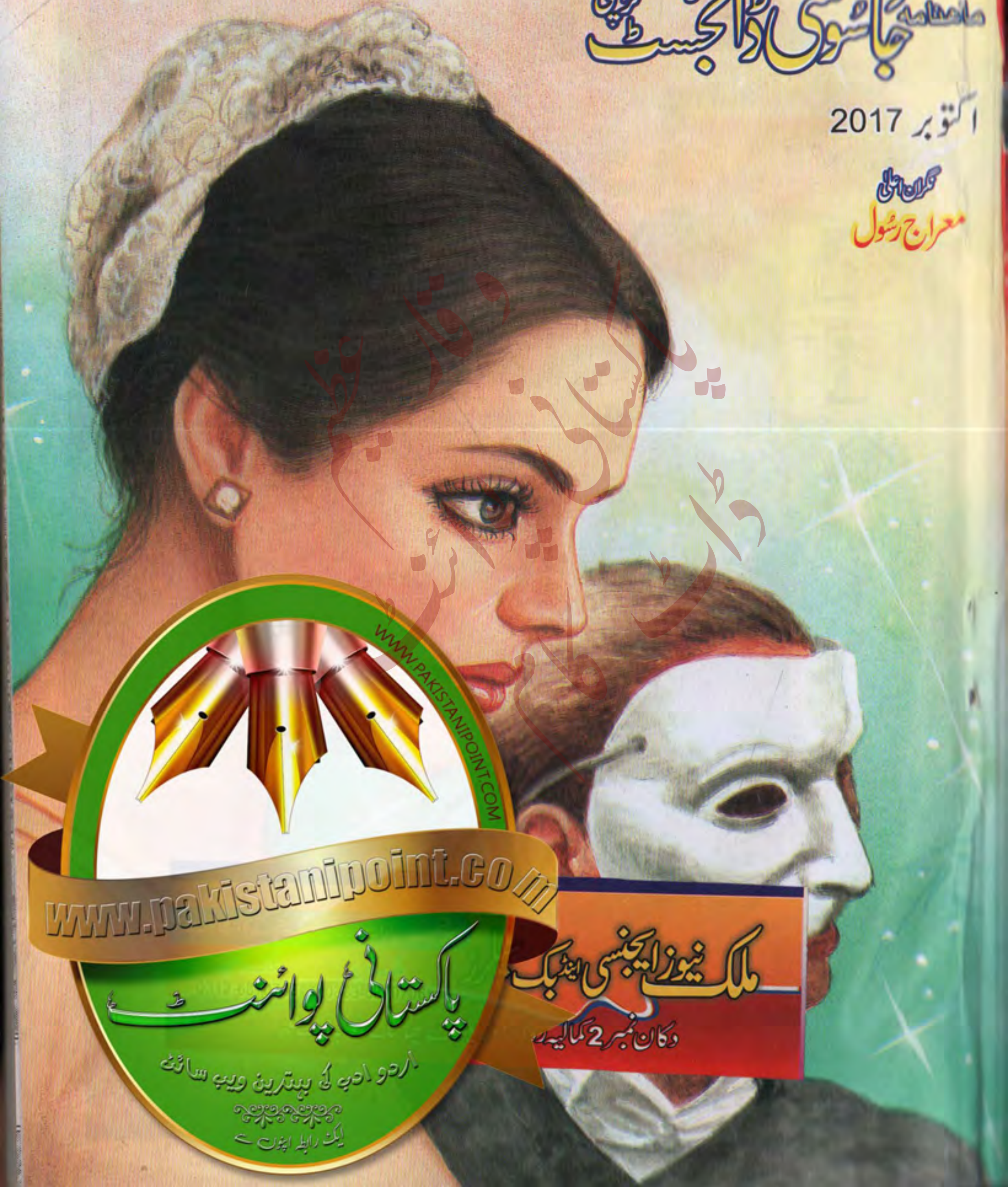


WWW.PAKISTANIPOINT.COM
www.pakistanipoint.com
پاکستانی پوائنٹ
اردو ادب کی بہترین ویب سائٹ
ایک رابطہ اپنوں سے
ملک نیوز ایجنسی اینڈ بک
دکان نمبر 2 کمالیہ

جاسوسی ڈائجسٹ

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269


07 — **چینی نکتہ چینی** — مدیر اعلیٰ

قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

14 — **آبلہ پا** — امجد رئیس

خوف، دہشت، اذیت اور وحشت ناک ماحول کی اسیر... جو کسی نجات دہندہ کی منتظر تھی

79 — **خام خیالی** — جمال دستی

اس مجرم کا قصہ جس نے نہایت چالاکی سے حکمتِ عملی کا مظاہرہ کیا تھا

81 — **دوسرا جرم** — تنویر ریاض

پہلے جرم کے لبادے میں چھپے دوسرے جرم کی آمیزش کا احوال

94 — **انگارے** — طاہر جاوید مغل

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان

135 — **لہو کی تاثیر** — محمد یاسر اعوان

خون کی تاثیر جو اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے... ایک انہونی محبت کی دل پذیر کہانی


جلد 47 • شمارہ 10 • اکتوبر 2017 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

161
# آتش زن
تمکین رضا

بدلے و جذبات کی آگ
میں جھلسے شخص کا اقدام

164
# آوارہ گرد
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا
ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

201
# ناکام کامیابی
شاکر لطیف

ہار کے جیت جانے والے ناکام
کامیاب پرستو کا پرلطف ماجرا

213
# بھونک
سلیم انور

اس عورت کا وجدان جو
جانوروں کی نبض شناس تھی

218
# بامحاورہ
منظر امام

شگفتہ شگفتہ..... دھیرے دھیرے انداز
میں دل کو گرماتی..... لبھاتی..... کھلکھلاتی کہانی

224
# بلیک میلر
عکس فاطمہ

دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ
اٹھانے والے بلیک میلر کا قصہ

227
# فرار
محمد فاروق انجم

ان مجرموں کی کوششیں جو
فرار کے راستوں پر گامزن تھے

254
# انتخاب
کبیر عباسی

دو چیزوں میں سے کسی ایک کا
انتخاب..... اس کا کڑا امتحان تھا

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

# چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من......السلامُ علیکم!

اکتوبر کا شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔عالمی نقشے پر نظر دوڑائیں تو امتِ مسلمہ پر کڑا وقت نظر آتا ہے۔ فلسطین،عراق،شام،لیبیا،افغانستان، مصر،سوڈان، کشمیر اور اب برما میں جو حالات ہیں، ان پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ بھارت جیسے، جمہوریت کے دعوے دار ملک میں بھی مسلمان تعصب اور تشدد کا شکار ہیں۔نئی لہر گئو رکھشا کے نام پر اٹھی ہے۔گئو ماتا کی توہین کے نام پر نہ جانے کتنے مسلمانوں کو بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنا کر ہلاک کیا جاچکا ہے۔بڑی طاقتوں میں سے ایک یعنی امریکا ہر جہت سے مسلمانوں کے درپے آزار ہے۔اس کی کھلی پالیسی اور پسِ پردہ شہ پر ہر سُو مسلمانوں کو وحشت و بربریت کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں کا یہ سلسلہ نیا نہیں ہے۔اس فتنے کی بنیاد عرب و عجم کی تفریق کو پوری قوت سے ابھار کر رکھی گئی اور پھر یہ قوم مسلک،فرقوں،علاقائی اور لسانی گروہوں میں بٹتی چلی گئی۔کوئی اپنے دوسرے بھائیوں کے درد کا درماں نہیں بنتا۔ہر ایک اپنی اپنی ڈفلی بجارہا ہے،مفادات اور مصلحتوں نے کان بہرے اور زبانیں گنگ کردی ہیں۔دور دور تک ایسا کوئی مسیحا نظر نہیں آتا جو شہ زوروں کے مقابلے میں ان کمزوریوں کا علاج کرکے پوری امت کو ایک محور پر یکجا کرسکے۔آج جو کچھ ہورہا ہے،آنے والے وقت میں اس سے بھی برا ہوتا نظر آرہا ہے۔بس دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ اللہ ہم سب کو آفات و مصائب سے محفوظ رکھے۔اسی دردمندانہ دعا کے ساتھ چلتے ہیں اپنی محفل میں جہاں ہمارے قارئین کی کھٹی میٹھی تحریریں سب کی منتظر ہیں۔

فیصل آباد سے اے آر جٹ کی شوخیاں ”میری زندگی کا ایک خاص دن خاص اس لیے کہ یہ وہ دن تھا جب میں نے پہلی دفعہ جاسوسی ڈائجسٹ خریدا۔پانچ بج کے چالیس منٹ۔آسمان مٹیالے اور کالے بادلوں سے اٹا ہوا،ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جسم میں ٹھنڈک اتار رہے تھے جب میں نے بائیک دکان کے سامنے روکی اور شمارہ خریدا۔بارش سے بچنے کے لیے تیس کی اسپیڈ سے بائیک اڑاتا ہوا گھر پہنچا۔گھر پہنچ کر جیسے ہی شمارے کے سرورق کی طرف پہلی نظر کی۔میرا تے ہاسا ای نکل گیا۔ہنسنے کی وجہ نہ تو درمیان والی خوبصورت حسینہ تھی نہ ہی لمبے دانتوں والی افسردہ آنٹی جس کی آنکھ بہت خوبصورت تھی بلکہ وہ آدمی تھا جو اتنی شدت سے ہنس رہا تھا کہ اس کی ناک بہنے لگی تھی۔چینی نکتہ چینی میں سیف،ایمانے، عبادت،طلعت،کوثر اسلام اور تانیہ مہر کا نام پڑھ کہ بہت خوشی ہوئی اور تبصرے تو تمام لوگوں کے ہی کمال،دھمال،بے مثال تھے۔انگارے اور آوارہ گرد کو پسِ پشت ڈال کے دوڑ لگائی سرورق پر۔یعنی خود کردہ را کی طرف کیونکہ شکیل سر سے تھوڑی جان پہچان تھی۔کہانی ایک مکمل پیکج تھا جس میں سسپنس اور ایکشن تو تھا ہی لیکن ایک خاص پیغام بھی تھا آج کل کی جنریشن کے لیے جو سوشل میڈیا کی دیوانی ہے اور اپنے کھانے پینے سمیت ہر کارروائی کی خبر دینا اپنا فرض سمجھتی ہے کہ کس طرح ہماری معلومات لے کے ہمیں اور ہمارے جاننے والوں کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے، اس کے متعلق بہت خوبصورتی سے لکھا... ویلڈن! لیکن زین کو تھوڑا زور کا جھٹکا ضرور لگنا چاہیے تھا۔دور کی آواز ایک مختصر کہانی لیکن میسج بہت شاندار۔اس دنیا میں ہر شخص دغاباز نہیں ہوتا اس لیے کوئی ایک آپ سے دھوکا کرے تو سب کو ایک ہی نظر سے مت دیکھیں اور ڈاکٹر کی فیلڈ میں تو یہ بہت ہی ضروری ہے کہ ہر مریض کو ایک ہی پلڑے میں مت رکھیں۔ویسے جس طرح کے آج کل حالات ہیں ہر شخص نفسیاتی مریض ہوسکتا ہے۔ قصۂ جدید ایک مزاحیہ انداز میں لکھی ہوئی کہانی جس میں لکھاری نے مغلیہ اور آج کے دور کو بہت خوبصورتی سے مکس کیا۔پھر دوڑ لگائی ابتدائی صفحات کی طرف جہاں رقصِ ابلیس ہمارا انتظار کررہی تھی۔کہانی کی سب سے شاندار بات اس کی منظر نگاری تھی،ایسا محسوس ہوا ہم ستر اسّی کی دہائی کی کوئی انگلش فلم دیکھ رہے ہوں۔سویرا اپنے نام کی طرح ایک روشن پیغام لیکن تلخ حقیقت لیے ہوئے تھی۔ہم اپنے ادیبوں اور شاعروں کی قدر نہیں کرسکتے اور اسی چیز کو بہت عمدگی سے بیان کیا ہے۔فقیر کے کردار میں مجھے بار بار ساغر صدیقی کا احساس ہوتا رہا۔قاتل تکون میں کرسٹن قاتل کم اور ہارر فلم کا ہیرو زیادہ لگ رہا تھا۔دامِ صیاد کچھ اچھا تاثر نہ قائم کرسکی جبکہ پہچان اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب رہی۔لہو کا کھیل......ویلڈن روبینہ رشید۔میرے خیال میں یہ وہ کہانی تھی جو اپنے اندر سب سے اچھا پیغام لیے ہوئے تھی۔الفاظ کا چناؤ اور کہانی کا ردھم شاندار تھا۔انگارے اور آوارہ گرد اگر ابھی شروع کرتا ہوں تو کچھ خاص سمجھ نہیں آئیں گی اس لیے ان کے مکمل ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔پہلی شرکت ہے اس لیے غلطیاں،کوتاہیاں معاف کی جائیں اور میری آدھی ملاقات کو ضرور شامل کیجیے گا۔“

گجرات سے نصیر احمد چوہدری کی تنقید ”جاسوسی کا شمارہ بروقت مل گیا۔ٹائٹل پر تبصرہ چونکہ تبصرے کے لوازم میں سے ایک ہے اس لیے اس بار ٹائٹل دیکھنا پڑا ورنہ کبھی ٹائٹل پر زیادہ غور نہیں کیا۔درمیان میں عورت اوپر ایک پریشان مردانہ خاکہ نیچے خوش باش مرد کا خاکہ گویا دکھلا

رہا تھا کہ مرد کی پریشانی یا خوشی کے پیچھے ایک عورت ہی ہوتی ہے۔ اداریے میں دورِ حاضر میں میڈیا کی ریٹنگ کو بہت اچھی طرح بیان کیا گیا۔ ادارے میں نیو کراچی کے لوگوں کے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری بھی تھی کہ مزدور طبقہ کو چھ روپے میں کھانے کی فراہمی اور وہ بھی کسی سرکاری امداد کے بغیر بہت بڑا اقدام ہے۔ اللہ پاک اس نیک خاتون کو بہت زیادہ عطا فرمائے۔ آغاز میں اشفاق شاہین ٹانگیں پھیلائے محوِ استراحت تھے۔ شاہین آپ نے آخر میں دیکھا ہوگا کہ ان لوگوں کے نام ہوتے ہیں جو محبت نامے بھیجتے ہیں، آپ تبصرہ بھیجا کریں۔ انور یوسف زئی صاحب تعطیلات گزارنے گئی ہیں تو کیا ڈائجسٹ لے بیٹھیں۔ پرانے لوگ آگے بڑھیں گے تو نئے آئیں گے۔ پرانے تبصرہ نگار مصنف بنیں گے تو نئے لوگ تبصرہ نگار بنیں گے۔ انجم فاروق ساحلی اس بار بھی اختصاریہ کے ساتھ ہی تھے۔ بھکر سے قدیر شاہ کی پہلی آمد خوش آمدید! بھائی سید عبادت کاظمی فوج میں جا رہے ہو آنا جانا لگا رہے گا اس لیے الوداع نہ کہو انشاء اللہ آجاؤ گے، نو مہینے ٹریننگ کے بعد ضرور وقت ملے گا، تبصرہ لکھتے رہنا، اللہ کامیاب فرمائے۔ شاہد رضا خان کا پہلا تبصرہ دھماکے دار رہا۔ رضا ترتیب توڑنی بھی پڑتی ہے چونکہ انگارے سب سے پہلے پڑھی جاتی ہے۔ فاروق ساحلی اور فاروق انجم کے بارے میں ہمیں بھی کنفیوژن تھی آپ نے دور کروا دی۔ فیصل آباد سے رمشا نے پہلی بار شرکت کی۔ اس بار بہت سے تبصرے پہلی بار شائع ہوئے۔ یاد کرواتا چلوں کہ میرا بھی پہلا تبصرہ ہے۔ اسما قادری کی مظلوم کے بارے میں آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا حقیقت پر مبنی تھا۔ اقصیٰ مغل کاظمی تو موجود ہیں البتہ مرحا گل کی جگہ آپ جو ہیں۔ زارا شاہ کی انٹری بھی خوب رہی۔ دوراستے کا صحیح پوسٹ مارٹم کیا۔ بچکانا ڈائیلاگ بھی برداشت کرلیا کریں۔ شاہد ذوالفقار پر اٹھوں کی ہیٹ ٹرک مبارک ہو۔ فیصلہ کے بارے میں ہم نے بھی یہی سنا اور انگلش کہانیاں اکثر نئے پڑھنے والے بڑی مشکل سے پڑھتے ہیں۔ ثانیہ مہر سرورق کی لڑکی جہاں دیکھنا چاہتی تھی دیکھ رہی تھی آپ کو کیوں لگا کہ کہیں اور دیکھ رہی تھی۔ کوثر اسلام کا تبصرہ بہت بھرپور تھا۔ سرورق، کہانیوں کے نام، اداریہ اور کہانیوں پر بیک وقت خیال آرائی نے تبصرے کو جاندار و شاندار بنا دیا۔ کوئی بھی سلسلے وار کہانی پاکستان تک محدود نہیں رہتی اور یہ یقیناً رائٹر کی مجبوری بھی ہوتی ہے کہ کہانی کو طویل کرنے کے لیے کرداروں کو ملک سے باہر کوئی اسائنمنٹ دی جائے اور یہی وجہ شاہ زیب کو جاماجی لے گئی۔ رائے زل اور آقا جان کی موت سے ایسا لگ رہا ہے کہ کہانی کے کردار ایک بار پھر پاکستان کی فضاؤں میں سانس لیں گے۔ آوارہ گرد میں شہزی اینڈ کمپنی امریکا جانے کے لیے پر تول رہی ہے۔ امید ہے عابدہ کے بارے میں پیش رفت ہوگی۔ سرورق کا پہلا رنگ روبینہ رشید، لہو کا کھیل اوسط درجے کی تحریر تھی۔ خضر اور آمنہ کی بھاگ دوڑ ایک سچے صحافی کی بھاگ دوڑ تھی۔ صحافت ایک آسان نظر آنے والا کام ہے لیکن اگر اس کو دیانت داری سے کیا جائے تو یہ کافی مشکل کام ہے، خضر کا مقامی اخبار کے لیے کام جاری رکھنا اچھا لگا۔ دوسرا رنگ شکیل کاظمی کا تحریر کردہ قدرے اچھا تھا لیکن کرداروں کی بھرمار نے الجھاؤ پیدا کیے رکھا۔ کاشف زبیر سے کافی انسپائر نظر آئے، ایسی صورتِ حال ایک سے زائد بار مرحوم شامی و تیمور سیریز میں پیش کر چکے ہیں۔ ابتدائی صفحات کی اسٹوری رقصِ ابلیس بچکانا محسوس ہوئی۔ کئی بار تمارا قتل ہونے والوں کے ساتھ گھومتی دیکھی گئی لیکن امریکی پولیس، پاکستانی پولیس کی طرح بے خبر رہی۔ اسکربچ کو مارنے کے لیے عین وقت پر اجنبی گھر میں بھرا ہوا پسٹل مل جانا بھی غیر منطقی لگا۔ تمکین رضا کی دور کی آواز میں جنید اور اس کی بیوی ڈاکٹر کو دھوکا دے کر بیرونِ ملک سیٹل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ البتہ ڈاکٹر صاحب نے بھی پُراثر بات کہی کہ یہ کامیابی صرف دنیا تک ہی محدود ہے اس کی جواب دہی آخرت میں لازمی ہے۔ منظر امام پرانے کرداروں کے ساتھ جدید دور کا قضیہ پیش کر رہے تھے۔ سرکاری ٹھیکوں میں اقربا پروری اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی اور اس کا جو نتیجہ ہو رہا ہے، وہ کہانی میں واضح دکھایا گیا ہے۔"

نارووال سے سید ذیشان حیدر کاظمی کی تبصرہ نگاری "میں کچھ عرصہ پہلے چینی نکتہ چینی کا حصہ بنا تھا۔ پھر جاب اور ٹریننگ کی مصروفیات نے فرصت ہی نہ دی کہ محفل میں حاضری لگواتا۔ پچھلے ماہ بھی آپ کو تبصرہ بھیجا لیکن آپ نے بلیک لسٹ کر دیا۔ ستمبر کا جاسوسی مجھے عید سے پہلے ہی مل گیا اس لیے عید بہت مزے کی گزری۔ ٹائٹل پر تاکا جھانکی میں نہیں کرتا کیونکہ میں بڑا پیارا بچہ ہوں جی۔ نکتہ چینی میں اس بار کئی نئے ساتھی نظر آئے۔ ابتدائی صفحات پر ایک نیا نام نظر آیا۔ ڈاکٹر سلیم عادل۔ رقصِ ابلیس ایک اچھی کہانی تھی۔ انجام بخیر کے ساتھ خوشگوار اثر چھوڑ گئی۔ دور کی آواز میں مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی اور ہی گیم کھیلا جا رہا ہے۔ بڑے چالاک نکلے دونوں میاں بیوی۔ قصۂ جدید بھی اچھی کہانی تھی۔ مزاحیہ ٹچ کے ساتھ منظر امام نے موجودہ حکومت کو خوب رگڑے لگائے۔ ارشد بیگ کی وہ ایک لمحہ بھی خوبصورت تحریر تھی۔ انسان کو جانوروں ہی سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ انسان اپنا درجہ تو بھول چکا ہے اسی لیے تو کبھی روہنگیا کے مسلمان ذبح ہوتے ہیں تو کبھی کشمیر میں خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے۔ فلسطین کا تو پوچھو ہی مت۔ سرور اکرام کی کہانی بھی اچھی رہی۔ اس کے بعد انگارے پڑھی اور پھر نظر ہی نہ ہٹ سکی۔ اتنا شاندار ایکشن۔ اتنی جاندار قسط۔ بڑا ہی مزہ آیا جی۔ اللہ مغل انکل کے قلم میں مزید برکت پیدا کرے۔ سرورق کے رنگ بھی اس دفعہ بہت اچھے تھے۔ روبینہ رشید نے کھیل کے میدان میں ہونے والی اندرونی کہانیاں بیان کیں۔ شارٹ کٹ کے چکر میں یہ بچے اپنی زندگیوں سے کھیل جاتے ہیں۔ بہت غلط بات ہے جی۔ صاف اور سیدھا رستہ ہی پائیدار ہوتا ہے۔ دوسرا رنگ شکیل بھائی نے لکھا۔ پلاٹ کافی منفرد اور ایکشن زبردست تھا۔ سوشل میڈیا پہ ہونے والی بے احتیاطی انسان کو کتنی مصیبتوں میں ڈال دیتی ہے۔ شکیل بھائی! اب آتے جاتے رہیے گا جی۔"

اسلام آباد سے سیدہ ایمانے زارا شاہ کی دلچسپ باتیں "ستمبر کا مہینہ اور یوم دفاع ہمیں 52 سال بعد بھی بحیثیت قوم خود پر فخر محسوس کراتا

ہے۔ان بہادروں کی جرأت اور دلیری کی داستان بے ساختہ ہماری آنکھیں نم کر دیتی ہے۔اندرونی اور بیرونی دشمن چاہے جتنی بھی کوشش کرلیں اس ارضِ پاک کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ یہ ملک روزِ آخر تک قائم رہنے کے لیے بنا تھا اور انشاء اللہ قائم رہے گا۔نکتہ چینی میں نظر دوڑاتے ہی عبادت کا الوداعی تبصرہ پڑھا۔کتنا روتے ہولڑکے؟ کیا پیاز کاٹتے ہوئے لکھا تھا۔سیف کا نام آنکھیں رگڑ رگڑ کر دیکھا ویلکم بیک لیکن اردو لکھنے میں ہاتھ ہلکا رکھیں آدمی باتیں تو لغت سے دیکھ کر سمجھ میں آئی ہیں۔ٹنڈ والہ یار والا سیکرٹ ضرور بتانا یوں تو مجھے آپ بھی کوئٹہ کے بجائے لکھنو سے بولتے دکھائی دیے ہیں۔طلعت ذہین تو آپ پہلے سے ہیں لیکن یہ پتا چلنے والا کریڈٹ لکھاری کو جاتا ہے جس نے بے ڈھنگے انداز میں خود ہی بتا دیا تھا۔تانیہ کی اتنی سیانی باتیں واہ، واہ، اب غائب نہ ہو جانا پھر سے۔کبیر عباسی جلدی سے نئے کیس میں کوئی نیا پہاڑی محاورہ متعارف کرائیں ورنہ شاہد ذوالفقار پراٹھے ملنے والے محاورے سے بور کرتے رہیں گے۔اس دفعہ انگارے نہ پڑھنے کی قسم توڑ ہی ڈالی اور تمام اقساط کو ایک ہی نشست میں مکمل کرلیا۔مغل صاحب کی منظرنگاری ایسی بے مثال ہے کہ انسان خود کو چشم تصور میں وہیں چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔شاہ زیب صحیح معنوں میں پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے والا بندہ ہے۔کہاں ڈنمارک سے پاکستان اور کہاں جاماجی۔شاہ زیب کو نجات دہندہ سمجھا جارہا ہے تو ٹھیک ہی سمجھا جارہا ہے۔جن میں اکیلے چلنے کا حوصلہ ہوتا ہے ایک دن انہی کے پیچھے قافلے چلا کرتے ہیں، شاباش لگے رہو۔سیف کے مرنے کا دکھ ہوا لیکن مجھے بس اس لیے ہوا کہ اب تاجور پھر سے شاہ زیب کے گلے پڑے گی......اور قسطینا؟ اس کا کیا بنے گا......؟ کیونکہ فارس مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا اور سجاول کی شان میں گستاخی کی مرتکب نہیں ہونا چاہتی ناحق گردن ہی مروڑ دے گا ڈکیت کہیں کا۔رقصِ ابلیس بس ٹھیک تھی۔دور کی آواز میں جنید کی ذہانت پر اش اش کر اٹھی۔پڑھے لکھے شیز دفرینک نے بے چارے سائیکاٹرسٹ کے ساتھ ہی ہاتھ کر دیا۔خود کردہ را کے سید شکیل کاظمی کو مبارک باد۔کہانی کے گھومتے پھرتے کردار تو بوجھ ہی محسوس ہوئے لیکن اس کی تھیم سے یہ سبق سیکھا کہ سوشل میڈیا کو ذاتی زندگی سے الگ رکھنا چاہیے ورنہ کبھی ہم لوگ فرینڈ لسٹ میں موجود کسی کی وجہ سے غنڈوں میں نہ پھنس جائیں۔قصہ جدید ہلکے پھلکے انداز میں ہمارے معاشرے کی کج رویوں کی طرف اشارہ تھا بالخصوص ہمارے حکمرانوں کی کرپشن اور اقربا پروری کا نمونہ۔مختصر کہانیوں میں دامِ صیاد اور وہ اک لمحہ اچھی لگیں۔"

یواے ای سے طلعت مسعود لکھتے ہیں "ستمبر کے جاسوسی کے ٹائٹل کو بڑے غور سے دیکھا لیکن پھر بھی سمجھ نہیں آیا کہ پیچھے چھپے ہوئے انکل کے ہنسنے کی وجہ کیا تھی اور یہ حیرانی تو بی جمالو ٹائپ حسینہ کے چہرے پر بھی نظر آرہی تھی اس لیے ان کو اپنے حال پر چھوڑ کر ہم نے سیدھے چینی نکتہ چینی کی محفل میں قدم رنجہ فرمایا جہاں اداریے میں میڈیا جسے میں تو بے لگام میڈیا کہوں گا کہ حال پر روشنی ڈالی جارہی تھی۔اب جس طرح ریٹنگ کی دوڑ لگی ہوئی ہے اس میں بہتری کی دعا ہی کی جاسکتی ہے لیکن اس کے باوجود کراچی کی محترم خاتون جو سستے داموں لوگوں کو کھانا فراہم کرتی ہیں یقیناوہ اچھے کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں اور ان جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی یہ دنیا ابھی انسانیت سے خالی نہیں ہوئی۔خطوط میں اشفاق صاحب شاہینوں والی پرواز کرتے ہوئے سب سے اونچی نشست پر براجمان تھے، تبصرہ اچھا تھا۔انور یوسف زئی صاحب پرانے تبصرہ نگاروں کو یاد کرتے نظر آئے۔امید ہے پرانے لوگ دوبارہ ان کی آواز پر لبیک کہیں گے۔قدیر شاہ صاحب نے پہلی آمد پر ہی کوثر اسلام صاحب کو دوشیزہ بنادیا۔کوثر صاحب اس وقت سے سکتے میں ہیں۔عبادت کاظمی صاحب الوداعی خطبہ دیتے نظر آئے۔شاہ جی اداس نہ ہوں امید ہے جب بھی موقع ملے گا حاضری لگاتے رہیں گے۔کوئٹہ سے سیف برادر کو دوبارہ ویلکم اور امید ہے اب آپ کی آمد سے محفل کی بے نوری سے بے ختم ہوکر نوری اور ناری دونوں ہوجائے گی۔ایمانے زارا ہم تو آج کل اتنے فری ہیں کہ دو تبصرے لکھنے کا دل کرتا ہے۔شاہد ذوالفقار صاحب زیادہ پراٹھے گرمی میں اچھے نہیں ہوتے۔تانیہ مہر کو دوبارہ خوش آمدید۔نپا تلا سا تبصرہ اچھا تھا۔حفصہ طارق پہلی انٹری پر سب گھر والوں کو رعب دکھاتی نظر آئیں۔بشریٰ افضل کو کافی ٹائم بعد محفل میں دیکھ کر اچھا لگا۔آپ کا شکوہ بجا ہے کہ اب یاد کوئی نہیں کرتا۔لیکن امید ہے اب آپ حاضری لگواتی رہیں گی۔تنویر اختر، ذیشان اور رمشا کو پہلی آمد پر خوش آمدید۔باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے لگے۔کہانیوں کے آغاز میں حسبِ معمول انگاروں کو سینکا، جاماجی کی جنگ لگتا ہے اب اختتام کو پہنچ رہی ہے۔آقا جان اور رائے زل کے انجام سے دلی خوشی ہوئی، یہ قسط کافی ہنگامہ خیز رہی۔لہو کا کھیل میں روبینہ رشید صاحبہ نے شرافت کے نقاب میں چھپے مکروہ دھندے کرنے والے معاشرے کے ناسوروں کو عمدگی سے بے نقاب کیا، تجسس اور سنسنی سے بھرپور رنگ اچھار ہا۔خود کردہ را میں مصنف نے سوشل میڈیا کے غیر محتاط استعمال سے ہونے والے نقصانات کو جس طرح کہانی میں بیان کیا اس نے کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔سسپنس اور تھرل سے بھرپور تحریر کا خوشگوار اختتام اچھا لگا۔شکیل کاظمی صاحب کی پہلی انٹری متاثر کن رہی۔رقصِ ابلیس شروع میں تو اچھی رہی لیکن کہیں کہیں تسلسل کی کمی رہی۔مختصر کہانیوں میں منظر امام کی قصہ جدید بہترین رہی۔ہنستے مسکراتے انداز میں آج کی کئی تلخ حقیقتوں پر نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئے۔سویرا از سرور اکرام دوسری عمدہ تحریر۔سویرا تو موجود ہے بس سب کو اپنے اپنے حصے کی شمع جلانے کی ضرورت ہے۔اس کے علاوہ وہ اِک لمحہ، جال اور دور کی آواز اچھی رہیں۔جبکہ قاتل تکون متاثر نہ کرسکی۔آوارہ گردی ابھی شروع ہی نہیں کی۔"

صوابی سے کوثر اسلام کا اپنا تعارف "اس بار جاسوسی بہت لیٹ ملا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں صرف ایک ہی بک شاپ ہے جہاں سے ڈائجسٹ ملتا ہے، وہ بے چارہ دکان دار بھی شہر سے لاتا ہے۔اس بار عید کی وجہ سے دس تاریخ کو ڈائجسٹ ملا۔سب سے پہلے جاسوسی کا آراستہ و پیراستہ مزین دروازہ (سرورق) کھولا اور چمنِ چینی نکتہ چینی میں داخل ہوگیا۔اس بار پھولوں جیسے بہت سارے دوست شامل ہوئے تھے

جن کی مسحور کن خوشبو چہار سُو پھیلی ہوئی تھی۔ اصل میں جے ڈی پی سے منسلک تمام افراد ایک فیملی جیسے ہیں۔ ایک مہینے کے بعد ان سے ملاقات عجیب سا سرور طاری کرتی ہے۔ میں ان دوستوں کا بہت شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میرا تبصرہ پسند کیا۔ اس بار تمام دوستوں نے لاجواب تبصرے لکھے تھے۔ قدیر شاہ کا تبصرہ پڑھ کر اپنی ہنسی پر قابو نہ پاسکا اس لیے کہ نام کی وجہ سے وہ مجھے دوشیزہ سمجھ بیٹھے۔ بھائی میں دوشیزہ نہیں ہوں اچھا بھلا مرد ہوں۔ کئی دوستوں نے خاص نمبر کے بارے میں بات کی تھی۔ واقعی خاص نمبر ضرور نکالنا چاہیے۔ خصوصاً ایم اے راحت، نواب صاحب اور کاشف زبیر نمبر جو ایک مدت تک جے ڈی پی کے روحِ رواں تھے۔ یہ ان عظیم لوگوں کو خراجِ عقیدت کی ایک چھوٹی سی کاوش ہوگی۔ پہلی کہانی رقصِ ابلیس سسپنس، ایڈونچر، تحیر اور تجسس سے بھرپور کہانی تھی۔ ساتھ ساتھ یہ سبق آموز بھی تھی۔ جان پہچان کے بغیر کسی پر اندھا اعتماد نقصان دہ ہوتا ہے۔ اپنے حواس پر قابو رکھ کر مضبوط قوتِ ارادی سے مشکل سے مشکل حالات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ تمارا نے کیا۔ زر، زن اور زمین کے لیے ہمیشہ سے قتل و غارتگری ہوتی آئی ہے۔ پیسوں کے لالچ میں کئی لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بقیہ کہانیاں ابھی نہیں پڑھیں۔‘‘

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کا عذر ’’ستمبر کا شمارہ عید سے پہلے مل گیا تھا۔ سرورق عمدہ رہا۔ آپ کا اداریہ پڑھا، یقین کریں اگر ہمارا میڈیا ٹھیک ہوجائے تو بڑے بڑے لوگوں کے دھڑن تختہ ہوجائیں۔ کئی صحافی حضرات سب کچھ جانتے ہوئے بھی پیسا لے کر خاموش ہوجاتے ہیں۔ ایسی کالی بھیڑیں ہر جگہ موجود ہیں۔ یہ لوگ وہ خبر بھی پہلے بریک کردیتے ہیں جو ملک کے مفاد میں ہوتا کہ ہمارا دشمن پہلے ہوشیار ہوجائے۔ اپنی محفل میں آئے لاہور سے اشفاق شاہین کو براجمان پایا، مبارکاں جی، اچھا تبصرہ لکھا۔ انور یوسف زئی بھی وزارت خوب نبھارہے تھے۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ جہاں پر شاہ زیب اینڈ کمپنی کو فتح نصیب ہوئی اور رائے زل اور آقا جان جیسے غداروں کا خاتمہ ہوا۔ بیگم نورل کی قربانی کو سلام آخر میں پھر ابراہیم کی طبیعت پر لٹکادیا کام کو۔ آوارہ گرد پڑھی جس میں شہزی نے اپنے ایک دشمن کو پھر مات دے کر وہ انمول ہیرا اپنے ملک کے اعلیٰ افسران کے حوالے کیا۔ اب آگے عابدہ والا مشن شروع ہورہا ہے۔ پہلا رنگ لہو کا کھیل روبینہ رشید کے قلم سے آیا۔ بہت ہی خوب صورت تحریر خصوصاً اسماعیل شیر محمد جیسے کالے کرتوتوں والوں کو بے نقاب کرتی تحریر عمدہ رہی۔ ہمارے ملک میں ہر جگہ ملاوٹ کی بھرمار ہے جو پتا نہیں کتنی زندگیاں گل کرچکی ہے۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک ہر چیز میں ملاوٹ ہے۔ سید شکیل کاظمی کی خود کردہ را بھی اچھی تحریر تھی لیکن شروع میں جو توقع لگی تھی وہ درمیان میں تھوڑی ڈھیلی پڑگئی۔ آخر میں اختتام اچھا ہوا بہرحال تھوڑی سی کمی بیشی رہ گئی تھی تحریر میں، یہ میری ذاتی رائے ہے کسی اور کا متفق ہونا لازمی نہیں۔ سرور اکرام کی سویرا عمدہ رہی۔ ارشد بیگ کی وہ ایک لمحہ، یاسر اعوان کی قاتل تکون، تمکین رضا کی دور کی آواز بیسٹ رہیں۔ باقی تمام تحریریں بھی بہترین تھیں، وقت کی کمی کے باعث اتنا ہی تبصرہ لکھ سکا۔‘‘

ناظم آباد سے محمد ادریس خان کی عنایت ’’جاسوسی ڈائجسٹ دیدہ زیب رنگوں سے سجا موصول ہوا۔ سرورق خوب صورتی کا بہترین امتزاج لیے تھا۔ اداریہ بھی امید کے رنگ لیے تھا۔ سرفہرست ناموں میں اشفاق شاہین نظر آرہے تھے۔ دیگر ناموں میں بیشتر نئے تھے۔ بشریٰ افضل کی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ دو چار ماہ سے اگر کوئی تبصرہ نگار محفل میں شرکت نہیں کررہا ہے تو اس کا بذریعہ تحریر حال احوال ہی پوچھ لیں۔ یہ ایک دوسرے سے اتنے لمبے عرصے سے متعارف رہنے والوں کا حق بنتا ہے۔ چینی نکتہ چینی سے آگے بڑھے تو ڈاکٹر سلیم عادل کی کہانی رقصِ ابلیس پڑھی اچھی لگی۔ تمکین رضا کی دور کی آواز بھی اچھی لگی۔ جس میں ڈاکٹر کو بے وقوف بنا کر میاں بیوی نے کروڑوں روپے کا غبن کیا اور ملک سے فرار ہوگئے۔ اس کے بعد منظر امام کی قصۂ جدید تھی جس کی کامیابی کے لیے ان کا نام ہی کافی ہے۔ کہانی میں طنز بھی شامل ہوتا ہے اور دنیا کے لیے پیغام بھی۔ تنویر ریاض کی جال بھی پسند آئی۔ اس کے بعد طاہر جاوید مغل کی انگارے جس کو پسندیدگی کا درجہ آغاز سے ہی ملا ہوا ہے اور کامیابی سے جاری و ساری ہے۔ قاتل تکون بھی اچھی تحریر تھی۔ دامِ صیاد اور پہچان بھی پسندیدہ قرار پائیں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد بھی دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے تھی۔ کھوٹ میں گرین نے احسان کا بدلہ احسان فراموشی سے دیا جو کہ انسانیت کی بھی تذلیل ہے۔ وہ ایک لمحہ ارشد بیگ کی سبق آموز کہانی تھی جس میں انسان کو حیوان سے سبق حاصل ہوا۔ سویرا بھی اچھی کہانی تھی جو ابھی تو کہانی ہے مگر آزادی ملنے کے اولین ایام میں حقیقت ہوگی۔ اب ہر طرف مطلب پرستی اور ابن الوقتی ہے کہ جیسے ہی موقع ملے اپنا مطلب نکالو اور چلتے بنو۔ چاہے اس کے مضمرات کیسے ہی ہوں۔ لہو کا کھیل اور خود کردہ را اچھی کہانیاں تھیں۔ روبینہ رشید اور شکیل کاظمی کو بہت بہت مبارک باد۔ کترنیں بھی اپنے ہونے کا احساس دلا رہی تھیں۔‘‘

سمندری، فیصل آباد سے منحہ رمشا کی خوشی و سرشاری ’’اس ماہ کا جاسوسی 5 ستمبر کو ہاتھ میں آیا۔ کھولنے سے پہلے اپنا تبصرہ شائع ہونے کی اللہ جی سے دعا کی جو پچھلے ایک ماہ سے جاری تھی۔ اپنا تبصرہ دیکھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ لیکن آپ نے میرا پورا نام نہیں لکھا۔ پلیز اگلی بار پورا نام شائع کیجیے گا۔ (بہن نام صاف اور نمایاں کرکے لکھا کریں) اب آتے ہیں تبصرے کی جانب۔ اس دفعہ کی موسٹ فیورٹ کہانی ڈاکٹر سلیم عادل کی غیر ملکی کہانی رقصِ ابلیس رہی۔ اف اتنا زیادہ سسپنس! پڑھ کے مزہ آگیا بلکہ میں نے تو درمیان میں روک کر سارا جاسوسی پڑھنے کے بعد آخر میں یہ ختم کی۔ واقعی دل تھام لینے والی ساعتوں سے لبریز کہانی تھی۔ بھئی میرا تو مشورہ ہے کہ جاسوسی کے پہلے صفحات پر اسی طرح غیر ملکی

کہانیوں کو شائع کرنا چاہیے۔ بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ہالی ووڈ فلم دیکھ رہے ہیں۔ تمکین رضا کی دور کی آواز بھی خوب رہی۔ لگا ہی نہیں کہ جنید ایکٹ کر رہا ہے۔ تنویر ریاض کی چال بھی اچھی رہی۔ والدین کو اپنے بچوں کا خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں وہ غلط روش پر تو نہیں چل پڑے۔ بلیز اوبرے مجھے بے قصور ہی لگ رہا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ محمد یاسر اعوان کی قاتل تکون خوب مزے کی رہی۔ آخر میں تینوں خطرناک مجرموں کے پکڑے جانے کی بہت خوشی ہوئی۔ بے چارے خوش حال گھرانے کو انہوں نے پریشان کیے رکھا تھا۔ سلیم انور کی دام صیاد بھی اچھی رہی۔ امینڈا نے کونراڈ کے ساتھ مل کر جو سازش اپنے شوہر کے خلاف چلی تھی خود بھی اس کی لپیٹ میں آ گئی یعنی صیاد خود اپنے دام میں آ گیا۔ سید شکیل کاظمی کی خود کردہ را آج کل کے معاشرے کے لیے کافی سبق آموز رہی۔ فیس بک کے ذریعے لڑکیاں تو ہینگ ہو کر نقصان اٹھاتی ہی ہیں لیکن اس کہانی میں تو لڑکوں کو بھی نہیں چھوڑا گیا۔ لیکن آخر میں بغیر کوئی نقصان اٹھائے سب لڑکے لڑکیوں کے بچ جانے کی خوشی ہوئی۔ دعا ہے جاسوسی اسی طرح کامیابی و کامرانی کی منازل طے کرتا رہے، آمین۔''

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی ستائش ''اب جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت گھر بیٹھے بک اسٹال سے بھی پہلے بذریعہ ڈاک مل جاتا ہے۔ ادارے کا شکریہ۔ سرورق اب معیاری نہیں رہے۔ مصور تبدیل کر دیں تو بہتر ہے۔ لاہور کے اشفاق شاہین اور دبئی کے طلعت مسعود کا میری اہلیہ کے انتقال پر تعزیت کا شکریہ۔ پرانے اور مستقل تبصرہ لکھنے والے اس بار بلیک لسٹ میں تھے۔ افسوس ہوا۔ بہاولپور کی بشریٰ افضل کو محفل میں واپسی پر خوش آمدید! گوجر خان کی حفصہ طارق کا تبصرہ ایک اچھوتا رنگ لیے ہوئے تھا۔ اس شمارے کی بہترین کہانی ڈاکٹر سلیم عادل کی ترجمہ کی ہوئی رقص ابلیس رہی۔ دیسی کہانیوں میں منظر امام کی قصۂ جدید لطف دے گئی۔ سرورق کی پہلی کہانی روبینہ رشید کی لہو کا کھیل صحافت کی دنیا کی اچھی کہانی تھی۔ دوسری کہانی شکیل کاظمی کی خود کردہ را ایک تیز رفتار اور مار دھاڑ سے بھرپور کہانی تھی۔ زویا اعجاز اور کبیر عباسی کے بعد یہ تیسرے تبصرہ نگار بھی مصنفین کی صف میں آ گئے ہیں۔ شاہ جی مبارک ہو مگر ہاتھ ذرا ہولا رکھیں۔ اب سمجھ آئی کہ وہ اتنے عرصے سے تبصرہ نگاری سے غیر حاضر کیوں رہے۔ (موصوف نے یہ کہانی کافی عرصہ پہلے بھیجی تھی، باری اب آئی) سلسلہ وار کہانی انگارے کی اس بار قسط کافی طویل تھی شاید اب آخری مراحل میں ہے۔ شاہ زیب دوبارہ زیرِ زمین پناہ گاہ میں واپس آچکا ہے اور قسطینا سے ملاقات بھی۔ آقا جان بھی اپنے انجام کو پہنچا۔ اس بار کترنیں کافی زیادہ اور اچھی تھیں مگر کارٹون بے حد کم؟'' (آپ کو کارٹون بہت پسند ہیں...... ہم آپ کی پسند کا خیال رکھتے ہیں)

بھکر سے نعمان خان نیازی کا تشکرانہ اظہارِ رائے ''میں جاسوسی کا مستقل قاری نہیں تھا اور نہ کوئی رائٹر ہوں بلکہ میں نے اگست 2017ء سے جاسوسی پڑھنا شروع کیا ہے۔ اگست کا جاسوسی پڑھ کر اب میں مستقل قاری بن گیا ہوں۔ یہ میرا کسی بھی ڈائجسٹ میں پہلا خط ہے۔ (خوش آمدید برادر!) جاسوسی کی نکتہ چینی کی محفل میں تبصرہ نگاروں کے تبصرے پڑھ کر میرا من بھی کرنے لگا کہ چلو میں بھی ایک ناکام کوشش کروں (ناکام کیوں؟ ہر کام کا آغاز کامیابی کا سوچ کر کریں) کہ شاید ہمارا تبصرہ بھی لوگوں کو پسند آئے اور جاسوسی کی نکتہ چینی میں جگہ مل جائے مجھ ناچیز کو لیکن یہ ڈر بھی ہے کہ اگر میرا خط یا تبصرہ معیار پر پورا نہ اترا تو ردی کی ٹوکری کی نذر ہو جائے گا۔ (خط جیسا بھی ہو۔ اولین کوشش ہوتی ہے وہ خطوط کی محفل میں شامل رہے) اگر میرے پہلے خط میں کوئی کوتاہی نظر آئے تو پلیز اس کی اصلاح کر دینا، میں آپ کا ممنون رہوں گا۔ (ضرور) اب چلتے ہیں تبصرے کی جانب! ستمبر کا پرچہ 9 ستمبر کو ایجنسی سے خریدا۔ سرورق پر ایک حسینہ شاید کسی کو دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ (ارے کسی کو کیا، آپ ہی کو دیکھ کر مسکرائی تھی) اور ساتھ ہی ایک آدمی بھی قہقہے لگاتا نظر آ رہا تھا شاید وہ کوئی بڑا کام سرانجام دے کر ہنس رہا تھا۔ اداریے میں یوم دفاع اور پاکستانی میڈیا کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ جی بالکل ٹھیک کہا گیا کہ میڈیا اپنی ریٹنگ کے لیے ہر خبر کو سنسنی خیز بنا کر اور بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ یوم دفاع کے بارے میں اتنا کہوں گا کہ یہ دن ہماری مختصر سی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے اس دن کو اور پاک فوج کی قربانیوں کو ہم کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ لاہور میں صبح کا ناشتا کرنے کی خواہش رکھنے والے بھارتی سورماؤں کو پاک فوج نے ایسا ناشتا کروایا کہ ان کی نسلیں در نسلیں یاد رکھیں گی اور لاہوری ناشتے کا سن کر بھی کانپ جاتے ہوں گے۔ نکتہ چینی کی محفل میں لاہور سے اشفاق شاہین نشست اول سنبھالے ہوئے تھے اپنے شاندار تبصرے کے ساتھ۔ بھائی مبارک باد قبول کریں۔ اس کے بعد انور یوسف زئی، انجم فاروق ساحلی، سید عبادت کاظمی، شاہد رازق خان، رمشا مغل، سیف خان، طلعت مسعود، زارا شاہ، تانیہ مہر، کوثر اسلام، حفصہ طارق، ذیشان، تنویر اختر، شمع پری، عبدالجبار رومی انصاری اور اپنے ہی شہر یعنی بھکر سے قدیر شاہ کے تبصرہ پڑھنے کو ملے۔ سب کے تبصرے پڑھ کر بہت مزہ آیا اور آپس میں نوک جھوک بھی اچھی لگی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی سلسلے وار کہانی انگارے پڑھی۔ اس قسط میں آخر کار شاہ زیب، رائے زل، آقا جان اور ان کے ساتھیوں پر چڑھائی کرنے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ لاکھوں کی تعداد میں جاماجی کے لوگ شاہ زیب کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے تھے جبکہ ان پر فائرنگ بھی ہوتی رہی اور بہت سے لوگ اپنی جانوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے مگر وہ پھر بھی پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے کیونکہ ان کے ساتھ دبنگ شاہ زیب تھے جن کو وہ اپنا لیڈر مانتے تھے۔ رائے زل

اور اس کے ساتھی اپنے انجام کو پہنچے جن کی انہیں امید نہیں تھی۔ بیگم نورل اور اس کے بیٹے کی قربانی جاماجی کے لوگ کبھی بھی فراموش نہیں کر پائیں گے۔ سجاول اور نرس خورسنہ کا قریب آنا بھی بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ابراہیم کی حالت سے سب پریشان ہیں اور سب اچھے کی دعا کر رہے ہیں۔ ہماری دعا بھی ان کے ساتھ ہے اور ہم بھی اچھے کی امید لگائے اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔ اتنی شاندار اور ایکشن سے بھرپور سلسلے وار کہانی پیش کرنے پر طاہر جاوید مغل کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس کے بعد دوسری سلسلے وار کہانی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد پڑھی۔ یہ کہانی میں نے قسط نمبر 40 سے پڑھنا شروع کی۔ اس کہانی کا بھی میں نے گزشتہ اقساط کا خلاصہ پڑھ کر اندازہ لگایا کہ کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کیا ہوتا رہا۔ یہ کہانی بھی ایکشن سے بھرپور ہے جسے پڑھ کر بہت مزہ آرہا ہے۔ اس زبردست کہانی کو پیش کرنے پر میں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ باقی کہانیوں میں رقصِ ابلیس کی تھوڑی بہت سمجھ آئی مجھے۔ (کیوں کیا مشکل تھی؟) کہانی لہو کا کھیل میں واقعی لہو کا کھیل کھیلنے والے کردار اسماعیل شیر محمد جیسوں کو اپنے انجام تک ضرور پہنچنا چاہیے۔ کہانی بہت شاندار تھی۔ سرورق کی دوسری کہانی خود کردہ را بھی بہت اچھی کہانی تھی۔ بعض اوقات انسان اپنے پیدا کردہ را پر پھنس جاتا ہے جس طرح زین پھنسا۔ زین کی وجہ سے ایک عورت جان کی بازی ہار گئی جس کا افسوس ہے۔ پتا نہیں کیوں بلال غوری اپنے ہی ملازم کو اپنا دشمن سمجھ بیٹھا شاید اس ای میل آئی ڈی کی وجہ سے۔ زین کے چند فیس بک دوست بھی زین کی پیدا کردہ را میں پھنس گئے مگر پھر زین کے کزن اور ایلیٹ فورس کی شاندار کارکردگی کی بدولت ان سب کی جان بچی۔ اس کے ساتھ ساتھ بلال غوری اور اس کے کارندے اپنے انجام کو پہنچے جبکہ ایلیٹ فورس کے ایک بہادر جوان نے جامِ شہادت نوش کیا۔ امید ہے کہ قارئین اس کہانی کا متن سمجھ کر فیس بک اور انٹرنیٹ پر بہت محتاط رہیں گے، انشاء اللہ۔''

لاہور سے انجم فاروق ساحلی کی شمولیت ''اس بار جاسوسی کا ٹائٹل حسرت ویاس، دلکشی اور قہقہہ بار مسکراہٹ سے سجا ہوا تھا۔ فہرست کے خانے میں مدیرِ اعلیٰ کے نام کے نیچے آپ کا نام لکھا دیکھ کر مسرت ہوئی۔ دامِ صیاد، سسپنس اور ارتکاز سے بھرپور اچھی تحریر ہے۔ قاتل تکون شروع میں روایتی انداز لیے ہوئے تھی لیکن پھر بہتر ہو کر آگے بڑھی، پولیس کی پلاننگ بھی خوب تھی۔ پہچان کی تصاویر کا انداز خوب صورت ہے۔ خطوط کی محفل دلچسپی سے بھرپور تھی۔ اس بار تصاویر کا معیار بہتر ہوا ہے۔ رقصِ ابلیس نسوانی جدوجہد سے بھرپور ہے۔ قاتلوں سے مقابلہ بھرپور اور زبردست تھی۔ پرستار اور کھوٹ دونوں خوب تھیں۔ رقصِ ابلیس سے یاد آیا۔ میرے پاس ابلیس کا چکر ترجمہ کہانی موجود ہے جس میں جرم کا انداز منفرد اور ارتکاز سے بھرپور ہے۔ انگارے اور آوارہ گرد اچھے انداز میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ آخری تحریر دونوں رنگ مکمل طور پر نہیں پڑھے جا سکے۔ وہ ایک لمحہ اچھی سبق آموز تحریر ہے۔ قصۂ جدید اور سویرا دلچسپ ہیں۔ امید ہے کہانیوں کی طرف توجہ دی جائے گی۔''

اشفاق شاہین، لاہور سے لکھتے ہیں ''جاسوسی حسبِ معمول بروقت ہی مل گیا۔ چھوٹی سی چھلانگ لگا کر چینی نکتہ چینی پہنچے، سرورق سے زیادہ توجہ دوستوں کے بتائے گئے ایڈوانس نامے کی رُو سے سب سے پہلے شائع ہونے والے خط کی طرف تھی۔ بہت ہی خوشی ہوئی کہ ہم اس صفحے کے مستحق ٹھہرے۔ تمام احباب کا شکریہ جنہوں نے مطلع کیا اور مبارک باد بھی دی۔ عیدالضحیٰ کا مزہ دوبالا بلکہ سہ بالا ہو گیا۔ عید کی تعطیلات میں ہی پورا جاسوسی پڑھا۔ محفل میں اس بار کافی نئے احباب نے انٹری دی۔ قدیر شاہ، شاہد رزاق خاں، رمشا، شمع پری، ذیشان، آپ تمام احباب کو دل کی گہرائیوں سے بزمِ دوستاں میں خوش آمدید۔ اور سب سے خاص سیف خاں کی آمد، جنہوں نے آتے ہی توجہ مبذول کروانے کے ساتھ ساتھ چینی نکتہ چینی پر بے نوری کا طعنہ کھینچ مارا۔ اب دیکھتے ہیں کہ کتنی روشن ہوئی ہے کوئٹہ کی روشنی سے یہ محفل۔ سید عبادت، الوداعی کیوں؟ ڈائجسٹ پڑھنا تمہیں منع نہیں ہے اور آپ کو خط لکھنے کا وقت بھی ضرور ملے گا۔ کنی مت کترائیے گا اور خط ضرور لکھیے گا۔ طلعت مسعود، ثانیہ مہر، کوثر اسلام کے خطوط محفل کا خاصّہ تھے، انور یوسف زئی، انجم فاروق، اقصیٰ مغل، حفصہ طارق، عبدالجبار رومی انصاری بھی محفل کی رونق بڑھاتے نظر آئے اور سب سے خاص بات بشریٰ افضل کی واپسی، اب ہمارے درمیان رہیے گا۔ سب سے پہلے حسبِ معمول انگارے کی طرف، شاہ زیب بالآخر سرخرو ہوا۔ آقا جان اور رائے زل اپنے انجام کو پہنچے۔ انیق کی بذلہ سنجی لبوں پر مسکراہٹ لے آئی۔ خورسنہ اور سجاول کی تاک جھانک بھی اچھی رہی۔ باذان بھی گیا لیکن کُل کتنا نقصان ہوا گرین فورس کی اس تحریک میں، یہ کہیں ذکر نہ ہوا۔ لونگ بدترین انجام سے دوچار ہوا اور یہ اسی کا مستحق تھا۔ بہرحال وہ جی دار، ورنہ شاہ زیب پر حملے کے لیے کشتی پر کبھی نہ آتا، اپنی جان بچاتا۔ ابراہیم بھی ابھی خطرے میں ہے۔ یہ قسط ایکشن سے بھرپور رہی پسند آئی۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ آوارہ گرد سے دو دو ہاتھ کیے۔ شکیلہ بالآخر مل گئی۔ شاہنواز بالآخر قانون کے شکنجے میں آگیا اور طویل انتظار کے بعد بیگم ولا کی رونقیں بھی لوٹ آئیں۔ شہزی طویل سفر سے لوٹا۔ اب پھر امریکا اڑان بھرنے کو ہے اس سے پہلے عارفہ کے بچوں کے ساتھ ننھی نوید سانچے والا سے دو دو ہاتھ کرنا باقی، اینڈ پر پھر ایک سسپنس اور ایک مہینے کا طویل انتظار، جان لیوا۔ سرورق کے رنگوں کا نمبر آیا۔ روبینہ رشید کی لہو کا کھیل، ایک الگ سے موضوع پر اچھی تحریر تھی۔ ڈرگ مافیا صرف اپنے مفادات دیکھتی ہے بس۔ کیسے کیسے ہر فیلڈ میں ان کی گرفت، قانون، میڈیا غرض ہر جگہ لیکن بہرحال فتح قانون اور سچ کی ہی ہوتی ہے۔ خضر اور آمنہ، بہترین کردار، ایک بات ذہن میں آئی آمنہ کو کسی نے بھی نہیں روکا، اس کے

# سوشل میڈیا قارئین کے لیے اہم اطلاع

سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ وغیرہ پر ادارے کی کوئی OFFICIAL WEBSITE نہیں ہے۔ جو ایڈمن اپنی WEBSITES پر آفیشل کا لفظ استعمال کر رہے ہیں، اسے فوری ترک کر دیں تاکہ قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ بصورت دیگر ادارہ سائبر کرائمز ایکٹ کے تحت کارروائی کرے گا۔

گھروالے، اور مالک چچا بہرحال پسند آئی۔ شکیلہ کاظمی کی تحریر کے چرچے، پرچہ ملنے سے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ خودکردہ را بہترین تحریر۔ اتنے سارے مخصوص کرداروں کو مخصوص علاقوں سے اٹھا کر یکجا کر دیا۔ مقصد تو سوشل میڈیا کے نقصانات سے آگاہی تھی۔ ہماری ذرا سی کوتاہی سے ہمارا یا ہم سے متعلق لوگوں کا کتنا بڑا نقصان ہوسکتا ہے، یہی سب کچھ اس اسٹوری میں ہے، بہت اچھی لگی ویلڈن شکیل کاظمی صاحب۔ رقصِ ابلیس اچھی رہی یہی کردار اگر سلیم عادل صاحب مشرقی انداز میں لے آتے تو یہ تحریر اور بھی خوب لگتی۔ دوسری آواز تمکین رضا کی خوب صورت تحریر، اتنے منظم اور چالاک لوگ، واہ واہ یہی لوگ اگر مثبت طرزِ عمل اپنائیں تو معاشرہ ترقی کر جائے۔ قصہ جدید ذرانہ بھایا۔ جال بھی ٹھیک رہی۔ تفتیشی کہانی۔ مختصر کہانیوں میں سب سے بہترین ہمیں سرور اکرام کی سویرا لگی۔ کردار بھی خوب تھے۔ بہت پسند آئی۔ اور ہاں احباب کے مشورے کے مطابق اگر پرانی تحریریں لگیں تو کیا مزہ ہو۔"

کراچی سے محمد اقبال کی باتیں "حسبِ روایت اس ماہ کا ڈائجسٹ بھی وقت پر مل گیا مگر کیا کریں عیدالاضحیٰ ہو اور ہم مویشی منڈی میں مصروف نہ ہوں ایسا کیسے ہوسکتا ہے مگر ڈائجسٹ اور مویشی منڈی آنے جانے کے لیے وقت نکال ہی لیتے، دن بھر گائے، بیلوں کے ساتھ مصروف رہتے اور تھک ہار کر رات کو ڈائجسٹ سے انصاف کرتے۔ جتنا ڈائجسٹ پڑھ سکے اس پر تبصرہ حاضر ہے۔ ٹائٹل پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے اداریے میں پہنچے جہاں نیو کراچی کے حوالے سے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ایک خاتون نے صرف چھ روپے میں مستحق لوگوں کے لیے کھانے کا انتظام شروع کیا ہے دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی نیک نیتی کو قبول فرمائے اور دوسرے مخیر حضرات کو بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ چینی نکتہ چینی میں اشفاق شاہین پہلے نمبر پر موجود تھے مبارک باد قبول کریں اچھا تبصرہ تھا۔ دیگر دوستوں کے تبصرے بھی اچھے تھے، نئے ساتھیوں کو خوش آمدید اور پرانے ساتھیوں سے درخواست ہے کہ ریگولر نہیں تو کبھی کبھی ہماری طرح محفل میں حاضری لگا دیا کریں بڑی مہربانی ہوگی۔ (کبھی کبھی اس لیے کہ دیر سے خط لکھنے کی صورت میں بلیک لسٹ میں بھی آجاتے ہیں) سسپنس اور ایکشن سے بھرپور طاہر جاوید مغل کی انگارے سے ہی شروع ہوئے اور جیسا کہ شک تھا پال مخلص تو ضرور ہے لیکن کہیں نہ کہیں کچھ اندھیرے میں رکھ رہا ہے مگر شاہ زیب کی قسمت اچھی ہے کہ کچھ نہ کچھ غیب سے مدد ہو جاتی ہے کہ انیق نے پال اور راجر کے درمیان ہونے والی بات چیت سن کر شاہ زیب کو بتا دیا مگر شاہ زیب کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ عوام کے ہجوم کو آگے بڑھنے دے، بہرحال اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ طویل جدوجہد کے بعد محترم حاذق ذکری کی ہمت افزائی اور شاہ زیب، قسطینا اور دیگر مخلص ساتھیوں کے عزم و حوصلے نے عوام کو اپنی طاقت کے مظاہرے پر مجبور کر دیا اور آزادی حاصل کرنے میں کامیاب رہے، نیا ٹوئسٹ سجاول کی خورسنہ میں دلچسپی ہے دیکھتے ہیں مغل صاحب کیا کرتے ہیں سجاول کے لیے۔ ابراہیم نے زینب کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رکھی ہے امید ہے کہ ڈاکٹرز کی محنت اور زینب کی دعائیں رنگ لائیں گی۔ عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد میں شہزی کی پھرتیاں بھی عروج پر تھیں، شہزی نے بہرحال طلسم نور ہیرا سرکاری تحویل میں پہنچا دیا اور واپس زہرہ بانو کے گھر اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ گیا جہاں سے عابدہ تک پہنچنے کے لیے کوششیں شروع کر دی گئیں، اچھی جا رہی ہے آوارہ گرد۔ روبینہ رشید کی لہو کا کھیل بھی عمدہ تحریر تھی جس میں خضر اور آمنہ نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی کوششوں میں لگے رہے بالکل آخر انہوں نے اس گھناؤنے کھیل کا پردہ چاک کر دیا جو بہت ہوشیاری سے کھیلنے کی کوشش کی جا رہی تھی ویلڈن روبینہ رشید صاحبہ۔ منظر امام کی قصہ جدید بھی عمدہ تحریر تھی۔ قاتل تکون میں یاسر اعوان کی محنت نظر آ رہی تھی عمدہ کہانی تھی۔ سرور اکرام سویرا میں تلخ حقیقت لیے وارد ہوئے اچھی کہانی تھی۔ سید شکیل کاظمی کی خودکردہ را آج کل کے معاشرے کے لیے کافی سبق آموز رہی۔ دیگر کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔ شہناز اقبال، کراچی۔ ثاقب عزیز، کوٹری۔ ہما انصار، کراچی۔ مہک فرحان، حیدرآباد۔ جنید ملک، کراچی۔ سید فرقان شاہ، لاہور۔ اویس خان، پشاور۔ وقار احمد، میرپور خاص۔ شہزاد احمد خان، کوئٹہ۔ بلال خان، پشاور۔

لی چائلڈ کے ناولوں میں سے ایک یادگار ناول کی دلچسپ تخلیق

# آبلہ پا

امجد رئیس

روح کے اندر کے خزانے آدمی کے چہرے پر حُسن بن کر جھلکتے ہیں... دلوں میں اس کے لیے محبت اور عقیدت پیدا کردیتے ہیں... ہر فرد کی روح اس کے چہرے، اس کی آنکھوں اور اس کے جسم کی ہر جُنبش سے جھانکتی ہے... سرکش... سرکشیدہ... سرپھرا... تنہا اور بے چین روح رکھنے والے ایسے ہی شخص کے گرد گھومتی کہانی... کسی ایک جگہ ٹک کر رہنا اس کی عادت نہیں تھی... سیمابی فطرت اسے ہر لمحہ بے قرار و بے کل رکھتی... آوارہ پتے کے مانند وہ ایک شہر سے دوسرے شہر اڑتا پھرتا... اس آوارہ گردی کے دوران میں ایسے لمحات... اور ایسی یادگار ملاقاتیں ہوتی ہیں جو ذہن پر لافانی نقش ثبت کرجاتی ہیں... دور دراز علاقے میں سرِراہ اس کی ملاقات..... ایک عورت سے ہوگئی... اس کی طرح وہ بھی بے چین روح کی مالک تھی... اسے کسی کی تلاش تھی جو اسے خوش نما... ٹھوس اور مضبوط عمارت میں مقید زندگی سے آزادی دلا دے۔ سنسنی خیز لمحات... پُرتجسّس واقعات کی گرد میں چھپی کہانی کے نت نئے موڑ.........

**خوف، دہشت، اذیت اور وحشت ناک ماحول کی اسیر...... جو کسی نجات دہندہ کی منتظر تھی**

وہ تین تھے۔ دو آدمی اور ایک لڑکا۔ فاصلے اور میدانی علاقے کی وجہ سے دونوں آدمی ٹیلی اسکوپ استعمال کر رہے تھے۔ فاصلہ ایک میل تھا۔

جمعے کا روز تھا۔ سرخ مکان ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ نگرانی کا متواتر.... پانچواں دن تھا۔ وہ ٹیکساس کا علاقہ تھا اور مقام ”ایکو کاؤنٹی“۔

پک اَپ وہاں سے کچھ دور وزنی پتھر کی آڑ میں کھڑی تھی۔ پک اَپ کو جھلسی ہوئی زمین کی رنگت جیسے تارپولین سے ڈھک دیا گیا تھا۔ شاور...... ڈریسنگ...... ناشتا...... گھر سے باہر...... وغیرہ وغیرہ۔ لڑکا نوٹ بُک میں لکھتا رہا۔ لال مکان کی ریکی جاری تھی۔

[illegible] ٹاپ والے نے بتایا۔
[illegible] گھڑی دیکھی۔ ”سات چالیس پر وہ بس [illegible] سوار ہوگی۔“ لڑکے نے نوٹ بک بند کردی۔

☆☆☆

سات بج کر اکتالیس منٹ۔ ٹھیک اس مقام سے تین سو میل دور موٹیل میں جیک ریچر اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر نکلا۔ اس سے پیشتر اس نے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ دروازے کے مخالف پک بورڈ تھا جس میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ شیشے کا رخ موٹیل کے بیرونی دروازے کی طرف تھا۔ اس نے کھڑکی سے نکلتے وقت عکس میں پولیس کار کو رکتے دیکھا۔ کار میں سے چار آدمی برآمد ہوئے اور موٹیل کی جانب بڑھے۔ چاروں یونیفارم میں تھے۔ گن، ہتھکڑیاں، ضروری لوازمات ان کے ساتھ تھے۔ جیک ریچر کے لیے چاروں میں سے صرف ایک شناسا تھا۔ شناسا، دراز قامت اور ہٹا کٹا تھا۔ ٹھوڑی اور ایک ہاتھ کی انگلی پر بینڈ یج تھی۔

اسی صبح ستر منٹ قبل وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ ریچر بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ پولیس کا آدمی ہے۔ ریچر کے نزدیک وہ بار میں آنے والا کوئی احمق تھا۔ اس وقت وہ اسٹول پر بیٹھا دیوار گیر ٹی وی کو دیکھ رہا تھا۔ ریچر اس کے دائیں جانب بیٹھا تھا۔ غالباً ٹی وی نے اسے بور کردیا تھا۔ اس نے گردن گھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔ بار میں خاصے لوگ تھے۔ ماحول پُرشور تھا۔ وہ مرغن چکن ونگز ندیدوں کے مانند چبانے میں مصروف تھا۔ روغنیات سے انگلیاں لتھڑی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ ٹھوڑی سے بہہ کے اس کی شرٹ کو بھی داغدار کر رہی تھیں۔ اعلیٰ درجے کے بار رومز میں ایسا انداز دیکھنے کو نہیں ملتا۔ ریچر کی نظر پڑ گئی۔ چکن کھانے والے کی گردن گھوم رہی تھی۔ ایک ساتھ دونوں کی نظر چار ہوئی۔

”مجھے گھور رہا ہے؟“ وہ بدتمیزی سے بولا۔

”نہیں۔“ ریچر نے جواب دیا۔

”لڑکے، کہیں اور دیکھ۔“

ریچر تھوڑا اور گھوم گیا۔ اس کا مقصد چکن بھنبھوڑنے والے کو مشتعل کرنا نہیں تھا۔ وہ اس کا ناپ لے رہا تھا۔ ریچر کو گمان تھا کہ کسی نہ کسی دن اس جیسا کوئی لمبا تڑنگا، سر پھرا...... اس کے ساتھ آن ٹکرائے گا۔ دوبدو...... روبرو۔ ریچر نے اسے تولا اور دل میں کہا۔ ”ابھی وہ دن نہیں آیا۔“ اگرچہ بدتمیز دیو قامت، بظاہر آسانی کے ساتھ دو چار کے لیے تنہا کافی تھا۔ شاید اس کے دماغ میں بھی اپنی طاقت کا خناس چھپا ہوا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے ہی جیسے آدمی کو ذرہ برابر اہمیت نہیں دی۔ ادھر ریچر اس کا ناپ لینے کے بعد مسکرایا۔

اس نے ریچر کے چوڑے سینے پر روغنی انگلی ماری۔

”کہا تھا مجھے نہ دیکھ۔“ ریچر کی شرٹ پر داغ پڑ گیا۔

”ایسے نہیں کرو۔“ ریچر نے کہا۔

اس نے پھر انگلی ماری۔ ”ورنہ...... ورنہ کیا کرے گا؟“

ریچر نے نیچے دیکھا۔ شرٹ پر دو نشان پڑ گئے تھے۔ اس نے پھر انگلی ماری۔ تین داغ۔

”بہرا ہے؟“ ریچر نے کہا۔ ”میں نے کہا تھا، یہ کھیل نہ کھیل۔“

”تو کھیلے گا؟“

”نہیں، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تو یہ مت کر۔“

وہ مسکرایا۔ ”اتنے بڑے سینے میں بکری کا دل لیے پھر رہا ہے؟“

”جو بھی ہے...... مجھ سے دور رہ۔“

”تو بتا دے نہ...... کرے گا کیا؟“

”اب چھو کے دیکھ اور معلوم کرلے۔“ ریچر نے سکون سے کہا۔

چکن والے کا سرخ چہرہ مزید سرخ ہوگیا۔ وہ ایک سیکنڈ کے لیے رکا، پھر اس کی انگلی حرکت میں آئی۔ اتنا کافی تھا۔ ریچر نے راستے میں ہی انگلی پکڑی اور الٹا جھٹکا مار کے انگلی توڑ دی۔ وہ رکا نہیں تھا۔ آگے جھک کر اس نے سر کی خوفناک ضرب لگائی۔ بڑبولا اسٹول سے گرا۔ ابھی وہ چاروں ہاتھ پیروں پر سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ریچر کی زوردار لات پسلیوں میں لگی۔ وہ کمر کے بل گرا۔ اگلے لمحے ریچر نے بے رحمی سے بوٹ کی ضرب عین اس کی ٹھوڑی کے نیچے لگائی۔ آخری ضرب اس کی سانس روکنے کے لیے کافی تھی۔ ریچر نے کل چار حملے کیے تھے۔ تین سیکنڈ میں۔ پہلے دو وار بیک وقت۔ آخری دو وار آگے پیچھے۔ اتنا کافی تھا۔

ریچر نے ادائیگی کی اور رواں قدموں سے چلتا ہوا بار سے نکل گیا۔ اس کا رخ قریبی موٹیل کی طرف تھا۔ ایک گھنٹے بعد وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر نکلنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر موٹیل کے سامنے پولیس پر جا پڑی۔ وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر پھرتی سے پلٹا تھا۔ بعدازاں باہر نکلنے کے لیے اسے کھڑکی استعمال کرنا پڑی۔

پولیس کا دردِسر...... ریچر کے ساتھ مزید پریشانی۔ وہ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اس کے پاس کسی قسم کی کوئی شناخت نہیں تھی۔ ہمیشہ کی طرح صرف ایک فولڈنگ ٹوتھ برش اور

پندرہ ہزار ڈالرز۔ ایکو کاؤنٹی میں وہ اجنبی تھا۔ بار میں اس کے خلاف درجنوں گواہ تھے۔ باتیں کس نے سنی ہوں گی۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس نے خوامخواہ مار پیٹ کی اور چل دیا۔ مختصر یہ کہ کوئی چیز اس کے حق میں نہیں تھی۔ پولیس والے اس کے ساتھ اپنی مرضی کا سلوک کریں گے...... مار پیٹ...... اَن گنت سوالات۔ خوب تماشا بنے گا۔ نیم اجاڑ، دور دراز علاقے میں کون جانے، کس کا سکہ چلتا ہے۔ اسے مار کے بھی پھینک دیا تو کون پوچھے گا۔

وہ جلد ہی ایک عمارت کی آڑ میں پہنچ چکا تھا۔ نگاہیں بس کی تلاش میں تھیں۔ ٹیکسی ملنا دشوار تھا۔ اس نے تخمینہ لگایا۔ وہاں گنتی کے موٹیلو تھے...... ریچر کے پاس زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ تھے۔ اس کے بعد پولیس سڑکوں پر ہو گی...... اس نے سڑک پر آ کر انگوٹھا بلند کر دیا۔

☆☆☆

وہ تین قاتل تھے۔ دو مرد، ایک عورت۔ بیس (base)، لاس اینجلس تھا اور رابطے ڈلاس کے علاوہ ویگاس میں تھے۔ وہ پیشہ ور تھے۔ انہیں اس دھندے میں دس برس ہو چلے تھے۔ وہ ایک اچھی اور خطرناک ٹیم تھی۔ وہ زیادہ تر سفر الگ الگ کرتے تھے۔

ان میں سے ایک کرائے کی کار پر ٹیکساس جا رہا تھا۔

وہ سیاہی مائل اور پستہ قد تھا۔ گاڑی کے ٹرنک میں دو بڑے موٹی سیاہ نائیلون کے بیگ تھے۔ ایک زیادہ وزنی تھا۔ بیگ ساتھ لے کر وہ فلائی نہیں کر سکتا تھا۔ بائی روڈ، ٹیکساس جانے کے لیے دو دن درکار تھے۔ وہ سگریٹ نوش نہیں تھا۔ باوجود اس کے وقتاً فوقتاً سگریٹ سلگا کر راکھ ادھر ادھر جھاڑ رہا تھا۔ واپسی پر رینٹل کمپنی خوب صفائی کرتی۔ ویکیوم، وینائل، واٹر اسپرے، ایئر فریشنر، سروس۔ اس طرح ہر نشان مٹ جاتا تھا۔ اس کا لائسنس اور کریڈٹ کارڈز اصلی تھے۔ یہ دور دراز کی ریاست سے ایشو ہوئے تھے۔ یہ اور بات کہ اس آدمی کا کوئی وجود نہیں تھا جس کے نام پر کاغذات تھے۔

دوسرا آدمی گوری رنگت کا تھا۔ نسبتاً لمبا اور صحت مند تھا۔ اس کا رخ ڈلاس فورٹ ورتھ کی جانب تھا۔ وہ دوسرے دن شام کو منزل پر پہنچا۔

ٹیم کا تیسرا ممبر عورت تھی۔ وہی لیڈر تھی۔ درمیانہ قد، درمیانی عمر، بال بھورے نہ سنہرے۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سوائے اپنے "پیشے" کے۔ اس کے پاس جعلی ماسٹر کارڈ تھا اور اس نے اپنا سفر ایک دن بعد شروع کیا تھا۔ منزل ٹیکساس تھی۔

گوری رنگت والے نے گاڑی ڈلاس فورٹ ورتھ ایئرپورٹ کی پارکنگ میں چھوڑی اور ہرٹز کے کاؤنٹر سے فورڈ کراؤن وکٹوریا حاصل کی۔ ہرٹز والے فورڈ کرائے پر دیتے تھے۔ فورڈ کراؤن وکٹوریا ان کی ٹیم کے لیے ضروری تھی۔

سیاہی مائل پستہ قد پہلے دن کیسولینا کے لیے رکا۔ پھر راستہ بدل کے نیومیکسیکو کی پہاڑیوں میں سفر کرنے لگا۔ اس دوران اس نے کیلی فورنیا کی پلیٹ بدل کر گاڑی پر ایریزونا کی پلیٹ لگا دی تھی۔

سفید فام نے اپنے بیگس کراؤن کے ٹرنک میں منتقل کیے۔ تنقیدی نظر سے کار کا جائزہ لیا۔ گاڑی میٹیلک بلیو کلر کی تھی۔ یہ گاڑیاں کینیڈا میں تیار ہوتی تھیں۔ انہیں تین جگہوں پر فروخت کیا جاتا تھا۔ پولیس ڈپارٹمنٹ، ٹیکسی کیب کمپنیز اور رینٹل فلیٹس۔ چند منٹ بعد وہ وکٹوریا میں بیٹھ کر منزل کی طرف جا رہا تھا۔ منزل دور نہیں تھی۔ وہ ایک موٹیل تھا۔ چیک ان کر کے، اس نے پیٹ پوجا کی اور سو گیا۔ وہ صبح جلدی بیدار ہو گیا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی موٹیل کے باہر موجود تھے۔

یہ وہی وقت تھا جب ریچر نے سڑک پر انگوٹھا بلند کیا تھا۔

☆☆☆

تین منٹ بعد ہی اسے لفٹ مل گئی تھی۔ مزید حیرانی کی بات یہ تھی کہ ڈرائیور ایک عورت تھی۔ وہ کوئی عام، چھوٹا موٹا بندہ نہیں تھا۔ اس کا قد چھ فٹ پانچ انچ تھا۔ بھاری بھرکم لیکن کسرتی بدن۔ وزن ڈھائی سو پونڈ۔ کھردرا چہرہ، شیو بڑھا ہوا۔ آشفتہ منہ، آشفتہ سر، اور ڈرائیور عورت؟

"کہاں؟" گاڑی روک کر عورت نے شیشہ نیچے کیا۔ انداز ایسا ہی تھا، جیسے وہ کوئی کیب ڈرائیور ہو۔

"کہیں بھی۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ مطلوبہ منزل کے بارے میں لاعلمی کا اظہار صورتِ حال کو خراب کر دیتا ہے۔ ایسے افراد کو لفٹ مشکل سے ہی ملتی ہے۔ مزید برآں، اس کا حلیہ اور قد و قامت، شرٹ پر بھی روغن کے داغ تھے۔ ریچر کے اندازے اور تخمینے شاذ ہی غلط ثابت ہوتے تھے۔ تاہم اس عورت نے اسے غلط ثابت کر دیا تھا۔ عورت نے سر ہلا کر اوکے کہا۔

"گریٹ۔" ریچر دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

"تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم نے مجھ پر کتنی مہربانی کی ہے۔"

"میں پیکو کی طرف جا رہی ہوں۔" اس نے گاڑی آگے بڑھائی۔

ریچر نے کار میں نگاہ دوڑائی۔ یہ دو دروازوں والی خوب صورت کیڈی لاک تھی۔ عقبی نشست پر ایک ہینڈ بیگ اور بریف کیس رکھا تھا۔

کھلے ہوئے بریف کیس میں کاغذات کا ڈھیر صاف نظر آرہا تھا۔ کاغذات بے ترتیبی سے ٹھونس دیے گئے تھے۔

ریچر نے عورت پر نظر ڈالی۔ اس کا قد اور وزن مناسب تھا۔ اس نے بغیر آستینوں والا کاٹن ڈریس پہنا ہوا تھا۔ گھٹنوں سے نیچے اس کی ٹانگیں عریاں تھیں۔ سیاہ بال، سیاہ آنکھیں، رنگت گندمی، ریچر نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر تیس سال ہونی چاہیے اور تعلق میکسیکو سے۔ پنڈلیاں ایسی شفاف تھیں، جیسے پالش کی گئی ہوں۔ لباس بہت زیادہ گراں قدر نہیں، لیکن مناسب تھا۔

''ہم...... م...... تمہارا رخ کس جانب ہے؟'' وہ مسکرائی۔ ''اوہ، یہ تو میں معلوم کرچکی ہوں...... تم خود نہیں جانتے۔'' اس کا لہجہ خالص امریکی تھا۔ اس کی انگلیوں میں رنگ نظر آرہے تھے۔ ریچر نے نازک ویڈنگ بینڈ بھی دیکھا اور ایک پلاٹینم کی انگوٹھی، جس میں ہیرا جڑا تھا۔

''میں کہیں بھی اُتر جاؤں گا۔''

وہ پھر مسکرائی۔ ''بھاگے ہوئے تو نہیں ہو؟ کہیں میں کسی مفرور کو لفٹ دے بیٹھی ہوں؟'' وہ مسکراتے ہوئے زیادہ پرکشش اور پراعتماد نظر آتی تھی۔

''ٹورسٹ سمجھ لو۔''

''لگتے تو نہیں ہو۔''

''تم یہیں کہیں رہتی ہو؟'' ریچر نے موضوع بدلنا چاہا۔

''میں، میں یہیں آس پاس رہتی ہوں۔'' اس نے رفتار کم کر کے نیو میکسیکو کی جانب دایاں موڑ کاٹا۔ ایک میل بعد بایاں۔ سیدھا اولڈ میکسیکو کی طرف جنوب کی سمت...... ڈیش بورڈ کی جالی سے آنے والی ٹھنڈی ہوا پرفیوم کی مہک کو گاڑی میں پھیلا رہی تھی۔

''کیا تم پہلے ٹیکساس یا اس کے علاقے پیکو میں آئے ہو؟''

''نہیں، کبھی نہیں۔'' ریچر نے کہا۔ ''تمہاری فیملی پیکو میں ہے؟''

''نہیں، کیلی فورنیا میں۔'' وہ بولی۔ ''میں شادی کے بعد ٹیکساس آئی تھی۔

بات کرتے رہو۔ اس عورت نے تمہاری گردن بچالی ہے۔ ریچر نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔ ''معلوم ہوتا ہے کافی عرصہ ہوگیا شادی کو؟''

''سات سال۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم وکیل ہو؟'' اس نے استفسار کیا۔

عورت نے ایئر ویو میں بریف کیس کو دیکھا۔ ''نہیں، میں مؤکل ہوں۔ وکیل کوئی اور ہے۔''

''اس کے علاوہ؟''

''اس کے علاوہ کسی کی ماں اور کسی کی بیوی...... کسی کی بیٹی، کسی کی بہن...... اور تم؟''

''کچھ نہیں۔''

''کچھ نہ کچھ تو ہوگے؟''

''میں صرف ایک چیز ہوں۔'' ریچر نے کہا۔ ''کسی کا بیٹا تھا، کسی کا بھائی تھا اور کسی کا بوائے فرینڈ تھا......''

''تھا؟''

''میرے والدین کا انتقال ہوگیا۔ بھائی چل بسا۔ اور گرل فرینڈ مجھے چھوڑ گئی۔''

''معذرت چاہوں گی۔'' اس نے کہا۔ ''تنہا ہو؟''

''تنہائی مجھے پسند ہے...... دو راتیں ایک جگہ گزارنا مشکل ہوجاتا ہے۔''

''ایسا کب تک چل سکتا ہے؟ لگتا ہے تمہاری زندگی سیٹ تھی۔ کچھ ہوا...... جس کے بعد تم نے بھاگنا شروع کردیا یا شاید آوارہ گردی۔'' عورت نے خیال آرائی کی۔

ریچر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''غلط۔ میری زندگی آرمی میں گزری ہے۔ مجھے سب بے تکا لگتا تھا۔ یہ احساس بڑھتا گیا پھر میں نے آرمی چھوڑ دی۔''

''کیسے ایک آدمی تمام زندگی آرمی میں گزار سکتا ہے؟''

''میرے والد آرمی میں تھے۔ ملٹری بیس میں ہی پلا بڑھا، قریباً ساری دنیا دیکھی۔ ٹریننگ لی، سروس کی اور اب......''

''اب تم باہر ہو۔ شاخ سے ٹوٹے پتے کے مانند ہوا کے ساتھ اڑتے پھر رہے ہو۔''

''ایسا ہی ہے۔'' ریچر نے سر ہلایا۔

☆☆☆

مخصوص رنگ کی کراؤن وکٹوریا کا عمومی تاثر ایف بی آئی سے لگا کھاتا ہے یا سیکرٹ سروس...... یا پھر کوئی اور سرکاری ایشو۔ کچھ تبدیلیوں کے بعد یہ تاثر گہرا ہوجاتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے یہ گاڑی ہائر کی تھی۔

وہ تینوں ہائی وے سے ہٹ کر جنگل کے اندر کراؤن کو

ضروری تبدیلیوں کے ساتھ مزین کررہے تھے۔ عورت نے وزنی بیگ کھول کر ورجینیا کی پلیٹس کی ایک جوڑی نکالی۔ سفید فام نے اسکروڈرائیور کی مدد سے ٹیکساس کی پلیٹس اتار کر ورجینیا کی پلیٹس لگا دیں۔ پستہ قد نے وہیل کیپ بدل دیے۔ عورت نے بیگ سے چار ریڈیو اینٹینا نکالے اور ایڈھیو پیڈز کی مدد سے ان کو عقبی کھڑکی پر لگا دیا۔ سی بی اینٹینا، مقناطیسی بنیاد کی مدد سے ٹرنک پر چپکا دیے گئے۔ یہ محض دکھاوا تھا۔ ان کا کنکشن کہیں نہیں تھا۔

پستہ قد نے اسٹیئرنگ وہیل سنبھالا۔ کچھ دیر بعد کراؤن وکٹوریا، ایف بی آئی کار کی شکل میں ہائی وے پر رواں تھی۔ اندر گویا تین عدد ایجنٹ بیٹھے تھے۔

☆☆☆

''آرمی میں تم کیا کرتے تھے؟'' عورت نے عام سے انداز میں سوال کیا۔

''پولیس...... آرمی پولیس۔''

''کیا؟ آرمی میں پولیس کا کیا کام؟''

''ہاں، ملٹری کی اپنی پولیس ہوتی ہے۔''

''لگتا ہے، وہاں تمہاری کارکردگی اچھی تھی؟''

''ہاں، شاید...... میں میجر تھا۔ چند میڈل بھی ملے تھے۔''

''پھر کیوں......؟''

''سرد جنگ کے اختتام پر آرمی سکڑ گئی تھی۔ ملٹری پولیس کی ضرورت بھی محدود ہوگئی۔''

عورت نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، جیسے کسی ٹاؤن میں آبادی کم ہو تو پولیس کی تعداد بھی کم ہوتی ہے۔ میں بھی چھوٹے سے علاقے میں رہتی ہوں۔ کاؤنٹی...... ایکو کاؤنٹی۔ تھوڑے سے لوگ ہیں۔ پولیس ڈپارٹمنٹ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بس کاؤنٹی شیرف ہے۔''

ریچر نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ پُرکشش تھی لیکن ریچر نے محسوس کیا کہ اسے کوئی پریشانی لاحق ہے۔ وہ ایکو سے بہت دور تھی۔ پیکو جارہی تھی۔

''کیسی ہوتی ہے، آرمی کی زندگی؟''

''رولز، ریگولیشن...... مختلف قسم کی۔ لیکن لاقانونیت بھی ہوتی ہے...... رف اینڈ ٹف۔''

''وائلڈ ویسٹ کے مانند؟''

''ہاں کچھ ایسی ہی۔''

''کیا میں تمہارا نام جان سکتی ہوں؟''

''ریچر...... جیک ریچر۔''

''ریچر! تم نے انسانوں کو ہلاک کیا ہے؟'' وہ کچھ دیر رک کر بولی۔ ''میرا مطلب ہے، سروس کے دوران؟''

ریچر نے سر ہلایا۔ ''ہاں۔''

''پیکو میں ایک میوزیم ہے۔ اصلی وائلڈ ویسٹ میوزیم۔ وہاں کلے ایلی سن کی قبر بھی ہے۔'' عورت نے کہا۔ ''کبھی یہ نام سنا ہے؟''

ریچر نے نفی میں سر ہلایا۔

''اسے شریف گن فائٹر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ پتا ہے اس کے مدفن پر کیا لکھا ہے؟''

''کیا لکھا ہے؟'' ریچر نے گردن گھما کر اس کی جانب دیکھا۔

''رابرٹ کلے ایلی سن **1840-1887**۔ ایلی سن نے کبھی ایسے آدمی کو ہلاک نہیں کیا جو ہلاکت کا حق دار نہیں تھا۔''

''مجھے یہ فقرہ پسند آیا۔'' ریچر نے تبصرہ کیا۔

''کیا تم بھی اپنے مدفن پر ایسی ہی کوئی چیز لکھواؤ گے؟'' اس کی آواز میں ہلکی سی شوخی تھی۔

''ابھی میرا مرنے کا ارادہ نہیں ہے؟''

وہ پھر مسکرا اٹھی۔ ''بالآخر وہ دن آئے گا...... میرا قیاس ہے کہ تم ایسا ہی کوئی فقرہ پسند کرو گے؟''

''کیا تم مطلب کی بات پر آؤ گی؟''

عورت نے گاڑی سڑک سے اتار کر کچے میں کھڑی کر دی۔ ''میرا نام کارمن گریر ہے۔'' وہ بولی۔ ''مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔ میں نے تمہیں لفٹ حادثاتی طور پر نہیں دی تھی۔ مجھے تم جیسے آدمی کی تلاش تھی۔''

''کیوں؟''

''میں ایک مہینے سے کوشش کررہی ہوں لیکن مجھے مطلب کا بندہ نہیں ملا۔''

''اوکے کارمن، مجھے اصل بات بتاؤ...... کیا ہورہا ہے؟''

''تمہارا وکیلوں سے واسطہ پڑا ہے؟ شاید نہیں۔ انہیں بہت سا وقت اور بہت سی رقم درکار ہوتی ہے اور آخر میں وہ کہتے ہیں کہ کیس میں جان نہیں ہے۔''

''تمہیں نیا وکیل چاہیے؟''

''میں چار وکلا کو بھگت چکی ہوں۔ چاروں خاصے مہنگے تھے۔''

''تم کیڈی لاک ڈرائیو کررہی ہو۔''

''یہ میری ساس کی ہے۔''

"ڈائمنڈ رنگ؟"

کارمن کی نظر دھندلا گئی۔ "یہ تحفہ میرے شوہر نے دیا تھا۔"

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ "وہ تمہاری مدد نہیں کرسکتا؟"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "کبھی تم پرائیویٹ ڈیٹکٹیو کے پاس گئے ہو؟"

"میں خود ہی کافی تھا۔ مجھے کبھی ضرورت نہیں پڑی۔"

"وہ بھی فراڈ ہوتے ہیں۔ مجھے ایک آدمی ملا تھا۔ وہ ایک ہفتے کے مجھ سے دس ہزار ڈالرز طلب کر رہا تھا۔ میں مایوس ہوگئی۔ پھر مجھے ایک خیال آیا اور میں لانگ ڈرائیو پر مددگار کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ اس سلسلے میں، میں بہت محتاط تھی۔"

"لیکن یہ ایک خطرناک طریقۂ کار تھا۔" ریچر نے کہا۔

"ہاں، لیکن میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔"

"کیا تمہاری تلاش ختم ہوگئی ہے؟"

"ہاں۔"

"کارمن، میں کوئی فلمی ایکشن ہیرو نہیں ہوں۔"

"ایک مہینے کا تجربہ اور تم سے باتیں کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ تم ہی وہ آدمی ہو۔"

"کون آدمی؟"

"جس کی مجھے تلاش تھی۔"

"ممکن ہے تمہارا اندازہ درست ہو۔ لیکن مجھے جاب کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یہ اچھی اور خالص بات ہے۔" کارمن نے کہا۔ "مدد صرف مدد کی خاطر۔ تمہارے پس منظر کو دیکھتے ہوئے یہ مورال ڈیوٹی کے مانند ہوگا۔"

ریچر نے کارمن کی آنکھوں میں دیکھا۔ "میں نہیں سمجھتا۔"

"تم سپاہی رہے ہو۔ آرمی پولیس۔ کیا پولیس لوگوں کی مدد نہیں کرتی؟"

"پولیس کی ضرورت ہے تو تمہیں شیرف کے پاس جانا چاہیے۔"

کارمن نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ "میں نہیں کرسکتی...... نہیں...... جاسکتی......"

ریچر خاموش رہا۔

"میں پاگل نہیں ہوں۔ ہاں ایک ماہ سے میں خواب ضرور دیکھ رہی تھی۔ احمقانہ منصوبہ...... لیکن چانس تو ہوتا ہے۔ میں نے سوچا...... بات بن گئی ہے... لیکن نہیں۔ میں واقعی پاگل تھی۔"

ریچر کئی منٹ تک خاموش بیٹھا رہا۔

"ٹھیک ہے شروع کرتے ہیں۔" ریچر نے سکوت کا پردہ چاک کیا۔ "اپنی کہانی سناؤ لیکن پہلے مجھے ایک کپ کافی چاہیے۔"

☆☆☆

پچاس میل دور جنوب میں کراؤن وک ایلن کی ایک سنسان سڑک پر کھڑی تھی۔ ڈرائیور کی نظر ایئر ویو پر تھی۔ اس نے کراؤن پکے راستے پر کھڑی کی تھی۔ عقب میں ایک میل تک وہ بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ وقت اپنی رفتار سے رینگ رہا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ عقب میں کسی گاڑی کی قریب ہوتی ہوئی جھلک نظر آئی۔ گاڑی سفید رنگ کی مرسیڈیز تھی۔ کراؤن میں موجود ٹیم کی معلومات مکمل تھیں۔ مرسیڈیز میں ایک آدمی ہونا چاہیے تھا جسے طے شدہ ملاقات کے لیے وقت پر پہنچنا تھا۔ اسے کراؤن کو کراس کر کے مزید تیس میل آگے جانا تھا۔ وہی کراؤن ٹیم کا ٹارگٹ تھا جو ہر لحظہ قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ کراؤن کے ڈرائیور نے عورت کی گہرے نیلے رنگ کی بال کیپ لے لی۔ جس پر ایف بی آئی کے الفاظ کڑھے تھے۔ اس نے ٹوپی ذرا جھکا کر سر پر رکھی اور بولا۔

"وہ وقت پر پہنچا ہے۔" اس نے کراؤن کا انجن اسٹارٹ کیا۔

مرسیڈیز، سڑک کے کنارے کھڑی کراؤن وک کے برابر سے گزر گئی۔ کراؤن حرکت میں آئی اور مرسیڈیز کے پیچھے روانہ ہوگئی۔ مرسیڈیز کے ڈرائیور نے ایئر ویو میں دیکھا کہ عقبی گاڑی کی ہیڈ لائٹس جل بجھ رہی ہیں۔ مرسیڈیز نوے کی رفتار سے اڑی جا رہی تھی۔ اس نے رفتار کم کرتے کرتے گاڑی ایک طرف لگا دی۔ کراؤن اس کے برابر آگئی۔ اس میں تین افراد تھے۔ دو کے سر پر ٹوپیاں تھیں۔ تیسری عورت تھی۔ گاڑی پر کئی جگہ انٹینا نظر آ رہے تھے۔ چھت پر گول لائٹ نہیں تھی۔ سائرن کی آواز بھی نہیں آئی تھی۔ عورت نے ایف بی آئی کی جعلی آئی ڈی کھڑکی کے شیشے سے چپکا دی۔ سرکاری گاڑی تھی۔ سرکاری آدمی تھے۔ مرسیڈیز کے ڈرائیور کی بے چینی ختم ہوگئی۔ ایف بی آئی تیز رفتاری پر مداخلت نہیں کرتی۔ یہ کچھ اور معاملہ تھا۔ شاید عمومی چیکنگ، اس نے سر ہلا کر مرسیڈیز کچے میں اُتار کر روک دی۔ کراؤن، مرسیڈیز کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔

''مسٹر یوجین؟'' عورت نے کہا۔

''اِل یوجین، یس۔'' اس نے مرسیڈیز کا دروازہ کھولا۔ اس کی عمر تیس سال تھی۔ قد بت عام سا تھا۔ ''میم، کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''سر، آپ کے پانچ منٹ درکار ہیں۔ ایف بی آئی اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہمارے ساتھ ہے۔'' عورت نے عقب میں اشارہ کیا۔ ''وہ آپ سے کچھ ضروری بات کریں گے۔''

یوجین نے گھڑی دیکھی۔ ''میرا ایک اپائنٹمنٹ ہے۔''

''صرف پانچ منٹ......''

''او کے، کہاں؟''

''ادھر چیک پوائنٹ ہے۔ آپ ہمارے ساتھ بیٹھ جائیں، ہم واپس یہیں چھوڑ دیں گے۔''

یوجین نے شانے اچکائے۔ وہ اگلی نشست پر، عورت اور سفید فام عقبی نشست پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے گاڑی گھمائی اور پچپن کی رفتار سے اس کچے موڑ پر پہنچا جو زیرِ استعمال نہیں تھا۔ ایسے کتنے ہی ویران موڑ جابجا نظر آتے تھے۔ جھاڑیاں، پتھر، بڑے چٹان نما پتھر، پہاڑی صحرائی...... چرند پرند۔ ٹیکساس کی ریاست وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ تقریباً سات لاکھ کلو میٹر۔ وہ مخصوص موڑ کراؤن کے ڈرائیور نے تیس منٹ پہلے تلاش کیا تھا۔ وہ بائیں مڑا۔ کراؤن ہچکولے کھانے لگی۔ رفتار کم کر کے اس نے وائیں جانب رخ کیا اور گاڑی ایک قد آور نیم خشک جھاڑی کے پیچھے روک دی۔ یوجین کو خطرے کا احساس ہوا۔ عقب سے عورت نے ہینڈ گن اس کی گردن پر رکھ دی۔

''خاموش بیٹھے رہو۔''

ڈرائیور اتر کر پسنجر ڈور کی طرف آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گن نظر آرہی تھی۔ دروازہ کھول کر اس نے یوجین کو باہر نکالا۔ یوجین باہر نکلا تو تین عدد آتشیں ہتھیار اس کے سر سے لگے تھے۔ ان کے کہنے کے مطابق اس نے چند قدم بڑھائے اور کراؤن سے دور آگیا۔ قبل اس کے، وہ کچھ کہتا...... عورت نے اوپر تلے فائر کیے۔ ایک دائیں آنکھ میں دوسرا بائیں آنکھ میں۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر نیچے گر گیا۔ عورت نے اس کے گرد چکر لگایا پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بغور جائزہ لیا۔ ''او کے۔'' وہ بولی۔

دونوں آدمیوں نے لاش کی ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹتے ہوئے دریافت شدہ دراڑ تک لے گئے۔ سوراخ نما دراڑ آٹھ فٹ گہری اور ڈیڑھ فٹ چوڑی تھی۔

دونوں نے مل کر اس طرح لاش کو اندر کیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اندر اتر جائے۔ گدھ اور دیگر مردار خوروں کا خطرہ کم ہو گیا تھا۔ پھر بھی دونوں نے ایک وزنی پتھر لڑھکا کر سوراخ کے منہ پر ڈال دیا۔ جھاڑی کی شاخ سے انہوں نے خون کے اور جوتوں کے نشانات صاف کیے اور کراؤن میں بیٹھ گئے۔

☆☆☆

دونوں سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے ڈائننگ ہال میں بیٹھے تھے۔ ریچر نے کونے کا بوتھ منتخب کیا تھا۔ کارمن نے آئس کافی منگوائی اور ریچر نے ہاٹ اینڈ بلیک کا آرڈر دیا۔ اس نے پہلی مرتبہ روبرو کارمن کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں گہری سیاہ تھیں۔ پلکوں کی گھنی سیاہ جھالر آنکھوں پر سایہ فگن تھی۔ گہرے سیاہ بال اور تراشیدہ ہونٹ۔ جلد ہموار اور بے داغ تھی۔ رخسار کی ہڈیاں ابھری ہوئی...... ریچر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

کارمن نے اپنا احوال بتانا شروع کیا۔ درمیان میں ریچر گاہے گاہے سوالات کرتا جا رہا تھا۔ کارمن کی بیٹی چھ برس کی تھی۔ اس کا نام میری ایلن تھا۔ وہ وہاں کے قدیم رہائشی تھے۔ وہ کارمن کی بیٹی کو ایلی کہہ کر پکارتے تھے۔ دونوں کی شادی کو تقریباً سات سال ہو گئے تھے۔ کارمن اور اس کے شوہر کی فیملی کے درمیان ہم آہنگی پیدا نہ ہوسکی۔ وہ پرانی طرز کے ٹیکسن تھے۔ خاصی دولت تھی اور بڑا حصہ ضائع ہو گیا تھا۔ تاہم اب بھی وہ متمول افراد میں شمار ہوتے تھے۔ دولت کی تاریخ میں مویشیوں اور تیل کا بڑا حصہ تھا۔ سسر کا انتقال ہو گیا تھا۔ ساس اور دو بیٹے زندہ تھے۔ بڑا بیٹا سلوپ گریر کارمن کا شوہر ہے۔ چھوٹے کا نام پاٹ رابرٹ ہے لیکن، لوگ اسے بوبی کہتے ہیں۔

''میں سلوپ سے کیلی فورنیا میں ملی تھی۔ ہم اکلا (UCLA) میں ساتھ پڑھتے تھے۔ میری بیٹی، مجھ سے مختلف تھی۔ بہت خوب صورت۔ سونے جیسے بال، گلابی جلد...... ہاں آنکھیں میری جیسی تھیں۔ کبھی مجھے سلوپ سے محبت تھی۔ وہ ہینڈسم، قد آور مرد تھا۔ مسکراتا بہت تھا۔ ہم جوان تھے، پڑھ رہے تھے، کیلی فورنیا میں تھے۔ جہاں کچھ بھی ممکن ہے۔

''یہ بتانا ضروری ہے کہ میرا تعلق میکسیکو سے نہیں تھا۔ میں بہت دور ''ناپا'' سے آئی تھی۔ وہاں، ہم شروع سے رہائش پذیر تھے اور وہاں کی چند متمول ترین فیملیز میں ہمارا شمار ہوتا تھا۔ لہٰذا مجھے کچھ پریشانی تھی کہ شادی پر میری فیملی کیا سوچے

گی کہ میں کس گرینگو سے شادی کر رہی ہوں......اور واقعی وہ بہت برہم ہوئے۔ اس دوران میں حاملہ ہوگئی تھی۔ اس امر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ روایت پسند تھے۔ انہوں نے مجھ سے ترکِ تعلق کر لیا۔ ہم نے شادی کر لی۔ چند مہینے بعد گریجویشن مکمل کی۔ پھر میری ایلین پیدا ہوئی۔ تاہم سلوپ کا ارادہ ملازمت کا نہیں تھا۔ وہ واپس جا کر باپ کا کاروبار سنبھالنا چاہتا تھا۔ میرے سسر نے اس وقت تک ریٹائرمنٹ کا عندیہ دے دیا تھا۔ مجھے یہ خیال پسند نہیں آیا۔ میں چاہتی تھی کہ ہم نئی جنریشن کے ساتھ اپنے بَل پر ایک نیا آغاز کریں۔ اس مسئلے پر ہمارے درمیان بحث ہوگئی۔ میں اپنی فیملی سے علیحدہ تھی۔ میرے پاس رقم نہیں تھی۔ جلد ہی کرایہ بھی دینا مشکل ہوگیا۔ اس طرح سلوپ جیت گیا اور ہمیں ٹیکساس آنا پڑا۔ یہ لوگ دقیانوسی اور ناخواندہ سوچ کے حامل تھے۔ مختصر یہ کہ تب سے میں یہیں ہوں۔

"یہ میرے لیے کسی شاک سے کم نہیں تھا۔ کہاں میں ایک شہزادی کی طرح زندگی گزار رہی تھی اور کہاں میں اب ایک بے قیمت استعمال شدہ ٹشو کے مانند تھی۔ انہوں نے زبان سے کبھی مجھے کچھ نہیں کہا۔ لیکن میں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کی شائستگی میں طنز و تشنیع کی اذیت ناک چبھن تھی۔ ان کے ڈارلنگ بیٹے کے لیے میں ایک طوائف کے مانند تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جلد یا بدیر سلوپ مجھ سے جان چھڑا لے گا اور اس کا بہتر طریقہ تھا کہ وہ مجھے فروخت کر دے۔"

"لیکن اس نے ایسا نہیں کیا؟" ریچر نے کہا۔

کارمن نے میز کی سطح کو دیکھا۔ "نہیں، اس نے ایسا نہیں کیا۔ لیکن اس نے مجھے تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ پہلی مرتبہ اس نے میرے منہ پر گھونسا مار کے دانت توڑ دیے تھے۔ تاہم فوراً بعد اس نے شرمندگی کا اظہار کیا اور مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس دوران وہ مجھ سے معافی مانگتا رہا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں یہ بات کسی کو نہ بتاؤں۔ میں رضامند ہوگئی لیکن ایک ہفتے بعد اس نے پھر مار پیٹ شروع کر دی۔ وہ بہانے بہانے سے تشدد کرتا۔ اس دوران اس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ وہ بہتر آدمی تھے۔ اب وہی سب کچھ تھا، میں اس کی فیملی کو بتا بھی نہیں سکتی تھی اور اس کا فائدہ بھی کچھ نہیں تھا۔ عجیب بات تھی کہ وہ محبت کی اداکاری بھی کرتا رہا۔ اس نے فیملی میں کہا کہ مجھے گھوڑے پسند ہیں اور اس نے مجھے گھوڑے دلا دیے۔ وہ مجھ پر تشدد کرتا تو سمجھا تا کہ گھوڑے سے گرنے کا بہانہ کر دینا۔ روڈیو میں چوٹیں لگتی ہیں، ہڈیاں بھی ٹوٹ جاتی ہیں......"

"اس نے تمہاری ہڈیاں توڑیں؟"

"ہاں، میرا بایاں بازو، ہنسلی کی ہڈی، جبڑا...... میرے تین دانت مصنوعی ہیں۔"

"تم اس جہنم میں کیوں رہ رہی ہو؟ بھاگ کیوں نہیں جاتیں؟"

"اگر میں ایلی کو چھوڑ پاتی تو میں چلی جاتی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں ایلی کو چھوڑ دوں تو وہ مجھے جانے دے گا۔ کرایہ بھی دے گا اور میری پسند کی جگہ پر بھی پہنچا دے گا لیکن میں یہ نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا اس کا رویہ بد سے بدتر ہوتا گیا۔"

ریچر نے گہری نظر سے کارمن کا جائزہ لیا۔ ہنسلی کی ہڈی کی گرہ اس نے دیکھ لی۔ تاہم اور کوئی خاص بات اسے نظر نہیں آئی۔ "علامات نظر نہیں آتیں کہ وہ کئی سال تک تمہارے ساتھ مار پیٹ کرتا رہا ہے۔" ریچر نے سوال اٹھایا۔

"تقریباً ڈیڑھ سال قبل یہ سلسلہ ختم ہوگیا تھا۔" کارمن نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اسے جیل ہوگئی تھی۔"

☆☆☆

کیڈی لاک کا رخ پیکو کاؤنٹی کی طرف تھا۔ جنوب کی سمت، سنسان سڑک، دوپہر کا وقت۔ سورج عین سر پر تھا۔ سڑک کے اطراف میں کہیں کہیں بِل بورڈ، موٹیلو نظر آجاتے تھے۔

کارمن نے ریچر کی طرف دیکھا۔ "تم نے میری باتوں پر یقین نہیں کیا؟"

ریچر نے اس کی طرف دیکھا۔ ماضی میں وہ خود تیرہ سال تفتیشی کام کرتا رہا تھا۔ وہ کسی بات پر اتنی آسانی سے قائل نہیں ہوتا تھا۔ یہ اس کی فطری جبلت بھی تھی۔

"اسے جیل ہوگئی تھی۔ تم پر تشدد کی وجہ سے؟"

"ٹیکساس میں؟" وہ ہنس پڑی۔ "ٹیکساس میں کوئی شریف آدمی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ اور مجھ جیسی "طوائف" اگر یہ دعویٰ کر دے تو الٹا مجھے لاک اَپ میں نظر بند کر دیا جائے گا۔"

"پھر کس وجہ سے جیل کی نوبت آئی؟"

"وفاقی ٹیکس میں ہیر پھیر۔ اس نے میکسیکو کے ساتھ آئل ٹریڈ میں بہت دولت کمائی اور IRS کو نظر انداز کر

دیا۔ ایک دن وہ پکڑ میں آ گیا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ جیل کی نوبت نہ آئے۔ کوئی ایسا سمجھوتا ہو جائے کہ IRS کو رقم واپس مل جائے۔ لیکن سلوپ اڑا رہا۔ دولت فیملی ٹرسٹ کی آڑ میں تھی۔ کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ پاگل ہو گئے۔ قتل کرنے سے رقم نہیں ملتی۔ لہٰذا وہ عدالتی کارروائی پر مجبور ہو گئے۔'' کارمن نے تفصیل بتائی۔ ''ایک وکیل سلوپ کا بہترین دوست تھا، اسکول کے زمانے سے۔ ایک اور پیکو کاؤنٹی کا ڈی اے تھا۔ اسے تین سے پانچ سال کی سزا ہوئی۔ کم سے کم بھی تین سال......''

رچرڈ خاموش رہا۔ وہ سامنے سے آنے والے ٹرک کو دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر بعد کوئی گاڑی نظر آئی تھی۔

''اسے کہاں رکھا گیا ہے؟''

''ایبلسن۔'' کارمن نے جواب دیا۔

''IRS (انٹرنل ریونیو سروس) کو کیسے معلوم ہوا تھا؟''

''ان کو میں نے اشارہ دیا تھا۔'' کارمن نے رک کر جواب دیا۔

کچھ دیر بعد رچرڈ گویا ہوا۔ ''تمہیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ کسی بڑے شہر میں۔ وہاں مختلف قسم کے فلاحی ادارے ہوتے ہیں......''

''وہاں میں کیسے پہنچوں گی؟''

''جہاز، ٹرین، بس......دو، ون وے ٹکٹس۔''

''ڈالر کے نام پر میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''پیسے نہیں ہیں......اور ڈریس؟''

''میل آرڈر۔'' وہ بولی۔ ''سلوپ کے وکیل نے چیک سائن کیا تھا جس سے میں نے یہ ڈریس خریدا تھا۔''

''ہیرا بیچ دو۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''کوشش کی تھی۔'' یہ جعلی ہے۔ اسٹیل اور زرکونیم۔ جوہری بھی مذاق اڑا رہا تھا۔ تیس ڈالر قدر ہے اس کی۔''

''گھر سے کچھ رقم چرا لو۔''

''میری حیثیت دہرے مفرور کی بن جائے گی۔ ایلی کا قانونی مسئلہ بھی سدِراہ ہے۔ اس کا باپ سلوپ ہے۔ وکلا پہلے بھی مجھے تنبیہ کر چکے ہیں کہ اگر میں نے ایلی کو لے کر ٹیکساس کی لکیر کراس کی تو میری شناخت اغواکار کی بن جائے گی۔ اس کے لیے سلوپ کی رضامندی ضروری ہے......جلد یا بدیر وہ ایلی کو مجھ سے چھین لیں گے اور مجھے جیل میں ڈال دیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ ٹیکساس میں رہو لیکن ڈلاس چلی جاؤ۔''

''میں ٹیکساس میں نہیں رک سکتی۔ یہ آسان نہیں ہے۔ اس کی ماں میری نگرانی کر رہی ہے۔''

''پھر کیا حل ہے......تم نے ڈیڑھ سال ضائع کر دیا۔''

کارمن کے کچھ کہنے سے پہلے ڈیش بورڈ سے بیپ کی آواز آئی اور نارنجی بتی جل اٹھی۔

''فیول ختم ہو رہا ہے۔'' کارمن نے کہا۔

''میں نے پیچھے ایکسون کا بل بورڈ دیکھا تھا۔ آگے کچھ اور جانے کے بعد تمہیں فیول مل جائے گا۔''

''ادائیگی کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔'' کارمن نے کہا۔

رچرڈ خاموش رہا۔

کارمن نے ہاتھ بڑھا کر عقبی نشست سے ہینڈ بیگ اٹھایا اور رچرڈ کی گود میں ڈال دیا۔ ''دیکھ لو۔''

''میں خواتین کے بیگ نہیں کھنگالتا۔''

''میری خواہش ہے......'' وہ بولی۔

رچرڈ نے زپ کھینچ کر بیگ الٹا کر دیا۔ پرفیوم کی خوشبو اور میک اپ کا سامان۔ ہیئر برش، نیل کٹر، والٹ، ڈرائیونگ لائسنس......والٹ میں سے ڈالر کا ایک عدد نوٹ برآمد ہوا۔ کریڈٹ کارڈ بھی نہیں تھا۔ والٹ میں ایک پلاسٹک فریم تھا جس کے پیچھے ایک خوب صورت بچی کی تصویر تھی۔

''ایلی۔'' کارمن نے کہا۔

''کیوٹ!'' رچرڈ بچی کو دیکھتا رہا۔ ''کارمن رات تم کہاں سوئی تھیں؟''

''کار میں۔'' اس نے فیول بچانے کے لیے رفتار کم کر دی۔

''تم نے مجھے لفٹ دی تھی۔ بدلے میں، میں فیول ڈلوا دیتا ہوں۔''

''اوکے۔'' کارمن نے رفتار بڑھا دی۔

اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ''کار روک دو۔''

''کیوں؟''

''روک دو۔''

کارمن نے الجھن زدہ نظروں سے اسے دیکھا اور گاڑی ایک طرف روک دی۔ رچرڈ نے سیٹ بیلٹ کھول دی۔

"تم نے کیا پہنا ہوا ہے؟"
"کیا؟ کیا کر رہے ہو؟"
"مجھے بتاؤ۔ تم نے کیا پہنا ہوا ہے؟"
کارمن کے چہرے پر سرخی نمودار ہوئی۔ "یہ لباس......اور انڈر ویئر......اور جوتے۔"
"اپنے جوتے دکھاؤ۔"
کارمن نے چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد جوتے اتار کر اس کے حوالے کر دیے۔
ریچر نے احتیاط سے جوتوں کو چیک کیا اور واپس کر دیے پھر اپنی قمیص اتار کر کارمن کو دے دی۔ "میں گاڑی سے اُتر رہا ہوں۔ اپنے تمام کپڑے اتار کر سیٹ پر رکھ دو اور یہ شرٹ پہن لو۔ اور باہر آجاؤ۔"
"کیوں؟"
"تمہیں میری مدد چاہیے تو وہی کرو، جو کہہ رہا ہوں۔"
وہ کار سے اتر کر کچھ دور چلا گیا۔ سورج اس کے برہنہ شانوں کو جھلسا رہا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اس کی قمیص پہن کر گاڑی سے باہر آگئی تھی اور تپتی زمین پر بار بار قدم بدل رہی تھی۔
"اپنے جوتے پہن لو۔" ریچر نے کہا۔ کارمن نے جلدی سے جوتے پہن لیے۔
"اب گاڑی سے دور ہو جاؤ اور انتظار کرو۔" اس نے نئی ہدایت جاری کی۔
وہ دس قدم دور چلی گئی اور ریچر گاڑی میں واپس آگیا۔ اس نے دوبارہ بیگ دیکھا پھر بریف کیس چیک کرنے کے بعد لباس کو کھنگالا۔ اس کے بعد نشست، نشستوں کے نیچے، ہڈ، کارپٹ کے نیچے، فینڈر......ٹرنک، بیس منٹ تک اس نے خوب جانچ کی۔
"اوکے، واپس آجاؤ......کپڑے پہنو اور میری قمیص واپس کر دو۔"
"یہ سب کیا تھا؟" کارمن نے کپڑے بدل کر سوال کیا۔
"ہاں اب مجھے یقین آگیا ہے اور میں تمہاری مدد کروں گا......واقعی تمہارے پاس رقم نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے اور کوئی گھر سے تین سو میل دور نہیں آسکتا جبکہ اس کے پاس رقم کے ساتھ ضروری لوازمات نہ ہوں۔ کوئی یہ ایڈونچر اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ حقیقتاً مصیبت میں ہو۔ اب تمہارے پاس ایک سال بچا ہے۔ ایک سال بہت ہے۔ تم ملین کلومیٹرز دور جاسکتی ہو اور نئی زندگی شروع کر سکتی ہو۔"
"لیکن میری مجبوریاں؟"
"دور ہو جائیں گی۔" ریچر نے سکون سے کہا۔

☆☆☆

ریچر نے کیڈی لاک میں بیس گیلن سے زیادہ ایندھن بھروایا۔
"فیاضی کا شکریہ، سینور۔" کارمن نے کہا۔
"میری خوشی ہے سینوریٹا۔"
"تم اسپینش بول سکتے ہو؟"
"ٹوٹی پھوٹی درجنوں زبانیں بول لیتا ہوں لیکن فرنچ بہ آسانی......کیونکہ میری ماں کا تعلق فرانس سے تھا۔"
"یعنی تم آدھے غیر ملکی ہو؟"
"کبھی لگتا ہے......آدھے سے بھی زیادہ۔"
"لیکن تمہیں "سینوریٹا" کی جگہ "سینورا" کہنا چاہیے تھا۔ کیونکہ میں شادی شدہ ہوں۔" وہ مسکرائی۔
جواباً ریچر بھی مسکرایا۔ ایک میل تک دونوں خاموش رہے۔ معاً کارمن نے گہری سانس لی۔ "اوکے، ایک اور مسئلہ ہے......میرے پاس ایک سال بھی نہیں بچا ہے۔"
"وہ کیوں؟"
"ایک ماہ قبل ایک وکیل گھر آیا تھا۔ ٹیبل پر کوئی ڈیل ہوئی تھی۔ پوری بات مجھے نہیں معلوم۔ لگ ایسا رہا ہے کہ سلوپ کے دوست جو تیل کے دھندے میں اس کے ساتھ ملوث تھے، وہ مل کر رقم ادا کریں گے اور بدلے میں سلوپ کو وقت سے پہلے رہائی دلائی جائے گی۔ اس کے دوست ڈپٹی اٹارنی کے دفتر میں بروکرنگ کر رہے ہیں۔"
"بُری خبر ہے۔" ریچر نے کہا۔ "پھر کتنا وقت ہے؟"
"ویک اینڈ پر مشکل ہے۔ پیر کے دن یا اگلے ہفتے کسی دن وہ باہر ہوگا۔" کارمن نے جواب دیا۔ "میری غلطی ہے، میں نے بہت وقت ضائع کیا اور اب گویا پنجرے میں بند ہو چکی ہوں۔"
"ڈیل کی نوعیت کیا ہے؟"
"میں تفصیل سے لاعلم ہوں۔" اس کی آواز گھٹ گئی۔
"جیل یاترا، مجرم کو اور بگاڑ دیتی ہے۔ صورتِ حال مزید ابتر ہو گئی ہے۔"
"میں جانتی ہوں۔" اس نے بے بسی کا اظہار کیا۔
ریچر نے مختلف سوالات کیے۔ ان میں طلاق کا پہلو بھی شامل تھا۔ تاہم کوئی نتیجہ خیز حل برآمد نہیں ہوا۔ کارمن چڑیا کے مانند سلوپ کے پنجوں میں پھنس چکی تھی۔ ٹیکساس سے نکل سکتی تھی، نہ وہاں رک سکتی تھی۔

''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ بھاگنے میں تمہاری مدد کروں؟''

وہ خاموش رہی۔ ریچر سوچ رہا تھا۔ روڈ پورائڈرز، پیشہ ور بدمعاش اس کے پیچھے لگ جائیں گے۔ لیکن بڑا خطرہ فیڈرل ایجنٹ تھے۔

''واپس چلو، پہلے ایلی کو اٹھاؤ۔ پھر ہم سیدھے ویگاس جائیں گے۔''

''پھر؟''

''نئی شناخت حاصل کریں گے۔ پھر تم لاس اینجلس جاؤ اور نئے کاغذات تیار کرو۔ میں کچھ رقم تمہیں دے دوں گا۔''

''نہیں، میں مفرور نہیں بن سکتی۔ غیر قانونی زندگی بھی نہیں گزار سکتی۔ ایلی کے لیے بھی یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''ہاں، ایلی بہتر زندگی کی حق دار ہے...... لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا...... پھر کیا منصوبہ ہے تمہارا؟''

''میرا پلان تم ہو۔'' کارمن نے یاسیت کے ساتھ کہا۔

''تم چاہتی ہو کہ میں تمہارا باڈی گارڈ بن جاؤں؟''

کارمن خاموش رہی۔

''کارمن آئی ایم سوری...... یہ صورتِ حال گمبھیر ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں چوبیس گھنٹے، سات دن...... تمہاری حفاظت کروں؟''

کارمن خاموش رہی۔

''میرا کوئی اسکرو ڈھیلا ہے شاید...... میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ لیکن زیادہ دن ایک جگہ رکنا میرے لیے محال ہے۔ میرا دماغ پوری طرح سیٹ ہوتا تو آوارہ گردی اور تنہائی کے بجائے آرمی میں ہی ہوتا...... کب تک رکوں گا؟ سال، پانچ...... دس سال؟''

''مجھے باڈی گارڈ نہیں چاہیے۔'' بالآخر وہ بول اٹھی۔

''پھر کیا چاہتی ہو؟''

''ریچر، میں اسے مردہ دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اس کی آواز بلند ہوگئی۔ ''یہی ایک راستہ ہے...... واحد حل۔''

ریچر نے نفی میں سر ہلایا اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔

''بھول جاؤ...... یہ اب وائلڈ ویسٹ نہیں رہا۔''

''میں نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا پھر مجبور ہو کر کسی نہ کسی طرح ایک گن خرید لی۔ لیکن مجھے شک ہے کہ میں کامیاب ہو جاؤں گی اگر ہو بھی گئی تو ایلی کا کیا بنے گا؟''

''کارمن تم نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔''

''کیوں؟ تم نے آرمی میں بڑے افراد کو ہلاک کیا ہے۔''

''وہ ایک مختلف منظر نامہ تھا۔ یہ سیدھا سادہ قتل ہے جس آدمی کو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ میں اسے قتل کر دوں؟'' میں کرائے کا قاتل نہیں ہوں۔''

''وہ مجھے مارتا ہے، قہقہے لگاتا ہے، لطف اندوز ہوتا ہے۔ میری زندگی خوف کے سائے میں گزر رہی ہے۔ وہ ایلی کو مجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔''

''شیرف کے پاس جاؤ۔''

''وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ یقین ہی نہیں کرے گا۔ سلوپ اور اس کے گماشتوں سے سب ڈرتے ہیں۔ تمہیں یہاں کے حالات کا علم نہیں ہے۔''

ریچر خاموش رہا۔

''تم میری آخری امید ہو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اگر تمہاری گرل فرینڈ کو کوئی تشدد کا نشانہ بناتا تو تم اسے ختم کر دیتے۔''

''ہاں میں ایسا ہی کرتا۔'' اس نے سوچا۔

''کیا نام تھا تمہاری گرل فرینڈ کا؟''

''جوڈی گاربر۔''

''کوئی ذہنی مریض، اذیت پسند بار بار اسے ٹارچر کرتا تو تم کیا کرتے؟''

''میں اسے ختم کر دیتا۔'' ریچر نے پھر دل میں کہا۔

کارمن نے سر ہلایا، جیسے اس نے ریچر کے خیالات پڑھ لیے ہوں۔

''لیکن تم میرے لیے یہ نہیں کر سکتے۔ انسانیت کے نام پر بھی نہیں۔ کیا سلوپ مجرم نہیں ہے؟''

''میں جوڈی کو جانتا تھا...... تمہیں نہیں جانتا۔''

''ٹھیک ہے، جان جاؤ...... چند روز ہیں۔ ایلی سے ملو۔ ہمیں جاننے کی کوشش کرو۔ میرے لیے نہیں تو اس معصوم کے لیے کچھ کرو۔''

ریچر خاموش رہا۔

''ریچر تمہیں کیا چاہیے؟ سیکس...... ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔''

''کار روک دو۔'' وہ اچانک بولا۔ ''بہت ہوگیا۔''

کارمن کا پیر بریک پر چلا گیا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ باہر خاصی گرمی تھی۔ اس نے زور سے دروازہ بند کیا اور مخالف سمت میں چل پڑا۔ بیس قدم جانے کے بعد ہی قمیص پسینے سے تر ہونے لگی۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ ٹمپریچر

112 ڈگری تھا۔ اس نے پچاس قدم طے کر لیے۔ اس کے پاس پانی بھی نہیں تھا۔ اس نے انگوٹھا بلند کیا۔ تاہم کوئی لفٹ دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ صورتِ حال نا مساعد تھی۔ اس نے دیکھا کہ کیڈی لاک کچے راستے پر ریورس میں اس کی طرف آ رہی تھی۔ قریب پہنچ کر کارمن نے شیشہ نیچے کیا۔
''آئی ایم سوری۔'' اس نے معذرت کی اور ریچر اندر بیٹھ گیا۔

اس نے پھر معذرت کی، اسے سیکس کی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ''ایک ماہ میں کئی افراد نے ایسی خواہش کی تھی...... میں سمجھی......'' وہ چپ ہو گئی۔ خجالت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

''تم سمجھی تھیں کہ سیکس کے بعد وہ تمہارے شوہر کو مار دیتے؟'' ریچر کی آواز میں ہلکا سا طنز تھا۔

''میرے پاس آفر کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔'' کارمن نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں تمہیں چھوڑ دیتی ہوں۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' اس نے کہا۔
''مجھے افسوس ہے کہ تم ایسی ناگوار صورتِ حال میں پھنس گئی ہو۔ خواہ مخواہ کسی آدمی کو مارنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ میں کر سکتا ہوں، کسی اور طریقے سے۔ اگر تم اب بھی چاہتی ہو کہ میں ایسا کروں۔''
کارمن نے کچھ سیکنڈ بعد کہا۔ ''ہاں، مجھے تمہاری مدد چاہیے۔''

☆☆☆

''تم ظاہر کرنا کہ تمہیں کام کی ضرورت ہے اور تم گھوڑوں کی دیکھ بھال کر سکتے ہو۔'' کارمن نے اسے سمجھایا۔ وہ واپس ایکو کاؤنٹی جا رہے تھے۔ کاؤنٹی کا علاقہ گویا وسیع بنجر زمین پر تھا۔ دو سڑکیں وہاں ایک دوسرے کو کاٹ رہی تھیں۔ سڑکوں کے قریب محدود تعداد میں کاؤنٹی کے مکانات تھے۔ کراس روڈ کے ساتھ ایک پتلی سڑک پر بس ڈولتی نظر آ رہی تھی۔ ''وہ اسکول بس ہے۔ ہمیں اسے اوورٹیک کرنا ہے۔ ورنہ ایلی بس میں گھر چلی جائے گی۔'' کارمن نے کیڈی لاک کی رفتار میں اضافہ کیا۔

پانچ منٹ بعد وہ کراس روڈ پر تھے۔ شمال مغرب میں ڈائننگ ہال تھا۔ اس کے سامنے ترچھے زاویے پر اسکول تھا۔ جنوب مغرب میں گیس اسٹیشن تھا۔ قریب ہی چار مکانات اور تھے، تاہم وہ سنسان اور کباڑ خانوں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ کارمن اسکول کے پاس سے گزری اور یوٹرن لے کر واپس آئی۔ گاڑی اس نے اسکول کے پاس روک دی۔ بس شمال کی جانب سے ڈولتی آ رہی تھی۔ ٹیچر نے اسکول کا گیٹ کھولا۔ ریچر نے گنتی کی۔ سترہ بچے برآمد ہوئے تھے۔ ایلی کو اس نے بہ آسانی پہچان لیا۔ وہ تصویر سے زیادہ خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ کارمن نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا کر گول چکر دیا۔ ریچر نے بچی کو ہنستے دیکھا اور کارمن کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھ لیے۔ وہ اسے لے کر گاڑی تک آئی اور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اندر آتے ہی ایلی کی نظر ریچر پر پڑی اور وہ ساکت ہو گئی۔

''مسٹر ریچر، میرے دوست ہیں، ہیلو کہو۔''
''ہیلو۔'' ایلی نے کہا۔

ریچر نے جواب دیا اور کہا۔ ''ایلی پیچھے آ جاؤ، تمہاری ماما دھوپ میں کھڑی ہیں۔ ایلی پچھلی نشست پر چلی گئی اور کارمن نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر دروازہ بند کر دیا۔

''ماما بہت گرمی ہے۔ ہمیں آئسکریم سوڈا لینا چاہیے۔'' ایلی نے فرمائش کی۔

ریچر نے رضامندی سے کارمن کو دیکھا۔ کارمن نے عقب میں بیگ کی طرف نظر ڈالی۔ جہاں والٹ میں فقط ایک ڈالر پڑا تھا۔
''گڈ آئیڈیا۔'' ریچر بول اٹھا۔ ''یہ ٹریٹ میری جانب سے۔''

چند منٹ بعد کیڈی لاک، ڈائننگ ہال کی پارکنگ میں تھی۔ کیڈی لاک کے ساتھ صرف ایک کار کھڑی تھی۔ نیلی کراؤن وکٹوریا۔ ریچر نے سوچا کہ اسٹیٹ ٹروپر ہوں گے یا شاید رینٹل کمپنی کی کار۔ اس پر کوئی نشان نہیں تھا۔ انہوں نے اندر قدم رکھا۔ وہاں بھی ویرانی سی تھی۔ صرف تین افراد کا ایک گروپ موجود تھا۔ دو مرد اور ایک عورت۔ تینوں عام سے افراد تھے۔ ایک سیاہ بال، دوسرا سفید فام۔ عورت میں بھی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اگرچہ وہ ایک حد تک پُرکشش تھی۔ اس کا مطلب کراؤن کا تعلق قانونی اداروں سے نہیں تھا۔ وہ کرائے کی کار تھی اور وہ تینوں کسی سیلز ٹیم کے نمائندے لگ رہے تھے۔ ریچر نے نظر ہٹالی۔ وہ کارمن کے ہمراہ مخالف سمت کے بوتھ کی جانب آ گیا۔

ان کے بیٹھتے ہی ویٹرس پیڈ اور پنسل کے ساتھ آ گئی۔ کارمن نے آرڈر لکھوایا۔ اس دوران ایلی، ریچر سے باتیں کرتی رہی۔ وہ خاصی بولڈ تھی۔ ریچر نے اندازہ لگایا کہ بچی کے ساتھ وہ جلد ہی بے تکلف ہو جائے گا۔
ویٹرس ان کا آرڈر لے کر آئی تو ریچر نے دیکھا کہ

کراؤن کی ٹیم جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ پارکنگ سے کراؤن وکٹوریا غائب تھی۔ کارمن کے گھر کی طرف جاتے ہوئے ریچر نے مختلف رینچ دیکھے۔ آئل پمپ بھی جابجا نظر آئے۔ ہر دس پندرہ میل پر ایک رینچ اور اس کا نام بھی موجود تھا۔ مشرقی سمت قدرے بہتر تھی۔ اس طرف گھاس کے قطعات بھی نظر آرہے تھے۔

''گریر کی اراضی یہاں سے شروع ہوتی ہے۔'' کارمن نے بتایا۔ ''اس کا رقبہ آٹھ میل پر محیط ہے۔''

گیٹ سے اندر جانے کے بعد ریچر نے دومنزلہ بڑی اور قدیم عمارت دیکھی۔ اس کے اطراف میں شیڈ اور باڑے بنے ہوئے تھے۔ ہر شے پر سرخی مائل رنگ کیا گیا تھا۔ دوسری منزل کی پیشانی پر ''ریڈ ہاؤس'' لکھا ہوا تھا۔

''جہنم میں خوش آمدید۔'' کارمن نے سرگوشی کی۔

لال مکان کے سامنے شیوی کیپرائس کھڑی تھی۔ اس کا رنگ سیاہ اور سفید تھا۔ شیوی کے دروازے پر ایکو کاؤنٹی شیرف لکھا تھا۔ گاڑی خالی تھی۔

''ماما، کسی نے شاید میری گھوڑی چرالی ہے......''

کارمن سیٹ بیلٹ کھول کر باہر آگئی۔ ریچر نے بھی اس کی تقلید کی اور اس کے قریب کھڑا ہوگیا۔ معاً لال مکان کا دروازہ کھلا اور ایک وردی پوش برآمد ہوا جو یقیناً شیرف تھا۔ اس کی عمر ساٹھ کے قریب تھی۔ وہ موٹاپے کا شکار تھا۔ گن بیلٹ کے ہولسٹر میں ریوالور لٹک رہا تھا۔ اس کا رخ شیوی کی جانب تھا لیکن کارمن کی موجودگی کو محسوس کرکے اس نے رخ بدل لیا۔

''مسز گریر۔''

''کیا معاملہ ہے؟'' کارمن نے سوال کیا۔

''اندر والے بتا دیں گے۔'' شیرف نے کہا۔ ''میرے لیے اس گرمی میں ہر بات دہرانا ممکن نہیں ہے۔'' اس نے ریچر کو دیکھا۔

''اور تم کون ہو؟''

''اندر والے بتا دیں گے۔'' ریچر نے جواب دیا۔ ''میرے لیے اس گرمی میں ہر بات دہرانا ممکن نہیں ہے۔''

شیرف دس پندرہ سیکنڈ تک ریچر کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر شیوی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ شیوی کے ہٹتے ہی کارمن واپس گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ریچر نے اس کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔

''مسکرا رہی ہو؟''

''ہاں، تم نے اسے کیا جواب دیا تھا۔'' وہ بولی۔

''مجھے بھی گرمی لگتی ہے۔'' ریچر نے کہا۔

کارمن، کیڈی لاک کو پارکنگ نما باڑے میں لے گئی۔ وہاں دو عدد پک اپ اور ایک ''چیروکی'' جیپ کھڑی تھی۔ ایک پک اپ ٹھیک تھی۔ دوسری کے ٹائر بیٹھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ کئی دہائیوں سے وہ غیر استعمال رہی ہو۔ وہاں سے نکل کر وہ مکان کے بیرونی دروازے پر پہنچے۔ کارمن نے دستک دی۔

''تمہیں دستک دینی پڑتی ہے؟''

کارمن نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''انہوں نے کبھی چابی میرے حوالے نہیں کی۔ دروازہ کھلا۔ ایک آدمی وہاں کھڑا تھا۔ اس کی عمر بیس پچیس کے درمیان تھی۔ بڑا سا چہرہ، تن و توش بھی نمایاں تھا۔ ڈینم جین اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔

''بوبی۔'' کارمن نے کہا۔

بوبی کی نظر ریچر پر تھی۔ ''یہ تمہارا دوست ہے؟''

''اس کا نام ریچر ہے۔ کام کی تلاش میں ہے۔''

بوبی نے وقفہ لیا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے، آؤ۔''

اندر ہال وے کا ساز و سامان قیمتی مگر پرانا تھا۔ ریچر نے دیکھا کہ مختلف ریکس میں رائفلیں اور گنز موجود تھیں۔ ان کی تعداد اسے ضرورت سے زیادہ محسوس ہوئی۔ آٹھ کرسیوں والی میز پر سے ایک کرسی پر جو عورت بیٹھی تھی، اس کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔ اس کی نگاہ بھی ریچر پر تھی۔ اس کا انداز جوانوں جیسا تھا۔ اس نے بھی جین پہنی ہوئی تھی۔

کارمن نے ریچر کا تعارف کرایا۔

''کیا کام آتا ہے تمہیں؟'' اس نے براہِ راست ریچر سے سوال کیا۔

''گھوڑوں کی دیکھ بھال کر لیتا ہوں۔''

''میرا نام رسٹی گریر ہے۔ لال مکان میں خوش آمدید...... کام تو مل جائے گا، کیونکہ اصطبل میں ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ ورنہ کارمن تمہیں یہاں تک نہ لے کر آتی۔ ڈھنگ اور ایمانداری سے کام کروگے تو کام چلتا رہے گا۔''

''شکریہ۔''

''شیرف ملا تھا باہر؟'' کارمن نے سوال کیا۔

''سلوپ کا وکیل غائب ہے۔ وہ سلوپ سے ملنے جیل جا رہا تھا۔ وہاں تک پہنچا ہی نہیں۔ ایلن کے جنوب میں اس کی کار ملی ہے۔ کچھ گڑبڑ ہے۔ کار سے کوئی کلیو نہیں ملا۔''

''سلوپ کے کیس کا کیا بنے گا؟'' کارمن نے نارمل انداز میں پوچھا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شیرف کے مطابق ڈیل مکمل ہے۔ سلوپ پیر کو آرہا ہے، یوجین اور اٹارنی ورکر مدد کررہے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔" کارمن زبردستی مسکرائی۔ "وکیل کے ساتھ کیا ہوا؟"

"کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔ کس کی حرکت ہوسکتی ہے...... اگر یہ میکسیکن ہیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں کبھی میکسیکو نہیں گئی۔"

کچھ دیر کے لیے وہاں خاموشی چھاگئی۔

"ایلی کے لیے کھانے کا بندوبست کرو اور مسٹر ریچر کو "بنک ہاؤس" دکھاؤ۔" رسٹی گریر نے کہا۔ ریچر نے محسوس کیا کہ ایلی کے لیے اس کے محبت آمیز لہجے میں مصنوعی پن تھا۔

☆☆☆

بنک ہاؤس خاصا بڑا اور دومنزلہ تھا۔ ریچر، گھوڑوں کو نظرانداز کر کے سیڑھیاں طے کر کے بالائی منزل پر آگیا۔ وہاں آمنے سامنے سولہ بستر لگے تھے۔ آخری سرے پر کونے میں باتھ روم تھا۔ بستروں کے درمیان چوبی فرش پر چوڑی خالی جگہ تھی۔ باتھ روم کے قریب دو بستروں پر دو آدمی لیٹے تھے۔ دونوں کی جسامت باڈی بلڈرز جیسی تھی۔ دونوں سیڑھی کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ ریچر کا سترہ سالہ تجربہ بتاتا تھا کہ جب نئی، اجنبی جگہ پر جانا پڑے تو خاموش رہو اور اپنی جگہ منتخب کر کے دوسروں کو بولنے کا موقع دو۔ اس نے ایک بستر منتخب کیا۔ اس کے پاس ساز و سامان یا بیگ نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ اس نے اپنا فولڈنگ ٹوتھ برش نکال کر بیڈ کی سائیڈ پر رکھ دیا۔ اگرچہ یہ اشارہ ہلکا تھا لیکن یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ یہیں رہے گا۔

ان دونوں میں سے ایک اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"نئے ملازم ہو؟"

"شاید۔"

"میرا نام بلی ہے۔"

"میں جوش ہوں۔" دوسرے نے کہنی کے بل اٹھ کر کہا۔

ریچر نے سر ہلایا۔ "خوشی ہوئی...... میرا نام ریچر ہے۔"

"ہم کھانا باہر بار میں کھائیں گے۔ جنوب میں چند گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ تم ساتھ چل سکتے ہو۔" بلی نے کہا۔

"نہیں ابھی تو مجھے کچھ کمانا ہے۔ اچھا نہیں لگے گا کہ کوئی اور ادائیگی کرے۔"

بلی نے کچھ سوچ کر سر ہلایا۔ "اچھی سوچ ہے۔"

☆☆☆

ملازمہ کھانے کی اشیا لائی تو بلی اور جوش روانہ ہونے والے تھے۔ "ہم باہر کھائیں گے۔" دونوں نے ملازمہ سے کہا اور جواب سنے بغیر نکل گئے۔ ملازمہ اور ریچر خاموش رہے۔

"میں یہیں ہوں، تم آرام کرو۔" ریچر نے کہا۔ "میرا کھانا چھوڑ جاؤ۔"

ریچر اور ملازمہ نے نیچے سے پک اپ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ ملازمہ ان دونوں کا کھانا واپس لے گئی۔

کچھ دیر بعد ریچر خالی برتن لے کر نیچے اتر رہا تھا۔ کچن ڈور تلاش کرنے میں اسے زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ دستک پر ملازمہ نے دروازہ کھولا۔

"میں کچھ دیر بعد آکر لے جاتی۔" ملازمہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"فاصلہ ہے، گرمی ہے...... میں نے سوچا، خود دے آؤں۔"

"میں مشکور ہوں۔ پیٹ بھر گیا؟"

"ہاں، کھانا خوب تھا۔" ریچر نے جواب دیا اور واپسی کے لیے مڑا۔

"ریچر۔" کسی نے آواز دی۔ وہ بوبی تھا۔ بوبی پورچ میں ایک طرف کھڑا تھا۔

"یہاں آؤ۔" وہ بولا۔ "ایک مضبوط گھوڑا تیار کر کے لاؤ۔ میں شام کو سواری کرتا ہوں۔ یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ تم گھوڑوں کے بارے میں کتنا کچھ جانتے ہو، انہیں کیسے تیار کرتے ہو۔"

ریچر کچھ کہے بغیر بنک ہاؤس کی طرف چل دیا۔

وہاں پانچ گھوڑے تھے جبکہ گھوڑوں کے اسٹال پانچ سے زیادہ تھے۔ وہاں نیم تاریکی تھی۔ اس نے ایک اونچے قد کا گھوڑا منتخب کیا اور ایک ہاتھ کی پشت اس کی ناک پر رکھ کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا۔ سب سے پہلے اس نے کمبل (سیڈ کلاتھ) گھوڑے کی پشت پر ڈالا، اس کے اوپر کاٹھی، لگام، رکابیں۔ نعل چیک کیے۔

☆☆☆

بوبی گریر پورچ کی سیڑھیوں پر منتظر تھا۔ اس نے گھوڑے کو چیک کیا۔ "ہوں، بُرا نہیں ہے...... ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

ریچر بنک ہاؤس کی پہلی منزل پر پہنچا تو وہاں کارمن

JBD

# نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

# جہانگیر بکس

91

## آخری معرکہ 550/-

سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

## اندھیری رات کے مسافر 475/-

اُندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی الم ناک داستان

## ثقافت کی تلاش 300/-

نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنھوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

## قیصر و کسریٰ 625/-

ظہورِ اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالاتِ زندگی اور فرزندانِ اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

## اور تلوار ٹوٹ گئی 550/-

شیرِ میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستانِ شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

## گمشدہ قافلے 500/-

انگریز کی اسلام دشمنی، بنیے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز داستان

## داستانِ مجاہد 300/-

فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکۃ الآرا داستان

## پردیسی درخت 450/-

اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنھوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

## یوسف بن تاشفین 500/-

اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

## معظم علی 475/-

لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

## خاک اور خون 550/-

سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

## کلیسا اور آگ 450/-

فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

## قافلۂ حجاز 599/-

راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

## محمد بن قاسم 425/-

عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

## پورس کے ہاتھی 300/-

1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہموں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنھیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

## انسان اور دیوتا 450/-

برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

## پاکستان سے دیارِ حرم تک 300/-

تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

## آخری چٹان 450/-

سیّد خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستانِ شجاعت جو تاتاریوں کے سیلِ رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

## سو سال بعد 225/-

گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

## سفید جزیرہ 325/-

بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

## شاہین 475/-

اُندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

جہانگیر
# اردو لغت
(جامع ترین)

ملفوظی طریقے سے تلفظ کے اندراج کے ساتھ اردو زبان کی پہلی لغت

# سبق آموز کتب سلسلہ
## دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین

- اقوالِ حضرت علی المرتضیٰ 165/-
- اقوالِ آئمہ کرام 165/-
- حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ 195/-
- اقوالِ شیخ سعدیؒ 140/-
- حکایاتِ رومیؒ 180/-
- دلچسپ و عجیب حقائق 170/-
- حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ 199/-

- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں 150/-
- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات 180/-
- بڑے لوگوں کے روشن واقعات 165/-

# جہانگیر بک ڈپو

022-2780128 042-37220879 042-35757086 051-5539609 021-32765086

ہیلو ننھی پری۔'' یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''ایلی تمہیں شب بخیر کہنا چاہتی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ کل تم شہسواری پر ساتھ چلو۔'' کارمن نے کہا۔ سیڑھی پر قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی۔ پھر ایلی کا چہرہ نمودار ہوا۔ وہ سیدھی رچرڈ کی جانب آئی اور ننھا سا ہاتھ بڑھایا۔

''گڈ نائٹ، ایلی۔'' رچرڈ نے نرمی سے اس کا ملائم ننھا ہاتھ تھام لیا۔ ایلی، رچرڈ کی طرف دیکھتی رہی۔ ''تمہیں کس کرنا چاہیے۔'' اس نے کہا۔

''اوکے۔'' رچرڈ جھکا۔

''ایسے نہیں، گود میں اٹھا کے۔'' ایلی نے مطالبہ کیا۔

چند سیکنڈ کا وقفہ دے کر وہ مسکرایا اور ایلی کو اوپر اٹھا لیا۔ ''گڈ نائٹ۔'' رچرڈ نے کس کرنے کے بعد کہا۔

''میں تھک گئی ہوں۔ مجھے کمرے تک چھوڑ دو۔'' ایلی نے دوسرا مطالبہ کیا۔

رچرڈ اسے لے کر نیچے اترا اور پورچ کی سیڑھیوں پر چھوڑ دیا۔

''ماما، مسٹر رچرڈ سے کہو مجھے اندر آ کر گڈ نائٹ کہیں۔''

''میں نہیں جانتی کہ وہ اندر آ سکتے ہیں۔'' کارمن نے کہا۔

''میں یہاں رہتا نہیں ہوں۔ بنک ہاؤس میں کام کرتا ہوں۔''

''وکسی کو معلوم نہیں ہوگا۔ آپ کچن سے آ جاؤ۔ وہاں صرف کھانا بنانے والی ہوتی ہے۔ اور اسے اندر آنے کی اجازت ہے۔'' ایلی نے راستہ دکھایا۔

رچرڈ نے کارمن کو دیکھا، شانے اچکائے اور دونوں کا ہاتھ پکڑ کر کچن کے ذریعے اندر چلا گیا۔

☆☆☆

کچن میں ملازمہ نے ان تینوں کو دیکھا، تاہم خاموش رہی۔

''اس طرف۔'' ایلی نے سرگوشی کی۔ وہ ہال وے میں آئے، پھر اسے کراس کر کے سیڑھیاں طے کیں۔ کوریڈور میں ایلی نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔

''تم ہاتھ منہ دھولو۔ مسٹر رچرڈ یہاں بیٹھے ہیں۔'' وہ دونوں واش روم میں چلے گئے۔ ماں کے پیچھے ایلی واپس آئی اور اپنے بستر پر چلی گئی۔

''اوکے گڈ نائٹ، ننھی پری...... آرام سے سو جاؤ۔''

''وکِس ی۔'' ننھی پری نے مطالبہ کیا۔

رچرڈ نے جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

''دوستی کا شکریہ۔'' ایلی نے کہا۔ ''میں کل ملوں گی۔''

☆☆☆

رچرڈ پورچ کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا جب بوبی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ''بوبی، رائڈ کیسی رہی؟''

بوبی نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔ ''میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

''کیوں؟''

''یقین دہانی کے لیے کہ تم باہر واپس آتے ہو یا نہیں۔''

''میں کیوں نہیں آتا؟''

''پہلے تو یہ بتاؤ کہ اندر گئے کیوں تھے...... تم تینوں ایک چھوٹی سی فیملی کے مانند؟''

''بچی کو پیار کر کے گڈ نائٹ کہا...... ایلی کی خواہش تھی۔ چھوٹی سی بات تھی۔'' رچرڈ نے جواب دیا۔ ''کوئی مسئلہ ہے؟''

''میرے بھائی کے ساتھ پرابلم چل رہی ہے۔'' بوبی نے کہا۔ ''میرے خیال میں تم جانتے ہو۔''

''سنا ہے، ٹیکس کا معاملہ ہے کوئی۔''

''ہاں، آئی آر ایس کے آدمی پیچھے لگے ہیں۔''

''آئی آر ایس...... کیوں؟''

''خیر چھوڑو۔ سلوپ جیل میں ہے۔ پیر کو آ جائے گا۔ وہ بہت ناپسند کرے گا کہ تم اس کی بیٹی کو پیار کر رہے ہو اور اس کی بیوی سے دوستی......'' بوبی نے تنبیہ کی۔

رچرڈ نے کندھے اچکائے۔ ''مجھے کام سے مطلب ہے۔ میں یہاں کام کے لیے آیا ہوں۔''

''میں نے تمہیں سمجھا دیا ہے۔ ورنہ تم زیادہ دن یہاں ٹک نہیں سکو گے۔''

''کیوں...... کیا شیرف کو کال کرو گے۔ اسے تو ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔''

بوبی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ویسٹ ٹیکساس...... ہم اپنے معاملات خود نمٹاتے ہیں۔ یہی روایت رہی ہے۔ جوش اور ٹلی کافی ہیں۔''

''وہ لڑکے؟ کچن کی ملازمہ بہتر رہے گی یا پھر تم خود۔'' رچرڈ نے بے پروائی سے کہا اور چلنا شروع کیا۔

''وہ لڑکے نہیں ہیں۔ وہ رنگ میں اترتے ہیں تو ان کو ایک ٹن وزنی بھینسے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔'' بوبی نے کہا۔

''تمہاری باتیں سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اگر چاہتے ہو تو میں ایسے ہی چلا جاتا ہوں۔ کیا گائے، بھینسوں کی باتیں

شروع کر دی ہیں۔ ایلی کو گڈ نائٹ کہنے کا مطلب ہے کہ تھرڈ ورلڈ وار شروع ہونے والی ہے۔ ایلی کو پیار کی ضرورت ہے۔ اس کی ماں بھی اکیلی ہے......"

"کافی اسمارٹ ہو...... کارمن کی باتوں پر یقین مت کرنا۔ وہ پہلے بھی کئی افراد کو بے وقوف بنا چکی ہے جس کے بعد جوش اور بلی کو حرکت میں آنا پڑتا ہے۔ اس نے جو بھی تم سے کہا ہوگا، اس کا بیشتر حصہ جھوٹ پر مبنی ہے۔"

ریچر خاموش رہا۔

"تمہیں کام کی ضرورت ہے، کام کرو۔ لیکن سلوپ کی بیوی اور بیٹی سے دور رہو۔ یہ میں تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں۔"

☆☆☆

صبح اٹھ کر ریچر نے اصطبل کا معائنہ کیا۔ گھوڑوں کی خوراک کدھر ہے؟ کونے میں ایک کمرا بنا ہوا تھا۔ ریچر نے اسے کھولا۔ وہاں اوپر تلے بڑے بڑے تھیلوں میں چارا بھرا ہوا تھا۔ ریچر نے تھیلوں پر لگی مہر دیکھی۔ کوئی سان اینجلو کا خاص سپلائر تھا۔ وہ اصطبل سے باہر آ گیا۔ لال مکان کے متوازی گزرتے ہوئے اس نے سڑک کا رخ کیا۔ عقب میں اس نے دومنزلہ لال مکان کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ ریچر نے مڑ کے دیکھا۔ بوبی باہر آ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی۔

"میں تم کو ہی اٹھانے آ رہا تھا۔" بوبی نے کہا۔ "مجھے ڈرائیور کی ضرورت ہے۔"

"کیوں، کہاں جا رہے ہو؟"

"شکار پر...... تم پک اپ ٹرک چلانا، میں شکار کروں گا۔ نشانہ اچھا ہونا چاہیے۔ بھاگتی گاڑی میں سے یہ آسان نہیں ہوتا۔"

"پک اپ سے نشانہ بناؤ گے؟"

"ہاں، تم دیکھنا...... مزہ آتا ہے۔ لیکن سلوپ زیادہ ماہر ہے۔"

"مجھے شکار کا شوق نہیں ہے۔" ریچر نے کہا۔

"تم بھول رہے ہو کہ تم یہاں کام کرتے ہو۔"

"کام کرتا ہوں۔" ریچر بولا۔ "لیکن ابھی تک تنخواہ، چھٹی، اوقات کار پر کسی نے بات نہیں کی۔"

"ٹھیک ہے۔ دو سو ڈالر فی ہفتہ۔" بوبی نے کہا۔ "او کے؟"

ریچر نے شانے اچکائے۔ وہ وہاں پیسوں کے لیے نہیں آیا تھا۔ "او کے۔"

"جوش اور بلی جو کہیں وہ کرو گے۔"

"او کے۔" ریچر نے پھر کہا۔ "لیکن میں شکار پر نہیں جاؤں گا، ابھی اور نہ کبھی۔"

بوبی نے خاموشی کا لمبا وقفہ دیا۔ "تمہیں اس سے دور رکھنے کے میرے پاس دوسرے راستے بھی ہیں۔"

"میں بنک ہاؤس میں ہوں۔" ریچر رخ بدل کر چل دیا۔

کچھ دیر بعد ایلی اس کے لیے ناشتا لے کر آ گئی۔

"ماما نے کہا ہے کہ وہ لنچ کے بعد یہاں ملنے آئیں گی۔" ایلی نے بتایا۔

☆☆☆

کارمن لنچ دے کر کچھ کہے بغیر چلی گئی۔ کھانا نمٹا کر ریچر برتن لے کر نیچے اتر گیا۔ بوبی پورچ کی سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔

"گھوڑوں کی خوراک لانی ہے۔" بوبی نے کہا۔ "تم جوش اور بلی کے ساتھ شام تک روانہ ہو جانا۔"

ریچر نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے برابر سے گزر کر کچن کی طرف چلا گیا۔ برتن ملازمہ کے حوالے کیے اور شکریہ ادا کر کے باہر آ گیا۔ بوبی اپنی جگہ پر تھا۔ ریچر اصطبل کی طرف چلا گیا۔

پندرہ منٹ بعد کارمن وہاں پہنچی۔ اس نے کاٹن شرٹ اور جین پہنی ہوئی تھی۔ سر پر تنکوں کا ہیٹ تھا۔ ہینڈ بیگ بھی اس کے ساتھ تھا۔

"کیا ارادے ہیں؟" ریچر نے استفسار کیا۔

"گھڑ سواری۔"

"اس گرمی میں؟"

"تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔" کارمن نے کہا۔

دس منٹ میں دو گھوڑے تیار کر کے دونوں نکل کھڑے ہوئے۔

بوبی مکان کے سامنے موجود تھا۔ اس مرتبہ ریچر کو ناگوار محسوس ہوا۔

"یہاں کا چوکیدار ہے یہ......؟"

"فی الحال سب ہی کچھ ہے۔" ریچر نے کارمن کی آواز میں نفرت صاف محسوس کی۔ وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ نفرت سلوپ کے لیے تو ہو سکتی تھی لیکن اس کے بھائی کے لیے......؟ تاہم وہ خاموش رہا۔

لال مکان سے مناسب فاصلے پر آنے کے بعد کارمن نے گھوڑا ایک خشک جھاڑی کے قریب روک کر لگام اس میں

الجھادی۔ ریچر نے بھی اس کی تقلید کی اور گھوڑے سے اُتر گیا۔ کارمن نے ہینڈ بیگ کھول کر ایک گن باہر نکالی۔

''پلیز مجھے سکھاؤ۔'' اس نے کہا۔

ریچر نے ہینڈ گن پر نظر ڈالی۔ لورسن L-22 آٹومیٹک، بیرل کی لمبائی ڈھائی انچ تھی۔

''قانونی ہے؟''

کارمن نے اثبات میں سر ہلایا۔

''چھپا کے رکھی ہے؟''

''ہاں۔'' کارمن نے جواب دیا۔ ''کیسی ہے؟'' اس نے اعشاریہ بائیس کی گولیوں کا ڈبا نکالا۔ لوڈ کر کے بتاؤ، میں ذاتی دفاع کے لیے سیکھنا چاہتی ہوں۔''

ریچر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کارمن، یہ خطرناک کھلونے ہیں۔ ایلی کی نظر نہ پڑے۔ کوئی حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''میں خیال رکھتی ہوں لیکن مجھے سیکھنا ہے۔''

ریچر نے شانے اچکائے۔ ''تمہاری زندگی، تمہاری بچی، تمہارا فیصلہ۔ لیکن یہ ایک سنجیدہ معاملہ ہے۔ ذہن میں رکھنا۔'' ریچر نے گن اپنی چوڑی ہتھیلی پر رکھ لی۔ ''غور سے سنو۔'' وہ بولا۔ ''گن کی نال چھوٹی ہے۔ ایسے ہتھیار سے صحیح نشانہ لگانا دشوار ہوتا ہے۔ اس قسم کے ہتھیار کو استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تم ٹارگٹ سے بہت قریب رہو۔ ہو سکے تو ٹارگٹ پر رکھ کر فائر کرو۔ ایک ہی کمرے کے دوسرے سرے سے بھی کوشش کرو گی تو گولی ٹارگٹ سے میلوں دور جائے گی۔''

''او کے۔''

''دوسری چیز۔'' ریچر نے ڈبے میں سے ایک گولی اٹھائی۔ ''اس کا سائز مختصر ہے اور رفتار کم۔ لہٰذا یہ ہلاکت خیز نہیں ہے۔ ٹریگر دباؤ تو دباتی چلی جانا حتیٰ کہ گن خالی ہو جائے۔''

''او کے۔''

''اب دیکھو۔'' ریچر نے گن کا کلپ باہر نکالا۔ اس میں نو گولیاں فٹ کر کے کلپ واپس گن کے اندر کر دیا۔ ایک گولی بریچ میں چڑھا کر کلپ باہر نکالا۔ اب وہاں آٹھ گولیاں تھیں۔ خالی جگہ کو ایک اور گولی سے پُر کر کے کلپ واپس فٹ کر دیا۔ اسے تیار کر کے سیفٹی کیچ آن رہنے دیا اور گن کارمن کے حوالے کر دی۔

''تم کو... دو کام کرنے ہیں۔ سیفٹی کیچ کو پش کر کے ٹریگر دس مرتبہ دبانا ہے۔ کوشش کرو...... سیفٹی اور ٹریگر۔''

کارمن نے سیفٹی کیچ کے لیے بایاں ہاتھ استعمال کیا پھر گن دائیں ہاتھ میں لے کر آنکھیں بند کیں۔ ہاتھ سیدھا کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ چھوٹا سا دھماکا ہوا اور گولی دس فٹ آگے زمین سے ٹکرائی۔ خالی شیل نکل کر باہر گرا۔ گھوڑے اچھلے، تاہم ادھر ادھر نہیں ہوئے۔

''سیفٹی آن کر کے گن لاک کرو۔'' ریچر نے کہا۔

کارمن نے ہدایت پر عمل کیا۔ ریچر نے شرٹ کے بالائی بٹن کھول کر اسے اتار دیا۔ پندرہ فٹ آگے جا کر اس نے شرٹ ایک بڑے پتھر پر پھیلا دی اور واپس آ گیا۔ ''ہتھیار اچھا نہ ہو، نشانہ اچھا نہ ہو تو ہمیشہ دھڑ پر فائر کرتے ہیں۔ جسم کا بڑا حصہ وہی ہوتا ہے۔ گردن سے لے کر ناف تک۔ گولی لگنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔'' ریچر اس کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔ ''شروع کرو۔''

''تمہاری قمیص......؟''

''شروع کرو۔''

کارمن نے سیفٹی ہٹا کر آنکھیں بند کیں اور فائر کیا۔ گولی بیس فٹ اوپر اور دائیں جانب کافی ہٹ کر گئی۔

''آنکھیں کھلی رکھو۔''

کارمن نے آنکھیں کھول کر پھر کوشش کی۔ گولی بائیں جانب چھ فٹ دور سے گزری۔

''لاؤ مجھے دو۔'' ریچر نے کہا۔ اس نے ایک آنکھ دبا کے نشانہ لیا۔ ''میں سینے پر جیب کو نشانہ بنا رہا ہوں۔'' اس نے اوپر تلے دو فائر کیے۔ ایک نشان جیب کے قریب بغل کے ساتھ نمودار ہوا اور دوسرا جیب کے مرکز میں ذرا نیچے۔

''اب تمہاری باری ہے۔''

کارمن نے تین گولیاں داغیں۔ کوئی بھی قمیص کو نہ چھو سکی۔ اس نے مایوسی سے ہاتھ نیچے کر لیا۔

''بتاؤ، کیا سیکھا؟''

''مجھے قریب جانا چاہیے۔''

''بالکل ٹھیک کہا۔ سارا قصور تمہارا نہیں ہے۔ کچھ گن کا اور کچھ تمہارا کہ تم پہلی بار کر رہی ہو۔ میں نے پہلی مرتبہ بارہ انچ کے فاصلے سے مس کیا تھا۔ بعدازاں پسٹل شوٹنگ میں آرمی میں کئی میڈل مجھے دیے گئے۔ وہاں کئی سال تک میں پہلے نمبر پر تھا۔'' ریچر نے اپنی پرانی عادت کے مطابق خالی شیل جمع کر کے پتلون کی جیب میں رکھ لیے اور قمیص بھی پہن لی۔

''اس کا کیا کرو گے؟'' کارمن نے قمیص کے سوراخوں کی طرف اشارہ کیا۔ جواب میں ریچر نے ایک

پھوٹی خشک ٹہنی توڑی۔ اسے جیب کے سوراخ میں کئی بار گھمایا۔ پھر ٹہنی دو انگلیوں میں پھنسا کر بغل کی طرف گھسیٹی۔ قمیص کا وہ حصہ پھٹ گیا اور دونوں سوراخ بھی یکجا ہو کر غائب ہو گئے۔ ایک آدھ جگہ ریچر نے قمیص پر خراشیں ڈالیں۔ بعدازاں دونوں ٹانگوں سے جھاڑی میں لاتیں چلائیں۔ پتلون کے نچلے حصوں پر بھی معمولی نشانات پڑ گئے۔

"اب ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔" کارمن مسکرائی۔ "لیکن میں ایلی کے ہاتھ دوسری قمیص بھجوا دوں گی۔ گھوڑے سے گر کر تمہارے کپڑے خراب ہو گئے ہیں۔"

☆☆☆

جوش اور بلی اصطبل میں پک اپ کے ساتھ کھڑے تھے۔

"یہ کیا ہوا؟" بلی مسکرایا۔

"گھوڑے نے ٹھوکر کھائی تھی...... میں سنبھل نہیں سکا۔"

"کچے لگتے ہو۔" جوش نے طنز کیا۔

"منہ دھو کر آتا ہوں۔" ریچر سیڑھیاں چڑھ گیا۔

"جلدی آجاؤ، سورج ڈھلنے سے پہلے نکل جائیں گے۔" عقب سے بلی کی آواز آئی۔

اوپر آ کر ریچر نے ہاتھ منہ دھویا اور پھٹی ہوئی قمیص اتار کر جیب کے آس پاس خوب دھو کر نچوڑا۔ کچھ دیر بعد وہ جانے کے لیے پلٹا تو ایلی اوپر چڑھ رہی تھی۔ اس کے پاس نیلے رنگ کی ایک شرٹ تھی۔ شرٹ، ریچر کی جسامت کے مطابق تھی۔ کس کی شرٹ ہے...... اس نے سوچا۔

☆☆☆

جوش ڈرائیو کر رہا تھا۔ بلی پسنجر سیٹ پر تھا اور ریچر درمیان میں۔ صورتِ حال خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی پہلی خبر ہی نہایت غیر متوقع تھی کہ سلوپ آنے والا ہے۔ بوبی، بلی اور جوش کے تیور بھی ٹھیک نہیں تھے۔ ریچر کو اپنی فکر نہیں تھی۔ وہ ماضی میں اس سے کہیں زیادہ مخدوش حالات کا سامنا کر چکا تھا۔ لیکن کارمن اور ایلی کا کیا بنے گا۔ ایلی واقعی ننھی پری کے مانند تھی۔ اور صاف عیاں تھا کہ وہ پیار کی بھوکی ہے۔

ریچر بخوبی آگاہ تھا کہ گھوڑوں کا چارا محض ایک بہانہ تھا۔ اس نے جو گودام نما کمرا دیکھا تھا وہاں گھوڑوں کی خوراک کے لیے کم سے کم چالیس بڑے تھیلے موجود تھے۔ بالفاظ دیگر وہ چالیس مرتبہ سان اینجلو جا چکا تھا۔ سپلائر کی مہر کے مطابق۔ تو پھر اچانک چارے کی ضرورت کیوں آن پڑی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ بوبی نے جوش اور بلی کے ذریعے ریچر کو کارمن کے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پک اپ نے آگے جا کر بایاں موڑ کاٹا تو ریچر کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ سان اینجلو میں سپلائر، ایکو کاؤنٹی کے شمال مشرق میں تھا۔ انہیں دائیں جانب مڑنا چاہیے تھا جبکہ وہ شمال مغرب کی طرف جا رہے تھے۔ ریچر زیرِلب مسکرایا۔

"کتنی دیر لگے گی؟" ریچر نے معصومیت سے سوال کیا۔

"زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے۔" جوش نے جواب دیا۔

کل جس بار کا ذکر ہو رہا تھا۔ یہ دونوں اسی طرف جا رہے ہیں۔ ریچر نے سوچا...... اور وہاں ان دونوں کے دوست بھی ہوں گے۔

"سپلائر، ہفتے کے دن بھی کھلا ہوتا ہے؟"

"بڑے آرڈر کے لیے وہ ہفتے کو بھی آجاتا ہے۔" بلی نے کہا۔

سورج مغرب میں غروب ہو چکا تھا۔ کچھ فاصلے پر چند عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ چند سائن بورڈ۔ گیس اسٹیشن، ایک اسٹور اور ایک بار۔ بار کا نام تھا لانگ ہارن لاؤنج۔ وہاں دس بارہ گاڑیاں اور پک اپ کھڑی تھیں۔ ریچر نے وہاں شیرف کی کار بھی دیکھی۔

ملٹری پولیس کے نوّے فیصد لفڑوں، پھڈوں کا تعلق بار کے ساتھ ہوتا ہے۔ ریچر کے لیے یہ انوکھی جگہ نہیں تھی۔ اس نے اندر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے نکلنے کے راستوں کو تاڑا۔ وہاں تین ڈور تھے۔ ایک وہ جس سے وہ اندر آئے تھے۔ دوسرا بیک ڈور، جو ریسٹ رومز کے پیچھے تھا، تیسرا ایگزٹ پرائیویٹ ڈور تھا۔ یہ بار کے پیچھے آفیشل ڈور تھا۔ فوراً بعد ریچر نے وہاں موجود افراد کی ناپ تول کی۔ وہ خاموش تھے اور اسی کو تک رہے تھے۔ شرارت کہاں ہے؟ دھمکی کہاں ہے؟ وہ کل 25 افراد تھے اور دھمکی اسے نظر نہیں آئی۔ وہ سب مرد تھے۔ نصف منٹ میں ان کی توجہ ریچر کی جانب سے ہٹ گئی۔ ان میں کوئی غیر معمولی جسامت کا حامل نہیں تھا۔ سب سے بہتر بلی اور جوش تھے۔ ریچر شیرف کو دیکھنے میں ناکام رہا۔ تاہم بار کے نزدیک ایک اسٹول خالی پڑا تھا۔ سامنے بار کاؤنٹر پر ایک بوتل بھی لاوارث پڑی تھی۔

اب ریچر نے ہتھیاروں کا جائزہ لیا۔ بار کے اوپر لکڑی کے تختے پر قدیم انداز کی ایک ہینڈ گن لٹک رہی تھی۔ بورڈ پر لکھا تھا۔ ''ہم 911 کو کال نہیں کرتے۔'' سب سے اہم مرکز میں پڑی ''پول ٹیبل'' تھی۔ اہم بھی اور توجہ طلب بھی۔ جس پر سیلولائڈ کی ٹھوس بالز گھوم رہی تھیں۔ ٹیبل پر چار آدمی کھیل رہے تھے۔ چاروں کے پاس چار عدد ''کیوز'' تھیں۔ قریبی دیوار پر ریک میں ایک درجن کیوز اور ہونی چاہیے تھیں۔

بار روم میں، پول (اسنوکر نہیں) کیو سے بہتر ہتھیار دوسرا نہیں ہوتا۔ اگر آتشیں ہتھیار کی نوبت نہ آئے۔ پروفیشنل کیو خاص لکڑی سے بنی ہوتی ہے جس میں سیسے کی آمیزش ہوتی ہے۔ اس کی لمبائی بھی بہت موزوں ہوتی ہے۔ پول ٹیبل کے دوسری جانب چند چھوٹی میزیں اور اسٹول پڑے تھے۔ بلی نے بار مین کو تین انگلیوں کا اشارہ کیا اور ٹھنڈی بوتلیں حاصل کرلیں۔ ریچر قدم بڑھا کر پہلے وہاں پہنچ گیا۔ اسے دیوار کے ساتھ اپنی مرضی کی جگہ چاہیے تھی۔ وہ ممکنہ حد تک تینوں ایجنٹ کو نظر میں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ راستہ بناتا ہوا اسٹول پر بیٹھ گیا۔ بلی اور جوش قدرے آگے پیچھے اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ میز پر تین بوتلیں رکھی تھیں۔ بلی نے ایک بوتل میز پر آگے بڑھائی۔ ''گڈ لک۔'' بلی نے اپنی بوتل اٹھائی۔ اسی وقت شیرف نظر آیا۔ اس نے رک کر ریچر کو دیکھا اور خالی اسٹول پر بیٹھ گیا۔

''ایک کال کرنی ہے۔'' بلی اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ بلی واپس آکر شیرف سے باتیں کرنے لگا۔ شیرف سر ہلا رہا تھا۔ اس نے بوتل خالی کی اور ریچر کی طرف دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ بلی میز پر واپس آگیا۔

''شیرف کو ضروری کام تھا۔'' اس نے بتایا۔

''تم نے کال کرلی؟'' جوش نے کہا۔

''ہاں، کال کردی۔'' بلی نے کہا۔ ''تمہیں تجسس نہیں ہے کہ میں نے کہاں کال کی ہے؟''

''مجھے کیا ضرورت پڑی اور مجھے تمہارے ذوق کا بھی نہیں پتا کہ لڑکیوں کو پسند کرتے ہو یا لڑکوں کو۔''

بلی چند سیکنڈ رک کر بولا۔ ''میں نے ایمبولینس کو کال کی ہے۔ پہلے سے بندوبست ٹھیک رہے گا۔ کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں اسے پہنچنے میں۔''

''ہاں پچھلی بار ہم سے غلطی ہوگئی تھی۔'' جوش نے کہا۔

''سلوپ کی بیوی پر اس نے نظر رکھی ہوئی تھی۔ اسکول ٹیچر تھا۔ کچھ تو کرنا تھا۔ سلوپ قید میں تھا۔ بوبی نے کہا یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اسے سبق سکھاؤ...... ہم اسے یہاں لے آئے۔''

''ہاں، بوبی نے بتایا تھا کہ تم دونوں وہی کرتے ہو جو وہ کہتا ہے۔'' ریچر نے کہا اور جوش نے دانت نکالے......

''لیکن میں نے بوبی سے کہا تھا کہ تم دونوں کے لیے گھوڑے اور سانڈ ہی بہتر ہیں۔ تم دونوں کو دوسرے کھیلوں میں الجھانا نقصان دہ ہوسکتا ہے۔'' ریچر نے بوتل اٹھائی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا۔

''سنو آگے کیا ہوا۔''

''سُن رہا ہوں۔''

''ہم اسے پکڑ کر یہاں لے آئے۔ اس کی پتلون اتاری اور زیر ناف چاقو رکھ کر عندیہ دیا کہ وہ ایک بے بدل عضو سے محروم ہونے والا ہے۔ اس نے بلبلانا شروع کردیا۔ توبہ تلا کرنے لگا۔

''اگر آئندہ شکل نظر آئی تو......''

وہ قسمیں کھانے لگا۔ پھر بھی ہم نے ایک چھوٹا ساکٹ لگا دیا۔ اس نے رونا شروع کردیا۔ بہر حال آئندہ دور دور تک اس کا چہرہ کسی نے نہیں دیکھا۔ غلطی یہ ہوئی کہ خون زیادہ بہہ گیا تھا۔'' دونوں پھر قہقہہ زن ہوئے۔

''میرا اس کہانی سے کیا تعلق ہے؟''

''تعلق ہے...... بوبی یہی کہتا ہے۔''

''تم نے یقین کرلیا؟''

''کیوں نہیں کرتے ...... یہ ایک فیملی ہے...جس کی تمہیں عزت کرنی چاہیے۔ فیملی کا ملازم بھی فیملی ہے۔ یہ یہاں کا قانون ہے۔''

''میں ملازم...... میں بھی فیملی میں شامل نہیں؟''

''نہیں تم نہیں۔ ایک دن تو ہوا ہے تمہیں اور بوبی کہتا ہے کہ تم ملازم نہیں ہو...... اسکول ٹیچر کے تجربے کے بعد ہم ایمبولینس پہلے منگا لیتے ہیں۔'' بلی نے کہا۔

''اب یہ بتاؤ کہ ایمبولینس میں جاؤ گے یا خود ہی چلے جاؤ گے؟'' جوش بولا۔

''میں کام کرنے آیا ہوں۔ جانے کے لیے نہیں...... اگر تم دونوں جانا چاہتے ہو تو ایمبولینس میں بھجوا دیتا ہوں۔'' ریچر نے کہا۔

''تم زیادہ بولتے ہو۔ بھول جاتے ہو کہ یہاں ہمارے کتنے بندے موجود ہیں۔'' بات ٹھیک تھی۔ وہ لوگ بے چین تھے۔ کبھی ان تینوں کی طرف دیکھتے، کبھی ایک دوسرے کی جانب۔ ریچر نے فضا میں تناؤ کی کیفیت محسوس کی۔ ممکن ہے تصادم ایک کے مقابلے میں دو تک محدود نہ

رہے۔

''آؤ دیکھتے ہیں۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔''یارڈ میں چلو۔ وہ میز کے پیچھے سے نکلا اور جوش کے برابر سے گزرا۔ اچانک یہ دعوت ...... دونوں کے لیے غیر متوقع تھی۔ ریچر پول ٹیبل کی دائیں جانب سے گزرا۔ رخ ریسٹ روم ایگزٹ کی طرف تھا۔ چند افراد کی گرہ راستے میں آ گئی۔ ریچر کی چال میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ انہوں نے اسے آگے بڑھنے کے لیے راستہ دے دیا۔ بلاشبہ جوش اور بلی اس کے پیچھے تھے۔ حاضرین کے خیال میں وہ دونوں ہی کافی سے زیادہ تھے۔ شاید وہ ایسے نظارے پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ ریچر بظاہر آرام سے تھا لیکن اس کے عضلات میں تناؤ کی کیفیت شامل ہو گئی تھی۔ ایڈرینیلین گلینڈ نے خون میں اضافی توانائی کے لیے ہارمونز خارج کرنے شروع کر دیے تھے۔ اس کے بازو ڈھیلے انداز میں پہلوؤں میں لٹک رہے تھے۔ تین افراد متحرک تھے۔ ریچر، جوش اور بلی۔ ریچر ان کے قدموں کی چاپ سے عقب میں فاصلے کا اندازہ لگا رہا تھا۔ فاصلہ سمٹ کر آٹھ سے دس قدم رہ گیا۔ ڈھیلے بازو بجلی کے مانند لپکے اور ریک میں سے آخری پول کیو کھینچ لی۔ اس نے کیو کو پلٹ کر الٹی جانب سے پکڑا تھا...... گھومتے ہوئے اس نے بھرپور وار کیا۔ بلی زد میں تھا۔ کیو دستے کی جانب سے بلی کے کان سے ذرا اوپر ٹکرائی۔ ریچر نے رعایت سے کام نہیں لیا تھا۔ ٹھپ کی آواز آئی اور بلی گرا۔ دوسرا وار پہلے سے زیادہ پُرغضب تھا۔ کیونکہ جوش، ساتھی کو گرتے دیکھ چکا تھا۔ اس نے اضطراری طور پر بازو سامنے کر کے وار بلاک کیا۔ ہڈی ٹوٹی اور اس کی کربناک چیخ بلند ہوئی۔ شائیں...... تیسرا وار اس کے سر پر۔ وہ بلی کے قریب گرا۔ یکساں سرعت اور طاقت کے ساتھ مزید چار حملے۔

بقیہ افراد جھڑپ کے مقام سے پرے ہٹ گئے۔ بلی اور جوش آناً فاناً بُری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ شائیں، شائیں...... ریچر نے کیو گھماتے ہوئے وہاں موجود ٹولے کو جانچا اور کیو نیچے گرا دی۔ پک اپ کی چابیاں اٹھائیں اور ٹولے کے درمیان سے گزرتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ یہ ایک نفسیاتی اور آزمودہ حرکت تھی۔ کسی نے اس کا راستہ روکنے کی جرأت نہیں کی۔ 'ایکو کاؤنٹی میں تعلقات کی بھی کچھ حدود ہیں' پک اپ ٹرک کی طرف جاتے ہوئے اس کے دماغ میں خیال آیا۔

☆☆☆

تاریکی میں وہ رینچ کے گیٹ سے اندر گیا۔ پک اپ اصطبل کے بجائے لال مکان کی طرف لے گیا۔ کیونکہ مکان کی تمام روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ وہ دو کاریں بھی پارک تھیں۔ ایک شیرف کی اور دوسری سبز رنگ کی لنکن تھی۔ سامنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ریچر پک اپ سے اتر کر آگے بڑھا اور پورچ میں لٹک گیا۔ اندر شیرف، رسٹی گریر، بوبی اور کارمن نظر آ رہے تھے۔ کمرے کے دوسری جانب ایک اور آدمی موجود تھا۔ قد لمبا نہ چھوٹا لیکن وزن کچھ زیادہ تھا۔ عمر تیس، بتیس سال ہو گی۔ مسکراہٹ میں سیاسی انداز گھلا ہوا تھا۔ اس نے سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ ریچر نے اندر نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن اس کے وزن سے پورچ کا تختہ چرچرایا۔ بوبی نے سن لیا۔ چند سیکنڈ کے لیے وہ ساکت رہا پھر ریچر کی طرف لپکا۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں یہاں ملازم ہوں۔''

''جوش اور بلی کہاں ہیں؟''

''بھاگ گئے شاید۔''

دیگر افراد بھی دروازے تک آ گئے۔ کارمن اندر ہی رہی۔

''میرا نام ہیک واکر ہے۔'' سوٹ والے نے تعارف کرایا۔ ''میں پیکو کاؤنٹی میں ڈی اے (ڈسٹرکٹ اٹارنی) ہوں...... فیملی کا دوست۔''

ریچر نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

''سلوپ کا بہت گہرا دوست۔'' رسٹی گریر نے غائب دماغی سے کہا۔

''جیک ریچر...... میں یہاں کام کرتا ہوں۔''

''ہیک ہمارے لیے ایک بہت ہی خوشگوار خبر لے کر آیا ہے۔'' رسٹی نے کہا۔

ریچر نے دیکھا کہ کارمن کے سوا ہر کوئی خوش نظر آ رہا تھا۔

''تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں کسی کو اتوار کے دن باہر لا رہا ہوں...... وہ کل آ جائے گا۔'' ہیک نے کہا۔

''ہیک ہمیں لے جائے گا ہم ساری رات سفر کریں گے اور ساتھ واپس آئیں گے۔'' رسٹی گریر نے کہا۔

''سب جا رہے ہیں؟'' ریچر نے سوال کیا۔

''میں نہیں جا رہی۔'' کارمن کی آواز آئی۔ ''مجھے ایلی کے ساتھ رکنا پڑے گا۔''

''کار میں بہت جگہ ہے۔'' ہیک نے کہا۔

''میں نہیں چاہتی کہ ایلی اپنے باپ کو جیل سے باہر آتا دیکھے۔''

''میرے خیال میں مجھے بھی رکنا چاہیے۔'' بوبی نے بھی عندیہ دیا۔ ''سلوپ سمجھ جائے گا۔''

کارمن اندر چلی گئی۔ رسٹی اور ہیک واکر اس کے پیچھے چلے گئے۔ بوبی اور شیرف پورچ پر ہی تھے۔

''تو وہ کہاں چلے گئے؟'' بوبی نے سوال کیا۔

''گئے تو کہیں نہیں ہوں گے۔ شاید اسپتال جانا پڑے۔ میں نے تو فیملی کے لیے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کسی سے جھگڑ بیٹھے اور ہار گئے۔''

بوبی نے ریچر کو گھورا۔ ''کون تھا وہ؟''

''جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔''

''وہ تم تھے؟'' بوبی نے رک کر کہا۔

''میں؟'' ریچر مسکرایا۔ ''بھلا مجھ سے وہ کیوں لڑیں گے؟ ایسی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ تم نے تو نہیں کہا تھا؟''

بوبی مڑا اور پیر پٹختا ہوا اندر چلا گیا۔ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند ہوا تھا۔

''بوبی نے مجھے بتایا تھا۔'' ریچر نے شیرف کو مخاطب کیا۔ ''یہاں اختلافات اور تنازعات خود طے کیے جاتے ہیں۔ نجی معاملات سے پولیس کو دور رکھا جاتا ہے۔ اس کے مطابق یہ کوئی بڑی اور قدیم ویسٹ ٹیکساس کی روایت ہے۔''

شیرف کچھ دیر خاموش رہا۔ ''تم ایسا سمجھ سکتے ہو۔'' شیرف نے کہا۔ ''اور میں بہت روایت پسند آدمی ہوں۔''

ریچر نے سر ہلایا۔ ''خوشی ہوئی سُن کر۔''

شیرف اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

ریچر بنک ہاؤس میں تھا۔ کار کا انجن بولا تو اس نے اٹھ کر دیکھا۔ واکر کی شبیہ اسٹیئرنگ کے پیچھے تھی۔ رسٹی گریر پسنجر سیٹ پر بیٹھی تھی۔ کار رینچ سے نکل کر روڈ کی طرف چلی گئی۔ اس کے خیال میں کارمن کو آنا چاہیے تھا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد اس نے کارمن کے بجائے بوبی کو آتے دیکھا۔ ریچر اُتر کر اصطبل میں آیا اور بنک ہاؤس سے باہر بوبی کے سامنے آگیا۔

''گھوڑوں کو پانی پلانا ہے۔'' بوبی نے کہا۔ ''اور ان کے کیڑوں کی صفائی کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے، کرلو۔''

''وہاٹ؟'' وہ غرایا۔ ''میں کروں گا؟''

''نہیں کروگے تو میں کرواؤں گا۔'' ریچر بولا۔ ''بوبی، حالات بدل گئے ہیں۔ جب تم نے جوش اور بلی کو مجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے بھیجا تو تم نے لکیر کراس کر لی اور خود کو بدتر صورت حال سے دوچار کرلیا۔ اب جو میں کہوں گا تم کرو گے۔''

بوبی کچھ نہیں بولا۔ ریچر براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ''میں تم سے کہوں گا کہ جمپ لگاؤ، تم یہ نہیں پوچھو گے کہ کتنی اونچی جمپ؟ تم اچھلنا شروع کر دو گے، سمجھ گئے؟''

بوبی ساکت کھڑا رہا۔ ریچر نے دایاں ہاتھ گھمایا۔ نشانہ بوبی کا رخسار تھا۔ یہ راؤنڈ ہاؤس پنچ تھا۔ ریچر نے قصداً رفتار دھیمی رکھی تھی۔ بوبی نے جھکائی دی اور سیدھا ریچر کے بائیں ہاتھ کی زد میں آگیا۔ ریچر نے اطمینان سے اس کی ٹوپی اچک لی۔

''جاؤ گھوڑوں کو دیکھو...... وہیں سو جانا۔ ناشتے سے قبل دکھائی دیے تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

ریچر نے ٹوپی گندگی میں پھینک دی اور مکان کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

ریچر نے کارمن کو کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے قریب بیٹھے دیکھا۔ وہ دیوار کو گھور رہی تھی۔ ''پہلے میں نے ایک سال ضائع کردیا۔'' وہ بولی۔ ''اب لگ رہا ہے دومرتبہ میرے ساتھ دھوکا ہوا۔ جب تم ملے تو اڑتالیس گھنٹے رہ گئے اور اب چوبیس گھنٹے۔''

''تم اب بھی یہاں سے نکل سکتی ہو۔'' ریچر نے کہا۔

''چوبیس گھنٹے بھی نہیں۔ وہ صبح پہنچ رہا ہے۔ سولہ گھنٹے۔''

''سولہ گھنٹے بھی بہت ہیں۔''

''ایلی سو رہی ہے۔ میں اسے اٹھا کر کار میں بھاگوں اور باقی زندگی پولیس کے آگے آگے بھاگتی رہوں۔''

ریچر کچھ نہیں بولا۔

''میں سامنا کروں گی۔ اسے بتا دوں گی کہ اب اگر اس نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں طلاق کی کارروائی کروں گی۔ چاہے دس برس بیت جائیں۔ اب اس کی مرضی نہیں چلے گی۔''

''گن کہاں ہے؟''

''گن کا علم صرف مجھے ہے۔'' کارمن نے کہا۔ ''آؤ چلیں۔''

''کہاں؟''

''دوسرے کمرے میں...... وہ تینوں کہاں ہیں؟''

''چوہوں کو گٹر میں ہونا چاہیے۔ سمجھو وہ گٹر میں ہیں۔ بوبی نالی میں پڑا ہے۔ صبح تک اسے بھول جاؤ۔''

''تم عجیب آدمی ہو؟'' کارمن اچانک رک گئی۔

''ہاں عجیب، آوارہ، سرپھرا، اکیلا اور شاید کچھ کچھ پاگل۔''

''مجھے بالکل اُمید نہیں تھی کہ تم جیسا کوئی مل جائے گا۔''

ریچر خاموش رہا۔

''شادی کیوں نہیں کرتے؟''

ریچر خاموش رہا۔

''کوئی ارادہ نہیں ہے؟''

ریچر خاموش رہا۔

کارمن نے گہری سانس لی اور اسے لے کر آگے بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں ایک کمرے میں داخل ہو رہے تھے جہاں ایک کنگ سائز بیڈ پڑا تھا۔ سائڈ ٹیبلو، فرنیچر......

''وہ ڈیڑھ سال اندر رہا ہے۔ عورت سے دور۔ کیا وہ سیکس کا مطالبہ نہیں کرے گا؟'' کارمن نے کہا۔

ریچر نے جواب نہیں دیا۔

''لیکن میں انکار کردوں گی۔ یہ عورت کا حق ہے کہ وہ ''نو'' کہہ دے۔ کیوں؟''

''ہاں یہ اس کا حق ہے۔'' وہ بولا۔

''چاہے عورت شادی شدہ ہو؟''

''ہاں۔ بیشتر جگہوں پر وہ ''نو'' کہہ سکتی ہے۔''

''اور ''یس'' کہنا بھی اس کا حق ہے؟''

''ایسا ہی ہے۔''

''آئی سے ''یس'' ٹو یو I say yes to you''

''لیکن میں نے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔''

کارمن نے وقفہ لیا۔ ''ٹھیک ہے، میں مطالبہ کرتی ہوں۔''

''لیکن کیوں؟''

''کیونکہ میری خواہش ہے کہ ہم ساتھ سوئیں۔''

''اور؟''

کارمن نے شانے اچکائے۔ ''اور شاید میں سلوپ کو تکلیف دینا چاہتی ہوں۔''

ریچر خاموش رہا۔

''غیر مشروط۔'' وہ بولی۔

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟''

کارمن نے دوسری طرف دیکھا۔ ''مجھے جواب چاہیے۔''

ریچر نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ تمام امکانات تحلیل ہو چکے ہیں۔ صرف جبلت باقی رہ گئی ہے۔

''نو۔'' اس نے کہا۔

وہ کافی دیر تک خاموش کھڑی رہی۔

''کم از کم تم میرے ساتھ ٹھہر سکتے ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

☆☆☆

بوبی چارے کے ڈھیر پر سو رہا تھا۔

''اٹھو اور اپنا حلیہ ٹھیک کرو، چھوٹے بھائی۔'' ریچر نے کہا۔ بوبی ہڑبڑا کے اٹھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا پھر بولا۔ ''وہ آنے والے ہوں گے...... کچھ سوچا ہے کہ پھر کیا ہوگا؟''

ریچر مسکرایا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ میں انہیں بتاؤں گا کہ میں نے تم سے کام کرایا تھا اور یہاں سلایا تھا؟''

''تم نہیں بتاؤ گے؟''

''ہاں میں کیوں بتاؤں گا...... اور میرا خیال ہے کہ تم بھی یہ حماقت نہیں کرو گے یا کرو گے؟''

بوبی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ریچر دوبارہ مسکرایا۔ ''دوپہر تک یہیں رہو۔ پھر میں تمہیں اندر آنے دوں گا۔''

''اور ناشتا؟''

''یہاں بہت ملے گا۔'' ریچر واپس چل دیا۔

ملازمہ نے بوبی کا معلوم کیا تھا، ریچر نے بتایا کہ وہ فی الحال اصطبل میں ہے۔ ایک گھوڑا سست ہو رہا ہے۔''

''ناشتا وہ یہیں کرے گا؟'' ملازمہ نے پوچھا۔

''نہیں جب آئے گا تو یہیں کرلے گا۔''

☆☆☆

''میں نہیں چاہتی کہ پہلے تم اس سے بات کرو۔ اگر اس کو پتا چل گیا کہ کوئی اور بھی کچھ جانتا ہے تو وہ بگڑ جائے گا۔'' کارمن نے استدعا کی۔

''لیکن کیوں، ایسا کیا ہے؟''

''میں نے دوبارہ غور کیا تھا۔ بہتر ہے کہ میں آغاز کروں۔''

''کم آن۔ اسٹینڈ لو۔ فائٹ کرو۔''

''میں لڑوں گی۔ میں آج رات ہی اسے بتادوں گی۔''

لیکساس، ایبلسن...... ایکو کاؤنٹی۔ ریچر کے دماغ میں گھومتی گھڑی بتا رہی تھی کہ وقت سر پر ہے۔ وہ ایک بجے تک آجائے گا۔

بارہ بجے بوبی بنک ہاؤس سے نکل آیا۔ پونے ایک بجے تک وہ نہا دھو کے نئے کپڑے بدل چکا تھا۔ چند منٹ بعد کارمن ایلی کا ہاتھ پکڑے وہاں آئی۔ اس کی چال میں خفیف سی لڑکھڑاہٹ تھی جیسے گھٹنے کمزور ہو گئے ہوں۔ ریچر کھڑا ہو گیا اور کارمن کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خود پورچ کی ریلنگ پر آگیا۔ نگاہ سڑک پر جمی ہوئی تھی۔ نگاہ کی آخری حد پر اس نے غبار اٹھتے دیکھا۔ غبار آلود بادل پھیلتا گیا۔ حتیٰ کہ اس نے سبز رنگ کی لنکن پہچان لی۔ کچھ دیر بعد اس کے اندر بیٹھے افراد بھی نظر آنے لگے۔ ہیک واکر ڈرائیو کر رہا تھا۔ رسٹی گریر عقبی نشست پر تھی۔ قدرے بڑے جثے کا مالک شخص واکر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ گاڑی رینچ میں داخل ہوگئی۔ سلوپ گھر پہنچ گیا تھا۔ اس نے کھڑکی سے گردن نکال کر یہاں وہاں دیکھا اور مسکرایا۔ لنکن پورچ کے قریب رکی اور انجن بند ہوگیا۔ تین دروازے کھلے۔ لنکن کی سواریاں باہر نکل آئیں۔ بوبی، ایلی کے ہمراہ پورچ کی سیڑھیاں طے کر کے نیچے اترا۔ ریچر، ریلنگ سے پیچھے ہٹ گیا۔ کارمن، سلوموشن میں اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ جیل میں رہنے کی وجہ سے سلوپ کی جلد کچھ زردی مائل لگ رہی تھی۔ نشاستہ دار غذا نے اس کا وزن بڑھا دیا تھا۔ تاہم بلاشبہ وہ بوبی کا ''بھائی'' تھا۔ بال، انداز اور چہرے کی ساخت بوبی سے ملتی تھی۔ بوبی اس کے ساتھ گلے ملا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی پیٹھ تھپکی، پھر سلوپ نے ایلی کے لیے اپنے بازو وا کر دیے۔ گود میں اٹھا کر پیار کیا اور واپس نیچے چھوڑ دیا۔ بعدازاں اس نے پورچ پر نظر ڈالی۔ ہاتھ سیدھا کر کے کارمن کو اشارہ کیا۔ کارمن نے گہری سانس لی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر پورچ سے نیچے اتری۔ سلوپ نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ طویل بوسہ علامت تھا کہ دونوں بہن بھائی نہیں ہیں لیکن بوسے کی طوالت اتنی بھی نہیں تھی کہ جذبوں کا واضح اظہار ہوتا۔ بوبی اور اس کی ماں گھر کے اندر چلے گئے۔ واکر گاڑی میں بیٹھا، انجن اسٹارٹ کیا اور روانہ ہو گیا۔

ریچر نے بنک ہاؤس کی طرف پیش قدمی کی۔ سلوپ کے ایک ہاتھ میں ایلی اور دوسرے میں کارمن کا ہاتھ تھا۔ ایلی متواتر بول رہی تھی۔ وہ تینوں پورچ کی طرف جا رہے تھے۔

☆☆☆

تین گھنٹے تک ریچر نے ملازمہ کے سوا کسی کو نہیں دیکھا۔ ملازمہ لنچ دے گئی تھی۔ وقت سہ پہر ریچر کی سماعت سے آوازیں ٹکرائیں۔ سلوپ، کارمن اور ایلی کے ساتھ آرہا تھا۔ کارمن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ گرمی سے، ٹینشن سے یا پھر تھپڑ سے؟

''ماما میری پونی کہاں ہے؟''

''آؤ، میں دکھاتی ہوں۔'' کارمن اسے لے کر ایک طرف چلی گئی۔ ریچر نیچے آگیا تھا۔

''سلوپ گریر۔'' اس نے ہاتھ آگے کیا۔ بوبی کے مقابلے میں اس کی شخصیت کا تاثر مؤثر تھا۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ لیکن یہ چمک خالص نہیں تھی۔ اس میں مکاری کی آمیزش چھپی ہوئی تھی۔ ریچر نے شقاوت کی جھلک بھی دیکھی۔ ریچر نے ہاتھ ملایا۔ گرفت درمیانی رکھی اور محسوس کیا کہ وہ کسی فائٹر سے ہاتھ نہیں ملا رہا ہے۔

''جیک ریچر۔'' اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''سلاخوں کے اندر کیسا وقت گزرا؟''

سیکنڈ کے کسی مختصر لمحے میں سلوپ کی آنکھوں میں تحیر نے کروٹ لی۔ تاہم یہ بہت مختصر اظہار تھا۔ 'خود کو فوری طور پر سنبھالنے پر قادر ہے۔' ریچر نے نتیجہ اخذ کیا۔ اچھی خوبی ہے۔

''تجربہ کافی بدمزہ رہا۔'' سلوپ نے کہا۔ ''تم بھی سلاخوں میں رہے ہو؟''

''ہاں، لیکن سلاخوں کے دوسری جانب۔' تیز بھی ہے۔' ریچر نے جواب دیتے ہوئے سوچا۔

''بوبی نے مجھے بتایا تھا کہ تم پولیس میں رہ چکے ہو اور اب بے گھر اور بے روزگار ہو۔''

''ایسا ہی ہونا تھا۔ میرا باپ، تمہارے باپ کے مانند مالدار نہیں تھا۔''

سلوپ نے وقفہ لیا۔ ''آرمی میں تھے؟''

''ہاں۔''

''میں نے خود کبھی آرمی کو خاص اہمیت نہیں دی۔'' سلوپ نے کہا۔

''میں نے بھی خصوصی دلچسپی نہیں لی۔'' ریچر نے کہا۔

''اوہ، وہ کیسے؟''

''تم نے باہر نکلنے کے لیے رشوت دی؟''

سلوپ کی آنکھوں میں چمک لہرا کر غائب ہوگئی۔

''کیا یہ تمہارا خیال ہے؟''

ریچر نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے سوچا کہ بندہ جیل سے مزید کچھ سیکھ کر نکلا ہے جو خود کو قابو میں رکھا ہوا ہے۔

''شرم کی بات ہے۔ مدت پوری کیے بغیر انکل (شیرف) کو درمیان میں لاکر رو دیے......اور باہر آگئے۔''

''تمہارا وہم ہے۔''

''تمہارا وقت ضائع ہو رہا تھا۔'' ریچر نے گرم پتا پھینکا۔''مزید جرم کرنے کے لیے تمہیں وقت چاہیے تھا۔''

''یعنی تم نے بھی یہی کیا۔ تمہیں وقت درکار تھا۔'' وہ بولا۔

ریچر مسکرایا۔ موقع دینے کا شکریہ۔ اس نے سوچا۔

''میرے پاس چوائس نہیں تھی۔'' ریچر نے جواب دیا۔

''انہوں نے مجھے باہر کر دیا۔''

''کیوں؟''

''میں نے قانون توڑا تھا۔''

''ہم......م......کیسے؟''

''ایک نامرد کرنل تھا۔ وہ اپنی بیوی پر تشدد کرتا تھا۔ اچھی بیوی تھی اس کی۔ تشدد کا معاملہ مخفی تھا۔ لہٰذا میں ثبوت سے محروم رہا۔ لیکن میرے لیے مشکل تھا کہ میں اسے یہ سلسلہ جاری رکھنے دیتا۔ یہ بہت غلیظ حرکت تھی۔ میں عورتوں پر ہاتھ اٹھانے والے مردوں سے نفرت کرتا ہوں۔ ایک رات میرا داؤ چل گیا۔ اب وہ وہیل چیئر پر رہتا ہے اور اسٹرا کے ذریعے حریری غذا استعمال کرتا ہے۔''

اس مرتبہ سلوپ اندرونی کیفیت کو دبانے میں ناکام رہا...لیکن وہ خاموش تھا۔ ریچر اب چلے چلو، اس نے سوچا۔ سلوپ کھمبے کی طرح ایک ہی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ وہ خلا میں غیر مرئی نکتے کو گھور رہا تھا۔ پھر وہ اس کیفیت سے باہر آیا۔ نگاہ فوکس کی...... نہ تیزی سے نہ دھیمے سے۔' اسمارٹ گائے۔' ریچر نے دل میں کہا۔

''کارمن۔'' سلوپ نے کارمن کو آواز دی۔''چلتا ہوں، اپنا خیال رکھنا۔'' اس نے ریچر سے کہا۔

☆☆☆

رات گہری ہو رہی تھی۔ ملازمہ کھانا دے گئی تھی۔ ریچر فارغ ہو کر بستر پر لیٹا تھا۔ وہ سلوپ کے اگلے قدم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا وہ ریچر کا بدلہ کارمن سے لے گا۔ نہیں، وہ بو بی نہیں تھا۔ دونوں کی مڈ بھیڑ ذو معنی اور براہِ راست متصادم تھی۔ وہ کارمن کو ہاتھ لگانے سے پہلے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھائے گا۔

معاً بنک ہاؤس کی سیڑھیوں پر مدھم چرچراہٹ سنائی دی۔ ریچر نے اٹھنے میں تاخیر نہیں کی۔ لیکن وہ کارمن تھی۔ اس کا ایک ہاتھ رخسار پر تھا۔

''اس نے مارا ہے؟''

''نہیں۔''

''میں نے کیا پوچھا ہے؟''

کارمن نے دوسری طرف دیکھا۔''ہاں، ایک بار۔''

''مجھے اس کے بازو توڑ دینے چاہئیں۔'' ریچر نے کہا۔

''اس نے شیرف کو فون کیا ہے۔ وہ تمہیں یہاں سے ہٹانا چاہتا ہے۔''

''مسئلہ نہیں ہے۔ شیرف سے میں پہلے بھی نمٹ چکا ہوں۔''

''مجھے جانا ہے۔ اس کے خیال میں، میں ایلی کے ساتھ ہوں۔''

''شیرف کی فکر مت کرو، وہ بھی روایت پسند ہے۔''

☆☆☆

لیکن شیرف نے ایک کام کیا۔ اس نے معاملہ ریاست کی پولیس کے سپرد کر دیا۔ نوّے منٹ میں ٹیکساس رینجرز کی کروزر وہاں پہنچ گئی۔ کسی کی ہدایت کے مطابق وہ سیدھی بنک ہاؤس کی طرف آئی تھی۔ ریچر انجن کی آواز سن کر بستر سے اتر گیا۔ سیڑھیاں اتر کر اصطبل میں آیا۔ وہاں سے باہر نکلا تو روشنی میں نہا گیا۔ جیپ سامنے ہی کھڑی تھی۔ ونڈ شیلڈ کے بیریئر پر اسپاٹ لائٹس آن تھیں۔

کروزر کے دروازے کھلے اور دو رینجرز باہر آئے۔ وہ شیرف سے مختلف تھے۔ جوان، فٹ اور پروفیشنل۔ درمیانہ قد، ملٹری اسٹائل کا ہیئر کٹ اور ستھری یونیفارم۔ ان میں سے ایک سارجنٹ تھا اور دوسرا ٹروپر۔ ٹروپر ہسپانوی تھا، ہاتھوں میں شاٹ گن تھی۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' ریچر نے سوال کیا۔

''دونوں ہاتھ بونٹ پر رکھ دو۔'' سارجنٹ نے ہدایت جاری کی۔

ریچر آگے بڑھا اور رینجرز کی مطلوبہ پوزیشن اختیار کر لی۔ سارجنٹ نے تلاشی لینے کے بعد کہا۔''اندر بیٹھو۔''

ریچر نے کوئی حرکت نہیں کی۔''کس خوشی میں؟''

''زمین کے مالک کی درخواست ہے کہ اجنبی مداخلت کار کو جاگیر سے بے دخل کیا جائے۔''

''میں اجنبی ہوں اور نہ یہاں اپنی مرضی سے گھسا ہوں۔ میں یہاں کام کرتا ہوں۔''

''تو اس کا مطلب انہوں نے تمہیں کام سے ہٹا دیا ہے جس کے بعد تمہیں یہاں نظر نہیں آنا چاہیے۔''

''کیا یہ اسٹیٹ پولیس کا کام ہے؟'' ریچر نے اعتراض اٹھایا۔
''چھوٹی آبادی میں، کال پر ہمیں مقامی پولیس کی مدد کے لیے آنا پڑتا ہے۔'' سارجنٹ نے کہا۔
''او کے، میں چلا جاتا ہوں۔'' ریچر رخ بدل کر سیدھا ہوگیا۔
''تنہا، سڑک پر...... رات کی تاریکی میں، یہ خلافِ قانون ہوگا۔''
''کیا چاہتے ہو؟''
''تمہیں کاؤنٹی چھوڑنی ہوگی۔ ہم تم کو پیکوڈراپ کر دیں گے۔''
''میری مزدوری ان پر واجب الادا ہے۔''
''ٹھیک ہے بیٹھ جاؤ، مکان کے سامنے روک دیں گے۔''
ریچر نے کن انکھیوں سے ٹروپر کو دیکھا۔ وہ گن کے ساتھ تیار حالت میں تھا۔ ریچر نے سرسری انداز میں سارجنٹ کو دیکھا۔ اس کا ہاتھ ہینڈ گن کے دستے پر تھا۔
''ایک اور مسئلہ ہے۔'' وہ بولا۔ ''یہاں مالکن کی بہو پر تشدد ہو رہا ہے۔ اس کا ذمے دار اس کا شوہر ہے۔''
''وہ شکایت کرے گی، تب ہی ہم کچھ کر سکتے ہیں۔''
''دراصل وہ خوف زدہ ہے۔ شیرف بھی فیملی کے ساتھ دوستی نبھا رہا ہے۔ عورت کا تعلق ہسپانیہ سے ہے اور وہ کیلی فورنیا سے آئی ہے۔''
''شکایت کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔''
''شکایت تم سُن رہے ہو۔ میں بتا رہا ہوں۔'' ریچر نے کہا۔
''جس کو تکلیف ہے درخواست وہاں سے آنی چاہیے۔'' سارجنٹ نے جیپ کا دروازہ کھولا اور ریچر کے سر پر ہاتھ رکھ کے اسے جھکایا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''
ریچر نے ایک ساعت کے لیے توقف کیا، پھر بیٹھ گیا۔
رینجرز نے گاڑی مکان پر پورچ کے سامنے روک دی۔ وہاں ایلی کے سوا سب موجود تھے اور سب کے چہروں پر مسکراہٹ تھی...... سوائے کارمن کے۔
''یہ کہتا ہے، اس کو پیسے نہیں ملے؟''
''اسے بولو کے ہم پر جا کے مقدمہ کر دے۔'' بوبی نے کہا۔
ریچر کھڑکی کی طرف جھکا اور شکستہ ہسپانوی میں بلند آواز میں کارمن کو مخاطب کیا۔ ''تمہارے ساتھ جو ہو رہا ہے۔ اپنی زبان سے کہہ دو، سارجنٹ کو بتا دو۔ مسئلہ ابھی، یہیں ختم ہو جائے گا۔''
سارجنٹ نے شیشہ چڑھا کر گردن موڑی۔ ''کیا کہا؟''
''کچھ نہیں۔'' ریچر نے جواب دیا۔
''لہجہ خراب ہے...... لیکن اس نے عورت سے کہا ہے کہ اپنی پریشانی خود بتا دے۔'' ٹروپر نے سمجھایا۔
سارجنٹ نے اشارہ کیا اور کروزر گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

وہ ساٹھ میل سے زیادہ سفر طے کر چکے تھے۔ ایلی کا اسکول بھی پیچھے رہ گیا تھا۔ کروزر کا رخ پیکو کی طرف تھا۔ ریچر اپنے اگلے اقدام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کسی معاملے میں ہاتھ ڈالنے کے بعد پسپا ہونا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ اس کی افتادِ طبع ہی ایسی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ تنہا آدمی ہزاروں لاکھوں عورتوں کی تقدیر نہیں بدل سکتا۔ نہ وہ ہر مسئلے میں اندھا دھند ٹانگ اڑاتا تھا۔ الجھنے کے بعد مشن کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے وہ جان لڑا دیتا تھا۔ چھوڑنے والے کو چھوڑ دو، ملنے والے سے ملو اور اپنا راستہ پکڑو۔ یہی اس کا اصول تھا۔ وہ ایک آوارہ بادل تھا۔ مدد مانگنے والا اسے قائل کر لے تو پھر ریچر کے لیے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتا تھا۔ اس نے کارمن کو تمام آپشن گنوا دیے تھے لیکن اس نے ہر ایک کے جواب میں اپنی مجبوری واضح کی تھی۔ ایک مرتبہ وہ ڈر کی دیوار گرا دیتی تو ریچر کو لفٹ نہ دیتی۔ حتیٰ کہ رینجرز کی موجودگی میں بھی وہ اگر دو جملے بول دیتی تو منظرنامہ کچھ اور ہوتا۔ یا تو رینجرز کارروائی ڈالتے ورنہ ریچر کو حرکت میں آنے کا جواز مل جاتا۔ ان کی وردیاں، عہدے اور ہتھیار ریچر جیسے طوفان کا رخ نہیں موڑ سکتے تھے۔ ریچر نے ملٹری میں اور ملٹری سے باہر بظاہر ناممکن مشن تن تنہا نمٹائے تھے۔ وہ کارمن کو بزدلی کا الزام نہیں دے سکتا تھا۔ عورت بہرحال عورت ہوتی ہے۔ وہ غلط جگہ پھنس گئی تھی۔ عورت تو عورت، ریچر نے بدتر حالات میں مردوں کی پتلون گیلی ہوتے دیکھی تھی۔ کارمن کی بڑی مجبوری ایلی تھی۔ ایلی سے مل کر ریچر بھی متاثر ہوا تھا۔ بچی پیار کی بھوکی تھی۔ سلوپ نے کارمن کو کیوں پیشکش کی تھی کہ ایلی کو چھوڑ دو اور کہیں بھی چلی جاؤ...... خرچہ بھی دوں گا۔ کیا عزائم تھے ان کے۔ درحقیقت وہ جیل کیوں گیا تھا اور کیونکر وقت سے پہلے، وہ چھٹی والے دن نکل آیا؟
کاؤنٹی سے کروزر کا فاصلہ تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

ریچر کا ذہن بھی برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔
دفعتاً ریڈیو کال نے اسے چونکا دیا۔ ''بلیو فائیو، بلیو فائیو۔''
ٹروپر نے مائیکروفون ہک سے اتار کر سوئچ دبایا۔ ''بلیو فائیو، کاپی، اوور۔''
لال مکان والے رینچ پر پہنچو فوراً، اندرونی گڑبڑ ہے۔ اوور۔''
''کاپی۔ نوعیت بتاؤ، اوور؟''
''فی الوقت واضح نہیں ہے۔ خون خرابا شاید۔ اوور۔''
''لعنت ہے۔'' سارجنٹ بڑبڑایا۔
''کاپی، ہم جا رہے ہیں۔'' ٹروپر نے مائیکروفون جگہ پر لٹکایا۔
''شاید تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔'' ٹروپر نے ریچر سے کہا۔
ریچر خاموش رہا۔
''اب ہم کچھ کر سکیں گے۔'' سارجنٹ نے اظہارِ خیال کیا۔
''میں نے وارن کیا تھا۔'' ریچر بولا۔ ''تمہیں بھی اور کارمن کو بھی۔ کارمن نام ہے اس کا۔ دوست اس کے ساتھ کچھ زیادہ خراب ہو گیا ہے اور ذمے داری تم پر آئے گی۔ کم سے کم تین گواہ ہیں۔ میں، تمہارا ساتھی اور خود کارمن۔''
''روشن پہلو پر نظر رکھو۔ ہم ان سے رعایت نہیں کریں گے۔ اگر وہ خود اس وقت بول دیتی تو ہم اس وقت بھی کچھ نہ کچھ کرتے۔''
ریچر سمجھ گیا کہ سارجنٹ کو اپنی بیلٹ کی پڑ گئی ہے۔
گاڑی نے پھر سے الٹا سفر شروع کیا۔ وہ بہت تیز گئے۔ تاہم ریچر کے اندازے کے مطابق دو گھنٹے لگنے ہی تھے۔
شیرف کی گاڑی وہاں پہلے ہی موجود تھی۔ کروزر جا کر عین اس کے پیچھے رکی تھی۔
''چھٹی ہے...... شیرف یہاں کیا کر رہا ہے؟'' سارجنٹ نے منہ بنایا۔ باہر کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹروپر نے اُتر کر دروازہ کھولا۔ سارجنٹ نے ریچر کو گاڑی میں ہی رکنے کا اشارہ کیا اور دونوں اندر چلے گئے۔ ریچر نے بھی کسی قسم کا ردِعمل پیش نہیں کیا۔ اس نے رینجرز کا بدلا ہوا رویہ جانچ لیا تھا۔ تاہم اسے تشویش تھی کہ اندرونِ خانہ ہوا کیا ہے۔ رینجرز کے سامنے کارمن کچھ نہیں بول پائی تھی۔ بعد ازاں اگر تشدد ہوا ہے تو اس کا ردِعمل پیکو تک کیسے پہنچ گیا؟

قریب پندرہ منٹ بعد ہسپانوی ٹروپر کی شکل نظر آئی۔
آتے ہی اس نے مائیکروفون کی جانب ہاتھ بڑھایا۔
''کیا وہ ٹھیک ہے؟'' ریچر نے سوال کیا۔
ٹروپر نے کشیدگی سے سر ہلایا۔ ''بظاہر بالکل ٹھیک ہے لیکن ایک بڑی مصیبت اس کے لیے کھڑی ہو گئی ہے۔''
''کیا مطلب ہے؟''
''اس پر حملے کی کال نہیں گئی تھی بلکہ معاملہ ہی الٹ گیا...... اس نے اپنے شوہر کو گولی ماردی ہے۔''

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد ایک اور کروزر وہاں پہنچ چکی تھی۔ ایک اور ٹروپر ایک اور سارجنٹ۔ دونوں اندر چلے گئے۔ بیس منٹ بعد ایکو کاؤنٹی کا شیرف باہر آیا اور اپنی کار میں بیٹھ کر رخصت ہو گیا۔
مزید ایک گھنٹے بعد ایمبولینس نے شکل دکھائی۔ اس پر لکھا تھا۔ پریذیڈیو فائر ڈپارٹمنٹ۔ ڈرائیور نے ایمبولینس ریورس میں پورچ کے ساتھ لگائی۔ عملے نے اتر کر عقبی دروازے کھولے۔ ایک وھیل اسٹریچر نکال کر وہ اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ان کی واپسی ہوئی تو اسٹریچر پر سلوپ گریر کی لاش دھری تھی۔ جیل سے نکلے اسے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے۔ وہاں سے وہ پروانۂ آزادی، دوسری دنیا کا لے کر آیا تھا۔ ایمبولینس کے دروازے بند ہوئے اور وہ روانہ ہو گئی۔
پانچ منٹ بعد دوسری کروزر والے رینجرز نظر آئے۔ ان کے ساتھ کارمن تھی۔ اس کا چہرہ زرد لیکن بے تاثر تھا۔ پشت کی جانب اس کے دونوں ہاتھ ہتھکڑیوں میں تھے۔ رینجرز نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور روانہ ہو گئے۔ پہلے آنے والے رینجرز واپس اپنی گاڑی میں آ گئے۔ انجن اسٹارٹ ہوا اور کروزر آگے جانے والی گاڑی کے پیچھے لگ گئی۔
''کہاں لے جا رہے ہیں اسے؟'' بالآخر ریچر نے استفسار کیا۔
''پیکو۔'' سارجنٹ نے کہا۔ ''جیل میں۔''
''لیکن واردات پیکو نہیں ایکو میں ہوئی ہے۔'' ریچر نے کہا۔
''ایکو کاؤنٹی میں مشکل سے ڈیڑھ سو افراد ہوں گے۔ جن کے لیے الگ سے جیل اور کورٹ ہاؤس قائم نہیں ہو سکتے۔ نہ علیحدہ دائرۂ کار کا امکان ہے۔''
''مسئلہ الجھ جائے گا؟''
''کیوں؟''

"پیکو کاؤنٹی کا ڈسٹرکٹ اٹارنی، ہیک واکر، گریر فیملی کا دوست ہے۔ وہ اپنے دوست کے لیے گولی چلانے والے کے خلاف عدالت میں کھڑا ہوگا۔"

"اوہ، یعنی مفادات کا تصادم۔ اس کے لیے تم پریشان ہو؟"

"کیوں، اس میں وزن نہیں ہے؟" ریچر نے کہا۔

"نہیں۔" سارجنٹ نے کہا۔ "ہم ہیک واکر کو جانتے ہیں۔ وہ احمق نہیں ہے۔ وہ ڈیفنس کونسل کو کوئی موقع فراہم نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ خود جج بننے کی تیاریاں کررہا ہے۔ سلوپ تو گیا، واکر معذرت کرلے گا۔ کیس وہ اسسٹنٹ کو دے گا اور اس کی دونوں اسسٹنٹ خواتین ہیں۔"

"جج؟"

"ہاں، نومبر میں وہ جج کی پوزیشن کے لیے لڑے گا۔ اس طرح وہ کوئی رسک لیے بغیر اپنے اور ملزم کے لیے ہمدردیاں سمیٹ لے گا۔ وہ خود درمیان میں نہیں آئے گا۔"

"ہمدردی؟ نہیں سمجھا۔" ریچر نے اعتراف کیا۔

"پیکو کاؤنٹی میں میکسیکن ووٹ بہت ہیں۔ واکر نہیں چاہے گا کہ اس موقع پر اس کے بارے میں اخبارات میں کوئی خراب تاثر آئے۔ کارمن خوش قسمت ہے۔ ایکو میں میکسیکن عورت نے ایک سفید فام کو اڑا دیا۔ اور عورت کے خلاف پیکو کاؤنٹی میں مقدمہ عورت لڑے گی۔ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی۔ ملزم کے لیے اس سے اچھا کیا ہوگا۔" سارجنٹ نے وضاحت کی۔

"لیکن وہ میکسیکن نہیں ہے۔ کیلی فورنیا سے آئی ہے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے، وہ دیکھنے میں میکسیکن ہی لگتی ہے۔" سارجنٹ نے کہا۔ "اور پیکو میں ووٹ بٹورنے کے لیے یہ نکتہ اہم ہے۔"

"پیکو...... عجیب علاقہ ہے۔ کارمن نے بتایا تھا۔ یہاں ایک میوزیم ہے اور وہاں ایک مدفن ہے۔"

"کلے ایلی سن۔" سارجنٹ نے کہا۔ "وہ ایک داستانی ہیرو کے مانند تھا...... ایک بے مثال گن فائٹر۔"

"اس نے کبھی ایسے آدمی کو نہیں مارا جو موت کا حق دار نہیں تھا۔" ریچر نے کارمن کی بتائی ہوئی بات دہرائی۔

سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور ریچر کو دیکھا۔

"یہ اس کی پوزیشن ہوگی۔" "کلے ایلی سن ڈیفنس۔"

"ہاں، کیوں نہیں؟ کارمن کے پاس جواز تھا۔" ریچر بولا۔ "کم ازکم ضمانت تو مل جائے گی جبکہ وہ ایک بچی کی ماں بھی ہے...... کل تک ایسا ہونا چاہیے۔" ریچر نے ہوائی چھوڑی۔

"کل؟ بہت مشکل ہے۔ ایک لاش درمیان میں پڑی ہے۔ اس کا وکیل کون ہے؟"

"کوئی نہیں۔ اور اس کے پاس رقم بھی نہیں ہے۔"

"اچھی خبر نہیں ہے۔" سارجنٹ نے کہا۔ "بچی کی عمر کتنی ہے؟"

"چھ سال، کیوں؟"

"ضمانت کے لیے سماعت بھی نہیں ہوگی جب تک وہ ساڑھے سات سال کی نہیں ہوجاتی۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ بچی کو اس کی ضرورت ہے۔"

"قانون اور آئین یہی کہتا ہے۔ پھر یہ ٹیکساس ہے۔ سوال پیدا ہوگا کہ وکیل کب تک دستیاب ہے، فوراً ملنا مشکل ہے۔ اگر اس کی مدد کرنا چاہتے ہو تو وکیل کا انتظام کرو۔ کیونکہ ہیک واکر، الیکشن تک معاملہ لٹکائے گا۔ عورت کو لاک اپ میں ڈال کر بھول جائے گا۔ غالب امکان ہے کہ نومبر میں جج کے عہدے پر ہوگا۔ ایکو سے بھی اسے ووٹ لینے ہیں، سو، ڈیڑھ سو ہی سہی۔ صورتِ حال بدل جائے گی۔ لہٰذا میوزیم سے دھیان ہٹا کر وکیل کا بندوبست کرو۔" سارجنٹ اور ریچر نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ بالآخر وہ پیکو میں داخل ہوگئے۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ کروزر کی رفتار کم ہوئی پھر وہ رک گئی۔ آگے جانے والی گاڑی غائب ہوگئی۔

"کیا مجھے جیل کے قریب چھوڑ دوگے؟"

"یہ ٹیکسی کیب نہیں ہے۔ اب ہم پٹرولنگ شروع کریں گے۔"

"پھر میں کہاں جاؤں؟"

"ڈاؤن ٹاؤن، تین میل چلنا پڑے گا۔"

ریچر نے اترتے اترتے چند معلومات حاصل کیں۔ خصوصاً جیل کا اتا پتا معلوم کرلیا۔ اس نے بظاہر ڈاؤن ٹاؤن کا رخ کیا لیکن ارادہ جیل کی طرف جانے کا تھا۔

☆☆☆

ریچر نے دستک دیتے وقت خود کو دروازے پر نصب وڈیو کیمرے کے سامنے رکھا تھا۔ اس کے باوجود دروازہ کھولنے والے نے کافی وقت لیا۔ وہ ایک سفید فام بھاری بھرکم عورت تھی۔ اس نے کورٹ بیلیف کا یونیفارم زیب تن کیا ہوا تھا۔ کمر کے گرد چوڑی بیلٹ میں گن اور اسٹک کے علاوہ سرخ مرچوں کا اسپرے بھی موجود تھا۔ عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے ریچر کو گھور رہی تھی۔

''کارمن گریر کو یہاں لایا گیا ہے؟''
''ہاں۔''
''کیا میں مل سکتا ہوں؟''
''نہیں۔''
''ملاقات کب ہوسکتی ہے؟''
''وکیل ہو؟''
''نہیں۔''
''پھر ہفتے کو آؤ۔''
چھ دن بعد۔ ریچر نے سوچا۔
''کیا مجھے لسٹ مل جائے گی۔ اگر میں ہفتے کو آؤں تو اپنے ساتھ کیا کیا لاسکتا ہوں؟'' ریچر اندر قدم رکھنا چاہ رہا تھا۔

بیلیف نے شانے اچکائے اور اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ ریچر لابی میں اس کی رہنمائی میں آگے بڑھا۔ موٹی عورت نے ایک سیموگراف شیٹ اس کے حوالے کی۔ ''اس پر جو اشیا درج ہیں، اگر اس کے علاوہ کوئی چیز اس کے لیے لائے تو داخلہ بند ہوجائے گا۔''

اس دوران ریچر نے ڈیسک کے ایک جانب کارمن کی بیلٹ اور بیگ رکھا دیکھ لیا تھا۔ اس نے مزید رکنے کے لیے بظاہر لسٹ پڑھنا شروع کی۔ ''ڈسٹرکٹ اٹارنی کا دفتر کس طرف ہے؟''
''پہلی منزل پر۔''
''بہت کم بولتی ہے۔' ریچر نے سوچا۔ 'میری طرح۔'
''دفتر کب کھلتا ہے؟''
''ساڑھے آٹھ بجے۔''
''وکلا کہاں دستیاب ہیں؟''
''سستے یا مہنگے؟''
اور گویا ریچر کے لیے کھڑکی کھل گئی۔ ''فری!'' وہ فوراً بولا۔

موٹی عورت مسکرانے پر مجبور ہوگئی۔ ''باہر جا کر بائیں مڑنا۔ آگے چوراہے کے قریب کمیونٹی لائرز مل جائیں گے۔'' اس نے پہلی مرتبہ طویل جملہ کہا۔
''شکریہ۔ میں سمجھ گیا کہ ایسے میں کارمن کو نہیں دیکھ سکتا۔ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں؟''
''ہاں، ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں۔'' اس کی آواز میں سے خشکی غائب ہوگئی تھی۔
''اور تم؟''
''مجھے ہر پندرہ منٹ بعد اسے دیکھنا پڑتا ہے۔''
''اتنی حسین ہے وہ؟''
''تم دلچسپ آدمی ہو۔'' وہ پھر مسکرائی۔ ''وہ خودکشی نہ کرلے...... اس لیے۔ حالانکہ وہ اتنے چھوٹے دل کی لگتی نہیں ہے۔''
''تمہارے تبصرے کا شکریہ۔ ایک کام کر دینا۔ اس کو کہنا کہ ریچر ساتھ ہے...... یہیں پیکو کاؤنٹی میں۔''
''سمجھ گئی۔ کہہ دوں گی۔ تمہاری دوست یقیناً خوش ہو جائے گی۔''
ریچر مسکرایا اور ہاتھ ہلا کر باہر نکل آیا۔

☆☆☆

ریچر چوراہے کی طرف جانے کے بجائے ہائی وے پر نکل آیا۔ وہ موٹیلو کے بورڈ پڑھتا ہوا چلتا رہا۔ کرایہ گرتے گرتے تیس ڈالرز تک آگیا تو وہ رک گیا۔ موٹیل میں داخل ہو کر اس نے نائٹ کلرک کو ٹھوکا دیا۔ رسمی کارروائی کر کے کمرے کی چابی حاصل کی۔ وہ صبح آٹھ بجے تک سوتا رہا۔ بعدازاں غسل کر کے باہر نکلا۔ کافی شاپ پر بڑے سائز کے دو ڈف نٹ حلق سے اتارے۔ تین کپ کافی کے معدے میں انڈیلے اور وہاں سے اٹھ کر سستے کپڑوں کی دکان میں آگیا۔ پتلون، انڈرویئر اور ایک خاکی شرٹ خرید کر باتھ روم میں لباس تبدیل کیا۔ پرانی جیبوں میں جو کچھ تھا، نئی جیبوں میں منتقل کیا۔ کارمن کی سستی گن کے خالی کارتوس بھی منتقل کیے۔ پرانے کپڑوں کا گولا بنا کر ٹریش کین میں ٹھونسا۔ باہر آکر اس نے لباس کی مد میں تین ڈالرز ادا کیے۔ وہ ایک بار پھر کورٹ ہاؤس کی طرف جا رہا تھا۔

اس کے اندازے کے مطابق نائٹ شفٹ کو تبدیل ہونا چاہیے تھا۔ نئی شفٹ شاید کچھ نرمی دکھائے۔ نو بج گئے تھے۔ عموماً آٹھ بجے دن کی شفٹ شروع ہوتی ہے۔ یہ ٹیکساس تھا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر وہ ساڑھے نو بجے دستک آزما ہوا۔

دن کی شفٹ میں کوئی چھریرا نوجوان تھا۔ وہ موٹی عورت سے زیادہ کڑک ثابت ہوا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وکیل کے علاوہ کوئی قیدی سے نہیں مل سکتا...... ریچر نے یہ کارڈ ڈراپ کر دیا اور وکیل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ سب سے پہلے اس نے موٹی عورت کے بتائے ہوئے چوراہے کا رخ کیا۔

وہاں وکلا ایک ڈیسک لیے بیٹھے تھے۔ کلائنٹس ڈیسک کے دوسری جانب کرسی پر بیٹھے تھے۔ تمام کلائنٹ ہسپانوی

تھے۔ چند وکلا بھی ہسپانوی دکھائی دے رہے تھے۔ مجموعی طور پر سب کے سب مختلف جنس اور عمروں سے تعلق رکھتے تھے۔ مرد، عورتیں، جوان، نوجوان...... عمر رسیدہ، بوڑھے۔ کلائنٹس میں ایک چیز مشترک تھی۔ سب ہی ہراساں اور ٹوٹے ہوئے لگ رہے تھے۔

کوئی بھی وکیل فارغ نہیں تھا۔ ریچر آگے بڑھتا رہا۔ آخر اسے ایک خالی کرسی نظر آئی اور وہ بیٹھ گیا۔ دوسری جانب وکیل ایک پچیس، چھبیس سالہ گوری عورت تھی۔ اس کے بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے۔ شرٹ کے بجائے اس نے اسپورٹس برا پہنی ہوئی۔ جیکٹ کرسی کی پشت پر لٹک رہی تھی۔ وہ فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ باتیں کیا...... بسور رہی تھی۔ روہانسی نظر آ رہی تھی۔ ریچر کو لگا کہ وہ کسی وقت بھی رو دے گی۔ وہ ہسپانوی زبان استعمال کر رہی تھی۔ لہجہ دھیما تھا، لہٰذا ریچر کو سمجھنے میں دشواری کا سامنا نہیں تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''ہاں، ہم جیت گئے ہیں لیکن وہ ادائیگی نہیں کر رہا۔ صاف انکاری ہے۔'' وہ رک رک کر دوسری طرف سے کچھ سنتی اور پھر اپنی بات دہراتی۔ ''اس کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم کیا کریں؟...... لیکن...... نہیں...... نہیں واپس کورٹ کیسے جائیں گے۔ فیصلے کا نفاذ کرانے کے لیے ایک سال مزید لگ جائے گا...... نہیں...... دو سال بھی لگ سکتے ہیں...... ہاں میں سن رہی ہوں۔'' وہ بری طرح اپ سیٹ تھی اور اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''میں پھر کال کروں گی۔'' اس نے فون رکھ دیا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ڈیسک پر پڑی فائل دراز میں ڈال دی پھر ریچر کو دیکھا۔

''پرابلم؟'' الٹا ریچر نے سوال کیا۔

اس نے شانے اچکائے اور سر بھی ہلایا۔ ''کیس جیتنا بھی آدھی لڑائی جیتنے جیسا ہوتا ہے اور بعض اوقات نصف سے بھی کم......''

''کیا ہوا ہے؟ پیسے نہیں مل رہے؟''

''وہ رینچر ہے۔ اس نے میرے کلائنٹ کی گاڑی کے ساتھ ایکسیڈنٹ میں اسے اور اس کی بیوی کو زخمی کر دیا۔ میرے کلائنٹ کے ساتھ ان کے دو بچے بھی تھے۔ یہ فصل کاٹنے کا وقت تھا۔ وہ کام نہیں ہو سکا۔ میاں بیوی اسپتال میں تھے...... یوں پوری فصل تباہ ہو گئی۔'' وکیل نے روداد بیان کی۔ ''ہم نے کیس میں بیس ہزار ڈالرز ہرجانہ جیت لیا لیکن رینچر ٹال مٹول کر رہا ہے۔ میرے کلائنٹ کا تعلق میکسیکو سے ہے۔ ہم دوبارہ کورٹ میں وقت ضائع کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جبکہ رینچر کا منصوبہ یہی ہے کہ وقت ضائع ہو اور وہ قلاش ہو کر واپس میکسیکو جانے پر مجبور ہو جائیں۔''

''فصل کی انشورنس نہیں تھی؟'' ریچر نے سوال کیا۔

''پریمیئم کی شرح بلند ہونے کے باعث انشورنس مہنگی ہے۔ یہ میکسیکن اس کا بار نہیں اٹھا سکتے۔ رینچر (Rancher) کے خلاف کورٹ میں براہِ راست پروسیڈ کرنا ہی تھا۔''

''بیڈلک۔'' ریچر نے کہا۔

''میکسیکن پہلے ہی بدحالی اور ناانصافی کا شکار ہیں۔ تم یقین نہیں کرو گے کہ اس فیملی کا کیا حال ہے۔ بارڈر پٹرول نے بارہ سال پہلے ان کے بڑے لڑکے کو ہلاک کر دیا تھا۔ اس وقت وہ لوگ یہاں غیر قانونی تارکینِ وطن میں شمار ہوتے تھے۔''

''تو انہوں نے کچھ نہیں کیا؟''

''مذاق کر رہے ہو؟ کیا کرتے...... وہ غیر قانونی تھے۔ خیر چھوڑو، تمہارا کیا مسئلہ ہے؟''

''میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ عورت ہے جسے میں جانتا ہوں۔ اسے وکیل کی ضرورت ہے۔ اس نے اپنے شوہر کو گولی مار دی تھی۔''

''کب؟''

''گزشتہ رات۔ اب وہ یہیں قریبی جیل میں ہے۔''

''شوہر زندہ ہے؟''

''نہیں۔''

یہ سن کر وکیل کے شانے ڈھلک گئے۔ اس نے ایک پیڈ نکالا۔ ''تمہارا کیا نام ہے؟''

''ریچر۔'' وہ بولا۔ ''اور تمہارا؟''

''ایلس امینڈا ارون......'' اس نے پورا نام بتایا۔

''اپنی دوست کے بارے میں بتاؤ۔''

ریچر نے احوال بتاتے وقت کارمن کا وراثتی حوالہ میکسیکن بتایا...... اور ضمانت کی درخواست کی۔

''ضمانت؟ بھول جاؤ۔''

''اس کی ایک چھوٹی بچی ہے۔ چھ سال کی۔''

''کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دو طریقے ہیں۔ پہلا یہ کہ باقاعدہ مقدمہ بازی کی جائے...... مہینے صرف ہو جائیں گے۔ کیونکہ تم بتا رہے ہو کہ گواہ دستیاب نہیں ہے۔ تشدد کی نوعیت خفیہ ہے۔ شوہر کے سوا کسی کو نہیں پتا تھا۔ مزید یہ کہ میرا کیلنڈر بھی فل ہے۔ مجھے شروع کرنے میں ہی مہینے لگ جائیں گے۔ جو کہانی تم نے بتائی ہے، اس کے لیے میڈیکل ایکسپرٹ اور ریکارڈ درکار ہے۔ ایکسپرٹ ہائر کرنے کے

لیے اس کے پاس رقم نہیں ہے۔ اگرچہ ایکسپرٹ مفت میں بھی مل سکتا ہے لیکن وقت لگ جائے گا۔"

"فوری طور پر ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"فوری طور پر میں ایک وزٹ کر سکتی ہوں اور اسے جا کر کہہ سکتی ہوں۔ "ہائے، میں تمہاری وکیل ہوں۔ ایک سال بعد پھر آؤں گی۔"

ریچر نے گہری سانس لے کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ "تم نے کہا تھا کہ دو طریقے ہیں؟"

"دوسرا یہ کہ ہم ڈسٹرکٹ اٹارنی کو قائل کریں کہ وہ ضمانت کی مخالفت نہ کرے، پھر ہم بیل کے لیے جائیں گے۔ بات جا کر اٹکے گی کہ جج کس طرح دیکھتا ہے۔ اگر جج نے ڈسٹرکٹ اٹارنی کو نیوٹرل دیکھا تو ممکن ہے کہ بیل ہو جائے۔" ایلس نے دوسرا طریقہ بتایا۔

"اٹارنی ہیک واکر خود گریر فیملی کا پرانا حلیف ہے۔"

ایلس کے شانے ایک بار پھر ڈھلک گئے۔ "پھر کوئی حل نہیں ہے۔" اس نے مایوسی سے کہا۔

"لیکن تم کیس لے سکتی ہو؟"

"شیور، اسی لیے ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ لیکن تم جو توقع کر رہے ہو وہ ممکن نہیں ہے۔"

"ایلس تم کیس لے سکتی ہو تو کچھ کر بھی سکتی ہو۔"

"میں نے کہا کہ......"

"او کے او کے...... ایک ڈیل کر لیتے ہیں۔" ریچر نے ہاتھ اوپر کیا۔

"کیسی ڈیل؟"

"میں تمہارے کلائنٹ کے بیس ہزار ڈالرز آج ہی وصول کر لیتا ہوں اور تم آج ہی کارمن گریر پر کام شروع کر دو۔"

"کیا تم ڈوبے ہوئے قرضے وصول کرتے ہو؟"

"نہیں میں ڈیٹ کلکٹر نہیں ہوں۔ لیکن کیا ہوں، خود مجھے نہیں پتا...... دوبارہ ملوں گا تو بیس ہزار کا چیک لے کر آؤں گا۔"

"کیسے؟" ایلس نے حیرت سے سوال کیا۔

"وہ رینج کا مالک ہے۔ مالدار ہوگا۔ بس جا کے مانگ لوں گا۔"

ایلس نے پُرسوچ انداز میں دراز کی طرف دیکھا۔ "نہیں، کوئی نئی پریشانی کھڑی نہ ہو جائے۔"

"یہ میری پیشکش ہے۔ تمہارا مطالبہ نہیں۔" ریچر بولا۔

ایلس نے ریچر کی آنکھوں میں دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔ "میں باتھ روم سے ہو کر آتی ہوں۔"

ریچر نے دیکھا کہ وہ اس کے اندازے سے زیادہ لمبی تھی۔ وہ کھڑی ہوئی تو شارٹس نظر آئے۔ لمبی ٹانگیں اور مختصر شارٹس...... وہ عقبی دروازے میں غائب ہو گئی۔ تاہم وہ سمجھا نہیں، اچانک اسے باتھ روم کی کیوں سوجھی۔ اس نے آگے جھک کر اوپر کی دراز کھول کر سب سے اوپر والی فائل اٹھائی جس پر "دفاع" لکھا تھا۔

ریچر نے فائل کھول کر دیکھی اور ایک شیٹ نکال کر فائل واپس رکھ کر دراز بند کر دی۔ پیپر تہ کر کے اس نے شرٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اسی وقت وہ واپس آ گئی۔ وہ عقب اور سامنے...... دونوں جانب سے پُرکشش تھی۔ سر سے پیر تک بھی خوب تھی۔ ایلس کا لباس بھی سب سے مختلف تھا۔ کسی ٹینس اسٹار کے مانند۔

اسے دیکھ کر ریچر کھڑا ہو گیا۔ "ایک فیور چاہیے، کسی سے چند گھنٹے کے لیے کار ادھار دلوا دو۔"

"میرے خیال میں تم میری گاڑی لے لو۔" اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چابیاں نکالیں۔ "واکس ویگن ہے۔ گلوباکس میں نقشے بھی مل جائیں گے۔"

"شکریہ۔" ریچر چابیاں لے کر اس کی بتائی ہوئی جگہ کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

ریچر دلچسپی سے گلوباکس میں نقشوں کے نیچے پڑی گن کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے نقشے چھوڑ کر گن اٹھالی۔ یہ ہیکلر اینڈ کوش کی P7M10 تھی۔ بیرل چار انچ کی تھی۔ اعشاریہ چالیس کی دس عدد گولیاں تھیں۔ گن واپس رکھ کر اس نے سیٹ پیچھے کی اور نقشے نکالے۔ جیب سے پرچہ نکال کر پڑھا۔ بعدازاں وہ پندرہ منٹ تک نقشوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ پھر انہیں بھی لپیٹ کر رکھ دیا۔

اس نے سیلف مارا، تیسری کوشش میں انجن بیدار ہوا۔ یہ روایتی ماڈل کی بیٹل شیپ وی ڈبلیو تھی۔ گہرے زرد رنگ کی۔ نمبر پلیٹ نیویارک کی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اس سڑک پر تھا جہاں گاڑیوں کی مرمت کرنے والے قطار سے دکانوں میں بیٹھے۔ چھوٹی بڑی دکانیں تھیں، گیراج...... سروس والے۔ ریچر دھیمی رفتار سے بڑھتا رہا۔ ایک دکان کے سامنے وہ رک گیا۔ وہاں استعمال شدہ کاروں کی خرید و فروخت اور مرمت کا بورڈ لگا تھا۔ ریچر گاڑی شیڈ کے نیچے لے گیا۔ تین آدمی اٹھ کر آئے۔ ایک فورمین معلوم ہو رہا

تھا۔ ریچر گاڑی سے باہر آ گیا۔
"کلچ سیٹ کرنا ہے، نرم ہے اور بیٹری چیک کرو۔ بیٹری ٹھیک ہے تو سیلف کھول کر دیکھو۔ ایک آدمی اندر بیٹھ گیا۔ ٹانگ سے کلچ دبا دبا کر دیکھا۔ دو تین بار انجن اسٹارٹ کر کے بند کیا۔" وقت لگے گا، سیلف تو کھولنا ہی پڑے گا۔" اس نے ریچر کو بتایا۔ وی ڈبلیو، مینویل سسٹم کی تھی۔ ریچر کو اسی قسم کے جواب کی توقع تھی۔

"ٹھیک ہے آرام سے کام کرو۔ بار بار نہیں آؤں گا اور مجھے ایک کام نمٹانا ہے۔ کوئی دوسری گاڑی دو۔ میں ہو کر آتا ہوں۔"

مکینک باہر آیا تو ریچر واپس اندر بیٹھ گیا۔ اس نے باکس کھول کر نقشے اس طرح اٹھائے کہ گن نظر نہ آئے۔ باہر نکل کر چابیاں اس نے فورمین کو پکڑا دیں۔ ایک آدمی اسے شیڈ کے پیچھے لے گیا۔ اس نے ایک گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ریچر نے دیکھا۔ وہ پرانی کرائسلر لیبن کنورٹیبل تھی۔ چابیاں لیتے وقت اس نے ٹو کرنے والی رسی مانگی۔

"کیا کھینچ کرلانا ہے؟"

"کچھ نہیں، بس رسی چاہیے۔"

وہ آدمی شانے اچکا کر ایک طرف چلا گیا۔ واپسی پر اس کے ہاتھ میں موٹی رسی کا لچھا تھا۔

☆☆☆

ریچر شمال مشرق میں اس سڑک پر تھا جو چالیس میل کے بعد میکسیکو میں غائب ہو رہی تھی۔ سڑک پر چھوٹے بڑے رینج تھے۔ میل باکسز پر نام لکھے تھے...... ریچر کو "بگ ہیٹ رینج" کی تلاش تھی۔ مالک کا نام لائنڈن برور تھا۔ رینج تو اسے نظر آ گیا۔ خاصا بڑا رقبہ تھا۔ ایک مناسب جگہ پر اس نے گاڑی روکی اور اتر کر وائن کی مدد سے پہلے کرائسلر کی نمبر پلیٹیں کھولیں۔ رینج کی احاطہ بندی آئرن کی فینسی گرل سے کی گئی تھی۔ وہ داخلے کا راستہ دیکھنے کے لیے بڑھتا رہا۔ داخلی محراب بھی خوب صورت تھی۔ کچھ فاصلے پر اس نے گاڑی روکی۔ اُتر کر اطراف کا جائزہ لیا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ پول کے اوپر ایک بڑا ٹرانسفارمر نصب تھا۔ پاور لائنز خمیدہ حالت میں پول در پول چلی گئی تھیں۔ "ٹرانسفارمر کی پاور لائن T کی شکل میں تھی۔ T کا عمودی حصہ جو دراصل زمین کے متوازی تھا۔ اندر رینج میں چلا گیا تھا۔ تقریباً فٹ ڈیڑھ فٹ کے قریب ٹیلی فون کی لائن گزر رہی تھی۔ اس نے رسی نکال کر کھولی۔ بیس فٹ کے قریب کھول کر ایک سرے پر اس نے ایلس کی گن باندھی، دوسرا سرا بائیں ہاتھ میں لیا اور دائیں ہاتھ سے گن اوپر دونوں تاروں کے درمیان پھینکی۔ پہلی بار وہ مس کر گیا۔ دوسری کوشش میں گن دونوں تاروں کے خلا سے گزرتی ہوئی واپس آئی۔ ریچر نے گن کھول کر گاڑی میں ڈالی اور رسّی کے دونوں سرے تھام کر جھٹکا دیا۔ ٹیلی فون کی تار ٹوٹ گئی۔

رینج میں سفید قلعہ نما عمارت تک پہنچنے میں اسے ایک میل تک ڈرائیو کرنی پڑی۔ اس نے گاڑی روکی، انجن بند کیا۔ سیڑھیاں طے کر کے سفید کوٹھی کی بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ بیل پر انگلی رکھنے والا تھا کہ دروازے کا ایک پٹ کھلا۔ ملازمہ گرے یونیفارم میں ملبوس تھی۔ "میں یہاں لائنڈن برور سے ملنے آیا ہوں۔" ریچر نے کہا۔

"آپ کا اپائنٹمنٹ ہے؟"

"ہاں۔" اس نے اندازہ لگایا کہ ملازمہ کا تعلق فلپائن سے ہے۔

"انہوں نے بتایا نہیں مجھے...... کیا نام ہے آپ کا؟"

"رودر فورڈ بی ہیس۔" ریچر نے کہا۔ ملازمہ کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "یولیس جی گرانٹ کے بعد رودر فورڈ انیسواں صدر تھا۔" وہ بولی

"آپ کی یادداشت اچھی ہے۔" ریچر نے ستائش کی۔ "رودر فورڈ میرے آبا و اجداد میں سے ایک تھے۔ مسٹر برور کو بتایئے کہ میں سان انٹونیو کے بینک میں کام کرتا ہوں۔ بینک میں حال ہی میں انکشاف ہوا ہے کہ مسٹر برور کے دادا کے ایک ملین ڈالرز کے شیئرز بینک میں پڑے ہیں۔"

"میں ان کو بتاتی ہوں۔" وہ پلٹی اور ریچر نے بھی آہستگی سے اندر قدم رکھ دیا۔ کوٹھی اندر سے بھی شاندار تھی۔ ملازمہ چوڑے ہال سے گزر کر سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس اترتی نظر آئی۔ "وہ آپ کو اوپر عقبی جانب بالکونی میں ملیں گے۔" ملازمہ نے بتایا کہ بالکونی تک وہ کیسے پہنچے گا۔ ریچر سر ہلا کر ہال سے گزرا اور سیڑھیاں طے کرنے لگا۔

☆☆☆

بالکونی کافی چوڑی اور کوٹھی کے چاروں طرف تھی۔ وہاں قیمتی فرنیچر بھی موجود تھا۔ ایک میز پر ساٹھ سالہ آدمی بیٹھا تھا جس کی گردن بھینسے کے مانند موٹی تھی۔ سامنے لیمونیڈ رکھا تھا۔

"مسٹر ہیس؟" اس نے کہا۔ انداز سوالیہ تھا۔ ریچر آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کتنے بچے ہوں گے؟'' ریچر نے سوال کیا۔
''میرے تین بچے ہیں۔''
''کوئی نظر نہیں آیا؟''
''تینوں کام پر ہیں۔''
''بیگم؟''
''ہیوسٹن، چند روز کے لیے......'' وہ کچھ بے قرار ہوا۔
''بس تم اور ملازمہ؟''
''یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟'' وہ مزید الجھ گیا۔لیکن شائستگی کا دامن تھامے رکھا۔ملین ڈالرز کا سوال تھا۔
''میں بینکر ہوں۔پوچھنا پڑتا ہے۔'' ریچر نے جواب دیا۔
''شیئرز کے بارے میں بتاؤ۔''
''کیسے شیئرز۔میں نے جھوٹ بولا تھا۔''
برور کے چہرے پر حیرت نظر آئی جو مایوسی میں تبدیل ہوکر کڑواہٹ میں بدل گئی۔
''یہاں کیا کررہے ہو؟''
''میں لون آفیسر ہوں۔یہ ہمارا طریقہ کار ہے۔''
برور کا ہاتھ میز کے نیچے گیا اور گھنٹی لے کر واپس آیا۔
اس نے زور سے گھنٹی پر ہاتھ مارا۔معمولی آواز پیدا ہوئی۔
''ماریا!''
ملازمہ بالکونی میں ہی کسی طرف سے نمودار ہوئی۔
''پولیس کو کال کرو۔'' برور بولا۔''اس آدمی کو گرفتار ہونا چاہیے۔''
وہ واپس ایک کمرے میں چلی گئی۔دو منٹ بعد اندر سے ہی اس کی آواز آئی۔''فون خراب ہے۔'' پھر ملازمہ نے شکل دکھائی۔
''تم جاؤ۔'' ریچر نے کہا۔
''کیا چاہتے ہو؟''
''اپنے قانونی وعدے پورے کرو۔کیا مسئلہ ہے۔اتنی عمر ہوگئی۔اتنا مال لے کر بیٹھے ہو؟''
برور کے تاثرات بدلے۔اس نے کھڑا ہونا شروع کیا۔ریچر نے دونوں بازو پھیلا کر سیدھے کیے اور سختی سے اسے واپس کرسی میں دھکیلا۔برور کا وزن زیادہ تھا۔وہ واپس کرسی میں گرا اور اسے لے کر الٹ گیا۔اس کے حلق سے کراہ خارج ہوئی۔
''تم ایسا کیوں کررہے ہو؟'' اس کے چہرے پر ہراس نظر آیا۔

''میں نرم دل آدمی ہوں۔ایک غریب میکسیکن فیملی کو ذلیل وخوار ہوتے نہیں دیکھ سکتا......لوگوں کی یہ حالت مجھے اچھی نہیں لگتی۔''
''وہ میکسیکو واپس جاسکتے ہیں۔'' برور ابھی تک نیچے پڑا تھا۔
ریچر نے لیمونیڈ کا گلاس اٹھا کر اس کی موٹی گردن پر انڈیل دیا۔
''چلو اٹھ کے بیٹھو۔گردن کی طرح تمہاری عقل بھی موٹی ہے......مجھے تمہاری فیملی کے حالات کی فکر ہے۔''
''میری فیملی؟''
''ہاں، تم نے میرے دماغ میں آگ لگا دی ہے۔نتیجہ تمہاری فیملی بھگتے گی۔ان پر حملہ بھی ہوسکتا ہے۔ایکسیڈنٹ بھی ہوسکتا ہے۔سیڑھیوں سے گر کر تم ٹانگ تڑوا سکتے ہو۔گھر میں آگ لگ سکتی، تمہیں ہارٹ اٹیک ہوسکتا ہے......اور بہت کچھ۔ممکن ہے یہ حادثے اوپر تلے ہوں گے اور تمہاری بیوی......تمہیں کیا معلوم کہ وہ چند روز میں واپس آجائے گی۔''
''تم بچ نہیں سکو گے۔''
''اووپس (OOPS)......ذرا یہ جگ پکڑانا۔''
وہ بیٹھ چکا تھا۔اس نے ہچکچاتے ہوئے جگ اٹھایا۔
ریچر نے کرسٹل کا قیمتی جگ نیچے پختہ ورانڈے میں اچھال دیا۔چھوٹا سا دھماکا ہوا۔جگ ریزہ ریزہ ہوگیا۔''ہزار ڈالرز کا تو ہوگا۔یہیں بیٹھے بیس ہزار مٹی کردوں گا۔'' وہ غرایا۔''پھر تمہیں نیچے پھینکوں گا۔''
''میں تمہیں گرفتار کرادوں گا۔'' برور نے مری مری آواز میں کہا۔
''کیوں؟ تم تو لیگل سسٹم پر یقین نہیں رکھتے یا پھر یہ صرف تمہارے لیے ہے۔تم اسپیشل ہو؟ چیک سائن کرو۔''
برور نے منہ کھولا...اور ریچر نے اس کی طرف قدم بڑھایا۔
''او کے۔'' وہ ریچر کو اسٹڈی میں لے آیا۔ریچر عین اس کے عقب میں کھڑا تھا۔کہیں وہ ڈیسک میں سے ریوالور نہ نکال لے......
''اگر یہ باؤنس ہوا تو سمجھ لو کیا ہوگا۔'' ریچر نے چیک پکڑا۔
''نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

☆☆☆

ریچر نے کرائسلر کی پلیٹس واپس فٹ کیں۔دکان

سے ایلس کی گاڑی لیتے وقت چالیس ڈالرز خرچ کیے، نقشے اور گن وی ڈبلیو میں جگہ پر رکھیں اور ایلس کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ ڈیسک پر موجود تھی۔ گاڑی جگہ پر لگا کے ایلس کے پاس آیا۔ ایلس کے سامنے ایک فیملی موجود تھی۔ اس نے اپنا لباس تبدیل کر لیا تھا۔ سیاہ پتلون اور سیاہ جیکٹ۔ وہ فون پر بات کر رہی تھی۔ وہی مسئلہ چل رہا تھا۔ بلکہ فیملی بھی منہ لٹکائے کھڑی تھی۔ ریچر کو دیکھ کر ایلس نے بات ختم کر دی۔

''اچھی لگ رہی ہو۔''

ایلس نے نگاہِ ناز سے تنبیہ کی۔ ''ہمارے لیے مسئلہ ہے۔'' وہ بولی۔ ''ہیک واکر تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

''مجھ سے؟ کیوں؟''

''بہتر ہے کہ براہِ راست معلوم کرو۔'' ایلس نے کہا اور فون کی طرف متوجہ ہوئی۔ ریچر نے جیب سے چیک نکال کر ڈیسک پر رکھ دیا۔ ایلس نے فون پر بات پھر ادھوری چھوڑ دی۔ چیک دیکھا، پھر فیملی کو...... آخر میں ریچر پر نظر ڈالی۔ ریچر نے چابیاں بھی ڈیسک پر ڈالیں، مڑا اور کورٹ ہاؤس کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

وہاں پہلی منزل تمام کی تمام ڈسٹرکٹ اٹارنی کے پاس تھی۔ سیکریٹریز اور دونوں اسسٹنٹ کے آفس بھی وہیں تھے۔ ریچر کو گزشتہ شب کے مانند روک لیا گیا۔ اس نے مدعا بیان کیا تو بیلف نے فون کرنے کے بعد اسے اوپر جانے دیا۔

چند منٹ بعد ریچر، واکر کے دفتر کے سامنے تھا۔ اس نے ایک بار دستک دی اور ردِعمل کا انتظار کیے بغیر دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ کشادہ میز کے دوسری طرف بیٹھا تھا۔

''سٹ ڈاؤن، پلیز۔'' اس نے ریچر سے کہا۔ ریچر نے بیٹھتے وقت کرسی کا زاویہ ترچھا کر دیا۔ وہ دروازے اور شیشے کے باہر بھی نظر رکھنا چاہتا تھا۔ واکر ایک فوٹو دیکھ رہا تھا۔ ریچر نے وہ فوٹو سلوپ کے گھر میں بھی دیکھی تھی۔

''میں، سلوپ اور ال یوجن۔'' واکر نے کہا۔ ''سلوپ مر چکا ہے۔ یوجن کا پتا نہیں چل رہا۔''

''میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''سمجھ نہیں آ رہا کیا کہوں۔ میں جج بننا چاہتا ہوں۔ سب جانتے ہیں۔ غالباً تم بھی آگاہ ہو۔ ٹیکساس کا معاملہ مختلف ہے۔ عجیب ریاست ہے۔ مجھے الیکشن جیتنا ہوگا۔ یہاں بہت امیر افراد بھی ہیں اور بہت غریب بھی۔ غربا کو وکیل کورٹ مہیا کرتا ہے اور یہ جج کی صوابدید ہے۔ وہ جسے چاہے مقرر کر دے۔ فیس بھی جج طے کرتا ہے۔ اگرچہ یہ سرپرستی ہے لیکن جج ایسا وکیل اپائنٹ کرتا ہے جو انتخابی مہم میں اس کا ساتھ دے۔''

''اچھی بات نہیں ہے۔'' ریچر نے تبصرہ کیا۔

''یا تو میں جج کے ٹارگٹ پر توجہ مرکوز رکھوں...لیکن ڈی اے آفس کا کیس میں یا میرے اسسٹنٹ پراسیکیوٹ کرتے ہیں تو ڈیفنس اس کے بخیے ادھیڑنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔''

''کارمن کا ڈیفنس سولڈ ہے۔'' ریچر نے کہا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے...... میں دونوں طرف سے پھنس رہا ہوں۔''

''ظاہر ہے تم خود کو بچاؤ گے۔''

''ہاں، لیکن یہ میرا آفس ہے۔''

''میں سمجھ نہیں رہا ہوں۔ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟''

''او، میں...... میں ایک ہسپانک عورت کو موت کی سزا دینے جا رہا ہوں اور یہاں ہسپانیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ میرا جج بننا ممکن نہیں رہے گا۔''

''تم کہہ رہے ہو کہ ڈیفنس، استغاثہ کو اڑا دے گا؟''

''نہیں اڑا سکتا۔''

''اس کیس سے ہٹ جاؤ۔''

''دیکھو اگر شوہر کا تشدد بیوی پر ثابت ہو جاتا ہے تو کیس میں جان ہے لیکن یہاں کارمن بُری طرح پھنس گئی ہے......'' واکر نے تفصیل سے نکات کی وضاحت کی۔ ریچر سنتا رہا۔

''اب میں جو کہنے جا رہا ہوں، اسے خاموشی سے سننا۔ شاید تمہیں تکلیف ہو۔''

ریچر نے کچھ نہیں کہا۔

''اس نے تمہیں بتایا ہوگا کہ وہ UCLA میں سلوپ سے ملی تھی۔ ان کی شادی ہو گئی۔ کارمن کی فیملی نے کارمن سے ترکِ تعلق کر لیا۔ ایلی، سلوپ اور کارمن کی بیٹی ہے۔''

ریچر خاموش تھا۔

''اس نے بتایا ہوگا کہ سلوپ اسے مارتا تھا اور اس بات کو چھپانے پر مجبور کرتا تھا۔ اس نے کہا ہوگا کہ IRS کو اشارہ خود کارمن نے دیا تھا اور سلوپ کی واپسی کی خبر نے اسے سخت تشویش میں مبتلا کر دیا۔''

ریچر خاموش رہا۔

''وہ جھوٹ بولتی رہی ہے۔ پہلے میں تمہیں بتا دوں کہ

تم بھی جرح کی زد میں آؤ گے۔ اگر میں کہیں غلطی پر ہوں تو معاف کر دینا۔ اس نے سلوپ کو مارنے کے لیے جھوٹی کہانیاں سنا کر تمہیں گھیرا۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے تمہیں سیکس کی آفر بھی کی ہوگی۔''

ریچر خاموش رہا۔

''ثبوت، شواہد، واقعات...... سب اس کے خلاف ہیں۔ عدالت میں جب ہم تم سے پوچھیں گے کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے تو تم جواب دو گے؟''

''پھر؟''

''پھر اس کا اعتبار ختم ہو جائے گا۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ میں اس عورت کو جانتا ہوں...... اچھی طرح۔ اس کا تعلق متمول گھرانے سے نہیں ہے۔ نہ ناپا ویلی میں اس کی زمینیں ہیں۔ اس کے والدین کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ وہ لاس اینجلس کے کلب میں عریاں رقص کرتی تھی۔ UCLA کی پارٹیوں میں آنا جانا تھا...... وہیں سلوپ کی شکل میں اسے اپنا شکار نظر آیا اور اس نے یہ شکار کامیابی سے کھیلا۔ میں سلوپ کو بھی جانتا ہوں، وہ اس سے محبت کرتا تھا، جبکہ وہ ایک طوائف تھی۔''

''اگر یہ سب سچ ہے تو کیا سلوپ کو حق مل جاتا ہے کہ وہ اس پر ہاتھ اٹھائے؟''

''یہ حق اس کو نہیں ہے لیکن اس نے کبھی کارمن پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ ٹیکساس میں کوئی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ سلوپ میں کچھ خامیاں ضرور ہیں لیکن ان کا تعلق کارمن سے نہیں ہے۔ تشدد کی کہانی صرف تم جانتے ہو...... میڈیکل ریکارڈ میں بھی وہ پھنس جائے گی......'' واکر پندرہ منٹ اور بولتا رہا پھر چپ ہو گیا۔

☆☆☆

''پھر کیا کہتے ہو کارمن کے لیے...... ہاں یا ناں؟''

ایلس نے ریچر کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس نے مجھے قائل کر دیا ہے۔'' ریچر نے کہا۔

''تم یہاں کی قانونی موشگافیوں کو سمجھ گئے ہو۔''

ریچر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اگر تشدد ہوا ہے تو ثابت کرنا دشوار ہے۔'' ایلس نے کہا۔ ''اگر نہیں ہوا تو پھر یہ مرڈر ہے۔ تم جو بتا رہے ہو، اس کے مطابق اس کا اعتبار صفر ہو گیا ہے۔''

''واکر جج بننے کے لیے مرا جا رہا ہے۔ ورنہ شاید کچھ بچت ہو جاتی اور کیس بُری طرح بگڑتا نظر آرہا ہے جس کا اثر پراسیکیوشن آفس پر پڑے گا۔ ردِعمل میں جج بننے کے امکانات محدود ہو جائیں گے......'' ریچر نے اختصار کا مظاہرہ کیا۔ ''وہ اس کو بچانے کی کوشش کرتا ہے تو ڈیفنس آڑے آتا ہے، بصورتِ دیگر...... ووٹرز۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''اس صورتِ حال پر تم خوش ہو؟''

''نہیں۔'' ایلس نے کہا۔ ''اخلاقی طور پر نہ عملی...... ممکن ہے کہ واکر کی دلچسپی جج کے علاوہ بھی کہیں اور ہو۔ مستقبل میں جس کے سامنے آنے کا امکان ہے...... نومبر بہت دور ہے۔ ہم اس پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنا حماقت ہوگا۔ کارمن اس کے لیے ٹیکنیکل پرابلم ہے جو کسی وقت بھی حل ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ سمجھ رہی ہو اور ڈیفنس کے بارے میں محتاط ہو۔''

ریچر مسکرایا۔ ''تمہارا ذہن تمہاری طرح اسمارٹ ہے...... میرے اندازے کے برخلاف۔''

''واکر کا مشورہ خطرناک ہے۔ تم کٹہرے سے دور رہنا۔ فی الوقت گن، ثابت کرنے والی واحد چیز ہے۔ ہم جرح کر سکتے ہیں کہ گن کی خریداری اور اس کے استعمال کو آپس میں منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ کسی اور مقصد کے لیے اس نے گن خریدی ہو۔''

ریچر خاموش رہا۔

''لیب ٹیسٹ کے بعد دو افراد کے فنگر پرنٹس سامنے آسکتے ہیں۔'' ایلس نے بات جاری رکھی۔ ''کارمن اور سلوپ کے۔ ممکن ہے کہ جھگڑے کے دوران حادثاتی طور پر سلوپ مارا گیا ہو۔ میرا مطلب ہے کشمکش کے دوران۔''

ریچر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''دوسری انگلیوں کے نشانات میرے نکلیں گے......'' اس نے ایلس کو شوٹنگ پریکٹس کے بارے میں بتایا۔

''ہم الٹی سائیکل چلائیں گے۔'' ایلس بولی۔ ''ہم آغاز کریں گے کہ واردات یا حادثے کی منصوبہ بندی پہلے سے نہیں کی گئی تھی۔ پھر ہم میڈیکل ریکارڈ سے تشدد ثابت کریں گے۔ میں کاغذی کارروائی شروع کرتی ہوں۔ بعدازاں ہم ڈی اے آفس میں ملیں گے اور سمن کے لیے کارروائی ڈالیں گے۔''

''ایلی کا کیا ہوگا؟'' ریچر نے سوال کیا۔

''مثبت میڈیکل ریکارڈ کے لیے دعا کرو تا کہ ہم واکر کو کہہ سکیں کہ وہ چارجز ڈراپ کرے۔'' ایلس نے کہا۔

”کارمن سے کب ملو گی؟“

”بعد میں، آج دو تین بجے تک بینک سے بیس ہزار کیش بھی نکالنا ہے۔ گروسری بیگ میں رکھ کر لاؤں گی۔ فیملی تک پہنچاؤں گی۔ اس دوران تم میرے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دو گے اور بتاؤ گے کہ تم چیک کیسے لے کر آئے......“

”ڈیوٹی اچھی ہے۔ میں تیار ہوں۔ پتلون پھر غائب؟“

”پتلون اچھی لگتی ہے؟“

”نہیں، گرمی میں یہی ٹھیک ہے۔“ وہ مسکرایا۔

بینک سے رقم نکلوا کر ایلس اپنے کلائنٹ گراہم کے گھر گئی۔ ریچر ہمراہ تھا۔ گراہم فیملی کی سکونت اور حال احوال ہر شے سے افلاس اور پریشانی آشکارا تھی۔ ایلس کے پہنچنے پر وہاں جشن کی سی کیفیت پیدا ہوگئی جو قابلِ دید تھی۔ غالباً ایلس نے پہلے ہی فون کر دیا تھا، ان کا ٹرک خراب پڑا تھا۔ کھاد اور بیج کے پیسے تک نہیں تھے۔ بل چڑھے ہوئے تھے۔ اریگیشن پمپ کے لیے ڈیزل بھی نہیں تھا۔ انہیں دوسری زندگی ملی تھی۔ ریچر سوچ رہا تھا کہ اس نے رینجر برور کو سستا چھوڑ دیا تھا۔ گراہم کی فیملی، ایلس اور ریچر کے آگے بچھی جا رہی تھی۔

ریچر کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک دیوار پر اسے فریم شدہ تصویر نظر آئی۔ فوٹو میں کم عمر لڑکے کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ تھی۔

”میرا بڑا بیٹا...... اس وقت ہم نے میکسیکو کا گاؤں چھوڑا تھا۔“

ریچر پلٹا۔ گراہم کی بیوی اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ وہ دوبارہ بولی۔ ”اس کا نام رولی ہے؟...... بارڈر پٹرول نے اسے مار دیا۔“

”آئی ایم سوری۔“ ریچر نے کہا۔

”اس رات ہم تین گھنٹے بھاگتے رہے۔ ہم جانتے تھے کہ وہ گرفتار نہیں کریں گے۔ مار دیں گے۔ رولی نے بہن کو بچانے کے لیے راستہ الگ کر لیا۔ لڑکیوں کو وہ نہیں چھوڑتے تھے۔ رولی مارا گیا۔ وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کے لیے وہ سب ایک اسپورٹس تھا۔“ مسز گراہم کے چہرے پر غم کا سایہ اتر آیا۔ ریچر نے ایک بار پھر معذرت کی اور تصویر کے پاس سے ہٹ گیا۔

عورت نے شانے اچکائے۔ ”وہ بہت برا وقت تھا۔ علاقہ بھی بہت برا تھا۔ بیشتر لڑکیاں غائب ہوگئیں۔ اس سال تین سے زیادہ افراد نشانہ بنے۔“ وہ چپ ہوگئی۔ گراہم نے اسے آواز دی اور دونوں ماں بیٹی مل کر طعام کی میز سجانے لگے۔

”کیا تفتیش نہیں ہوئی تھی؟“ ریچر نے سوال کیا۔

”ہوئی تھی، کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔“

”قتلِ عام کا سلسلہ رک گیا تھا؟“

”ہاں جیسے شروع ہوا تھا، اچانک ویسے ہی تھم گیا۔ شاید انہیں خطرے کا احساس ہوگیا تھا۔“ مسز گراہم نے کہا۔

”کیا وہ بارڈر پٹرول کے آدمی تھے؟“

”وہ...... وہ پتا نہیں کون تھے۔ شاید تھے...... یا شاید نہیں تھے۔“

☆☆☆

اس وقت وہ ڈی اے آفس میں تھا۔ ”گن پر تمہاری انگلیوں کے نشانات بھی ہیں۔“ واکر نے ریچر سے کہا۔ ”نیشنل ڈیٹا بیس میں یہ نشانات پہلے ہی موجود ہیں۔“

”جانتا ہوں۔“

”شاید تمہیں گن ملی ہو اور تم نے کہیں ڈال دی ہو یا کسی کو واپس کر دی ہو......“

”شاید۔“

”تم عبادت بھی کرتے ہو؟“

”نہیں۔“

”تو پھر شکر ادا کرو۔ تمہیں عبادت کرنی چاہیے۔ تم خوش قسمت رہے کہ واردات کے وقت رینجرز کے ساتھ تھے۔ ویری لکی! گن پر، گولیوں پر، میگزین پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ہیں۔ گن اس نے خریدی تھی۔ اس کی ملکیت ہے لیکن استعمال تم نے کی۔“

ریچر خاموش رہا۔

”میں منصوبہ بندی کی طرف آتا ہوں۔“ واکر بولا۔ ”اس نے گن سلوپ کو مارنے کے لیے ہی خریدی تھی۔ تاہم اسے ایک بندہ چاہیے تھا اور تم مل گئے۔ تمہارا ملٹری ریکارڈ بتاتا ہے کہ تم کئی سال تک متواتر چیمپئن شوٹر رہ چکے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ کارمن نے اپنی مظلومیت کی داستان سنا کر کہا ہوگا کہ تم سلوپ کو ٹھکانے لگا دو۔ تم پھر لکی رہے...... شاید تم نے انکار کر دیا ہوگا۔“

”اب تمہارا کیا منصوبہ ہے؟“

”میں میڈیکل ریکارڈ کا انتظار کر رہا ہوں، کل تک یہ ہو جائے گا پھر میں ڈیفنس ایکسپرٹ ہائر کروں گا کہ وہ ریکارڈ چیک کرے۔ خفیف سا امکان ہے کہ کارمن سچ بول رہی ہو...... یوجین کے دفتر سے مالیات سے متعلق کچھ کاغذات

آئے ہیں۔ اگر میڈیکل رپورٹس اچھی آجاتی ہیں اور کوئی مالی محرک بھی نہیں ہے تو میں آرام سے ہو جاؤں گا۔''
''ٹھیک ہے، تم آرام کرو۔ ہم کل ملیں گے۔'' ریچر نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ ایلس کی طرف جارہا تھا۔ ایلس کو ڈیسک پر دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔
''کارمن سے ملاقات ہوئی؟''
''ہاں۔''
''کیا کہہ رہی ہے، وہ؟''
''وہ نہیں چاہتی کہ میں اس کی نمائندگی کروں۔''
''کیا بکواس ہے؟''
''کچھ نہیں کہہ سکتی۔ پُرسکون اور نیوٹرل دکھائی دے رہی تھی۔''
''تم نے دباؤ ڈالا؟''
''ہاں، لیکن وہ آپے سے باہر ہونے لگی تھی۔''
''تم نے بتایا کہ میں نے بھیجا تھا؟''
''ہاں، لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔''
''سات بجے دوبارہ جاؤ۔ تقریباً سناٹا ہوگا۔ آٹھ بجے شفٹ بدل جائے گی۔ وہ شور مچائے تو مچانے دینا۔''
''ہاں، تم کہاں ملو گے؟''
ہائی وے پر آخری موٹیل میں۔ کمرا نمبر 11۔ نام ملارڈ فل مور۔''
''ملارڈ فل مور کون ہے؟''
''ابراہم لنکن سے پہلے، تیرا صدر۔''
موٹیل پہنچ کر وہ نہا دھو کر بستر پر دراز ہو گیا اور ایلس کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

عین اسی وقت قاتل ٹولا، پیکو کاؤنٹی سے سو میل کے فاصلے پر ایک موٹیل میں کال وصول کر رہا تھا۔ کال، ڈلاس سے ویگاس اور وہاں سے موٹیل تک آئی تھی۔ کال کرنے والا قاتل ٹولے کو نیا کام تفویض کر رہا تھا۔ ٹارگٹ پیکو میں تھا اور آدمی تھا۔ کال کرنے والے نے اس کی عمر، حلیہ اور نام بتایا۔ اور یہ بھی بتایا کہ ٹارگٹ اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں کہاں مل سکتا ہے۔
کال عورت نے وصول کی تھی۔ اس نے لکھا کچھ نہیں۔ صرف سنتی رہی۔ جب کالر نے بات ختم کی تو عورت نے معاوضہ بتایا۔ دوسری جانب خاموشی کا وقفہ آیا۔ کال کرنے والا شاید سودے بازی کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور اوکے کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

ایلس نو بجے کے بعد ریچر تک پہنچی۔ وہ دوبارہ سیاہ پتلون اور جیکٹ میں نظر آرہی تھی۔ ریچر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ گہری سانس لے کر بستر پر ریچر کے قریب ہی بیٹھ گئی۔
''وہاں، ادھر...... کرسی پر بیٹھو۔''
''ڈرومت، کاٹوں گی نہیں۔'' ایلس نے جیکٹ اتار دی۔ ''سب سے پہلے میں نے کارمن سے پوچھا کہ میرا مسئلہ تو نہیں ہے؟ اسے کوئی چاہیے۔ کوئی مرد وکیل، ہسپانک...... بوڑھا؟ اس نے جواب میں کہا کہ اسے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔''
''کیا پاگل پن ہے؟'' ریچر بڑبڑایا۔
''ریچر، میں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔'' ایلس نے کہا۔ ''میں نے اس سے کہا کہ اپنا بازو دکھاؤ۔ جواب آیا۔ کس لیے؟ میں نے کہا کہ میں تمہاری نسیں دیکھنا چاہتی ہوں کہ زہریلا انجکشن کون سی نس میں کتنی آسانی سے جائے گا۔ شیشے کے پیچھے سے لوگ اسے موت کی وادی میں اترتا دیکھیں گے۔ اس کی لاش کو کہاں رکھا جائے گا...... وغیرہ وغیرہ۔''
''اور؟''
''نہیں بھئی۔ وہ تو جیسے پتھر کی بن گئی ہے۔ میں تو اب یہ سوچ رہی ہوں کہ اگر اس نے لکھ کر دے دیا تو پھر میں بھی اس سے نہیں مل سکوں گی۔''
''پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''
''ہمیں چاہیے کہ اسے مکمل طور پر نظرانداز کر دیں اور ہیک واکر پر توجہ مرکوز کریں۔ اگر ہم واکر کو قائل یا مجبور کر لیتے ہیں کہ وہ چارجز ڈراپ کر دے۔ تو پھر کارمن چاہے نہ چاہے اسے باہر آنا پڑے گا۔'' ایلس نے لائحہ عمل بتایا۔

☆☆☆

''واکر نے یہ پیکٹ بھجوایا ہے۔'' ایلس نے فیڈیکس کا پیکٹ ڈیسک پر آگے کیا۔ ''کارمن کی اصلی میڈیکل رپورٹس۔ واکر خود توتیس پر کانفرنس میں ہوگا۔'' ایلس نے ریچر کو بتایا۔ ایلس کے سامنے ایک ہسپانک بیٹھا تھا۔ ایلس نے ہسپانک کے ساتھ بات ختم کر کے ریچر کو مخاطب کیا تھا۔ ریچر نے ہسپانک کو دیکھا پھر ایلس کو۔
''مسٹر'' اس نے ہسپانک کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
''کام ہو گیا؟''
اس نے سر اٹھا کر ریچر کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

''جایئے پھر...... میں زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا......''
اس کے جانے کے بعد ریچر نے ایلس کو دیکھا۔
''تمہارے پاس اور بہتر ملبوسات نہیں ہیں؟''
وہ ہنس پڑی۔ ''گرمی دیکھو کتنی ہے......''
''ہاں، وہ تو ہے۔'' ریچر نے پیکٹ کی طرف دیکھا جو توقع کے برخلاف کافی نحیف تھا۔ ایلس نے اسے کھول کر کاغذات نکالے۔ کل چار رپورٹس تھیں۔ پہلی ایلی کی پیدائش سے متعلق تھی۔ اس میں مطلب کی کوئی بات نہیں تھی۔ دوسری رپورٹ، ایلی کی پیدائش کے پندرہ مہینے بعد کی تھی۔ یہ ایکسرے رپورٹ تھی جس میں دو پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ وجہ کی جگہ لکھا تھا کہ کارمن گھوڑے سے گر کر ریلنگ سے ٹکرائی تھی۔ اس کے چھ مہینے بعد تیسری رپورٹ تھی۔ اس میں بھی وہ گھوڑے سے گری تھی۔ جب گھوڑا رکاوٹ عبور کرنے کے لیے جمپ لگا رہا تھا۔ وہ گر کر پول سے ٹکرائی اور دائیں پنڈلی کا نچلا حصہ خاصا زخمی ہو گیا۔ تاہم ہڈی محفوظ رہی۔ اس حادثے کے ڈھائی سال بعد چوتھی رپورٹ ہنسلی کی ہڈی کے ٹوٹنے کا اعلان کر رہی تھی۔ ایکسرے موجود تھا۔ گھڑسواری کا ذکر نہیں تھا۔
''یہ ناکافی ہیں، ایلس۔'' ریچر نے کہا۔ ''بازو ٹوٹنے کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے بیان کے مطابق جبڑا بھی ٹوٹا تھا اور ایک مرتبہ اسے تین دانت پھر سے بٹھانے پڑے تھے۔''
''دو امکان ہیں...... رپورٹس میں گڑبڑ یا پھر وہ جھوٹ بولتی رہی ہے۔ ریچر، میڈیکل ریکارڈ کی صحت پر شک کرنا بہت مشکل ہے۔ ہاں جھوٹ بولنے والی بات صحیح ہو سکتی ہے۔ یہ مبالغہ آرائی تمہاری مدد حاصل کرنے کے لیے تھی۔''
ریچر نے گھڑی دیکھی۔ ''آؤ واکر کو دیکھتے ہیں۔''

☆☆☆

واکر کے دفتر میں ایک معمر شخص پہلے سے موجود تھا۔ واکر نے جیکٹ اتاری ہوئی تھی۔ بشرے سے تشویش ہویدا تھی۔ اس نے معمر شخص کا تعارف ''کوون بلیک'' کی حیثیت سے کرایا۔ بلیک، فارنسک میڈیسن میں پروفیسر تھا۔ چاروں نے مصافحہ کیا۔ متعارف ہوئے اور آس پاس بیٹھ گئے۔ رپورٹس کی چار نقول ترتیب سے واکر کے سامنے رکھی تھیں۔
پہلی رپورٹ میں زچگی کی تفصیلات کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ پروفیسر بلیک ایکسرے دیکھنا چاہتا تھا۔ ریچر نے فیڈیکس کا پیکٹ اس کے حوالے کر دیا۔ پروفیسر نے ایکسرے فلمز روشنی کی طرف کر کے بغور جائزہ لیا اور انہیں واپس فولڈر میں رکھ دیا۔ اگلی دو رپورٹس پر کافی سیر حاصل گفتگو ہوئی...... سوال، جواب، اعتراض...... وضاحتیں...... امکانات...... پروفیسر نے تمام امکانات بڑی وضاحت سے رد کر دیے۔ وہ اپنے شعبے کا ماہر تھا۔ آخری رپورٹ کالر بون کی تھی۔
''یہ کلاسیک انجری ہے۔'' پروفیسر بولا۔ ''ہنسلی کی ہڈی کی حیثیت سرکٹ بریکر کے مانند ہوتی ہے۔ جب انسان نیچے گرتا ہے، چاہے چلتے چلتے گرے...... اسے زمینی تصادم سے بچنے کے لیے ہاتھ آگے کرنے پڑتے ہیں۔ ہاتھوں کے پیچھے جسم کا وزن ہوتا ہے۔ تصادم کی لہر بازوؤں سے ہوتی ہوئی کندھوں کے جوڑ تک جاتی ہے۔ اگر کالر بون نہ ہو تو فورس گردن میں سرایت کر کے اسے توڑ سکتی ہے...... فالج ہو سکتا ہے...... لہر دماغ میں جا کر بے ہوشی یا کوما میں ڈھل سکتی ہے۔ ان تمام ہلاکت خیزیوں کو ایک طرف کرنے کے لیے کالر بون ٹوٹ جاتی ہے۔ اگرچہ یہ ایک تکلیف دہ اور بے تکی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے لیکن زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ سائیکل چلانے والوں، اسکیڈر اور گھڑسواروں کی نسلیں اس ہڈی کی احسان مند ہیں۔ چوتھی رپورٹ پر تھوڑی بات ہوئی اور پروفیسر نے یہاں بھی تشدد کا امکان خارج کر دیا۔ بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ رسمی بات چیت کے بعد ریچر نے کاغذات فیڈیکس کے پیکٹ میں سمیٹے اور کھڑا ہو گیا۔ پروفیسر پہلے ہی رخصت ہو چکا تھا۔ واکر نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر آنکھیں بند کر لیں۔ ''مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' وہ بولا۔

☆☆☆

ریچر سڑک کے کنارے رک گیا۔ بائیں ہاتھ میں پیکٹ لے کر اس نے دائیں ہاتھ سے ایلس کا بازو تھام لیا۔
''کاؤنٹی میں کوئی اچھا جوہری ہے؟''
''ہوگا، کیوں؟''
''تم ابھی تک اس کی وکیل ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی ذاتی اشیا سائن آؤٹ کرلاؤ۔ مجھے ایک کی ضرورت ہے، تم سب نہیں، دو لے آنا۔ اس کی بیلٹ اور ڈائمنڈ رنگ...... دیکھتے ہیں کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ؟'' ریچر نے کہا۔
''اب بھی کوئی شک ہے؟''
''میں آرمی کا بندہ ہوں۔ پہلے ہم چیک کرتے ہیں پھر ڈبل چیک کرتے ہیں۔''
''اوکے۔''
ریچر وہیں رکا اور ایلس، میٹرل کے فارم پر سائن کر

لے دونوں چیزیں لے آئی، پھر وہ جوہری کی تلاش میں نکلے۔

پندرہ منٹ بعد وہ ایک دکان میں داخل ہو رہے تھے۔ جوہری کی عمر زیادہ تھی اور کمر خمیدہ۔ تاہم وہ سست دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایلس نے ریچر کی ہدایت کے مطابق بات کی۔ رِنگ نکالی۔ جوہری کو بتایا کہ یہ اسے وراثت میں ملی ہے اور وہ اسے فروخت کرنا چاہتی ہے۔

جوہری نے ہیرا لیمپ کے نیچے کیا۔ ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ میں گول شیشہ فٹ کیا۔ پھر ہیرے کو گھما پھرا کر روشنی میں خوب جانچا۔ بعدازاں ایک کارڈ نکالا، جس میں چھوٹے بڑے ہول نظر آرہے تھے۔ اس نے نگینہ مختلف سوراخوں سے گزارنے کی کوشش کی۔ ایک سوراخ میں وہ فٹ ہوگیا۔

''سوا دو قیراط۔'' اس نے اعلان کیا۔ ''کٹ، کلر اور کلیریٹی بھی اچھے ہیں...... کیا ارادہ ہے تمہارا؟''

''کتنی رقم مل جائے گی؟'' ایلس نے کہا۔

''بیس دے سکتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''بیس...... کیا بیس؟''

''بیس ہزار؟'' اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ ''چلو پچیس کرلو۔ اس سے زیادہ نہیں۔ پیکو کے باہر زیادہ بھی مل سکتے ہیں...... پھر یہ بھی سوچو کہ تم خریدنے نہیں، بیچنے نکلے ہو۔''

''میں سوچوں گی۔'' ایلس نے رخ پھیرا۔

''تیس سے زیادہ نہیں۔'' اس نے عقب سے ہانک لگائی۔

☆☆☆

وہ کچھ آگے جا کر ایک طرف رک گئے۔ ''یہ تیر کمان، تیس ہزار روپے دے رہا ہے...... یعنی یہ کم سے کم بھی ساٹھ ہزار کا تو ہوگا۔'' ریچر نے کہا۔

''کہاں تیس ڈالرز اور کہاں تیس ہزار یا ساٹھ ہزار......'' ایلس نے کہا۔ ''وہ سب کو بے وقوف بناتی رہی۔''

ریچر نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ ''آؤ چلیں۔'' وہ بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ ایک اور کوشش کی جائے۔''

''وہ کیوں؟''

''کیونکہ میں آرمی سے ہوں۔ ہم ڈبل چیک کے بعد ٹرپل چیک کرتے ہیں۔''

ایلس نے ایک سرد آہ کھینچی۔ ''کیا چاہتے ہو؟''

''ایک عینی شاہد ہے۔ اس سے بات کرتے ہیں۔''

''عینی شاہد؟ کہاں؟''

''ایکو کاؤنٹی کے اسکول میں۔''

''وہ چھ سال کی ہے۔'' ایلس نے اعتراض کیا۔

''ہاں، لیکن کافی اسمارٹ ہے۔''

دونوں ایلس کے مختصر دفتر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ایلس نے کھڑکی سے جھانکا۔ اس کی ڈیسک کے قریب کافی امیدوار جمع تھے۔ اس نے گاڑی روک دی۔

''ان کے ساتھ زیادتی ہوگی، اگر میں نے وقت نہ دیا۔'' وہ بولی۔

''بس یہ آخری کام کرنا ہے، ایلس۔''

''میں تمہیں گاڑی دے دیتی ہوں۔ تم چلے جاؤ۔''

''نہیں، تم وکیل ہو۔ تمہاری ضرورت ہے۔ تمہارے بغیر میں اسکول میں داخل نہیں ہوسکوں گا۔''

''نہیں، سارا دن نکل جائے گا۔''

''ریچر سے رقم نکلوانے میں کتنا وقت لگا تھا؟''

وہ خاموش ہوگئی۔ ڈوبی ہوئی بیس ہزار کی رقم نے میکسیکن فیملی کو نئی زندگی دی تھی...... ''او کے۔'' ایلس نے کہا۔ ''ڈیل از ڈیل۔''

☆☆☆

''کیا اس سے قبل تم کبھی ناکام نہیں ہوئے؟'' دورانِ سفر ایلس نے سوال کیا۔

''ہاں، ایسا ہوا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہاں ایسا نہیں ہے۔ میں لوگوں کو جانتا ہوں۔ محسوس کرسکتا ہوں، اندازہ لگا سکتا ہوں۔ ہاں غلطی بھی کرسکتا ہوں۔ کہانی جس طرح اور جتنی آگے بڑھی ہے، مجھے رک جانا چاہیے مگر میرے محسوسات ابھی تک درمیان میں حائل ہیں۔ یہ میری انا کا مسئلہ نہیں ہے۔ میرا اسٹائل ہے۔''

''شاید میں تم سے زیادہ غلطیاں کرتی ہوں۔ وکیل ہوں، تم انویسٹی گیٹر لیکن میں سمجھ رہی ہوں کہ کارمن نے تمہیں استعمال نہیں کیا تو کوشش ضرور کی ہے، ایک کامیاب کوشش۔''

ریچر خاموش رہا۔ نگاہ سڑک پر تھی۔ فیڈیکس کا پیکٹ گھٹنوں پر۔ وہ بے خیالی میں پیکٹ کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ بقیہ سفر خاموشی سے طے ہوا۔ اسکول میں وہ ایلس کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ وہ جلد ہی باہر آگئے۔ ایلی اسکول میں نہیں تھی۔ مزید یہ کہ وہ گزشتہ روز بھی نہیں آئی تھی۔

''گھر جانا پڑے گا۔'' ریچر نے کہا۔

☆☆☆

وہ ایک بار پھر لال مکان کے سامنے تھا۔ ایلس نے

انجن بند کر دیا۔ وہاں خاموشی اور سناٹا تھا۔ تاہم تمام گاڑیوں کی موجودگی ظاہر کر رہی تھی کہ افرادِ خانہ گھر پر ہیں۔ ریچر نے ایلس کے ہمراہ پورچ کی سیڑھیاں طے کیں اور دروازے پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازے میں رسٹی گریر رائفل لیے ایستادہ تھی۔

''تم پھر آ گئے، میں سمجھی بوبی ہے۔'' رسٹی نے کہا۔

''گاڑیاں تو کھڑی ہیں۔'' ریچر نے کہا۔

''میں اوپر تھی، کوئی اور اسے لے کر گیا ہے۔ آوازیں سنی تھیں میں نے......''

''یہ کارمن کی وکیل...... ہمیں ایلی سے ملنا ہے۔'' ریچر نے مدعا بیان کیا۔

وہ مسکرائی۔ ''ایلی یہاں نہیں ہے۔''

''مسز گریر، ایلی کہاں ہے؟'' ایلس نے زبان کھولی۔

''میں نہیں جانتی۔''

''آپ کو جاننا چاہیے۔ بتائیے وہ کہاں ہے؟''

مسز گریر نے وقفہ لیا۔ ''صبح فیملی سروس والے اسے لے گئے۔ میں نہیں جانتی وہ کہاں ہے۔''

''اور تم نے جانے دیا؟'' ریچر نے کہا۔

''اور کیا کرتی، سلوپ چلا گیا۔ ایلی کا میں کیا کرتی۔''

ریچر نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''وہ تمہاری پوتی تھی؟''

''مجھے اس بات کی بھی خوشی نہیں ہوئی۔''

''شاید تمہیں اپنے باپ یا دادا کا نام یاد نہیں ہے۔'' ریچر نے بلاتامل کہا۔ رسٹی گریر کے نقوش بگڑ گئے۔

''وہ اسے کہاں لے گئے ہیں؟'' ایلس نے رسٹی کی توجہ کا رخ بدلا۔

''شاید یتیم خانے میں۔''

''تم نے بتایا نہیں کہ تم بھی یتیم ہو۔'' ریچر نے پھر کڑوا لقمہ دیا۔ رسٹی نے منہ کھولا ہی تھا کہ ریچر واپس چل پڑا۔

☆☆☆

''تم ایسا بھی بول لیتے ہو؟'' ایلس نے گیئر بدلا ''میرا مطلب ہے، عورتوں سے۔''

''کبھی کبھی......'' ایلی ایک معصوم پری کا نام ہے۔ اگر اسے کچھ......'' وہ خاموش ہو گیا۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ رسٹی گریر کسی عورت کا نام ہے۔''

دونوں چار بجے سے پہلے واپس پہنچ گئے۔ حسبِ معمول ایلس کی ڈیسک پر لفافوں کا ڈھیر تھا۔ پانچ صرف ہیک واکر کی جانب سے تھے۔ پانچوں پر ارجنٹ لکھا تھا۔

''کیا افتاد آن پڑی۔'' وہ بڑبڑائی۔

''اسے ڈائمنڈ کے بارے میں مت بتانا۔'' ریچر نے کہا۔

''قضیہ ختم نہ سمجھیں؟'' ایلس نے کہا اور واکر کے دفتر میں اس کی شکل دیکھتے ہی ریچر سمجھ گیا کہ قضیہ واقعی ختم ہو چکا ہے۔ واکر کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔ مکمل اطمینان، جو بحران اور خلجان سے نکلنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ امن ہی امن۔ اس کی میز پر کاغذات کی دو ڈھیریاں رکھی تھیں۔

''کیا خبر ہے؟'' ریچر نے آغاز کیا۔ واکر نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے ایک کاغذ ایلس کو پکڑایا۔ ایلس نے تحریر پر نظر دوڑائی۔

''اس نے لکھا ہے کہ کوئی اس کا وکیل نہیں ہے، نہ اسے کسی کی ضرورت ہے۔ جو کوئی بھی اس کی مدد کی کوشش کر رہا ہے وہ سب رضاکارانہ ہے اور وہ شروع سے اس کے خلاف ہے۔'' واکر نے کاغذ کا اختصاریہ سنایا۔

''مجھے شک ہے۔'' ایلس نے کہا۔

''تم شک کا فائدہ لے سکتی ہو۔ لیکن کچھ حاصل نہیں...... اخلاقی اصولوں کی بنیاد پر تم دونوں یہاں نظر آ رہے ہو۔'' واکر نے چند کمپیوٹر پرنٹ آؤٹس ایلس کو پکڑائے۔ وہ بینک ریکارڈ تھا۔ پانچ اکاؤنٹ۔ دو کرنٹ اکاؤنٹ اور تین کرنسی مارکیٹ کے ڈپازٹ۔ پانچوں ٹرسٹ فنڈ تھے۔ غیر صوابدیدی گریر ٹرسٹ فنڈز، جن کی مجموعی مالیت دو ملین ڈالر بنتی تھی۔

''کاغذات ال یوجین کے آدمیوں نے بھیجے ہیں۔'' واکر نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

ایلس کاغذات کا مطالعہ کر رہی تھی۔ جن کا بیشتر مواد قانونی زبان پر مشتمل تھا۔ منٹس کی تفصیل۔ ٹرسٹ ایگریمنٹ اور تصدیق شدہ ڈیڈ کے لوازمات منسلک تھے۔ تمام مواد بہ بانگِ دہل اعلان کر رہا تھا کہ واحد ٹرسٹی، سلوپ گریر کی وائف کارمن ہے۔

''یعنی وہ اب دو ملین ڈالرز کی مالک ہے؟'' واکر نے کہا۔

ریچر نے بھی کاغذات دیکھے۔

''مسٹر واکر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ایلس نے تصدیق کی۔

''آخری شق پڑھو۔'' واکر نے کہا۔

ایلس نے دیکھا۔ آخری شق ترمیم سے متعلق تھی جس

ے مطابق ٹرسٹ، مستقبل میں فنڈز سلوپ کے کنٹرول میں واپس دے سکتا ہے۔ اس کا انحصار سلوپ کی خواہش پر ہے۔ سوائے اس کے یا تو وہ دماغی طور پر ناکارہ ہو جائے یا انتقال کر جائے۔ اس صورت میں کارمن ہی واحد مالک ہو گی۔ مطلب یہ ہوا کہ پہلی صورت میں وہ ایگریمنٹ کے تحت دو ملین کی حق دار ہے۔ دوسری صورت میں وراثتی طور پر دو ملین کی مالک ہے۔

’’کرسٹل کلیئر؟‘‘ واکر نے اطمینان سے کہا۔

ریچر خاموش رہا اور ایلس نے سر کو جنبش دی۔

اب واکر نے کاغذات کی دوسری ڈھیری آگے کی۔

’’یہ کیا ہے؟‘‘ ایلس نے سوال کیا۔

’’یہ اس کے اعتراف نامے کی تحریر ہے۔ اعتراف اس نے زبانی کیا تھا جس کی وڈیو ٹیپ ہمارے پاس ہے۔‘‘

ریچر کا دھیان بٹا ہوا تھا۔ وہ پڑھ بھی رہا تھا اور سن بھی رہا تھا۔

مختصر یہ کہ کارمن کا تعلق لاس اینجلس سے تھا۔ وہ ناجائز اولاد تھی۔ نوجوانی میں اس نے جسم فروشی کا دھندا شروع کر دیا۔ کارمن نے بیان میں مذکورہ دھندے کے لیے ’’اسٹریٹ اسٹرالر‘‘ کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ یہ اصطلاح ریچر کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اسٹرالر، وھیل والا بے بی کاٹ ہوتا ہے جس میں خواتین، بچے یا بچی کو بٹھا کر فٹ پاتھ پر یا باغ میں ٹہلاتی ہیں۔ اس نے یہی خیال کیا کہ یہ کوئی پرانی اسپینش اصطلاح ہے۔ اعترافی بیان میں آگے وہ سڑکوں سے کلب میں عریاں رقص کے پیشے میں آگئی جو اسٹرپ ٹیز کہلاتا ہے...... پھر UCLA میں سلوپ کی شکل میں اپنا مستقبل نظر آیا۔ سلوپ کے ساتھ اس نے بہ آسانی محبت کا ڈھونگ رچایا اور شادی کر کے ٹیکساس آگئی۔ تاہم جلد ہی اسے اکتاہٹ ہونے لگی۔ اس کی بے صبری کچھ اور کی متقاضی تھی۔ اس دوران بیٹی کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد سلوپ آئی آر ایس کے چنگل میں پھنس گیا......

...... پہلے اس نے سلوپ کو جیل میں مروانے کی کوشش کی لیکن اس کے مواقع میسر نہیں تھے۔ جب اسے خبر ملی کہ سلوپ وقت سے پہلے رہا ہو رہا ہے تو اس نے گن خرید کر رکھ لی۔ جسمانی چوٹوں کو اس نے اپنے منصوبے کا حصہ بنایا اور کوشش کی کہ ہمدردی یا سیکس کے بدلے میں کوئی اور سلوپ کو ختم کر دے۔ ریچر بھی متاثر ہوا لیکن اس نے سلوپ کا خون بہانے سے انکار کر دیا۔ بالآخر میڈیکل ریکارڈ پر انحصار کرتے ہوئے اس نے خود ہی سلوپ کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا۔ ہر جانب سے ناکام ہونے کے بعد اس نے اعترافی بیان دیا اور خود کو استغاثہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ یہ بیان کا خلاصہ تھا۔ ہر صفحے کے نیچے کارمن کے دستخط تھے۔

’’الیکشن کا کیا ہوگا؟‘‘ ریچر کی آخری امید۔

واکر نے شانے اچکائے۔ ’’ٹیکساس کا کوڈ کہتا ہے کہ یہ کیپٹل کرائم ہے۔ پیسے کے لیے قتل۔ اعترافِ جرم ٹیکس دینے والوں کے لیے ٹرائل کا خرچہ بچا لیتا ہے۔ لہٰذا میرے پاس معقول جواز ہے کہ میں عمر قید کی سفارش کروں۔ اگرچہ کارمن کے اعتراف کے بعد میں سزائے موت کی سفارش بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن میں عمر قید تک رہوں گا تو اسے میری نرمی اور فیاضی سے تعبیر کیا جائے گا۔ سفید فام ووٹرز کچھ بے چینی محسوس کریں گے۔ تاہم میکسیکن ہضم کر جائیں گے۔‘‘ واکر کے لہجے میں آسودگی تھی۔

’’اس کی بیلٹ اور رِنگ میرے پاس ہیں۔‘‘ ایلس نے بتایا۔

’’اسٹوریج میں رکھوا دو۔ کارمن کو بھی یہاں سے ہٹانا پڑے گا۔‘‘

’’کہاں؟‘‘

’’اسے باقاعدہ قید خانے میں رکھنا پڑے گا۔‘‘

’’نہیں، میرا مطلب تھا...... اسٹوریج؟‘‘

’’مردہ خانہ، اسی عمارت میں ہے۔ اسٹور وہیں ہے۔ رسید ضرور لینا۔‘‘

☆☆☆

ریچر، ایلس کے ہمراہ خاموشی سے چل رہا تھا۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی لیکن ریچر کا دماغ کہیں اور تھا۔ وہ اندرونی بے عزتی محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ خود کوئی حساس مقدمہ ہار گیا ہو۔ اسے صرف ایک ہی آواز سنائی دے رہی تھی، اس کے اپنے ذہن میں۔ ’’تم مکمل طور پر غلط تھے۔‘‘ یہ وہ آواز تھی جو ماضی میں بھی اس نے ایک بار سنی تھی لیکن اسے دوبارہ سننا اتنا سہل نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے اپنے تمام کیریئر میں اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں برائے نام غلطیاں کی تھیں۔

مردہ خانہ سڑک کی دوسری جانب، پیچھے کی طرف تھا۔ ایلس نے رنگ نکال کر کاؤنٹر پر موجود آدمی سے کچھ کہا۔ وہ گیا اور ایوی ڈینس باکس لے آیا۔

’’سوری، یہ ذاتی اشیا ہیں...... ایوی ڈینس نہیں۔‘‘ اس نے شکایتی انداز میں ایلس کو دیکھا اور واپس مڑا۔

’’ایک منٹ!‘‘ ریچر نے مداخلت کی۔ ’’میں دیکھنا

چاہتا ہوں۔'' وہ پھر مڑا اور باکس کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ یہ تین انچ گہری کارڈ بورڈ کی ٹرے تھی۔ دو خالی کارتوس الگ پلاسٹک بیگ میں تھے۔ اعشاریہ بائیس کی دو گولیاں الگ الگ بیگ میں تھیں۔

''یہاں فزیشن ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے ایک طرف ڈبل ڈور کی طرف اشارہ کیا۔

ریچر نے جاکر شیشے پر دستک دی۔ اندر ڈیسک کے پیچھے بیٹھے شخص نے سر اٹھا کر اشارہ کیا اور ریچر اندر چلا گیا۔

''کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''سلوپ گریر کے جسم سے صرف دو گولیاں نکلی ہیں؟''

''تم کون ہو؟''

''میں ملزم کے وکیل کے ساتھ ہوں۔ وہ باہر کاؤنٹر پر ہے۔''

''اوکے۔ گولیوں کا مسئلہ؟''

''کتنی گولیاں تھیں؟''

''دو۔'' اس نے جواب دیا۔ ''انہیں نکالنے کے لیے خاصی تگ و دو کرنی پڑی۔''

''کیا میں باڈی دیکھ سکتا ہوں؟''

''کیوں؟''

''مجھے تشویش ہے، کوئی ناانصافی نہ ہو جائے۔'' ریچر نے کہا۔

فزیشنز کے لیے اس صورتِ حال میں یہ لائن آزمودہ تھی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اس چیز سے بچتے تھے کہ مقدمے کے دوران جرح کے لیے انہیں طلب نہ کر لیا جائے اور ان کی کوئی غلطی، بے عزتی کا سبب نہ بن جائے یا کیس کا رخ موڑ دے۔

''اوکے، تم فریزر میں دیکھ سکتے ہو.....'' اس نے اجازت دی۔ اس کی پشت پر ایک اور دروازہ تھا جس کے پیچھے کوریڈور تھا۔ ریچر اس کے ہمراہ کوریڈور میں داخل ہوا۔ اس نے ایلس کو بھی بلوا لیا تھا۔ اس کے ذہن میں کارمن کے ساتھ شوٹنگ پریکٹس کے مناظر ابھر رہے تھے۔ کارمن نے دو گولیوں میں سلوپ کو ٹھنڈا کر دیا؟ کتنے قریب سے گولیاں چلائی گئی تھیں؟ گولیاں کہاں لگی تھیں؟ کوریڈور سے گزر کر فزیشن نے ایک ڈور آپریٹ کیا اور وہ تینوں اندر داخل ہو گئے۔ وہاں ایک دیوار میں ستائیس فولادی درازیں تھیں۔ انیس خالی تھیں۔ کیونکہ ان پر کوئی ٹیگ نہیں تھا۔ اندر خاصی ٹھنڈک تھی۔ فزیشن نے ٹیگ چیک کر کے ایک دراز کھینچی۔ وہ بہ آسانی آہنی ریل پر پھسلتی ہوئی باہر آ گئی۔

تابوت نما دراز میں سلوپ چت لیٹا تھا۔ ایک دوسرے کے برابر پیشانی میں دو سوراخ تھے۔ دونوں کے درمیان تین انچ کا فاصلہ تھا۔ کنارے نیلگوں تھے۔ اتنی صفائی اور مہارت؟ گویا ڈرل سے کیے گئے ہیں۔ ریچر نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری اور پھیلتی چلی گئی۔ بس دانت نظر آنے کی دیر تھی۔

''کیا ہوا؟'' ایلس نے حیرت محسوس کی۔

''کیا دیکھا تم نے؟'' الٹا ریچر نے سوال کیا۔

''سر میں گولیاں ماری گئی ہیں۔''

''اور کیا دیکھا؟''

''اور کچھ نہیں۔'' وہ بولی۔

''غور سے دیکھو۔''

وہ اور قریب ہو گئی۔ ''اور کیا دیکھوں؟'' وہ الجھ کر ریچر کو تکنے لگی۔

''آؤ باہر چلتے ہیں۔'' ریچر نے فزیشن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''کواڈرپل (چوتھا چیک) کے بعد کیا آتا ہے؟''

دونوں گاڑی میں بیٹھے تھے۔

''کوئین ٹپل چیک۔'' ایلس نے جواب دیا۔

''اور اس کے بعد؟''

''سکس ٹپل چیک (چھٹی جانچ)...... کیوں؟''

''کیونکہ ہم ٹرپل چیک کے بعد بھی سب کچھ چیک کریں گے۔'' ریچر نے کہا۔ ''کچھ غلط ہو گیا ہے، بہت غلط۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟''

''دیکھو فائر کے وقت بیرل سے جو چیز پہلے باہر نکلتی ہے، وہ گرم گیس ہوتی ہے۔ اگر نال پیشانی پر رکھی ہے تو گولی کا نشان بڑا اور اسٹار جیسا ہوگا...... لاش کی پیشانی پر ایسا نشان نہیں ہے۔ دوسری چیز بیرل سے شعلہ نکلتا ہے۔ اگر گولی بہت قریب سے چلائی گئی ہے۔ اس صورت میں گولی کے نشان کے اردگرد کھال جل جاتی ہے۔ کھال بھی جلی ہوئی نہیں تھی۔ دو تین انچ کا فاصلہ ہوتا تو کھال جلنی چاہیے تھی۔ تیسری چیز ہوتی ہے 'سوٹ'...... اگر فائر چھ سے آٹھ انچ کے فاصلے سے ہوا تھا تو کاربن کے ذرات نظر آنے چاہیے تھے۔ اگر گولیاں ایک فٹ کے فاصلے سے ماری گئی ہوں، پھر گن

پارے کے ذرات موجود ہوتے ہیں...... ان میں سے کچھ بھی نہیں تھا یا تھا؟''

''نہیں۔'' ایلس نے متاثر ہو کر نفی میں سر ہلایا۔

''اوکے، صرف گولیوں کے نشان۔ جو صورتِ حال میں نے دیکھی، اس کے مطابق قریب ترین فاصلہ تین سے چار فٹ ہونا چاہیے جبکہ ایسا ہو نہیں سکتا۔ دو منٹ رکو ابھی آیا۔'' ریچر گاڑی سے اُتر کر پھر اندر چلا گیا۔ وہ کچھ دیر بعد واپس آیا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ فزیشن کے مطابق فاصلہ آٹھ ساڑھے آٹھ فٹ ہے۔ یہی میرا اندازہ تھا۔''

''لیکن اس کا مطلب؟'' ایلس نے سوال کیا۔

''مطلب یہ کہ کارمن نے سلوپ کو نہیں مارا۔'' ریچر نے انکشاف کیا۔

ایلس گنگ رہ گئی۔ ''کیسے؟'' اس نے سرگوشی کی۔

''کسی انسان کی پیشانی کتنی بڑی ہوتی ہے؟ دو تین انچ اونچی...... دائیں سے بائیں پانچ انچ۔ اتنے مختصر ٹارگٹ کو آٹھ ساڑھے آٹھ فٹ سے یہ نشانہ بنانا کارمن کے بس کی بات نہیں تھی۔''

''تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''میں نے تمہیں شوٹنگ پریکٹس کی کہانی سنائی تھی؟''

''ہاں، لیکن بعض اوقات قسمت ساتھ دے جاتی ہے۔''

''ہاں، لیکن دو بار نہیں۔'' وہ مسکرایا۔ ''یہ کسی پروفیشنل کا کام ہے۔ دونوں گولیاں متوازی تین انچ کے فاصلے سے برابر برابر بیٹھی ہیں۔ پہلی گولی کھانے پر جسم گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا دوسری گولی سر یا چہرے پر کہیں اور ہونی چاہیے تھی۔ یہ مہارت اور اعتماد کا مظہر ہے۔ یہ تقریباً ایک ہی فائر ہے...... بینگ بینگ فنش۔ کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ ایسے کاریگر ایک نشانے پر دو گولیاں مارنے پر قادر ہوتے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے، کارمن نے تمہارے سامنے قصداً اناڑی پن کا مظاہرہ کیا ہو۔'' ایلس نے ایک اور امکان ظاہر کیا۔

''فرض کر لیتے ہیں کہ اس نے ایسا کیا...... پھر بھی ایسی ہنرمندی کا مظاہرہ ناممکن ہے جبکہ گن بھی غیر معیاری ہے۔ میں نے بہت شوٹنگ کی ہے اور دیکھی بھی ہے۔ اگر وہ قصداً اناڑی پن کا مظاہرہ کرتی تو فوراً میری نگاہ میں آجاتی۔''

☆☆☆

''یہ پینڈورا باکس جیسا ہے۔'' واکر نے کہا۔ ''سمجھ رہے ہو، کیا مطلب ہے میرا؟ اس باکس کو نہ کھولنا بہترین قدم ہوگا۔ کھولنے پر جو کچھ نکلے گا، اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ ہم پھر دلدل میں ہوں گے۔''

''تم کیا سوچتے ہو؟'' ایلس نے کہا۔

''فرض کرو، ریچر کی تھیوری درست ہے۔ ایسا معلوم بھی ہوتا ہے۔ ہم اس تھیوری پر کوئی سوال نہیں اٹھاتے۔ وہ اس طرح شوٹ نہیں کر سکتی۔ لیکن ہم منطقی سوال اٹھا سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہمیں حاصل کیا ہوگا؟''

''کیا؟''

''ایک نیا تنازع۔ نئی گتھی...... جسے سلجھانے میں بہت وقت لگے گا۔ تم جس طرح دیکھ رہے ہو، اس کا سیدھا مطلب ہے کہ قتل اس نے نہیں کیا بلکہ کروایا۔ قاتل ہائر کیا...... بات وہیں آجائے گی۔ میں عمر قید کی سفارش کروں گا۔ پھر اس کے اعترافِ جرم کو ہم کہاں رکھیں گے۔ یعنی اس نے بہت جمع تفریق کے بعد جھوٹا اعتراف کیا۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ نیا تنازع کھڑا ہوگا اور ہم احمقوں کے مانند ردِعمل پیش کریں گے۔ دفاع، ریچر کی تھیوری لاتا ہے تو اعترافِ جرم کے ساتھ تصادم ہوگا۔ اس کے دستخط شدہ اعتراف کو فوقیت حاصل ہے۔ فرض کرو ٹرائل کے دوران نوبت آجاتی ہے کہ عدالت اس کی شوٹنگ اہلیت کو جانچے۔ احمقانہ بات ہے۔ پھر فرض کرو عدالت ایسا کرتی ہے...... تو کیا ہوگا۔ وہ مہارت ثابت کرے گی یا نہیں۔ دونوں صورت میں اس نے قتل کروایا...... یہ ایک جنجال ہے۔ بھول جاؤ۔ آلۂ قتل بھی اس کا۔ اقبالِ جرم بھی اس کا۔ پسٹل پر انگلیوں کے نشانات پر پہلے ہی بات ہو چکی ہے۔ ریچر کی لک تھی کہ وہ رینجرز کے ساتھ تھا...... اگر کوئی چانس ہوتا، میں ضرور ٹرائی کرتا۔'' واکر خاموش ہو گیا۔

ایلس نے کچھ نہیں کہا۔ ریچر نے شانے اچکائے۔

کچھ دیر بعد وہ آہستگی سے کھڑی ہو گئی اور ریچر کے شانے کو تھپکا۔ ریچر اٹھا اور اس کے پیچھے واکر کے دفتر سے نکل گیا۔

☆☆☆

بس اسٹاپ، کورٹ ہاؤس سے پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' ایلس نے سوال کیا۔

''آؤٹ، یہی میرا اصول ہے......'' بس اسٹاپ کے قریب پہنچ کر اس نے ون وے ٹکٹ خریدا۔ ''چند سال بعد Yellow Pages میں تمہیں تلاش کروں گا۔ اُمید ہے

ا ا ں ۔ باہر کسی اچھی جگہ پر تمہارا دفتر ہوگا۔''
وہ مسکرائی۔ ''اپنا خیال رکھنا، ریچر۔ میں تمہیں یاد رکھوں گی۔''

☆☆☆

ریچر کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بس آنے پر وہ سوار ہوگیا اور بائیں جانب خالی ڈبل سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کھڑکی سورج کے بالمقابل تھی۔ سورج اس رخ سے ایبلسن کی جانب ڈوبنے جا رہا تھا۔ ریچر نے ٹانگیں پھیلائیں۔ جیب کے اندر آٹھ عدد خالی کارتوس اسے چبھ رہے تھے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر انہیں باہر نکالا اور مٹھی کھولی...... ایبلسن۔ اس نے ہتھیلی سے نگاہ ہٹا کر ڈوبتے سورج کو دیکھا۔ اسی وقت ڈرائیور نے بس اسٹارٹ کرکے آگے بڑھائی۔

''رک جاؤ۔'' اس نے ہانک لگائی۔ ''مجھے اترنا ہے۔'' وہ کھڑا ہوگیا۔ ڈرائیور نے اسے دیکھا لیکن خاموش رہا اور دروازے کے میکنزم کو حرکت دی۔ وہ کارتوس جیب میں ڈال کر نیچے اُتر گیا۔

☆☆☆

وہ کسی عورت سے بات کر رہی تھی۔ اس نے حیرانی سے ریچر کو دیکھا۔ ''کیا بس نہیں آئی؟''

''ایبلسن کی فون بک ہے؟'' ریچر نے استفسار کیا۔

''نیچے والی دراز میں بکس ہیں۔ ٹیکساس کے تمام علاقے۔''

ریچر نے دوسری طرف آکر دراز میں سے مطلوبہ بک نکالی۔

''ایک فون کال۔'' اس نے انگلی کھڑی کی۔ ایلس نے سر ہلایا اور مؤکل کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ریچر نے اسٹیٹ پولیس، ایبلسن کا نمبر ملایا۔ جواب میں نسوانی آواز سنائی دی۔ ''سارجنٹ راڈریگز؟''

''میرے پاس ایک جرم کی اطلاع ہے۔''

''آپ کا نام، سر؟''

''چیسٹر آرتھر، میں پیکو کاؤنٹی میں لائر ہوں۔''

''او کے، بتائیے۔''

''تمہارے آدمیوں کو جمعے کے روز ایبلسن کے جنوب میں ایک خالی مرسیڈیز بینز کار ملی تھی۔ جو ال یوجین نامی وکیل کی ملکیت تھی۔ یوجین لاپتا افراد کی فہرست میں ہے۔ میرے ایک مؤکل کے مطابق یوجین کو کار سے نکال کر قریب ہی قتل کیا گیا تھا۔''

''سر آپ کے کلائنٹ کا نام؟''

''فی الوقت نہیں بتا سکتا اور درحقیقت مجھے بھی کچھ شک ہے۔ اس کی کہانی پر یقین کرنے کے لیے مجھے تم لوگوں کی مدد درکار ہے۔''

''کیا بتایا ہے آپ کے مؤکل نے؟''

''اس کا بیان ہے کہ مرسیڈیز کو دوسری کار نے روکا اور یوجین کو اتار کر ساتھ بٹھایا۔ شمال کی جانب کچھ دور جا کر اسے قتل کر دیا...... وہیں کہیں اس کی لاش چھپا دی۔''

ایلس کی توجہ بٹ گئی۔ وہ عالمِ استعجاب میں ریچر کو گھور رہی تھی۔

''ہم پہلے ہی علاقہ چھان چکے ہیں۔'' سارجنٹ نے جواب دیا۔

''کتنی دور تک؟''

''اطراف میں۔''

''نہیں، ایک سے دو میل کا فرضی دائرہ تشکیل دے کر تلاش کریں۔ میرا مؤکل خاصا پُریقین ہے...... جہاں سے مرسیڈیز ملی۔ وہاں سے پیچھے بائیں جانب توجہ رکھو۔''

''آپ کا نمبر؟''

''میں خود ایک گھنٹے میں کال کرتا ہوں۔'' ریچر نے فون بند کر دیا۔

ایلس سے بات کرنے والی عورت جا چکی تھی۔

''یہ کیا حرکت ہے؟''

''ہمیں پہلے ہی یوجین کو فوکس کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ ہمیں ایک ٹھوس ثبوت مل گیا تھا۔''

''کونسا؟''

''کارمن نے سلوپ کو نہیں مارا۔''

''یہ رائے ہے۔'' ایلس نے کہا۔

''میرا یقین کرو۔ یہ ٹھوس ثبوت ہے۔ اس پر مجھے ماشہ بھر شک نہیں۔''

''تو پھر؟''

''کسی اور نے اسے شوٹ کیا ہے۔ کیوں؟ ہم جانتے ہیں کہ یوجین لاپتا تھا اور سلوپ مردہ۔ دونوں کا آپس میں وکیل اور مؤکل کا رشتہ تھا۔ دونوں مل کر کام کر رہے تھے جس کے نتیجے میں سلوپ کا باہر آ جانا تھا۔ کوئی بہت بڑی ڈیل تھی۔ کسی کے لیے بڑی مشکل پیدا ہونے جا رہی تھی۔ مصیبت سے بچنے کے لیے دونوں کو روکنا ضروری تھا۔ سلوپ تو باہر آ گیا تھا لیکن گھر پر مارا گیا اور یوجین کو گھات لگا کر ایبلسن میں ٹھکانے لگا دیا گیا۔''

''یہ آئیڈیا تمہیں کیسے ملا؟'' ایلس نے کہا۔

"سوچو، ایلس...... ذرا سوچو۔ جس نے سلوپ کو شوٹ کیا وہ پروفیشنل تھا۔ اس پر شک مت کرو۔ اور پروفیشنل منصوبہ بندی کے ساتھ متحرک ہوتے ہیں۔ چند قدم آگے چلتے ہیں۔ اگر کارمن کسی پروفیشنل کو ہائر کرتی تو اسے مجھ جیسوں کو ڈھونڈنے کے لیے سڑک گردی کی ضرورت نہیں تھی۔ مزید یہ کہ وہ کیوں سلوپ کو اپنے ہی بیڈ روم میں ہلاک کر کے ہتھکڑیاں پہن لیتی؟ ہتھیار بھی اس کا؟"

"تمہارے خیال میں سب کس طرح ہوا؟"

"کسی ہٹ ٹیم نے جمعے کے روز یوجین کو مارا اور لاش چھپا دی۔ اتوار کو سلوپ کو شوٹ کیا...... اس طرح کہ کارمن پھنس جائے۔ یوجین کی لاش اس لیے چھپائی کہ معاملہ ٹھنڈا ہونے تک وہ منظرِ عام پر نہ آئے۔ یہ کوئی بڑا لفڑا ہے۔"

"لیکن کارمن، سلوپ کے ساتھ تھی۔ اس نے بیان بھی دیا ہے؟"

"ممکن ہے کہ وہ ایلی کے ساتھ ہو...... شاید وہ اسی وقت واپس خواب گاہ میں آئی ہو۔ یا شاور لے رہی ہو۔"

"تو اسے شوٹنگ کی آواز آنی چاہیے تھی؟"

"تم نہیں جانتیں...... وہ شاور نہیں آبشار ہے۔ میں وہاں نہا چکا ہوں...... اس کا غلط مطلب نہیں لینا۔" ریچر نے کہا۔

"تم نے کیسے کہا کہ شمال کی طرف بائیں ہاتھ پر تلاش کرو؟"

"اچھا سوال ہے۔ اتنی دیر میں ذرا میوزیم سے ہو کر آؤں...... اوکے۔" ریچر کھڑا ہو گیا۔ "اور ہاں شمال میں بائیں ہاتھ والی بات...... قاتل جانتے تھے کہ یوجین کون ہے، کہاں سے آ رہا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ فی الحال ٹھیک اندازہ نہیں لگا سکتا کہ انہوں نے مرسیڈیز کیسے روکی...... تاہم یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ پہلے سے گھات لگا کر بیٹھے تھے۔ گاڑی سے کوئی کلیو نہیں ملا۔ یعنی انہیں صرف یوجین کو صفائی سے ختم کرنا تھا۔ لاش بھی نہیں ملی تھی۔ مطلب یہ کہ گھات لگانے سے پہلے انہوں نے وہ مقام تلاش کیا تھا جہاں لاش کو چھپایا جا سکے۔ اوکے؟"

"اوکے۔"

"یوجین جنوب کی طرف سفر کر رہا تھا۔ خالی مرسیڈیز کا رُخ بھی جنوب کی طرف تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ ہائی وے پر دائیں لین میں تھا۔ قاتل جہاں منتظر تھے، پوشیدہ مقام منطقی اعتبار سے وہیں آس پاس تھا۔ مرسیڈیز کی اسپیڈ تیز رہی ہو گی۔ وہ ان کے پاس سے گزر گئی۔ قاتلوں نے مرسیڈیز کی


بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ اکتوبر 2017ء کی جھلکیاں

علامہ ابن جوزی
اس عالمِ دین کا تذکرہ جس کا قلم ہر ایک کے لیے رہنما تھا

راشدی برادران
سندھ کے دو سپوت جن پر ادب کو ناز ہے

دھرتی کا بوجھ
جنگ زدہ عراق سے درآمد ایک عجیب سی روداد

آواز کا جادوگر
جہاں جہاں اردو بولی جاتی ہے وہاں وہاں اس کی شہرت ہے

رہائی
ایک ایسی سچ بیانی جسے پڑھ کر آپ حیران رہ جائیں گے

اس کے علاوہ
"شمشال سے ٹورنٹو" جیسا دلچسپ سفرنامہ
لہورنگ طویل قصہ "ناسور"
کے علاوہ بھی
بہت سی سچ بیانیاں دلچسپ سچے قصے اور تاریخی واقعات

جھلک دیکھ کر گاڑی اسٹارٹ رکھی ہوگی اور اس کے پیچھے لگ گئے ہوں گے۔ کچھ دور جا کر انہوں نے کسی ترکیب سے مرسیڈیز رکوائی، یوجین کو اتار کر اپنی گاڑی میں بٹھایا اور واپس پلٹے۔ انہوں نے دائیں جانب سے پیچھا کیا تھا۔ اب پلٹے تو پھر دائیں لین میں تھے اور رخ شمال کی جانب...... سمجھ میں آیا؟"

"ٹھیک ہے...... لیکن بائیں......"

"ہاں، اب وہ شمال کی طرف جا رہے ہیں۔ سوچو کہ جہاں وہ انتظار کر رہے تھے، وہ جگہ اب بائیں ہاتھ پر آئے گی...... اور پوشیدہ مقام بھی اس طرف ہونا چاہیے۔ اتنی بات ہے۔" وہ مسکرایا۔

"لیکن غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"تھیوری تھی۔ غلط ہو سکتی ہے۔ اس کی وضاحت کیا کرنا۔ میرا خیال ہے کہ لاش مل جائے گی۔ ایک ہوتا ہے شماریات میں "قانون امکانات" اس کے تحت بہت کم امکان ہے کہ لاش نہ ملے۔" ریچر نے بات ختم کی۔

"تم نے کامرس پڑھی ہے؟"

"میں نے تو ڈریس ڈیزائننگ بھی نہیں کی۔" وہ مسکرایا۔

"گھوم پھر کر میرے لباس پر آجاتے ہو...... اچھا لگتا ہے کیا؟"

"یہ تو پہننے والی پر منحصر ہے۔"

"یعنی میں......"

"ہاں تم حسین ہو۔ جو پہنو گی اچھا لگے گا۔" ریچر نے صاف الفاظ میں کہا۔ "لیکن اصل حسن اندر ہوتا ہے۔ تم دوسروں کی مدد کرتی ہو۔ غیروں کے لیے آبدیدہ ہو جاتی ہو...... تم ایک اچھی خاتون ہو۔"

"ریچر......"

"ہاں؟"

"کچھ نہیں۔"

☆☆☆

وہ ایک گھنٹے بعد میوزیم سے واپس آیا۔ گھڑی دیکھی اور ایبلسن پولیس کا نمبر ملایا۔ اپنا نام بتا کر اس نے سارجنٹ راڈ ریگز سے بات کی خواہش کا اظہار کیا۔ اسے ایک منٹ انتظار کرنا پڑا۔

سارجنٹ کے سوال کرنے سے پہلے اس نے سوال کر دیا۔ جواب مثبت ملا۔ "ہم نے باہر والی پٹرولنگ کارز کو وہاں مرکوز کر دیا تھا اور کچھ نفری یہاں سے روانہ کر دی تھی۔

شمال کی جانب ڈیڑھ میل کے فاصلے پر بائیں جانب کچھ اندر جا کر چونے کا ایک گہرا پتھریلا سوراخ ہے۔ جہاں صفائی کے ساتھ لاش کو اندر روپوش کیا گیا تھا۔ سر، آپ کے کلائنٹ کا نام چاہیے۔" آخر میں سارجنٹ نے کہا۔

"اعشاریہ بائیس کی گولی تھی؟"

"نہیں...... نو ملی میٹر۔ آدھا سر اڑ گیا تھا۔"

"شکریہ سارجنٹ...... اور یہ کہ یہ کام میرے موکل کا نہیں ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں کہ وہ تمہیں فون کرے۔" ریچر نے فون بند کر دیا۔

"چیسٹر آرتھر کون ہے؟" ایلس نے سوال کیا۔

"پریذیڈنٹ؟"

"ہاں، گروور کلیولینڈ سے پہلے اور گارفیلڈ کے بعد۔"

"اب پھر ہیک واکر؟"

"ہاں اسے خبردار کرنا ہے۔ یہ دو اور دو نہیں ہیں۔ تین اور تین ہیں۔ تیسرا واکر ہے۔ اب اس کا نمبر ہے۔ جب میں کارمن کے لال مکان پہنچا تھا تو پہلی خراب اطلاع یہی تھی۔ سلوپ گھر آنے والا ہے۔ کوئی ڈیل ہوئی ہے جس میں یوجین اور اٹارنی، اکر نے کردار ادا کیا ہے۔"

☆☆☆

واکر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ریچر نے کچھ کہے سنے بغیر براہِ راست یوجین کی برآمدگی کی اطلاع سنائی۔ خبر سنتے ہی واکر کا چہرہ سفید پڑ گیا اور پیشانی پسیج گئی۔ وہ کھڑے ہوتے ہوتے پھر کرسی میں گر گیا۔ وہ کئی منٹ تک خاموش رہا۔ پھر دھیرے سے سر ہلایا۔ "میں جانتا تھا...... لیکن پُرامید تھا کہ شاید میں غلط سوچ رہا ہوں۔" اس نے یاسیت سے کہا۔

ایلس نے اسے ریچر کی تین اور تین کی تھیوری کے بارے میں، نامعلوم ڈیل اور خطرے سے آگاہ کیا۔ واکر کے چہرے کا رنگ لوٹ آیا۔ وہ خاموش تھا، گہری سوچ میں گم۔ کچھ دیر بعد اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایسا کچھ نظر نہیں آتا۔ سلوپ ٹیکسز اور جرمانہ ادا کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ یوجین نے IRS سے رابطہ کیا۔ فیڈرل پراسیکیوٹر نے دستخط کرنے تھے۔ اسی لیے میں درمیان میں آیا۔ جس کے بعد کارروائی تیز ہوگئی اور وہ چھٹی والے دن ہی باہر آگیا۔ IRS کے لیے یہ سب معمول کی کارروائی تھی۔ سوائے اتوار کے دن رہائی کے......"

ایلس نے سر ہلایا۔ "ہمیں افسوس ہے۔ وہ تمہارا دوست تھا۔" واکر الجھن زدہ دکھائی دیا۔

''کیا بات ہے؟'' ریچر نے سوال کیا۔

''ہم ایک دائرے میں گھوم رہے ہیں۔ ٹرسٹ کی رقم کا بیشتر حصہ سرکار کے اکاؤنٹ میں منتقل ہونے والا تھا۔ اب ایک نہیں دو اموات سامنے ہیں۔ کارمن کا محرک مزید مضبوط ہو گیا۔ کیس مزید متنازع۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بچ جائے۔ انتخابی مہم میں اس طرح مجھے بھی فائدہ پہنچتا لیکن یہ نظر نہیں آ رہا۔''

''مجھے کوئی تنازع نظر نہیں آ رہا۔'' ریچر نے کہا۔ ''اگر اس نے قاتل یا قاتلوں کو ہائر کرنا تھا تو مجھے لفٹ دینے کی کیا ضرورت تھی؟''

''خود کو دور رکھنے کے لیے۔ الجھاؤ پیدا کرنے کے لیے۔'' واکر بولا۔

''اتنی چالاک ہے وہ؟''

''میرا خیال ہے۔''

''تو پھر ثابت کرو۔ تمہارے پاس بینک ریکارڈ موجود ہے۔ اس نے کسی کو ہائر کیا تو ادائیگی بھی کی ہوگی۔ مفت میں ایسے کام کون کرتا ہے؟''

واکر کا منہ بن گیا۔ اس نے جیب سے چابیاں نکال کر ایک دراز کھولی اور بینک ریکارڈ نکالا۔ جو ایلس اور ریچر پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ ایلس نے دورانِ مطالعہ ڈیبٹ (Debit) کے کالم دیکھنے شروع کیے۔ تمام چھوٹی موٹی رقوم تھیں۔ ریچر کے کہنے پر اس نے آخری مہینے میں نکالی گئی رقوم جمع کیں، ٹوٹل نو سو ڈالرز بنتے تھے۔

''اس قسم کے آپریشن کے لیے نو سو ڈالرز قطعی ناکافی ہیں۔ ہمیں کارمن سے بات کرنی ہے۔'' ریچر نے مطالبہ کیا۔

''اس نے اقبالِ جرم کیوں کیا؟'' واکر نے سوال اٹھایا۔

ریچر نے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔ ''کسی نے اسے مجبور کیا۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''کس نے؟''

''میں نہیں جانتا۔ لیکن معلوم ہو جائے گا۔ بیلف کو بلاؤ اور پوچھو کون کون اب تک اس سے مل چکا ہے؟ لاگ چیک کرو۔''

واکر نے فون اٹھایا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ کچھ دیر بعد بیلف لاگ بک لے کر آیا۔ واکر نے اول دن سے تاحال تمام انٹریز پڑھ کر سنائیں۔ ان میں ایلس کے دو وزٹ بھی شامل تھے۔ ریچر نے بک چیک کی۔ پھر بک لانے والے نوجوان کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''کیا چھوڑ دیا تم نے؟''

''فون کالز ہم نہیں لکھتے۔'' وہ بولا۔

''کیسی کالز؟''

''پیر اور منگل کی صبح اس کا وکیل بار بار کال کر رہا تھا۔ اس نے بہت تنگ کیا۔'' ریچر نے ایلس کی طرف دیکھا۔

''مرد یا عورت؟''

''مرد۔'' اس نے جواب دیا اور ریچر نے واکر کو دیکھا۔

وہ خاموش رہا۔

''آواز کیسی تھی، ہسپانک؟''

''یقین سے نہیں بتا سکتا...... شاید لائن خراب تھی۔''

''ٹھیک ہے...... جاؤ۔''

اس کے جانے کے بعد ریچر نے واکر سے کہا۔ ''اب کیا کہتے ہو؟'' دفتر میں سکوت طاری تھا۔ ''ہمیں کالز ٹریس کرنی پڑیں گی۔'' ریچر نے کہا۔

''مشکل ہے۔ لیگل انفارمیشن کو تحفظ حاصل ہوتا ہے۔''

''تو تم اب بھی یہ سمجھ رہے ہو کہ ''وہ'' کارمن کا وکیل تھا جبکہ وہ ایلس تک سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھی اور بیان بھی ریکارڈ کرا دیتی تھی؟''

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' واکر نے کہا۔

''وہ جو بھی تھا۔ اس نے کالز کے دوران کارمن کو دھمکایا اور مجبور کیا کہ وہ اقبالِ جرم کرے۔''

''کیسی دھمکی؟''

''اس کی بیٹی گھر پر نہیں ہے۔ ڈیئر واکر وہ اغوا ہو چکی ہے۔'' ریچر نے کہا۔

واکر نے فون اٹھایا۔ پہلے اس نے ایکو کاؤنٹی فون کیا۔ پھر کسی اور نمبر پر معلومات لیتے ہوئے بچی کا پورا نام استعمال کیا۔ میری ایلن گریر۔'' سلوموشن میں اس نے فون واپس رکھ دیا۔

''اوکے...... پولیس اور ایف بی آئی کو ملوث کرنا پڑے گا۔ وقت کم ہے۔ ہمیں تیزی دکھانی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ ایلی کہیں دور نکل جائے...... تم لوگ ایکو کاؤنٹی روانہ ہو جاؤ۔ رسٹی گریر سے مکمل معلومات حاصل کرو......''

''ہمارے ساتھ اس کا رویہ ٹھیک نہیں ہے۔''

واکر نے ایک اور دراز کھولی۔ ایک ڈبے میں سے دو اسٹار نکال کر میز پر رکھے۔ ''تم دونوں اپنا ہاتھ اوپر کرو...... اور میرے ساتھ الفاظ دہراؤ۔'' انہوں نے ہدایت پر عمل کیا۔

''اب تم دونوں شیرف کے ڈپٹی ہو۔ رسٹی کو سیدھے منہ بات کرنی پڑے گی۔''

ریچر اسے گھورتا رہا۔

''کیا ہوا؟''

''تم یہیں سے یہ کام کر سکتے ہو۔'' ریچر نے کہا۔

''ہاں کر سکتا ہوں۔ لیکن اب میں تم دونوں کے علاوہ کسی پر بھروسا کر کے کوئی نیا مسئلہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا۔ جا کر براہِ راست اس سے نمٹو۔ ابھی مجھے سیکڑوں کالز کرنی ہیں۔ وہیں سے کال کرو یا سیدھے واپس آؤ۔ میں اسٹیٹ پولیس اور ایف بی آئی کو الرٹ کرتا ہوں......''

ریچر نے اسٹار اٹھا لیا۔ سوا چار سال بعد وہ ایک بار پھر قانونی طور پر آفیشل ڈیوٹی پر تھا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی دن میں دوسری مرتبہ ایکو کاؤنٹی، مقتول سلوپ کے گھر جا رہے تھے۔

☆☆☆

عورت نے کال وصول کی۔ اس نے کوئی بات نہیں کی، صرف سنتی رہی اور بات مکمل ہونے پر فون رکھ دیا۔

''وہاٹ؟'' گورے آدمی نے استفسار کیا۔

''اضافی کام ہے۔'' عورت نے جواب دیا۔ ''پیکو میں معمولی گڑبڑ ہے۔ یوجین کی لاش دریافت کر لی گئی ہے۔ رات میں ہی روانہ ہونا ہے۔ قبل اس کے کہ صورتِ حال ابتر ہو۔''

''ٹارگٹ کون ہے؟''

''ٹارگٹ کا نام جیک ریچر ہے۔ سابق فوجی ہے۔ کوئی ٹھکانا نہیں ہے اس کا۔ اس کی پہچان تفصیل سے بتا دی گئی ہے۔ ساتھ میں کوئی لڑکی بھی ہے وہ وکیل ہے۔ اس پر بھی توجہ درکار ہے۔''

''بے بی کا کیا ہوگا؟''

''وہی...... جیسے ہم کام کرتے ہیں۔'' عورت نے بات ختم کی۔ دونوں آدمیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

ایلی، بستر پر بیٹھی، تینوں کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

تاریکی پھیل گئی تھی۔ اس مرتبہ ریچر زیادہ ہی خاموش تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے تک اس نے کوئی بات نہیں کی۔ نصف گھنٹا اس نے نقشوں کے مطالعہ میں صرف کیا۔ ایکو کاؤنٹی کے اطراف کا علاقہ اس کا مرکزِ نگاہ تھا۔

''سمجھ میں نہیں آتا اس نے ہیرے کے بارے میں جھوٹ کیوں بولا؟''

''اس نے بہت سے جھوٹ بولے ہیں۔'' ایلس نے کہا۔

''ہیرے کا معاملہ مختلف ہے۔ یہ مختلف قسم کا جھوٹ ہے۔ واحد چیز ہے جس کی وضاحت میں تلاش نہیں کر سکا۔ مکمل تصویر میرے ذہن میں ہے...... میں نے ہر زاویے سے غور کیا ہے۔ صرف ہیرا، اس تصویر کو بگاڑ رہا ہے۔'' ریچر نے ایلس کی گن نکال کر چیک کی پھر اسے تیار کر کے جیب میں رکھ لیا۔

''تمہارے خیال میں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟''

''جلد یا بدیر۔'' ریچر نے جواب دیا۔ ''یہ بتاؤ تم نے کبھی گھڑسواری کی ہے...... یا بائیک وغیرہ چلائی ہے؟''

''نہیں...... ماضی میں تھوڑی بہت اسکیٹنگ کی ہے۔''

''کبھی گری ہو؟''

''ہاں، بُری طرح......'' ایلس نے کہا۔

''چوٹیں بھی لگی ہوں گی؟''

''ظاہر ہے...... کافی زیادہ......''

وہ گریر فیملی کی جاگیر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ''بک ہاؤس کی طرف جانا۔ ہیڈ لائٹس اس رخ پر رکھنا کہ میں اندر گاڑیوں کا معائنہ کر سکوں۔''

ایلس نے ریچر کی ضرورت کے تحت گاڑی لگائی۔ ریچر اتر کر اندر چلا گیا۔ دو پک اپ ٹرک اور ''چیروکی جیپ۔ ریچر اس گاڑی کا جائزہ لے رہا تھا جس کے ٹائر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ شیورلیٹ پک اپ تھی۔ اور غالباً ایک دہائی سے بیکار پڑی تھی۔ ماڈل بیس سال پرانا رہا ہوگا۔ رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اسپرنگ بیٹھے ہوئے اور زنگ آلود تھے۔ لوڈنگ بیڈ میں ایک بار لگی تھی۔

''واکر کے آفس میں اسی کی فوٹو لگی ہے۔'' ریچر نے واپس آ کر بتایا۔ فینڈز کے ساتھ تینوں کھڑے ہیں۔ وہ خود، سلوپ اور یوجین۔'' اس نے ایلس کو بتایا۔ ''اب پورچ کی طرف چلو۔''

☆☆☆

یوبی کا منہ بن گیا تھا لیکن اسٹار دیکھ کر وہ انہیں اندر لے گیا۔ وہ ہال سے گزر کر پارلر میں پہنچے جہاں رسٹی گریر بیٹھی تھی۔

''مسز گریر ہم آفیشل وزٹ پر ہیں۔ چند جوابات درکار ہیں۔''

''میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔'' رسٹی نے کہا۔

''ایلی کو بھیج کر تم نے سب سے زیادہ غلط کام کیا۔''

''اسی کی بہتری تھی......اوران کے پاس کاغذات بھی تھے۔'' وہ بولی۔

''تمہیں کیسے علم ہوا کہ وہ کاغذات ٹھیک تھے۔ انہوں نے تمہاری پوتی کو اغوا کرلیا اوراس کے بل پر تمہاری بہو کو دھمکیاں دے رہے ہیں۔ وہ کون تھے، ان کا حلیہ بتاؤ۔''

''میں نہیں جانتی۔لیکن وہ دو تھے۔ایک عورت اور ایک مرد۔''

''دیکھنے میں کیسے تھے؟ ناک، آنکھ، بال، قد وغیرہ......'' ریچر نے کہا۔

''گوری رنگت، سستے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ عورت نے اسکرٹ۔اس کی آنکھیں شاید نیلی تھیں۔آدمی قدرے لمبے قد کا تھا۔''

''ان کی گاڑی؟''

''بڑی سی سیڈان تھی۔نیلے رنگ کی۔''

''کوئی ایسی چیز ہے تمہارے کچن میں جو میں تمہارے حلق میں ٹھونس سکوں؟''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' بوبی نے ٹانگ اڑانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔کیونکہ انہوں نے یوجین کو قتل کر دیا ہے۔''

''وہاٹ؟'' رسٹی کے چہرے کی رنگت زرد پڑگئی۔

''اوروہ......'' وہ ایلی کا نام لیتے لیتے رک گئی۔

''دعا کرتے رہو کہ ایلی ٹھیک ہو......ورنہ میں واپس آکر تمہاری گردن توڑ دوں گا۔''

☆☆☆

''اب؟'' ایلس نے سوالیہ نظروں سے ریچر کو دیکھا۔

''واپس پیکو۔''

ایلس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔''تم کیسے کہہ رہے ہو کہ انہوں نے یوجین کو قتل کیا؟''

''ڈیپلائمنٹ ایشو۔'' ریچر نے کہا۔''میں نہیں سمجھتا کوئی دو الگ الگ ہٹ ٹیمز کو ہائر کرے گا۔ایک اغوا کے لیے اور دوسری سلوپ اور یوجین کے لیے۔اوراس کاؤنٹی میں تو دوسری ٹیم کی ضرورت ہی نہیں تھی۔اچانک یہاں آسمان سے ٹپکنا؟ ہٹ ٹیم کے لیے اغوا اضافی کام ہے، یا پھر قتل......ٹیم ایک ہی ہے۔انہیں تیسرا کام بھی سونپا جا سکتا ہے۔''

''یوجین کو کوئی بھی گولی مار سکتا ہے؟'' ایلس نے اعتراض کیا۔

''نہیں، یہ ایک مختصر نشانہ تھا۔ون ٹو......بینگ بینگ۔ بالکل ویسے ہی جیسے سلوپ کو نشانہ بنایا گیا۔دونوں مرتبہ کوئی منطقی وجہ سامنے نہیں ہے۔سوائے اس کے کہ شوٹر اپنے ہی فن سے لطف اندوز ہورہا ہے۔'' ریچر نے کہا۔

''اوراب کِڈ؟''

''ایلی ان کے لیے بوجھ ہے۔بظاہر وہ بیشتر اوقات الگ الگ رہتے ہیں۔ہٹ ٹیم کے لیے یہ ایک معروف حکمت عملی ہے۔ایلی کی موجودگی میں وہ نمایاں نظر آئیں گے۔'' ایلس نے کہا۔

''شاید نہیں......عورت، مرد اور بچی، ایک فیملی کے مانند......میرے خیال میں وہ دو سے زیادہ ہیں۔'' ریچر نے کہا۔''کیونکہ اگر میں بھی ہوتا تو ہم تین ہوتے۔ملٹری کے مانند۔ایک ڈرائیور، ایک شوٹر اورایک بیک اپ۔''

''لیکن اعتراف کے بعد ایلی کو رکھنے کی کیا وجہ ہے؟''

''اگر وہ گرینڈ جیوری کے سامنے بیان بدل دے تو باہر آنے میں اسے کتنی دیر لگے گی؟''

ایلس نے چٹکی بجائی۔''کل تک وہ باہر ہوگی۔''

''یہی چیز ان کے لیے پریشان کن ہے۔''

''پھر کیا کرنا چاہیے؟''

''ایلی کی تلاش۔'' ریچر نے پھر نقشے باہر نکالے۔

''لاکھوں مقامات پر کیسے تلاش کریں گے؟''

''وہ یوجین کو ہلاک کر چکے ہیں۔رسٹی کو شکل دکھا چکے ہیں۔ایلی ان کے ساتھ ہے......ان کو کسی موٹیل میں ہونا چاہیے۔ہر روز وہ موٹیل بدلیں گے۔میں سامنے سے تصادم پسند نہیں کروں گا۔ایلی کو کراس فائر سے بچانا ہے۔''

''سیکڑوں موٹیل ہیں؟'' ایلس کے اعتراضات کا سلسلہ جاری تھا۔

''ہم انہیں اپنے دماغ سے تلاش کریں گے۔ان کی جگہ بیٹھ کر سوچیں گے۔تینوں میں سے ایک کو جھانسا دے کر الگ کرنا پڑے گا۔وہ دونوں کے بارے میں بتائے گا۔وہ ہمارے بارے میں جان چکے ہیں۔چنانچہ وہ ہمارے پیچھے آئیں گے۔تیسرا اضافی کام۔''

''کس نے بتایا ہمارے بارے میں؟''

ریچر خاموشی سے نقشوں کو گھورتا رہا۔

☆☆☆

''واکر کو فون کر کے اب تک کی صورتِ حال کے بارے میں بتا دو۔'' ریچر نے ایلس کو ہدایت دی۔دونوں

آفس میں اس طرح بیٹھے تھے کہ سامنے کا دروازہ ریچر کی نگاہ میں رہے اور ایلس عقبی دروازے پر نظر رکھ سکے۔ گن ریچر کی گود میں تھی۔ دونوں وکلا کے کیبن نما دفاتر میں عقبی جانب سے داخل ہوئے تھے۔ دوسری ڈیسک سے ریچر نے سارجنٹ راڈریگز کا نمبر ملایا۔

راڈریگز کی آواز میں خفگی تھی۔ ''کیسے آدمی ہو؟ ٹیکساس کی بار ایسوسی ایشن میں چیسٹر آرتھر کے کسی وکیل کے پاس لائسنس نہیں ہے۔''

''پہلی بات، میری اطلاع ٹھیک تھی۔ کریڈیٹ تمہیں ملے گا۔ دوسری بات میرا تعلق ورمونٹ سے رہا ہے...... فری میں کام کرتا ہوں...... بلکہ والنٹیئر ہوں۔ ایک ڈیل کرنی ہے، تمہارا ہی فائدہ ہوگا۔''

دوسری طرف خاموشی تھی...... نیم رضامندی تھی۔

''رینجر میں کب سے ہو؟''

''سترہ سال۔''

''بارڈر پٹرول کے بارے میں کتنا کچھ جانتی ہو؟''

''کافی کچھ۔''

میں چند سوالات کروں گا، ہاں یا نہ میں جواب دینا۔ بارہ سال سے پہلے ایک بارڈر پٹرول انویسٹی گیشن شروع ہوئی تھی؟''

''شاید۔''

''تحقیقات کو سرد خانے کی نذر کر دیا گیا تھا؟''

جواب ملنے میں ریچر نے کہا۔ ''شکریہ سارجنٹ، جلد رابطہ کروں گا۔'' اور فون بند کر کے ایلس کی طرف دیکھا۔

''واکر تیز جا رہا ہے۔ اس نے ہمیں یہیں رکنے کا کہا ہے...... ایف بی آئی سے بات کر کے رابطہ کرے گا۔'' ایلس نے بتایا۔

''یہاں بیٹھ کر انتظار نہیں کر سکتے۔'' ریچر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہیرے کا کیا سوچا؟'' ایلس نے یاد دلایا۔

''سب ہی کچھ افواہ اور سنا سنایا ہے۔ ہیرا اصلی ہے۔ عجیب جھوٹ ہے۔''

''کوئی اہمیت ہے اس بات کی؟''

''بالکل ہے۔ میں ایک تھیوری تشکیل دے چکا ہوں۔ جواز ہاتھ نہ آیا تو ہیرا اس تھیوری کے پرخچے اڑا دے گا۔''

''بگ تھیوری کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

''یوجین کی لاش سے لے کر اب تک بتا ہی رہا ہوں

پھر بھی کچھ اور سن لو...... بنجامن فرینکلن نے ایک مرتبہ لکھا تھا......''

''تم پاگل ہو...... کریزی......''

☆☆☆

وہ کورٹ ہاؤس بلڈنگ میں واکر کے دفتر پہنچ گئے۔ فضا میں نمی کا تناسب بڑھ گیا تھا۔ واکر دفتر میں اکیلا تھا۔ وہ تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میز پر کاغذات اور فون بکس بکھری ہوئی تھیں۔

''ویل...... کام شروع ہو گیا ہے۔ پولیس، ایف بی آئی، روڈ بلاکس، ہیلی کاپٹرز...... ڈیڑھ سو افراد کی نفری زمین پر ہے لیکن طوفان کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ یہ اچھی علامت نہیں ہے۔''

''ہمارے لیے کوئی ہدایت؟''

''نہیں، اب ٹاسک، پروفیشنلز پر چھوڑ دینا چاہیے۔'' میں گھر جا کر آرام کروں گا۔''

ریچر نے اطراف میں آفس کا جائزہ لیا پھر بولا۔ ''میں بھی یہ ہی سوچ رہا ہوں۔ ایلس کے گھر جاؤں گا۔ کوئی خبر ہو تو کال کر دینا۔''

☆☆☆

''ہمیں ایک بار پھر ایف بی آئی کے مانند متحرک ہونا پڑے گا۔'' عورت نے کہا۔

''بچی کا کیا بنے گا؟''

عورت نے کچھ سوچا۔ ٹیم کو دو۔ ایک میں منقسم کرنا پڑے گا۔ ڈرائیور بچی کے پاس اور دراز قد گورا خود اس کے ہمراہ۔

''تم یہیں رکو گے۔'' اس نے پستہ قد ڈرائیور سے کہا۔ ''چار گھنٹے انتظار کرنا اس کے بعد ہر نشانی مٹا کر غائب ہو جانا۔ یاد رکھنا ہم نے ریکی کرنے والوں کے ساتھ کیا کیا تھا۔''

☆☆☆

ایلس کے مسکن میں جانے سے پہلے ریچر نے گن اور فیڈیکس کا پیکٹ اٹھا لیا تھا۔ اندر پہنچ کر وہ سیدھا کچن میں گیا۔ کھانا پکانے کے لیے ہلکی اشیائے خورد و نوش کے مخصوص اسکیل پر اس نے پیکٹ رکھ دیا۔ ایلس خاموشی سے اس کی حرکات کا جائزہ لے رہی تھی۔ ریچر نے کپ بورڈ کھول کر نگاہ دوڑائی اور اخروٹ کا ڈبا اٹھا کر کھولا۔ اس نے اخروٹ اسکیل کی سطح پر رکھنے شروع کیے۔ کانٹا اٹھتے اٹھتے دو پونڈ پر آ گیا۔ اس نے پیکٹ کا لیبل دیکھا۔ دو پونڈ۔ اس نے اخروٹ ہٹا

لیے۔ کانٹا نیچے آکر ایک پونڈ ایک اونس پر رک گیا۔ ریچر مسکرایا۔

''اسکرو ڈرائیور چاہیے؟''

''سنک کے نیچے ہے۔''

اسکرو ڈرائیور برآمد کر کے اس نے کہا۔ ''آؤ چلیں۔''

''کہاں؟''

''کورٹ ہاؤس۔''

''وہ بند ہوگا۔ لاک ہوگا۔''

''تم آؤ تو۔''

دونوں باہر آگئے۔ ایلس گاڑی کو عقبی گلی میں لے گئی۔

''الارم ہوگا، پولیس آجائے گی۔'' اس نے کہا۔

''تین منٹ سے پہلے نہیں آئے گی۔ مجھے تین منٹ درکار ہیں۔ گاڑی اسٹارٹ رکھنا۔ میری واپسی پر بھاگ نکلنا۔'' وہ غائب ہوگیا۔

ریچر نے عقبی دروازے کے لاک کے نیچے لات ماری...... دوسری لات میں لکڑی ٹوٹ گئی۔ نیلے رنگ کی روشنی جلنے بجھنے لگی اور الارم کی آواز بلند ہوئی۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اندرونی آفس تک پہنچا۔ لات مار کر دروازہ کھولا اور سیدھا فائل کیبنٹ کی طرف گیا۔ مدھم روشنی میں قریب ہو کر اس نے حرف B تلاش کرنا شروع کیا۔ اسکرو ڈرائیور کی مدد سے درازیں کھولیں۔ دو منٹ ہو چکے تھے۔ وہ پھرتی سے ڈیسک کی طرف متوجہ ہوا۔ وہاں ایک دراز میں سے اسے مطلوبہ شے ملی، کاغذات کا دو انچ موٹا پلندا تھا، جو لفافے میں رکھا تھا۔ الارم کے ساتھ اب دور سے پولیس کار کا سائرن سنائی دے رہا تھا۔ اس نے پلندا بغل میں دبایا۔ دراز کھلی چھوڑی اور ہوا کے تیز جھونکے کے مانند پلٹا۔

ایلس نے اسے دیکھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔

''نکل چلو۔''

''کہاں؟'' گاڑی حرکت میں آئی۔

''جنوب...... لال مکان۔''

''وہاں کیا ہے؟''

''سب کچھ وہیں ہے۔''

ایلس نے رفتار پکڑی۔ ریچر نے عقب میں پولیس کارز کو جائے واردات کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے گردن گھمائی اور بروقت بڑی سی سیڈان کو دو سو گز کے فاصلے پر دیکھا جس کا رخ ایلس کی قیام گاہ کی جانب تھا۔ وہ اسٹریٹ لائٹس کے نیچے سے گزری تھی۔ وہ کراؤن وکٹوریا تھی اور بظاہر ایف بی آئی کی گاڑی کے مانند تھی جس پر VHF اینٹنا بھی نظر آرہے تھے۔

''جتنا تیز جا سکتی ہو...... ڈرائیو کرو۔'' ریچر نے اندر کی روشنی میں بارڈر پٹرول کی فائل کھولی اور دلچسپی سے مطالعہ شروع کیا۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے فائل لفافے میں ڈال کر پچھلی نشست پر اچھال دی۔

''کس چکر میں ہو؟''

''سچ تھا۔''

''کیا سچ تھا؟''

''کارمن نے ہیرے کے متعلق سچ بولا تھا۔ جھوٹ جوہری نے بولا تھا۔ اس نے کارمن کو الو بنانے کی کوشش کی تھی۔ احمق تھا۔ کارمن نے بھی سچ سمجھ لیا اور دوسرے جوہری کے پاس نہیں گئی۔ جوہری نے اسے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ تیس ڈالر میں لے کر ساٹھ ہزار میں فروخت کر دیتا۔ یہی بارہ سال پہلے ہو رہا تھا۔ تارکینِ وطن کے ساتھ۔ ہیرے کے متعلق مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا۔ یہ مشکل معما نہیں تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اتفاق سے ہم اسی جوہری کے پاس پہنچ گئے۔''

''اس نے ہمیں لوٹنے کی کوشش نہیں کی؟''

''کارمن اور ہم میں بہت فرق تھا۔ وہ اکیلی تھی، پریشان حال...... ہم دو تھے۔ اس کے اور ہمارے حلیے میں بھی فرق تھا۔ اسے جرأت ہی نہیں ہوئی۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''مطلب یہ ہوا کہ تمام بطخیں ایک قطار میں بیٹھی ہیں...... اور مطلب یہ ہوا کہ گاڑی بھگاؤ...... اور یہ کہ گندی بلائیں غالباً ہم سے بیس منٹ پیچھے ہیں۔'' ریچر نے اشاروں میں مطلب بتایا۔

☆☆☆

اندھیرا تھا۔ آسمان پر بادل گھرے تھے۔ دو بج رہے تھے۔ ریچر نے ریک میں سے تمام اعشاریہ بائیس کی شکاری رائفلیں اٹھا کر ایلس کے بازوؤں پر رکھیں۔ ''گاڑی میں رکھ آؤ۔'' وہ بولا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' بوبی آنکھیں ملتا ہوا آیا۔

''بھول گئے، میں ڈپٹی شیرف ہوں...... اور اسلحہ کہاں ہے؟''

بوبی نے پلکیں جھپکائیں۔ ''باہر ہے۔''

''چلو جلدی کرو۔ ہم سب کے پاس وقت کم ہے۔''

باہر پورچ سے کچھ فاصلے پر ایک گول فوارہ بنا ہوا تھا۔ اس کے نیچے کسی خفیہ خانے سے بوبی نے چار عدد ونچسٹر رائفلز

نکالیں۔ ایک کارڈ بورڈ باکس میں گولیاں تھیں۔ ''انہیں گاڑی میں پہنچادو۔''

بوبی نے ونچسٹرز، ایلس کی گاڑی میں رکھ دیں۔

''مجھے تمہاری جیپ کی ضرورت ہے۔ تم اور تمہاری ماں گھر میں ہیں۔ کوئی بھی آئے۔ سمجھنا کہ وہ دشمن ہے۔ اول تو ہم آنے نہیں دیں گے۔''

بوبی سر ہلا کر گھر کے اندر چلا گیا۔

''دس رائفلز کا ہم کیا کریں گے؟'' ایلس نے سوال کیا۔

''کچھ بھی نہیں۔ میرا مقصد تھا کہ اسلحہ خونی بلاؤں کے ہاتھ نہ آئے...... وہ دس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔ ان کی گاڑی بڑی ہے۔''

''کیا ہوگا؟''

''تصادم ویرانے میں ہوگا۔''

''تم نے کہا تھا کہ وہ بہت اچھے شوٹرز ہیں۔''

''ہاں، لیکن ہینڈ گن کے ساتھ...... بہترین دفاع یہ کہ ہم ہینڈ گن کا مقابلہ رائفلز کے ساتھ کریں۔''

ایلس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اس مار دھاڑ کا حصہ کیسے بن سکتی ہوں؟''

''اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تمہیں صرف شناخت کرنا ہے۔ تمہاری گواہی میرے لیے بہت اہم ہے...... تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میری گارنٹی ہے۔''

''اندھیرے میں کیسے دیکھوں گی؟''

''میری ذمے داری ہے۔'' ریچر نے کہا۔

''ریچر تم کریزی ہو......'' ایلس نے ساتھ تبصرہ دہرایا۔

''سات منٹ!''

ایلس نے دور سڑک کی طرف دیکھا۔

''میں جیپ جیرو کی لے جا رہا ہوں، میرے پیچھے آؤ۔''

جس وقت دونوں روانہ ہوئے...... اسی وقت آسمان سے پہلا قطرہ ونڈ شیلڈ پر گرا۔

☆☆☆

انہوں نے تاریکی میں پانچ میل سفر طے کیا۔ بوندا باندی نے بارش کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ ناہموار سطحِ زمین کی وجہ سے گاڑیوں کی رفتار چالیس کے قریب تھی۔ پانچ میل بعد سطحِ زمین نے اٹھنا شروع کیا۔ یہ ایک مخصوص قسم کی چھوٹی پہاڑی تھی۔ جس کے چاروں اطراف پست ڈھلوان تھی۔

اوپر سے پہاڑی کی زمین مسطح شکل میں تھی۔ اس کا مرکزی علاقہ فٹ بال گراؤنڈ جیسا تھا۔ یہ لائم اسٹون سے بنا قدرتی گراؤنڈ تھا۔ جیسے کسی نے فرائنگ پین کو الٹ کر رکھ دیا ہو۔ گراؤنڈ نما خطۂ زمین تک پہنچنے کے لیے چھوٹی بڑی چٹانیں اور علاقائی جھاڑیاں راستے میں حائل تھیں۔ خشک نالے اور پانی کے بہاؤ سے پیدا ہونے والے لائم اسٹون کے سوراخ، پتھر، کانٹے دار جھاڑیاں، ان کے درمیان راہداریوں سے گزر کر ہی گراؤنڈ تک پہنچا جاسکتا تھا۔

متعاقبین، گراؤنڈ سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ ریچر نے جیپ گھما کر چاروں طرف روشنی میں پہاڑی گراؤنڈ کا قطر اور حدود کو ذہن میں بٹھایا۔ بارش کے قطروں میں تیزی آگئی تھی لیکن اس میں تواتر کا فقدان تھا۔ ریچر جو کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی پسند کے عین مطابق اور آنے والے تصادم کے لیے موزوں تھا۔ بالآخر اس نے جیپ ایک مقام پر گراؤنڈ کے کنارے پر لگا دی جہاں سے چند فٹ چڑھ کر اندر داخل ہوا جاسکتا تھا۔ راہداری کسی قدر مخدوش تھی۔ ایلس نے بھی واکس ویگن، جیپ کے برابر لگا دی۔

''گاڑی گھما کر اس طرح لگاؤ کے یہ راستہ بلاک ہو جائے۔'' ریچر نے ہدایت کی۔ ''پچھلے پہیے بالکل کنارے تک لے آنا اور لائٹوں کے ساتھ انجن بھی بند کر دینا۔''

ایلس نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور گاڑی سے اُتر آئی۔

''رائفلز دو۔'' ریچر نے جیپ کا ٹیل گیٹ گرا دیا۔ ایلس نے ایک ایک کر کے ونچسٹر اس کے حوالے کیں۔ جنہیں ریچر نے ترتیب سے پک اپ کے لوڈ بیڈ میں رکھ دیا۔ وقتاً فوقتاً وہ شمالی راہداری کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ بعدازاں اعشاریہ بائیس کی شکاری رائفلز، ایلس سے لے کر اس نے جھاڑی کے ساتھ رکھ دیں۔ ایمونیشن کے دو باکس لے کر جھاڑی کے ساتھ رکھے اور جیپ کا انجن بند کر دیا۔ اندھیرا...... بوندا باندی اور سناٹا۔ دفعتاً جیسے ماحول میں خونی طوفان کی خاموش آہٹ ہمکنے لگی...... غیر محسوس سی سنسنی تھی۔ میدانِ کارزار کی سجاوٹ آخری مراحل میں تھی۔ ریچر نے آنکھیں سکیڑ کر شمالی افق کو دیکھا اور سماعت پر زور دیا۔ ہر جانب تاریکی اور خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

ریچر نے ایمونیشن کا ڈبا کھولا اور پہلی ونچسٹر رائفل کو تیار کیا۔ اس نے ساتوں رائفلز لوڈ کر دیں۔ ٹیل گیٹ بند کر کے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔ ایلس ساتھ بیٹھ گئی۔ جیپ نے وی ڈبلیو کے قریب سے ہٹنا شروع کیا۔

"کہاں جارہے ہو؟" ایلس نے سوال کیا۔

"سمجھو پہاڑی کا یہ گراؤنڈ نما حصہ ایک وال کلاک کا چہرہ ہے۔ ہم وہاں سے آئے تھے۔ کلاک کے مطابق وہ چھ کا ہندسہ ہے۔ چھ بج رہے ہیں اور تمہاری کار مخالف سمت میں بارہ بجے کے وقت پر کھڑی ہے۔ تم نے فرضی کلاک کو ذہن میں رکھ کے آٹھ کے ہندسے پر چھپنا ہے...... عین کنارے پر۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم ایک فائر کروگی اور سات بجے کے وقت پر چلی جاؤ گی۔"

"تم نے کہا تھا کہ فائر ورک میں میری ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں، میں نے منصوبہ تبدیل کر دیا ہے۔"

"لیکن میں فائر نہیں کر پاؤں گی۔"

"تم کرلوگی...... آسان کام ہے۔ ہر چیز لوڈڈ ہے۔ تم کو صرف ٹریگر دبانا ہے، کسی چیز یا نشانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے صرف دھماکے اور رائفل کے شعلے کی ضرورت ہے۔" ریچر نے وضاحت کی۔

"اوکے، گریٹ۔"

ریچر نے ایک جگہ گاڑی روک کر ٹیل گیٹ گرایا۔ ایک ونچسٹر اٹھائی اور اسے فرضی آٹھ بجے والی پوزیشن پر رکھ دیا۔

"یہاں آٹھ بج رہے ہیں۔ جہاں سے تم فائر کرکے سات پر جاؤ گی۔" ریچر نے ایلس کو بتایا۔ کنارے سے بھی کچھ نیچے رہنا...... محتاط رہنا۔ وہ نمبر آٹھ پر جوابی فائر کریں گے لیکن میں ضمانت دیتا ہوں کہ تمہیں خراش تک نہیں آئے گی۔"

"ایسا ہے؟"

"ہاں...... ان حالات میں ہینڈ گن سے سپر مین بھی تمہیں چھو نہیں سکتا۔"

"شاید ان کی لک کام کر جائے۔" ایلس نے کہا۔

"نہیں ایلس، آج کی رات میری ہے۔ ان کی قسمت روٹھ رہی ہے۔ مجھ پر یقین رکھو۔"

"لیکن میں فائر کب کروں گی...... کیسے پتا چلے گا؟"

"تمہیں معلوم ہو جائے گا، ایلس دی گریٹ۔ تم ایسی وکیل ہو جو گن ساتھ لیے پھرتی ہو۔" ریچر نے کہا۔

"گریٹ!"

ریچر، جیپ میں سوار ہوا اور چار بجے کی پوزیشن پر پہنچ کر جیپ ریورس کی اور تقریباً کنارے سے اتار دی۔ جیپ دوفٹ نیچے جاکر ترچھی حالت میں رکی۔ اس نے انجن بند کر کے لائٹس آف کر دیں۔ اتر کر اس نے ایک رائفل نکالی اور پسنجر ڈور کے ساتھ ٹکا دی۔ دو عدد اپنے ساتھ لیں اور دوفٹ اوپر آگیا۔ اس کا رخ فرضی کلاک کے دو کے ہندسے کی جانب تھا۔ وہاں اس نے ایک رائفل لٹکائی دوسری ونچسٹر کے ساتھ وہ احتیاط سے بھاگتا ہوا واکس ویگن کی طرف گیا۔ گاڑی کی اندرونی لائٹ کھول کر الگ کر دی۔ ڈرائیونگ سیٹ پیچھے کھسکائی۔ باہر آکر محتاط اندازے کے ساتھ قدم طے کر کے رائفل بارہ اور ایک کے درمیان رکھ دی...... تقریباً بارہ بج کر سترہ منٹ پر۔

کھسک کر وہ کنارے سے قریب تر ہو گیا۔ واکس ویگن قریب تھی۔ وہ خود پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ نظریں شمالی افق پر تھیں۔

☆☆☆

دس گیارہ منٹ بعد اسے ہچکولے کھاتی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ ساتھ ہی آسمان پر بجلی چمکی اور رم جھم میں اضافہ ہو گیا۔ یہ بارش نہیں بلکہ طوفان کی آمد آمد تھی۔ اوہ، نو...... ناٹ ناؤ۔ پلیز...... مجھے پانچ منٹ درکار ہیں۔ اس نے آسمان کو مخاطب کیا۔

تیس سیکنڈ بعد اسے آٹھ سلنڈر انجن کی آواز سنائی دی۔ یوبی کا پک اپ ٹرک۔ اس کے ذہن میں خیال سرسرایا۔ وہ اچانک چڑھائی عبور کر کے راہداری ٹن سے نمودار ہوا...... سطح زمین پر اس کی چال ہموار اور رفتار میں اضافہ ہوا۔ ستر گز کا فاصلہ تھا...... پچاس گز۔ وہ سیدھا ایلس کی تیز زرد رنگ کی واکس پر چڑھا آرہا تھا۔ اس کی تیز روشنی میں وی ڈبلیو زرد نگینے کے مانند چمک رہی تھی۔ دفعتاً اس نے ایمرجنسی بریک لگائے۔ چاروں وہیل ایک ساتھ لاک ہو گئے۔ ہنگامی بریک کی وجہ سے ٹرک رکتے رکتے تھوڑا سا پھسل گیا اور اس کا منہ گیارہ بجے والی پوزیشن کی طرف ہو گیا۔ وہ ریچر سے تیس گز دور تھا۔ ریچر سانس روکے وی ڈبلیو کے نیچے پڑا تھا۔ ایک سیکنڈ تک کچھ نہیں ہوا۔ پھر پک اپ ٹرک ڈرائیور نے لائٹس آف کر دیں۔ انجن نیوٹرل میں گھوم رہا تھا...... اور کوئی آواز نہیں تھی۔

"ایلس، فائر کرو۔" ریچر کے ذہن میں چیخ بلند ہوئی۔

"ناؤ، ایلس......"

ریچر نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پورے دو سیکنڈ گزر گئے۔ ریچر نے آنکھیں کھولیں۔ اسی وقت فرضی کلاک کی آٹھ بجے والی پوزیشن سے دھماکے کی آواز آئی اور شعلہ چمکا۔ ریچر بجلی کے مانند حرکت میں آیا۔ باہر کی جانب کروٹ لی اور

ڈرائیونگ سائڈ سے گھٹنوں کے بل کھڑکی میں ہاتھ ڈالا۔ اگلے لمحے گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن کر دیں۔

دھماکے اور روشنی نے حملہ آوروں کو سن کر دیا تھا۔ روشنی میں پک اپ صاف نظر آرہی تھی۔ اس میں تین آدمی تھے۔ کیب میں ڈرائیور اور دو لوڈ بیڈ.... گھٹنوں پر تھے۔ دونوں نے بار کو ایک ہاتھ سے پکڑا ہوا تھا۔ وہ سر گھما کر ایلس کے ٹھکانے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ شکاری اور شکار کا کھیل نہیں تھا۔ شکار کی صورت میں انہیں بھی شکاری کا سامنا تھا، آغاز ہی غیر متوقع تھا۔

تاہم ان کا سکتہ سیکنڈ کے قلیل وقفے میں ٹوٹ گیا۔ ڈرائیور نے دوبارہ لائٹس آن کیں۔ تاہم ریچر کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ نیلی جیکٹوں اور ایف بی آئی ٹوپیوں پر لمحاتی طور پر ٹھٹکا تھا۔ تاہم وہ اس جھانسے میں نہیں آیا۔ البتہ اتنا ضرور سمجھ گیا کہ انہوں نے کراؤن میں بیٹھ کر یوجین کی گاڑی کیسے روکی ہوگی۔ وہ اپنا مقصد حاصل کر کے جگہ تبدیل کر چکا تھا۔ وہ چھ فٹ ہٹ کر ڈھلوان سے چپک گیا تھا۔ لوڈ بیڈ میں ایک شکاری چھوٹے قد کا تھا۔ عورت۔ اس نے سوچا...... شوٹر۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ...... کارمن کی گن۔ لورین انہی ہاتھوں کے لیے تھے۔ دونوں گاڑیوں کی روشنی آنکھیں لڑاکا مینڈھوں کے مانند ایک دوسرے کو گھور رہی تھیں۔ دونوں کی جسامت میں کافی فرق تھا۔

معاً نو ملی میٹر پسٹل سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور ایلس کی گاڑی کا ونڈ شیلڈ، ہیڈ لائٹس سمیت نابود ہو گیا۔ فائرنگ کا رخ تبدیل ہو گیا تھا۔ غالباً وہ ایلس کی پوزیشن کو نشانہ بنا رہے تھے۔ ریچر ''کلاک'' پر رینگتا ہوا بارہ سترہ کی پوزیشن پر آ گیا۔ وہاں رکھی ہوئی ونچسٹر اٹھائی اور بے محابا ایک اندھا فائر کیا۔ پک اپ کی روشنی سے باہر رہتے ہوئے وہ ڈھلوان پر واپس وی ڈبلیو کی طرف پلٹا اور وہاں سے دوسرا فائر کیا۔ پک اپ کے اسمارٹ شوٹر نے متحرک شوٹر کو ذہن میں رکھتے ہوئے، ریچر کے پہلے فائر کی پوزیشن کے بجائے وی ڈبلیو کی طرف فائر کیا۔ ڈی فلیکٹ شوٹنگ۔ ''اسمارٹ'' ریچر نے خود سے کہا۔ گولی زرد گاڑی کے قریب زمین سے ٹکرائی تھی۔ اس مرتبہ ریچر نے رائفل چھوڑ کر کلاک وائز حرکت کی اور دو بجے والی پوزیشن پر پہنچ گیا۔ وہاں رکھی تیسری ونچسٹر اٹھائی۔ اس نے پک اپ سے آٹھ فٹ پیچھے، ہیڈ لائٹس سے چار فٹ اوپر فائر کیا۔ اس نے عورت کی چیخنے کی آواز سنی۔ اس کے آرڈر پر فوراً ہی پک اپ کی لائٹس بند ہو گئیں۔ ریچر نے ایک اور گولی داغی اور پانچ فٹ ہٹ کر زاویے میں تبدیلی پیدا کی۔ ذہن میں منجمد ٹارگٹ کو دیکھا اور فائر کیا۔ لوٹ لگا کر اندھیرے میں فوراً معمولی فرق سے ذہن میں موجود ٹارگٹ پر ایک اور فائر کیا۔ ایک کریہہ چیخ بلند ہوئی اور کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ ون ڈاؤن...... ریچر کے ذہن نے کہا۔ اس نے جگہ چھوڑ کر ذہنی ٹارگٹ کے بائیں جانب فائر کیا۔

اسی وقت دو واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ پک اپ ٹرک نے تنگ موڑ کاٹ کر راہِ فرار اختیار کی۔ دوسرا واقعہ ہینڈ گن کی تیز تر فائرنگ تھی۔ وہ اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ پھر بھی تین چار فٹ کے فرق سے گولیاں ٹارگٹ سے دور ٹکرائیں۔ عورت...... اصل شکاری میدان میں تھا۔ گرنے والے کی چیخ مردانہ تھی۔ ڈرائیور فرار ہو گیا۔

بارش نے یک دم زور مارا۔ دھواں دھار بارش اور ہوا گویا زخمی ناگن کی پھنکاریں تھیں۔ ریچر نے رائفل گیلی زمین پر رکھ دی اور تاریکی میں نیم پوشیدہ جیپ کی طرف حرکت کی۔ بارش اور ہوا کے شور میں دونوں حریف آواز دبانے کی کوشش سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ جیپ چالیس گز کے فاصلے پر ہونی چاہیے تھی۔ خراب بات یہ تھی کہ نگاہ کی رسائی قریب قریب صفر ہو گئی تھی۔ یوں غنیم گہری تاریکی میں ایک دوسرے سے ٹکرا سکتے تھے۔ تاہم چار بجے کی پوزیشن پر ریچر جیپ تک پہنچ گیا۔ اس کی چھوڑی ہوئی رائفل پسنجر سائڈ پر ٹکی ہوئی تھی۔ اس نے پہلا فائر وہیں سے گیارہ بجے والی پوزیشن پر کیا۔ فٹ فٹ کے فاصلے پر اوپر تلے چار فائر بارہ بجے والی پوزیشن پر کیے۔ چار سے گیارہ اور بارہ، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پانچ گولیاں...... وہ وہاں تھی یا نہیں...... لیکن ریچر نے فرضی کلاک پر وہاں تک جانے کے لیے سفر طے کیا تھا۔ اگر وہ درمیان میں راستے میں آئی تو بھی ''ہٹ'' ہونے کا امکان تھا۔ ریچر نے رائفل جیپ کے نیچے ڈالی اور جھاڑیوں کی آڑ میں مغرب کی طرف حرکت کی۔ آسمانی بجلی چمکتی تو اس کا قوی ہیکل جسم فوراً نظر میں آتا۔ اس نے ایلس کا ہیکلر اینڈ کوش جیب سے نکال لیا تھا۔ طوفانی بارش کا شور حیرت انگیز تھا۔

ریچر دو بجے والی پوزیشن کے مخالف سمت میں تھا۔ کنارے سے تیس فٹ اندر۔ اس وقت بجلی کڑکی۔ ریچر گھٹنوں اور کہنیوں پر نیچے جھک گیا۔ روشنی کے مختصر جھماکے میں اسے سامنے اور بائیں جانب کچھ نظر نہیں آیا۔ بجلی چند سیکنڈ بعد پھر چمکی۔ ریچر نے دوبارہ بائیں جانب نظر رکھی۔ اسے قدرے حیرت ہوئی۔ وہ ستر فٹ دور ایستادہ تھی۔ نگاہ ریچر پر تھی۔ دونوں ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھ گن پر

تھے۔ وہ پتھر کا مجسمہ لگ رہی تھی۔ فائر کے ساتھ روشنی کا وقفہ تحلیل ہوگیا۔ گھپ اندھیرا۔ اس کا نشانہ چوک گیا تھا۔ ریچر کو توقع نہیں تھی کہ وہ وہیں ہوگی یا کھڑی حالت میں ہوگی۔ لہٰذا اس نے ایک فائر پر اکتفا کیا اور سارا زور سماعت پر لگا دیا۔ کچھ نہیں......

پھر بجلی چمکی تو وہ ساٹھ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ دونوں نے تقریباً ایک ساتھ فائر کیا اور چوک گئے۔ گھپ اندھیرا۔ بلاشبہ وہ حرکت پذیر تھی۔ ریچر نے اوپر تلے دو فائر کیے۔ ڈی فلیکٹ فائرز۔ وہ زگ زیگ آرہی تھی۔ ریچر نے روشنی کا انتظار نہیں کیا۔ پہلا فائر اس نے ہٹ کر کیا۔ اس مقام سے دو فٹ ہٹ کے جہاں وہ نظر آئی تھی اور دوسرا فائر جہاں وہ پھر نظر آئی تھی۔

آسمان گرجا، بجلی کڑکی۔ ریچر نے نگاہ جمائی۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ وہ بجلی ہی کی تیزی سے مزید بائیں جانب گھوما۔ اسے دور ہوتی ہوئی نیلی جھلک نظر آئی۔ مہلت نہیں تھی، اس نے اندازے سے فائر کیا...... اور تاریکی۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور حتی الامکان تیزی سے دائیں جانب قوس بناتا ہوا بھاگا۔ اگلے کڑاکے سے پہلے وہ اس سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ تاریکی میں اس طرح دوڑنا خطرناک تھا۔ کیچڑ، پتھر اور جھاڑیاں لیکن کچھ تو کرنا تھا۔ شوٹر عورت میدان میں تھی۔ ریچر نے جو جال بچھایا تھا، وہ بھی فرار ہوسکتی تھی۔ وہ کئی جگہ گرتے گرتے بچا۔ وہ پہلی مرتبہ شمال میں نظر آئی تھی اور جنوب کی سمت گئی تھی۔ دوسری جھلک میں وہ مزید آگے آئی تھی اور آخری جھلک میں وہ جنوب میں ہی دور ہوتی نظر آئی تھی۔ بجلی کے چمکنے کی صورت میں ریچر کسی بھی لمحے زمین بوس ہونے کے لیے تیار تھا۔ اس نے بھاگتے ہوئے جو ایریا کور کیا تھا۔ اندازہ یہی تھا کہ وہ عین اس کے سامنے تیس فٹ دور نمودار ہوگا۔ اس نے رفتار کم کردی...... بجلی چمکی، وہ جھکنے کے بجائے تقریباً لیٹ گیا۔ سامنے کوئی نہیں تھا۔ اغلباً وہ جیپ کی طرف گئی ہوگی۔ اس نے کرالنگ شروع کردی۔ دس فٹ، پندرہ...... بیس...... معاً اسے خوشبو کا احساس ہوا۔ وہ رک گیا۔ اور ساکت لیٹ کر اندازہ لگایا۔ پرفیوم ہے یا کچھ اور...... نہیں ہلکی خوشبو پرفیوم کی تھی۔ اس نے سانس بھی روک لی اور روشنی کا انتظار کرنے لگا۔ خوفناک گرج کے ساتھ بجلی کڑکی اور جیسے دن نکل آیا۔ وہ محض تین فٹ دور منہ کے بل دہری پڑی تھی۔ گھٹنے مڑ کر پیٹ سے لگے تھے اور بازو بھی جسم کے نیچے تھے۔ گن اس کے کندھے کے قریب کیچڑ میں پڑی تھی۔ روشنی معدوم ہونے سے قبل ریچر نے اس کی گن دور اچھال دی۔ ایک بار پھر تاریکی چھا گئی۔ تین فٹ دور اس کا ہیولا ریچر کے ذہن میں تھا۔ اس نے انگلیاں اس کی گردن پر رکھ دیں۔ نبض مردہ تھی۔ جسم برف ہورہا تھا۔

☆☆☆

ڈی فلیکٹ شوٹنگ۔ اس وقت وہ پسپا اسی لیے ہوئی تھی۔ وہ ریچر کی گولی کے راستے میں آگئی تھی۔ ریچر نے فائر براہِ راست اس پر نہیں کیا تھا، کیونکہ وہ حرکت میں تھی۔ ریچر نے اسے سیدھا کیا اور جیکٹ کھول دی۔ بجلی کی چمک میں اس نے زخم دیکھا۔ گولی پہلو میں بغل کے قریب لگی تھی اور دوسرے پہلو سے نکل گئی تھی۔ اعشاریہ چالیس کی گولی نے تباہی پھیر دی تھی۔ غالباً پھیپھڑوں کے ساتھ دل بھی زد میں آیا تھا۔

☆☆☆

وہ گن جیب میں رکھ کر جیپ کی سمت چلنے لگا۔ جیپ میں بیٹھ کر اس نے ہیڈ لائٹس آن کردیں۔ انجن اسٹارٹ کر کے وائپرز چلائے اور جیپ کو کھلی جگہ پر لے آیا۔ اس نے دو تین بار ہارن بجایا۔ ایلس اپنی کمین گاہ سے نکل کر ہیڈ لائٹس کی طرف چل پڑی اور قریب آکر پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ریچر نے زگ زیگ میں جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں پہلے شکار کو تلاش کیا۔ ونچسٹر کی گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ وہ دراز قد اور قدرے بھاری تھا۔

ریچر نے آنکھیں بند کر کے تصور میں ان تینوں کو

## "ثبوت"

دو بچے ایک دوسرے پر اپنے اپنے باپ کے زیادہ امیر ہونے کا رعب ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر دلیلیں دے رہے تھے۔ آخر ایک بچہ بولا۔ "میرے ابا تمہارے ابا سے زیادہ امیر ہیں...... وہ تمہارے ابا سے زیادہ چیزوں کی قسطیں دیتے ہیں۔"

## "غلط فہمی"

مریض: ڈاکٹر صاحب! آپ نے مجھے طاقت کی جو گولیاں دی تھیں وہ سب کی سب میں باقاعدگی سے کھا رہا ہوں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہو رہا...... میں اب بھی اپنے آپ کو بے حد کمزور محسوس کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر: ہوسکتا ہے تمہاری خوراک میں کوئی گڑبڑ ہو۔ آج کل کیا کھا رہے ہو؟"

مریض: اچھا...تو ان گولیوں کے علاوہ مجھے کھانا بھی کھانا تھا؟

ڈائننگ شاپ میں دیکھا، جب وہ ایلی اور کارمن کے ساتھ وہاں گیا تھا اور کراؤن وکٹوریا کو دیکھ کر سیلز ٹیم کا دھوکا کھایا تھا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ تیسرا گندمی رنگ کا اور پستہ قد تھا۔ ''دو مر گئے، ڈرائیور بھاگ گیا۔'' ایلس کے استفسار پر اس نے بتایا۔ ''یہ اچھا نہیں ہوا...... کیا تم نے اسے دیکھا تھا؟''

ایلس خاموش تھی۔

''میں بھی چوک گیا۔ وہ تین تو تھے۔ لیکن لمحاتی روشنی میں میرا دھیان شوٹر پر تھا۔''

ایلس خاموش رہی۔

''یہ بہت اہم ہے۔ ایلس۔ ایلی کی خاطر۔ ڈرائیور کے بغیر ہم ایلی تک نہیں پہنچ سکتے۔''

''آئی ایم سوری، میں بھاگ رہی تھی اور آسمانی روشنی سیکنڈ۔ دو سیکنڈ تک رہتی تھی۔''

''میں ان دونوں کو پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ لیکن اس وقت یہ تین تھے۔ میں کارمن اور ایلی کے ساتھ ایکو کاؤنٹی کے قریب اسکول کے پاس ایک ڈائننگ ہال میں تھا۔ یقیناً انہوں نے پہلے اس علاقے کی ریکی کی ہوگی یا کرائی ہوگی۔ وہ تیسرا گندمی رنگ کا پستہ قد تھا...... بتاؤ، وہ ایسا ہی تھا؟''

''نہیں ریچر، مشکل سوال ہے۔''

''محسوس کرو، دماغ پر زور دو۔''

ایلس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ''شبیہ تھی...... سایہ سا۔ وہ چھوٹے قد کا نہیں تھا۔ شاید بال بھی سیاہ نہیں تھے۔''

''گڈ...... بات سمجھ آئی۔ انہوں نے ڈرائیور کو ایلی کے پاس چھوڑ دیا تھا۔''

''تو پھر یہاں کون ڈرائیو کر رہا تھا؟'' ایلس نے سوال کیا۔

''وہ آدمی، جس نے ان کو ہائر کیا تھا۔ میرا اندازہ ہے۔ کیونکہ عورت اور مرد کو علاقائی معلومات کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ نکل گیا۔'' ریچر مسکرایا۔ ''وہ بھاگ سکتا ہے، چھپ نہیں سکتا۔''

☆☆☆

انہوں نے وی ڈبلیو کا جائزہ لیا۔ جو تقریباً بے کار ہو گئی تھی۔ ایلس نے محض شانے اچکانے پر اکتفا کیا۔ ریچر نے اس میں سے نقشے نکال لیے۔ پھر دونوں جیپ کے ذریعے واپس لال مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ بارش بوندا باندی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

''پاور آف...... تاروں پر شاید بجلی گری ہے۔'' ریچر نے مکان کی کھڑکیوں میں جھلکتی زرد روشنی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے جیپ کا رخ اصطبل کی طرف کیا اور ہیڈ لائٹس روشن رکھیں۔ بوبی کی پک اپ جگہ پر تھی۔ لیکن گیلی اور کیچڑ میں لتھڑی ہوئی تھی۔ ریچر نے مرر میں عقبی سمت دیکھا۔ ''کوئی آ رہا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''چلو اندر چلتے ہیں۔''

وہ پورچ کی سیڑھیاں طے کر کے دروازے کے ذریعے ہال میں چلے گئے جہاں موم بتیاں جل رہی تھیں۔

''تم دونوں تین بجے جاگ رہے ہو؟'' ریچر نے بوبی اور رسٹی کو مخاطب کیا۔ دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تمہارا پک اپ ٹرک، طوفانی رات میں باہر گیا تھا؟''

''لیکن ہم نہیں...... تمہارے کہنے کے مطابق ہم گھر پر ہی تھے۔'' بوبی نے جواب دیا۔ باہر کسی گاڑی کے انجن کی آواز آئی۔ گاڑی بند ہوئی۔ دروازہ کھلا۔ بند ہوا۔ پھر کسی کے قدموں کی چاپ پورچ کی سیڑھیوں پر ابھری۔ دروازہ کھلا اور ہیک واکر نمودار ہوا۔

ریچر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بہت دلچسپ!''

''کیسی دلچسپی؟''

''تفصیلات کے بارے میں۔'' ریچر نے کہا۔ ''میں بڑا تفصیلی آدمی ہوں۔''

''تم میرے دفتر میں گھسے تھے؟''

''ضرورت تھی۔''

''فائلیں میں تم کو دکھا سکتا تھا۔''

''جب میں گھسا، تم وہاں نہیں تھے۔''

''جو کچھ بھی ہے۔ تم نے اپنے لیے بڑی مشکل کھڑی کر لی ہے۔'' واکر نے کہا۔

ریچر مسکرایا۔ ''تم کیوں کھڑے ہو؟ بیٹھ جاؤ۔''

واکر چند سیکنڈ تک اسے دیکھتا رہا پھر بیٹھ گیا۔ ریچر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ واکر، رسٹی کے برابر بیٹھا تھا۔

''کسی نہ کسی شکل میں، میں تیرہ سال سے پولیس کا کردار ادا کر رہا ہوں۔''

''پھر؟''

''کارمن کے پاس دو ملین تو کیا چند ڈالر بھی نہیں تھے۔ وہ گھر سے تین سو میل دور مجھے ملی تھی۔ اس وقت اس کے پاس صرف ایک ڈالر تھا۔ کار میں ہی سوجاتی تھی۔ اگر وہ ایک ڈالر کے ساتھ اتنی دور مجھ جیسے کسی آدمی کی تلاش میں تھی تو پھر ملک میں اس سے بڑا اداکار یا شعبدہ باز کوئی دوسرا نہیں۔

دلوئی پہلے گزرا۔"

"کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"تم میں کچھ کالا کالا تھا...... مسئلہ دولت کا نہیں تھا۔ شاید ہنسلی کی ہڈی نے گڑبڑ کر دی۔ ایلس تم گری تھیں اسکیٹنگ کے دوران، کیا تمہاری کالر بون ٹوٹ گئی تھی؟"

"نہیں...... ہاں زخم آئے تھے۔ جبلی طور پر ہاتھ سامنے لانے پڑتے ہیں۔"

"میں کارمن کے ساتھ ایک دن گھڑسواری پر نکلا تھا۔ ایسی بنجر، اونچی نیچی سطح زمین پر گھوڑے سے گرنے پر کالر بون ٹوٹ گئی...... اور باقی زخم کہاں گئے؟"

"زخم، خراشیں ہوں گی۔" واکر نے کہا۔

"اسپتال کی رپورٹ میں نہیں لکھا۔"

"وہ بھول گئے ہوں۔"

"میں نے دیکھا تھا۔ تفصیلی رپورٹ تھی۔ پروفیسر نے بھی تفصیلی روشنی ڈالی تھی۔ کارمن نے جبڑا ٹوٹنے، تین دانت اور بازو ٹوٹنے کی ذمے داری سلوپ کے تشدد پر ڈالی تھی جن کی رپورٹس غائب تھیں۔"

"میرا بیٹا کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔" رسٹی نے کہا۔

"تم خاموش رہو۔" ریچر نے کہا۔ "میرا واکر کے ساتھ بزنس چل رہا ہے۔"

"کیسا بزنس؟"

"یہ بزنس۔" ریچر نے ایلس کی گن میز پر رکھ دی جس کا رخ واکر کے سینے کی جانب تھا۔

"کیا مذاق ہے؟" واکر نے کہا۔

"جب میں ہیرے کی الجھن ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ہر چیز اپنی جگہ فٹ ہوتی چلی گئی۔ خاص طور پر جب تم نے ہمیں ڈپٹی شیرف بنا دیا۔"

"تمہاری کوئی بات مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔"

"آ جائے گی، مجھے بھی وقت لگا تھا۔ تم کارمن کو اچھی طرح جانتے تھے۔ تم نے اس کی طرف سے خوب صورت اور موزوں مکالمے بولے تاکہ میں بدظن ہو جاؤں۔ لیکن جھوٹ وہ نہیں بلکہ تم بول رہے تھے۔ تمہارا طریقۂ کار بہت مؤثر تھا۔ دوسری طرف تم اسے بچانے کی کوشش کا ڈراما کر رہے تھے۔ میں خوامخواہ تمہارے راستے میں آ گیا۔ تم خود ہی آواز بدل کر اسے دھمکیاں دے رہے تھے کہ اعترافی بیان حاصل کر سکو۔ اس سے پہلے قاتلوں کے ذریعے تم نے ایلی کو اغوا کرا لیا۔ کارمن مجبور ہو گئی۔ تمہارا کھیل بہت خوب صورت تھا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔"

"دوسری طرف تم ہمیں بہکا رہے تھے کہ تم اسے بچانا چاہ رہے ہو۔ اس طرح جج بننے کے لیے تم میکسیکن ووٹ حاصل کر سکو گے۔ گریٹ۔ اپنے کمپیوٹر پر تم نے خود ہی جعلی مالی ریکارڈ تیار کیا۔ جعلی ٹرسٹ ڈیڈ۔ فیملی سروس کے جعلی کاغذات، جنہیں دکھا کر تمہارے آدمیوں نے ایلی کو اٹھایا۔"

"سب بکواس۔"

ریچر نے شانے اچکائے۔ "ثابت کرو، یہ بکواس ہے۔ ایف بی آئی کو کال کر کے پوچھو کہ انہوں نے ایلی کے لیے کیا کیا؟"

"فون طوفان کی وجہ سے خراب ہیں۔" بوبی نے کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ رسٹی بتائے گی کہ ایف بی آئی والے یہاں آئے تھے یا نہیں؟"

رسٹی نے نفی میں سر ہلایا۔

"واکر! اسٹیٹ روڈ بلاک، ایف بی آئی اور ہیلی کاپٹرز کہاں ہیں؟ اور ڈیڑھ سو اہلکار؟ ڈیئر تم نے کسی کو کال نہیں کی۔ اگر تم کال کرتے تو جو کارروائی ہوتی، سب میں جانتا ہوں۔ کیونکہ رسٹی واحد گواہ تھی۔ جب وہ ایلی کو لے کر گئے۔"

"ایف بی آئی کے آدمی مجھے نظر آئے تھے۔" بوبی نے بتایا۔

"وہ صرف ٹوپیاں تھیں...... جعلی۔ ہاں تو مسٹر واکر بڑی حماقت تم سے اس وقت سرزد ہوئی جب تم نے یہ فضول اسٹار ہمارے حوالے کیے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ تمہیں علم ہو کہ کہاں پر ہمارے پائے جانے کے امکانات نمایاں ہوں گے اور تم قاتلوں کو ہمارے پیچھے روانہ کر سکو گے۔ ان سے تم نے یوجین کو مروایا، سلوپ کو ختم کرایا۔ وہ پیشہ ور تھے۔ یوجین اتنا مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن سلوپ کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ رہا ہو کر آیا تھا۔ فی الحال اس کو نہیں رہنا تھا۔ یہاں اسے شوٹ کرنے میں رسک تھا۔ تاہم انہوں نے تمہیں قائل کیا کہ یہ ممکن ہے اگر کارمن کو فریم کر دیا جائے۔"

"یہ سب کہانیاں ہیں۔" واکر کی آواز کمزور پڑ گئی۔

"تم جانتے تھے کہ کارمن نے گن خریدی ہے...... تم سلوپ کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتے تھے۔ وہ کارمن پر ظلم کرتا تھا۔ یہ بات تمہارے علم میں تھی۔ تم آگاہ تھے کہ سلوپ کی خواب گاہ ٹارچر چیمبر تھی۔ اسی لیے کارمن نے گن

وہیں چھپائی تھی۔ چھپانے کی تین جگہیں تھیں۔ ٹاپ شیلف، کارمن کا کلوزٹ اور وہ دراز جس میں اس کے زیر جامے رکھے ہوتے ہیں۔ میں واقف تھا اور تمہارے آدمی بھی جانتے تھے۔ غالباً وہ کھڑکی کے آس پاس موقع کی تلاش میں تھے۔ جیسے ہی وہ شاور کے لیے گئی، وہ اندر آئے۔ دستانے پہن کر اس کی گن سے سلوپ کو شوٹ کیا اور نکل گئے۔ کار سڑک پر ہوگی۔ یہاں سناٹا ہوتا ہے۔ تم فیملی کو خوب جانتے ہو۔ تم نے انہیں یقین دہانی کرائی ہوگی کہ دیکھ لیے جانے کا امکان نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے تم نے نقشہ بھی فراہم کر دیا ہو۔''

واکر خاموش تھا۔ اس کا چہرہ اُتر گیا۔

''مالی کاغذات بناتے وقت بھی تم نے غلطیاں کیں۔ خاصی رقم لیکن اخراجات معمولی؟ اور میڈیکل رپورٹس...... فیڈیکس پیکٹ میں بڑی صفائی سے تم نے ایلس کو ارسال کر دیں۔ تم بھول گئے کہ اس پر دو پونڈ نو اونس کا لیبل لگا ہے۔ میں نے ایلس کے کچن میں وزن کیا تو وہ ایک پونڈ ایک اونس تھا۔ تقریباً ساٹھ فیصد رپورٹس تم نکال چکے تھے۔ تم نے سوچا کہ کالربون کی گرہ تو سب کی نظر میں آجاتی ہے۔ تم نے کالربون کی نامکمل رپورٹ ساتھ رکھ دی۔ مجموعی طور پر تم بہت اچھا کھیلے۔

لیکن میں نے جب تمہیں یوجین کی لاش دریافت ہونے کی خبر سنائی تو تم ہوش کھو بیٹھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ تمہارا دوست تھا بلکہ اس لیے کہ لاش کی جلد برآمدگی تمہارے منصوبے میں شامل نہیں تھی۔ تاہم تم جلد ہی سنبھل گئے اور IRS کا شوشہ چھوڑا۔ لیکن تم سوچنے میں اتنے مصروف تھے کہ اپنے خوف کو نہ چھپا سکے۔ سلوپ کو اتوار کو رہا کرانا آسان نہ تھا لیکن یہ تمہاری اپنی ضرورت تھی۔ وہ اتوار کو مارا جاتا۔ کارمن اتوار کو اندر ہوتی تو اگلے ہفتے تک کوئی اس سے نہیں مل سکتا تھا۔ اس طرح تمہیں منصوبہ نکھارنے کے لیے چھ سات دن مل جاتے۔''

واکر خاموش تھا۔ چہرے پر زردی اُتر آئی تھی۔ بوبی آگے جھکا۔ ''تم نے میرے بھائی کو مارنے کے لیے آدمی بھیجے تھے؟''

''میں کیوں بھیجتا...... میرے پاس کوئی محرک نہیں تھا۔'' واکر کافی دیر بعد بولا۔

''تم طاقت اور پیسے کے بھوکے ہو۔'' ریچر نے کہا۔ ''تم جج بننا چاہتے تھے اس کے لیے ضروری تھا کہ تم الیکشن جیت جاؤ۔ تمہاری فتح کی راہ میں صرف ایک چیز حائل ہوسکتی تھی۔ اسکینڈل...... پرانے راز، واپس تمہارے راستے میں آرہے تھے۔ پرانی بات ہے۔ یوجین، سلوپ اور تم ایک تھے۔ مل کر کام کرتے تھے۔ سلوپ اندر گیا تو وہ زیادہ برداشت نہ کرسکا۔ وہ باہر آنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے وہ ٹیکس دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے تمہاری شکل میں ایک جج کی ضرورت تھی۔ اس نے تم سے بات کی کہ تم بروکر بن کر کوئی ڈیل کرو اور اسے کسی طرح باہر نکالو...... ورنہ ماضی میں تم تینوں مل کر جو کچھ کرتے رہے ہو، وہ ان سرگرمیوں کے بارے میں زبان کھولنا شروع کردے گا۔ پہلے تم نے سوچا کہ سلوپ ایسا نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ خود بھی ملوث رہا تھا۔ تاہم بعد میں تم نے خطرہ محسوس کیا اور انتخابی مہم کے چندے میں سے آئی آر ایس کو ادائیگی کردی۔ اب سلوپ خوش تھا لیکن تم برہم۔ تمہارے ذہن میں تھا کہ سلوپ ایک مرتبہ دھمکا سکتا ہے تو آئندہ بھی دھمکا سکتا ہے۔ مزید برآں یوجین، سلوپ کا وکیل تھا۔ یوجین کے بیشتر مؤکل صاف ستھرے نہیں تھے۔ معاً تمہیں ادراک ہوا کہ تمہاری پوزیشن نازک ہے۔''

واکر خاموش تھا۔

''جانتے ہو بین فرینکلن نے کیا لکھا تھا؟'' ریچر نے کہا۔ ''تین آدمی راز کو راز رکھ سکتے ہیں۔ اگر ان میں سے دو مردہ ہوں۔''

''راز کیا تھا؟'' ایلس نے سرگوشی کی۔

''ٹیکساس کے دیہی علاقے میں تین لڑکے تھے۔'' ریچر نے بتایا۔ ''ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ وہ کچھ بڑے ہوئے تو انہوں نے اکتا کر اپنے بڑوں کے کھیل میں دلچسپی لینی شروع کی۔ یعنی شکار میں۔ انہوں نے رائفلز کا استعمال شروع کیا اور بوبی کے مطابق ان تینوں نے چھوٹا موٹا شکار شروع کیا۔ خیال سلوپ کا تھا۔ تینوں میں وہی زیادہ ماہر تھا۔ تینوں ہائی اسکول سینئرز میں شامل ہوئے تو انہیں مزید ہیجان اور لطف کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ بڑے ہوگئے تھے۔ انہیں مضبوط شکار کی ضرورت تھی۔ وہ راتوں کو پک اَپ ٹرک میں سرحد کی جانب شکار کھیلنے لگے۔ انہیں اندازہ ہوا کہ بڑا شکار کسے کہتے ہیں اور تھرل کیا ہوتا ہے۔''

''کون سا بڑا شکار؟''

''میکسیکن۔'' ریچر نے کہا۔ ''شاید انہوں نے لڑکی سے شروع کیا۔ ممکن ہے شروع میں ان کا ارادہ ہلاکت کا نہ ہو۔ بہرحال یہ شروع ہوگیا۔ کچھ دن وہ نروس رہے...... لیکن بارہ سال پہلے اس طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔ جلد ہی انہیں لت پڑ گئی۔ ان کے لیے یہ اسپورٹس تھا۔ پرانے پک اپ ٹرک میں ایک ڈرائیونگ کرتا اور باقی دونوں پیچھے لوڈ بیڈ میں

موجود رہتے۔ انہوں نے سال میں پچیس مرتبہ یہ حرکت کی۔"

"نہیں، وہ بارڈر پیٹرول تھا۔" بوبی نے تردید کی۔

"نہیں۔" ریچر نے کہا۔ "بارڈر پٹرول کی فائل میں نے پڑھی ہے۔ سارجنٹ راڈریگز نے تصدیق کی ہے۔ تحقیقات بھی شروع ہوئی تھیں۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا کیونکہ اس جانب بارڈر پٹرول کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ وہ تین مقامی لڑکے تھے۔ یوجین، سلوپ اور ہیک واکر۔"

کمرے میں سکوت طاری تھا۔

"اس قسم کے حملے زیادہ تر ایکو کاؤنٹی کے اطراف میں ہوئے تھے۔ یہی چیز میرے لیے عجیب تھی۔ بارڈر پٹرول کو اتنی دور شمال میں آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لڑکوں کی سرگرمیاں ختم ہوگئی تھیں۔ تحقیقات کے ڈر سے نہیں بلکہ کالج کھل گئے۔ اگلے سرما میں یہ اسپورٹس خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ لڑکوں نے بھی اپنے راستے چن لیے۔ اس طرح تمام معاملہ تاریخ کا حصہ بنتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ سلوپ کو سزا ہوئی۔ باہر آنے کے لیے اس کی بے چینی بڑھتی گئی اور یہاں سے واکر کا کھیل شروع ہوا۔ بارہ سال پہلے کے مانند پھر خون خرابا......"

سب کی نظریں واکر پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں بند اور رنگت ہلدی ہورہی تھی۔ "ہم سے غلطی ہوئی۔" وہ بولا۔ "ہم نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی اس کا ذکر نہیں کریں گے۔ اس نے کارمن سے شادی کی۔ وہ خود کو سزا دینے کے لیے اسے مارتا تھا۔ ایلی کو میں نے عارضی طور پر اغوا کرایا تھا اور سلوپ کا کہنا تھا کہ وہ گڑے مردے نہ اکھاڑے۔ اس نے کہا اسے ایلی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بہت پرانی بات ہے، ریچر...... اس وقت ہم بچے تھے۔ وہ ایک بھیانک خواب تھا......"

"تمہارے پاس گن ہے؟"

"ہاں۔"

"مسز گریر، اس کی گن نکال لو۔" ریچر نے ہدایت دی۔ رسٹی نے اس کی جیب سے کولٹ اسپیشل نکالا۔

"ایلی کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم...... وہ موٹلز میں قیام کرتے تھے۔ وہ میرے آفس سے زیادہ دور نہیں تھے۔"

"رابطہ کیسے کرتے تھے؟"

"ڈلاس کا نمبر تھا۔ کال، ڈلاس...... پھر ڈلاس سے واپس آتی تھی۔"

ریچر نے ایلس کی گن اٹھا کر واکر کے چہرے پر تان لی۔ "میری انگلی پر نظر رکھو۔" ریچر نے ٹریگر دبانا شروع کیا۔ انچ کا سولہواں حصہ...... آٹھواں حصہ...... "ایلی کہاں ہے؟...... مرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں، پلیز...... ماردو۔"

ریچر نے گن میز پر رکھ دی۔ سب خاموش اور ساکت تھے، جب رسٹی کا کولٹ والا ہاتھ اٹھا۔ اس نے نال واکر کے سر پر رکھ دی۔

"میرے بیٹے کو تم نے مروایا؟"

"آئی ایم سوری۔" اس نے بمشکل کہا۔

"رسٹی نہیں۔" ریچر بلند آواز میں بولا۔ بوبی بھی چیخا۔ لیکن رسٹی فائر کر چکی تھی۔ ایلس کی چیخ بعد میں گونجی...... دو گولیاں واکر کے سر کے آر پار ہوگئیں۔ رسٹی پر دیوانگی طاری تھی...... وہ ہوائی فائرنگ کر رہی تھی۔ ایک گولی نے کیروسین لال ٹین کے ٹکڑے اڑا دیے۔ سیکنڈوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ وہ پسٹل خالی ہونے کے بعد بھی ٹریگر دباتی رہی۔

"باہر نکلو۔" ریچر چلایا۔

ریچر، ایلس کا ہاتھ پکڑے جیپ کی طرف دوڑ رہا تھا۔ "تم ڈرائیو کرو۔" ریچر نے دوسری جانب بیٹھ کر نقشے کھولے۔ ایلس، واکر کی لنکن کے برابر سے ہوکر باہر نکل گئی۔

"تیز چلو...... میری چھٹی حس مجھے ڈرا رہی ہے۔"

☆☆☆

چار گھنٹے گزر گئے تھے لیکن ڈرائیور ہدایت کے برعکس اپنی جگہ پر تھا۔ وہ سوئی ہوئی ایلی کو تک رہا تھا۔ کچھ سوچ کر وہ باہر نکلا...... ڈور کی تختی پلٹی۔ ڈونٹ ڈسٹرب کا نشان نمایاں ہو گیا۔ واپس آکر اس نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی ٹیم کے دونوں ممبر اب واپس نہیں آئیں گے۔

☆☆☆

ایلس اپنی ہمت کے مطابق برق رفتار سے جیپ دوڑا رہی تھی۔ ریچر نقشہ جات میں کھویا ہوا تھا۔ وہ انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کو کہیں کہیں کمپاس کے مانند گھما رہا تھا۔

"کوئی سیاحتی مقام ہے یہاں؟"

"میکڈ انلڈ اور بزرویڑی۔" ایلس نے جواب دیا۔

ریچر نے نقشہ دیکھا۔ "اسّی میل...... نہیں بہت دور ہے۔"

"کیا مطلب؟"

''پیکو سے نصف گھنٹے کا مطلب پچیس، حد سے حد تیس میل۔ کیونکہ انہیں واکر کے قریب رہنا تھا۔ واکر، ایلی کو اسمگل کرتا یا پھر اندر لاتا۔ یہ دکھانے کے لیے کہ دھمکی کھوکھلی نہیں ہے۔ سیاحتی مقام، تالے کی چابی ہے۔ مرنے سے قبل وہ بتا چکا تھا کہ قاتل آفس کے قریب تھے۔''

''اوہ گاڈ، ریچر فیول ختم ہو رہا ہے۔''

''چلتی رہو۔'' اس نے جھک کر فیول گیج دیکھا۔ ''ایک میل اور گھسیٹو۔''

''تم بے فکر ہو؟''

''ہاں۔'' ریچر نے کہا۔ ''وہ دیکھو۔''

ایلس نے دیکھا کہ سڑک سے ہٹ کر کچھ دور وہی پہاڑی تھی جہاں میدانِ کارزار گرم ہوا تھا۔ ''سڑک سے اتر جاؤ۔'' ریچر نے کہا۔ ایک منٹ بعد ہیڈ لائٹس کی روشنی میں پہاڑی کے شولڈر پر کراؤن وکٹوریا نظر آئی۔ اسی وقت جیپ نے آخری ہچکی لی اور انجن بند ہو گیا۔ ''کراؤن یہاں کیوں کھڑی ہے؟'' ایلس نے سوال کیا۔

''سیدھی بات ہے۔'' ریچر نے کہا۔ ''وہ لوگ پیکو سے دو کاروں میں آئے تھے۔ لنکن اور کراؤن۔ ناسازگار حالات کے تحت واکر بھاگ کر لال مکان پہنچا۔ لنکن یہاں چھوڑ کر وہ پک اپ ٹرک میں بھاگا۔ پک اپ اصطبل میں کھڑی کی اور کراؤن میں واپس آ گیا۔ کراؤن یہاں چھوڑ کر لنکن میں واپس چلا گیا۔ وہ یہ تاثر دینا چاہ رہا تھا کہ لنکن پر وہ اسی وقت وہاں پہنچا تھا۔ ''اب تم کراؤن میں جتنا تیز جا سکتی ہو جاؤ، کوئی نہیں روکے گا۔ کیونکہ یہ دیکھنے میں ایف بی آئی کی گاڑی معلوم ہوتی ہے۔'' ریچر نے کہا اور نقشوں کے ساتھ سیڈان میں بیٹھ گیا۔

ایلس نے سڑک پر آنے کے بعد رفتار بڑھانی شروع کی اور اسّی تک جا پہنچی۔ ''ملمور یا ریکریشن ایریا کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' ریچر نے نقشے پر نظر دوڑاتے ہوئے سوال کیا۔ ''یہ پیکو سے جنوب مغرب میں ہے۔ تیس میل کے فاصلے پر......''

''یہ نخلستان ہے...... اسکوبا ڈائیونگ اور پیراکی کے لیے وہاں بڑی سی شفاف جھیل بھی ہے۔''

ریچر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اولڈ فورٹ اسٹاک ٹن؟''

''تاریخی جگہ ہے۔ پیکو سے نزدیک ہے۔''

ریچر نے فاصلہ چیک کیا۔ پینتالیس میل۔ ''ہاں، ممکن ہے۔''

''کیا چیز ہے؟''

''ملٹری کا قدیم قلعہ۔''

ریچر نے آنکھیں بند کر لیں۔

''ایلی کو یہاں ہونا چاہیے؟''

''مزید ایک میل تک ریچر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''وہاں نہیں، لیکن اس کے قریب۔ سوچو، ان کے ذہن سے سوچو...... وہ کون تھے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''وہ پیشہ ور تھے...... ٹرینڈ۔ پروفیشنل...... کم گو، غیر نمایاں، چھپکلی کی طرح رنگ بدلنے والے۔ رنگ بدل کر ماحول میں ڈھل جانے والے۔ ایلس، ان کے جوتوں میں اپنے پیر ڈالو۔ جب میں نے ان کو دیکھا تھا تو یہی سمجھا کہ وہ کوئی سیلز ٹیم ہے۔ یوجین کے لیے وہ ایف بی آئی کی گاڑی تھی۔ رسٹی گریر کے نزدیک وہ سوشل ورکر تھے۔ تم ان کی طرح سوچو تو تمہاری طاقت اس میں ہے کہ تم عام اور غیر اہم دکھائی دو۔ ماحول میں مدغم ہو جاؤ۔ تو گوری ہو...... تم مڈل کلاس کی معلوم ہوتی ہو اور تمہارے پاس فورڈ کراؤن وکٹوریا ہے جس پر جعلی ریڈیو اینٹینا نہیں ہے۔ لہٰذا اب یہ ایک عام فیملی سیڈان ہے۔''

''او کے۔'' ایلس نے سر کو جنبش دی۔

''لیکن تمہارے ساتھ ایک بچی ہے...... ایک عام، مڈل کلاس فیملی......''

''لیکن وہ تین تھے؟''

''تیسرا انکل ہے۔ تم لوگ چھٹی پر ہو۔ سوبر فیملی...... تم لوگ ڈزنی لینڈ کی سیر کے لیے نہیں نکلے۔ تم لوگ ٹیکساس کے نہیں ہو۔ ظاہر ہے سفر پر ہو۔ کہاں جاؤ گے۔ بظاہر تمہاری جیب بھی ہلکی ہے۔ بچی کو ذہن میں رکھو۔ ایسی جگہ جاؤ گے، جہاں دوسری فیملیز کے ساتھ گھل مل جاؤ......''

''اولڈ فورٹ اسٹاک ٹن۔'' ایلس اچانک بول اٹھی۔

''ٹھیک ہے۔ تم بچی کو امریکن افریقن سولجرز کا شاندار ماضی دکھانا چاہتی ہو۔ تمہارے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔ تم کیڈی لاک یا بی ایم ڈبلیو میں سفر نہیں کر رہی ہو......'' ریچر رک رک کر بول رہا تھا، غلطی کی گنجائش نہیں تھی۔ ''اولڈ فورٹ اسٹاک ٹن...... رواں سڑک پر پیکو سے پچیس منٹ کا فاصلہ ہونا چاہیے۔ واکر کے دفتر کے قریب۔''

☆☆☆

بچی سو رہی تھی۔ اس نے شاور لینے کا فیصلہ کیا اور کپڑے اتار کر باتھ روم میں گھس گیا۔ وہ نیم گرم پانی میں احتیاط سے ہاتھ پیر اس طرح صاف کر رہا تھا جیسے کوئی سرجری

کی تیاری کر رہا ہو...... اس کا ذہن نئے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ تنہا رہ گیا تھا۔ اس کا مطلب کمائی کے امکانات محدود ہو گئے تھے۔ یہ صورتِ حال اس کے لیے ناگوار تھی۔ ٹیم ورک کے بغیر وہ عضوِ معطل تھا۔ میٹرس کے نیچے اس کے پاس کچھ رقم محفوظ تھی۔ لیکن یہ ناکافی تھی۔ بچی کو لاس اینجلس لے جانا چاہیے۔ وہاں اسے فروخت کرنے میں اسے دشواری پیش نہیں آئے گی۔ کراؤن کی غیر موجودگی میں وہ کوئی اور گاڑی بہ آسانی چرا سکتا تھا۔ بچی کو ٹرنک میں ڈال کر نکل جائے گا۔ نو پرابلم۔

☆☆☆

”ہمیں منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔“ ریچر نے کہا۔

”ایلس نے ایک قانونی اصطلاح استعمال کی جسے استعمال کر کے اسے کارمن کو لانا ضروری تھا۔ اس کے تحت ثابت کرنا تھا کہ اسے غیر قانونی پر محبوس کیا گیا ہے۔ ایمرجنسی صورت، فیڈرل جج کے سامنے موو کرنی پڑے گی اور اس کے لیے اوتھ کے تحت گواہ کا بیان درکار ہے۔ لہٰذا ہمیں ایلی کو ہر صورت بچانا ہوگا۔ اگر زیادہ رد وقدح نہ ہوئی تو پوری کہانی بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ ایلس نے قانونی نکات اٹھائے۔ ”اس ڈرائیور کو بھی زندہ رکھنا ہوگا۔“

☆☆☆

ایلی کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی باتھ روم میں تھا۔ کمرے کی روشنیاں آف تھیں لیکن پردے پوری طرح برابر نہیں تھے۔ باہر سے مدھم روشنی اندر آ رہی تھی۔ اس نے پیر نیچے کر کے آہستگی سے جوتے پہنے۔ اور گربہ قدم باتھ روم کے پاس سے گزر کر دروازے تک پہنچی۔ وہ چین، لاک اور ہینڈل کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ لوگ جب بھی دروازہ بند کرتے وہ خاموشی سے طریقۂ کار کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ ایلی نے چین ہٹائی۔ باتھ روم سے پانی کے گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کوشش کرتی رہی۔ دونوں ہاتھوں سے ہینڈل کو آزمایا...... جیسے تیسے وہ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گئی۔ تاہم آخری کوشش میں خاصی آواز آئی اور باتھ روم میں پانی گرنے کی آواز بھی بند ہو گئی تھی۔ ایلی اپنی جگہ پر جم کے رہ گئی اور سماعت پر زور دیا۔ اس کا ننھا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

☆☆☆

ایلس گاڑی نوّے کی رفتار سے دوڑا رہی تھی۔ وہ فورٹ اسٹاک ٹن سٹی کو پاس کر گئی تھی۔ وہاں ”پیکو اڑتالیس میل“ کا نشان لگا تھا۔ ریچر متواتر دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔

## گشت جاری ہے

شام کا وقت تھا۔ ہاتھوں میں بندوقیں تھامے دو سپاہی بھاری بوٹ کھڑکھڑاتے ہوئے گشت کر رہے تھے۔ تھوڑی دور جا کر ویران سڑک پر انہوں نے ایک جگہ کچھ لوگ کھڑے دیکھے۔ دونوں تیزی سے اس طرف بڑھے۔ لوگوں کے درمیان ایک لاش پڑی تھی۔ کوٹ پتلون پہنے مرنے والا کسی اچھے کھاتے پیتے گھر کا فرد معلوم ہوتا تھا۔ سپاہیوں کی آنکھوں میں بھوک سی چمکی اور انہوں نے بھیڑ منتشر کر دی۔

ایک سپاہی نے آنے جانے والوں پر نگاہ رکھی، دوسرا سپاہی تیزی سے لاش کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اور جو کچھ بھی ملا اپنی جیبوں میں ٹھونستا چلا گیا۔ مرنے والے کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی چمک رہی تھی اس کے ساتھی نے کہا۔

”اوئے جلدی کر... اتنی دیر...؟ چاروں طرف نگرانی ہو رہی ہے!“

”انگوٹھی ہے سونے کی!“ سپاہی نے ساتھی کو بتایا۔

”اتار لے... اتار لے... جلدی کر۔“

”اترتی ہی نہیں ہے، پھنسی ہوئی ہے۔ انگلی کاٹ لوں..؟“

”نہیں نہیں۔ چھوڑ دے، دیر مت کر... انگوٹھی بڑے صاحب کے لیے چھوڑ دے... وہ ابھی گشت پر آنے والا ہے۔“

دونوں بندوقیں سنبھالے، گشت کے لیے آگے بڑھ گئے۔

(ہندی پنجابی ادب۔ مصنف۔ درشن متواء)

(انتخاب: محمد الیاس چوہان، کراچی)

## ”بھکارن“

”بچہ بھوکا ہے۔ کچھ دے دو سیٹھ۔“

گود میں بچہ اٹھائے ہوئے ایک نوجوان عورت ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگ رہی تھی۔

”اس کا باپ کون ہے... پال نہیں سکتے تو پیدا کیوں کرتے ہو؟“ سیٹھ جھنجلا کر بولا۔ عورت خاموش رہی۔

سیٹھ نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے تھے۔ لیکن تھی وہ بہت خوب صورت اور سڈول۔

سیٹھ کہنے لگا۔ ”میرے گودام میں کام کرے گی؟ کھانے کو بھی ملے گا اور پیسا بھی۔“

بھکارن سیٹھ کو دیکھتی رہی۔

سیٹھ نے کہا۔ ”بول! بہت سارے پیسے ملیں گے!“

”سیٹھ... تیرا نام کیا ہے؟“

”نام؟ میرے نام سے تجھے کیا غرض...؟“

”جب دوسرے بچے کے لیے بھیک مانگوں گی تو لوگ اس کے باپ کا نام پوچھیں گے؟“

(ہندی پنجابی ادب۔ مصنف شیام سندر اگروال)

(انتخاب: محمد الیاس چوہان، کراچی)

یہ اندازے اور احساسات کا کھیل تھا۔ دونوں جانب موٹیلز موجود تھے۔ وہ لاشعور میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ پر انحصار کر رہا تھا۔ وہ نہیں، یہ نہیں، یہ نہیں وہ......

☆☆☆

وہ تولیا لپیٹ کر باہر نکلا اور یکلخت تھم گیا۔ خالی بستر اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کی طرف پھر دروازے کو دیکھا اور بھاگا۔ وہ دروازے سے نکل کر دس دم دور ہی گیا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ وہ ننگے پیر، ننگے بدن، تولیا لپیٹ کر رات میں باہر نکل آیا ہے۔ چھ سالہ بچی کہاں بھاگ سکتی ہے۔ اسے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ وہ دروازے کی طرف پلٹا۔

☆☆☆

''واپس گھماؤ۔'' ریچر اچانک بولا۔

ایلس نے بریک لگانے اور یوٹرن لینے میں زیادہ لحاظ نہیں برتا تھا۔

ریچر دیکھ رہا تھا کہ کونسا موٹیل کتنا بڑا، کتنے منزلہ ہے...... پارکنگ میں کتنی اور کس قسم کی گاڑیاں ہیں۔ کس میں آنے جانے کے کتنے راستے ہیں۔ اس کے اشارے پر ایلس ایک موٹیل میں داخل ہوئی۔

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''سولہ کمرے اور چھ گاڑیاں ہیں۔ کم سے کم آٹھ گاڑیاں ہونی چاہئیں۔''

''کیوں؟''

''وہ کسی ایسی جگہ قیام نہیں کریں گے جو عملی طور پر خالی دکھائی دے اور گہری نظر رکھنے والے کو یاد رہ جائے۔''

ایلس واپس سڑک پر آ گئی۔

☆☆☆

وہ واپس کمرے کی طرف جاتے ہوئے معارک گیا۔ زمین پر معمولی سی نمی کے باعث اس کے قدموں کے نشان نظر آرہے تھے۔ تاہم وہاں کوئی ایسا نشان نہیں تھا جو کسی چھوٹے بچے کا ہو۔ وہ مسکرایا۔ اس کا مطلب وہ کمرے کے اندر ہی چھپی ہے۔ اس نے بقیہ راستہ طے کیا اور کمرے کے اندر آ کر دروازہ بند کر دیا۔ ''باہر آ جاؤ۔'' اس نے نرمی سے کہا۔ کوئی ردِعمل نہیں تھا۔ اس نے بستر کے نیچے دیکھا۔ کھڑکی اور الماری کو چیک کیا۔ باتھ روم میں وہ خود تھا۔ ''لڑکی ہے یا فتنہ؟'' وہ بڑبڑایا۔ پھر بستر کے نیچے دیکھا۔ دوبارہ باتھ روم میں گیا۔ اچانک اس نے ٹب کے سامنے سے پردے ہٹا دیے۔ ٹی شرٹ، شارٹس اور جوتوں میں وہ ٹب کے کونے میں دبکی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ منہ پر تھا۔ آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔

''میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے...... تمہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

☆☆☆

''ریورس میں پچھلے موٹیل پر روکو۔'' ریچر نے گویا سرگوشی کی۔ موٹیل پر نیون سائن نہیں تھا۔ دیوار پر نام پینٹ کیا گیا تھا۔ ریچر نے بغور اس کا حدود اربعہ، رنگ، گنجائش اور پارکنگ دیکھی۔ دائیں بائیں موجود موٹیلز کی شکل دیکھی۔ دونوں موٹیلز فاصلے پر تھے۔

''اندر جانا ہے؟'' ایلس نے سوال کیا۔

''بے شک۔'' جواب ملا۔

بیس میں سے دس کمرے ایک قطار میں تھے۔ دوسری قطار عقب میں تھی۔ یوشیپ پارکنگ میں بارہ گاڑیاں موجود تھیں۔ تین شیوی، تین ہنڈا، دو ٹویوٹا، دو بیوک، ایک پرانی ساب اور ایک آڈی۔ ریچر نیچے اتر گیا۔ آفس میں اندھیرا تھا اور کمرے بند تھے۔ ریچر نے دفتر کی گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ کے ہٹالی۔ کچھ دیر بعد روشنی ہوئی اور ایک آدمی باہر آیا۔ ریچر نے جیب پر ڈپٹی شیرف کے اسٹار کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آدمی اسے اندر لے گیا۔ ریچر نے ریک میں سیاحتی کتابچے دیکھے۔ جن میں اولڈ فورٹ اسٹاک ٹن نمایاں تھا۔ اس نے اشارے سے ایلس کو اندر آنے کے لیے کہا۔

''یہی ہے؟'' ایلس نے سوال کیا۔

ریچر نے سر کو آہستہ سے جنبش دی۔ ''یہی ہونا چاہیے۔''

ریچر نے آدمی کی طرف دیکھا۔ ''رجسٹر دکھاؤ۔''

وہ ہچکچایا۔ ریچر نے بلا تامل ایلس کی گن نکال لی۔

''وقت نہیں ہے۔ جلدی کرو۔'' اس نے جھک کر بڑا سا چرمی لیجر نکالا۔

''نام؟'' ایلس نے ریچر کو دیکھا۔

''گاڑیوں کے نام دیکھو۔''

گاڑیاں وہی تھیں، جو باہر کھڑی تھیں۔ آخر میں ایلس نے فورڈ کا نام لیا۔

''یہ فورڈ کراؤن وکٹوریا ہے۔''

''کیسے؟''

''میں جانتا ہوں۔''

''لیکن نمبر میچ نہیں کر رہے۔''

''فکر مت کرو، نمبر پلیٹس گاڑی میں ملیں گی۔ ایلس، اسٹیٹ پولیس کو کال کر کے قانونی کارروائی کے لیے تیار رہو۔''

''او کے۔'' ایلس نے جواب دیا۔

''فورڈ پارکنگ میں نہیں ہے؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' موٹیل والے نے جواب دیا۔

''تعاون کرو، ورنہ پھنس جاؤ گے...... فورڈ ہمارے پاس ہے۔ کئی افراد مارے جا چکے ہیں۔ فورڈ میں یہاں تین افراد آئے تھے۔ ایک عورت تھی۔ انہوں نے کتنے کمرے لیے تھے؟''

''دو کمرے...... پانچ اور آٹھ۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔''

''ہاں، ایسا سوچنا بھی مت۔ یہیں رکو۔'' ریچر باہر نکل گیا۔ وہ تیزی کے ساتھ مگر بے آواز حرکت کر رہا تھا، دیکھنے کے لیے بند دروازے تھے۔ کھڑکیاں عقب میں تھیں۔ پانچویں دروازے کے ہینڈل پر اس کا پیپر ''ڈونٹ ڈسٹرب'' کے ٹیگ پر پڑا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے خیال میں ایلی کو آفس سے دور رکھا گیا ہوگا۔ نمبر آٹھ پر اس نے کان دروازے کی باریک جھری سے لگا دیا۔ سناٹا...... وہ آگے بڑھا اور گھوم کر پیچھے چلا گیا۔ پیچھے کھڑکیاں تھیں اور سامنے کی طرف دس کمروں کی دوسری قطار۔ جن کے دروازے کھڑکیوں کے بالمقابل تھے۔

ریچر دس اور نو نمبر کمرے کے بعد آٹھویں کھڑکی کے نیچے بیٹھ گیا۔ احتیاط سے اس نے سر اٹھانا شروع کیا...... کمرا خالی تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے استعمال ہی نہیں کیا گیا ہو۔ ریچر وقت ضائع کیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ ساتویں کھڑکی، چھٹی...... پانچویں اس نے پھر محتاط انداز میں اندر جھانکا اور سیکنڈ کا کوارٹر حصہ استعمال کیا۔ قلیل مدت میں اس نے اپنا ٹارگٹ دیکھا جس نے کمر کے گرد تولیا لپیٹی ہوئی تھی اور ایک ہاتھ میں ایلی کی دونوں کلائیاں جکڑے اسے باتھ روم سے گھسیٹ کر باہر لا رہا تھا۔ ایلی بے سود مزاحمت کر رہی تھی۔ اسی وقفے میں ریچر نے کمرے کا جائزہ بھی لیا اور نو ملی میٹر کی وہ ہینڈ گن بھی دیکھی جو سائیڈ بورڈ پر رکھی تھی۔ سائلنسر فٹ تھا۔

ریچر پشت دیوار سے ٹکا کر کھڑکی کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے آس پاس نظر دوڑائی اور ایک پتھر حاصل کر لیا۔ وہ کھڑکی سے ذرا دور ہوا، منہ کھڑکی کی طرف کیا۔ پتھر کھڑکی کی طرف اچھالا، جو شیشہ توڑتا ہوا اندر جا کر گرا۔ سناٹے میں جیسے دھماکا ہوا۔ ذرا سا اٹھ کے ریچر نے جست لگائی۔ وہ پتھر کے پیچھے ہی کھڑکی سے اندر گیا تھا۔ پستہ قد کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ریچر کے ساتھ کھڑکی کے درمیان نازک فریم کے ٹکڑے بھی ٹوٹ کر اندر گئے۔ ریچر لوٹ لگا کر کھڑا ہوا۔ پستہ قد کے حرکت میں آنے سے قبل وہ اس کا حلقوم دبا کر اسے دیوار سے لگا چکا تھا۔ بایاں گھونسا پیٹ میں مارتے وقت ریچر نے اس کے حلق پر گرفت ڈھیلی کر دی۔ وہ آگے جھکا۔ ریچر نے دایاں گھٹنا بے رحمی سے اس کی ٹھوڑی کے نیچے مارا۔ پستہ قد کی پتلیاں گھوم کر اوپر چڑھ گئیں۔ وہ پٹ سے نیچے گرا۔ ریچر، ایلی کی طرف مڑا۔ ''تم ٹھیک ہو؟''

ایلی نے چند سیکنڈ سوچا پھر اثبات میں سر ہلایا۔ آنسو نہ کوئی چیخ پکار۔ ریچر نے مسکرا کر فون اٹھا کر زیرو ملایا۔ دفتر کے آدمی نے فون اٹھایا۔ ریچر نے اسے بتایا کہ وہ ایلس کو کمرا نمبر 5 میں بھیج دے۔

''یہ ایلس ہے۔'' ریچر نے ایلی کو بتایا۔ ''یہ تمہاری مام کی مدد کریں گی۔''

''مام کہاں ہیں؟''

''تم جلد ان سے ملوگی۔'' ایلس نے جواب دیا۔

ایلس نے زمین بوس شخص کو دیکھا۔ ''کیا یہ زندہ ہے؟''

''میرا خیال ہے۔'' ریچر نے کہا۔

''پولیس پہنچنے والی ہے اور اپنے باس کی نیند خراب کر دی ہے میں نے۔'' ایلس نے کہا۔ ''اس کا پہلا کام جج کے ساتھ چیمبر میٹنگ ہے۔ لیکن اسے بغیر کسی تاخیر کے ملزم کا اعترافی بیان درکار ہے۔'' ایلس نے نیم بے ہوش پستہ قد کی طرف اشارہ کیا۔

''تم اور ایلی منہ پھیر لو۔'' ریچر نے پستہ قد کا واحد لباس تولیا اس کی گردن میں لپیٹا اور گھسیٹ کر اسے باتھ روم میں لے گیا۔

بیس منٹ بعد وہ باہر آیا تو کمرے میں ایک سارجنٹ اور ایک ٹروپر کو کھڑے پایا۔ اس نے سر ہلا کر پستہ قد ڈرائیور کے کپڑے باتھ روم میں پھینکے۔ ''وہ بیان کے لیے تیار ہے، مکمل رضا کارانہ بیان، غیر مشروط...... اپنی مرضی سے۔''

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور باتھ روم میں گھس گئے۔

''مجھے جانا ہے۔'' ایلس نے کہا۔ ''رٹ تیار کرنی ہے۔ کارمن کی غیر قانونی حراست کے کاغذات تیار کرنے ہیں...... اور......''

''اور پھر سونا ہے۔'' ریچر مسکرایا۔ ''کراؤن لے جانا، میں یہیں ہوں۔''

جواباً ایلس نے تشکیلی نظروں سے اسے دیکھا اور باہر چلی گئی۔

☆☆☆

ریچر کمرا نمبر 8 میں ایلی کے ساتھ سو رہا تھا۔ ایلی فوراً ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔ دو گھنٹے بعد صبح کے آثار نمودار ہو گئے۔ ریچر کچی پکی نیند لے کر اٹھ گیا... بلکہ ایلی نے اسے اٹھایا، اسے بھوک لگ رہی تھی۔ ریچر نے فون پر دونوں کے لیے بھرپور ناشتا منگوایا۔ ناشتے میں ایلی کے لیے کولا اور آئسکریم بھی شامل تھی۔

بعدازاں وہ کرسیاں لے کر باہر بیٹھ گئے۔ چار گھنٹے بعد ریچر نے کراؤن کی جھلک دیکھی۔ گاڑی قریب ہوتے ہوتے موٹیل کی پارکنگ میں آ گئی۔ ریچر نے ایلی کو اشارہ کیا۔ اس نے بھی کارمن کو دیکھ لیا تھا۔ کارمن ابھی اتر ہی رہی تھی کہ ایلی بھاگتی ہوئی اس تک پہنچ گئی۔ کارمن جھکی اور ایلی اچھل کر اس کی بانہوں میں سما گئی۔ ایک ہی وقت میں آنسو، قہقہے اور قلقاریاں۔ ماں بیٹی خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں۔ ریچر مسکراتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا۔

''سب ٹھیک ہے؟'' اس نے ڈرائیونگ سائڈ پر آ کر سوال کیا۔

''پولیس کاغذی کارروائی کر رہی ہے۔ سب ٹھیک ہے۔''

''میرے بارے میں؟''

''ہاں، انہوں نے پوچھا تھا۔ میں نے اپنے اوپر لے لیا۔''

''کیوں؟''

وہ مسکرائی۔ ''کیونکہ میں وکیل ہوں۔ میری گاڑی وہاں پڑی ہے۔ میں نے سیلف ڈیفنس کی کہانی ڈال دی۔ ورنہ اس خون خرابے کے بعد اتنی آسانی سے تمہاری جان نہیں چھوٹنے والی تھی۔''

''یعنی ہم آزاد ہیں؟''

''بالخصوص کارمن۔'' ایلس نے کہا۔

ماں بیٹی کا ملن اور مسرت قابلِ دید تھی۔ ریچر ایک انجانی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

''کارمن کا کیا پروگرام ہے؟''

''وہ پیکو میں رہے گی۔ کسی ایسی جگہ، جہاں میں رہتا ہوں۔ وہ جاب کی بات کر رہی تھی۔ ہو سکتا ہے لاء اسکول میں چلی جائے۔''

ایلی کی زبان مستقل رواں تھی۔ کارمن فریش دکھائی دے رہی تھی۔ بدلے ہوئے حالات نے اس کے حسن کو نئی جلا بخشی تھی۔ ریچر گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ کارمن نے ایلی کو گود سے اتار دیا اور ریچر کے قریب آ گئی۔ خاموشی کے ساتھ شرم کا امتزاج تھا۔ چند سیکنڈ ایسے ہی گزرے...... پھر وہ مسکرا کر ریچر سے لپٹ گئی۔ اس کے منہ سے صرف ایک لفظ برآمد ہوا۔

''شکریہ۔''

ریچر نے بھی اسے سینے سے لگا لیا۔ ''سوری، میں نے کافی تاخیر کر دی تھی۔''

''میرے اشارے نے مدد کی تھی؟''

''اشارہ؟''

''میں نے جبری اعتراف میں اشارہ دیا تھا۔ میں نے گھبراہٹ کی اداکاری کرتے ہوئے اسٹریٹ اسٹرالر کا لفظ استعمال کیا تھا...... اسٹرالر، مطلب واکر۔ سب کچھ واکر کر رہا تھا۔''

''مجھے یاد ہے۔ لیکن میں اشارہ مس کر گیا۔ منزل پر پہنچنے کے لیے مجھے لمبا چکر کاٹنا پڑا۔''

کارمن مسکرا کر الگ ہو گئی اور ریچر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کراؤن کی طرف بڑھی جہاں ایلی اور ایلس گپ لگا رہے تھے۔

''لیکن مجھے جرم کا احساس ہو رہا ہے۔'' کارمن نے کہا۔ ''کئی افراد مارے گئے۔''

ریچر نے شانے اچکائے۔ ''یاد کرو کلے ایلی سن کے مدفن پر کیا لکھا ہے؟''

''تھینکس۔'' کارمن نے دوبارہ کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے، سینوریتا۔''

''سینورا۔'' وہ بولی۔ ''اور...... اور...... تم گریٹ ہو۔''

''انکل آپ جا رہے ہو؟'' ایلی نے معصومیت سے کہا۔

''گڑیا، مجھے جانا ہے۔''

''واپس آؤ گے؟''

''ہاں۔''

''اچھا پیار کرو۔''

ریچر جھکا۔ ''نہیں گود میں اٹھا کر۔'' ریچر نے مسکرا کر اسے گود میں اٹھا لیا اور پیار کر کے نیچے اتار دیا۔ پھر ایلس کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ ''چند سال بعد زرد صفحات میں تمہارا نام تلاش کروں گا۔''

سراغ رسی کرتے ہوئے بعض اوقات معمولی شہادتوں سے مجرم کی شناخت ہو جاتی ہے... مگر اس کے لیے سراغرساں کی باریک بین اور مشاہداتی نظر کا ہونا لازمی ہے... وہ ان دونوں خوبیوں سے مالا مال تھا...

اس مجرم کا قصہ جس نے نہایت چالاکی سے حکمت عملی کا مظاہرہ کیا تھا

# خام خیالی

جمال دستی

ہیلن نے اپنی رہائشی عمارت کی لابی میں داخل ہوتے ہی دربان مورٹی کو گڈ آفٹرنون کہا اور پانچویں منزل پر واقع اپنے اپارٹمنٹ میں جانے کے لیے لفٹ میں سوار ہوگئی۔

اس وقت سہ پہر کے تین بج کر پچپن منٹ ہو رہے تھے۔

ٹھیک چار بجے مورٹی کے فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلپ!'' ایک قلقلی کی سی مردانہ آواز میں کہا گیا۔ ''چاقو گھونپا گیا ہے۔ اپارٹمنٹ پانچ سو تین!''

پھر یہ نحیف سی آواز خاموش ہوگئی۔

اپارٹمنٹ پانچ سو تین میں لیتھونیا سے تعلق رکھنے والے تاجر زیوئیر کورالٹ کی رہائش تھی۔

دربان مورٹی نے 911 کا نمبر ڈائل کیا اور ریسیور رکھنے کے بعد انتظار کرنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اپارٹمنٹ 505 کا کرایہ دار عمارت میں داخل ہوا۔ اس نے دربان مورٹی کی کپکپاتی کیفیت دیکھی تو پوچھا۔ ''کیا بات ہے، مورٹی؟''

اس سے پیشتر کہ مورٹی کوئی جواب دیتا، سائرن کی چنگھاڑتی آواز اسکواڈ کار کی آمد کا پیغام دینے لگی جو بتدریج نزدیک آرہی تھی۔

پولیس جب اپارٹمنٹ 503 میں داخل ہوئی تو وہاں سفید قالین پر زیوئیر کورالٹ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں ایک چاقو دستے تک گڑا ہوا تھا۔

''موت کا سبب یہ چاقو کا زخم لگتا ہے۔'' سینئر پولیس افسر نے لاش کے گرد چکر کاٹتے ہوئے کہا۔ لاش کے پاس خون کی ایک معمولی سی مقدار دکھائی دے رہی تھی۔ یہ واحد دھبا تھا جو اس بے عیب صاف ستھرے قالین پر نظر آرہا تھا۔ ''یقیناً اس کی کوئی شریان کٹ گئی ہوگی اور میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا کچھ خون قاتل کے لباس پر بھی گیا ہوگا۔''

جونیئر پولیس افسر لاش کا قریب سے جائزہ لینے کے لیے آگے بڑھا تو اس کا پیر ٹیلی فون کے ایک لمبے تار میں الجھ گیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ ٹیلی فون کا ریسیور مردہ شخص کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور ٹیلی سیٹ صحیح سلامت پندرہ فٹ کے فاصلے پر موجود ایک چھوٹی سی میز پر رکھا ہوا تھا۔ ٹیلی فون کے اسپیڈ ڈائل کی فہرست میں سب سے پہلا نام بلڈنگ کے دربان مورٹی کا لکھا ہوا تھا۔

''حملہ آور کے جانے کے بعد مرتا ہوا شخص یقیناً لڑکھڑاتے قدموں سے فون کی طرف گیا ہوگا اور اس نے اسپیڈ ڈائل کا ایک نمبر دبا دیا ہوگا۔'' جونیئر پولیس افسر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''عمارت میں آگ لگنے کی صورت میں باہر نکلنے کا الگ راستہ بھی ہے۔'' دربان مورٹی نے رضاکارانہ طور پر بتایا۔ ''وہ قاتل اس راستے سے نکل گیا ہوگا...... میری نظروں میں آئے بغیر۔''

لیکن پولیس کو مشتبہ قاتل کی تلاش میں عمارت سے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔

ہیلن، زیوئیر کورالٹ کی پڑوسن اور گرل فرینڈ تھی۔

جب پولیس نے اس کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دی تو وہ اسی وقت شاور لے کر باہر نکلی تھی۔ ''میں چار بجنے میں چند منٹ پہلے گھر واپس لوٹی تھی۔'' اس نے حلفیہ بیان دیا۔ ''میں نے ذرا گپ شپ لگانے کے لیے زیوئیر کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا لیکن مجھے لگا جیسے وہ اندر اپارٹمنٹ میں موجود نہیں ہے۔''

ایلکس ٹورفل مقتول کا دوسرا پڑوسی اور بزنس پارٹنر تھا۔

پولیس جہاں تک سراغ لگا سکی، اس کے مطابق صرف یہ دونوں ہی اس غیر ملکی کے شناسا اور دوست تھے اور دونوں کے پاس ممکنہ جواز تھا۔

''اس کے باوجود کہ چاقو کے وار نے کسی شریان کو کاٹ دیا تھا قالین پر خون کا صرف ایک دھبا اور معمولی سی مقدار موجود ہے؟''

سینئر پولیس افسر نے کہا۔ ''تو پھر مقتول خون کی لکیر بنائے بغیر کس طرح پندرہ فٹ کے فاصلے پر موجود ٹیلی فون سیٹ تک پہنچا تھا؟''

جونیئر پولیس افسر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''وہ خود سے ٹیلی فون سیٹ تک نہیں گیا تھا۔'' سینئر پولیس افسر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کسی نے فون کا ریسیور مردہ شخص کے ہاتھ میں دبا دیا تھا۔ اس شخص نے جو جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی ثابت کرنا چاہتا تھا۔''

پولیس نے اپنی تمام تر توجہ اس فرد پر مرکوز کر دی جس کے پاس اپنی عدم موجودگی کا جواز تھا۔

جب پولیس نے ایلکس ٹورفل سے سختی سے بازپرس کی تو اس نے سب کچھ اگل دیا۔ اس نے زیوئیر کو قتل کرنے کا اعتراف کر لیا۔ اس نے بتایا کہ کاروبار کے معاملے میں اس کا زیوئیر سے جھگڑا ہو گیا تھا اور اشتعال میں آکر اس نے زیوئیر کو قتل کر دیا پھر اس نے فون کا ریسیور زیوئیر کے ہاتھ میں دبا دیا اور اپنے خون آلودہ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ پھر آگ سے بچاؤ کے ہنگامی راستے کے ذریعے عمارت سے باہر نکل گیا اور سڑک کنارے کے ایک فون بوتھ سے دربان مورٹی کو فون کیا جیسے کہ وہ زیوئیر ہے اور زخمی حالت میں ہے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز بنائی تھی تاکہ آواز پہچان میں نہ آسکے۔

پھر وہ چند سیکنڈ بعد ٹہلتا ہوا واپس عمارت میں آگیا وہ یہی سمجھا کہ اب اس کا جائے واردات سے عدم موجودگی کا ایک یقینی جواز بن گیا ہے لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔

اس اعترافِ جرم کے بعد پولیس نے اسے ہتھکڑی پہنا دی۔

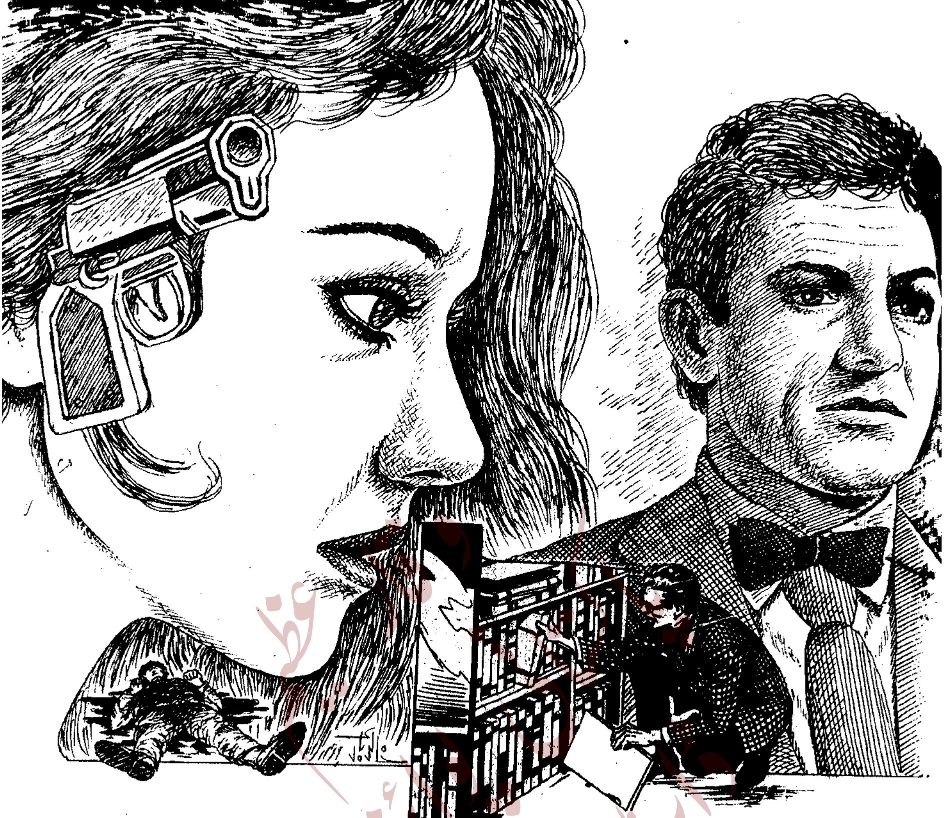

# دوسرا جرم

تنویر ریاض

مغربی ماحول میں ہر کام نہایت سلیقے اور اصولوں کے تحت انجام پذیر ہوتا ہے... کوئی بھی شخص کام کی انجام دہی میں رخنہ انداز نہیں کرتا... رائٹرز کے مسودے اور ان کے ناول کی اشاعت اور پبلشنگ کے معاملات دیکھنے والے ایجنٹ کی موت کا معما... پُرسکون اور پُرامن ماحول میں اس کا قتل دھماکا خیز تھا...

**پہلے جرم کے لبادے میں چھپے دوسرے جرم کی آمیزش کا احوال**

یہ پہلی بار ہوا تھا کہ جولیس نے اپنے معمول سے ہٹ کر کسی گاہک سے ملاقات کی ہو۔ وہ عموماً... صبح ساڑھے چھ بجے بیدار ہونے کے بعد اپنے ٹاؤن ہاؤس کی تیسری منزل پر واقع پرائیویٹ اسٹوڈیو میں مارشل آرٹس کی مشقیں کرتا پھر شیو، غسل اور لباس تبدیل کرنے کے بعد نیچے اترتا۔ دفتر آ کے وہ ہلکا ناشتا اور اخبار کا مطالعہ کرنے کے

ساڑھے دس بجے اپنا کام شروع کرتا لیکن اس روز معمول سے ہٹ کر وہ پونے دس بجے ہی ایک خاتون سے گفتگو کررہا تھا۔ اس کا نام سوسن وینس تھا۔ عمر انتالیس سال۔ دبلی پتلی، درمیانہ قد...... براؤن بال۔ میں نے اس کے ڈرائیونگ لائسنس پر جو تصویر دیکھی۔ اس میں وہ خاصی پرکشش لگ رہی تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور اس کی وجہ جاننا کچھ مشکل نہ تھا۔ تین ہفتے قبل اس کے شوہر فلپ وینس کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کردیا تھا۔ سونے پر سہاگا یہ کہ پولیس اس پر ہی شک کررہی تھی اور اس قتل کے الزام میں اس کی گرفتاری کا خطرہ بڑھتا جارہا تھا۔

فلپ وینس کا قتل ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ عام طور پر بوسٹن میں لوگوں کو اس طرح گلیوں میں گولی نہیں ماری جاتی اور وہ بھی ایسے بے ضرر لٹریری ایجنٹ کو۔ مقامی میڈیا میں یہ افواہ گشت کررہی تھی کہ وہ اپنی بیوی سے بے وفائی کا مرتکب ہورہا تھا اور یہ کہ انہوں نے حال ہی میں ایک بڑی بیمہ پالیسی خریدی تھی۔ پولیس ان دونوں نکات کی بنا پر اس کی بیوی کو مشتبہ سمجھ رہی تھی۔ چنانچہ اس وقت میری حیرت انتہا نہ رہی جب جولیس وقت سے پہلے گھر واپس آگیا۔ اس شب وہ ملی روسٹن کے ساتھ ڈنر کرنے گیا تھا۔ میری حیرت اس وقت مزید بڑھ گئی جب اس نے کہا کہ میں سوسن وینس کو فون کرکے اگلی صبح اس کے دفتر بلالوں۔

''کیا واقعی تم ایسا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں گزشتہ تین ہفتوں سے اس قتل کے بارے میں جستجو کررہا تھا۔ میں نے کیمبرج پولیس ڈپارٹمنٹ کے کمپیوٹر سسٹم کو ہیک کرکے یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ کیا معلوم کرسکے ہیں جس سے پتا چلا کہ میڈیا میں پھیلنے والی افواہیں سچی ہیں۔ فلپ وینس کم ازکم گزشتہ ایک سال سے اپنی بیوی سے بے وفائی کررہا تھا اور صرف دو ماہ پہلے پچاس لاکھ ڈالر کی بیمہ پالیسی بھی لی گئی تھی۔ البتہ اخبارات نے یہ نہیں بتایا کہ اس رات جب اس کے شوہر کو گولی ماری گئی تو وہ اس کا پیچھا کرتی ہوئی کیمبرج میں واقع دی بلیو پیرٹ تک گئی تھی۔'' ''مجھے غلط مت سمجھو جب تم کوئی نیا کیس لیتے ہو تو مجھے خوشی ہوتی ہے لیکن یہاں معاملہ مختلف ہے یہ قتل اسی نے کیا ہے اور وہ کسی بھی وقت گرفتار ہوسکتی ہے۔ کیا اب بھی تم یہ چاہو گے کہ میں اسے فون کرکے بلاؤں؟''

''ہاں، آرچی میں یہی چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے لیکن تمہیں اچانک اس کیس میں دلچسپی کیوں ہوگئی؟''

جولیس مسکراتے ہوئے بولا۔ ''وہ للی کی دوست ہے اور للی اس کے بارے میں بہت پریشان ہے۔ اسے یہ بھی یقین ہے کہ اس کی دوست بے گناہ ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ اس معاملے کو دیکھوں۔''

میں جانتا تھا کہ للی اس کے ساتھ کام کرتی ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ آپس میں دوست بھی ہیں۔ اس سے کم ازکم ...یہ ظاہر ہوگیا کہ جولیس اس قتل کی تحقیقات کیوں کرنا چاہ رہا تھا جبکہ اس کے بینک اکاؤنٹ میں کافی پیسے تھے۔

''اسے کیا وقت دوں؟ ساڑھے دس؟''

''بہتر ہے کہ جلدی بلالو۔ میرا مطلب ہے کہ ساڑھے نو تک۔ اس کے علاوہ ٹام ڈرکن اور سام ہینیز کو بھی فون کرکے معلوم کرو کہ کیا وہ دستیاب ہوسکتے ہیں؟''

میرے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی کا جدید ترین شاہکار ہوں اور ایک روبوٹ کے مانند کام کرتا ہوں جسے جولیس ایک ٹائی پن کی طرح لگا کر رکھتا ہے۔

تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد جولیس نے اچانک ہی موضوع بدل دیا اور وینس سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے شوہر کی موت پر خوش ہے۔ وہ سیدھی ہوکر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''بالکل نہیں۔ لیکن تم نے اس طرح کی بات کیوں پوچھی؟''

جولیس کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے شوہر کا قتل ہوگیا ہے۔ اگر اخبارات میں شائع ہونے والی خبریں درست ہیں کہ وہ تم سے بے وفائی کررہا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہو اس لیے یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ تمہیں اس کی موت سے خوشی ہوئی ہو۔''

''یہ صحیح ہے کہ وہ مجھ سے بے وفائی کررہا تھا۔'' اس نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم نے کیسے سمجھ لیا کہ وہ مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا؟''

جولیس نے چند سیکنڈ اسے دیکھا پھر سرد لہجے میں بولا۔ ''کیونکہ دو ماہ قبل پچاس لاکھ ڈالر کی بیمہ پالیسی لی گئی تھی گو کہ اس میں تم دونوں کو تحفظ حاصل تھا لیکن میرا خیال ہے کہ اس نے تمہارے علم میں لائے بغیر یہ پالیسی خریدی تھی۔ تمہیں اس کا پتا اس وقت چلا جب پولیس والوں نے تم سے اس بارے میں پوچھ گچھ کی۔''

''یہ سچ ہے لیکن تمہیں اس پالیسی کی مالیت کے بارے میں کیسے علم ہوا؟ میں نے تو تمہیں نہیں بتایا اور نہ ہی اخبارات میں اس کا ذکر آیا۔''

جولیس جانتا تھا کہ میں نے اپنی ہیکنگ کے دوران میں یہ بات معلوم کرلی تھی لیکن اس نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ اور صرف اتنا کہا کہ اس نے اپنے ذرائع سے یہ معلوم کیا ہے۔'' اس نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں مسز وینس کہوں یا تم نے دوبارہ اپنا پیدائشی نام اختیار کرلیا ہے؟''

''نہیں میں اب بھی وینس کا نام استعمال کررہی ہوں لیکن تم مجھے سوس کہہ سکتے ہو۔''

''نہیں، جب تک مجھے تمہاری بے گناہی کا یقین نہ ہو جائے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے شوہر کے قتل کی تحقیقات کروں اور پولیس کے سامنے تمہاری بے گناہی ثابت کرسکوں تو تمہیں میرے سوالوں کا ایمان داری سے جواب دینا ہوگا۔''

''میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہی اور نہ ہی میں نے گول مول جواب دینے کی کوشش کی۔ البتہ تمہاری زبان سے یہ سن کر صدمہ ہوا کہ کیا میں اپنے شوہر کی موت پر خوش ہوں۔ بے شک میں اس کی بے وفائی پر ناراض تھی اور جب کبھی اس کی بیمہ پالیسی کے بارے میں سوچتی تو خوف زدہ ہوجاتی۔ میں بے وقوف نہیں ہوں، اس کے معاشقوں اور میرے ساتھ ہونے والے سلوک کے بعد میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ اس نے مجھے بتائے بغیر بیمہ پالیسی کیوں خریدی اگر وہ مجھے قتل کرنے کی منصوبہ بندی نہیں کررہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے مرنے کے بعد بھی بہت خوف زدہ ہوں اور بتا نہیں سکتی کہ میں کیا محسوس کررہی ہوں لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میں نے فلپ کو قتل نہیں کیا۔''

''بہت خوب! اگر تمہیں بیمہ پالیسی کے بارے میں معلوم نہیں تھا تو اس پر تمہارے دستخط کہاں سے آگئے، کیا وہ جعلی ہیں؟''

''پولیس نے مجھے وہ دستخط دکھائے تھے اور وہ بالکل میرے ہی لگ رہے تھے۔ ممکن ہے کہ فلپ نے جعل سازی کی ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے دھوکے سے دستخط کروا لیے ہوں۔ یہ بتائے بغیر کہ میں کس کاغذ پر دستخط کررہی ہوں۔ وہ اکثر ایسا کرتا تھا۔''

جولیس نے اس کی بات پر یقین کرلیا۔ اس نے سوسن کو ایک کاغذ دے کر کہا کہ وہ اس پر اپنے دستخط کردے۔ سوسن نے اُلجھے ہوئے انداز میں اسے دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں اور دستخط کردیے۔ جیسے ہی جولیس نے وہ کاغذ پکڑا۔ میں نے اس کا موازنہ پولیس ریکارڈ میں موجود انشورنس فارم پر کیے ہوئے دستخطوں سے کیا۔

''فارم پر جعلی دستخط کیے گئے ہیں۔'' میں نے ائرپیس کے ذریعے کہا جو جولیس نے اپنے کان میں لگا رکھا تھا اس لیے سوسن ہماری گفتگو نہیں سن سکتی تھی۔

''تمہیں اپنے شوہر کے معاشقہ کا کس طرح پتا چلا؟'' جولیس نے پوچھا جبکہ وہ یہ بات پہلے سے جانتا تھا کیونکہ میں نے کیمبرج پولیس ڈپارٹمنٹ کے کمپیوٹر سسٹم کی ہیکنگ کر کے پوری تفصیل معلوم کرلی تھی لیکن وہ شاید دیکھنا چاہ رہا تھا کہ سوسن اس سوال کا کیا جواب دیتی ہے۔

وہ ایک پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔ ''اس عورت کے شوہر نے مجھے فون کیا تھا۔ یہ فلپ کے قتل سے تین دن پہلے کی بات ہے۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کیا مجھے فلپ اور اس کی بیوی کے معاشقہ کا علم ہے۔ مجھے اس کی بات سن کر بہت صدمہ ہوا۔ میں اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن جب میں نے اس پر غور کیا تو بہت سی باتیں واضح ہوگئیں۔ فلپ بہت ہی ہینڈسم تھا اور کوئی بھی عورت آسانی سے اس کے جال میں گرفتار ہوسکتی تھی۔''

''کیا چیلن نے تمہارے شوہر کو کوئی دھمکی دی تھی؟''

اسٹیوارٹ چیلن اس عورت کے شوہر کا نام تھا جس سے وینس کا معاشقہ چل رہا تھا۔ سوسن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ بہت غصے میں تھا اور میرا خیال ہے کہ مزید غصے میں آگیا جب میں نے کہا کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر فلپ دوبارہ اس کی بیوی سے ملا تو وہ اسے قتل کردے گا۔''

''کیا تم نے اس کی بات پر یقین کرلیا؟''

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں جانتی۔''

جولیس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور اپنی نظریں اس کے چہرے پر جمادیں لیکن سوسن پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بھی جواب میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ میں نے فلپ کو قتل نہیں کیا؟''

جولیس نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''مجھے اس رات کے بارے میں بتاؤ جب تمہارے شوہر کا قتل ہوا؟''

سوسن نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''جب میں نے اس بارے میں مزید سوچا تو محسوس ہوا کہ فلپ سے چھٹکارا حاصل کرنے میں ہی

بہتری ہے لیکن میں اپنی بزدلی کی وجہ سے اس کا براہِ راست سامنا نہیں کرسکتی تھی۔ جانتی تھی کہ اگر میں نے ایسی کوشش کی تو وہ مجھے جھٹلادے گا۔ اس کے بجائے میں چاہ رہی تھی کہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑ کر طلاق کا مطالبہ کر سکوں۔ اس رات میں نے اس کا پیچھا کیا اور ہارورڈ اسکوائر میں واقع ریسٹورنٹ 'دی بلیو پیپرٹ' تک پہنچ گئی۔ پولیس کو یہ بات معلوم ہے۔ میں بیس منٹ تک کار میں بیٹھی اپنی قوت مجتمع کرتی رہی تاکہ اندر جاکر اسے پکڑ سکوں لیکن مجھے ناکامی ہوئی اور بزدلوں کی طرح کار چلاتی ہوئی گھر واپس آگئی۔''

''کیا تم نے دیکھا کہ وہاں تمہارے شوہر سے ملنے کون آیا تھا؟''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھ رہی تھی کہ وہ اس عورت سے ملنے وہاں گیا ہے لیکن پولیس نے بتایا کہ وہ اپنی میز پر پینتالیس منٹ بیٹھا رہا لیکن وہ نہیں آئی۔''

جولیس کو یہ بات پہلے سے معلوم تھی کیونکہ وہاں پر موجود ویٹرس نے بھی پولیس کو یہی بتایا کہ جتنی دیر فلپ وہاں بیٹھا رہا، اس سے ملنے کوئی نہیں آیا۔

''کیا تم نے کسی کو ریسٹورنٹ کے باہر گھومتے ہوئے دیکھا؟'' جولیس نے پوچھا۔

''اس وقت میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ کسی اور جانب توجہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔''

جولیس آدھے گھنٹے تک اس سے مختلف سوالات کرتا رہا تاکہ وہ اپنی یادداشت پر زور دے کر بتاسکے کہ اس نے ریسٹورنٹ کے باہر کسی شخص یا کار کو تو نہیں دیکھا لیکن اس کی یادداشت کا خانہ خالی تھا۔ وہ نو بج کر بیس اور پچیس منٹ کے درمیان وہاں سے روانہ ہوئی جبکہ بیس منٹ قبل اس کا شوہر کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ریسٹورنٹ کے بل کی ادائیگی کر چکا تھا۔ جولیس کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہاں سے واپس آنے کے بعد وہ یہی سوچتی رہی کہ وہ گھر آنے پر اپنے شوہر کا سامنا کس طرح کر پائے گی۔ وہ نصف شب تک انہی خیالوں میں کھوئی رہی پھر پولیس نے اس کے دروازے پر آکر فلپ کے قتل کی اطلاع دی۔

اس کے بعد جولیس نے فرش پر رکھا ہوا ایک باکس اٹھایا جو وہ اپنے ساتھ لے کر آئی تھی اور اسے اپنی میز پر رکھ دیا۔ اس باکس میں اس کے شوہر کا لیپ ٹاپ اور تین مسودے تھے۔ جولیس نے وہ لیپ ٹاپ نکالا اور اسے اپنے وائرلیس نیٹ ورک سے منسلک کردیا تاکہ میری اس تک رسائی ہوسکے۔ اس نے سوسن سے پوچھا کہ کیا کسی وقت پولیس نے یہ لیپ ٹاپ اپنے قبضے میں لیا تھا۔

''ہاں، انہوں نے تقریباً اسے ڈھائی ہفتے اپنے پاس رکھا اور گزشتہ جمعے کو ہی واپس کیا ہے۔''

جولیس کو اسی بات کی توقع تھی۔ اس نے سوسن سے کہا کہ اس نے اس کا کافی وقت لے لیا اور اسے امید ہے کہ یہ مسئلہ جلد حل ہوجائے گا۔ عام طور پر وہ اپنے گاہکوں کو دفتر سے ہی رخصت کردیا کرتا تھا لیکن لِلی کی دوست ہونے کے ناتے اس نے سوسن سے یہ رعایت برتی کہ پہلے اس کے لیے ٹیکسی منگوائی اور پھر اسے خود چھوڑنے دروازے تک گیا۔

''میں نے فلپ وینس کی ای میل اور کمپیوٹر ریکارڈ چیک کرلیا ہے۔'' میں نے جولیس کو بتایا۔ ''تینتیس روز قبل اس نے پچاس لاکھ ڈالر کی بیمہ پالیسی خریدی اور کچھ مہنگی اشیا مثلاً کاریں، مکانات، فلوریڈا میں چھٹیاں گزارنے کے لیے گھر اور مہنگی فرانسیسی شرابیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی اور مشتبہ شخص نظر نہیں آیا۔''

''بہت خوب۔ اس وقت ہماری نظر میں کئی مشتبہ لوگ ہیں۔ اگر وہ بے گناہ ثابت ہوئے تو میں کسی اور جانب دیکھوں گا۔ یہ جان کر کہ وینس مہنگی اشیا کی قیمت لگا رہا تھا۔ میرے اس نظریے کو تقویت ملی ہے جس پر میں کام کررہا ہوں۔''

یہ بات تو سمجھ میں آرہی تھی کہ وینس کی نظریں پچاس لاکھ ڈالر کی بیمہ پالیسی پر تھیں جس سے اس خیال کو تقویت ملتی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی کررہا تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے وینس کے قاتل تک پہنچنے میں کیا مدد مل سکتی ہے۔ میں نے جولیس سے بھی یہ پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ اس کے ذہن میں کیا نظریہ ہے۔ ممکن ہے کہ ایسی کوئی بات نہ ہو اور وہ مجھے بے وقوف بنا رہا ہو اور اگر ہے تو وہ مجھے نہ بتانا چاہ رہا ہو۔ بہرحال مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ کیونکہ وہ اس کیس کو لینے کا فیصلہ کرچکا تھا اس لیے میں چھ مشتبہ افراد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں مصروف ہوگیا تاکہ جولیس کو نیچا دکھا سکوں۔

ان میں سے تین تو بالکل واضح تھے۔ سوسن، وینس کی محبوبہ امینڈا چیلن اور اس کا شوہر اسٹیوارٹ چیلن۔ دیگر تین شاید مشتبہ نہ ہوں۔ گزشتہ شب میں نے انہی کے سیل

فون ریکارڈ کو ہیک کر کے ان تمام فون کالز اور پیغامات کی تفصیل حاصل کر لی تھی جو وینس نے گزشتہ چھ ماہ میں کیے تھے۔ جولیس نے ان میں سے تین افراد کا انتخاب کیا جن سے وہ بات کرنا چاہ رہا تھا۔ کیا اسے یقین تھا کہ ان میں سے کوئی ایک ممکنہ قاتل ہوسکتا ہے۔ اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ تینوں وینس کے متوقع گاہک تھے اور فی الوقت میں انہیں مشتبہ سمجھ رہا تھا۔

جولیس نے اپنے لیے تازہ کافی بنائی اور واپس اپنی میز پر آکر اوپر کی دراز سے ایک اسکریو ڈرائیور نکالا اور اس کی مدد سے لیپ ٹاپ کا پچھلا حصہ کھولنے لگا اور اسے ایک چھوٹے سکے کے برابر ڈیوائس تلاش کرنے میں دیر نہیں لگی جو ایک انچ لمبے تار سے منسلک تھی۔ اس نے اسے اپنی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان پکڑتے ہوئے کہا۔ ''ضرور اسے پولیس نے اس میں چھپایا ہوگا۔''

پھر اس نے وہ مسودے نکال کر انہیں پڑھنا شروع کیا۔ اس دوران میں اپنے نظریے کو ثابت کرنے کی کوششوں میں لگا رہا۔ میں نے ابھی تک اس امکان کو مکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا تھا کہ سوسن نے ہی اپنے شوہر کو گولی ماری تھی لیکن وقتی طور پر اپنی توجہ دوسرے مشتبہ شخص اسٹیوارٹ چیلن پر مرکوز کردی۔ اور اس کی وجہ بالکل سیدھی تھی۔ یعنی یہ کہ کسی طرح اسے معلوم ہوگیا کہ اس کی بیوی وینس سے ملنے دی بلیو پیرٹ جارہی ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو وہاں جانے سے روکا اور خود ریسٹورنٹ کے باہر وینس کے نکلنے کا انتظار کرنے لگا تاکہ وہ اسے گولی کا نشانہ بنا سکے۔ اس کے لیے کسی فون کال، ٹیکسٹ میسج یا ای میل کا پتا لگانا ضروری تھا جس سے معلوم ہوسکتا کہ امینڈا اس رات اپنے محبوب سے ملنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے ان دونوں کے درمیان دیگر فون کالز اور ای میلز کا ریکارڈ بھی دیکھنا تھا۔ ابھی میں اسی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ گیارہ بج کر اڑتالیس منٹ پر ایک جانی پہچانی دستک کی آواز سنائی دی۔ میں نے ویب کام چیک کرنے سے پہلے ہی اندازہ لگا لیا کہ دروازے پر کون ہوسکتا ہے۔ میں نے جولیس سے کہا۔ ''کریمر تمہارا دروازہ توڑنے کی کوشش کررہا ہے۔ میں نے کبھی اسے اتنے غصے میں نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں دستک کا جواب دے دینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ اسے دل کا دورہ پڑ جائے۔''

یہ سن کر جولیس کا منہ بن گیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ کریمر اس کے پاس آنے والا ہے۔ اس نے پہلے تو وہ لیپ ٹاپ اور مسودے سیف میں بند کیے اور پھر بیزاری کے عالم میں دروازہ کھول دیا۔ اتنی دیر میں کریمر کا پارا چڑھ چکا تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ ''کیوں نا تمہیں پولیس کی تحقیقات میں مداخلت کرنے کے الزام میں جیل بھیج دیا جائے۔''

''یہ میں کیسے کرسکتا ہوں؟'' جولیس نے معصوم بنتے ہوئے کہا۔

''ہم نے وینس کے کمپیوٹر میں جو آلہ لگایا تھا۔ اس کی ٹرانسمیشن یہاں آنے کے بعد بند ہوگئی ہیں۔ اس طرح تم نے جان بوجھ کر اس جرم کی تحقیقات میں مداخلت کی ہے۔ اگر تم نے اس آلے کو نقصان پہنچایا تو ڈپارٹمنٹ اس کی قیمت وصول کرنے کے لیے تم پر دعویٰ کردے گا۔''

''بہت خوب۔'' جولیس نے کہا۔ ''کیا تمہارے پاس میرے دفتر کی تلاشی لینے کا عدالتی حکم موجود ہے؟''

کریمر نے کوئی جواب نہیں دیا تو جولیس بولا۔ ''تم یہیں ٹھہرو۔ میں تمہارا آلہ واپس کردیتا ہوں، میں نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔''

کریمر نے انتظار کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا کچن تک آگیا۔ جولیس نے ریفریجریٹر کے فریزر میں سے وہ آلہ نکال کر کریمر کے حوالے کردیا۔

''تم اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتے ہو۔'' کریمر نے کھردرے لہجے میں کہا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں بیمہ پالیسی کی مالیت کا کس طرح پتا چلا؟''

گویا کریمر نے جولیس اور سوسن کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ اس پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ جولیس اس کی توقع کررہا تھا۔ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''اس کے کئی طریقے ہیں۔ میں کسی بھی طرح معلوم کرسکتا ہوں۔''

''ہاں، میرا خیال ہے کہ کسی نے تمہیں بیمہ پالیسی کی نقل بھیجی ہوگی۔ اسی لیے تم نے سوسن سے ایک کاغذ پر اس کے دستخط لیے۔ تم موازنہ کرکے دیکھنا چاہتے تھے کہ پالیسی پر اسی کے دستخط ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کے شوہر نے ہی پالیسی لی ہو لیکن وہ اس بارے میں جانتی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ بند کیا اور جولیس کو بغور دیکھنے لگا پھر اس کی طرف سے جواب نہ ملنے پر بولا۔ ''جب مجھے معلوم ہوجائے گا کہ میرے یہاں سے کون تمہیں معلومات فراہم کررہا ہے تو میں

اس کے خلاف کارروائی کروں گا اور تمہیں بھی اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔''

''میرا خیال ہے کہ تم فلپ وینس کے قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کرو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔''

کریمر نے خاموش رہنے کی کوشش لیکن خود پر قابو نہ رکھ سکا اور بولا۔ ''ہم دونوں پہلے سے اُسے جانتے ہیں۔ تمہاری نئی موکلہ کے پاس قتل کا محرک اور موقع تھا۔ میرے پاس اسے گرفتار کرنے اور اثباتِ جرم کے لیے بہت کچھ ہے اور تمہاری کوئی بھی کوشش مجھے اس سے باز نہیں رکھ سکتی۔ میں نے اس کی جاسوسی اس لیے کی تاکہ اس کے تابوت میں مزید کچھ کیلیں ٹھونک سکوں۔ یہاں سے جانے کے بعد میں اس کے وارنٹ گرفتاری حاصل کروں گا اور تین بجے تک اسے گرفتار کرلوں گا۔''

''یہ بدقسمتی ہوگی اور تم محض اپنا اور سوسن کا وقت ضائع کرو گے۔ اگر تم صبر سے کام لو اور سات آٹھ گھنٹے انتظار کرلو تو میں فلپ وینس کے اصل قاتل کو تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔''

کریمر اسے محتاط طریقے سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔''

جولیس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں ایسا کرتا تو تمہیں پتا بھی نہ چلتا۔ میرا پوائنٹ یہ ہے کہ میں اس وقت تک قاتل کو مع ثبوت تمہارے حوالے کردوں تاکہ تم مطمئن ہو جاؤ اور اگر ایسا نہ کر سکا تو تم سوسن کو گرفتار کرلو۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس دوران میں وہ ملک سے فرار ہو جائے گی تو اس کی نگرانی پر کسی کو مامور کر سکتے ہو۔''

''میں تمہیں سات گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں لیکن تم محض مجھے بے وقوف بنا رہے ہو جیسا کہ میرا خیال ہے تو میں اس مہلت کے گزرنے کے بعد تمہاری موکلہ کو گھسیٹتا ہوا سیدھا جیل لے جاؤں گا۔''

اس کے جانے کے بعد جولیس دوبارہ دفتر میں آیا اور سیف سے مسودے نکال کر پڑھنے لگا۔ بارہ بج کر اٹھارہ منٹ پر مجھے ٹام ڈرکن نے فون کر کے بتایا کہ وہ پال ٹنکر کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ وہ وینس کے سابقہ گاہکوں میں سے تھا جن سے جولیس بات کرنا چاہ رہا تھا۔ گزشتہ شب میں نے اسی سلسلے میں چیلسن، اس کی بیوی امینڈا اور تین مصنفین کو فون کیا تھا۔ امینڈا اور دو مصنفین تو تعاون کرنے پر آمادہ تھے لیکن ٹنکر نے مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کیا جب میں نے جولیس کو اس بارے میں بتایا تو اس نے یہ ذمے داری ٹام ڈرکن کو سونپ دی اور سام سے کہا کہ وہ چیلسن کو قابو کرے۔

میں نے ٹام سے پوچھا کہ اس نے ٹنکر کو کس طرح تعاون پر آمادہ کیا تو وہ بولا کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا اور وہ اس کے بارے میں مجھے بعد میں بتائے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ ٹنکر کو ایک بجنے میں پندرہ منٹ پر جولیس کے دفتر لے کر آئے گا۔

پال ٹنکر بیالیس سالہ دبلا پتلا شخص تھا۔ وہ اپنے حلیے اور لباس سے ہی کالج کا پروفیسر لگتا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ ایک مقامی یونیورسٹی میں انگریزی کا ایسوسی ایٹ پروفیسر تھا۔ اس کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس ملاقات سے خوش نہیں ہے۔ اسے جولیس کے پاس پہنچانے کے بعد ٹام نے مجھے فون کر کے بتایا کہ اس نے کس طرح ٹنکر کو اس ملاقات پر آمادہ کیا۔ اگر وہ جولیس سے ملنے نہ آتا تو ٹام اس کے ڈپارٹمنٹ میں جا کر سب کو بتا دیتا کہ جولیس کو اس پروفیسر پر وینس کے قتل کا شبہ ہے۔

''مجھے اس بہتان تراشی پر تمہارے خلاف مقدمہ کر دینا چاہیے۔'' ٹنکر اپنی منحنی آواز میں بولا۔

''میں نے تم پر کیا بہتان لگایا ہے؟'' جولیس نے پوچھا۔

''تمہارے آدمی نے یہ افواہ پھیلانے کی دھمکی دی تھی کہ تم مجھ پر وینس کو قتل کرنے کا شبہ کر رہے ہو۔''

''میں نے تمہاری وہ ای میلو دیکھی ہیں جو تم نے وینس کو بھیجی تھیں۔ تم نے اسے تباہ کرنے کی دھمکی دی تھی اور اس کے چھ دن بعد وہ قتل کر دیا گیا اس لیے میری نظر میں تم بھی مشکوک ہو۔''

''یہ بکواس ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرا مطلب اسے پیشہ ورانہ طور پر تباہ کرنا تھا۔ جسمانی لحاظ سے نہیں۔''

''یہ وہ بات نہیں جو تم نے لکھی۔ ایک اور ای میل میں تم نے اسے دھمکی دی کہ اگر اگلی بار تمہارا اس سے سامنا ہوا تو تم اس کے منہ پر گھونسا مار دو گے۔''

ٹنکر نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر سے ہٹائیں اور بولا۔ ''اس نے میرے ساتھ جو سلوک کیا، اس کے بعد میرا ناراض ہونا فطری تھا لیکن میں ایسا شخص نہیں جو لوگوں سے جھگڑا کروں یا کسی کو گلی میں گولی مار دوں۔ میرے پاس اس سے نفرت کرنے کی معقول وجہ تھی۔''

''وہ کیا؟''

"میں نے پندرہ ماہ قبل اسے ایک ادبی ناول کی فروخت کے لیے کہا تھا جسے لکھنے میں گیارہ سال لگے۔ یہ میرا اب تک پہلا اور واحد ناول ہے۔ پانچ ہفتے قبل مجھے معلوم ہوا کہ اس پورے عرصے میں اس نے صرف ایک ایڈیٹر کو ہی یہ ناول بھیجا۔ سنا تم نے صرف ایک ایڈیٹر کو۔"

اس نے محسوس کیا کہ آواز کچھ اونچی ہوگئی ہے لہٰذا اس نے شعوری طور پر آہستہ بولنے کی کوشش کی اور کہا۔ "بالکل میں ناراض تھا لیکن جب وینس نے میری فون کال اور پیغامات کا جواب نہیں دیا تو میرا غصہ اور بڑھ گیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی کو وحشی پن میں سڑک پر گولی مار دوں۔"

میں نے جولیس سے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ اس کا وحشی پن منہ پر گھونسا مارنے تک محدود ہے، میں نے اس کے بارے میں ایک اور بات معلوم کی ہے جو شاید تمہارے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔ گو کہ یہ خود رجسٹرڈ گن اونر نہیں ہے لیکن گزشتہ برس اس کا ایک شاگرد غیر قانونی طور پر گن فروخت کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اس کا نام وٹز ہے۔"

جولیس نے اشارے سے بتایا کہ یہ واقعی دلچسپ بات ہے پھر اس نے ٹنکر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں نے تمہارے ناول کے کچھ حصے پڑھے ہیں۔ اس کے ساتھ بہتر سلوک ہونا چاہیے تھا۔"

"ایک منٹ... تم نے میرے ناول کی کاپی کیسے حاصل کی؟"

"اس کی ایک کاپی فلپ وینس کے پاس تھی جب میں نے تمہاری فون کالز اور ای میل کا ریکارڈ دیکھا تو سوچا کہ اس ناول پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ تم نے وینس کو قتل کیا ہو یا نہیں میں اس تحقیقات کے مکمل ہونے پر یہ مسودہ تمہیں واپس کردوں گا۔ ہمیں بات کو آسان بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تم دس مارچ کی شب نو بج کر پینتالیس منٹ اور گیارہ بجے کے درمیان کہاں تھے؟"

"یہ وہی رات ہے جب وینس کو گولی ماری گئی؟"

"ہاں۔"

"میں اپنے دفتر میں اکیلا بیٹھا پرچے چیک کر رہا تھا۔"

"کیا کوئی اس کی تصدیق کرسکتا ہے؟"

ٹنکر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں لیکن یہ خیال ہی بے ہودہ ہے کہ میں نے وینس کو قتل کیا۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور بولا۔ "گو کہ میں اس کی ناک پر گھونسا مارنا چاہ رہا تھا۔"

"کیا تم نے کبھی اعشاریہ اڑتیس کا پستول خریدا تھا؟"

ٹنکر کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جولیس اس سے یہ سوال پوچھے گا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "بالکل نہیں۔"

"مجھے وٹز کے بارے میں بتاؤ۔"

اس نے جولیس کو گمراہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔ جولیس نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا کہ مارکووٹز اس کا ایک شاگرد تھا۔

"اچھا۔ میرا خیال شاگردوں کی طرف نہیں گیا۔ مارکووٹز کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کیا تم نے اس سے کوئی گن خریدی تھی؟"

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "نہیں، بالکل نہیں۔ تم مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اس لیے کہ مارکووٹز گزشتہ برس غیر قانونی طور پر ایک گن فروخت کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔"

اس نے ایک بار پھر پلکیں جھپکائیں اور کہا۔ "میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہ یونیورسٹی کا اچھا طالب علم ہے۔"

"مسٹر ٹنکر اگر ضرورت پیش آئی تو میں ایک کُل وقتی معاون کو یہ معلوم کرنے کی ذمّے داری سونپ دوں گا کہ آیا کلاس روم سے باہر تمہارے مارکووٹز کے ساتھ کیا معاملات تھے اگر ایسی کوئی بات ہے تو تمہیں ابھی بتا دینا چاہیے۔"

"تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ صرف اپنا وقت اور پیسا ضائع کرو گے۔"

جولیس نے کافی کا کپ میز پر رکھا اور ٹنکر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا تم نے فلپ وینس کو قتل کیا ہے؟"

"اس سوال کا جواب دینا میری شان کے خلاف ہے۔"

میں نے جولیس سے کہا۔ "تم نے اسے بے چین کر دیا ہے۔ میں نہیں بتا سکتا کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ آیا یہ قاتل ہے یا بری طرح گھبرایا ہوا ہے البتہ ایک بات شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ مارکووٹز کی گرفتاری کے بارے میں جانتا تھا۔"

جولیس نے اشارے سے بتایا کہ وہ مجھ سے متفق ہے پھر وہ پینتالیس سیکنڈ اسے دیکھنے کے بعد بولا۔ "مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ لیا۔ اگر تم نے وینس کو قتل کیا ہے تو مجھے بتا دو ورنہ میں تو معلوم کر ہی لوں گا۔"

"یہ قطعی احمقانہ بات ہے۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بڑبڑایا اور باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے جولیس سے کہا۔ "اس کے مارکووٹز سے کسی قسم کے تعلقات تھے۔ ممکن ہے کہ وہ ہتھیاروں کے علاوہ بھی کچھ چیزیں فروخت کرتا ہو مثلاً منشیات وغیرہ لیکن جیسے ہی تم نے پروفیسر کے سامنے اس کا نام لیا تو وہ حواس باختہ ہو گیا۔"

"ہاں، یقیناً ایسا ہی ہوا۔" جولیس متفق ہوتے ہوئے بولا۔

"تم نے اچانک ہی بات ختم کر دی۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم اس سے مزید کچھ اگلواؤ گے۔"

جولیس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "یہ وقت ضائع کرنے والی بات تھی۔ اس سے مزید کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ تم سام سے میری بات کراؤ۔"

"مجھے کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔" سام نے رابطہ کرنے پر بتایا۔ "جس رئیل اسٹیٹ آفس میں چپلن کام کرتا ہے۔ اس کے اکاؤنٹ سے پچاس ہزار ڈالر غائب ہیں۔ یہ بات مجھے یوں معلوم ہوئی کیونکہ میں نے اپنے آپ کو آڈیٹر ظاہر کیا تھا ورنہ یہ معاملہ اگلے تین ماہ تک دبا رہتا، میں اس بارے میں چپلن سے بات کر کے اس کا ردِعمل معلوم کرنا چاہ رہا تھا لیکن آج وہ ابھی تک دفتر نہیں آیا اور گھر پر بھی نہیں ہے۔"

"بہت خوب سام۔ اب میں تمہیں ایک اور ذمے داری سونپ رہا ہوں۔ تمہیں ایڈ مارکوئز نامی ایک کالج کے طالب علم کی نگرانی کرنی ہے اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ پال ٹنکر نامی ایک شخص اس سے رابطے میں ہے۔ آرچی تمہیں ان کے پتے، تصویریں اور دوسری متعلقہ معلومات فراہم کر دے گا۔"

میں نے وہی کیا جو اس نے کہا تھا۔ اس کے بعد جولیس نے کہا کہ میں چپلن کے کریڈٹ کارڈ کے استعمال اور اس کی فون کالز کی نگرانی کروں جو کہ مجھے بہرحال کرنی ہی تھی کیونکہ چپلن دوبارہ میری فہرست میں سب سے اوپر آ گیا تھا گو کہ میں اب بھی ٹنکر کی نگرانی کر رہا تھا۔ میں نے جولیس کو یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ پچاس ہزار ڈالر کسی بھی قاتل کو خریدنے کے لیے کافی ہیں۔ اس کے بجائے میں نے یہ کہا کہ اس نے کبھی قتل کے بارے میں نہیں سوچا۔

"شاید تم کریمر کی دی گئی سات گھنٹے کی مہلت میں قاتل کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاؤ لیکن پہلے تم اسے بے وقوف بنا رہے تھے لیکن اب تم ایسی پوزیشن میں ہو کہ ٹنکر یا چپلن میں سے کسی ایک کے خلاف کافی ثبوت حاصل کر سکتے ہو۔"

جولیس مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ سچ نہیں ہے آرچی لیکن ہم دیکھیں گے۔"

گویا اب وہ مجھے بھی بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اس سے مزید بحث نہیں کی اور اس کے بجائے کوئی ایسا ثبوت تلاش کرتا رہا جس سے پتا چلتا کہ چپلن نے کسی قاتل کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اس دوران میں جولیس دوسرا مسودہ پڑھتا رہا۔

دروازے کی گھنٹی بجنے پر جولیس نے فوراً جواب دیا اور ایمنڈا چپلن کو اپنے دفتر لے آیا۔ ڈرائیونگ لائسنس کے مطابق وہ سوسن وینس سے عمر میں نو سال اور قد میں دو انچ چھوٹی تھی جبکہ اس کا وزن سوسن سے آٹھ پونڈ زیادہ تھا۔ بہرحال وہ سوسن سے زیادہ خوب صورت نہیں تھی۔

اگر جولیس اس کے دیر سے آنے پر ناراض تھا تب بھی اس نے اس کا اظہار نہیں کیا بلکہ ملاقات کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے ریفریشمنٹ پیش کیا۔ ایمنڈا نے کہا کہ وہ اس ملاقات کے لیے صرف اس وجہ سے تیار ہوئی تاکہ وہ عورت گرفتار ہو جائے۔"

"تمہاری مراد سوسن وینس سے ہے؟"

"ہاں بالکل۔" وہ ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ اب تک گرفتار کیوں نہیں ہوئی۔ یقیناً اس نے فلپ کا اس ریسٹورنٹ تک پیچھا کیا ہو گا۔"

"کیا تم وہاں فلپ سے ملنے والی تھیں؟"

"شکر ہے خدا کا کہ نہیں۔ اگر میں وہاں جاتی تو شاید وہ مجھے بھی گولی مار دیتی۔"

"کیا تم جانتی ہو کہ وہ وہاں کس سے ملنے گیا تھا؟"

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "شاید کسی گاہک سے۔"

"اس رات تمہارا شوہر کہاں تھا؟"

"میں نہیں جانتی۔ اس شام گھر پر اکیلی ہی تھی اور وہ رات ایک بجے کے بعد گھر آیا۔ شاید وہ اپنی کسی محبوبہ کے ساتھ ہو۔ اخبارات نے یہ نہیں لکھا کہ میرا شوہر کئی برسوں سے مجھ سے بے وفائی کر رہا ہے۔"

"گویا فلپ سے تمہارا معاشقہ ایک انتقام تھا؟"

"ہاں اس کی ابتدا اسی جذبے سے ہوئی۔ بعد میں ہم

سنجیدہ ہو گئے۔ فلپ اپنی بیوی اور میں اسٹیورٹ کو چھوڑنے پر تیار تھے۔ ہم ایک ساتھ زندگی گزارنا چاہ رہے تھے لیکن اس کی بیوی نے سب کچھ ختم کر دیا۔"

"وینس نے کب تم سے یہ کہنا شروع کیا کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ رہا ہے؟"

"شاید ڈھائی مہینے پہلے لیکن میں نہیں سمجھتی کہ تمہیں اس سے یہ ثابت کرنے میں کیا مدد ملے گی کہ اس عورت نے فلپ کو قتل کیا ہے۔"

"اس سے بہت مدد ملے گی۔ قاتل کو پکڑنے کے لیے یہ باتیں جاننا ضروری ہیں۔ تمہارے شوہر کو اس معاشقہ کا کیسے پتا چلا؟"

"میری بے پروائی سے۔ میں نے اپنا فون لاک نہیں کیا اور اس نے تمام پیغامات پڑھ لیے۔ مجھے یہ بات بہت دیر میں معلوم ہوئی لیکن اس نے مجھ سے جھگڑا کرنے کے بجائے فلپ کی بیوی کو فون کر کے بتا دیا۔"

"تم اور تمہارا شوہر اب تک کیوں ساتھ رہ رہے ہیں؟"

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہم نے علیحدگی کا فیصلہ نہیں کیا۔ ہم معاملات پر دوبارہ غور کر رہے ہیں۔"

"کیا تمہیں اپنے شوہر پر شک نہیں؟"

"بالکل بھی نہیں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "وہ فلپ کو گولی مارنے کے لیے ریسٹورنٹ کے باہر اس کا انتظار نہ کرتا۔ یہ اس کا انداز نہیں ہے۔ اگر اس نے اس جگہ تک فلپ کا پیچھا کیا ہوتا تو وہ ریسٹورنٹ کے اندر جا کر اس سے لڑنا شروع کر دیتا۔"

"اگر وینس اپنی بیوی کو چھوڑنے کا ارادہ کر رہا تھا تو اس نے دونوں کے نام پر پچاس لاکھ ڈالر کی بیمہ پالیسی کیوں لی؟"

"اس نے کوئی پالیسی نہیں لی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اب تک یہ رقم لے چکی ہوتی۔"

"کیا فلپ نے تمہیں کبھی نہیں بتایا کہ عنقریب اسے ایک بڑی رقم ملنے والی ہے؟"

"نہیں۔"

"میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تمہارے پاس وینس کو قتل کرنے کا کیا محرک ہو سکتا ہے؟"

"میں فلپ کو نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

جولیس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "بشرطیکہ اس نے کوئی دوسری لڑکی نہ تلاش کر لی ہو۔ شاید اس رات بھی وہ اسی سے ملنے گیا ہو اور تم اس کا پیچھا کرتے ہوئے ریسٹورنٹ تک پہنچ گئیں۔"

امینڈا اپنی جگہ سے اٹھی اور غصے سے بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ "میں ایک منٹ بھی یہ بے ہودہ الزام سننے کے لیے یہاں نہیں رک سکتی۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے جولیس سے کہا۔ "یہ دونوں مشتبہ افراد تمہارے الزام کو بے ہودہ سمجھتے ہیں حالانکہ میں بھی امینڈا سے متفق ہوں۔ مجھے وینس کی فون کالز اور ای میلو سے کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہوئی کہ اس نے کسی نئی لڑکی سے دوستی کر لی تھی۔"

"تم جین فراسٹ کو بھول رہے ہو۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جین فراسٹ اس کے گاہکوں میں سے تھی جس سے اس نے اس سہ پہر گفتگو کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ جولیس محض اس پر شبہ ظاہر کر رہا ہے لیکن گزشتہ چار ماہ اور اس روز بھی کئی بار ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کو دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ وہ اس کی نئی دوست ہو سکتی ہے۔ وہ بھی سوسن سے گیارہ برس چھوٹی تھی اور ویب سائٹ پر اپنی تصویر میں خاصی پُرکشش نظر آ رہی تھی۔

جولیس سے ملنے کے لیے آنے والا اگلا شخص ایک اور مصنف ڈگلس ٹولیور تھا۔ ڈرائیونگ لائسنس کے مطابق اس کی عمر اڑتیس برس، قد پانچ فٹ نو انچ اور وزن دو سو پونڈ تھا۔ اس نے جولیس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہارے آدمی کا پیغام سن کر حیرت ہوئی کہ تم مجھ سے فلپ وینس کے قتل کے سلسلے میں ملنا چاہتے ہو جبکہ وہ تو میرا ایجنٹ بھی نہیں تھا۔"

"ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن میری دلچسپی ان کئی فون کالز کی وجہ سے تھی جو اس نے مرنے سے پہلے تمہیں کیں۔ ان میں سے پہلی تین ماہ قبل اور آخری مرنے والے دن کی گئی۔"

ٹولیور نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے لیکن اس میں تمہارے لیے خوشی کا کوئی پہلو نہیں۔ میں نے نو ماہ قبل یہ سوچ کر اپنے ایک ناول کی کاپی بھیجی کہ شاید وہ میری نمائندگی کرنا چاہے۔ اس نے مجھے تین ماہ قبل جواب دیا۔ اس کے بعد ہماری ملاقات ہوئی۔ وہ اس میں کچھ تبدیلیاں چاہ رہا تھا۔ میں نے اس پر کام شروع کیا لیکن مطمئن نہیں ہوا۔ آخری بار جب وہ ملا تو میں نے اسے

بتلا دیا کہ میں کسی اور ایجنٹ کی تلاش میں ہوں۔ اس طرح یہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ گیا۔ مجھے اس کے مرنے کا سن کر افسوس ہوا۔"

"تم نے اس سے دی بلیو پیرٹ میں ملنے کا پروگرام نہیں بنایا تھا؟"

"نہیں، اس سے دوبارہ ملنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔"

"تم نے وینس کا انتخاب کیوں کیا تھا؟ وہ صرف ادبی ناولوں پر کام کرتا ہے جبکہ تمہارا ناول جاسوسی ہے۔"

ٹولیور اس سوال پر حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "تم نے میری کتاب پڑھی ہے؟"

"ہاں اس کا کچھ حصہ پڑھا ہے۔ کافی دلچسپ ہے لیکن تم میرے سوال کا جواب دو۔"

"میرا خیال تھا کہ کسی مقامی شخص سے کام لوں حالانکہ مجھے دیکھنا چاہیے تھا کہ وہ کس قسم کی کتابیں فروخت کرتا ہے لیکن تمہیں میری کتاب میں کیا چیز دلچسپ لگی؟"

"تم نے اس میں ڈکیتی کی تفصیلات بڑی خوبی سے بیان کی ہیں۔" جولیس نے کہا۔ "مجرموں نے جو منصوبہ بنایا، وہ بالکل حقیقی لگ رہا تھا۔ کیا تم نے فوکس ورتھ میں ہونے والی آرمرڈ کار ڈکیتی کو بنیاد بنا کر یہ ناول لکھا تھا؟"

"نہیں البتہ اس سے متاثر ضرور ہوا۔" ٹولیور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس ناول کو لکھنے سے پہلے میرے دماغ میں اس ڈکیتی کے بارے میں کئی سوالات سر اٹھاتے رہے لیکن پولیس نے کچھ نہیں بتایا گو کہ اس واقعے کو چار سال گزر چکے ہیں۔"

"کیا تم نے اپنے طور پر کوئی ریسرچ کی تھی یا تحقیقات کرنے والے سراغ رسانوں سے کچھ پوچھا؟"

"نہیں، یہ سب میرے دماغ کی اختراع ہے۔ خالص فکشن۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔"

میں نے مداخلت کرتے ہوئے جولیس کو بتایا کہ جین فراسٹ مقررہ وقت سے پینتالیس منٹ پہلے ہی اس کے دروازے پر پہنچ گئی ہے اگر وہ کہے تو میں اسے بعد میں آنے کے لیے کہہ دوں۔ اس نے مجھے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اس نے ٹولیور کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اسے دوسرے کسی مہمان سے ملنا ہے۔

جین فراسٹ اپنی تصویر سے کہیں زیادہ خوب صورت تھی۔ جولیس نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پوچھا کہ وینس سے اس کا کیا تعلق تھا۔

"وہ میرا ایجنٹ تھا لیکن یہ تعلق زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔"

"کیوں؟"

"وہ آخری دنوں میں مجھ سے الگ ہونے کی باتیں کرنے لگا اور میں بھی اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔" پھر وہ اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں یہ سوال کرنے کی زحمت سے بچانا چاہتی ہوں کہ کیا میں نے فلپ کو گولی ماری تھی تو میرا جواب نفی میں ہے اور نہ میں بھی ایسا چاہتی تھی۔ کوئی بھی مصنف اپنے ایجنٹ کو قتل کرنا نہیں چاہتا۔"

جولیس پر اس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے جین سے بھی یہی سوال کیا۔ "تم اسے کیوں قتل کرنا چاہتی تھیں؟"

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ "میں نے یہ نہیں کہا کہ ایسا چاہتی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان ایک معمولی مسئلہ تھا جو عام طور پر مصنفین اور ایجنٹوں کے درمیان ہو جاتا ہے۔ میں نے اب تک صرف دو ناول لکھے ہیں۔ جب وہ ان کی اشاعت کے لیے کسی کو تیار نہ کر سکا تو اس نے مجھ سے الگ ہونے کی بات کرنا شروع کر دی گو کہ اسے اس کا موقع نہ مل سکا اور وہ اس سے پہلے ہی مر گیا۔"

جولیس نے پوچھا۔ "تمہارے ناول کا عنوان "دی کوئنٹ گرل" تھا؟"

وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "ہاں مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"اس کی ایک کاپی وینس کے پاس تھی اور مجھے اس کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔" جولیس نے وضاحت کی۔ "فی الحال مجھے اس کی ورق گردانی کا موقع ہی ملا ہے لیکن جو صفحات غور سے پڑھے۔ وہ بڑی خوب صورتی سے تحریر کیے گئے ہیں۔ خاص طور پر اس کا کلائمیکس تو بہت ہی لاجواب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے ناول کو جلد ہی کوئی پبلشر مل جائے گا۔ تب میں اس کی ایک کاپی ضرور خریدوں گا۔ چاہے تم ہی وینس کی قاتل نکلو۔"

اس کی مسکراہٹ یکسر غائب ہو گئی اور وہ انتہائی سنجیدگی سے بولی۔ "شکریہ، کیا تم فلپ کے سبھی گاہکوں کو اتنی توجہ دے رہے ہو یا صرف میں ہی وہ خوش نصیب ہوں؟"

"واقعی تم ہی وہ خوش نصیب ہو۔ گزشتہ تین ماہ میں تم کتنی بار وینس سے ملیں؟"

"ذاتی طور پر ایک مرتبہ بھی نہیں۔"

"کیا تم ہی وہ کلائنٹ تھیں جس سے وہ قتل کی رات

ملنے والا تھا؟''

''اگر میں وہ کلائنٹ ہوتی تو یقیناً اس کا اعتراف نہ کرتی۔''

جولیس نے کہا۔ ''کیونکہ وہ جو کوئی بھی تھا۔ لگتا یہی ہے کہ اسی نے فلپ کو قتل کیا۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''کیا تمہارے اور فلپ کے درمیان کبھی رومانی تعلق رہا؟''

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''میں کبھی فلپ سے نہیں ملی۔ ایک دفعہ بھی نہیں۔ حالانکہ ہم بیس میل سے بھی کم فاصلے پر رہتے تھے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میری نظر میں اس کی کیا اہمیت تھی۔''

میں نے مداخلت کی اور جولیس کو بتایا کہ چیلن نے اپنا ایک کریڈٹ کارڈ استعمال کیا ہے۔

''اس نے سان انٹونیو کا یک طرفہ ہوائی ٹکٹ خریدا ہے اور یہ پرواز نواسی منٹ میں روانہ ہونے والی ہے۔ شاید وہ ملک سے باہر جانے کا پروگرام بنا رہا ہے۔''

جولیس نے بڑے بے ڈھنگے پن سے فراسٹ کو رخصت کیا اور اس کے جانے کے بعد مجھے کریمر سے فون ملانے کے لیے کہا جب وہ لائن پر آ گیا تو بولا...... ''یہ دیکھتے ہوئے کہ اس نے اپنے دفتر سے پچاس ہزار ڈالر چرائے اور وہ ملک سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ تمہارے پاس اس کی گرفتاری کا معقول جواز موجود ہے بلکہ اگر تم اس کے ساتھ دوسرے لوگوں کو ساڑھے چھ بجے تک میرے ٹاؤن ہاؤس پر لے آؤ تو میں سات گھنٹے کی مہلت ختم ہونے سے پہلے وینس کے قاتل کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔''

یہ کہہ کر جولیس نے مطلوبہ لوگوں کی فہرست کریمر کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد اس نے وہ کاغذ اٹھایا جس میں گزشتہ چھ ماہ کے دوران وینس کی فون کالز کی تفصیل تھی۔ لگتا تھا کہ وہ وینس اور فراسٹ کے درمیان ہونے والی کالز کی تفصیل تلاش کر رہا ہے لیکن جب اس نے مجھ سے ایک نمبر ڈائل کرنے کے لیے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کن خطوط پر کام کر رہا ہے۔

ساڑھے چھ بجے جولیس کا دفتر لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ گو کہ اسٹیوارٹ چیلن کو ہتھکڑی نہیں لگائی گئی لیکن وہ صوفے پر دو سادہ لباس والے پولیس آفیسرز کے درمیان سینڈوچ بنا بیٹھا تھا۔ سوسن وینس، جولیس کے سامنے جبکہ جین

## روٹی کا ٹکڑا

بچہ پٹ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر ندامت نہیں تھی۔ وہ ایسے کھڑا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ عورت اسے پیٹ رہی تھی۔ ''جا... جا کر جمعدار ہو جا... تو بھی بھنگی بن جا۔ تو نے ان کی روٹی کیوں کھائی...؟''

بچے نے معصومیت سے کہا۔ ''ماں! کیا ان کے گھر کا ایک ٹکڑا کھا کر میں بھنگی ہو گیا؟''

''اور نہیں تو کیا؟''

''اور جو کالو بھنگی ہمارے گھر میں پچھلے دس برسوں سے روٹی کھا رہا ہے۔ وہ پنڈت کیوں نہیں ہو گیا؟'' بچے نے پوچھا۔

ماں کا اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔ وہ کبھی اپنے بچے کو دیکھتی، کبھی اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا روٹی کا ٹکڑا دیکھتی۔

(ہندی پنجابی ادب... بھوپیندر سنگھ)

(انتخاب: محمد الیاس چوہان، کراچی)

## ''راتب''

سرکاری افسر کو تین چار ماتحتوں کے ساتھ اپنی دکان کی طرف آتا دیکھ کر دکاندار اپنی حالت ٹھیک کی اور جلدی سے گدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ جوڑ کر انہیں سلام کیا اور بٹھانے کے لیے اپنی دھوتی کے پلو سے کرسیاں صاف کرنے لگا۔

وہ لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے کھانے کے لیے خشک میوہ اور پینے کے لیے پھلوں کا رس آ گیا۔ افسر نے کھانے پینے کے بعد اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیریں اور دکاندار سے حساب کتاب کا رجسٹر لے کر جانچ پڑتال کرنے لگا۔ ایک صفحے پر اس کی نظر ٹھہر گئی۔ وہ حیران بھی ہوا اور مسکرایا بھی۔ اس نے وہ صفحہ اپنے ماتحتوں کو دکھایا۔ وہ بھی پڑھ کر مسکرانے لگے۔

''کیسے لوگ ہیں...؟ انکم ٹیکس بچانے کے لیے کتے کو ڈالی گئی، روٹی کے ٹکڑے کا خرچ بھی درج کر دیتے ہیں۔''

کھلے ہوئے صفحے پر لکھا تھا۔

''12-2-89... کتے کا کھانا، 50 روپے۔''

دکاندار بھی ہی ہی کرتا ہوا ان کے ساتھ ہنسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوگ چلے گئے۔

دکاندار نے رجسٹر دوبارہ کھولا... خشک میوے سے لے کر جوس تک سارا خرچ جوڑا اور رجسٹر میں ایک نئی سطر لکھی۔

''29-8-89... کتوں کا کھانا =/150 روپے۔''

(ہندی پنجابی ادب۔ درشن متواء)

(انتخاب: محمد الیاس چوہان، کراچی)

فراسٹ اور پال فنکر جولیس کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے تھے۔ دو کرسیوں پر ایمنڈا چیپلن اور ڈوگلس ٹولیور کو بٹھایا گیا تھا اور جولیس کے بالکل برابر میں کریمر بیٹھا ہوا تھا تاکہ وہ پورے کمرے کا جائزہ لے سکے۔ صوفے کے پیچھے دو پٹرول مین کھڑے ہوئے تھے۔ اسی طرح ٹام ڈرکن اور سام دروازے کے ساتھ کھڑے ہوئے محافظ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ سب سے آخر میں ایک دبلا پتلا شخص اندر داخل ہوا، اور خاموشی سے کمرے کے عقب میں بیٹھ گیا۔ کریمر نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا لیکن اس کی شناخت معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

جولیس نے گلا صاف کیا اور حاضرین سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”ماسوائے اس شخص کے جس نے فلپ وینس کو قتل کیا میں دوسرے لوگوں سے انٹرویو کے دوران میں خشک رویے پر معذرت خواہ ہوں گو کہ میں اس کی وجہ بتا سکتا ہوں لیکن صرف اتنا کہوں گا کہ میرا مقصد کسی کو دھمکانا نہیں بلکہ قاتل کو بے نقاب کرنا تھا۔“

کریمر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ تم نے پچاس ہزار ڈالر کی چوری کے علاوہ اس شخص کا تعاقب کس طرح کیا؟“

کریمر نے چیپلن کی طرف اشارہ کیا تو وہ فوراً بول پڑا۔ ”میں نے کوئی رقم نہیں چرائی اور نہ ہی کسی کو قتل کیا ہے۔“ پھر وہ جولیس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”جب میں نے رقم کی گمشدگی کے بارے میں سنا تو سمجھ گیا کہ تم اس سے کیا نتیجہ نکالو گے۔ گزشتہ شب تمہارے اسسٹنٹ نے جو دھمکیاں دیں، اس سے میں گھبرا گیا اور فرار کا منصوبہ بنایا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر ایسا نہ کیا تو تم مجھ پر قتل کا الزام عائد کر دو گے۔“

وہ سچ نہیں کہہ رہا تھا۔ جولیس کو معلوم تھا کہ چیپلن نے کمپنی سے پچاس ہزار ڈالر چرائے تھے۔ یہی بات اس نے مجھ سے کہی۔ ”میں اسے قاتل نہیں سمجھتا البتہ اس پر چوری کا الزام لگایا جا سکتا ہے لیکن اس نے یہ رقم کسی کرائے کے قاتل کو نہیں دی اور نہ ہی وہ وینس کی موت کا ذمے دار ہے۔ اس کا قاتل ہمارے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے پہلے سے ہی یقین تھا کہ اس قتل کا محرک بیمہ پالیسی ہے اور یہ بات سچ ثابت ہوئی۔“

کریمر کو اس کی خاموشی گراں گزری اور وہ غصے سے بولا۔ ”تم کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟“ کیا تمہیں کوئی دعوت نامہ دیا جائے؟“

”بالکل نہیں۔“ جولیس بولا۔ اب اس کی آنکھیں قاتل پر جمی ہوئی تھیں۔ ”کوئی تین ماہ قبل فلپ نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اسی لیے اس نے بیمہ پالیسی خریدی تاکہ اس کی موت کے بعد وہ ایک بڑی رقم کا وارث بن جائے۔ وہ اتنا سادہ لوح نہیں تھا اور جانتا تھا کہ اس کے معاشقے اور بیمہ پالیسی کی وجہ سے پولیس سب سے پہلے اسی پر بیوی کے قتل کا شبہ کرے گی چنانچہ ضروری تھا کہ اس کے پاس جائے وقوعہ سے غیر موجودگی کا ثبوت ہو۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کسی کرائے کے قاتل کو معاوضے کی ادائیگی ممکن نہیں کیونکہ ایسی کسی بھی رقم کی منتقلی فوراً نظروں میں آجاتی چنانچہ اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ کوئی معاوضہ دیے بغیر کسی عادی مجرم کو بیوی کے قتل پر مجبور کیا جائے۔“

کریمر اور سادہ لباس میں پولیس والے اس پر توجہ دیے بغیر نہ رہ سکے کہ جولیس اتنے غور سے کسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں پولیس والے جو چیپلن کے عقب میں کھڑے ہوئے تھے، وہ بھی قاتل کے قریب چلے گئے۔ کریمر نے جولیس سے پوچھا کہ وینس کا منصوبہ کیا تھا۔

اسے ایک ناول کا مسودہ موصول ہوا جسے پڑھ کر اسے محسوس ہوا کہ یہ چار سال قبل فوکس ورتھ میں ہونے والی آرمرڈ کار کی ڈکیتی پر مبنی ہے کتاب کا بیشتر حصہ غیر حقیقی انداز میں لکھا گیا تھا لیکن ڈکیتی اور دو مجرموں کے قتل سے متعلق مناظر اتنے حقیقی تھے کہ وینس کو اس بارے میں تجسس ہونے لگا اور اس نے وقوعہ کے مرکزی سراغ رساں سے رابطہ کر کے ناول میں دی گئی تفصیلات کے بارے میں تصدیق کی۔ کیونکہ یہ باتیں صرف واردات میں حصہ لینے والوں یا پولیس کو ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد اس نے کتاب کے مصنف ڈوگلس ٹولیور کو بلیک میل کرنا شروع کیا۔ وہ جان گیا تھا کہ ٹولیور کا بھی اس واردات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے اسے اپنی بیوی کو قتل کرنے پر مجبور کیا۔ مجھے پورا شک ہے کہ اس رات وینس نے ٹولیور سے ملنے کا پروگرام بنایا تھا تاکہ اپنی بیوی کو قتل کرنے کی تاریخ اور طریقہ طے کر سکے لیکن ٹولیور نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور بلیک میلر سے جان چھڑا لی۔“

”یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ کریمر نے کہا۔ ”اگر سراغ رساں نے ان میں سے ایک ڈاکو کو شناخت کر لیا تھا تو اس نے اسے گرفتار کیوں نہیں کیا؟“

سستے سوٹ میں ملبوس سخت چہرے والے شخص نے اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ ”اس سوال کا جواب میں دے

سکتا ہوں۔ میرا نام سراغ رساں ہیرالڈ رگسن ہے۔ جب فلپ وینس نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں اس سے ملنے گیا۔ اس نے مجھے ایک لفافہ دیا جو چارلس ٹاؤن سے پوسٹ کیا گیا تھا لیکن اس پر بھیجنے والے کا پتا نہیں تھا۔ البتہ چند صفحات میں اس ڈکیتی کی تفصیل درج تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک خط تھا جس میں بھیجنے والے نے لکھا تھا کہ وہ بعد میں اپنی کتاب کے بارے میں وینس سے رابطہ کرے گا۔ مجھے یہ سارا معاملہ گڑبڑ لگا لیکن میں اس مرحلے پر وینس کے گھر کی تلاشی کا وارنٹ نہیں لے سکتا تھا۔ چنانچہ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں وینس کا انتظار کروں جب تک کہ اسے بھیجنے والے کا نام معلوم نہ ہو جائے کیونکہ مسٹر جولیس نے مجھے اس نام نہاد کتاب کی مکمل نقل فراہم کر دی تھی اس لیے میں اخذ کردہ نتائج کی بنیاد پر ڈگلس ٹولیور کو ڈکیتی کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔ اگر تم اس پر قتل کا الزام عائد کرو گے تو ظاہر ہے کہ اسے برتری حاصل ہو گی۔ فی الحال پولیس اس جگہ کی کھدائی کر رہی ہے جہاں کتاب کے مطابق اس کے دوسرے ساتھیوں کی لاشیں دفن کی گئی ہیں۔''

جولیس نے اپنی آواز میں ہمدردی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''زیادہ اچھا ہوتا کہ تم ایک معصوم عورت کے بجائے کسی بدمعاش کو قتل کرتے لیکن تم نے وینس کا انتخاب کیا صرف اس لیے کہ وہ مستقبل میں تمہیں مزید لوگوں کو قتل کرنے کے لیے نہ کہے۔''

ٹولیور نے نفی میں سر ہلایا اور سوسن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ایک دن تمہارا تعاقب کیا تھا۔ تم مجھے ایک اچھی خاتون لگیں۔ تمہارا شوہر گھٹیا انسان تھا۔ میں نے وہی کیا جو ٹھیک تھا۔''

یہ اعتراف کریمر کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھا۔ ایک پولیس والا چپلن کو باہر لے گیا جبکہ کریمر، رگس اور باقی پولیس والوں نے ٹولیور کو ہتھکڑی لگائی وہ اسے دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔ سام اور ٹام نے باقی لوگوں کو بھی نکلنے میں مدد دی۔ اب وہاں جولیس کے پاس صرف سوسن رہ گئی تھی۔ کافی دیر تک وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی پھر جولیس نے اس سکوت کو توڑا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تمہارے لیے یہ سب برداشت کرنا بہت مشکل ہے لیکن یقیناً تمہیں قاتل کی گرفتاری سے کچھ سکون ملا ہوگا۔''

سوسن نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور سسکیاں لینے لگی۔

اس رات جولیس، للی کے ساتھ ڈنر پر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''سوسن خوش قسمت تھی کہ اس نے تمہاری خدمات حاصل کر لیں۔ میں گزشتہ ایک گھنٹے سے اس پورے معاملے کا تجزیہ کر رہا تھا اور مجھے اعتراف ہے کہ تمہارا نظریہ صحیح تھا۔ مجھے یہ بھی شبہ ہے کہ پولیس شاید ہی وینس اور ٹولیور کے درمیان کوئی تعلق معلوم کر سکتی۔ اگر تم بیچ میں نہ آتے تو وہ گرفتار ہو جاتی اور شاید اس پر جرم عائد ہو جاتا۔ اگر ٹولیور اپنے ساتھیوں کو قتل نہ کرتا اور اپنی کتاب میں تفصیل سے بیان نہ کرتا کہ اس نے ان کی لاشیں کہاں دفن کیں تو وہ بھی اس کا اعتراف نہ کرتا۔''

''اس کے اعتراف سے مدد ملی لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔'' جولیس نے کہا۔ ''میں صرف وینس کو بے نقاب کرنا چاہ رہا تھا کہ اس نے کس طرح ٹولیور کو اپنی بیوی کے قتل پر مجبور کیا۔ اس کی فون کالز، پالیسی خریدنے کا وقت اور ان تین مسودوں میں سے ایک کو پڑھنے کے بعد سب کچھ واضح ہو گیا۔''

''گویا تم نے کبھی نہیں سوچا کہ جین فراسٹ یا ایمنڈا چپلن اسے قتل کر سکتی ہیں؟''

جولیس کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمام امکانات پر غور کیا لیکن میری شروع سے ہی ٹولیور پر نظر تھی۔ وینس صرف ادبی ناولوں کی اشاعت میں دلچسپی لیتا تھا لیکن ٹولیور کا جاسوسی ناول اتنا برا لکھا گیا تھا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ وینس نے اسے اس بارے میں فون کیا ہوگا۔ اس کی وجہ کچھ اور تھی۔''

''ایک بات اور؟'' میں نے کہا۔ ''کیا وجہ تھی کہ تم نے اپنی صبح کی مصروفیات ترک کر کے بہت جلدی اس کیس پر کام شروع کر دیا؟''

''وہ بے چاری بہت پریشان تھی۔ اس سے پہلے کہ پولیس اسے گرفتار کرتی، اس کیس کو حل کرنا چاہ رہا تھا۔ جب للی نے مجھ سے اس معاملے کو دیکھنے کے لیے کہا تھا، وہ بھی سوسن کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔''

اوہ تو یہ بات تھی۔ وہ للی کو متاثر کرنے اور اس کے ساتھ ڈنر پر جانے سے پہلے اس کیس کو حل کرنا چاہتا تھا۔ اس سے میں نے یہ تاثر لیا کہ للی نے کتنی ذہانت سے جولیس کو استعمال کیا لیکن یہ بات میں نے اپنے تک ہی رکھی۔

طاہر جاوید مغل

اٹھائیسویں قسط

# انگارے

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

**سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...**

## گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جا رہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمین دار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک گھناؤنی درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤجی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھا۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ سجاول کے ساتھ میرا مقابلہ طے پا چکا تھا کہ میرا ذہن ماضی میں بھٹک گیا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوالیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کر لیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہوگیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، دھماکے گونج اٹھے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ناقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر بُرا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا

پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آگیا۔ سیف عرف سیفی کی شیخی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے۔ یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ریان فردوس کا بیٹا رائے زل مخالف پارٹی بن چکا تھا۔ امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ فردوس کی بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے مجھے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جارہی تھیں۔ مجھے شروع ہی سے آقا جان پر شک تھا۔ اور اس کی سرگرمیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا بُرا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ ہم زیرزمین مقید تھے۔ مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لانچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک باہر موجود تھی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تبارک زیرزمین بنکر سے باہر نکل گئے۔ مگر باہر سخت پہرا تھا...... تبارک پھسل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ بے تحاشا تشدد سہنے کے باوجود ہم قسطینا اور ابراہیم کا پتا نہیں بتاتے...... سیف کی حالت بری تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زہر دے کے اذیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اپنا حال بہت برا تھا۔ امریکی لونگ نے تشدد کی انتہا کردی تھی۔ برونائی کے حالات روز بروز بدتر ہو رہے تھے۔ میں رائے زل کی قید سے رہائی پاچکا تھا۔ عوام کا سمندر میرے لیے بے چین تھا۔ وہ مجھے اپنا سربراہ مان چکے تھے۔ ان کا ایک ہی تقاضا تھا کہ اب مار دو یا مر جاؤ۔ وہ آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ چکے تھے۔ ہمارا قافلے کا رخ اب ڈی پیلس کی جانب تھا۔ پال کی مدد سے پوری ٹیم اور عوام کا سمندر ڈی پیلس کی جانب گامزن تھا...... ہر طرف گولیاں...... شیلنگ اور دھواں دھار لڑائی تھی...... بالآخر پسپی ہوئی عوام نے اپنے جوش، جذبے اور جنون سے کام لے کر رائے زل کے ساتھیوں کا خاتمہ کردیا...... رائے زل اور آقا جان دردناک انجام سے دوچار ہوئے...... آزادی کا سورج بلند ہو رہا تھا...... عوام اور قسطینا میرے شکر گزار تھے۔ میں نے اپنی خراب ترین جسمانی حالت کے باوجود وہ بدلڑائی میں حصہ لیا تھا...... ہر شخص میرا احسان مند و ممنون تھا۔ ابراہیم کی حالت بے حد خراب تھی اسے اسپتال میں داخل کردیا گیا تھا...... اس کی صحت اور زندگی میرے لیے ازحد ضروری تھی۔ کیونکہ زینب کا چہرہ میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔

**اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے**

ایق نے میری وہیل چیئر دھکیل کر پورچ میں کھڑی ایک اسٹیشن وین تک پہنچائی۔ ہم اسٹیشن وین پر سوار ہوئے اور تیزی سے اسپتال کی طرف بڑھے۔ میری نگاہوں میں نوعمر ابراہیم کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ کتنی حلیمی اور بردباری تھی، کیسا اجالا تھا، وہ ہر طرح سے ایک نیک روح والا لڑکا تھا اور اب ہڈیوں کا ناقابلِ شناخت ڈھانچا بن کر بسترِ مرگ پر پڑا تھا، وہ موت کے بے رحم شکنجوں میں تھا۔

ایک بار پھر میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس مرتبہ پھر تاجور ہی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ کیا خبر سنانا چاہتی تھی۔ مجھ میں یہ خبر سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ میں نے کال ریجیکٹ کردی۔ دس پندرہ منٹ میں ہم اسپتال پہنچ گئے۔ ہم اس آئی سی یو تک پہنچے جہاں شیشے کی دیوار کے پار ابراہیم زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔ ابراہیم کے بیڈ کے گرد ''کرٹن'' کھڑا کردیا گیا تھا۔ آئی سی یو سے باہر کئی افراد جمع تھے۔ ان میں شاہی خاندان کے افراد بھی تھے جن میں قسطینا نمایاں نظر آتی تھی۔ اس کے علاوہ کمانڈر فارس جان، بن مشہد، زمان خاں جیسے اہم لوگ بھی دکھائی دے رہے تھے۔ سب کے چہرے دھواں دھواں تھے۔

میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ زینب جیسے ہوش و حواس کھو کر آئی سی یو کے دروازے میں داخل ہونے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ چلّا رہی تھی۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ مجھے ان کے پاس جانے دو۔ خدا کے لیے، مجھے ان کے پاس جانے دو۔''

اسپتال کا عملہ اسے روکنے کی کوشش کررہا تھا پھر ایک لمبا تڑنگا ملائیشین ڈاکٹر آیا اور اسے جھڑکیاں دینے لگا۔ وہ انگلش بول رہا تھا۔ ''کون ہے یہ؟ کیا کہہ رہی ہے؟''

عملے میں سے ایک شخص نے کہا۔ ''ان کی بیوی ہے۔''

لمبا تڑنگا ڈاکٹر زینب سے مخاطب ہو کر انگلش میں گرجا۔ ''یہ کیا کررہی ہو تم، ایسا کر کے کس کو فائدہ پہنچا رہی ہو۔ ہم کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔''

''پلیز ڈاکٹر...... پلیز۔'' زینب بلکی اور ڈاکٹر کی بغل میں سے نکل کر اندر جانا چاہا۔

ڈاکٹر نے اسے بازو سے تھام لیا۔ ''یہ کیا بے وقوفی ہے۔ یہ کیا طریقہ اختیار کررہی ہو تم؟'' پھر وہ عملے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اس طرح نہیں چلے گا، اس کو باہر نکالو۔''

یہی وقت تھا جب میں نے محترم حاذق ذکری کو دیکھا۔ وہ لمبے چغے میں تھے اور سفید براق ڈاڑھی سینے پر لہرا رہی تھی۔ وہ لمبے تڑنگے ڈاکٹر کے سامنے پہنچے اور زینب کا بازو اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔ ''ڈاکٹر! یہ کیا کر رہے ہو تم، کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟'' وہ رعب دار آواز میں بولے۔

ڈاکٹر نے حاذق ذکری کو دیکھا اور قدرے مرعوب ہوا۔ ذکری دوبارہ بولے۔ ''یہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ ابراہیم کی بیوی ہے اور ابراہیم ولی عہد ہے جاماجی کا۔''

''سوری جناب! لیکن ابراہیم صاحب کی حالت انتہائی نازک ہے، ان کے لیے...... آخری کوشش کی جا رہی ہے...... ان کے نزدیک کسی کی موجودگی ہرگز ٹھیک نہیں۔ آپ بس دعا کریں۔''

ذکری خاموش نگاہوں سے ڈاکٹر کی طرف اور دیگر عملے کی طرف دیکھتے رہے۔ ان کے اجلے چہرے سے جیسے روشنی سی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ ایسی روشنی جس میں ایک وجدانی آگاہی تھی۔ انہوں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''ڈاکٹر! مجھے ابراہیم کی حالت کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ تشویش ناک ہے۔ اگر خدانخواستہ...... وہ جا ہی رہا ہے تو پھر ہمیں اس کے لیے آخری حد تک جانا چاہیے۔''

''میں سمجھا نہیں جناب؟'' لمبے تڑنگے سینئر ڈاکٹر نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''تم زینب کو اس کے پاس جانے دو۔ اس کے پاس بیٹھنے دو۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا وہاں موجود ہونا اتنا ہی ضروری ہو جتنا تمہارا موجود ہونا ضروری ہے۔''

''لیکن جناب......'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگیا کیونکہ سامنے سے اس شعبے کا قابل ترین امریکی ڈاکٹر بوشر وائٹ آ رہا تھا۔ سفید لباس اور پُرکشش شخصیت کے ساتھ وہ سراپا مسیحا صفت دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے عقب میں ایک غیر ملکی اور دو تین مقامی ڈاکٹرز تھے۔ لمبے تڑنگے ملائیشین ڈاکٹر نے بوشر وائٹ کو ادب سے سلام کیا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' بوشر وائٹ نے روتی سسکتی زینب کو دیکھ کر کہا۔

ملائیشین ڈاکٹر دھیمے لہجے میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ دو چار فقرے محترم حاذق ذکری نے بھی بولے۔ میرا خیال تھا کہ ملائیشین ڈاکٹر کا موقف مانا جائے گا مگر یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ بوشر وائٹ نے محترم ذکری کی طرف دیکھ کر کچھ کہا، اثبات میں سر ہلایا اور زینب کو اپنے ساتھ لے کر آئی سی یو کے ایریا میں داخل ہوگیا۔ کچھ ہی دیر بعد زینب سبز رنگ کا ''تیمارداری ایپرن'' پہنے اس پردے کے پیچھے جا رہی تھی جہاں ابراہیم موجود تھا۔

محترم ذکری نے ایک مقامی نیورو فزیشن سے سوال جواب کیے، اس نے کہا۔ ''حضرت! صورتِ حال لحہ بہ لحہ خراب تر ہو رہی ہے۔ ہز ہائی نس ابراہیم کی مسلسل فاقہ کشی کی وجہ سے ان کی قوتِ مدافعت بالکل ختم ہو چکی ہے۔ نبضیں ڈوب گئی ہیں اور پورا جسمانی نظام جامد ہو چکا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ان کا ذہن بھی بس پندرہ بیس فیصد تک کام کر رہا ہے۔''

''تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے ڈاکٹر، کتنے فیصد امکان ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مؤدب انداز میں بولا۔ ''جناب! یہ جو ہمارا ذہن ہے اپنی طرز کا انوکھا گورکھ دھندا ہے۔ جدید میڈیکل کا یہی وہ شعبہ ہے جس پر ہماری گرفت کمزور تر ہے۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ طبی حوالے سے کس وقت کیا صورتِ حال پیش آجائے۔ میرے خیال میں جناب بوشر وائٹ نے ہز ہائی نس کی بیوی کو اگر اس کے قریب جانے کی اجازت دی ہے تو کچھ سوچ کر ہی دی ہے۔ بعض اوقات ایسے مریضوں کا برین کسی جذباتی وابستگی کے سبب بھی رسپانس کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن یہاں مسئلہ یہ ہے کہ......''

''ڈاکٹر پلیز۔'' ایک میل نرس کی آواز نے ڈاکٹر کو بات ادھوری چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اسے اندر بلایا جا رہا تھا۔

میں نے دیکھا اب محترم ذکری کوریڈور کے ایک گوشے میں مصلاً بچھائے بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ شاہی فیملی کے کئی افراد بے قراری سے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ قسطینا اپنی فوجی یونیفارم میں تھی اور اس کا چہرہ بالکل زرد نظر آ رہا تھا۔ میں جانتا تھا وہ ابراہیم سے بہت پیار کرتی ہے۔ وہ ایک ہی چار دیواری میں بہن بھائیوں کی طرح کھیل کر پروان چڑھے تھے۔ قسطینا کی آنکھوں میں بار بار نمی آتی تھی اور فارس جان اسے دلاسا دینے میں مصروف ہو جاتا تھا۔

میں نے انیق کو اشارہ کیا۔ وہ میری وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا انتظار گاہ کے وسیع لاؤنج میں لے گیا۔ یہاں درجنوں لوگ موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر ان میں سے اکثر احتراماً کھڑے ہوگئے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے ستائش، محبت اور ہمدردی کے تاثرات تھے...... اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں میں میری وہ دل فگار تصویر بھی نقش تھی جس نے ''وائرل'' ہو کر یہاں ایک انقلابی لہر پیدا کی تھی۔

لوگ میرے قریب آنا چاہتے تھے مگر مسلح محافظوں نے مجھے اور انیق کو حصار میں لے لیا۔ یہاں ایک دیوار پر ایل سی ای نصب تھی۔ ہز ہائی نس ابراہیم کی تشویش ناک حالت کی خبر چل رہی تھی۔

مسجدوں اور دیگر عبادت گاہوں میں لوگ ابراہیم کی صحت یابی کے لیے دعا گو تھے۔ منتیں مانی جارہی تھیں۔ خیرات تقسیم ہو رہی تھی۔ قسطینا کا ایک بیان ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”ڈی پیلس کا اصل قانونی وارث ابراہیم ہے۔ ہم سب کو اس کی زندگی کے لیے دعا کرنی چاہیے۔ خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو عزت مآب کے خانوادے کا آخری چراغ بھی گل ہو جائے گا۔ وہ ہمارے لیے عزت مآب اور بیگم نورل کی آخری نشانی ہے......“

”ڈاکٹر صاحب باہر آرہے ہیں۔“ انیق کی آواز نے مجھے چونکایا۔

میں نے مڑ کر دیکھا یہ وہی نیوروفزیشن تھا جو ہمیں تھوڑی دیر پہلے ابراہیم کی حالت کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ قریب آیا تو میں نے بے تابی سے پوچھا۔ ”کیا پوزیشن ہے ڈاکٹر؟“

”ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ محترم ڈاکٹر بوشر کی ہدایت کے مطابق وہ لڑکی...... میرا مطلب ہے ہز ہائی نس ابراہیم کی بیوی ان کے پاس موجود ہے۔ اس نے اپنا سر ہز ہائی نس کے کندھے پر رکھا ہوا ہے۔ مدھم آواز میں کچھ بولتی جارہی ہے۔ شاید پڑھتی بھی جارہی ہے۔“

”ابراہیم کے جسم میں کوئی حرکت؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ ڈاکٹر کا لہجہ سپاٹ تھا۔

☆☆☆

طوفان آتے ہیں اور آ کر گزر جاتے ہیں، ریت اور مٹی پر زندگی کے سارے بام و در پر ان کے نشان رہ جاتے ہیں۔ یہاں بھی ایک طوفان آکر گزر گیا تھا۔ یہ چار پانچ روز بعد کی بات ہے۔ میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ پاؤں اپنے سامنے ایک تپائی پر رکھے ہوئے تھے۔ پاؤں کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ میں نے دیوار گیر کھڑکی سے پار دیکھا۔ ایک روش کے کنارے گلاب کے زرد پھول کھلے ہوئے تھے، ان کے ساتھ ساتھ نرگس، نیلوفر اور صد برگ کے چھوٹے بڑے غنچے بھی تھے۔ زینب عجیب کھوئے کھوئے انداز میں ان پھولوں میں گھوم رہی تھی۔ وہ ایک گلدستہ تیار کر رہی تھی...... ہاں...... ایسا ہی ایک گلدستہ بھی ابراہیم بھی روزانہ تیار کرواتا تھا اور ایک خادمہ کے ہاتھ زینب کو بھجوایا کرتا تھا۔ یہ اس کی محبت کا ایک خاموش اور پاکیزہ اظہار ہوا کرتا تھا۔

گلدستہ تیار کر کے زینب کوریڈور میں آگئی۔ اوڑھنی اس کے سر پر تھی۔ قدم ہموار انداز میں اٹھ رہے تھے۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ ہم اسپتال کے اسپیشل روم میں داخل ہوئے۔ ابراہیم سفید بستر پر نیم دراز تھا۔ بے حد کمزور، ابھی تک نا قابل شناخت لیکن زندہ۔ زینب نے ذرا جھک کر گلدستہ اس کے سرہانے رکھ دیا اور ایک جانب خاموش کھڑی ہو گئی۔

ہاں...... طوفان آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں، کبھی کناروں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں اور کبھی کنارے اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ابراہیم بھی ایک جان لیوا اور نا قابل بیان کشمکش کے بعد زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ پچھلے کئی ہفتوں بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ابراہیم نے مجھے دیکھا اور پہچانا تھا۔ میں آہستگی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے استخوانی ہاتھوں کو حرکت دی اور میرا ہاتھ تھام کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سسکیاں لے رہا تھا۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”ابراہیم! اللہ نے تمہیں نئی زندگی دی ہے۔ اس کے لیے جتنا بھی شکر کیا جائے، کم ہے۔“

میرے ہاتھ پر اس کی گرفت مزید سخت ہو گئی۔ زینب کی طرح وہ بھی مجھ پر بے پناہ اعتماد کرتا تھا۔ ان دونوں کو اپنے قریب میری موجودگی بے حد اطمینان بخش محسوس ہوتی تھی۔ ابراہیم کی نگاہ میری کلائیوں کے مندمل ہو جانے والے زخموں پر پڑی۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں پوچھ رہا ہو۔ ”یہ آپ نے کیا حال بنا لیا ہے اپنا؟ کس کڑی مشکل سے گزرے ہیں آپ؟“

میں نے کہا۔ ”سب ٹھیک ہو چکا ابراہیم۔ برا وقت گزر گیا ہے۔ وہ سویرا طلوع ہو گیا ہے جس کا انتظار یہاں بے شمار لوگوں کو تھا جو تھوڑے بہت اندھیرے گوشے رہ گئے ہیں، وہ بھی بہت جلد روشن ہو جائیں گے۔ تمہارے والد، والدہ محترمہ اور تمہارے بھائی کی طرح ان بے شمار لوگوں کی قربانیاں ضائع نہیں گئیں جنہوں نے اس عظیم جدوجہد میں حصہ لیا ہے۔“

اس کی آنکھوں کے گوشوں سے تازہ آنسو بہہ نکلے۔

زینب نے ٹشو سے اس کے آنسو پونچھے، میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر پھر ڈاکٹر بوشر وائٹ کو دیکھ کر خاموش ہونا پڑا۔ وہ تین جونیئر ڈاکٹرز کے ساتھ ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس نے سب سے پہلے زینب کا سر تھپتھپایا اور ابراہیم سے مخاطب ہو کر انگلش میں بولا۔ ''کیسے ہو رائل بوائے؟''

ابراہیم نے سر کو اثبات میں حرکت دی۔

ڈاکٹر بوشر مسکرا کر بولا۔ ''کبھی کبھی جہاں میڈیکل ناکام ہو جاتی ہے، وہاں سے کوئی کرشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔ یہاں بھی ایک کرشمہ ہوا ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ کرشمہ اس بچی کے حوالے سے ہوا ہے۔'' اس نے ایک بار پھر زینب کا سر تھپتھپایا۔

وہ گھونگھٹ میں تھی اور اپنے آپ میں سمٹی جا رہی تھی۔

ڈاکٹر بوشر دوبارہ گویا ہوا۔ ''شاید آپ میں سے کچھ لوگ اسے میرا کارنامہ سمجھتے ہوں، مگر سچ یہی ہے کہ اس کیس میں میرا کردار بیس پچیس فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ اخباروں میں میری تصویریں چھپی ہیں اور ٹی وی پر میری تعریفیں ہو رہی ہیں لیکن میں اپنے طور پر کچھ شرمندگی محسوس کر رہا ہوں، میں نے اس میں بہت کم محنت کی ہے......''

میں نے کہا۔ ''یہ آپ کی کسرِ نفسی ہے ڈاکٹر! ہم سب جانتے ہیں 'نیورولوجی' میں آپ کا جو مقام ہے۔''

ڈاکٹر بوشر وائٹ نے جیسے پہلی بار دھیان سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا آپ کرشموں پر یقین نہیں رکھتے؟'' پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگا۔ ''آپ کا زندہ بچ جانا بھی تو ایک کرشمہ ہے۔ مجھے آپ کے سارے حالات معلوم ہوئے ہیں اور اس ٹمپریچر سیل کا بھی معلوم ہوا ہے جہاں آپ کو زندہ 'گرل' کرنے کی کوشش کی گئی۔ میں نے آپ کی وہ تصویر بھی دیکھی ہے جو یہاں چپے چپے پر نظر آتی ہے۔ آپ کی ثابت قدمی نے لوگوں میں ایک ایسا جذبہ پیدا کیا جس نے یہاں کی تاریخ بدل ڈالی۔''

''شکریہ، لیکن میرے خیالات بھی آپ سے ملتے جلتے ہیں ڈاکٹر! میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ اس ساری جدوجہد میں میرا کردار اتنا زیادہ نہیں جتنی تشہیر اس کو مل گئی ہے۔ یہاں کوئی بہادری نہیں دکھائی، کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا، میں نے بس اپنی ہمت کے مطابق برداشت کا مظاہرہ کیا اور اس برداشت کو صلہ ملا۔ لوگوں میں تحریک پیدا ہو گئی۔''

ڈاکٹر بوشر بولا۔ ''کہا جاتا ہے کہ تم ایک بڑے فائٹر ہو۔ ہم نے پہلی بار دیکھا کہ ایک فائٹر نے کوئی لڑائی لڑے بغیر جیتی ہے۔ اب آپ کے کیا ارادے ہیں؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''یہ واپس جانا چاہ رہے ہیں۔'' یہ آواز میرے امریکن دوست پال کی تھی جو ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہ مجھ سے اور ڈاکٹر بوشر وائٹ سے مصافحہ کر کے بولا۔ ''لیکن مجھے لگتا ہے ڈاکٹر کہ یہاں کے لوگ ان کو واپس نہیں جانے دیں گے۔''

''کیا مطلب؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔ ڈاکٹر کے معاون ابراہیم کی تازہ رپورٹس وغیرہ چیک کرنے میں مصروف تھے۔

پال نے امریکن انداز میں کندھے اچکائے اور بولا۔ ''ان لوگوں نے مسٹر شاہ زیب کو ایک ہیرو کی حیثیت دے دی ہے۔ یہ ان کو اپنے درمیان دیکھنا چاہتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان کو یہاں بڑے سے بڑا عہدہ مل سکتا ہے اور ایسا مرتبہ بھی مل سکتا ہے جو کبھی اکبر دی گریٹ کے ٹیچر کو ملا تھا، کیا نام تھا اس مغل بادشاہ کے ٹیچر کا...... بیرم خان۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر جزیرے کا نیا فرمانروا ابراہیم ہے تو پھر وہ نوعمر ہے۔ اسے کسی دبنگ استاد اور مشیر کی ضرورت ہے۔''

پال نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہر ہائی نس قسطینا کی حیثیت یہاں سپہ سالار کی ہوگی...... کمانڈر فارس جان قسطینا کا دستِ راست ہوگا۔''

ڈاکٹر بولا۔ ''میں نے سنا ہے کہ...... وہ ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں ان کی شادی بھی ہو جائے۔''

''یہ عین ممکن ہے ڈاکٹر۔''

میں یہ باتیں سن سن کر حیران ہو رہا تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے کہ امریکن جس خطے میں جاتے ہیں، وہاں کے حالات کو مقامی لوگوں سے بہتر جاننا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ نالج از پاور...... شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ اس پاور کا درست استعمال کرتے ہیں اور کچھ نہیں۔ ایجنسی کے لالچی امریکنوں نے اس پاور کو یہاں انتشار پھیلانے اور قبضہ جمانے کے لیے استعمال کیا اور انہی جیسے ایک امریکن پال کورنی نے ہمارے کندھے سے کندھا ملایا اور ایک دوسرے امریکی نے پال کی کال پر ابراہیم کی مسیحائی کی۔

زینب دوسرے کمرے میں جا چکی تھی۔ ڈاکٹر بوشر اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس لیے

نہایت انہماک سے ابراہیم کی تازہ رپورٹس دیکھیں اور اس کا معائنہ کیا۔ وہ مطمئن نظر آرہا تھا۔ میرے دو تین سوالوں کے جواب اس نے بڑی خندہ پیشانی سے دیے اور بتایا کہ ابراہیم کا جسم دیرینہ زہر خورانی کا عادی ہو چکا تھا لیکن اس نے اپنے جسم کو اس علت سے نکالنے کے لیے فاقہ کشی کی ایسی کڑی سزا دی ہے کہ اب حالات بہت بہتر ہیں اور اندر کی کیمسٹری میں نہایت مثبت تبدیلیاں آچکی ہیں۔

☆☆☆

خواجہ سرا خیام بھوں بھوں رو رہا تھا۔ اس کے فربہ جسم پر قیدیوں والا لباس تھا اور دونوں ہاتھ سامنے کی طرف ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے، ایک تنومند سپاہی نے ہتھکڑی کی زنجیر تھام رکھی تھی۔ خیام کو فوجی عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی تھی اور وہ رحم کی اپیل کے ساتھ میرے سامنے موجود تھا۔ خیام پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وہ شریف گھرانوں کی نوخیز اور خوش شکل لڑکیوں کو لالچ اور سخت دباؤ کے ذریعے ڈی پیلس تک پہنچاتا تھا۔ انہیں باقاعدہ ناچ گانے پر مجبور کرتا تھا اور پھر انہیں رائے زل کی ''خدمت'' میں پیش کیا جاتا تھا۔ ان میں سے کچھ کو رائے زل اپنے لیے پسند کرتا تھا اور باقی اس کے مصاحبوں کے حصے میں آتی تھیں۔

میرے سامنے روتے اور ہاتھ جوڑتے جوڑتے خیام مالش نے اچانک ایک حیران کن حرکت کی۔ وہ کسی چوپائے کی طرح اپنے گھٹنوں اور ہاتھوں پر ہو گیا۔ اس نے سر نیچے جھکایا اور میری ایک جوتی، جو پاس ہی پڑی تھی اپنے منہ میں دبالی۔ پتا چلا کہ مقامی رواج کے مطابق یہ عاجزی اور منت سماجت کی حد تصور کی جاتی ہے۔

میں نے کہا۔ ''خیام، اب تجھے پھانسی کا پھندا اپنے سامنے نظر آرہا ہے، ایسے وقت تو توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ مجھے سب یاد ہے...... تو نے زینب کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اس کے علاوہ بھی، پتا نہیں تو معصوم لڑکیوں کے ساتھ کیا کیا کرتا رہا ہے، کیا پتا ان میں سے دو چار تیرے ستم کی وجہ سے جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی ہوں؟''

میری جوتی منہ میں دبائے دبائے اس نے شدومد سے انکار میں سر ہلایا اور نا قابلِ شناخت آواز میں پتا نہیں کیا کہا کہنے لگا۔ وہ بنگالی لہجے کی اردو بولتا تھا، اب تو جوتی بھی اس کے منہ میں تھی، اس کا کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

میرے اشارے پر سپاہی نے جوتی اس کے منہ سے نکلی۔ اس نے اپنا سر فرش پر ٹیک دیا، میں نے کہا۔ ''تجھے یاد ہو گا تو میرے ٹمپریچر سیل میں آیا تھا اور میرے ساتھ بڑی ''محبت'' سے پیش آیا تھا......''

میرے طنز پر وہ تڑپ اٹھا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''اس وقت کو یاد کر کے ہام نے کئی بار اپنے شر پر (سر پر) اپنے ہاتھوں شے جوتا مارا ہے...... آپ بھی مارو۔ ہام کو ننگا (ننگا) کر کے مارو۔''

وہ کسی پالتو جانور کی طرح میرے سامنے کروٹ کے بل لیٹ گیا۔ وہ زندگی کے لیے تڑپ رہا تھا۔ کل سویرے اسے چند دوسرے مجرموں کے ساتھ ڈی پیلس کے سامنے پھانسی چڑھا دیا جانا تھا۔

ان سنگین لمحوں میں بھی میرے اندر ایک مسکراہٹ سی بکھر گئی۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب اس خبیث ہیجڑے نے ٹمپریچر سیل میں آ کر مجھے ٹارچر کیا تھا اور میں نے بے بس ہونے کے باوجود اسے جواب دیا تھا۔ اپنی دونوں بندھی ہوئی ٹانگیں میں نے اسے رسید کی تھیں اور لوٹ پوٹ کر دیا تھا۔ غالباً اس کے ایک دو مہرے بھی ہل گئے تھے وہ دردناک انداز میں چلاتا رہا تھا...... ہمار کی ہوڈی (ہڈی) توڑ ڈالی۔

میں دل ہی دل میں اس کی پھانسی کی سزا، قسطینا سے معاف کرانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ میری سفارش پر یہ سزا عمر قید میں تبدیل ہونے والی تھی۔ بہرحال میں اس سے کچھ اگلوانا بھی چاہتا تھا۔ میرے سب سوالوں کے جواب خیام نے اس طرح دیے تھے جیسے وہ کوئی روبوٹ ہو یا پھر ٹیپ ریکارڈر جو بٹن دبانے پر فرفر بولنا شروع کر دے۔ اس نے رائے زل اور اس کی ماں کی زندگی کے کئی خفیہ گوشوں سے نقاب اٹھایا۔ رائے زل کی خباثتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ اس کا جسم شروع سے ہی بہت موٹا اور بے ڈول تھا۔ وہ اپنی ہم نشیں عورتوں اور لڑکیوں کے سامنے تنہائی میں بھی بے لباس نہیں ہوتا تھا مگر پھر ایک دم اس کی ساری جھجک دور ہو گئی، بلکہ ایک طرح کی بے باکی و بے شرمی اس کے اندر آ گئی۔ اپنی نیوسٹی والی رہائش گاہ میں اس نے ایک بہت بڑا حمام تیار کروایا تھا۔ جس میں گرم پتھروں پر پانی ڈال کر بھاپ پیدا کی جاتی تھی اور اس بھاپ سے ''اسٹیم باتھ'' کا لطف اٹھایا جاتا تھا۔ اس لطف اندوزی کے دوران میں خوبرو لڑکیاں بھی اس کے ساتھ ہوتی تھیں اور وہ اپنے لیے لباس کا تکلف نہیں کرتا تھا۔ خیام نے رائے زل کی بداعمالیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ڈی پیلس میں بھی رائے زل، مرحوم ریان فردوس کے حمام کو ایسے ہی مشاغل

کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔ ایسے مشاغل کے دوران میں کئی بار ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ کسی لڑکی کی طرف راغب ہوتا تھا اور دوسری لڑکیوں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اس کو اپنی قربت کا ''اعزاز بخشتا'' تھا۔ بقول خیام ایک دن رائے زل نے ڈاکٹر ماریہ کو بھی دوسری لڑکیوں کے سامنے اسی قسم کی ''صورتِ حال'' سے دوچار کیا تھا۔

اس جنس زدہ شخص کے واقعات بہت طویل تھے۔ خیام اپنی جان بچانے کے لیے ہر بات کھول کھول کر بیان کررہا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ایک موقع پر رائے زل نے اپنی ماں کے کہنے پر اپنے نہایت بے ڈول جسم کو اسمارٹ بنانے کے لیے ورزشیں شروع کی تھیں مگر اس کی خوش خوراکی اور شراب نوشی نے اس کی کوئی پیش نہ چلنے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے خود کو بالکل ہی مادر پدر آزاد چھوڑ دیا اور پھیلتا چلا گیا۔

میرے تصور میں وہ مناظر آگئے، جب میری چلائی ہوئی گولی نے رائے زل کی عین شہ رگ کو نشانہ بنایا تھا پھر اس کا تڑپتا پھڑکتا چربیلا جسم، جسے سجاول کی کٹار نے ایک ہی وار میں سر سے محروم کردیا تھا...... اور اس کا بہی خواہ آقا جان...... جسے بندریا لوسی نے ہیلی کاپٹر سے کھینچ کر پختہ چھت پر پٹخا تھا اور دانتوں سے نوچ ڈالا تھا۔ وہ سارے تہلکہ خیز مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔

مجھے لگا کہ اگر خیام میرے سامنے کچھ دیر مزید ایسے ہی روتا بلکتا رہا تو اسے دل کا دورہ پڑ جائے گا یا برین ہیمرج ہوجائے گا۔ میں نے اسے صاف تو نہیں بتایا کہ میں اس کی پھانسی کو عمر قید میں تبدیل کروانے کا ارادہ کرچکا ہوں، بہرحال اتنا کہا کہ میں اس بارے میں سوچتا ہوں، اس کے لیے اتنی تسلی بھی ''برین ہیمرج'' جیسی ہی تھی۔ وہ جیسے بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔ اس کے منہ سے رالیں بہہ رہی تھیں۔ میرے اشارے پر سپاہی اسے کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔

اسی دوران میں انیق ٹہلتا ہوا اندر آگیا۔ وہ حسبِ معمول اوٹ پٹانگ لباس میں تھا۔ قمیص سامنے سے پینٹ کے اندر اور پیچھے سے باہر تھی۔ میں پوچھتا تو وہ یقیناً وہی گھسا پٹا جواب دیتا کہ قمیص سامنے سے اور پینٹ پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے۔''

میں اس وقت انیکسی کے ہی ایک کمرے میں موجود تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کہاں سے تشریف لارہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''کچھ ضروری شاپنگ کرنے گیا تھا۔ پاکستان جانے سے پہلے جزیرے کی کچھ سوغاتیں تو ہمارے پاس ہونی چاہئیں۔''

''خیر اتنی جلدی بھی ہم نہیں جارہے۔ ابھی آٹھ دس روز تو لگ ہی جائیں گے۔''

''یہ آپ اتنے ڈھیلے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ کہیں یہ تو نہیں سوچ رہے کہ کوئی اور پھڈا شروع ہوجائے اور ہم دوبارہ یہاں پھنس جائیں...... باجی تاجور سمیت۔'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

میں نے گھور کر دیکھا تو وہ جلدی سے دوسری جانب دیکھنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں دیر کررہا ہوں تو اس کا ایک معقول جواز ہے۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''سجاول، کہاں ہے؟''

وہ چمک کر بولا۔ ''امریش پوری کو اب بھول جائیں جی، وہ گوڈے گوڈے بلکہ گردن گردن عشق میں دھنس گیا ہے، اس وقت بھی خورسنہ کے گھر میں ہوگا اور اس کے بیٹے کے ساتھ آنکھ مچولیاں کھیل رہا ہوگا۔ ایک نمبر کا بہروپیا ہے۔ اتنی تیزی سے اس نے خود کو بدلا ہے کہ حیرانی ہوتی ہے یا پھر یوں کہا جائے کہ عورت چیز ہی ایسی ہے جو بندے کو بدل دیتی ہے، میرا تو کسی وقت جی چاہتا ہے کہ ایک نیکی کروں پوچھیں کون سی؟''

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔''

وہ بولا۔ ''سوچتا ہوں کہ اس نیک بی بی خورسنہ کو جاکر سب کچھ صاف صاف بتادوں، کہہ دوں کہ وہ جس کو ہیرو سمجھ بیٹھی ہے وہ پرلے درجے کا ولن ہے۔ باقاعدہ ایک سند یافتہ ڈکیت ہے۔ بے شمار گھر لوٹ چکا ہے، اَن گنت لوگوں کو اغوا کرچکا ہے، درجنوں سہاگ اجاڑ چکا ہے۔''

انیق کے لہجے میں سنجیدگی تھی، میں نے کہا۔ ''فضول باتیں نہ کرو، کہیں سچ مچ کچھ بک نہ دینا۔''

''آپ اسے بکنا کہتے ہیں۔ ایک نہایت خوب صورت اور خوش اخلاق خاتون کو سجاول امریش پوری جیسے خطرناک شخص سے بچانا عین نیکی ہے، کیا آپ مجھے اس نیکی سے روکنا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''نیکی حلال ہے لیکن خودکشی حرام ہے اور تمہارا یہ اقدام انشاءاللہ خودکشی کے برابر ہی ہوگا۔ سجاول نے، پہلے ہی خود پر پتا نہیں کیسے ضبط کررکھا ہے، وہ پاکستان روانہ ہونے سے پہلے ہی تمہیں مرحومین کی صف میں لاکھڑا کردے گا۔''

وہ منہ بنا کر بولا۔ ''آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن میری

اطلاعات یہ ہیں کہ امریش پوری، ہر طرح سے خورسنہ کے تیرِ نظر کا شکار ہے۔ وہ آج کل اس سے کہہ رہا ہے کہ وہ اس کے ساتھ پاکستان چلے لیکن وہ آمادہ نہیں ہے۔ وہ امریش پوری کو شاید پسند تو کرتی ہے لیکن اس کی طرح بے مقصد زندگی نہیں گزار رہی۔ وہ آزادی کی جدوجہد کرنے والی ایک سرگرم تنظیم کی رکن ہے اور یہاں اپنا کام جاری رکھنا چاہتی ہے۔''

''پھر کیا نتیجہ نکلے گا؟''

''امریش پوری اسے سبز باغ تو دکھا رہا ہے۔ اس کے بیٹے کو بھی اس نے ہاتھوں پر ڈالا ہوا ہے، دیکھیں کیا بنتا ہے۔''

''جو کچھ بھی ہے، تم اس کہانی میں کیدو بننے کی کوشش نہ کرو، کوئی انسان بھی سدا کے لیے برا نہیں ہوتا۔ کیا پتا کہ سجاول کل وہ نہ رہے جو آج ہے۔''

''یہ قیامت کی نشانیاں ہیں کہ آپ سجاول جیسے ڈاکو کو رانجھا کہہ رہے ہیں، ایسے موقع کے لیے اپنے حشمت پہلوان نے کیا خوب کہا ہوا ہے۔

رانجھے کے قول و فعل میں تھا تضاد بہت
حقیقت میں کیا اس نے ہیر کو برباد بہت
عمل کیا نہیں اور کرتا رہا گلاں ہی گلاں
دانے کے بغیر ڈالی کھیت میں کھاد بہت۔''

اسی دوران میں میرے پاؤں کی مرہم پٹی کرنے والے ڈاکٹر صاحب آگئے اور انیق کی چرب زبانی کو بریک لگ گئے۔

اسی شام کا واقعہ ہے۔ مجھے سجاول والے کمرے سے بلند آواز میں بولنے کی صدا آئی۔ یہ سجاول ہی تھا اور سہ پہر کے وقت انیکسی میں لوٹا تھا۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا اور مجھ سے اس کی ملاقات مختصر ہوئی تھی۔ اب پتا نہیں کہ وہ کس پر برس رہا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں پر مناسب انداز میں وزن ڈالا اور باہر نکل کر دیکھا۔ سجاول والے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک مقامی لڑکی ذرا گھبرائی ہوئی سی کمرے سے نکلی۔ وہ کسی طرف دیکھے بغیر سیدھی پورچ والے راستے کی طرف بڑھ گئی۔ جونہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئی، مجھے سجاول کے کمرے سے ایک زوردار کڑاکا سنائی دیا۔ یوں لگا جیسے لکڑی کی کسی شے کے پرخچے اُڑ گئے ہیں۔

میں تیزی سے آگے گیا اور سجاول کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ واش روم میں پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ شاید تین چار سیکنڈ پہلے تک وہ کمرے میں ہی تھا۔ یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ کمرے کے قالین پر ساگوان کی ایک چھوٹی میز کے ٹکڑے پڑے تھے۔ اس کے ساتھ ہی تاج محل کا ایک ماڈل بھی تھا۔ یہ خوب صورت ماڈل قدرے چھوٹے سائز کا تھا اور چاندی کا بنا ہوا تھا مگر میز کی طرح اس کی حالت بھی بری تھی۔ وہ ایک طرف سے پچک گیا تھا۔ جیسے اس پر کسی ہتھوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو مگر ہتھوڑا یہاں کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

میرے دل نے گواہی دی کہ سجاول نے اپنا طوفانی مُکّا استعمال کیا ہے، اور دونوں چیزوں کو چکنا چور کر دیا ہے۔ غالباً اس نے تاج محل کے ایک فٹ اونچے نقرئی ماڈل پر ضرب لگائی تھی اور ماڈل جس میز پر پڑا تھا، اس کا بھی بیڑا غرق ہو گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ خوب صورت ماڈل شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے خورسنہ کی طرف سے ہی سجاول کو بھیجا گیا ہے۔

اسی دوران میں سجاول بھی واش روم سے نکل آیا، اس کا سر اور کندھے وغیرہ پانی میں شرابور تھے۔ شاید اس نے اپنا طیش کم کرنے کے لیے خود کو شاور کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر اس کی کوشش کامیاب رہی تھی۔ وہ اب کافی حد تک نارمل دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا حیران ہوا۔ ''تم یہاں؟'' اس نے کہا۔

''تمہارے کمرے کا کھڑاک سنا تو آ گیا۔''

''کچھ نہیں یار! ایسے ہی ذرا ''پھرکی'' گھوم گئی تھی۔ یہ زنانیاں بھی بس وکھری ٹائپ کی مخلوق ہوتی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''وکھری ٹائپ کی نہ ہوتیں تو بابا آدم جنت سے کیوں نکلتے۔ لیکن یہ بات بھی ہے کہ اس دنیا میں زیادہ تر رنگ روغن اور رونق زنانیوں کی وجہ سے ہی ہے۔''

''چلو، دفع کرو اِس بات کو۔ مجھے بتاؤ ہماری واپسی کب ہو رہی ہے؟''

''بس چند دن اور۔ ہاناوانی کا دم خم تو نکل گیا ہے۔ اب وہ اپنے زخم چاٹ رہی ہے۔ لگتا یہی ہے کہ اب وہ کافی عرصے تک سر نہیں اٹھائے گی اور اگر اٹھائے گی تو قسطینا اور کمانڈر فارس جان مل کر اسے کچل دیں گے۔ قسطینا کی خواہش یہ ہے کہ ابراہیم ذرا مزید بہتر ہو جائے تو وہ اسے اپنے ہاتھوں سے عزت مآب کی گدی پر بٹھائے اور ہم بھی اس وقت موجود ہوں۔''

''یار! یہ ساری بے کار کی باتیں ہیں جو ہونے والا کام تھا وہ ہو چکا ہے، اب ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے......''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس تاج محل

کے ماڈل کو کس جرم میں سزا دی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ...... یہ تمہیں......خورسنہ نے تحفہ بھیجا ہوگا۔''

اس نے بوتل کھول لی تھی۔ وہسکی کا ایک طویل کڑوا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ''چھوڑو یار اس کی بات۔ وہ بچے والی ہے اور ایسی زنانیوں کے لیے اپنے بچے سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوتا۔ میں خواہ مخواہ اپنی مت مارنا نہیں چاہتا۔ پہلے ہی کوئی کم سیاپے نہیں ہیں۔''

کہنے کو تو وہ کہہ رہا تھا مگر اس کے لہجے کے اندر گہرائی میں کہیں کوئی کرب بھی چھپا ہوا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ پچھلے چوبیس گھنٹے میں سجاول اور خورسنہ کے درمیان کوئی ایسی بات ضرور ہوئی ہے جس کے سبب سجاول غم و غصے میں ہے۔

بڑی حیرت کی بات تھی۔ وہ اپنے کوٹلی والے ڈیرے پر اکثر کہا کرتا تھا، خوب صورت عورت، دل کو لگانے والی چیز نہیں، وہ بس استعمال کے لیے ہوتی ہے۔ ایک نہیں دوسری سہی، دوسری نہیں تیسری سہی۔ وہ تاجور کے حوالے سے مجھے بھی ایسے ہی مشورے سے نوازا کرتا تھا۔ تب اس کا خیال تھا کہ ڈیرے کے اندر تاجور میرے قبضے میں ہے، میں اس کے ساتھ عیش کروں اور پھر اسے اس کے منگیتر ساتے وغیرہ کے حوالے کردوں۔ آج وہی دبنگ سجاول اندر سے کچھ زخمی محسوس ہو رہا تھا بلکہ خاصا زخمی۔

وہ جھنجلایا ہوا تھا۔ میں نے اسے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی شراب کی بُو اب مجھے بری لگنے لگی تھی۔ میں نے اس سے سنبل کی خیر خیریت دریافت کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اگلے روز میں نے نہ صرف چہل قدمی کی بلکہ جسمانی توانائی بحال کرنے کے لیے ہلکی پھلکی ورزشیں بھی کیں۔ رات کا کھانا ہم سب نے اکٹھے کھایا۔ سجاول، سنبل، انیق، تاجور ہم سب موجود تھے۔ اگر کوئی نہیں تھا تو سیف عرف سیفی نہیں تھا۔ اس کی یاد نے ہم سب کو ملول کردیا۔ اس کی باتیں، اس کے دلنشیں قہقہے میرے کانوں میں گونجنے لگے......اور پھر اس کا آخری فقرہ ''استاد جی...... آپ مجھ سے......ناراض تو نہیں......''

کھانے کے بعد میں کافی دیر افسردہ رہا۔ انیق میرا مزاج شناس بن چکا تھا۔ میری افسردگی یا پریشانی دیکھ کر وہ میرے اردگرد ہی موجود رہتا تھا اور میرا دھیان بٹانے کی کوشش کرتا تھا۔

کہنے لگا۔ ''شاہی بھائی! اگر آپ کو آپ کی کوئی کھوئی ہوئی قیمتی چیز واپس مل جائے تو آپ کو کیسا لگے گا؟''

میں نے ذرا چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

وہ جھٹ بولا۔ ''زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں باجی تاجور کی بات نہیں کررہا ہوں۔ یہ ایک بے جان چیز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس کے گم ہونے کا دکھ رہا ہوگا۔''

''کچھ بکو بھی۔'' میں نے کہا۔

اس نے اپنی بند مٹھی میرے سامنے کی اور پھر کھول دی۔ میں واقعی ششدر رہ گیا۔ یہ چنے کی دال کے دانے جتنا وہی جدید اور نایاب اسپائی کیمرا تھا جو لڑائی کے وقت ڈی پیلس سے نکلتے ہوئے وہیں رہ گیا تھا۔ اس وقت یہ کیمرا ڈاکٹر ماریہ کی رہائش گاہ پر لگا ہوا تھا۔ وہاں میں نے اسے خود نہیں لگایا تھا بلکہ یہ قسطینا کے آفس سے کچھ دیگر سامان کے ساتھ ڈاکٹر ماریہ کے گھر پہنچا تھا۔ (کیمرا جس کمرے میں تھا، زینب بھی وہیں رہائش پذیر تھی) جب ہم گھمسان کی لڑائی میں ڈی پیلس سے نکل گئے تو کیمرا یہیں رہ گیا۔ رائے زل کی شکست کے بعد ڈی پیلس میں واپس آکر مجھے اس کیمرے کا خیال آیا تھا مگر اسے ڈھونڈنا بے کار تھا۔ مارٹر گولوں سے وہ سارا گھر ہی تباہ ہو چکا تھا جہاں کبھی ماریہ رہائش پذیر تھی۔ اب یہ کیمرا عقابی نگاہ رکھنے والے انیق کے ہاتھ میں نظر آرہا تھا۔

اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ ڈی پیلس سے نکلتے وقت اس نے یہ کیمرا ڈیکوریشن پیس سے علیحدہ کر کے محفوظ کرلیا تھا۔ ٹاپو کی زیرِزمین پناہ گاہ میں پہنچ کر وہ مجھے اس کیمرے کے حوالے سے سرپرائز دینا چاہتا تھا مگر پھر سب کچھ الٹ پلٹ ہوگیا۔ میں، کیپٹن تبارک اور سیف پناہ گاہ سے نکلنے کے بعد پکڑے گئے اور یہ کیمرے والی بات وہیں رہ گئی۔

انیق نے کہا۔ ''کبھی کبھی قسمت میرا بہت ساتھ دیتی ہے۔ وہاں ٹاپو والی پناہ گاہ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ مجھے وہاں ایک چھوٹے سے ڈکٹافون کی بیٹری مل گئی، اسی بیٹری میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے میں نے آپ کے اس جادوئی کیمرے کو چالو کرلیا۔ اب یہ پھر آپ کے لیے آئینہ جہاں نما کا کام دے سکتا ہے۔''

میں نے ننھے سے کیمرے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

''مجھے حیرت ہوگی اگر یہ اب بھی کام کرے گا۔''

''ہاتھ کنگن کو ''آرسی کولا'' کی بوتل کیا...... میں نے ثبوت کے لیے اس سے ایک چھوٹی سی وڈیو بھی بنالی ہے۔ دیکھ کر آپ کا دل خوش ہوجائے گا۔ آپ کے امریش پوری

کی ہے۔"

"تیرا بیڑا غرق۔ وہ سچ مچ تیری جان لے لے گا۔ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا۔"

"حرکت تو اب ہو چکی ہے جناب۔ لیکن وڈیو ہے کمال کی۔ سمجھیں شیر کی کچھار میں گھس کر اس کا کچا چٹھا کھولا ہے۔ کل شام جب امریش پوری، سنبل کو دیکھنے گیا تھا، میں نے اس کے کمرے میں گھس کر یہ کیمرا بریکٹ فین کے ساتھ چپکا دیا۔ اب دیکھیے اس کی کارکردگی۔"

اس نے پھرتی سے اپنے سیل فون کو وڈیو ریسیور کی ایپلی کیشن پر کیا اور کیمرے کو اس سے منسلک کر دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد واضح تصویر نمودار ہوئی، فریم میں سجاول نظر آیا جو کسی جنگلی بھینسے کی طرح پھیل کر بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ صندوق جیسا چوڑا چکلا سینہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ زیریں جسم پر صرف شلوار تھی۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکایا۔ "کون ہے؟" اس کی بھاری آواز سنائی دی۔

جواب میں جو کچھ کہا گیا، وہ ریکارڈ نہیں ہوا۔ سجاول نے جلدی سے لمبا کرتہ پہنا، وہسکی کی بوتل بیڈ کے نیچے گھسائی اور فریم سے نکل گیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر سجاول کے ساتھ ایک عورت فریم میں داخل ہوئی۔ وہ ڈی پیلس کی کوئی ملازمہ ہی لگتی تھی۔ مگر عام ملازماؤں کے برعکس اس نے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ جب اس نے چہرہ کھولا تو میں ششدر رہ گیا۔ وہ سرو قامت جاذب نظر خورسنہ تھی۔ اس نے چادر اپنے کندھوں پر ڈال لی اور شکایتی نظروں سے سجاول کو دیکھنے لگی۔ "کیا بات ہے تم مجھ سے ناراض ہو؟" اس نے پوچھا۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو، یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔"

"اور تم جو کر رہے ہو، وہ ٹھیک ہے؟ اگر میں تمہاری بات ماننے سے مجبور ہوں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہمارے درمیان دوستی اور محبت کا رشتہ بھی ختم ہو گیا، کیا ہمارا تعلق اتنا ہی کمزور ہے کہ ایک دوسرے کے پاس رہنے سے ہی برقرار رہ سکتا ہے۔"

"یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں خورسنہ! میں سیدھا سادہ بندہ ہوں یا تو تم میرے ساتھ ہو یا پھر نہیں ہو اور اگر نہیں ہو تو بھی کوئی بہت زیادہ ناراضی نہیں ہے، تھوڑی سی پریشانی ہے...... دس بیس دنوں میں وہ بھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

وہ ایک ادا سے اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اب وہ بالکل کیمرے کے سامنے تھی۔ اس کی صراحی دار گردن، ہنسلی کی ابھری ہوئی ہڈیاں، چمکیلے رخسار، ریشمی بال، وہ لڑکی نہیں تھی مگر ایک دلکش اور بھرپور خاتون کی ساری خوبیاں اس میں نظر آتی تھیں، سجاول نے کہا تھا، بس تھوڑی سی پریشانی ہے۔ خورسنہ نے ذرا شوخی سے اس کی بات دہرائی۔ "کیا واقعی تھوڑی سی پریشانی ہے؟"

"ہاں تھوڑی سی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم یہاں سے ناراض جاؤ گے اور میرے دل پر اور میرے بیٹے کے دل پر ایک بوجھ چھوڑ جاؤ گے۔ وہ تم سے بہت پیار کرنے لگا ہے۔ اس نے کوئی ایسی کہانی پڑھی ہوئی ہے جس میں ہندوستان سے ایک نڈر ہیرو آتا ہے اور یہاں ایک جزیرے پر پھنسے ہوئے لوگوں کو ایسے خونی مگرمچھوں سے نجات دلاتا ہے جو پانی میں تو تیرتے ہی ہیں لیکن زمین پر بھی گھوڑے کی طرح دوڑتے ہیں......" وہ ہنس دی۔

"خورسنہ! میں نے تمہیں اپنی ساری کہانی سنا دی ہے۔ میں کوئی ہیرو شیرو نہیں ہوں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ شاید تم نے میری بات نہ مان کر چنگا ہی کیا ہے۔ وہاں پاکستان جا کر تمہیں میرے بارے میں ایسی باتوں کا پتا چلنا تھا جو تمہیں اور ذیشان کو دکھ دیتیں۔" (ذیشان خورسنہ کے خوبرو بیٹے کا نام تھا)

"مجھے تمہاری کسی بات سے دکھ نہیں پہنچ سکتا سجاول! اور نہ ہی یہ باتیں میرے لیے اہم ہیں۔ اگر میں یہاں رہنا چاہتی ہوں تو اس کی کچھ اور وجوہات ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ابھی جاباجی کی آزادی کا سفر مکمل نہیں ہوا۔ ابھی اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ابھی ہم نے ہاناوانی کے طلسم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنی ہے، ابھی......"

"ابھی تم کو بہت کچھ کرنا ہے۔" سجاول نے جل کر اس کی بات کاٹی۔ "مجھے پتا ہے تمہارا وقت بہت مہنگا ہے بلکہ جو وقت تم یہاں میرے پاس گزار رہی ہو، یہ بھی ضائع ہو رہا ہے۔ تمہیں یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔" وہ جھلائے ہوئے انداز میں کیمرے کے فریم سے نکل گیا۔

خورسنہ کچھ دیر عجیب نظروں سے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر گردن کو ذرا خم دے کر بولی۔ "......اور تم یہ بھی کہہ رہے ہو کہ ناراض نہیں ہو؟"

جواب میں سجاول نے کچھ کہا مگر اس کی وڈیو آ رہی تھی نہ آڈیو واضح سنائی دے رہی تھی۔ خورسنہ نے ایک گہری سانس لی اور سجاول کی طرف بغور دیکھتے ہوئے آگے بڑھی۔ وہ سجاول کا ہاتھ تھام کر اسے صوفے تک لے آئی۔

اسے بٹھا کر بولی۔ ”اگر میں تمہیں ایک آفر دوں تو مان لو گے؟“

وہ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

خورسنہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”سجاول! تم یہیں رہ جاؤ، ہمارے پاس۔ ہم تینوں یہاں بہت خوش رہیں گے۔ بڑی خوشی اور بڑی آسائش کے ساتھ۔ میرے والد صاحب نے میرے لیے بہت کچھ چھوڑا ہے۔ ہم دونوں بھی محنت کریں گے، ایک بڑا خوش حال گھرانا بنائیں گے۔ تمہاری بہن کی تو شادی ہو جاتی ہے۔ تم اپنی والدہ کو بھی یہاں بلالو، ہم مل کر ان کی اتنی سیوا کریں گے کہ ان کے سارے دکھ اور شکوے دور ہو جائیں گے۔“

سجاول بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ وڈیو اتنی اچھی نہیں تھی کہ سجاول کی آنکھوں میں جھانکا جاسکتا مگر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ گمبھیر انداز میں سوچ رہا ہے۔ آخر اس کی پاٹ دار آواز ابھری۔ ”شاید میرا جواب تمہاری مرضی کے مطابق نہ ہو۔“

وہ اس کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے بولی۔ ”تم نے 'شاید' کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ 'شاید' میرے لیے امید کی کرن کی طرح ہے۔ میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گی۔“

وڈیو ختم ہو گئی۔ انیق نے کیمرا آف کیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”لو جی، دیکھ لیں ہیر رانجھے کی 'لیول' کی اسٹوری ہے۔ ہیر تو پھر بھی چلو کچھ منہ متھے لگتی ہے مگر رانجھا تو لگتا ہے کہ بے موسم کا پھل ہے، کولڈ اسٹور سے نکلا ہوا اور کچھ نہیں تو بندہ اپنی عمر ہی دیکھ لے، اگر اس کی جلدی شادی ہو گئی ہوتی تو اب تک جوان بچوں کا باپ ہوتا۔“

”اسے اتنا ایزی نہ لو، وہ اب بھی ایک ہاتھ سے تمہاری گردن مروڑ سکتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اب آپ میرا اور اس کا دنگل رکھ ہی لیں۔“

”دنگل رکھنے کی ضرورت نہیں۔ جس طرح کی تمہاری حرکتیں ہیں، ایک دن تمہارا دنگل ہو ہی جانا ہے اور اس دنگل کا نتیجہ تمہاری وفات یا جسمانی معذوری کی شکل میں نکلنا ہے۔ اپنی حالت پر رحم فرماؤ۔ اس طرح کی حرکت آئندہ نہ کرنا۔“ میں نے اسپائی کیمرا اس سے جھپٹ لیا۔

خورسنہ اور سجاول والا معاملہ کچھ سنجیدگی اختیار کر چکا تھا۔ سجاول کے لیے یہاں اور پاکستان میں بھی لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن یہ دل آنے کی بات تھی اور اس کا دل خورسنہ پر آگیا تھا۔ آگ دونوں طرف سلگ رہی تھی، مگر شعلہ بنے گی یا نہیں، یہ معلوم نہیں تھا۔

دن گزرتے جا رہے تھے، ہماری روانگی کا وقت نزدیک آرہا تھا۔ میری جسمانی حالت اب کافی بہتر تھی، میں روزانہ تھوڑی سی جاگنگ بھی کر رہا تھا، کندھا اب یوں فٹ تھا جیسے کبھی اس میں کوئی نقص پڑا ہی نہیں تھا۔ قسطینا اور کمانڈر فارس بڑی اچھی طرح سیاسی اور فوجی صورتِ حال کو کنٹرول کر رہے تھے۔ فوجی دستوں اور رضا کار دستوں کی ازسرِنو تنظیم کی جا رہی تھی۔ بہت سے فوجی افسروں کو شجاعت کے تمغے ملے تھے اور ان کی ترقیاں ہوئی تھیں۔ بن مشہد کو میجر کا عہدہ مل گیا تھا۔ دو تمغے ان دو افراد کے لیے بھی تھے جنہوں نے جاماجی سے چند میل کے فاصلے پر ایک ویران ٹاپو کے کنارے جان دی تھی۔ ان دونوں کی قبریں بھی وہیں پر تھیں...... ایک قبر پر کیپٹن تبارک اور دوسری پر محمد سیف کے نام کا کتبہ تھا۔ ساحلی ہوا میں جھومتے ہوئے بلند پام کے پیڑوں کے نیچے اس قبر میں وہ رنگ رنگیلا پنجابی گبرو سو رہا تھا جو کھیرا گاؤں کی ٹھہری ہوئی زندگی سے اٹھ کر یہاں پہنچا تھا اور چند نہایت پُرجوش دن گزارنے کے بعد موت کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

میں اس کی قبر پر الوداعی نگاہ ڈالنے ٹاپو پر پہنچا تو تاجور بھی میرے ساتھ تھی۔ اس کو بس ایک ہی غم کھائے جا رہا تھا، سیف کی ماں اپنے لاڈلے بیٹے کی موت کی خبر کیونکر سن پائے گی، وہ سسکنے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے دلاسا دیا۔ حاذق ذکری بھی ہمارے ساتھ موجود تھے۔ وہ بڑی پُرکشش روحانی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اور ان کے چند قریبی ساتھی اکثر روزے سے رہتے تھے۔ آج بھی وہ روزے سے تھے۔ حاذق ذکری کا کہنا تھا کہ روزہ انسان میں لطیف احساسات جگاتا ہے اور کثافت کو دور کرتا ہے، روزے دار کی بات میں ایک خاص قسم کا اثر پیدا ہو جاتا ہے اور سخت گیر لوگوں کا رویّہ بھی لاشعوری طور پر روزہ دار کے ساتھ نرم ہونے لگتا ہے۔

اب بھی حاذق ذکری اپنے کئی مریدان کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ انہوں نے فاتحہ پڑھی اور دعا کرائی۔ ابراہیم بھی ہمارے ساتھ یہاں آیا تھا۔ وہ ان دو افراد کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتا تھا جنہوں نے اپنی جان دے دی مگر اپنے زیرِزمین ساتھیوں کا سراغ نہیں دیا۔

ابراہیم کی حالت حیران کن تیزی سے بہتر ہو رہی تھی۔ گزرنے والا ہر دن اس میں زندگی اور توانائی کے آثار نمایاں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر بوشر وائٹ تو جا چکے تھے مگر ان کا اسسٹنٹ ڈاکٹر ولسن یہاں موجود تھا اور ابراہیم کے علاج کی

نگرانی کررہا تھا۔

☆☆☆

آخروہ دن آگیا جب قسطینا نے بڑے چاؤ اور محبت کے ساتھ ابراہیم کو عزت مآب کی نشست پر بٹھایا اور ساری رسمیں ادا کیں۔ ڈی پیلس اس روز بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ تین سو کے قریب خاص مہمان اس خوب صورت تقریب میں موجود تھے۔ ان مہمانوں میں ہمارے خاص مددگار پال کورنی اور راجر بھی تھے۔ پال کورنی نے اپنے لونگ جیک جیسے سفاک ہم وطن سے ٹکر لی تھی اور آخری حد تک گیا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے انسانیت کے ناتے سے کیا تھا۔

اس تقریب میں زینب اپنے دیدہ زیب لباس میں بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ وہ سمٹی سمٹائی ہوئی، ابراہیم کے پہلو میں موجود تھی۔ آج سے ایک برس پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اس مرتبے تک پہنچے گی۔ اس نے ''ماضی قریب'' میں بہت اذیتیں سہی تھیں لیکن آج صلہ پا رہی تھی۔ مگر یہ صلہ ابھی ادھورا تھا اور دراصل یہی ادھورا پن تھا جس نے مجھے ابھی تک جامانجی میں روکا ہوا تھا۔ میں ابراہیم اور زینب کو ایک دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ شاندار تقریب کے اختتام پر جب مہمان رخصت ہو چکے تھے اور شب بسری کی تیاری ہو رہی تھی، میں نے ابراہیم سے اکیلے میں ملاقات کی۔ وہ عنابی رنگ کے شاہی چغے میں پیارا لگ رہا تھا۔ چہرہ دبلا ضرور نظر آتا تھا، مگر اس پر صحت مندی کی چمک تھی۔ میں نے کہا۔ ''ابراہیم! تمہاری ساری آزمائش ختم ہو چکی ہے، اب اپنے اندر اعتماد پیدا کرو اور زندگی کو نارمل کر لو۔''

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ میری بات سمجھ گیا تھا۔ میں اس سے ازدواجی معاملے کی بات کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے اندر ابھی تک خوف موجود ہے۔ میں نے کہا۔ ''ڈیئر ابراہیم! تمہارے اندر سے سارے دلدر دور ہو گئے ہیں۔ تم نے خود کو کڑی آزمائش کی جس بھٹی میں تپایا ہے، اس نے تمہارے ہر میل کو دھو ڈالا ہے...... اب تمہیں علیحدہ ''بیڈروم'' میں سونے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ ''...... لیکن شاہ زیب بھائی میں ابھی......''

''پلیز ابراہیم۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''اب خود کو بے جا خوف میں مبتلا نہ کرو۔ شاید تمہیں پتا نہیں، میں اگر اب تک یہاں موجود ہوں تو صرف اس وجہ سے کہ تمہیں اور زینب کو ایک دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اس نے اپنے تپلے پتلے خشک لبوں پر زبان پھیری اور میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ ایک بار...... اپنے ٹیسٹ کرا لوں۔''

میں نے مسکراتے ہوئے ایک سفید لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ''یہ کیا ہے؟'' اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔

''تمہاری تازہ ترین ٹیسٹ رپورٹس۔ جمعے کے روز تمہارا جو بلڈ سیمپل لیا گیا تھا، وہ انہی ٹیسٹوں کے حوالے سے تھا۔ میرے کہنے پر ڈاکٹر ولسن نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ تم تناؤ میں رہو گے۔ تم سو فیصد اوکے ہو جس زہر نے تمہاری زندگی میں زہر گھول رکھا تھا اب اس کا شائبہ تک تمہارے جسم میں موجود نہیں۔''

میں نے اسے ساری رپورٹس دکھائیں اور سمجھائیں۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ آنکھوں میں نمی جاگ گئی تھی۔

پندرہ بیس منٹ بعد میں اسے آمادہ کر چکا تھا کہ......

آج کی رات جدائی کی نہیں، ملن کی ہوگی۔ وہ علیحدہ کمرے میں نہیں سوئے گا۔

میں نے اس کے لیے لباس منتخب کیا۔ اپنے ہاتھوں سے خوشبو لگائی۔ اس کی نوک پلک درست کی اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے مجھے بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ میرا لاڈلا سا، چھوٹا بھائی ہو اور میں اسے حجلۂ عروسی کے لیے روانہ کر رہا ہوں۔ وہ اپنے دھان پان جسم کے ساتھ، مجھ سے گلے ملا اور اشک بار آواز میں ہولے سے بولا۔ ''آپ کا شکریہ کہنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔''

''اور شکریہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں۔'' میں نے اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔

وہ میری زندگی کی ایک پُرمسرت رات تھی۔ اگلی صبح میں نے ابراہیم کی پیشانی چومی اور پھر جھکی جھکی آنکھوں والی، گڑیا سی زینب کے سر پر ہاتھ پھیرا...... مجھے لگا کہ میری بہت سی اذیتوں کا مداوا ہو گیا ہے۔ زینب جانتی تھی کہ ہماری یہاں سے روانگی کا دن قریب آگیا ہے۔ وہ رونے لگی۔

میں نے کہا۔ ''زینب! اب تم یور ہائی نس ہو۔ اس طرح رونا مناسب نہیں۔''

قسطینا بھی قریب ہی موجود تھی۔ زینب کو اپنے ساتھ لگا کر بولی۔ ''شاہ زیب یہاں سے جا کر تمہیں دکھ دے رہا ہے۔ اس کی سزا اسے میں دوں گی۔''

''کیا مطلب؟'' ابراہیم نے مسکرا کر پوچھا۔

''مطلب بھی اسی کو بتاؤں گی۔'' اس نے کہا۔

''کوئی اشارہ؟'' کمانڈر فارس جان نے کہا۔

''اشارے بازی تو زیادہ تر مرد ہی کرتے ہیں۔''
قسطینا ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔ سب ہنسنے لگے۔
اور یہ شام کا وقت تھا۔ جزیرے کی ایک خوش رنگ اور پُر بہار شام تھی۔ جنگ کے بادل چھٹ چکے تھے اور پام کے بلند درختوں کے اوپر گہرا نیلا آسمان جھلک دکھاتا تھا۔ ڈی پیلس کے مختلف حصوں کی مرمت کا کام تیزی سے جاری تھا۔ قسطینا نے مجھے اپنے نئے آفس کے اندر بلایا تھا۔ پتا نہیں، وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ میں ڈی پیلس کی مختلف راہداریوں سے گزر رہا تھا۔ ہمارا سامان تقریباً پیک ہو چکا تھا لیکن ہماری روانگی کی خبر کو عام نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ پھر بھی ڈی پیلس میں اکثر لوگوں کو شک تھا کہ ہم یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔ مجھے، انیق اور سجاول کو دیکھ کر ان کے چہروں پر افسردگی سی جھلکنے لگتی تھی۔
میں نئے آفس سے ملحقہ ایک چھوٹے سے ہال میں پہنچا تو قسطینا کو مختلف لباس میں دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے ویسا ہی سفید لباس پہن رکھا تھا جیسے کراٹے کے کھلاڑی پہنتے ہیں۔ بوائے کٹ بال سلیقے سے پیشانی پر جمے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ گرین فورس کی سپریم کمانڈر ہے۔ ''یہ کیا چکر ہے قسطینا؟'' میں نے پوچھا۔
اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کھوئی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مارشل آرٹ میرے بچپن اور لڑکپن کا اہم ترین مشغلہ تھا۔ تین چار سال پہلے جب تمہیں ٹی وی اسکرین پر یا نیٹ پر دیکھا کرتی تھی تو دل میں یہ خواہش جاگتی تھی کہ...... کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ کسی وقت میں تم جیسے چیمپئن سے ٹپس لوں یا اس کے ساتھ کھیلوں؟ یہ ایک سپنا تھا کہ میں تمہارے ساتھ پریکٹس فائٹ کر رہی ہوں۔ تم میرا ہنر دیکھ کر حیران ہو رہے ہو۔ مجھے شاباش دے رہے ہو۔''
اس نے ایک گہری سانس لی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''پھر ایک انہونی ہوئی۔ تم یہاں ہمارے پاس آئے۔ کئی ماہ یہاں رہے...... اور اب واپس جارہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ کچھ اور نہ سہی لیکن میری کم ازکم یہ خواہش تو پوری ہونی چاہیے کہ ایک بار تم سے لڑسکوں۔''
میں نے کہا۔ ''جزیرے کی سپریم کمانڈر بڑی جذباتی باتیں کر رہی ہے۔''
''سپریم کمانڈر اپنی جگہ، مگر تمہارے فن کی پرستار اپنی جگہ۔ چند ہفتے پہلے تک میرا خیال تھا ایسٹرن! چونکہ تم ایک سپر فائٹر ہو، اس لیے جزیرے کی لڑائی میں بھرپور حصہ لوگے۔ کوئی بڑا کارنامہ انجام دو گے۔ تم نے بڑا کارنامہ تو انجام دیا...... بلکہ بہت بڑا...... لیکن لڑ کر نہیں، اپنی برداشت اور ثابت قدمی دکھا کر۔ یہاں کے لوگ تمہیں کبھی بھول نہیں سکیں گے۔ تمہاری زخمی تصویر یہاں کے در و دیوار پر تو موجود ہی ہے، لوگوں کے دلوں میں بھی چسپاں ہو چکی ہے۔''
اس نے میری کہنی کے پاس جلد کے اس حصے پر انگلیاں چلائیں جس کا رنگ جان لیوا تپش کے سبب سفیدی مائل ہو گیا تھا۔ اب یہ رنگ آہستہ آہستہ معمول پر آرہا تھا۔ ایسے ہی کچھ نشان میری ٹانگوں اور کمر پر بھی موجود تھے۔ ایک جگہ نئی اسکن کا ٹکڑا بھی لگایا گیا تھا جو اَب جسم کے ساتھ ہم رنگ ہوتا جارہا تھا۔
وہ مسکرائی۔ ''میں تمہیں لڑے بغیر یہاں سے نہیں جانے دوں گی...... تم یوں سمجھو کہ میں تمہیں لڑ کر وداع کرنا چاہتی ہوں۔''
میں نے کہا۔ ''یہ اچھی بات کہی کہ لڑ کر وداع کرنا چاہتی ہوں۔''
تب میں نے پہلی بار دھیان سے دیکھا کہ ہال کے دو گوشوں میں دو وڈیو کیمرے بھی اسٹینڈز پر موجود تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ میں نے کہا۔ ''قسطینا! کیا آپ سوچ بھی سکتی ہیں کہ میں آپ کو چوٹ لگاؤں گا؟''
اس نے عجیب انداز میں کہا۔ ''چوٹ تو تم لگا ہی چکے ہو۔'' پھر فوراً ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔ چند سیکنڈ بعد سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''میں بھی جانتی ہوں کہ تمہارا وار نہیں سہہ سکتی اس لیے وار کرنے کا حق مجھے دے دو۔ تم صرف دفاع کرنا......''
میں نے اس ساری صورتِ حال سے بچنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ مصر تھی۔ آخر اس نے دونوں کیمرے آن کر دیے۔ ہم دونوں اس شرط کے ساتھ آمنے سامنے آگئے کہ میں صرف دفاع کروں گا۔
وہ کوئی گئی گزری فائٹر نہیں تھی۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی اسے بھگت چکا تھا (اس وقت میرا کندھا زخمی حالت میں تھا) آج بھی وہ زبردست اسپرٹ میں تھی۔ اس نے میرے سامنے ''اسٹانس'' لیا اور بولی۔ ''اگر میں تمہیں ایک دو چوٹیں لگانے میں بھی کامیاب ہوگئی تو سمجھوں گی کہ جیت گئی ہوں...... لیکن خبردار، تم جان بوجھ کر چوٹ کھانے کی کوشش نہ کرنا۔''
''اوکے۔'' میں نے کہا۔
وہ مجھ پر پل پڑی۔ ایک اچھی فائٹر کی طرح وہ اپنے ہاتھ پاؤں کو مشینی انداز میں اور یکساں تواتر کے ساتھ حرکت

دے سکتی تھی۔ اس کا چھریرا جسم، اسٹیل کی طرح سخت ہونے کے ساتھ ساتھ ربڑ کی طرح لچک دار بھی تھا۔ فائٹرز، پوائنٹ اسکور کرنے کے لیے چہرے اور سینے کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ بھی کر رہی تھی۔

میرے لیے دفاع کرنا مشکل نہیں تھا۔ شاید وہ آٹھ دس گنا زیادہ مہارت کا مظاہرہ بھی کرتی تو مجھے زیر نہ کر سکتی۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر میں زیادہ ''ایزی'' محسوس کروں گا تو وہ کوئی کراری ضرب لگا جائے گی۔ وہ پیچھے ہٹتی تھی، پینترا بدلتی تھی اور بار بار غضب ناک انداز میں حملہ آور ہوتی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ مجھے کیمرے کے سامنے بائیں کونے میں گھیر لے۔ میں نے اس کا ارادہ پورا ہونے دیا۔ وہ بے حد جوش سے حملہ آور ہوئی۔ میں اپنے ہاتھوں اور کلائیوں سے اس کے وار روک رہا تھا لیکن کسی وقت میں جان بوجھ کر ''بلاکنگ'' نہیں کرتا تھا۔ اس کے پنچ یا اس کی کک کو اپنے چہرے کی طرف آنے دیتا تھا اور پھر جھکائی دے کر خود کو بچا لیتا تھا۔ وہ ہانپ گئی، اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ رنگ لال گلابی ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''راؤنڈ ختم ہو گیا۔ تھوڑا سانس لیتے ہیں۔''

وہ شاید پہلے ہی ایسی آفر کی منتظر تھی۔ ہم گوشے میں رکھی دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے اسے بتایا کہ اس نے کہاں کہاں غلطی کی ہے اور وہ اپنی کن موومنٹس کو بہتر بنا سکتی ہے۔

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال ہم دونوں صرف دو حریف ہیں۔''

''اوکے۔'' میں نے کہا۔

چند لمبے سانس لے کر وہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک بار پھر اٹیک اور ڈیفنس کا کھیل شروع ہو گیا۔ اس کے بوائے کٹ بال اچھل رہے تھے اور شفاف گردن کی نسیں پھڑک رہی تھیں۔ بہت کوشش کے باوجود وہ مجھے کوئی ایسی ضرب لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکی جسے 'پوائنٹ اسکورنگ' کہا جا سکے۔ آخر وہ تھک کر چور ہو گئی۔ میں نے اسے روک دیا اور کندھوں سے تھام کر زبردستی کرسی پر بٹھا دیا۔ جگ سے پانی لے کر اسے پلایا اور چند گھونٹ خود بھی لیے۔

جب میں گھونٹ لے کر گلاس تپائی پر رکھ رہا تھا، وہ اچانک ایک چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ میں کرسی سمیت پشت کے بل فرش پر گرا۔ سر پر چوٹ آئی۔ وہ مجھ پر چڑھ دوڑی۔ اس کے دو تین زوردار مکے میرے منہ پر لگے۔ وہ میرے سینے پر چڑھ بیٹھی اور دونوں ہاتھوں سے مجھے مکے رسید کرنے لگی۔ میں نے دفاع کی تکنیک کے مطابق اپنے چہرے کو اپنے ''فور آرمز'' سے چھپا لیا۔

''تم بہت بُرے ہو۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔''

وہ جذباتی انداز میں بول بھی رہی تھی۔ آخر وہ ہانپ گئی اور میرے اوپر ہی گر گئی۔ اس کے دھڑکتے ہوئے عرق آلود بالائی جسم نے مجھے ڈھانپ رکھا تھا۔

چند سیکنڈ بعد اس کے رگ پٹھے ڈھیلے پڑتے محسوس ہوئے۔ میں نے اس کو بہ آہستگی خود سے جدا کیا...... اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی اٹھ گئی اور ہانپی ہوئی سی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''یہ تو سراسر فاؤل کیا ہے آپ نے۔'' میں نے بھی بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھوں میں نمی سی تھی۔ عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی پھر وہ مسکرانے لگی۔ ''سوری، تم نے ویسے تو مجھے کوئی پوائنٹ لینے نہیں دینا تھا۔''

''آپ کی تسلی ہوئی یا کچھ کسر باقی ہے؟''

''ایک بار پھر معذرت چاہتی ہوں ڈیئر ایسٹرن۔'' اس نے کہا اور آگے جھک کر میری ٹھوڑی کا معائنہ کیا۔ یہاں اس کے ایک پنچ نے خراش سی ڈال دی تھی۔

''نہیں، ایسی کوئی چوٹ نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

اس کی سانسیں اب درست ہو چکی تھیں۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''کیا تم چند دن مزید نہیں ٹھہر سکتے؟''

میں نے شریر انداز میں کہا۔ ''اگر تم اور فارس جان کوئی اہم ''فیصلہ'' کر لو تو ایک دو دن اور رکا جا سکتا ہے۔''

اس کے چہرے پر سرخ رنگ لہرایا بولی۔ ''اہم فیصلہ تو ہو جائے گا لیکن ایک دو دن میں نہیں۔ شاید ایک دو سال درکار ہوں گے۔''

''یہ تو زیادتی ہوگی فارس جان کے ساتھ۔'' میں نے سفارش کی۔

''چلو تمہارے کہنے پر جہاں اتنا کچھ مانا ہے، یہ بھی مان لیتے ہیں۔ دو سال میں دو تین ہفتے کم کر دیتے ہیں۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

اس کے سیل فون کا الارم بجنے لگا۔ اسے شاید کسی عسکری میٹنگ میں جانا تھا۔ وہ الارم بند کرتے ہوئے بولی۔ ''یہاں کے لوگ تمہیں کبھی بھول نہیں سکیں گے

ایسٹرن، اور ان لوگوں میں، میں بھی شامل ہوں۔ میں امید رکھوں گی کہ تم دوبارہ Ring میں نظر آؤ گے۔''

''اور امید پر دنیا قائم ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور یہ بھی امید رکھوں گی کہ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں دوبارہ ملاقات ہوگی۔''

الوداعی کلمات کی ادائیگی کے بعد ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ قسطینا نے دونوں کیمرے آف کر دیے اور میرے قریب آ کر ایک دم آگے جھکی۔ میرے رخسار کا بوسہ لیا اور نم آنکھوں سے بولی۔ ''مائی آل گڈ وشز۔''

☆☆☆

لونگ جیک کو اگر جاماجی کا قصائی کہا جاتا تو بے جا نہ ہو گا۔ اس کی اذیت رسانی کی کئی داستانیں یہاں موجود تھیں۔ اب یہ قصائی کسی مگرمچھ کا فضلہ بن کر سمندر میں بکھر چکا تھا۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ تاجور کے سفری کاغذات لونگ کے آفس میں سے مل گئے تھے۔ ہم سب یعنی انیق، سجاول اور سنبل وغیرہ بھی قانونی طریقے سے سفر کر کے یہاں پہنچے تھے۔ ہماری واپسی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی...... آخر ہماری روانگی کا دن آن پہنچا۔ ہمیں ایک چارٹرڈ طیارے کے ذریعے بروناٹی دارالسلام اور وہاں سے لاہور پہنچنا تھا۔ جاماجی سے ہماری فلائٹ علی الصباح پانچ بجے تھی۔ سجاول اور خورسنہ کے معاملات طے نہیں پا سکے تھے۔ خورسنہ نے سجاول کو آفر کی تھی کہ وہ اس کے ساتھ یہیں رہ جائے...... مگر جس طرح خورسنہ پاکستان جانے والی بات نہیں مان سکی تھی اسی طرح سجاول بھی یہاں رہنے پر آمادہ نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اوپر سے تو نارمل نظر آ رہا تھا۔ گاہے بگاہے مسکراتا بھی تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اندر سے اداس ہے۔ شاید اسے اب بھی امید تھی کہ خورسنہ اسے یوں اکیلا نہیں جانے دے گی۔ اس کی نگاہیں بار بار ڈی پیلس کے مین راستے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ جیسے اسے آس ہو کہ خورسنہ اور اس کا بچہ، اس کے ساتھ جانے کے لیے یہاں پہنچ جائیں گے اور قسطینا اپنے ذرائع استعمال کر کے آناً فاناً ان دونوں کی روانگی کا انتظام کر دے گی۔

ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جوں جوں ڈی پیلس سے روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا، سجاول کی بے کلی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ انیق نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔ ''جی چاہتا ہے کہ میرے پاس کچھ پیسے آ جائیں تو امریش پوری پر فلم بنا دوں۔ اس کا نام ہو ''ڈاکو اور حسینہ...... مع ایک عدد بچہ۔''

آخر ہمارے پروٹوکول کی گاڑیاں پہنچ گئیں۔ ابراہیم اور زینب ہمیں الوداع کہنے کے لیے موجود تھے۔ حاذق ذکری رات سے ہی ہمارے پاس تھے۔ ان کی سنہری گفتگو مسلسل ہمارے دل و دماغ کی آبیاری کر رہی تھی۔ وقتِ رخصت ابراہیم اور زینب نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد ہم سے ملنے پاکستان آئیں گے۔

میں نے حاذق ذکری سے بھی پاکستان آنے کی درخواست کی۔ انہوں نے جواب میں ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ دل پذیر لہجے میں بولے۔ ''سمجھو کہ یہ میرا خط ہے۔ اسے پاکستان جا کر اطمینان سے پڑھنا۔''

پال، راجر، بن مشہد، زمان اور دیگر مہربان بھی ہمیں الوداع کہنے کے لیے موجود تھے۔ ابراہیم اور زینب نے بھی ہمیں ڈی پیلس میں ہی سی آف کر دیا۔ قسطینا اور کمانڈر فارس جان کو ائر پورٹ تک جانا تھا۔ ہم ڈی پیلس کے عملے کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکلے تو دنگ رہ گئے۔ یہاں سڑک کی دونوں جانب بے شمار لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سیکڑوں میں نہیں ہزاروں میں تھے لیکن بالکل خاموش اور پُرسکون، غالباً انہیں سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ پہلے کی طرح ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کریں گے اور خاموشی سے الوداع کہیں گے۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں کہ اَن گنت لوگوں کے ہاتھوں میں میری ''زخمی تصویر'' تھی، ان میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ وہ خوشی اور افسردگی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ہماری طرف دیکھ رہے تھے، ہاتھ ہلا رہے تھے۔ کہیں کہیں کچھ ٹولیاں مقامی زبان میں کوئی گیت بھی گا رہی تھیں اور کیلے کے ایسے پتے لہرا رہی تھیں جن پر سرخ رنگ تھا۔ یہ سارے کے سارے مناظر بے حد جذباتی تھے۔ ہم گاڑیوں کے ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ ائر پورٹ پہنچے۔ ائر پورٹ پہنچ کر بھی سجاول کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکتی رہیں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا جس کی وہ آس رکھتا تھا۔ خورسنہ کی جھلک کہیں دکھائی نہیں دی۔ انیق کو اس ساری صورتِ حال میں بڑا مزہ آ رہا تھا، خوشی جیسے اس سے چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ عجیب خدا واسطے کا بیر تھا ان دونوں میں۔ جب جہاز کی سیڑھی علیحدہ ہو گئی اور دروازہ بند ہونے کے بعد جہاز نے چلنا شروع کر دیا تو میرے پہلو میں بیٹھے انیق نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر کہنیوں کو پیچھے کی طرف حرکت دی اور دبے دبے جوش سے بولا۔ ''یس۔'' اس کا مطلب یہی تھا کہ سجاول کی ''نامرادی'' پر مہر لگ گئی ہے۔

میں نے تاجور کی طرف دیکھا۔ وہ سنبل کے ساتھ

بیٹھی تھی اور کھوئی کھوئی نظروں سے کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ لٹیں پیشانی پر جھول رہی تھیں، جنہیں وہ بار بار بے خیالی میں پیشانی سے ہٹا کر کانوں کے پیچھے اُڑس رہی تھی۔ میں بھی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ جہاز سے نیچے جاماجی نظر آرہا تھا۔ میں جب اس سرسبز جزیرے پر پہنچا تھا تو تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ مجھے جنگ وجدل کے ایسے لرزہ خیز مناظر سے گزرنا پڑے گا۔ یہاں کی خوشگوار یادیں تو کم ہی تھیں۔ زیادہ تر تلخ یادیں تھیں۔ اسی جزیرے کے ایک گوشے میں لانبے جسم اور ریشمی بالوں والی جاناں ابدی نیند سو رہی تھی جس نے کبھی لکھا تھا...... میں برف کے اندھیرے گھر میں تھی...... اور پل پل ختم ہو رہی تھی میری زندگی......

جزیرے کے چاروں طرف گہرا نیلا سمندر تھا جس میں کشتیوں اور جہازوں کے سفید دھبے نظر آرہے تھے...... اور وہ چھوٹا سا ٹاپو بھی نظر آرہا تھا، جہاں میں نے سیف عرف سیفی کو کھویا تھا۔ اسے یاد کر کے دل ہول جاتا تھا۔ ہم تینوں جس شکنجے میں پھنسے تھے، اس میں سے میرا زندہ بچنا کرشمے سے کم نہیں تھا لیکن کسی وقت میں سوچتا تھا کہ اچھا ہی ہوتا میں بھی ختم ہو جاتا، کم از کم میرے دل پر یہ بوجھ تو نہ ہوتا کہ میں نے سیفی کو اپنے ہاتھوں سے مارا ہے۔ میں نے کئی بار دل کڑا کر کے تاجور کو یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ سیفی کی موت کس طرح ہوئی، لیکن ہمت نہیں پڑی۔ یہ خون کا رشتہ تھا اور ایسے رشتے بڑے سنگین ہوتے ہیں۔

انیق بھی میری ہی طرح نیچے جھانک رہا تھا۔ جاماجی کا ایک حصہ نیوسٹی کہلاتا تھا اور یہیں پر وہ خطرناک شاطر عورت موجود تھی جو اپنے اندر کچھ ایسی صلاحیتیں رکھتی تھی جو پیرا سائیکالوجی کے زمرے میں آتی تھیں۔ اطلاعات کے مطابق وہ خاصی بیمار تھی۔ اس جزیرے اور یہاں کے باسیوں کے لیے نیک شگون ہوتا اگر وہ کھلی قبر میں راتیں گزارنے کے بجائے مستقل طور پر بند قبر میں چلی جاتی۔

''دیکھیں جی، جاماجی پر نیا سورج طلوع ہو رہا ہے۔'' انیق نے افق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سمندر سے نکل کر سرخ گولا آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اور پام کے درختوں کی چوٹیاں روشن ہو رہی تھیں۔ ہاں...... جاماجی پر نیا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

☆☆☆

جب ہم پاکستان روانہ ہوئے تو میرے ہم سفروں میں کرنل احرار بھی تھا، وہ ایک نہایت ذہین اور ملنسار شخص تھا۔ ایک عام سی شکل وصورت کے اندر ایک نہایت قابل ڈاکٹر اور پلاسٹک سرجن چھپا ہوا تھا۔ شاید یہ کرنل کی عام شکل وصورت ہی تھی جس کی وجہ سے اس نے کمپاؤنڈر ارکب کا روپ دھار کر گرے فورس کے اندر رسائی حاصل کی اور میری تصویر حاصل کرنے کے علاوہ اور کئی اہم کام بھی انجام دیے۔ کرنل ابھی جاماجی کے جنگ زدہ ماحول سے کچھ دور رہنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے دل میں پاکستان دیکھنے کی اور یہاں کچھ ڈاکٹر دوستوں سے ملنے کی دیرینہ خواہش بھی تھی، لہٰذا وہ برونائی دارالسلام سے ہمارے ساتھ ہی پاکستان روانہ ہوا تھا۔

یہ مئی کی ایک خوشگوار رات تھی۔ ہمارا جہاز ایک لمبے سفر کے بعد آخر لاہور کی فضاؤں میں منڈلانے لگا۔ ہمارے نیچے حدِ نگاہ تک لاہور کی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ مینارِ پاکستان، بادشاہی مسجد، دریائے راوی کا پل، اندرونِ لاہور اور اردگرد کے علاقے صاف پہچانے جارہے تھے۔

کرنل احرار نے کھڑکی سے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا خوب صورت شہر ہے جناب علامہ اقبال یہیں پیدا ہوئے تھے؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں، لیکن ان کا مزار یہیں پر ہے۔ وہ نیچے دیکھیں بادشاہی مسجد، اس کے ساتھ ہی وہ ایک روشنی شاعرِ پاکستان کے مزار کی ہے۔''

کرنل احرار لاہور کے نشیب وفراز میں کھو سے گئے۔ انہوں نے ایک بار پھر کہا۔ ''دریا کے کنارے ایک دلفریب شہر۔''

میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی مگر میرا دھیان ان شب وروز کی طرف چلا گیا جو میں نے اس مکینی شہر میں گزارے تھے اور پھر گھبرا کر یہاں سے پرواز کرنے کا سوچا تھا مگر تب ہی تاجور اور چاند گڑھی ایک ساتھ میری زندگی میں آئے تھے اور مجھے پاکستان کے دیہی علاقے میں اس خطے کا اصل حسن دیکھنے کو ملا تھا...... میں اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ اب بھی لاہور مجھے خوب صورت تو لگ رہا تھا مگر میرا دھیان ان لوگوں کی طرف جارہا تھا جنہوں نے بڑے شہروں کی زندگی کو زہر آلود کر رکھا ہے۔ ان لوگوں میں شکیل داراب بھی تھا۔ وہ بھی تو لاہور کی انہی روشنیوں میں کہیں موجود تھا۔ میرے دل میں نفرت کی ایک لہر سی اٹھی۔ یہی شخص تھا جس نے تاجور کو ڈھونڈ کر جاماجی پہنچایا تھا اور اس کی آبرو اور زندگی ایک شدید ترین خطرے میں ڈالی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''کوئی بات نہیں شکیل داراب! میں آگیا ہوں۔''

لاہور پہنچ کر ہمارے راستے وقتی طور پر جدا ہو گئے۔ سجاول کو تو سیدھا کوٹلی آزاد کشمیر پہنچنا تھا جہاں اس کی والدہ اور بہن وغیرہ شدت سے اس کی منتظر تھیں، سنبل کو بھی سجاول کے ساتھ ہی جانا تھا۔ کرنل ڈاکٹر احرار کو یہیں لاہور میں رہنا تھا۔ انیق بھی لاہور میں اپنے زیرِزمین ٹھکانے پر پہنچ کر اپنے باس داؤد بھاؤ کے گھٹنے چھونا چاہتا تھا۔ داؤد بھاؤ اس کے بغیر بہت اداس تھا۔ ایک دن جاماجی میں فون پر میری مختصر بات داؤد بھاؤ سے ہوئی تھی۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں مجھ سے شکوہ کیا تھا کہ میں نے کچے ذہن کے انیق کو ورغلا کر اغوا کر لیا ہے، میں نے کہا تھا۔ ''داؤد بھاؤ میں بھی تو تمہاری محبت کا اسیر ہوں۔ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ تم نے مجھے اغوا کیا ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ میں اور انیق دونوں تمہارے دائرہ اثر میں ہیں اور اغوا شدہ ہیں۔''

وقتِ رخصت سنبل نے مڑ کر میری اور تاجور کی طرف دیکھا اور ہمیں مشترکہ طور پر سلاماں لیکم کہا۔ اس نے چند ہی ماہ میں کیا عروج اور کیسی پستی دیکھی تھی۔ وہ کھلنے اور بند ہونے والے مشینی گلاب میں بیٹھ کر ریان فردوس کی خدمت میں بطور تحفہ پیش ہوئی تھی اور عزیز ترین رکھیل کی حیثیت اختیار کر گئی تھی مگر پھر وہ وقت بھی آیا تھا جب ریان فردوس کی موت کے بعد اس کا سارا اثاثہ چھین کر اسے ایک کنیز کی حیثیت سے آریان نامی تھرڈ کلاس اہلکار کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اب ابراہیم اور زینب نے اسے کچھ تحفے دیے تھے اور ان تحفوں نے اس کے مردہ جسم میں پھر جان ڈالی ہوئی تھی۔

جب تک ہم ائرپورٹ پر رہے مجھے خدشہ رہا کہ کہیں پولیس کی طرف سے سجاول، انیق یا مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہ کی جائے مگر یہ اندیشہ درست ثابت نہیں ہوا۔ (مجھ پر تو باقاعدہ دہشت گردی کا مقدمہ بھی موجود تھا)

داؤد بھاؤ کے علاوہ کسی کو ہمارے پاکستان پہنچنے کی اطلاع نہیں تھی۔ داؤد بھاؤ کی شکل دیکھے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ میں اس سے ملنا چاہتا تھا مگر فی الوقت تاجور میرے ساتھ تھی۔ داؤد بھاؤ سے ملاقات میں نے پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھی۔ میں اور تاجور ائرپورٹ سے ٹیکسی میں بیٹھے اور بڑی خاموشی کے ساتھ شاہراہ قائداعظم کے ایک اچھے ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ تاجور بے حد مضطرب تھی، چادر میں لپٹی لپٹائی۔ پاکستان آنے کے بعد وہ مسلسل نقاب میں تھی۔ بس اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ جلد از جلد اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی۔ ان کی خیریت سے آگاہ ہونا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ غم بھی اس کی جان کھائے جا رہا تھا کہ سیف کے گھر والوں کو اس کے ''نہ ہونے'' کی دردناک اطلاع دینا ابھی باقی ہے۔ ابھی تو خود تاجور کے گھر والوں کو معلوم نہیں تھا کہ سیف اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ میں نے تاجور کو تسلی دی تھی کہ سیف کے گھر والوں کو اطلاع دینے والی نہایت گراں ذمے داری بھی میں پوری کروں گا۔

ہوٹل میں ہم نے ایک ہی کمرا شیئر کیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تاجور جن حالات سے گزری تھی، اس کے اندر اضافی خوف بیٹھ گیا تھا۔ میں ایک پل بھی اس کی نگاہ سے اِدھر اُدھر ہوتا تھا تو اُس کا رنگ اڑ جاتا تھا...... ساری رات سفر میں گزری تھی۔ ائرپورٹ پر بھی کافی وقت لگا تھا۔ اب دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ پروگرام کے مطابق ہم نے سب سے پہلے شکیل داراب کی بیوی سے رابطہ کیا۔ اس کی بیوی کا اصل نام تو اور تھا مگر اسے ''جے جی'' کہا جاتا تھا۔ بقول تاجور اس نے تاجور کو بہن کہا ہوا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ صرف زبانی کلامی بہن ہے۔ بہرحال ضروری تھا کہ تاجور اس زبانی کلامی بہن سے ٹیلی فونک رابطہ کرتی۔ تاجور نے کانپتے ہاتھوں سے اس کا نمبر ملایا۔ بیل جاتی رہی مگر فون اٹینڈ نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔ ''دوبارہ کوشش کرو تاجور۔''

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور دوبارہ کال کی...... پھر تیسری مرتبہ...... اور چوتھی مرتبہ...... ''آخر کال اٹینڈ ہو گئی۔ دوسری طرف ''جے جی'' ہی تھی۔ اس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ دراصل شکیل داراب کی خاندانی بیوی ہے...... اور سیاست میں اس کی ہم رکاب بھی۔ تاجور نے فون کا اسپیکر آن کر رکھا تھا۔

جے جی نے یہ جان کر خوشی کا اظہار کیا کہ تاجور پاکستان پہنچ چکی ہے۔ اس نے کہا کہ جاماجی میں اس سے رابطہ کرنے کی کئی ناکام کوششیں کی گئی ہیں۔ رسمی گفتگو کے بعد تاجور نے گلوگیر آواز میں اس سے شکوہ کیا کہ جاماجی میں اس سے برا سلوک ہوا ہے اور یہ کہ وہاں پہنچ کر شکیل صاحب اور جے جی نے اسے تنہا چھوڑ دیا۔

جے جی نے کہا۔ ''تاجور! ہماری نیت اچھی تھی...... ہم نے اچھی نیت کے ساتھ ہی تمہیں ڈھونڈا اور پھر جاماجی لے کر گئے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ تم شاہ زیب کی جان بچا سکو۔ اسے آمادہ کر سکو کہ وہ آقا جان کے مطلوبہ لوگوں کا کھوج کھرا بتا دے اور خود کو تکلیف دہ موت سے بچائے۔

[illegible] یقینی نظر آتی تھی کہ وہ لوگ شاہ زیب کی جان لے لیں گے۔ تمہیں شاہ زیب کے پاس پہنچا کر ہمیں تسلی ہوگئی تھی کہ سب کچھ خوش اسلوبی سے ہوجائے گا مگر ایک دم معاملہ اتنا بگڑ گیا کہ ہاتھ سے ہی نکل گیا۔ شاہ زیب اپنی جگہ اڑا رہا اور وہ لوگ تو تھے ہی پرلے درجے کے ہٹ دھرم۔ وہاں جو کچھ ہوا مجھے بے حد افسوس ہے۔ میں وہاں موجود نہیں تھی ورنہ شاید سب کچھ اس طرح نہ ہوتا۔“

”لیکن شکیل صاحب تو موجود تھے۔“ تاجور سسک کر بولی۔

”وہ موجود تھے لیکن جو ہوا آناً فاناً ہوا۔ لونگ جیک سے طے ہوا تھا کہ وہ تم پر کسی بھی طرح کی سختی نہیں کرے گا، تمہیں ہر طرح احترام دے گا مگر اس نے دھوکا دیا۔ جونہی شکیل صاحب کو پتا چلا کہ تمہیں شاہ زیب سے علیٰحدہ کر دیا گیا ہے اور شاہ زیب نے تمہیں ٹارچر سے بچانے کے لیے اپنی کلائیاں زخمی کر لی ہیں، شکیل صاحب فوراً ڈی پیلس پہنچے تھے مگر تب تک شاہ زیب بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچ چکا تھا اور تمہیں بھی اس کے پاس پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد شکیل اور آقا جان میں سخت جھڑپ بھی ہوئی۔“

”لیکن جے جی بہن! کسی نے ہماری مدد تو پھر بھی نہ کی۔“

”تاجور! تب تک تمہیں مدد کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ شاہ زیب کے پرستاروں نے اسے اسپتال سے نکال کر مرکوزا کے علاقے میں پہنچا دیا تھا۔ تم بھی ساتھ ہی تھیں۔ رائے زل کی فورس اور آقا جان کے لیے تو وہ نو گو ایریا تھا۔ اس وقت ہم نے سکھ کی سانس لی تھی۔“ پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”شکیل صاحب مسلسل تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر دو چار دن مزید تمہاری واپسی نہ ہوتی تو وہ دوبارہ جاماجی جاتے۔“

شکیل داراب کی سیاست داں بیوی تاجور کے سوالوں کے جواب بڑی ہوشیاری سے دے رہی تھی مگر جو کچھ ان دونوں نے کیا تھا وہ ہمارے لیے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ میں نے اشارے سے تاجور سے کہا کہ وہ اب مطلب کی بات کرے۔

تاجور نے آنسو صاف کر کے جے جی سے کہا۔ ”اب میرے لیے اور اباجی کے لیے شکیل صاحب کا کیا حکم ہے؟“

”کوئی حکم نہیں بھئی، تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔ جو جگہ تمہیں اسلام آباد میں الاٹ کی گئی ہے، وہ اب ہمیشہ کے لیے تمہاری ہے۔ اگر چاہو تو کچھ دن مزید اُدھر رہو، چاہو تو اپنے گاؤں چلے جاؤ۔“

”میں گاؤں جانا چاہتی ہوں۔“

”تو ٹھیک ہے، شکیل صاحب تو اس وقت پاکستان سے باہر ہیں۔ میں ان کے سیکریٹری کو ہدایت کر دیتی ہوں۔ تم اسلام آباد آنا چاہو گی یا تمہارے گھر والے وہاں لاہور پہنچ جائیں۔“

”اگر وہی پہنچ جائیں تو اچھا ہے۔ مجھے لمبا چکر نہیں پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے، میں انتظام کرواتی ہوں۔“

”لیکن یہ کام ذرا جلدی ہونا چاہیے جے جی...... میں اور شاہ زیب عارضی طور پر ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ شام تک وہ لوگ ہوٹل پہنچ جائیں گے تو ہم یہاں سے گاؤں روانہ ہوسکتے ہیں۔“

”اتنی جلدی تو شاید یہ ممکن نہ ہو۔ بہرحال میں کوشش کرتی ہوں۔ اگر نہ ہوسکا تو پھر کسی طرح رات گزار لینا۔“

”نہیں جے جی! یہ مناسب نہیں ہے۔“

”شاہ زیب تمہارے لیے کوئی اجنبی تو نہیں۔ اس سے پہلے تم اس کے ساتھ کافی عرصہ وہاں ملنگی ڈیرے پر رہ چکی ہو۔“ جے جی کے لہجے میں طنز کی کاٹ بڑی واضح تھی۔

”وہ ایک مجبوری تھی جے جی مگر اب میں ایسا نہیں چاہوں گی۔“

”اچھا، میں کوشش کرتی ہوں۔“ اس نے قدرے خشک لہجے میں کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ میں بھی تاجور کے پاس موجود ہوں مگر اس نے مجھ سے بات کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا اور شاید اچھا ہی کیا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ کوئی ایسی بات نکل سکتی تھی جو اس کے تن بدن میں آگ لگا دیتی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شکیل کے بارے میں بھی غلط بیانی کر رہی ہے۔ وہ بھی پاکستان میں ہی ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی بیوی جے جی کے پاس ہی بیٹھا ہوا اور یہ ساری گفتگو سن رہا ہو۔ اس نے تاجور کے ساتھ بڑی ”محبت“ سے بڑی بے رحمی کا سلوک کیا تھا۔ اگر جاماجی میں اُس روز میں اپنی شریانیں کاٹ کر خود کو موت کے حوالے نہ کر دیتا تو پتا نہیں تاجور کے ساتھ وہ دو نقاب پوش کیا کر گزرتے۔ انہوں نے لونگ جیک کے حکم پر اسے چھت سے لٹکایا ہوا تھا اور بے لباس کرنے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ان مناظر کو یاد کر کے ہی ایک جھرجھری سی میرے بدن میں پیدا ہوگئی۔ ایک بار پھر نفرت کی بلند لہر شکیل داراب کے لیے اٹھی۔ اس نے

آقا جان سے یاری نبھاتے ہوئے مجھے اور تاجور کو ایک بدترین آزمائش سے دوچار کر دیا تھا۔ ابھی اس کی بیوی نے جو بھی صفائی پیش کی، وہ سراسر جھوٹ کے زمرے میں آتی تھی۔

میں صوفے پر بیٹھا تھا اور دوسری منزل کی کھڑکی سے نیچے ہوٹل کے سرسبز پارکنگ لاٹ کو دیکھ رہا تھا۔ تاجور مجھ سے کچھ فاصلے پر دوسرے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس نے ابھی ابھی ظہر کی نماز ادا کی تھی اور سفید دوپٹے نے اس کے دلکش چہرے کے گرد ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ وہ جیسے بے خیالی میں سامنے دیوار پر لگی ایک خوب صورت پینٹنگ کو دیکھ رہی تھی۔ اس پینٹنگ میں ایک چھوٹے سے گھرانے کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ دیہاتی طرز کا سجا سنورا کمرا تھا۔ شوہر دسترخوان کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور کھانا کھا رہا تھا۔ بیوی اسے محبت سے دیکھ رہی تھی۔ ایک ننھا بچہ باپ کی کمر پر لدا ہوا تھا، چار پانچ سال کی ایک بچی اسے باپ کی کمر سے اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سب مسکرا رہے تھے۔

تاجور نے تصویر سے نگاہ ہٹائی اور گہری سانس لی۔ پھر میری طرف دیکھے بغیر کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''شاہ زیب! آپ یہ سب کچھ چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ کیوں اتنے بُرے لوگوں کے ساتھ اتنی خطرے والی زندگی گزار رہے ہیں۔ کہیں، دور چلے جائیں آپ...... اپنی کوئی الگ دنیا بسالیں۔ میرے دل کی آرزو ہے کہ آپ کسی کے ساتھ بھی رہیں لیکن خوش رہیں اور...... زندہ رہیں...... یہ لوگ نہیں چھوڑیں گے آپ کو۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا آپ کے ساتھ۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ آگے کچھ نہ بول سکی۔

میں نے کھوئی کھوئی نظروں سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر کی طرف کارنس پر ایک گملا رکھا تھا۔ گملے پر تازہ تازہ روغن کیا گیا تھا۔ ایک چیونٹا جو شاید خوراک کی تلاش میں نکلا تھا اس روغن سے چپک گیا تھا۔ پتا نہیں وہ کب سے چپکا ہوا تھا۔ اب اس کا صرف اگلا دھڑ حرکت کر سکتا تھا اگر اسے کھینچنے کی کوشش کی بھی جاتی تو وہ درمیان سے دو ٹکڑے ہو جاتا۔ اس نے اب جتنی دیر زندہ رہنا تھا اسی حالت میں رہنا تھا۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تاجور! تم اپنی جگہ درست کہہ رہی ہو مگر اپنے حالات صرف میں جانتا ہوں۔ میں اس دلدل سے نکلنا چاہوں بھی تو نہیں نکل سکتا۔ تم میرے لیے بس دعا کرو کہ......'' باقی فقرہ میں مکمل نہیں کر سکا۔

پورا فقرہ یہی تھا کہ...... میرے لیے بس دعا کرو کہ جب وقت آئے تو یہ زندگی آسانی سے میرا پیچھا چھوڑ دے۔ شاید وہ میرے بولے بغیر ہی میری بات سمجھ گئی تھی۔ اس کی بلوری آنکھوں میں نمی چمکی اور وہ اپنے آنسو چھپانے کے لیے جلدی سے واش روم کی طرف چلی گئی۔ میں دل میں درد لے کر اس مسکراتی ہوئی فیملی کی پینٹنگ دیکھتا رہا۔ ایسے موقعوں پر میرے پردۂ تصور پر وہی مناظر چلنے لگتے تھے جنھوں نے مجھے زندگی اور زندہ لوگوں کی دنیا سے دور کر رکھا تھا۔ میرے خنجر نے کسی کا پیٹ چاک کیا تھا، اس کی انتڑیاں تارکول کی سڑک پر بکھری تھیں، وہ کوئی اور نہیں تھا۔ یورپ کے سفاک ترین گینگسٹر جان ڈیرک کا لختِ جگر تھا۔

تاجور کی محبت میرے سینے کی گہرائی میں ایک جاودانی آگ کی طرح سلگتی تھی مگر جب میں مستقبل قریب پر نگاہ دوڑاتا تھا تو مجھے ٹیکساری گینگ کے سفاک قاتلوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے بہت قریب پہنچ چکے ہیں یا پہنچنے والے ہیں اور میں جانتا تھا کہ جب وہ مجھے نشانہ بنائیں گے تو میرے اردگرد موجود لوگ بھی بچ نہیں سکیں گے۔ تاجور کو سہاگن بننا تھا بیوہ نہیں۔ میری محبت شدید تو تھی مگر خودغرض نہیں تھی۔ (اگر خودغرض ہوتی تو پھر سجاول کے ڈیرے پر وہ ہر طرح میری دسترس میں تھی) میں تاجور کو سہاگن دیکھنے کا خواہش مند تھا...... اور زندہ بھی۔

شام تک ہم اپنے اپنے خیالوں میں گم رہے۔ آنے والی گھڑیوں کے بارے میں سوچتے رہے۔ میں تاجور کے گھر والوں کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر اس نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں ان کا سامنا کروں اور اپنی صفائی بھی پیش کروں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ میں زیادہ نہیں تو چند روز ضرور اس کے آس پاس موجود رہوں۔ اس کے ذہن میں انجانے وسوسے اور خدشات موجود تھے۔ پھر تیسری بات یہ تھی کہ میں نے اس سے یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ سیف کی دل کی مریضہ والدہ کو سیف کے حوالے سے اطلاع دینا اور اس اطلاع کے بعد اسے غم کے شدید ترین ریلے سے سنبھال لینا بھی میری ذمے داری ہے۔

شام کے وقت تاجور کے ابا جان دین محمد صاحب نے فون پر تاجور کو اطلاع دی کہ وہ اسلام آباد سے بذریعہ جی ٹی روڈ لاہور کے لیے روانہ ہو چکے ہیں اور دس بجے تک ہوٹل پہنچ جائیں گے۔ انتظار کا یہ وقت کاٹنا مشکل تھا۔ میں تاجور کے چھوٹے بھائیوں راحیل اور اسفند کے لیے کچھ شاپنگ

کرنا چاہتا تھا، اس کے علاوہ بھی مجھے ایک دو ضروری چیزیں لینا تھیں۔ میں نے تاجور سے کہا۔ "تاجور! تم دروازہ اندر سے بند کرلو۔ میں آؤں گا تو کھول دینا۔"

اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ بے ساختہ میرا بازو تھام کر بولی۔ "نہیں، آپ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "چھوڑ کر تو جانا پڑے گا تاجور۔"

میرے گمشدہ لہجے نے اسے چونکایا، بولی۔ "میں اب کی بات کر رہی ہوں شاہ زیب، میں اس کمرے میں اکیلے رہنا نہیں چاہتی۔" اس نے جھجک کر اپنے ہاتھ میرے بازو سے پیچھے ہٹا لیے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ گہری جھیل سی شفاف آنکھیں۔ کبھی یہ آنکھیں، اور یہ رخسار اور یہ ہونٹ مجھ سے بہت قریب تھے، بہت ہی زیادہ قریب۔ ملنگی ڈیرے کے وہ شب و روز جو ہم نے ایک چھت تلے اکٹھے گزارے تھے، ہمیشہ کے لیے میرے دل و دماغ پر نقش ہو چکے تھے۔ میں وہ رات کیسے بھول سکتا تھا جب "تاریک بند خانے" میں وہ میرے بالکل قریب موجود تھی، اچانک کہیں بالکل پاس سے پالتو چیتوں کی لرزہ خیز آواز سنائی دی تھی۔ تاجور خوف زدہ ہو کر میرے ساتھ آ لگی تھی۔ میری بانہوں میں سما گئی تھی اور پھر بعد کے دنوں میں اس ریشمی اندھیرے میں چھوٹے چھوٹے کئی خوش رنگ پھول کھلے تھے، کئی دلنواز لمحے چہکے تھے لیکن آج ان آنکھوں، ان رخساروں اور ان ہونٹوں سے میرا فاصلہ لامتناہی تھا۔ شاید پاٹا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ تاجور کی نگاہیں بھی جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھیں...... ہاں ہمیں بھی وہ سب یاد ہے لیکن اب اس کی یاد سے دل دکھنے کے سوا اور کیا حاصل؟

میں نے کہا۔ "تاجور! میرا باہر جانا ضروری ہے۔ اگر تم اکیلی نہیں رہ سکتیں تو ساتھ آجاؤ۔"

وہ باہر بھی نکلنا نہیں چاہتی تھی لیکن پھر اس نے جیسے ایک دم فیصلہ کیا اور اپنی چادر کی طرف بڑھی۔ اس نے خود کو سرتاپا چادر میں ڈھانپا۔ بس اس کی آنکھیں اور پیشانی ہی نقاب سے باہر تھی۔ ہم سیڑھیوں کے ذریعے نیچے آئے اور ہوٹل کے عقب میں واقع شاپنگ مال میں چلے گئے۔

شاپنگ مال سے واپس آ کر ایک بار پھر تاجور کے اہلِ خانہ کا انتظار شروع ہوا۔ تاجور کے والدین کو میری طرف سے کئی جذباتی دھچکے پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ میں کئی ماہ گونگا بن کر ان کی ملازمت کرتا رہا اور ان کے گھر میں بھی آتا جاتا رہا تھا مگر جہاں میری وجہ سے

انہیں صدمے پہنچے تھے وہاں کچھ چھوٹی موٹی راحتیں بھی ملی تھیں۔ میں نے ایک مرتبہ تاجور کو سجاول کے کارندوں سے بچایا تھا اور دوسری مرتبہ تاجور کے چھوٹے بھائی اسفند کو برستی گولیوں میں چاند گڑھی کے ایک کنویں سے نکالا تھا۔ ان صدموں اور ان راحتوں کی فہرست طویل تھی۔

آخر وہ گھڑی آئی جب تاجور کے ابا جی، اس کی والدہ اور دونوں چھوٹے بھائی میرے سامنے تھے۔ راحیل اور اسفند میری ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ تاجور کی والدہ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا تاہم دین محمد صاحب نے ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔ وہ گم صم نظر آتے تھے لیکن ان کا حلیہ کافی بدلا ہوا تھا۔ کچھ شہری رنگ ڈھنگ دکھائی دے رہا تھا۔ بوسکی رنگ کی اچکن کے نیچے انہوں نے سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی، پگڑی بھی نفیس تھی۔ راحیل اور اسفند بھی نیکر شرٹ میں نظر آرہے تھے۔ وہ سب تاجور کے گلے لگ کر ملے۔ وہ سسکنے لگی۔ ان کی ذاتی گفتگو میں مخل ہونے کے بجائے میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

وہ رات ہم نے ہوٹل میں ہی گزاری۔ بہرحال اب فرق یہ تھا کہ چار بیڈ کا ایک اور کمرا لے لیا گیا تھا۔ تاجور اور اس کے اہلِ خانہ اس کمرے میں منتقل ہو گئے تھے۔ تاجور کے والد اور والدہ پہلے سے زیادہ غم زدہ نظر آرہے تھے۔ والدہ کی تو رو رو کر آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ وجہ ظاہر تھی تاجور نے انہیں سیف کی ناگہانی موت کے بارے میں بتایا تھا۔ (بہرحال میں نے تاجور کو تاکید کر رکھی تھی کہ ابھی فی الفور سیف کے اہلِ خانہ کو کچھ نہیں بتایا جائے)

علی الصباح ہم بذریعہ اسٹیشن ویگن سکھیرا گاؤں کے لیے روانہ ہوئے۔ کرائے کی اس ویگن پر یہ ایک طویل اور بوجھل سفر تھا۔ میری موجودگی میں کوئی بھی زیادہ بات نہیں کر رہا تھا۔ صرف راحیل اور اسفند تھے جو کچھ بے تکلفی دکھا رہے تھے۔ ان کے لیے بے حد حیرانی کی بات تھی کہ ان کے گونگے انکل نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ اس حوالے سے تاجور نے انہیں پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ چند ماہ پہلے "انکل کا آپریشن ہوا ہے جس کے بعد ان کی گویائی بحال ہو چکی ہے۔ دونوں بچے اس بات پر بھی حیران تھے کہ میں اتنا عرصہ اوجھل رہنے کے بعد پھر نمودار ہو گیا ہوں۔ وہ میرے سر کے چھوٹے چھوٹے بالوں پر بھی خصوصی دھیان دے رہے تھے۔

راحیل اور اسفند کو میری باتیں بڑی دلچسپ لگ رہی تھیں۔ میرا بولنا ان کے لیے بڑی انوکھی چیز تھی۔ اب مجھے

مقامی لب و لہجے پر بھی کافی عبور حاصل ہو چکا تھا۔ سال ڈیڑھ سال پہلے میرے لہجے میں جو انگلش کا ٹچ پایا جاتا تھا وہ اب نہیں تھا۔ میں اپنی گفتگو میں پنجابی لفظ بھی آسانی سے استعمال کرتا تھا۔ مجھے بھی کبھی پنجابی فقرہ بولنا اچھا لگتا تھا۔ شاید اس کی وجہ بھی کہیں تاجور سے ہی جڑی ہوئی تھی۔

گجرات سے ہوتے ہوئے ہم لالہ موسیٰ پہنچے۔ لالہ موسیٰ کے مضافات سے ہمارا رخ سکھیرا گاؤں کی طرف ہوا۔ (ہم اسی پیٹرول پمپ کے پاس سے گزرے جہاں سے ایک مرتبہ میں اور تاجور موٹر سائیکل پر سکھیرا روانہ ہوئے تھے) بالآخر ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

یہ شام کا وقت تھا۔ سورج نے مغربی افق کو سرخ کر رکھا تھا۔ درختوں پر چڑیوں اور دیگر پرندوں کا شور تھا، کھیتوں کھلیانوں کی خوشبو نتھنوں میں گھس رہی تھی، ٹیوب ویل کی آواز کے پس منظر میں مویشیوں کی گھنٹیاں کانوں میں جلترنگ بجا رہی تھیں۔ یہ در و دیوار میں نے پہلے بھی دیکھ رکھے تھے مگر تاجور سمیت کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں ایک بار چوری چھپے، صرف اسے دیکھنے کے لیے یہاں آ چکا ہوں۔ باغ میں سہیلیوں کے جھرمٹ میں تاجور کا جھلملاتا چہرہ آج بھی ذہن پر نقش تھا (یہ اور بات ہے کہ میرا یہاں آنا کسی کے لیے بہت برا شگون ثابت ہوا تھا۔ میری مراد سیف سے ہے)

ہم اس بلند چار دیواری کے قریب سے گزرے جہاں ایک احاطے میں سیف اور اس کے دوستوں سے میری جھڑپ ہوئی تھی۔ ساری تلخ و شیریں باتیں ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ سکھیرا کافی بڑا گاؤں تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ گاؤں میں چودھری دین محمد کی کافی عزت بھی بن چکی ہے۔ ان کی اور اہلِ خانہ کی واپسی پر ہر کسی نے خوشی کا اظہار کیا۔ تاجور کے بارے میں یقیناً یہی سمجھا جا رہا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ اسلام آباد میں تھی اور وہیں سے واپس گاؤں آئی ہے۔ مقامی لوگ اس لیے بھی دین محمد صاحب اور ان کے گھرانے کو خصوصی اہمیت دے رہے تھے کہ وہ لوگ ایک بااثر سیاسی شخصیت کے بلاوے پر اسلام آباد گئے تھے اور وہاں ڈھائی تین ماہ مہمان بنے تھے۔

مجھے سکھیرا میں کوئی نہیں جانتا تھا، سوائے ان چند لڑکوں کے جن سے میری مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ ان میں سے بھی کوئی مجھے دکھائی نہیں دیا۔ میرے لیے دین محمد صاحب کے ڈیرے پر سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔ چودھری دین محمد چاند گڑھی کی ہر چیز اور ہر ''تعلق'' کو چاند گڑھی میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ ان کے ڈیرے کے سارے ملازم بھی نئے ہی تھے۔ کوئی مجھے جانتا نہیں تھا۔ ان کے نزدیک میں ایک عام شخص تھا اور دین محمد کی فیملی کے ساتھ اسلام آباد سے واپس گاؤں پہنچا تھا۔ میں نے ڈیرے پر موجود دو ملازموں کو اپنا نام شاہ زیب ہی بتایا۔ میرا خیال تھا کہ صبح ناشتے کے وقت گھر سے کوئی ملازم یا ملازمہ آئے گی اور مجھے گھر بلا لیا جائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ایک تنومند ملازمہ آئی تو ضرور لیکن مجھے بلانے نہیں بلکہ ایک طشتری میں میرا کھانا لے کر۔ کھانا پُرتکلف تھا لیکن یوں ڈیرے پر کھانا بھیج کر دین محمد صاحب نے اپنی سرد مہری کا واضح اظہار کیا تھا۔

مجھے پتا تھا کہ تاجور کے علاوہ دونوں بچے راحیل اور اسفند بھی مجھے گھر میں دیکھنا چاہتے ہوں گے لیکن گھر کے سربراہ کی مرضی کے خلاف چلنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ ناشتے کے بعد میں چہل قدمی کرتا ہوا گاؤں کے مرکزی حصے میں آ گیا۔ چاند گڑھی جیسے سارے مناظر یہاں بھی موجود تھے۔ کچے پکے گھر، دیواروں پر اپلے، گھروں کے وسیع و عریض صحنوں میں کیکر، نیم اور بیری کے درخت۔ کچی گلیوں میں دوڑتے بھاگتے بچے۔ میں شلوار قمیص میں تھا۔ میرے سر کے بال جو نمبر بچر میں جرم ہونے کے بعد مونڈ دیے گئے تھے اب پھر آدھ پون انچ لمبے ہو چکے تھے۔ گاؤں کے کئی لوگوں نے اور کچھ عورتوں لڑکیوں نے بھی مجھے توجہ سے دیکھا...... جیسے گاؤں میں وارد ہونے والے کسی بھی اجنبی کو دیکھا جاتا ہے۔

اچانک ایک جانب سے ایک نوجوان لڑکا تیزی سے آگے بڑھا۔ ''اسلام علیکم'' اس نے کہا اور اپنے دونوں ہاتھ میری طرف مصافحے کے لیے بڑھائے۔

میں نے ذرا غور کیا اور اسے پہچان لیا۔ کڑھائی دار شلوار کرتے والا یہ لڑکا بھی ان میں شامل تھا جنہوں نے چند ماہ پہلے اسی گاؤں کے ایک بند احاطے میں مجھ سے مار اماری کی کوشش کی تھی۔ انہیں ہرگز معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک ''سخت حریف'' کے سامنے آ گئے ہیں۔

''آپ شاہ زیب ہی ہیں ناں؟'' لڑکے نے بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔

''تم نے ٹھیک پہچانا ہے بھائی۔''

''سیف بھی آیا ہے؟'' لڑکے نے اشتیاق سے پوچھا۔

''سیف؟'' میں نے کہا۔

''اس نے بتایا تھا کہ وہ آج کل آپ ہی کے ساتھ

ہے۔اس کا فون آیا تھا کچھ ہفتے پہلے۔اس نے گھر میں تو یہی بتایا ہوا تھا کہ وہ بہاولپور میں ہے......لیکن مجھے پتا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ پاکستان سے باہر ہے۔وہ آپ کا مرید ہے جی......اور لگتا ہے کہ ہمیشہ رہے گا۔'' اپنی بات ختم کر کے وہ پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔آنکھوں میں وہی سوال تھا کہ سیف میرے ساتھ آیا ہے یا نہیں؟

میں نے کہا۔''کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کچھ فاصلے پر ٹیوب ویل کے نزدیک بچھی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''سیف تو ابھی نہیں آیا۔ وہ وہیں برونائی میں ہے۔اسے ایک اچھی ملازمت ملی ہوئی ہے۔ابھی چھٹی نہیں ملی، جونہی ملے گی آجائے گا۔''

''زبردست جی، لیکن کر کیا رہا ہے؟''

''وہاں ایک سیکیورٹی ایجنسی کی جاب ہے۔یونیفارم ملی ہوئی ہے۔گن ہے، بڑا ٹھاٹ ہے اس کا۔لیکن یہ باتیں ابھی اپنے تک ہی رکھنی ہیں۔''

''آپ فکر نہ کریں جی۔نظر بندے کی ترقی کو کھا جاتی ہے۔ میرا نام صدیق ہے۔ ہم دونوں ایک دوجے کے لنگوٹیے یار ہیں۔اس کے برونائی جانے والی بات بھی بس میرے اور اس کے بیچ میں ہی ہے۔وہ کہتا تھا کہ وہاں سے ٹیلی فون بڑی مشکل سے ملتا ہے پھر بھی ایک دو بار اس نے مجھی کو فون کیا ہے۔''

میں نے کہا۔''سیف نے گھر والوں کے لیے کچھ چیزیں بھجوائی ہیں، ان کو دینی ہیں۔''

''آپ ٹھہرے کہاں ہوئے ہیں؟'' صدیق نے پوچھا۔

''چودھری دین محمد صاحب کے گھر میں، بلکہ ان کے ڈیرے پر۔ یہ اسلام آباد سے گاؤں آرہے تھے، میں لاہور سے آرہا تھا۔راستے میں ملاقات ہوئی اور میں ان کے ساتھ ہی یہاں پہنچ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے ڈیرے سے وہ سامان اٹھایا جو سیف کے گھر والوں کے لیے لے کر آیا تھا اور صدیق کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل دیا۔دل پر بھاری بوجھ تھا۔ میں سچ بولنا چاہتا تھا لیکن ابھی شاید اتنے ''بڑے سچ'' کے لیے موقع مناسب نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سیف کے گھر میں اس کی والدہ اور والد کے علاوہ تین چھوٹی بہنیں ہیں، وہ ان بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور وہ اپنے بھائی کے سر پر سہرا سجانے کے لیے گن گن کر دن گزار رہی تھیں۔ہم سیف کے دروازے پر پہنچے۔ یہ ایک درمیانے درجے کے زمیندار کا کشادہ اور پختہ گھر تھا۔صدیق نے دروازے پر دستک دی۔دوسری تیسری دستک پر ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی نے دروازہ کھولا اور ہمیں اپنے سامنے دیکھ کر جلدی سے گھونگھٹ نکال لیا۔

صدیق بولا۔''شازیہ بہن، یہ بہاولپور سے آئے ہیں۔سیف کے ساتھ ہی کام کرتے ہیں۔''

سیف کا نام سن کر لڑکی چونکی۔اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے مجھے دیکھا اور سلام کرنے کے بعد تیزی سے اندر لپک گئی۔کچھ دیر بعد پچاس پچپن سال کی ایک قدرے فربہ خاتون دروازے پر آئی۔اس نے سر پر چادر لے رکھی تھی۔ چہرے پر اجلاپن تھا۔اس نے میرے سر پر پیار دیا۔ مجھے اور صدیق کو اندر صحن میں لے آئی۔ وسیع صحن میں ایک طرف ٹریکٹر کھڑا تھا۔ چند بکریاں بھی نظر آرہی تھیں۔ ہم برآمدے میں بچھی چارپائیوں پر آبیٹھے۔

بس اتنا سا چلنے سے ہی ادھیڑ عمر عورت کا سانس پھول گیا تھا وہ بولی۔''پتر! تم سیف کے بیلی (یار) ہو؟''

میں نے کہا۔''ہاں ماں جی، بہاولپور میں وہ میرے ساتھ ہی کام کرتا ہے۔وہاں ایک بیلے میں جنگل کی کٹائی کا کام ہو رہا ہے۔ ہم تین دوستوں نے مل کر ٹھیکا لے رکھا ہے۔''

''پر وہ آتا کیوں نہیں ہے۔اب تو کئی دنوں سے کوئی خط بھی نہیں آیا اس کا۔ڈیڑھ مہینا ہو گیا ہے۔بس ایک ٹیلی فون کیا تھا اس نے۔'' ادھیڑ عمر خاتون نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

''ہاں جی، وہاں فون کے سگنل بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔سگنل سمجھتی ہیں نا آپ؟''

آدھے گھونگھٹ کی اوٹ سے وہ شازیہ نامی لڑکی بولی۔''امی جی، بھائی بتا رہے ہیں کہ وہاں ٹیلی فون کی آواز نہیں آتی۔''

''پر اس نے تو کہا تھا کہ مہینے ڈیڑھ تک آجاؤں گا۔'' عورت نے بے تابی سے کہا۔میرا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔

میں نے کہا۔''میں کوشش کروں گا ماں جی کہ واپس جاتے ہی اسے آپ کے پاس بھیج دوں۔ یہ اس نے کچھ چیزیں بھیجی ہیں آپ سب کے لیے۔''

میں نے سامان لڑکی کو تھما دیا۔ وہ سامان لے کر دوسری چارپائی پر جا بیٹھی۔اندر سے دو اور لڑکیاں بھی نکل کر اس کے اردگرد بیٹھ گئیں۔ان میں سے ایک گھونگھٹ میں تھی

اور دوسری جو تیرہ چودہ سال کی ہوگی گھونگھٹ کے بغیر تھی۔

وہ بڑے اشتیاق سے چیزیں دیکھنے لگیں۔چھوٹی لڑکی بھاگتی ہوئی ماں کے پاس آئی اور بولی۔ ''امی جی، یہ دیکھیں آپ کا سوٹ......اور یہ دیکھیں چادر۔ہائے اللہ کتنی پیاری ہے۔''

اس نے چادر کھول کر ماں کو دکھائی، ماں نے دیکھا۔ اسے چوما اور سینے سے لگایا پھر وہ دیگر چیزیں دیکھنے لگی۔اس کی سانس اب بھی تیزی سے آجا رہی تھی۔ بڑی لڑکی ایک گلاس میں پانی اور دوا لے کر آگئی۔ ماں نے دوا کھائی اور ایک بار پھر مجھ سے سیف کے بارے میں سوال جواب کرنے لگی۔

میں جانتا تھا کہ سیف کی والدہ شفقت بی بی کا بائی پاس ہو چکا ہے۔انہیں اتنی خوفناک خبریں یوں ہی نہیں دی جا سکتی تھی......مگر زیادہ دیر چھپائی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ میں نے ان تک یہ اطلاع پہنچانے کے لیے ایک پروگرام بنا رکھا تھا۔میں ان کے پاس بیٹھا رہا، ان کی دلجوئی کی باتیں کرتا رہا۔اسی دوران میں سیف کے والد بشیر صاحب بھی آگئے۔ تاجور کے والد دین محمد کی طرح وہ بھی ایک درمیانے درجے کے زمیندار تھے۔ سیف کے حوالے سے وہ بھی کچھ الجھن میں نظر آتے تھے۔

وہ بولے۔ ''سخت غیر ذمے دار اور لاابالی لڑکا ہے۔ دو تین ہفتوں کا کہہ کر گیا تھا، اب دیکھو مہینے ہو گئے ہیں۔ ان دنوں تو اس کے ویاہ کی تیاری ہو رہی ہوتی تھی۔لڑکی کے گھر والے علیحدہ پریشان ہیں۔اب تو وہ اسلام آباد سے بھی آگئے ہیں۔انہوں نے زور ڈالنا ہے کہ جلد سے جلد دن مقرر کیے جائیں۔''

میں نے چودھری بشیر کو بھی وہ ساری باتیں بتائیں جو والدہ شفقت کو بتائی تھیں۔ وہ بولے۔ ''تم کب واپس جارہے ہو بہاولپور؟''

''آ......ابھی تو ٹھیک سے پتا نہیں، چند دن تو لاہور میں رہوں گا چاچا جی۔''

''تم واپس جاؤ تو مجھے ساتھ لے جاؤ، وہ وہاں بیٹھ کر ناراضگیاں دکھا رہا ہے مجھ کو...... پتا نہیں پیو سے معافی منگوانا چاہتا ہے۔تو ٹھیک ہے مانگ لیتے ہیں معافی۔ دونوں میاں بیوی مانگ لیتے ہیں۔'' چودھری بشیر کی آواز بھرا گئی۔

''نہیں چاچا جی ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔

''جب جوان پُتر بیکار پھرتا ہو تو ماں پیو کا سمجھانا تو فرض بنتا ہے نا؟ بس ایک دو بار تھوڑا سمجھایا ہی ہے نا میں نے۔'' چودھری بشیر نے بوجھل آواز میں کہا۔

یہاں آکر میرے دل کا بوجھ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ میں نے سیف کے گھر والوں کو بتایا کہ ابھی ایک دو روز میں چودھری دین محمد کا مہمان ہوں مگر چودھری بشیر نے اصرار کیا کہ میں ان کے ہاں رہوں۔انہوں نے اسی وقت اپنے گھر کی بیٹھک میرے لیے ٹھیک کرا دی اور سیف کے دوست صدیق سے کہا کہ وہ میرا سامان ڈیرے سے اٹھا کر گھر لے آئے۔

میں نے پہلے تو انکار کیا، پھر کہا کہ میں دین محمد صاحب کا شکریہ ادا کر آؤں، اور اس کے ساتھ ڈیرے سے سامان بھی لے آتا ہوں۔

میں صدیق کے ساتھ ڈیرے پر پہنچا تو وہاں پہلے ہی ناشتا لانے والی تنومند ملازمہ موجود تھی۔ وہ برتن لینے آئی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ وہ پیغام دے رہی تھی کہ دین محمد صاحب مجھے گھر بلا رہے ہیں۔ انہوں نے کوئی بات کرنی ہے۔

میں دین محمد کی ملازمہ کے ساتھ ان کے گھر پہنچا۔ میں یہاں سکھیرا گاؤں میں پہلی بار دین محمد صاحب کا گھر دیکھ رہا تھا۔ ملازمہ نے مجھے باہر کھڑا کیا اور پھر بیٹھک کا دروازہ کھول کر اندر بلا لیا۔ بیٹھک اندر سے اچھی طرح سجی ہوئی تھی۔ صوفے، پردے اور دیہاتی انداز کی رنگین پایوں والی کرسیاں۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیٹھک سے آگے کافی کشادہ صحن تھا اور گھر کے باقی کمرے صحن کی دوسری سمت تھے۔ صحن سے راحیل اور اسفند کی آوازیں آرہی تھیں وہ شاید صحن میں ہی کرکٹ کھیل رہے تھے۔ میرا دل انہیں دیکھنے کو چاہتا تھا، خاص طور سے چھوٹے اسفند کو۔ اس کو بھی مجھ سے بہت انس تھا۔

کچھ دیر بعد بیٹھک کا اندرونی دروازہ کھلا اور دین محمد صاحب اندر آگئے۔ میں نے اٹھ کر مصافحہ کیا۔ انہوں نے بے دلی سے ہاتھ ملایا اور بوجھل لہجے میں بولے۔ ''سیف کی موت ہم سب کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس کے گھر والوں تک یہ اطلاع کیسے پہنچائیں۔اس کی ماں تو مر جائے گی۔''

''میں اس کی ماں سے مل کے آیا ہوں جی۔ ان کی حالت واقعی ایسی نہیں کہ انہیں اتنی بڑی خبر دی جائے۔ ہاں اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو اس کے والد اور باقی گھر والوں کو مناسب طریقے سے بتایا جاسکتا ہے۔ یا ایسا کیا جائے کہ پہلے ان لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کیا جائے، اس کی بیماری

وغیرہ کی اطلاع دی جائے۔‘‘
دین محمد صاحب کے تاثرات سے ظاہر ہوا کہ وہ میری باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے اس کے برعکس ان کی آنکھوں میں میرے لیے بیگانگی اور غصے کی جھلک تھی، بولے۔ ’’ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ یہ سب کیا ہوا ہے اور کس طرح؟ میری بیٹی تو یہی بتا رہی ہے کہ یہ سب کچھ اتفاقیہ ہوا۔ سیف سے تمہاری ملاقات ہوئی اور وہ تمہارے پیچھے پہلے لیّہ اور پھر برونائی چلا گیا۔ وہاں اس کی موت کیسے اور کس طرح ہوئی ہے یہ بھی ہمیں کچھ پتا نہیں۔‘‘
’’آپ میرے جسم پر یہ زخم دیکھ رہے ہیں۔ خدا گواہ ہے کہ میں بھی موت کے منہ میں جا کر واپس آیا ہوں۔ وہاں جو کچھ ہوا بہت ہولناک تھا۔ ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔‘‘
دین محمد بولے۔ ’’وہ تو خیر جوشیلا اور ناسمجھ تھا، تم تو نہیں تھے۔ دنیا دیکھی ہوئی ہے تم نے۔ بڑوں بڑوں کی عقل سے زیادہ عقل ہے تمہاری۔ جب تمہیں پتا چل گیا تھا کہ وہ میری بیٹی کا منگیتر ہے اور اس کے ویاہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں، تو پھر تم نے کیوں اپنے ساتھ جانے دیا اُسے؟ کیوں اسے ایک خطرناک ترین شہر میں لے کر گھس گئے؟‘‘
’’شاید آپ کو پتا نہ ہو، وہ یہاں بھی بہت خطرے میں تھا۔ لاہور کے ایک نامی گرامی بدمعاش کے ساتھ اس نے متھا لگایا ہوا تھا۔ یہاں بھی کسی وقت، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ باقی ہوتا وہی ہے جو اللہ کی مرضی ہوتی ہے جہاں تک آپ کی دوسری بات کا جواب ہے، آپ یقین کریں مجھے اس بات کا پتا بہت بعد میں چلا کہ وہ آپ کا ہونے والا داماد ہے۔‘‘
وہ غصے سے بولے۔ ’’میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری باتوں پر یقین کیسے کروں...... تم نے ہمارے گھر میں اپنا اعتماد کھویا ہوا ہے......‘‘
میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ’’میں اس بارے میں بہت شرمندہ ہوں چچا جان، میں یہاں حاضر ہی اس لیے......‘‘
’’چپ رہو۔‘‘ انہوں نے کرخت لہجے میں میری بات کاٹی۔ ’’مت کہو مجھے چاچا شاچا...... تمہارے منہ سے یہ چنگا نہیں لگتا۔ تم نے پہلے دن سے جھوٹ بولا ہے اور...... اب تک بول رہے ہو، بار بار دھوکا دے رہے ہو۔‘‘
’’آپ، صرف دو منٹ کے لیے میری گزارش سن لیں۔‘‘ میں نے عاجزی سے کہا۔
وہ گرجے۔ ’’مجھے کچھ نہیں سننا تم سے، جو شخص میری بیٹی کو ورغلانے کے لیے گونگا بن کر میری ملازمت کرتا رہا، پیدائشی جھوٹوں کی طرح فریب دیتا رہا، وہ سب کچھ کر سکتا ہے...... وہ میرے داماد کو بھی مار سکتا ہے۔ اس کی جان بھی لے سکتا ہے۔‘‘ دین محمد صاحب کی آواز بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھی۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔
میں نے کہا۔ ’’جناب! میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں اور اگر میں جھوٹا ثابت ہو جاؤں تو ہر سزا کے لیے بھی تیار ہوں اگر آپ......‘‘
’’تم اپنی بکواس بند ہی رکھو تو اچھا ہے۔‘‘ دین محمد صاحب نے ایک بار پھر طیش میں میری بات کاٹی اور گرج کر بولے۔ ’’تم ہمارے لیے ہمیشہ مصیبت اور نحوست ہی لائے ہو۔ تمہاری وجہ سے ہمیں چاند گڑھی چھوڑنا پڑا، اپنے باپ دادا کی قبروں سے دور ہونا پڑا لیکن تم نے ہمیں یہاں بھی چین نہیں لینے دیا۔ ہمارا جینا حرام کرنے کے لیے یہاں بھی آپہنچے۔ جو کچھ سیف کے ساتھ ہوا ہے اور جو کچھ میری بچی کے ساتھ ہوا ہے اس کے ذمّے دار صرف اور صرف تم ہو...... ہاں تم ہی ہو جس کی وجہ سے اتنے طاقتور لوگ میری بچی کے پیچھے پڑے ہیں۔ وہ ہمیں راتوں رات یہاں سے اٹھا کر اسلام آباد لے گئے۔ میری بچی کو پتا نہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ہمیں دن رات اس کے لیے تڑپایا اور اب اگر وہ واپس آئی ہے تو تم اب بھی اس کے ساتھ چمٹ کر یہاں پہنچ گئے ہو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے...... تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔‘‘ وہ غصے سے کانپ رہے تھے۔ میں پہلی مرتبہ انہیں اتنے طیش کی حالت میں دیکھ رہا تھا۔
وہ کھڑے ہو چکے تھے، میں بھی کھڑا ہو گیا۔ میری سمجھ میں اچھی طرح آرہا تھا کہ اس موقع پر کچھ کہنا سننا فضول ہے۔ وہ گرجتے چلے گئے۔ ’’ہماری حفاظت اللہ کرے گا۔ ہمیں کوئی ضرورت نہیں تمہاری حفاظت کی...... اور نہ میری بچی کو کوئی ضرورت ہے۔ جن عذابوں میں تم نے ہمیں ڈالا ہے ہم خود ہی ان کو جھل (جھیل) لیں گے۔ بس تم دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔‘‘ انہوں نے باقاعدہ مجھے دھکا دیا۔
تب تک بیٹھک کے اندرونی دروازے پر دستک ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس دستک کی وجہ یقیناً دین محمد صاحب کی بلند آواز ہی تھی۔ میں نم آنکھوں کے ساتھ گھوما اور بیٹھک سے نکل کر باہر گلی میں آگیا۔
میرے سینے میں شعلے سے بھڑک رہے تھے۔ یہ شعلے شکیل داراب کے لیے تھے۔ یہ وہی تھا جس نے اپنے سارے ذرائع استعمال کر کے تاجور کو ڈھونڈا تھا اور پھر یہاں سے اٹھا کر اسے ہزاروں میل دور جاماجی میں جا پہنچایا

تھا تاکہ اسے میرے خلاف استعمال کیا جاسکے۔ میری زبان کھلوانے کے لیے اسے ہر طرح کے تشدد کی چکی میں پیسا جائے۔ ایک بار پھر میری نگاہوں میں وہ ہولناک منظر گھومنے لگا جب مجھے ایل سی ڈی کی اسکرین پر تاجور پر تشدد کے مناظر دکھائے گئے تھے۔ وہ چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے گریبان کو گرہ دے رکھی تھی تاکہ برہنگی سے بچ سکے۔ نقاب پوشوں نے وہ گرہ کھول دی تھی...... اس سے آگے میں کچھ دیکھ نہیں پایا تھا......

اور اب اسی شکیل داراب کی بیوی خود کو بے قصور اور لاتعلق ظاہر کررہی تھی۔ وہ یہ بھی بتارہی تھی کہ شکیل داراب پاکستان میں نہیں ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ پاکستان میں ہے اور لاہور میں ہے۔ کل رات ہی داؤد بھاؤ سے فون پر میری بات ہوئی تھی۔ لاہور کا کون سا گوشہ تھا جو داؤد سے چھپا ہوا ہو۔ وہ لاہور کے اسرار و رموز اور اس کی گلی کوچوں کو اسی طرح جانتا تھا جس طرح جسم کا لہو، جسم کی شریانوں کو جانتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ شکیل داراب الیکشن جیتنے کے بعد سے صرف ایک مرتبہ پاکستان سے باہر گیا ہے۔ آج کل اس نے لاہور میں پکا پکا ڈیرا لگایا ہوا ہے...... اور اپنے دو کٹھ پتلی افراد کو صوبائی وزیر بنوانے کے چکر میں ہے۔ داراب خاندان کی خصوصیت یہی تھی کہ یہ لوگ براہِ راست سیاست میں آئے بغیر سیاست کرتے تھے۔

میں ابھی سکھیرا گاؤں میں کچھ دن رہنا چاہتا تھا۔ تاجور کے والدین سے اپنی سابقہ غلطیوں کی معافی مانگنا چاہتا تھا، اس کے علاوہ ایک ایسا ماحول پیدا کرنا چاہتا تھا کہ سیف کے گھر والوں کو سیف کی موت کی اطلاع دی جاسکے مگر دین محمد صاحب سے ملنے کے بعد اور اپنے لیے ان کا غم و غصہ محسوس کرنے کے بعد میں نے فوراً گاؤں چھوڑنے اور لاہور پہنچنے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

میری آنکھوں کے سامنے طیش کی سرخ چادر سی تنی ہوئی تھی۔ جب بندہ اپنے کسی دشمن سے ٹکر لینے کے لیے جاتا ہے تو اس کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی منصوبہ بھی ہوتا ہے اور جب دشمن بھی شکیل داراب جیسا طاقتور شخص ہو تو ہتھیار اور منصوبہ بندی مزید ضروری ہو جاتی ہے لیکن میرے پاس ان میں سے کوئی چیز نہیں تھی اور شاید مجھے ان کی زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ جب میں چاہوں گا، ہتھیار خودبخود میرے ہاتھ میں آجائے گا۔ آج بہت عرصے بعد میں خود کو پوری فارم میں محسوس کررہا تھا۔ مسافر بس تیزی کے ساتھ لاہور سے قریب تر ہوتی جارہی تھی۔ میرے سیل فون پر کال کا سگنل آیا مگر کالنگ نمبر نہیں آیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ کوئی بیرون ملک سے کال کی کوشش کررہا ہو۔ ایسے ہی کال سگنل کل بھی دو تین دفعہ آئے تھے لیکن آج میں نے بٹن دبایا تو کال ریسیو ہو گئی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ قسطینا کی آواز تھی۔ آواز کٹ کٹ کر آرہی تھی۔ ”ہیلو قسطینا، خیریت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

جواب میں اس نے جو کچھ کہا، اس سے پتا چلا کہ وہ تو خیریت سے ہے لیکن اسے کچھ ایسی معلومات ملی ہیں جو میرے لیے ٹھیک نہیں ہیں۔ اس نے بتایا کہ دو دن پہلے تک یہاں جاما جی میں کچھ لوگ مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ وہ سفید فام ہیں اور خاصے خطرناک ہیں۔ اب پتا چلا ہے کہ وہ میرے پیچھے پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ شاید قسطینا مزید تفصیل بتاتی مگر رابطہ منقطع ہوگیا۔ میرا دھیان فوراً ٹیکساری گینگ کی طرف گیا۔ ان کی آمد کسی بھی وقت متوقع تھی مگر یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ویسے بھی اس وقت میرے ذہن میں صرف شکیل داراب کے نام کی آندھی چل رہی تھی۔ یتیم خانے کے قریب بس سے اترتے ہی میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور گلبرگ کی طرف روانہ ہوگیا۔ شکیل داراب کی لاہور والی وسیع و عریض رہائش گاہ اسی علاقے میں تھی۔ مجھے پچانوے فیصد امید تھی کہ شکیل داراب اور اس کی مکار بیوی ”جے جی“ وہیں پر موجود ہیں۔ یقیناً وہاں پر سیکیورٹی کے وسیع انتظامات بھی موجود تھے اور ہوسکتا تھا کہ شکیل داراب میری طرف سے کچھ الرٹ بھی ہو۔ مگر مجھے پتا تھا کہ جب میں آگے بڑھوں گا تو راستہ خودبخود نکلے گا۔ سب سے پہلا مرحلہ یہی تھا کہ کسی بھی حیلے بہانے سے شکیل داراب کے رُوبرو ہوا جائے، پھر کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ بااثر اور طاقتور ترین شخص کی کنپٹی پر بھی جب پستول یا رائفل کی نال آجائے تو اس کی شان و شوکت اور سیکیورٹی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

میرے ذہن میں بس ایک آندھی سی تھی۔ سینے میں بس یہی آگ بھڑک رہی تھی کہ اس شخص نے میرے ساتھ کیے جانے والے ہر سمجھوتے کو بالائے طاق رکھا اور تاجور کے ”اغوا“ کی صورت میں مجھ پر کاری ترین وار کیا...... ہاں وہ ایک طرح کا اغوا ہی تو تھا۔

مجھے پتا تھا کہ شکیل داراب کی رہائش گاہ کے سامنے سیکیورٹی والے مجھے روک لیں گے۔ میرے پاس شکیل کا

پرائیویٹ سیل نمبر بھی موجود تھا۔ اس موقع پر وہ مجھے فائدہ دے سکتا تھا۔ ہتھیار کے نام پر میرے پاس فقط ایک تیز دھار چھری تھی جو میں نے یونہی ڈیرے سے اٹھا کر اپنے لباس کے نیچے رکھ لی تھی۔

ہماری ٹیکسی کار نے مزنگ چونگی سے ٹرن لیا اور جیل روڈ کی طرف مڑ گئی۔ ابھی ہم گلبرگ کے علاقے میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ اچانک ایک ہنڈا اکارڈ کار نے ہمیں اوورٹیک کیا۔ ٹنڈڈ شیشے والی کھڑکی تھوڑی سی کھلی اور کسی نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ میں چونک گیا۔ یہ کوئی اور نہیں لاہور کی زیرزمین دنیا کا بے تاج بادشاہ داؤد بھاؤ تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے مڑ کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''گاڑی روک دو۔''

اس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کی اور پھر اسے کنارے پر روک دیا۔ سفید رنگ کی ہنڈا اکارڈ بھی چند قدم آگے رک گئی۔ میں اس وقت داؤد بھاؤ کے ساتھ اس ملاقات پر ششدر تھا۔ کیا یہ ملاقات اتفاقیہ تھی یا پھر مجھے ٹریس کیا گیا تھا۔ تب ہنڈا اکاڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھلا اور میں نے انیق کو دیکھا۔ وہ سرخ رنگ کی ہاف سلیو شرٹ اور جین میں ملبوس تھا پاؤں میں جوگرز تھے۔ خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ سیدھا میری طرف آیا اور بولا۔ ''چلیں جناب! آپ اغوا ہو چکے ہیں۔''

''کس خوشی میں؟''

''لاہور میں داخل ہونے کی خوشی میں۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو؟''

وہ ہولے سے مسکرایا اور جیب سے کچھ روپے نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کو تھما دیے۔ غالباً یہ ضرورت سے کافی زیادہ تھے، ٹیکسی ڈرائیور متحیر رہ گیا پھر انیق مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تشریف لائیں، باقی باتیں گاڑی میں ہوں گی۔''

میں باہر نکل آیا اور چند قدم دور اس ہنڈا اکارڈ کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا جہاں داؤد بھاؤ بھی موجود تھا۔ داؤد بھاؤ کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے مجھ سے پُرجوش معانقہ کیا۔ انیق نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ انیق کے ساتھ اگلی سیٹ پر وہی شخص موجود تھا جسے ''جھارا'' کہا جاتا تھا۔ اپنے نام کے برعکس وہ ایک سوکھا سڑا شخص تھا لیکن اس کی سختی اور بے خوفی ہر شبہے سے بالاتر تھی۔ اس کی گود میں ''اے کے 57'' رائفل رکھی تھی جو یقیناً لوڈ ڈ تھی۔ اس نے ادب سے مجھے سلام کیا۔ اس دوران میں انیق گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔

''پیچھے نظر رکھو۔'' داؤد بھاؤ نے پاٹ دار آواز میں انیق کو حکم دیا۔

''یس باس۔'' وہ مستعدی سے بولا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں داؤد بھاؤ؟'' میں نے پوچھا۔

داؤد بھاؤ نے مجھے سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا۔ ''زیادہ دور نہیں۔ وہ سامنے ہی کرسٹل ہوٹل ہے۔ اُدھر بیٹھتے ہیں، پھر اس نے میرا کندھا دبا کر کہا۔ ''تمہارا پارا بہت چڑھا ہوا ہے۔ خود کو ریلیکسڈ کرو یار۔ زیادہ غصہ صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔''

میں جیسے لہو کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ کچھ دیر خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی، پھر کہا۔ ''آپ کو میری آمد کا پتا کیسے چلا؟''

''یہ لاہور ہے جن جی، یہاں سے جو بھی نکلتا.... ہے، داؤد بھاؤ کی نگاہ میں تو آتا ہی ہے۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

ہم ایک شاندار ہوٹل کے پورچ میں داخل ہو چکے تھے۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ داؤد بھاؤ کی گاڑی کے پیچھے ایک اور کار بھی ہے۔ اس میں بھی داؤد بھاؤ کے کارندے تھے اور یقیناً مسلح بھی رہے ہوں گے۔ ہم اتر کر اندر داخل ہو گئے۔ دربان نے شاید داؤد بھاؤ کو پہچان لیا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلا اور اس نے جھک کر خصوصی سلام کیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ لاہور کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ ہم ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے۔ ابھی ڈنر کا ٹائم بہت دور تھا۔ ہال کی بیشتر میزیں خالی تھیں۔ انیق اور ''جھارا پہلوان'' تو داخلی دروازے کے پاس ہی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ ان کا انداز پہرا دینے والا تھا۔ داؤد بھاؤ مجھے لے کر ایک نیم تاریک گوشے کی میز پر آ گیا۔ وہ پینٹ کوٹ میں تھا۔ کوٹ کے نیچے یقیناً بھرا ہوا پستل ہر وقت موجود رہتا تھا۔ اپنے چوڑے جبڑوں اور بھاری بھرکم آواز کے ساتھ وہ ہر لحاظ سے ایک دبنگ شخص دکھائی دیتا تھا۔ اتنے میں ہوٹل کا منیجر خود بھاگا بھاگا ہماری میز پر پہنچ گیا اور رکوع کے بل جھک کر داؤد بھاؤ سے مصافحہ کیا۔ وہ ہر قسم کی خدمت کے لیے بالکل تیار نظر آتا تھا۔ داؤد بھاؤ نے اسے بس دو سوفٹ ڈرنکس

بھجوانے کے لیے کہا اور کہا کہ ہم دونوں کچھ دیر تنہائی میں بیٹھنا چاہتے ہیں۔

داؤد نے رسمی انداز میں میرا حال احوال دریافت کیا۔ میرے ساتھی سیف کی موت پر دکھ کا اظہار کرنے کے بعد بولا۔ ”تم کہاں جارہے تھے۔ میرے آدمیوں نے بس اڈے پر ہی تمہیں دیکھ لیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ تم بڑے تناؤ میں نظر آتے ہو پھر جب تم ٹیکسی میں گلبرگ کی طرف روانہ ہوئے تو میں مزید چونک گیا۔ مجھے لگا کہ تم کو روکنا چاہیے۔“

”کیوں؟ آپ نے کیا سمجھا ہے؟“

اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھا۔ یہ ایک نہایت جہاندیدہ گینگسٹر کی جگر پاش نگاہیں تھیں۔ سگریٹ سلگا کر بولا۔ ”مجھے آج پتا چلا ہے کہ شدید غصے کے عالم میں تم جیسا بندہ بھی بے وقوفی کر سکتا ہے اور آج یہی بے وقوفی تمہیں کھینچ کر شاید شکیل داراب کی طرف لے جارہی ہے۔ اس نے تاجور کے حوالے سے جو کچھ تمہارے ساتھ کیا ہے، اس نے تمہارے دماغ میں کھولتا ہوا لاوا بھر دیا ہے اور میں اس کی لالی تمہاری آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں۔“

”آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے داؤد بھاؤ...... لیکن میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں اب رکوں گا نہیں، آج اس کی آنکھوں میں آنکھیں ضرور ڈالوں گا۔“

”یہ بالکل بیکار کی بات کر رہے ہو...... بالکل بیکار۔ تم اس کے سوا اور کچھ نہیں کرو گے کہ خوامخواہ اسے ہوشیار کر دو گے اور اپنے لیے کوئی بڑا سا گڑھا کھود لو گے۔ وہ آج کل جتنی سیکیورٹی میں ہوتا ہے، تم اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے اور یہ بات بھی مت بھولو کہ وہ بادشاہ نہ سہی لیکن بادشاہ گر ہے۔ بڑے لمبے ہاتھ پاؤں ہیں اس خبیث کے۔ شاید یہ بات بھی تمہارے ذہن سے نکلی ہوئی ہے کہ تمہارے چچا اور چچا کا ”قیدی بیٹا“ کسی بھی وقت شکیل کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ بلکہ چچا کا بیٹا ولید تو جیل میں ہے ہی شکیل کے رحم و کرم پر۔ شکیل سے کھل کر دشمنی کرو گے تو پچھتانا پڑے گا تمہیں۔ وہ کوئی لالہ نظام نہیں ہے جسے نیچا دکھا لو گے۔“

”تو آپ کا کیا خیال ہے۔ صبر کا گھونٹ بھر کر بیٹھ جاؤں۔ ایسے لوگوں کا منہ نہ توڑا جائے تو وہ ایک جگہ رکتے نہیں ہیں۔ کچھ دن بعد اس کا کوئی اس سے بھی بڑا کرتوت سامنے آجائے گا۔“

میرا خون میرے سر کی طرف یورش کر رہا تھا۔ دماغ کی نسیں بے طرح دھڑک رہی تھیں۔ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”میں تمہیں صبر کر کے بیٹھ جانے کا نہیں کہہ رہا۔ میں نے خود بھی ایسے ”صبر“ نہیں کیے ہیں۔ بہرحال ایک بات ہے۔ میں نے ان شکیل جیسے مال زادوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی ساری حرام زدگیاں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہیں شکیل کے وار کا سیدھا سیدھا جواب دینے کے بجائے پلاننگ سے کام لینا چاہیے اور جب یہ پلاننگ سے ہوگا میں بھی تمہارا پورا ساتھ دوں گا۔“

”آپ کس پلاننگ کی بات کر رہے ہیں۔ اگر اس کے ہاتھ لمبے ہیں تو پھر وہ دو چار ماہ میں چھوٹے تو نہیں ہو جائیں گے۔ ایسے ہاتھوں کو کاٹنا ہی پڑتا ہے۔“

”کاٹیں گے چن جی، کاٹیں گے لیکن کلہاڑے سے نہیں، ایسی تیکھی تلوار سے جو چلے گی لیکن چمک تک نظر نہیں آئے گی اس کی۔ شکیل کے خلاف ایک پرانا معاملہ پھر سے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ عورت کا چکر ہے تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“

سوفٹ ڈرنکس آگئے تھے۔ اس نے مجھے ٹھنڈا جوس پینے کا مشورہ دیا۔ وہ مجھے مسلسل سمجھا رہا تھا۔ وہ بڑا کائیاں گروہ باز تھا۔ پچھلے چالیس پینتالیس سال میں بہت سرد و گرم دیکھ رکھے تھے اس نے۔ اس نے مجھے بتایا کہ شکیل داراب اور داراب فیملی کے ایک مخالف سیاسی دھڑے نے ایک صحافی کی مدد سے شکیل کا ایک بڑا اسکینڈل پکے ثبوتوں کے ساتھ پکڑ لیا ہے۔“

”کچھ اشارہ دیں داؤد بھاؤ۔“ میں نے کہا۔

”اشارہ کیا دینا ہے، تمہیں بتا ہی دوں گا۔ بس تھوڑا سا انتظار کرو۔“

داؤد بھاؤ کی یہ بات بھی سمجھ میں آرہی تھی کہ میرا چچا زاد ولید، پولیس پارٹی پر باقاعدہ حملہ کرنے کے جرم میں ابھی تک جیل میں تھا اور اس کی سلامتی کے سارے راستے شکیل داراب کے آفس میں سے ہو کر گزرتے تھے پھر چچا جان تھے جو پہلے ہی اپنے گھر کی بربادی کے بعد گوشہ نشین اور خاموشی کی زندگی گزار رہے تھے، میری کسی کارروائی سے ان کی مصیبتوں میں ایک دم اضافہ ہو سکتا تھا۔

داؤد بھاؤ سے میری یہ ملاقات قریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ اس دوران میں انیق اور جھارا، ہال کے دروازے کے قریب مستعد اور چوکس بیٹھے رہے۔ داؤد کی آمد سے جیسے اس پورے ہوٹل میں سراسیمگی سی پھیلی ہوئی تھی۔

داؤد نے آخر میں مجھ سے کہا۔ ”میں ابھی اسلام آباد جارہا ہوں۔ پرسوں واپسی ہوگی۔ تم اڈے پر آجانا۔ تفصیل

بھوانے لیے کہا اور کہا کہ ہم دونوں کچھ دیر تنہائی میں بیٹھنا چاہتے ہیں۔

داؤد نے رسمی انداز میں میرا حال احوال دریافت کیا۔ میرے ساتھی سیف کی موت پر دکھ کا اظہار کرنے کے بعد بولا۔ ''تم کہاں جا رہے تھے۔ میرے آدمیوں نے بس اڈے پر ہی تمہیں دیکھ لیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ تم بڑے تناؤ میں نظر آتے ہو پھر جب تم ٹیکسی میں گلبرگ کی طرف روانہ ہوئے تو میں مزید چونک گیا۔ مجھے لگا کہ تم کو روکنا چاہیے۔''

''کیوں؟ آپ نے کیا سمجھا ہے؟''

اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھا۔ یہ ایک نہایت جہاندیدہ گینگسٹر کی جگر پاش نگاہیں تھیں۔ سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''مجھے آج پتا چلا ہے کہ شدید غصے کے عالم میں تم جیسا بندہ بھی بے وقوفی کر سکتا ہے اور آج یہی بے وقوفی تمہیں کھینچ کر شاید شکیل داراب کی طرف لے جا رہی ہے۔ اس نے تاجور کے حوالے سے جو کچھ تمہارے ساتھ کیا ہے، اس نے تمہارے دماغ میں کھولتا ہوا لاوا بھر دیا ہے اور میں اس کی لالی تمہاری آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں۔''

''آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے داؤد بھاؤ...... لیکن میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں اب رکوں گا نہیں، آج اس کی آنکھوں میں آنکھیں ضرور ڈالوں گا۔''

''یہ بالکل بیکار کی بات کر رہے ہو...... بالکل بیکار۔ تم اس کے سوا اور کچھ نہیں کرو گے کہ خوامخواہ اسے ہوشیار کر دو گے اور اپنے لیے کوئی بڑا سا گڑھا کھود لو گے۔ وہ آج کل جتنی سیکیورٹی میں ہوتا ہے، تم اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے اور یہ بات بھی مت بھولو کہ وہ بادشاہ نہ سہی لیکن بادشاہ گر ہے۔ بڑے لمبے ہاتھ پاؤں ہیں اس خبیث کے۔ شاید یہ بات بھی تمہارے ذہن سے نکلی ہوئی ہے کہ تمہارے چچا اور چچا کا ''قیدی بیٹا'' کسی بھی وقت شکیل کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ بلکہ چچا کا بیٹا ولید تو جیل میں ہے ہی شکیل کے رحم و کرم پر۔ شکیل سے کھل کر دشمنی کرو گے تو پچھتانا پڑے گا تمہیں۔ وہ کوئی لالہ نظام نہیں ہے جسے نیچا دکھا لو گے۔''

''تو آپ کا کیا خیال ہے۔ صبر کا گھونٹ بھر کر بیٹھ جاؤں۔ ایسے لوگوں کا منہ نہ توڑا جائے تو وہ ایک جگہ رکتے نہیں ہیں۔ کچھ دن بعد اس کا کوئی اس سے بھی بڑا کرتوت سامنے آ جائے گا۔''

میرا خون میرے سر کی طرف یورش کر رہا تھا۔ دماغ کی نسیں بے طرح دھڑک رہی تھیں۔ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''میں تمہیں صبر کر کے بیٹھ جانے کا نہیں کہہ رہا۔ میں نے خود بھی ایسے ''صبر'' نہیں کیے ہیں۔ بہرحال ایک بات ہے۔ میں نے ان شکیل جیسے مال زادوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی ساری حرام زدگیاں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہیں شکیل کے وار کا سیدھا سیدھا جواب دینے کے بجائے پلاننگ سے کام لینا چاہیے اور جب یہ پلاننگ سے ہوگا میں بھی تمہارا پورا ساتھ دوں گا۔''

''آپ کس پلاننگ کی بات کر رہے ہیں۔ اگر اس کے ہاتھ لمبے ہیں تو پھر وہ دو چار ماہ میں چھوٹے تو نہیں ہو جائیں گے۔ ایسے ہاتھوں کو کاٹنا ہی پڑتا ہے۔''

''کاٹیں گے چن جی، کاٹیں گے لیکن کلہاڑے سے نہیں، ایسی تیکھی تلوار سے جو چلے گی لیکن چمک تک نظر نہیں آئے گی اس کی۔ شکیل کے خلاف ایک پرانا معاملہ پھر سے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ عورت کا چکر ہے تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔''

سوفٹ ڈرنکس آ گئے تھے۔ اس نے مجھے ٹھنڈا جوس پینے کا مشورہ دیا۔ وہ مجھے مسلسل سمجھا رہا تھا۔ وہ بڑا کائیاں گروہ باز تھا۔ پچھلے چالیس پینتالیس سال میں بہت سرد و گرم دیکھ رکھے تھے اس نے۔ اس نے مجھے بتایا کہ شکیل داراب اور داراب فیملی کے ایک مخالف سیاسی دھڑے نے ایک صحافی کی مدد سے شکیل کا ایک بڑا اسکینڈل پکے ثبوتوں کے ساتھ پکڑ لیا ہے۔''

''کچھ اشارہ دیں داؤد بھاؤ۔'' میں نے کہا۔

''اشارہ کیا دینا ہے، تمہیں بتا ہی دوں گا۔ بس تھوڑا سا انتظار کرو۔''

داؤد بھاؤ کی یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی تھی کہ میرا چچا زاد ولید، پولیس پارٹی پر باقاعدہ حملہ کرنے کے جرم میں ابھی تک جیل میں تھا اور اس کی سلامتی کے سارے راستے شکیل داراب کے آفس میں سے ہو کر گزرتے تھے پھر چچا جان تھے جو پہلے ہی اپنے گھر کی بربادی کے بعد گوشہ نشین اور خاموشی کی زندگی گزار رہے تھے، میری کسی کارروائی سے ان کی مصیبتوں میں ایک دم اضافہ ہو سکتا تھا۔

داؤد بھاؤ سے میری یہ ملاقات قریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ اس دوران میں انیق اور جھارا، ہال کے دروازے کے قریب مستعد اور چوکس بیٹھے رہے۔ داؤد کی آمد سے جیسے اس پورے ہوٹل میں سراسیمگی سی پھیلی ہوئی تھی۔

داؤد نے آخر میں مجھ سے کہا۔ ''میں ابھی اسلام آباد جا رہا ہوں۔ پرسوں واپسی ہوگی۔ تم اڈے پر آ جانا۔ تفصیل

سے بات کریں گے۔ اب تم کہیں اور نہ جاؤ۔ یہیں اس ہوٹل میں رہو۔ اپنے اس مغوی (انیق) کو بھی اپنے ساتھ رکھو۔ میں تمہارے لیے فرسٹ فلور پر پورا سوئٹ بک کرا دیتا ہوں۔" میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے چٹکی بجائی۔ اسسٹنٹ منیجر بھاگا بھاگا آیا۔ داؤد بھاؤ نے اسے فوراً ایک بہترین سوئٹ بک کرنے کی ہدایت کی۔ میں عذر کرنا چاہ رہا تھا مگر اس نے مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور انیق ہوٹل کے شاید سب سے اچھی لوکیشن والے آرام دہ سوئٹ میں موجود تھے۔ دیوار گیر کھڑکیوں سے نیچے سوئمنگ پول کا شاندار منظر نظر آ رہا تھا۔ جل پریاں مختصر ترین لباسوں میں دعوتِ نظارہ دیتی تھیں اور لگتا تھا کہ یہ خوش نمائی صرف دیکھنے کی حد تک نہیں ہے۔ "حوصلہ زیادہ" ہو تو آگے تک جایا جا سکتا ہے۔ یہ وہی یورپین اسٹائل تھا جو اب یہاں بھی سپر اسٹار ہوٹلوں میں دکھائی دیتا تھا۔

چالیس پینتالیس سالہ ایک سفید فام شخص تیس پینتیس سال کی ہم قوم خوبرو خاتون کو اپنے ساتھ لگائے، پول کے کنارے چہل قدمی کر رہا تھا۔ دونوں ہی واجبی ترین لباس میں تھے۔ انیق نے دونوں کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ "آپ کے امریش پوری عرف پربت سنگ عرف سجاول سیالکوٹی کا خیال آ گیا۔ اس کے اندر کی خباثت نے اس کی بیڑیوں میں وٹے ڈال دیے، ورنہ جاما جی کی وہ حسین خاتون ایسی سنگ دل بھی نہیں تھی۔ اگر وہ اسے یوں بری طرح نہ دھتکارتی تو ہوسکتا ہے اس وقت وہ بھی اس خوش باش جوڑے کی طرح کہیں چہلیں کر رہا ہوتا۔ آہ بے چارہ۔"

انیق نے اپنی آنکھوں میں باقاعدہ آنسو بھر لیے۔ پورا ڈرامے باز تھا۔ میں نے کہا۔ "میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں، سجاول کے بارے میں کتنے دکھی ہو تم۔ تمہارے بس میں ہوتا تو جہاز میں ہی ناچنا شروع کر دیتے کہ خورسنہ اس کے ساتھ نہیں آئی۔"

"آپ مجھے کبھی نہیں سمجھیں گے۔ دراصل مجھے کوئی بھی نہیں سمجھتا۔ میرے دل میں محبت کا ایک سمندر بہہ رہا ہے جو قراقرم سے بھی بڑا ہے۔"

"اور قراقرم کسی سمندر کا نہیں پہاڑ کا نام ہے۔" میں نے اس کی پسلیوں میں ٹانگ رسید کی۔ وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ سرخ چہرے کے ساتھ کراہا۔

"مم...... مجھے لگتا ہے کہ آپ نے میرا "لیور" پھاڑ ڈالا ہے۔ اُف...... آہ......"

"یہاں جگر نہیں، دل ہوتا ہے۔"

"دل ہی تو نہیں ہے میرے پاس۔ اگر ہوتا تو اب تک کسی کو دے نہ چکا ہوتا۔ یہاں بائیں بغل کے نیچے جگر ہے میرا۔ تبھی تو کہتا ہوں کہ مجھے آج تک کوئی سمجھ نہیں سکا...... بھولی ہوئی ہوں داستاں گزرا ہوا خیال ہوں۔ جس کو نہ تم سمجھ سکے......"

اچانک انیق کو بریک لگ گئے۔ نیچے کہیں سے یکے بعد دیگرے تین فائر سنائی دیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انیق کے فون پر سگنل آئے۔ اس نے کال ریسیو کی۔ یہ مختار جھارا تھا جو اپنے چند ساتھیوں سمیت ہمارے اردگرد ہی موجود تھا۔ وہ چلایا۔ "انیق! گڑبڑ ہے۔ کچھ لوگ اندر گھس آئے ہیں۔ چہرے نقابوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔"

اسی دوران میں ایک برسٹ چلا۔ میں اور انیق لپک کر سوئٹ کے اندرونی ٹیرس پر پہنچے۔ اس بالکونی نما جگہ پر کھڑے ہو کر ہم ہوٹل کا داخلی راستہ دیکھ سکتے تھے۔ یہ وہ راستہ تھا جو چھ منزلہ ہوٹل کے اندرونی باغیچے سے ہوٹل میں داخل ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا نیچے افراتفری دکھائی دے رہی تھی۔ ایک باوردی دربان خون میں لت پت ایک فوارے کے قریب پڑا تھا۔ شاید یہ وہی ہو جس نے سرِشام اس وقت ہمیں جھک کر خصوصی سلام کیا تھا جب میں اور داؤد بھاؤ اندر داخل ہوئے تھے۔ میں نے دو نقاب پوشوں کو دیکھا، وہ ایک کمرے کے اندر سے نکلے اور دوڑتے ہوئے ہوٹل کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ یقیناً ان کے کچھ ساتھی پہلے ہی اندر آ چکے تھے۔ ان دونوں نقاب پوشوں نے سیاہ رنگ کے نہایت چست لباس پہن رکھے تھے۔ اس لباس کے نیچے نہایت پتلی پرت والی بلٹ پروف جیکٹس بھی یقیناً موجود تھیں۔ ان کے اسکائی نقاب بھی ڈارک گرے تھے اور لباس کی طرح سیاہ ہی دکھائی دیتے تھے۔ ان دونوں نقاب پوشوں کو دیکھتے ہی زمین و آسمان کا قلابہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ مجھے لگا کہ میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت ٹھہر گئی ہے اور میں بے جان ہو کر ہوا میں معلق ہو گیا ہوں۔ قسطینا کی ادھوری فون کال کی بازگشت کانوں میں گونجنے لگی۔

...... ہاں وہ آ گئے تھے، جن کی آمد کے بدترین اندیشے شام و سحر میرے ذہن کو جکڑے رکھتے تھے...... ہاں وہ آ گئے تھے...... جنہوں نے مجھ سے موت کا وعدہ کر رکھا تھا اور اس وعدے کو ایفا کرنے کے لیے شب و روز کوشاں

تھے۔

...... یہ ٹیکساری گینگ تھا۔ یہ وہ بے رحم قاتل تھے جو صرف لڑنے مرنے کے لیے ہی پیدا ہوتے تھے اور جیتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ خون بہانے والی مشینیں تھیں...... نہ ان کے ماں باپ تھے، نہ بہن بھائی، نہ بچے، انہیں بس اس حوالے سے انسان کہا جا سکتا تھا کہ وہ انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے، سوتے جاگتے تھے اور عورتوں کے ساتھ تعلقات رکھتے تھے۔ یہ ٹیکساری گینگ کا وہ انوکھا ''ونگ'' تھا جو انڈر ورلڈ میں دہشت و بربریت کی علامت تھا۔ اس کو یار لوگوں نے ڈیتھ اسکواڈ کا نام دے رکھا تھا۔ اس میں چند عورتیں بھی شامل تھیں۔ اس اسکواڈ کا ہر فرد دورِ حاضر کا ہلاکو تھا۔ اس ڈیتھ اسکواڈ کی تفصیل میں آگے جا کر بیان کروں گا۔ فی الحال تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں یکایک ایک مہلک طوفان کی زد میں آ گیا تھا اور چند لمحے کے سکتے کے بعد میری تمام حسیات بیدار ہو کر صرف ایک ہی بات پر فوکس کر رہی تھیں کہ مجھے اپنی اور انیق کی جان کس طرح بچانی ہے۔

مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ عمارت میں داخل ہونے کے بعد وہ لوگ میرے ہی سوئٹ کی طرف لپک رہے ہوں گے۔

''یہ کون ہیں؟'' انیق نے پوچھا۔

''وہی جن کے بارے میں جاماجی سے اطلاع آئی تھی۔ ہمیں نکلنا ہوگا یہاں سے۔ تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟''

''جی جناب! ایک بریٹا پسٹل اور دو بھرے ہوئے فالتو میگزین۔'' انیق جوش سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''ہمیں کھڑکی کی طرف سے نکلنا ہوگا۔'' میں اسے لے کر کھڑکی کی طرف بڑھا۔

وہ بولا۔ ''جناب! ایسا تو تب کرتے ہیں جب کمرے میں کوئی ''ناجائز لڑکی'' ہو، یہاں تو ہم دونوں شریف زادے ہیں۔''

میں نے اس کی سنی ان سنی کی، وہ ابھی جانتا نہیں تھا کہ کتنی بڑی مصیبت میں پھنس چکا ہے۔ ہم نے شیشے کی دیوار گیر کھڑکی کا ایک شیشہ سلائڈ کیا اور باہر کے چھ سات انچ چوڑے کارنس پر قدم جما کر بائیں جانب کھسکنے لگے۔ ابھی ہم آٹھ دس فٹ دور ہی گئے ہوں گے کہ عین ہمارے ''سوئٹ'' کی طرف سے زوردار کڑاکے کی آواز آئی جیسے دروازہ توڑنے کی کوشش کی گئی ہو پھر ایل ایم جی کا ایک طویل برسٹ چلا اور در و دیوار لرزہ خیز آواز سے گونج اٹھے۔

''وہ پہنچ گئے ہیں، چھلانگ لگاؤ۔'' میں نے انیق سے کہا۔

ہم تیرہ چودہ فٹ کی بلندی سے کود ے۔ نیچے بھی بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہر ایک کو اپنی پڑی تھی۔ کسی نے ہمارے کودنے پر غور نہیں کیا۔ انیق کے گرنے سے ایک فربہ اندام خاتون کو دھکا لگا اور وہ چلّا کر فوارے کے پانی میں جا گری۔ اس سے معذرت کرنے کا موقع نہیں تھا۔ ہم آگے پیچھے دوڑتے اور ایک چھوٹی دیوار پھلانگتے ہوئے ہوٹل کے کچن میں گھس گئے۔ یہاں کوکنگ کا کام زوروں پر تھا۔ ان گنت پکوانوں کی خوشبوئیں چکرا رہی تھیں۔ ہم نے کئی برتن الٹائے اور کئی باورچیوں اور باورچنوں کو فرش بوس کیا۔ کچن کے عقبی دروازے سے نکل کر اور بیرونی چار دیواری پھاند کر ہم سڑک پر پہنچ گئے۔ سامنے ہی وہ نئے ماڈل کی اسٹیشن وین کھڑی تھی جس میں داؤد بھاؤ کے شوٹر موجود تھے۔ جھارا بھی ان میں ہی تھا اور اس نے ابھی دو منٹ پہلے ہمیں طوفان کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ میں اور انیق فراٹے سے وین میں گھس گئے۔ یہی وقت تھا جب ہوٹل کے فرسٹ فلور کی کھڑکی سے کسی کی پکارتی ہوئی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی اسٹیشن وین پر مشین پسٹل کی گولی فائر کی گئی۔

''جھارے' نکلو یہاں سے۔'' میں نے چلّا کر کہا۔

اس نے وین پہلے ہی اسٹارٹ کر کے گیئر میں ڈال رکھی تھی۔ وین کے پہیے چرچرائے اور وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح آگے بڑھی۔ اب رات کے نو بج چکے تھے۔ یہ ویک اینڈ تھا۔ یہ وہی وقت ہوتا ہے جب لاہور جیسے شہروں کے لوگ آؤٹنگ اور ہوٹلنگ کے لیے گھروں سے نکلتے ہیں، سڑکوں پر رش ہو جاتا ہے۔

ہماری وین پہلے چوراہے تک ہی پہنچی تھی کہ عقب میں ایک تیز رفتار گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شیورلیٹ جیپ تھی۔ تھوڑی سی دقت کے ساتھ ایسی جیپوں میں نو دس افراد بیٹھ سکتے تھے۔

''یہ انہی کی گاڑی ہے۔ وہ پیچھے آ رہے ہیں۔'' جھارا نے تصدیق کی۔

''رکنا نہیں، جدھر سے راستہ ملے نکلتے چلے جاؤ۔'' میں نے حکم دیا۔

میرے لباس میں اسی ایک تیز دھار چھری کے سوا اور

نہیں تھا اور سابقہ پڑ گیا تھا ٹیکساری گینگ کے سفاک ٹانگوں سے۔ ''انیق مجھے کوئی ہتھیار دو۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

انیق نے ایک شوٹر کے ہاتھ سے سیون ایم ایم لے کر مجھے تھما دی۔ میں ابھی رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹا رہا تھا کہ عقب میں آنے والی جیپ سے بے دریغ ایک برسٹ فائر کیا گیا۔ چند گولیاں وین کی باڈی میں لگیں۔ میں نے ایک آٹو رکشا کو دو پہیوں پر گھوم کر سڑک پر لڑھکتے دیکھا۔ شاید ہم پر چلائی جانے والی گولیوں میں سے ایک رکشا ڈرائیور کے حصے میں آگئی تھی۔ رکشے کی رگڑ سے فضا میں چنگاریاں سی چھوٹتی محسوس ہوئیں۔

دوسرا برسٹ چلنے سے پہلے ہی انیق چلّایا۔ ''لیٹ جاؤ۔''

اس برسٹ نے عقبی اسکرین کو چکنا چور کر دیا۔ ایک گولی یا شاید دو گولیاں ایک نشست کی ''بیک'' کو پھاڑ کر ایک شوٹر کے جسم کو چھید گئیں۔ میں نے سر اوپر اٹھایا اور ٹوٹی ہوئی اسکرین میں سے عقب میں آنے والی دیو ہیکل جیپ پر دو چھوٹے برسٹ فائر کیے اور اس کے ساتھ ہی نیچے جھک گیا۔ ہوشیار جھارا ایسی لڑائیوں اور مارا ماریوں میں ماہر تھا، اس نے وین کو تیزی سے دائیں بائیں لہرایا اور جیپ سے چلنے والے چوتھے برسٹ کو تقریباً خالی کر دیا مگر اس سے دو نقصان ہوئے۔ اس نے جب وین کو دائیں بائیں لہرایا تو ایک موٹر سائیکل سوار اپنی خاتون ساتھی سمیت ہماری وین کے پہلو سے ٹکرایا اور موٹر سائیکل سڑک پر دو تین قلابازیاں کھا گئی۔ دوسرا نقصان یہ تھا کہ ڈیتھ اسکواڈ والوں کی بے دریغ فائرنگ نے ایک اور شہری کو گھائل کر کے سڑک پر لٹا دیا تھا اور یہ گھائل ہونے والا کوئی اور نہیں ایک ٹریفک وارڈن تھا۔

میں اب پوری طرح چارج ہو چکا تھا اور ہر آفت کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا لیکن یہ نہیں چاہتا تھا کہ میری اور ٹیکساری گینگ کے غیر ملکیوں کی اس لڑائی میں میرے بے گناہ ہم وطن مارے جائیں۔ میں نے جھارا سے کہا۔ ''ہم کہاں پر ہیں؟''

وہ بولا۔ ''کینال بینک روڈ پر جی۔''

''گاڑی کو گنجان علاقے سے باہر نکالو۔ یہ سڑک آگے کہاں جائے گی؟''

''جلو پارک کی طرف جی۔'' جھارا کے بجائے انیق نے جواب دیا۔ ''وہ بالکل کھلا علاقہ ہے۔''

''ٹھیک ہے، اسی طرف نکلو۔ سب اپنے ہتھیار تیار کر لو۔ یہ لوگ آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑنے والے اور ذہن میں رہے، ان لوگوں نے بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی ہوں گی سر کو نشانہ بنانا ہے، یا ٹانگوں کو۔''

جونہی ہماری طاقتور اسٹیشن وین رش میں سے نکلی اور ایک چوراہا پار کر کے شاہراہ قائداعظم والے پل سے شمال کی طرف نکلی ایک دم اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ یہاں سڑک کشادہ تھی۔ ٹریفک بھی کم تھا۔ میرا مقصد پورا ہو رہا تھا۔ اب غیر متعلق لوگوں کا نقصان ہونے کا اندیشہ زیادہ نہیں تھا۔ میرے سینے کے انگارے پوری طرح دہک گئے تھے۔ ان کی مدتوں پرانی رنگت لوٹ آئی تھی۔ وہی نیلگوں آنچ، وہی شعلوں کی ہلکی ہلکی پھنکار۔ میں نے دانت پیسے اور دل ہی دل میں کہا۔ ''آجاؤ...... آجاؤ، آج دیکھ لیتا ہوں تم کو۔ تم وہی موت کے ہرکارے ہو اور میں بھی وہی شاہ زیب ہوں۔''

ہم بڑی تیز رفتاری سے جلو موڑ کی طرف جا رہے تھے۔ مجھے تھوڑا تھوڑا پتا تھا کہ آگے جا کر یہ علاقہ بالکل سنسان ہو جاتا ہے۔

''میرے خیال میں پولیس بھی پیچھے آرہی ہے۔'' انیق نے دور ایک ریوالونگ روشنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس کا کہنا درست تھا...... جیپ کے عقب میں پولیس کی گاڑی موجود تھی۔ کم از کم ایک تو دکھائی دے رہی تھی۔

''یہ پولیس کس کی طرف سے ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے خیال میں تو یہ نیوٹرل ہے۔ اب تک راستے میں جو جو کچھ ہوا ہے، اس کی وجہ سے یہ ہمارے پیچھے لگے ہیں۔'' انیق نے جواب دیا۔

جو کچھ بھی تھا مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ اب جو بھی مارا ماری ہوگی کھلے میدان میں ہوگی۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ ذرا آگے جا کر ہمیں ان نقاب پوش قاتلوں سے پیچھا چھڑانے کا کوئی موقع ہی مل جاتا۔ ہمارا اور جیپ کا درمیانی فاصلہ اب 500 میٹر سے زائد تھا۔

''مارے گئے۔'' انیق کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا اور چونک گیا۔ آگے پولیس ناکا نظر آرہا تھا اور یہ کوئی عام ناکا بھی نہیں تھا۔ نہر کے کنارے دو پولیس موبائلز کو اس طرح آمنے سامنے کھڑا کیا گیا تھا کہ راستہ تقریباً مسدود ہو گیا تھا۔ دونوں

گاڑیوں پر فلیشنگ روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ گاڑیوں سے کوئی پچاس قدم پہلے ہی پولیس کی نفری موجود تھی اور دور ہی سے ہمیں اسٹاپ والا سائن بورڈ دکھایا جارہا تھا۔ ''لگتا ہے کہ وائرلیس پر پیغام چل چکا ہے۔'' جھارا نے کہا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' انیق نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

دائیں طرف نہر تھی۔ بائیں طرف نشیب کی کچی جگہ تھی اور کیاریاں وغیرہ تھیں۔ میں انیق کے سوال کا کیا جواب دیتا۔ مجھے اس علاقے کی کچھ پہچان نہیں تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کر انیق، جھارا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''وہ اگلے والے کھمبے سے گاڑی نیچے اتاردو۔''

جھارا نے انیق کی ہدایت پر عمل کیا۔ اسٹیشن وین دو تین فٹ اچھلی اور کچے پر دھکے کھاتی ہوئی ایک پختہ سڑک پر آگئی۔ پانچ دس سیکنڈ بعد اندازہ ہوا کہ جیپ اور پولیس کی گاڑی بدستور ہمارے پیچھے ہیں...... بلکہ جیپ کا فاصلہ اب مزید کم ہوگیا تھا۔ جیپ کا دیوہیکل ہیولا جیسے کسی عفریت کی طرح ہمارے تعاقب میں لپکا چلا آرہا تھا۔

''کون لوگ ہیں یہ؟'' جھارا نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے دبی آواز میں انیق سے پوچھا۔

''ابھی تو بس یہی سمجھو کہ ہماری جان کے دشمن ہیں۔ بعد میں پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بعد پتا چلے گا کہ کس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

فاصلہ خاصا کم ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر جدید ترین رائفلوں کے برسٹ ہم پر فائر ہوئے۔ اسٹیشن وین کے دونوں پچھلے ٹائر فلیٹ ہوگئے...... مگر وہ بھاگتی چلی جارہی تھی۔ میں نے اور انیق نے جوابی فائرنگ کی۔ مجھے دکھ یہ تھا کہ اب ہم ایک بار پھر گنجان علاقے میں تھے اور یہ جو کچھ ہوا تھا پولیس کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ اپنے پیٹی بھائی (وارڈن) کو گولی لگنے کے بعد وہ غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کررہے تھے اور وہ جانتے نہیں تھے کہ یہ کارکردگی کچھ لوگوں پر بھاری بھی پڑسکتی ہے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں انیق سے معلوم ہوا یہ مغلپورہ کا علاقہ تھا۔ سڑک پر ٹریفک کا ازدحام تھا۔ آخر ہماری وین ٹریفک میں پھنس گئی۔ ہمارے عقب میں کچھ فاصلے پر دیوہیکل بلٹ پروف جیپ بھی رک گئی۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ جیپ کے اندر سے موت کے سیاہ پوش ہرکارے چھلانگیں لگا کر برآمد ہو رہے تھے...... یہ ٹیکساری گینگ کا بدنام زمانہ ڈیتھ اسکواڈ تھا اور مغلپورہ لاہور کی ایک سڑک پر موجود تھا۔ ان کا نشانہ میں تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ کسی دوسرے کی جان کی پروا کیے بغیر اندھا دھند مجھے ٹارگٹ کریں گے۔

میں نے جھارا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''جھارا! میں اور انیق یہاں سے نکل رہے ہیں۔ تم بھی مختلف سمتوں میں بھاگ جاؤ اور خبردار فائر نہیں کرنا ان پر...... بس خود کو بچانے کی کوشش کرو۔''

میں نے انیق کو ساتھ لیا اور جست لگاتا ہوا وین سے باہر آگیا۔ جھارا ابھی ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ چکا تھا۔ پیچھے والی گاڑیوں کے ہارن مسلسل شور مچانے لگے۔ ہم رکی ہوئی ٹریفک کے درمیان سے راستہ بناتے، لوگوں سے ٹکراتے، گاڑیاں پھلانگتے مشرقی جانب دوڑے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ سیاہ پوش ہمارے پیچھے ہیں اور پھر وہ گولیاں چلانے لگے۔ میرے عین سامنے ایک گدھا گاڑی کا گدھا اوندھے منہ گرا اور تڑپنے لگا۔ میں نے مڑ کر ایک برسٹ چلایا لیکن یہ ہوا میں تھا۔ میں پیچھے آنے والوں کو ٹارگٹ کیسے کرسکتا تھا۔ وہاں میرے اپنے لوگ بھی تھے۔ یکسر بے قصور اور لاتعلق۔ جب میں نے مڑ کر دیکھا، مجھے انیق کے علاوہ جھارا بھی نظر آیا۔ اور بات صرف جھارا!... کی نہیں تھی، وین میں موجود تقریباً تمام چھ سات افراد میرے پیچھے آرہے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی میرا ساتھ چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مجھے ان میں لودھی بھی نظر آرہا تھا۔ داؤد بھاؤ کے مارشل آرٹ کلب کا وہی دبنگ باکسر جس سے میرا ایک مرتبہ زوردار مقابلہ ہوا تھا۔

ہم ایک گنجان آبادی میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں تنگ گلیاں تھیں، بھرے پُرے بازار تھے، میوزک سینٹر، چائے خانے، پان شاپس، وڈیو گیمز، جنرل اسٹورز زندگی اپنے تمام تر روشن بہاؤ کے ساتھ رواں دواں تھی مگر ہماری اچانک آمد نے اس زندگی میں تلاطم برپا کردیا تھا۔ ہمارے اردگرد ایک دم بھگدڑ سی مچ گئی۔ بے شمار دہشت زدہ نگاہیں ہماری طرف اٹھیں۔ ہمارے ہاتھوں میں موجود اسلحہ دیکھنے والوں کو مزید خوف زدہ کررہا تھا اور وہ پھرتی سے ہمارا راستہ چھوڑ رہے تھے۔ یکایک اندھا دھند گولیاں چلنے لگیں۔ میں اور انیق دودھ دہی کی ایک دکان میں گھس گئے۔ ہم نے اپنے عقب میں آنے والوں پر جوابی فائرنگ کی۔ دھماکوں کے ساتھ ہر طرف چنگاریاں بکھرتی نظر آئیں۔ کئی عام افراد اس فائرنگ کی زد میں آکر زمین بوس ہوئے۔ ایک گولی جھارا کے ایک ساتھی کی پیشانی پر لگی اور میں نے اس کو پہلو کے بل دودھ کے کڑاہے میں گرتے دیکھا۔ دودھ فروش

ایک ملازم بھی زخمی ہو کر دکان کے فرش پر تڑپ رہا تھا۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا جس سے میں بچنا چاہتا تھا۔

گولیاں موسلادھار بارش کی طرح ہماری اس پناہ گاہ پر برسیں۔ مجھے اور انیق کو اتنا موقع ہی نہیں مل رہا تھا کہ کھل کر جوابی فائر کر سکیں۔ فائرنگ کی شدت اور رخ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل حملہ آور ہم سے قریب تر ہو رہے ہیں۔

''یہاں ایک چھوٹا دروازہ ہے۔'' انیق نے چلّا کر کہا اور عقب میں اشارہ کیا۔

ہم اس دروازے سے نکلے۔ ایسا کرتے ہوئے ہمیں تڑپتے ہوئے ملازم لڑکے کے خونچکاں جسم کو پھلانگنا پڑا...... اس منظر نے مجھے دکھ دیا۔ ہم ایک سڑک پر نکلے اور اسے پار کر کے دوسری طرف آ گئے۔ ہمارے چاروں جانب خوف زدہ آنکھیں اور ہراساں چہرے تھے۔ آس پاس ہونے والی فائرنگ نے راہ گیروں اور اہلِ علاقہ کو دہلا دیا تھا۔ ہم ایک بڑے آہنی گیٹ میں گھس گئے اور اسے اندر سے بولٹ کر دیا۔ یہ ایک پورچ نما جگہ تھی۔ سامنے ہی لکڑی کا دیدہ زیب منقش ''مین ڈور'' دکھائی دے رہا تھا۔ باہر ایک ملازم بھی کھڑا تھا۔ وہ ہکا بکا ہمیں دیکھ رہا تھا کہ ہم دروازہ دھکیل کر اندر گھس گئے۔ یہ ایک بڑا ہال تھا اور یہاں بہت سی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ اسی اثنا میں جھارا، لودھی اور ان کے دو ساتھی بھی بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ تب ہمیں پتا چلا کہ وہ بھی ہمارے پیچھے ہی آ رہے تھے۔ چوکیدار واویلا کرنے لگا۔ انیق نے اس منقش دروازے کو بھی اندر سے بولٹ کر دیا۔ دھیان سے دیکھا تو ہم ایک شادی ہال میں تھے۔ یہاں رنگ برنگے آنچل لہرا رہے تھے اور تیز روشنیاں تھیں لیکن یہاں شادی نہیں بلکہ کسی طرح کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی فلمی شوٹنگ ہے۔ ایک رقاصا اشتعال انگیز لباس میں شاید چند سیکنڈ پہلے تک رقص کر رہی تھی۔ ہماری دخل در معقولات نے یہاں موجود ہر مرد وزن کو بری طرح چونکا دیا۔

''کٹ اِٹ...... کٹ اِٹ۔'' ایک پاٹ دار آواز ابھری۔

اس کے ساتھ ہی دو ہٹے کٹے افراد ہماری طرف آئے۔ ''کیا بات ہے استاد! اندر کیوں گھسے ہو؟'' ایک بندے نے ہمارے اسلحے کو خاطر میں لائے بغیر کہا۔

انیق بولا۔ ''غلطی ہو گئی۔ ہم نے سمجھا تمہاری بہن کی شادی ہو رہی ہے مگر یہاں تو اور طرح کا جھنڈر خانہ چل رہا ہے۔''

''اوئے کون ہو تم؟'' دوسرے شخص نے پستول نکال لیا۔

دو گارڈز نے بھی رائفلوں کو حرکت دی مگر گارڈز کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ مر کر بھی گولی چلانے یا پنگا لینے کی جرأت نہیں کریں گے۔ پستول والا بھی جیسے خود چاہ رہا تھا کہ اس سے پستول چھین لیا جائے...... اور اس کی عزت بچ جائے۔ انیق نے اس سے نہ صرف پستول چھینا بلکہ ایک زوردار دھکا بھی دیا۔ وہ چربیلا شخص اپنی گنبد نما توند سنبھالتا ہوا ایک پورٹ ایبل لائٹ پر گرا اور اسے چکنا چور کر گیا۔ فلمی یونٹ میں کوئی قابلِ ذکر چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایکٹرز بھی شاید دوسرے تیسرے درجے کے تھے۔ انہوں نے شکاریوں والے لباس پہن رکھے تھے اور ڈمی بندوقیں اٹھا رکھی تھیں۔ تین چار لڑکیاں تھیں جو چلّاتی ہوئی ایک جانب بھاگ کھڑی ہوئیں۔ ڈائریکٹر اور کیمرامین بھی الٹے قدموں پیچھے ہٹے اور اوجھل ہو گئے۔ صرف گارڈز اور چربیلا شخص جو پروڈیوسر بھی تھا، ابھی تک وہیں تھے۔ چربیلے شخص کا چہرہ سرخ نظر آنے لگا تھا۔ انیق نے اس کی توند میں رائفل کی نال چبھوئی اور اسے ''زچہ'' کا خطاب دیتے ہوئے کہا۔ ''بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ تمہارا حمل ضائع ہو جائے گا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے موٹے شخص کے پاؤں کے قریب دو تین فائر کیے۔

خاصا نڈر شخص تھا مگر ہمارے تاثرات اُسے سمجھا رہے تھے کہ معاملہ اس کی توقعات سے زیادہ سنگین ہے۔ وہ بڑبڑاتا ہوا پیچھے ہٹا اور بولا۔ ''اس کو کون اتارے گا؟''

میں نے اور انیق نے ایک ساتھ اوپر دیکھا۔ لوہے کے ایک بڑے پنجرے میں ایک حسینۂ دلنواز قید تھی۔ اس کے جسم پر لباس کے نام پر تو کوئی شے نہیں تھی، ہاں چند سبز پتے تھے جنہوں نے اسے مختصراً ڈھانپ رکھا تھا۔ پنجرہ چھت سے تین چار فٹ نیچے ایک مضبوط زنجیر سے لٹک رہا تھا۔

انیق بولا۔ ''یا اللہ خیر، یہ تو ٹاپ کی ہیروئن ہے۔''

''اور ٹاپ پر ہی لٹکی ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ پکار رہی تھی۔ ''بچاؤ...... خدا کے لیے مدد کرو۔''

اب لوہے کے بیرونی گیٹ پر تابڑ توڑ فائرنگ ہو رہی تھی۔ وہ اسے توڑ کر اندر گھسنے ہی والے تھے۔ میں نے انیق اور موٹے پروڈیوسر کے ساتھ مل کر زنجیر کو ڈھیلا کیا۔ پنجرہ ایک چرخی پر گھوم کر نیچے فرش پر آ گیا لیکن جب انیق نے پنجرے کا دروازہ کھول کر لڑکی کو نکالنا چاہا تو پتا چلا کہ وہاں بھاری قفل لگا ہوا ہے۔

"چابی کہاں ہے؟" انیق نے گرج کر پروڈیوسر سے پوچھا۔

"وہ تو کیمرا مین کے پاس تھی۔"

"تو پھر جاؤ تم بھی کیمرا مین کی گود میں جا کر بیٹھو۔ اس کو مرنے دو یہاں۔"

"کوئی کام سیدھا بھی ہوتا ہے تم لوگوں کا؟" میں نے بھنّا کر موٹے پروڈیوسر سے کہا اور رائفل کی نال تالے پر رکھ کر گولی چلائی۔ ڈھیٹ قسم کا تالا تھا۔ دو گولیوں کے باوجود سلامت رہا۔ ہر فائر پر ہیروئن دیوانہ وار چلّا اٹھتی تھی۔ ایک ناقابلِ بیان خوف اور ہیجان تھا اس کے حسین چہرے پر۔

ہیروئن اور پنجرے کو اس کے حال پر چھوڑ کر ہم مختلف پوزیشنوں کی طرف بھاگے۔ یہی وقت تھا جب لکڑی کا منقش دروازہ دھماکے سے کھلا اور ڈیتھ اسکواڈ کے سفاک حیوان اندر داخل ہو گئے۔ وہ سرتاپا سیاہ پوش تھے۔ فربہ اندام پروڈیوسر اب بھاگنے کی فکر میں تھا مگر اس کام کے لیے اب دیر ہو چکی تھی۔ قریباً ایک درجن گولیاں اس کے سر کے پچھلے حصے اور پشت پر لگیں۔ وہ بھاگتا ہوا ایک آرٹی فیشل پودے پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ پنجرے میں بند ہیروئن بھی بے ہوش ہو چکی تھی۔ وہ اب تک یقیناً مصنوعی لڑائیاں اور مار دھاڑ ہی دیکھتی رہی تھی...... آج اصلی معرکے کی پہلی جھلک نے ہی اس کا پتّا پانی کر ڈالا تھا۔

میں نے اور لودھی نے ایک ساتھ ایک کمرے میں پوزیشن لی تھی۔ شادی ہال کا یہ کمرا شاید دلہن کے مزید بناؤ سنگھار کے لیے استعمال ہوتا ہوگا۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ آئی اور بناؤ سنگھار کی درجنوں اشیا ہوا میں اُڑتی دکھائی دیں۔ دیوار گیر آئینہ چکنا چور ہو گیا۔ ہم نے جم کر جوابی فائرنگ کی۔ میرے پاس سیون ایم ایم تھی اور لودھی کے پاس 32 گولیوں والی جرمن آٹو میٹک۔ فالتو راؤنڈز والا چرمی بیگ بھی اس کے گلے سے جھول رہا تھا۔ ہماری تابڑتوڑ جوابی فائرنگ اور جوش و خروش نے تین چار منٹ کے لیے اسکواڈ کے نقاب پوش شوٹرز کو ٹھٹکا دیا۔ وہ ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکے تھے۔ ان تین چار منٹ کے اندر ہی شادی ہال اور شوٹنگ کے ساز و سامان کا کباڑا ہو کر رہ گیا تھا۔ ہال کے در و دیوار جیسے چھلنی ہو گئے تھے۔

فائرنگ میں تھوڑا سا وقفہ آیا تو میں نے لودھی کی پیٹھ تھپکی۔ میں نے کہا۔ "پتا نہیں تھا کہ اتنے عرصے بعد ملیں گے اور اس طرح ملیں گے۔"

وہ بولا۔ "باکسنگ کے رِنگ میں اب بھی میں آپ کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں مگر یہ باکسنگ نہیں ہے۔ اس میں آپ کے لیے جان بھی قربان ہے۔"

پاس ہی شادی ہال کا آفس تھا۔ وہاں سے انیق کی للکارتی ہوئی آواز آئی۔ "شاہ زیب بھائی! ایمونیشن کافی ہے۔ یہ لیں ایک بیگ آپ کی طرف آ رہا ہے۔"

کینوس کا ایک وزنی بیگ چکنے فرش پر پھسلتا ہوا عین ڈریسنگ روم کے دروازے پر آ گیا۔ لودھی نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا مگر تب ہی دو فائر ہوئے اور ایک گولی لودھی کی چھوٹی انگلی کے بالائی حصے کو صاف اُڑا گئی۔ خون کی پچکاری سی نکلی۔ میں نے جلدی سے ایک رومال کس کر زخم پر باندھ دیا۔ رائفلوں سے نئے میگزین اٹیچ ہو گئے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ پھر سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہونے والی ہے۔ میں نے پنجرے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ لڑکی (ہیروئن) بے حرکت پڑی تھی۔ اب یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ صرف بے ہوش ہے یا اسے گولی چاٹ چکی ہے۔ اس کا نیم عریاں گلابی جسم چمکیلے لوہے کے پنجرے میں آڑھا ترچھا بے سدھ پڑا تھا۔

لودھی کے سیل فون پر سگنل آئے۔ اس نے کال ریسیو کی۔ شور کے سبب اسے بلند آواز میں بولنا پڑ رہا تھا۔ فون سننے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "شاہ زیب صاحب! ہمارے ساتھی کا فون ہے۔ وہ شادی ہال میں داخل نہیں ہو سکا۔ اس کی پنڈلی میں گولی لگی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے کچھ اور ساتھی آ گئے ہیں۔ ایک بھری ہوئی بڑی جیپ ہے۔ سات آٹھ بندے تو ہوں گے۔ کچھ تو اسی طرح نقاب پوش ہیں اور کالے کپڑوں میں ہیں۔ دو تین مقامی لگتے ہیں مگر انہوں نے بھی منہ نقابوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ سب کے پاس نئے "ماڈلوں" کا اسلحہ ہے...... ان کے پیچھے ایک اور گاڑی بھی نظر آ رہی ہے۔"

فوراً ہی لودھی کی بات کی تصدیق بھی ہو گئی۔ شادی ہال سے باہر غالباً اندھا دھند فائرنگ کی گئی تھی پھر وہ لوگ شادی ہال میں داخل ہو گئے۔ فون پر لودھی کے ساتھی کی کال آئی۔ "آپ نکل سکتے ہیں تو نکل جائیں یہاں سے۔"

لودھی نے پکار کر پوچھا۔ "پولیس کہاں ہے؟"

"پولیس ایسے موقعوں پر کہاں ہوتی ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا، کچھ اور بھی کہا گیا مگر شدید فائرنگ کے

شور میں سنائی نہیں دیا۔ یہ بڑا سخت حملہ تھا۔ میں نے لودھی سے کہا۔ ''لائٹس کو ٹارگٹ کرو۔''

شاید اس کے ذہن میں بھی یہی بات تھی۔ اگلے پندرہ بیس سیکنڈ میں ہم نے تاک تاک کر ہال کی بچی کھچی روشنیوں اور قمقموں کو نشانہ بنایا۔ آخری روشنی بجھتے ہی ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔ میں نے پکار کر انیق کو مخاطب کیا۔ ''نکلو انیق! اوپر کی منزل پر پہنچو۔ سیڑھیاں ہماری دائیں طرف ہیں۔''

میں نے یہ جملہ ملائی زبان میں کہا تھا تا کہ حملہ آوروں کی سمجھ میں نہ آسکے۔

ہم برستی گولیوں میں سیڑھیوں تک پہنچے اور باقی تین ساتھیوں کے ساتھ بالائی منزل پر اور پھر چھت پر آ گئے۔ یہاں چھتیں ساتھ ساتھ ملی ہوئی تھیں۔ درمیان میں فقط پانچ چھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ جسے بہ آسانی پھلانگا جا سکتا تھا مگر اچانک مجھے کسی کمی کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا لودھی موجود نہیں تھا۔

''لودھی کہاں ہے؟'' میں نے چلا کر پوچھا۔

اس کا جواب کسی نے نہیں دیا مگر ہم سب کی سمجھ میں آ گیا۔ لودھی سیڑھیوں کے بالائی کنارے پر پڑا تھا۔ ایک برسٹ اس کی کھوپڑی توڑ کر نکل گیا تھا۔ اس کا مغز بکھرا ہوا تھا۔ اس کی جرمن رائفل اٹھا کر ہم پلٹے اور درمیانی خلا پھلانگ کر ساتھ والی چھت پر پہنچ گئے۔ یہ بھی کوئی دو منزلہ عمارت تھی۔ چھت سنسان تھی۔ ہم دس پندرہ قدم بھاگے اور تیسری چھت پر کود گئے جو آٹھ دس فٹ نیچی تھی۔ یہ گنجان علاقہ تھا۔ چھتوں سے چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ کسی مارکیٹ کی چھت، کسی گھر کی چھت، رہائشی کوارٹرز کی چھتیں۔

جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ بھی اوپر پہنچ چکے ہیں اور فائرنگ کر رہے ہیں مگر یہ اندھی فائرنگ تھی۔ انہیں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ہم کس سمت فرار ہوئے ہیں بلکہ شاید ابھی وہ یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم شادی ہال کی عمارت سے نکل چکے ہیں۔ یہ عمارتوں اور چھتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ برساتیاں، منڈیریں، کبوتروں کی چھتریاں، مرغیوں کے ڈربے، الگنیوں پر لٹکے رہ جانے والے کپڑے، کہیں کہیں ٹی وی کے ایریل، ڈش انٹینا ز۔ دو چار چھتوں پر لوگ بھی نظر آئے۔ خواتین نے ہمیں دیکھ کر شور مچایا۔ ایک ٹھیٹ لاہوریے نے بدحواسی میں ہم پر ہاکی سے وار کرنے کی کوشش کی مگر انیق کی رائفل کا کندا کھا کر نیچے بالکونی میں جا گرا۔ ایک جگہ آ کر ہمیں رکنا پڑا کیونکہ چھتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ ہم نے ایک بھری پُری گلی میں چھلانگیں لگا دیں۔ لوگ ہمیں دیکھ کر دہشت زدہ ہوئے اور مختلف اطراف میں دوڑے۔ میری بس ایک ہی خواہش تھی۔ ہم جلد از جلد ان غیر ملکی قاتلوں سے دور نکل جائیں۔ میں ہرگز ان کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا اور ایسے گنجان ترین علاقے میں تو بالکل بھی نہیں۔ یہ ویک اینڈ کی رات تھی، کھاتے پیتے مرد و زن، ہنستے کھیلتے بچے، خوشی خوشی گھروں کو جاتے ہوئے راہ گیر، چبوتروں اور تھڑوں پر اٹکھیلیاں کرتے نوجوان، یہ سب میرے اپنے تھے...... جیسے، میرے جسم کا حصہ تھے، میں ان کا خون بہتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہم نے ایک کیری ڈبے کو روکا۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر سے ایک خان صاحب کو گھسیٹ کر نکالا۔ انہوں نے مزاحم ہونے کی کوشش کی تو انیق نے رائفل کے کندے سے ان کے سر پر جچی تلی ضرب لگائی۔ وہ سر پکڑ کر سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔ انیق کے ایک ساتھی نے چند ہوائی فائر کیے۔ ہم کیری ڈبے پر سوار ہوئے اور تیزی سے بڑی سڑک کی طرف بڑھے۔ قریب کی ایک دو گلیوں میں پولیس موبائلز کے سائرن چنگھاڑ رہے تھے۔ غالباً ان پولیس موبائلز کی ساری کارکردگی صرف سائرنز کے چنگھاڑنے تک ہی محدود تھی۔

☆☆☆

اور یہ منظر تھا، داؤد بھاؤ کے زیر زمین ٹھکانے کا۔

آج کل یہ ٹھکانا زیر زمین (پوشیدہ) نہیں تھا۔ انتظامیہ اور چیدہ چیدہ لوگوں کو معلوم تھا کہ یہاں داؤد بھاؤ کی رہائش ہے اور اس کے قریبی ساتھی بھی یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس رہائش گاہ کا ایک حصہ اب بھی ایسا تھا جہاں چڑیا پر نہیں مار سکتی تھی اور وہاں ایسے مفرور قیام پذیر تھے جن کی تلاش میں مختلف صوبوں کی پولیس ماری ماری پھرتی تھی (داؤد بھاؤ پر اب بھی کئی کیس چل رہے تھے اور وہ بڑی خوبی سے ان میں اپنا دفاع بھی کر رہا تھا۔ اگر کسی کیس میں گرفتاری یا ضمانت کینسل ہونے کا اندیشہ ہوتا تھا تو وہ کچھ دنوں کے لیے روپوش بھی ہو جاتا تھا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں سے اس کی یہ آنکھ مچولی چلتی ہی رہتی تھی)

اس وقت بھی گراؤنڈ فلور پر اسنوکر کلب کی سرگرمیاں جاری تھیں اور بیسمنٹ میں ایک آرام دہ کمرے کے اندر میں اور انیق گم صم بیٹھے تھے۔ کل شام کے بعد جو کچھ ہوا تھا، اس نے داؤد بھاؤ کے گینگ کو تو افسردہ کیا ہی تھا میں بھی دکھ کے گہرے اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ لودھی کے علاوہ گینگ کے تین مزید افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے، دو زخمی ہوئے

تھے۔ ایک کی پنڈلی اور دوسرے کی کمر میں گولی لگی تھی۔ سب سے روح فرسا بات یہ تھی کہ اس سارے تہلکہ خیز واقعے میں قریباً اٹھارہ عام شہری بھی جاں بحق ہوئے۔ ان میں ایک ٹریفک وارڈن اور ایک اے ایس آئی بھی شامل تھا۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔

داؤد بھاؤ وہسکی کا ایک تلخ گھونٹ بھرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی نوخیز داشتہ روبی نے اس کے سگریٹ کیس اور سیل فون وغیرہ اس کی نشست کے پاس ایک تپائی پر رکھ دیے۔ داؤد بھاؤ نے اپنا گلاس بھی وہیں پر رکھا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اچھا چھوڑو اب اس سوگ کو۔ اور سچی بات یہی ہے کہ میں تمہیں لودھی اور باقی تین بندوں کی موت کا ذمے دار نہیں سمجھتا۔ جھارا نے گواہی دی ہے کہ تم نے حملے کے وقت باقی ساتھیوں سے کہا تھا کہ وہ دائیں بائیں ہوکر نکل جائیں۔ اب یہ ان کا اپنا فیصلہ تھا کہ وہ تمہارے اور انیق کے پیچھے گئے۔ اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا اس میں تم بالکل بے بس تھے۔''

''مجھے ڈر تو تھا...... لیکن اتنے زیادہ نقصان کی توقع نہیں تھی۔ ساری گڑبڑ اس وقت ہوئی جب وارڈن کو گولی لگنے کے بعد ہمارا راستہ روکا گیا، اور ہمارا رخ گنجان آبادی کی طرف کردیا گیا۔ آپ کے ساتھیوں کے علاوہ بھی اٹھارہ بے گناہ مارے گئے ہیں داؤد بھاؤ اور جو زخمی ہیں ان میں سے شاید دو چار مزید چل بسیں گے۔''

''اچھا بتاؤ یہ تھے کون لوگ؟ ٹیکساری گینگ کا تو تم نے کئی بار کہا اور میں نے بھی کئی بار سنا۔ مگر یہ نقاب پوش شوٹرز؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ میڈیا پر بھی سنسنی پھیلی ہوئی ہے۔ ایسی ایسی خبریں چل رہی ہیں کہ عقل کی واٹ لگ جاتی ہے۔ نقاب پوشوں کے ملتے جلتے چہرے، ایک جیسے قد کاٹھ، سب کی آنکھیں بھوری یا ہلکی بھوری، ایک ہی رنگ اور نسل؟ یہ تو کوئی ہالی وڈ کی کہانی لگتی ہے۔''

''یہ ہالی وڈ کی کہانیوں سے کم دلچسپ اور حیرت انگیز نہیں ہے۔'' میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا اور سوچ میں گم ہوگیا۔

داؤد بھاؤ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''شادی ہال کے اندر سے تو اپنی دو لاشیں وہ لوگ اٹھا کرلے گئے ہیں مگر شادی ہال سے باہر دودھ فروش کی دکان کے آس پاس سے جو تین لاشیں ملی ہیں وہ سب کو حیران کررہی ہیں۔ اس طرح کے غیر ملکی ہمارے شہروں میں اس طرح دندنا سکتے ہیں، کبھی سوچا بھی نہ تھا......''

اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ میں نے داؤد بھاؤ سے پوچھا۔ ''شادی ہال میں کسی ڈرامے یا فلم کی شوٹنگ ہورہی تھی، بلکہ فلم ہی تھی۔ یونٹ والوں نے ایک لڑکی کو پنجرے میں بند کرکے رکھا ہوا تھا۔ اس کا کیا بنا؟''

''وہ ہماری چوٹی کی ہیروئنوں میں سے ایک تھی......''

''مرگئی؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''نہیں...... غائب ہوگئی۔ یہ بھی بڑی عجیب بات ہے۔ وہی حملہ آور اسے اٹھا کرلے گئے۔''

''اٹھا کرلے گئے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہوگی۔'' میں نے تجزیہ کیا۔

''لیکن تمہیں اس بات پر حیرانی نہیں ہوئی کہ ایسی جنگ وجدل والی حالت میں بھی وہ لڑکی کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے اٹھالیا؟''

''نہیں داؤد بھاؤ! مجھے حیرانی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ ہے کہ میں ان انسان نما قاتل مشینوں کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں......''

''یہ ''قاتل مشینوں'' والے الفاظ تم نے پہلے بھی استعمال کیے ہیں۔'' داؤد نے مزید وہسکی اپنے گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

''ہاں، داؤد بھاؤ! یہ قاتل مشینیں ہیں اور ہمارے شہر میں ہیں۔ اس صورتِ حال پر میرا سینہ اندر سے پھٹا جارہا ہے۔''

''تم نے بتایا تھا کہ ان لوگوں کو ڈیتھ اسکواڈ کہا جاتا ہے؟''

''آپ یوں سمجھیں کہ یہ ٹیکساری گینگ کا سب سے خطرناک ''ونگ'' ہے۔ ان لوگوں کو ایک بار جس نشانے پر ڈال دیا جاتا ہے، اس کا آخر تک پیچھا کرتے ہیں۔ عام طور پر کہا یہی جاتا ہے کہ ان ڈیتھ اسکواڈ کے ارکان کو نوعمری میں ہی اس کام کے لیے چن لیا جاتا ہے اور پھر سخت تربیت اور خاص قسم کے ماحول سے گزار کر صرف اور صرف مرنے مارنے والے جانور بنا دیا جاتا ہے مگر واقفِ حال لوگ جانتے ہیں کہ حقیقت اس سے بھی گہری اور حیران کن ہے۔''

داؤد بھاؤ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی موت کا غم وہسکی میں ڈبونے کی کوشش کررہا تھا۔ روبی دو تین منٹ تک اس کے کندھے دبانے کے بعد باہر جاچکی تھی۔ اس نہایت آرام دہ کمرے سے باہر وہی مصروفیات تھیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں۔ کچھ لوگ ٹی وی پر ایم ایم اے کی فائٹنگ دیکھ رہے تھے۔ کچھ تاش وغیرہ سے دل بہلا رہے تھے۔ کسی پاس کے ہال

کمرے میں Ring کے اندر باکسنگ کا پریکٹس سیشن چل رہا تھا۔ ہاں آج لڑکیوں کے سُریلے قہقہے نہیں گونج رہے تھے اور نہ ہی کوئی اور موج مستی تھی۔ وجہ وہی کل والے واقعات تھے۔

میں نے کوک کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''داؤد بھاؤ! آپ کو یہ عجیب تو لگے گا مگر حقیقت وہی ہے جو میں آپ کو بتانے والا ہوں۔ ڈیتھ اسکواڈ کے یہ سارے لوگ ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ ان کی تعداد اس وقت بھی پچاس کے لگ بھگ ہے۔ یہ سارے تقریباً ہم عمر ہیں۔''

داؤد بھاؤ نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور اپنے گلاس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''پی تو میں رہا ہوں اور نشہ تمہیں ہو رہا ہے۔ ایک ہی باپ کے پچاس بچے اور سارے ہم عمر؟''

''ہاں، یہاں ایسا ہی ہے۔ ان میں سے دس پندرہ ایسے ہوں گے جن کی ماں اور ہے۔ ورنہ باقیوں کی ماں بھی ایک ہی ہے۔''

''تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو، اور وہ بھی نہ سمجھ میں آنے والی۔''

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ آج سے کوئی بیس بائیس سال پہلے کی بات ہے، جان ڈیرک کا باپ ڈیرک میکسیکو کی ایک جیل میں بند تھا، اسی جیل میں ''ایول'' نام کا ایک نہایت خطرناک قاتل اور ڈکیت بھی موجود تھا۔ سفاکی اور بے خوفی اس شخص میں دیوانگی کی حد تک موجود تھی۔ درجنوں قتل، آبروریزیاں، ڈکیتیاں اور دیگر لرزہ خیز جرائم اس کے کھاتے میں تھے۔ مار کٹائی کی اسپرٹ بھی اس شخص میں غیر معمولی بلکہ ناقابلِ یقین حد تک تھی۔ کئی کیس چل رہے تھے، یقینی بات تھی کہ وہ بجلی کی کرسی سے بچ نہیں سکے گا۔ اس موقع پر جان ڈیرک کے باپ ڈیرک کو ایک انوکھی بات سوجھی......''

داؤد بھاؤ نے مجھے روکتے ہوئے پوچھا۔ ''جان ڈیرک وہی، جو اس وقت ٹیکساری گینگ کا ہیڈ ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جان ڈیرک کا باپ زبردست منصوبہ ساز تھا۔ وہ ''ایول'' نامی اس نہایت خطرناک شخص سے بے حد متاثر تھا۔ اس نے جیل سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ مل کر ایک پلان بنایا۔ اس نے سوچا کہ ایول کی سزائے موت سے پہلے کیوں نا اس کی ''نادر روزگار نسل'' کو محفوظ کیا جائے۔ آپ غور کرو داؤد بھاؤ کہ جو بندہ سیدھا سیدھا بجلی کی کرسی کی طرف جا رہا ہو، اس کو جیل کے اندر ہی دو من پسند عورتیں فراہم کر دی جائیں اور ہر طرح کی عشرت کا موقع دیا جائے تو اس کے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

''یقیناً۔'' داؤد بھاؤ نے تائید کی۔

''ڈیرک اور سپرنٹنڈنٹ نے جیل کے اندر سے ہی دو نہایت خطرناک لیکن جوان قیدی عورتوں کو منتخب کیا اور انہیں ''ایول'' کے ساتھ تعلقات قائم کرنے پر آمادہ کر لیا۔ یہ دونوں عورتیں حاملہ ہو گئیں۔ میکسیکو کی اس جیل کے نسبتاً ڈھیلے ڈھالے نظام میں یہ کوئی بہت انوکھی بات نہیں تھی۔ ان میں سے ایک عورت نے بچہ اور دوسری نے بچی جنم دی۔ ماں باپ میں سے کسی نے بھی ان بچوں کی صورت نہیں دیکھی۔ ان بچوں کو جیل سے منسلک نگہداشت کے ایک ادارے کے سپرد کر دیا گیا۔ ڈیرک چاہتا تھا کہ کسی طرح بچہ اس کی تحویل میں آ جائے لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ چند ماہ بعد ڈیرک اور سپرنٹنڈنٹ کے ذہنوں میں ایک اور منصوبہ آیا...... دراصل یہ پہلے منصوبے کی ہی ایک وسیع شکل تھی۔ انہوں نے ''ایول'' کی نسبت سے ٹیسٹ ٹیوب بے بی پیدا کرنے کا سوچا۔ ان دنوں کرائے کی ماں والی تکنیک بھی پریکٹس میں آ چکی تھی۔ کرائے کی ماں سمجھتے ہیں نا آپ؟''

داؤد بھاؤ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جس میں حمل مکمل کرنے کے لیے کسی صحت مند عورت کی کوکھ کرائے پر لی جاتی ہے۔''

''جی ہاں...... ڈیرک نے جیل سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ مل کر ٹھیک ٹھاک ڈالرز خرچ کیے اور اس کام کے لیے پچاسی عورتوں کا انتظام کیا...... جی ہاں قریباً اسّی پچاسی عورتیں۔ کرائے کی ان ماؤں میں سے ستر عورتوں نے کامیابی کے ساتھ ٹیسٹ ٹیوب بچے پیدا کیے۔ یہ سب کے سب ''ایول'' کے بچے تھے۔ فرٹیلائزیشن کے لیے Eggs انہی دونوں عورتوں سے حاصل کیے گئے تھے جو جیل میں ایول کے ساتھ ہوتی تھیں۔ یہ سارا عمل ایک ''ایم او'' کے ذریعے جیل سے منسلک ایک اسپتال میں ہی انجام پایا۔''

داؤد بھاؤ حیرت میں گم یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ان بچوں میں سے پینسٹھ میل اور صرف پانچ فی میل تھیں۔ مذکر مونث کی یہ تقسیم بھی پری پلاننگ کے تحت تھی۔ اس کے بعد منصوبے کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اس دوران میں ڈیرک بھی ضمانت پر رہا ہو چکا تھا۔ یہ سارے ٹیسٹ ٹیوب بی بی اس کی تحویل میں تھے۔ شروع سے ہی ان بچوں کی گھٹی میں سفاکی، درندگی اور وحشت ڈال دی گئی۔ وہ ذرا بڑے

ہوئے تو انہیں ایک بہت ہی خاص ماحول میں رکھا گیا۔ یہاں انہیں صرف مار دھاڑ، آتشیں اسلحہ کے استعمال اور مارشل آرٹ وغیرہ کی تربیت دی گئی۔ انہیں بتایا گیا کہ انسان کو صرف کھانے پینے، مخالف جنس کے ساتھ تعلقات رکھنے اور اپنے مقابل کا خون بہانے کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے اور یہی زندگی کی معراج ہے......"

"اچھا ایک منٹ۔" داؤد بھاؤ نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔ "اس سُپر بدمعاش ایول کا کیا بنا؟"

"اسے ایک سال بعد ہی بجلی کی کرسی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ اپنے انجام کو پہنچا لیکن اپنے 'جین' کی صورت میں بیسیوں اپنے جیسے انسان چھوڑ گیا......"

"اور وہ دونوں مائیں؟"

"ان میں سے جو زیادہ بچوں کی ماں تھی وہ چار پانچ سال مزید زندہ رہی...... پھر جیل کے اندر قیدیوں کے درمیان ہونے والی ایک لڑائی میں ماری گئی۔ اس نے کہیں سے ایک چاقو حاصل کیا تھا اور اپنے "جسم کے اندر" ہی چھپا رکھا تھا۔ اس چاقو سے اس نے دو عورتوں کی جان لی اور خود بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ دوسری ماں کو سرطان ہو گیا تھا، اور وہ کسی اور جیل میں بھیج دی گئی تھی، اس کا کچھ پتا نہیں۔"

"ہاں تو تم اُن بچوں کی ٹریننگ کا بتا رہے تھے؟" داؤد بھاؤ نے کہا۔

"ان کو ایک وسیع چار دیواری کے اندر ہی تربیت کے مختلف مرحلے طے کروائے گئے جب وہ لڑکپن کی حد سے آگے نکلے...... تو انہیں خصوصی طور پر بنائی گئی ایسی فلمیں دکھائی جاتی تھیں جو سفاکی سے بھرپور ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی طریقوں سے ان کی برین واشنگ ہوتی تھی۔ ڈرائیونگ، سی ڈائیونگ، نشانہ بازی، کمپیوٹر کا استعمال، پولیس اِن کاؤنٹرز وغیرہ کی عملی ٹریننگ نے ان میں سے ہر ایک کو ایک نہایت عیار قاتل کا روپ دے دیا۔ یقیناً اس میں ان "جینز" کا بھی بہت عمل دخل تھا جو انہوں نے اپنے باپ ایول سے حاصل کیے تھے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ بندہ صرف ایول نہیں "ایول جینئس" تھا۔ اب یہ بہت سارے ایول جینئس، ڈیتھ اسکواڈ کے نام سے، انڈر ورلڈ میں جانے جاتے ہیں۔"

داؤد بھاؤ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ کچھ دیر گہری سوچ میں گم رہنے کے بعد بولا۔ "ان لوگوں کو کمانڈ کون کرتا ہے...... جان ڈیرک؟"

"یہ آپ نے اچھا سوال کیا ہے۔ شروع میں میرا بھی یہی خیال تھا کہ شاید ان کو جان ڈیرک کا باپ یا خود جان ڈیرک کمانڈ کرتا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ جان ڈیرک کا بدبخت باپ تو کوئی چھ سال پہلے آنجہانی ہو چکا ہے۔ جان ڈیرک بھی ان موت کے ہرکاروں کو کنٹرول نہیں کرتا۔ ان کی کمان ان ہی میں سے ایک بندے کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی ان کا ایک بھائی ہی ہے جو اُن سے بھی زیادہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ وہ سب اس کے اشارے پر چلتے ہیں...... اور وہ خود جان ڈیرک سے ہدایات لیتا ہے۔ آپ یوں کہہ لیں کہ یہ سب ایک شیطان کی اولاد ہیں اور اس اولاد میں سے ہی ایک فرد اُن کو گائیڈ کرتا ہے۔"

داؤد بھاؤ نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ سب کے سب پچاس پچپن شوٹر یہاں موجود ہیں؟"

"نہیں، میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہوگا۔ جان ڈیرک کے ساتھ پندرہ بیس بندوں کی ٹولی یہاں پہنچی ہوگی۔ اور ان میں سے تین یہاں مارے گئے ہیں۔ یہ ہلاکتیں بھی خطرناک ہیں، وہ مزید خونخوار ہو جائیں گے۔" کچھ دیر کمرے میں بوجھل خاموشی طاری رہی، پھر میں نے ہی اسے توڑا۔ "یہ بے حد مکار بھیڑیے ہیں داؤد بھاؤ، جان ڈیرک سخت ضرورت کے وقت ہی ان کو باہر نکالتا ہے اور اپنے شکار پر چھوڑتا ہے۔ شکار کی چیر پھاڑ کے بعد ان کو دوبارہ ان کے شیطانی ماحول میں بند کر دیا جاتا ہے۔"

ساتھ والے کمرے میں ٹی وی آن تھا، نیوز کاسٹر ہیجانی انداز میں بول رہا تھا۔ "...... یہ لوگ پاکستان میں کیسے داخل ہوئے؟ کس طرح یہاں پہنچے اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ بہت سے سوالات اٹھ رہے ہیں۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق جاں بحق ہونے والوں کی تعداد بیس ہو چکی ہے......"

داؤد بھاؤ نے پُرسوچ لہجے میں پوچھا۔ "اور وہ ہیروئن جو کل رات غائب ہوئی ہے؟"

"وہ ان کی وحشت کا شکار ہو چکی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے راستے میں شیورلیٹ جیپ کے اندر ہی ریپ کر دیا گیا ہو۔ اگر وہ زندہ واپس مل گئی تو کرشمہ ہی ہوگا......"

کمرے کے ماحول میں سنسنی کی بلند و بالا لہریں اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

**خونریزی اور بربریت کے خلاف**
**صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ**
**باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے**

ستمبر 1965ء کی جنگ زوروں پر تھی۔ دشمن کے ٹینک پاکستانی سرحدوں میں بہت آگے تک گھس آئے تھے۔ مشہور ہو گیا تھا کہ بھارتی فوج نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ دشمن کی یہ خوش فہمی جلد ہی دور ہو گئی۔ پاکستانی جوانوں کا جوابی حملہ دشمن کو خواب سے باہر لے آیا۔ ٹینکوں میں روح نہیں ہوتی، جان بچانے کی سوجھ بوجھ نہیں ہوتی۔ بھارتی ٹینک تباہ ہونا شروع ہوئے تو میدانِ جنگ میں کھلبلی مچ گئی۔

**خون کی تاثیر جو اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے......**

**ایک انہونی محبت کی دل پذیر کہانی......**

ماحول و منظر بدلتے ہی لوگوں کی عادات، خصلتیں اور ان کے چہرے کے زاویے بھی بدل جاتے ہیں... لیکن فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیے... 65ء کی جنگ کے تناظر میں لکھی گئی تحریر کے پیچ و خم... جب پاک فوج کا جوان دشمن ملک کی سرحد پار کر گیا... وہاں رہتے ہوئے اسے اگر یاد تھا تو صرف اپنا وطن... اپنی سرزمین... میدان اور کھیت... دوستوں کے حلقوں پر جان دینے والے... گھر کے سادہ چولہے سے اٹھنے والے دھوئیں... اس کی آنکھوں میں رچے بسے تھے... ان کی محبت... کسک... اور جدائی اس کی آنکھوں کو نم رکھتی... دشمنوں کے دیس میں رہتے ہوئے وہ ایک پل بھی اپنوں سے دور نہ رہا تھا...

# لہو کی تاثیر

محمد یاسر اعوان

لاہور میں ناشتا کرنے کا دعویٰ کرنے والوں کو جان بچانا مشکل ہوگیا۔ بھگدڑ مچی تو دور دور تک لاشیں اور ناکارہ ٹینک بکھرے نظر آنے لگے، جو بچ گئے وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ ایسے میں ریڈیو پاکستان سے گیت سنائی دے رہا تھا۔

''اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے
توں لبھدی پھریں بازار کڑے
اے نقدی سودا نہیں ملا
توں پچھدی پھریں ادھار کڑے''

ملکۂ ترنم کی دلوں کو گرما دینے والی آواز میں اس گیت نے میجر عثمانی کی رگوں میں خون کی روانی کو بڑھا دیا تھا، اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

جنگ شروع ہوئے دسواں دن تھا، پاک سرزمین پر ناپاک دشمن کے قدم رکھنے کی جسارت پر وہ ایسا بپھرا ہوا تھا کہ انہیں پاک دھرتی پر ہی نیست و نابود کرنے کے جذبے کے ساتھ سرحد تک آگیا تھا۔ اس کی جیپ میں موجود تین ساتھی جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ وہ آہوں اور سسکیوں کے ساتھ انہیں ایک گڑھے میں امانتاً دفن کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ کیونکہ اس کا رابطہ اپنے ساتھیوں سے کٹ چکا تھا۔ وہ اکیلا ہی دور دور تک پھیلے ویرانے میں دشمن کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

گاڑی پیٹرول سے چلتی ہے، پیٹرول ختم ہو جائے تو گاڑی معذوری ظاہر کر دیتی ہے۔ سرکاری جیپ میں موجود پیٹرول ختم ہوا تو وہ جھنجلا گیا۔ اپنی نقرئی سنگین والی دور مار رائفل، چاقو، دوربین اور ایمونیشن جیبوں میں بھر کر وہ نیچے اُتر آیا۔ اس کے پاس اتنا اسلحہ تھا کہ دشمن سے سامنا ہونے پر دو تین دن تک کسی محفوظ مورچے میں چھپ کر دشمن کے قدم روک سکتا تھا۔ جیپ سے اُتر کر چھاگل سے پانی کے آخری چند گھونٹ حلق سے اتارے۔ پانی بھی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دور دور تک سناٹا اور ویران صحرا تھا۔ کبھی کبھی کسی طیارے کی دور سے آتی ہوئی آواز سنائی دیتی تو وہ کسی ٹیلے، درخت یا جھاڑیوں کی آڑ میں چھپ جاتا تھا۔

وہ اللہ کا نام لے کر ایک سمت میں بڑھتا چلا جارہا تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ کس طرف بڑھ رہا ہے، آگے اس کی ملاقات دوستوں سے ہوگی یا دشمن سے......

وہ ساری رات اندھیرے میں چلتا رہا، چلتے چلتے تھک جاتا تو ریت پر ہی بیٹھ کر دو گھڑی آرام کر لیتا۔ رات گہری تھی۔ ستارے اور چاند سب ہی گہرے بادلوں کے عقب میں چھپے ہوئے تھے۔ دور دور تک سوائے تاریکی کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس ویرانے میں خطرناک جانوروں کا بھی خدشہ تھا۔ اس کے پاس اسلحہ تھا۔ گیدڑ یا کتے وغیرہ اس پر حملہ کرتے تو ان سے نمٹا جا سکتا تھا۔ البتہ سانپ بچھو یا اس جیسے موذی جانوروں کا دھڑکا ہر قدم پر اس کے ساتھ تھا۔

وہ ایک بہادر نوجوان تھا۔ عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ چمکدار سفید اور سیاہ آنکھیں، چوڑی پیشانی اور مضبوط کسرتی جسم۔

ویرانے میں اچانک آنکھوں کے سامنے روشنی سی لہرا گئی۔ وہ سمیرا کا روشن چہرہ تھا جو اس کی نظروں کے سامنے گردش کر رہا تھا۔ سمیرا اس کے چچا کی بیٹی تھی۔ بچپن سے ساتھ کھیل کر اس کی نگاہوں کے سامنے جوان ہوئی تھی۔ فوج میں بھرتی ہونے کا خیال اسی کا تھا۔ سرسوں کے کھیت میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتے ہوئے اس نے سفید موتیوں جیسے دانت چمکا کر اس کی طرف دیکھا تھا تو دنداسے کے رنگے ہوئے کتنے مسوڑھے عثمان عرف عثمانی کو بھا گئے تھے۔ سمیرا نے کہا تھا۔

''عثمانی! تو فوج میں بھرتی ہو جا! تیرا ابا بھی فوجی تھا۔ تصویر میں وہ بہت گبرو لگتا تھا۔ وردی تیرے بدن پر خوب سجے گی۔''

عثمان عرف عثمانی اس کی مسکان کو ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھوں میں سجا کر بولا تھا۔ ''تجھے کیا پتا وردی مجھ پر جچے گی...... تو نے مجھے جوان ہونے کے بعد سے دیکھا ہی کب ہے؟ بچپن ان کھیتوں میں گزرا پھر میں شہر چلا گیا اور اب آیا ہوں تو...... تو......''

سمیرا بولی۔ ''اب کیوں آیا ہے؟''

''صرف تجھے دیکھنے...... اور تو مجھے فوج میں بھرتی ہونے کا کہہ رہی ہے۔''

''تو فوج میں بھرتی ہونا کوئی بُری بات ہے؟ گاؤں کے جتنے جوان ہیں، سب فوج میں جانا چاہتے ہیں۔ تو شہر جا کر شہریوں جیسا ہوگیا ہے کیا؟'' اس کا لہجہ میٹھا تھا۔ عثمان کو یقین تھا کہ ہونٹ لہجے سے بھی زیادہ میٹھے ہوں گے۔ وہ اسی مٹھاس کو دل ہی دل میں محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''مگر فوج کی نوکری...... کہیں تجھے مجھ سے دور نہ کر دے۔'' سمیرا کھلکھلا کر ہنس دی۔

''میں تو تجھ سے ویسے بھی دور ہوں۔'' یہ کہہ کر اس

نے عثمان کو دھکا دے دیا۔ وہ سبز پتوں اور سرسوں کے زرد پھولوں پر گر گیا۔ وہ ہنستی ہوئی بھاگتی چلی گئی۔ اس کی ہنسی پورے کھیت میں گونج رہی تھی۔ کھیت ہی کیا، صحرا میں بھی گونج رہی تھی، واضح طور پر میجر عثمانی کے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ میٹھا میٹھا رس اس کے کانوں میں انڈیل رہی تھی۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا......

چاروں طرف سکوت تھا۔ جھینگروں کی سائیں سائیں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اپنے آپ پر ہنس کر رہ گیا۔

سمیرا کی مترنم ہنسی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس نے مشرق کی طرف نظر دوڑائی۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے والا تھا۔ وہ ساری رات چلتا رہا تھا۔ اندھیرے میں بھٹکتا رہا تھا۔ اب تک کوئی گاؤں یا آبادی اس کے راستے میں نہیں آئی تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں مگر پھر چونک گیا۔ اس کے ہاتھ قریب رکھی ہوئی رائفل پر جم گئے۔ مترنم گھنٹیاں اب تک اس کے کانوں میں بج رہی تھیں۔ بالکل سمیرا کی ہنسی کی سی آواز تھی۔ اس ویرانے میں ہنسی کی آواز...... مگر نہیں، وہ سمیرا کی ہنسی نہیں تھی کسی اور کی آواز تھی۔

اس کا پورا وجود چوکس ہو گیا، وہ اٹھ بیٹھا، یقیناً قریب میں کوئی تھا۔ کوئی اس کے آس پاس موجود تھا مگر کسی عورت کا اس ویرانے میں ہونا اچنبھے کی بات تھی۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ یقیناً نزدیک ہی کوئی گاؤں ہے۔ وہ ایک ٹیلے کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ چوکنی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا مگر اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا سوائے چند درختوں کے جو کافی فاصلے پر تھے۔ ارد گرد کھیت تھے۔ ایک چھوٹی سی نہر کا شور بھی تھا۔

ہنسی کی آواز پھر سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی عورت کا کھنکتا ہوا جملہ اس کی سماعت سے ٹکرایا۔

"ذرا پیچھے ہٹ کر بات کر! شاید تجھے علم نہیں ہے گاؤں میں کوئی بھی ایسا جوان پیدا نہیں ہوا جس کا بازو میں نے پکڑا ہو اور اس نے چھڑا لیا ہو۔"

"اچھا چل، میری بانہہ پکڑ! قسم واہگرو کی چھڑاؤں گا نہیں۔ تجھے سینے سے لگا لوں گا۔ ساری زندگی تیرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر گزار دوں گا۔"

"چل چل باتیں نہ بنا! میں اچھی طرح جانتی ہوں میری اصل نیت کیا ہے جو بھی بات کرنی ہے دور ہی رہ کر کر۔ سورج نکلنے والا ہے۔ کوئی اٹھ کر اس طرف آ گیا تو ساری قسم نکل جائے گی۔"

اس کے بعد آوازیں سرگوشیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ عثمانی سمجھ گیا۔ وہ محبت کرنے والا جوڑا ہے۔ صبح ہونے سے پہلے گھر سے نکل کر ویرانے میں ملنے آئے ہیں۔ اس کا مطلب تھا جنگ اس علاقے سے بہت دور لڑی جا رہی تھی۔ ان کی گفتگو سے اس پر یہ انکشاف ہو گیا تھا کہ وہ دشمن کے علاقے میں بہت اندر تک آ گیا ہے۔ اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس کے پاس اسلحہ بھی تھا اور جسم پر پاک فوج کی یونیفارم بھی۔

اس حالت میں یہاں پکڑا جاتا تو بچنا مشکل ہو جاتا۔ بچ جاتا تو جنگی قیدی بن جانے کے بعد کتنا عرصہ جیل کی کال کوٹھری میں گزارنا پڑتا اسے معلوم نہ تھا۔ وہ وہیں دُبکا بیٹھا رہا۔ رات کی سیاہی اپنا اثر کھونے لگی تھی۔ اسی وقت پازیب بجنے کی آوازیں سنائی دیں۔ چند لمحوں بعد ایک ٹیلے کی اوٹ سے اوڑھنی لپیٹے ایک نسوانی جسم درختوں کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ درختوں سے پرے مشرقی جانب کھیت تھے۔ لڑکی درختوں کے دوسری جانب جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میجر عثمانی نے اوٹ میں سے جھانک کر دیکھا۔ ایک دیہاتی نوجوان جس نے دھوتی اور کرتہ پہن رکھا تھا، کھیتوں کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ میجر عثمانی نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور دبے پاؤں اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ جوان آہٹ پا کر پلٹا مگر اپنے سامنے ایک فوجی کو دیکھ کر سٹپٹا گیا۔ میجر عثمانی نے رائفل کی نال اس کے سینے سے لگا دی اور سرد آواز میں کہا۔

"چلانے یا شور مچانے کی کوشش کی تو مار ڈالوں گا۔ کوئی ایسی جگہ بتاؤ جہاں سب سے چھپ کر باتیں کر سکیں۔"

سورج ابھی تک تاریکی کا سینہ چیر کر مشرق سے ابھرا نہیں تھا مگر مشرقی سمت میں پھیلنے والی سرخی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر تک دن کی ابتدا ہو جائے گی۔ ایسے میں اتنی روشنی تھی کہ وہ دیہاتی جوان، اس رائفل بردار فوجی کا چہرہ بھی دیکھ سکتا تھا اور بدن پر موجود وردی بھی۔ دیہاتی کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "کک...... کون ہو تم...... آپ...... اپنی طرف کے تو نہیں لگتے۔"

میجر عثمانی نے دھیمی مگر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں، میں یہاں کا نہیں، بھٹک کر آ گیا ہوں، یہ دشمن کی سرزمین ہے۔ یہاں پکڑا گیا تو مارا جاؤں گا مگر مرنے سے پہلے دو چار کو جہنم میں ضرور پہنچا دوں گا۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ فوراً کوئی ایسی جگہ بتا دو، جہاں میں دن کے اجالے میں چھپ سکوں...... ورنہ......" جملہ ادھورا چھوڑ

دیا۔
دیہاتی نوجوان کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ مضبوط بدن کا مالک تھا مگر پاکستانی فوجی کو سامنے دیکھ کر اس پر ہیبت طاری ہوگئی اور کوشش کے باوجود اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ بمشکل تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''یہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں، گاؤں کے پرلی طرف ایک ریسٹ ہاؤس ہے۔ اس کے قریب ملازموں کے کوارٹرز ہیں۔ میرا ابا ریسٹ ہاؤس کی چوکیداری کرتا ہے۔ وہیں ایک کوارٹر میں رہتا ہے اور......''

میجر عثمانی نے سوچتے ہوئے کہا۔''اس کوارٹر میں ایک دن چھپ کر رہا جاسکتا ہے؟''

''ہاں مم...... مگر......'' دیہاتی بولا۔ ''مگر ان دنوں ریسٹ ہاؤس میں کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں...... یہ نال ہٹالو۔ تم لہجے سے پنجاب کے لگتے ہو، میں تمہیں دھوکا نہیں دے سکتا۔ میرا چاچا تقسیم کے وقت وہیں رہ گیا تھا...... اور......''

میجر عثمانی کو اس کی آنکھوں میں اپنائیت نظر آئی۔ وہ بولا۔''تمہارا چاچا...... کہاں رہتا ہے وہ؟''

''لاہور کے ساتھ ہی ہماری زمینیں تھیں۔ پنجاب دو ٹکڑے ہوا تو دادا ادھر تھا میرا ابا یہاں آگیا۔ چاچا وہیں ہے۔ میں اس وقت گود میں تھا۔ ساری زندگی یہاں گزاری مگر میرا دل وہیں دھڑکتا ہے...... وہاں جانے کو بے چین رہتا ہوں۔''

میجر عثمانی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اندھیرا رفتہ رفتہ چھٹنے لگا تھا۔ اس کے خدوخال واضح ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا کرب تھا۔ میجر عثمانی نے پوچھا۔''چاچا کے لیے کوئی بھتیجا بے چین نہیں ہوتا۔ پر تیرا دل وہاں کیوں دھڑکتا ہے؟''

وہ مشرق کی جانب بلند ہوتی سرخی پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔''ماں......! میری ماں وہیں رہ گئی۔ وہ ابا کے ساتھ ادھر نہیں آئی تھی۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ اس کے ماں باپ...... بہن بھائی...... سب وہیں تھے۔ وہ ابا کو چھوڑ سکتی تھی، مجھے بھول سکتی تھی مگر اپنی ماں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی اور......''

میجر عثمانی اس کی ساری کہانی سمجھ گیا، بات کاٹ کر بولا۔''دن نکلنے والا ہے۔ میرے بدن پر فوجی وردی ہے۔ مجھے اپنا حلیہ تبدیل کرنا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں اگر زندہ بچ کر واپس گیا تو تیری ماں کو تجھ سے ملانے کا بندوبست کروں گا، میں بھی لاہور کا رہنے والا ہوں۔''

نوجوان بولا۔''کھیتوں کے پاس ٹیوب ویل ہے، وہاں میرے کپڑے پڑے ہیں۔ دشمن کی مٹی میں بھی سگی دوست مل جاتے ہیں۔ تُو تو میری ماں کے دیس سے آیا ہے۔ تو میرا مہمان ہے۔ ٹیوب ویل پر چل کر کپڑے بدل لے...... پھر میں تجھے بابا کے کوارٹر میں لے جاؤں گا۔ سارا دن وہیں گزارنا...... رات کو نکل جانا...... چاہو تو رانی پور پہنچا دوں گا۔ ٹریکٹر ہے ہمارے پاس۔ وہاں سے دہلی کے لیے بس جاتی ہے۔ دو دن میں وہاں پہنچ جاؤ گے۔ دہلی بہت بڑا شہر ہے۔ انسانوں کا جنگل ہے وہاں۔ اس بھیڑ میں گم ہو جانا۔ محنت مزدوری کر کے چار پیسے کمانا۔ پھر کسی ایجنٹ کے ذریعے واپس اپنے ملک چلے جانا۔''

اس کی بات دل کو لگتی تھی۔ میجر عثمانی نے کہا۔''تم دشمن کی زمین پر پہلے دوست ہو، دھوکا مت دینا، سامنے سے آکر وار کرو گے تو خوشی ہوگی، تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟''

''میرا نام مکھن سنگھ ہے۔ قسم ہے واہگرو کی۔ ہم جس کو دوست بنا لیں اس کی پیٹھ پر وار نہیں کرتے، اس کے دشمن کا وار اپنی پیٹھ پر سہہ لیتے ہیں۔''

اس کے لہجے کی سچائی، میجر عثمانی کو بھروسا کرنے پر مجبور کررہی تھی۔ ویسے بھی اس کے پاس بھروسا کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ فی الوقت دن کی روشنی میں لوگوں کی نظروں سے چھپنا اس کا پہلا مسئلہ تھا۔ کسی محفوظ ٹھکانے پر بیٹھ کر آئندہ کی منصوبہ بندی کی جاسکتی تھی۔ اس طرح کھیتوں کے قریب میدان میں کھڑے رہ کر زیادہ وقت برباد کرنا خطرناک تھا۔

میجر عثمانی نے رائفل کی نال نیچے کرلی۔ انجان شخص دوست بن جائے تو اس پر اسلحہ نہیں اٹھایا جاتا۔ مدد کے لیے آمادہ انسان پر بھروسا کیا جاتا ہے۔ وہ تو ویسے بھی اسے نقصان پہنچانے یا دشمن بنانے کے خیال سے اس کے قریب نہیں آیا تھا۔ اسے دیارِ غیر میں دوستوں کی ضرورت تھی۔ اس کی جان لینے والے دشمن تو بھارتی وردی میں بہت تھے۔

مکھن سنگھ کے چہرے پر سکون پھیل گیا اور اس کی گھبراہٹ دور ہوگئی۔ وہ تیزی سے بولا۔''جلدی کرو، ٹیوب ویل کے چھپر کے ساتھ سامان وغیرہ رکھنے کا کمرا ہے، ہمیں جلد از جلد وہاں پہنچ جانا چاہیے۔ ابھی دن نکلنے سے پہلے کسان کھیتوں کی طرف آنا شروع ہو جائیں گے۔ ان

کے آنے سے پہلے ہمیں ریسٹ ہاؤس پہنچنا ہوگا۔ صاحب لوگوں کے اٹھنے سے پہلے، ورنہ بڑی گڑبڑ ہوجائے گی۔''

وہ تیز تیز قدموں سے کھیتوں کی طرف چل دیے، دور دور تک گنے کے کھیت تھے، قدِآدم گنوں کے وسیع سلسلے میں گھس کر وہ کچھ دیر کے لیے محفوظ ہو گئے تھے۔ اگر کسان کھیتوں کا رخ کر بھی لیتے تو شاید ان کی نظر نہ پڑتی۔ چاروں طرف پُرسکون خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی دور سے گزرتے ہوئے کسی فوجی طیارے کی آواز ہوا سے رگڑ کھا کر وہاں تک پہنچ جاتی۔ میجر عثمانی کو آوازوں سے فاصلے کا اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی۔ کئی میل دور سے آتی ہوئی آوازوں سے صاف پتا چل رہا تھا کہ سرحد بہت پیچھے رہ گئی ہے۔

دس پندرہ منٹ وہ خاموشی سے چلتے رہے نہ مکھن سنگھ نے کوئی بات کی نہ ہی میجر عثمانی نے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی۔ دن نکلنے سے پہلے وہ ایک ٹیوب ویل کے قریب پہنچ گئے۔ مکھن سنگھ نے ٹیوب ویل کا بٹن آن کردیا۔ گھر گھر کی آواز سے پرانی سال خوردہ پانی کھینچنے والی موٹر چل پڑی۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا کھولی نما کمرا تھا۔ ایک بیل گاڑی بغیر بیلوں کے نیچے کو جھکی پڑی تھی۔ مکھن سنگھ نے گھاس پھوس اور مٹی سے بنے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

''ادھر، وہاں ایک دھوتی اور کرتہ ہے، پگڑ بھی ہے۔ اسے پہن لو، تمہارا حلیہ تبدیل ہوجائے گا۔''

میجر عثمانی کمرے میں داخل ہوگیا۔ ایک لمحے کو اسے محسوس ہوا کہ کہیں مکھن سنگھ اسے دھوکا تو نہیں دے رہا مگر پھر ایک طویل سانس لے کر کمرے میں چلا گیا۔ مٹی کی دیوار پر کیل سے دھوتی اور کرتہ ٹنگا تھا۔ ایک جھلنگا سی چارپائی اور مٹکا بھی تھا۔ دو چار برتن بھی اوندھے پڑے تھے۔ ایک طرف بیلوں کا چارا تھا۔

میجر عثمانی نے رائفل اور وردی چارے کے نیچے چھپا دی۔ دھوتی کرتہ پہن کر اور پگڑ سر پر لپیٹ کر جب وہ باہر آیا تو اب اسے کوئی شناخت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے نیفے میں صرف ایک چاقو اڑسا ہوا تھا۔ باقی ساری چیزیں اندر ہی چھپادی تھیں۔

مکھن سنگھ نے اس کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔ ''قسم ہے واہگرو کی! اس علاقے کا کوئی بھی شخص تمہیں نہیں پہچان سکے گا۔ ویسے...... تمہارا نام کیا ہے؟''

میجر عثمانی نے ایک لمحے سوچا پھر کھیتوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''شیر دل...... شیر دل ہے میرا نام۔''

مکھن سنگھ بولا۔ ''یہ نام یہاں نہیں چلے گا۔ بابا کو معلوم ہے اس علاقے میں کوئی مسلمان نہیں رہتا...... ایسا کرو...... تم اپنا نام...... وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''ہاں دلیر سنگھ...... دلیر سنگھ میرا دوست ہے، یہاں سے تین گاؤں پرے مرالی پور میں رہتا ہے، بابا کو معلوم ہے۔ میں مرالی پور میں کبڈی کھیلنے جاتا ہوں اور وہاں دلیر سنگھ نام کا میرا ایک دوست بھی ہے۔ میں کہہ دوں گا۔ تم دلیر سنگھ ہو، گاؤں میں دشمنی ہوگئی ہے۔ چھپنے کے لیے میرے پاس آئے ہو۔ چوہدری تمہارا دشمن بن گیا ہے، تمہیں دو تین دن یہیں چھپ کر رہنا ہوگا۔''

میجر عثمانی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میری رائفل اور دوسری چیزیں اسی کھولی میں ہیں۔ یہ میری امانت ہیں تمہارے پاس۔''

''اس کی تم فکر مت کرو جی! میں اپنی جان سے زیادہ اس کی حفاظت کروں گا۔ جب ضرورت ہو، آکر یہاں سے لے جانا۔'' مکھن سنگھ نے جواب دیا۔

اب ان کا رخ ریسٹ ہاؤس کی طرف تھا، جو نہر کے کنارے کافی فاصلے پر بنی ہوئی ایک پکی عمارت تھی۔ راستے میں میجر عثمانی نے پوچھا۔

''وہ لڑکی کون تھی؟'' مکھن سنگھ چلتے چلتے رک گیا۔

''لڑکی۔'' پھر وہ ہنس پڑا۔ ''اس کا مطلب ہے تم نے ہماری باتیں سن لی تھیں۔''

میجر عثمانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ مکھن سنگھ چند منٹ کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''اسی گاؤں میں رہتی ہے۔ سندر کور نام ہے اس کا۔ ہاتھ پاؤں کی بڑی مضبوط ہے۔ میں اس کو پسند کرتا ہوں۔ کبھی کبھی ویرانے میں ملنے آجاتی ہے مگر مضبوط عورت ہے۔ اکیلے میں بھی پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی۔''

میجر نے کہا۔ ''ہاں، یہ بات مجھے معلوم ہوچکی ہے مگر میں حیران ہوں۔ تمہارے ٹیوب ویل پر اتنی اچھی جگہ ہے...... پھر ان ویران ٹیلوں میں کیوں ملتے ہو؟''

مکھن سنگھ نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ ''سمجھا کرو، بابو جی ٹیوب ویل محفوظ جگہ نہیں ہے۔ یہاں ٹیوب ویلوں پر بے شمار نوجوان عشق کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔ سب ٹیوب ویل کو محفوظ جگہ سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ کھیتوں میں ملتے تھے مگر اس علاقے میں سانپ بہت ہیں، ایک مرتبہ کھیتوں میں سانپ نے ایک لڑکی کو ڈس لیا تھا۔ اس کے بعد کوئی لڑکی رات کو کھیتوں میں نہیں آتی جس کو ملنا ہوتا ہے،

ان اونچے ٹیلوں میں آجاتی ہے۔ یہ ٹیلے محبت کی پناہ گاہ ہیں۔ یہاں محبت کی بہت سی داستانوں نے جنم لیا ہے۔ یہاں رات کے اندھیرے میں کوئی تلاش کرتے ہوئے آجائے تو کسی کو ڈھونڈنا مشکل ہوتا ہے۔ محبت کرنے والے اونچے ٹیلوں کی آڑ لے کر آسانی سے نکل جاتے ہیں۔"

مکھن سنگھ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ جگہ واقعی محفوظ تھی۔ کوئی ایک مرتبہ اس طرف نکل جائے تو اندھیرے میں اس کو تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ باتیں کرتے کرتے ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ دن نکل آیا تھا۔ چمکیلی دھوپ پورے ماحول کو آغوش میں لے چکی تھی۔ سرخ اینٹوں سے بنی وہ عمارت بہت پرانی تھی۔ شاید انگریزوں کے دور میں بنائی گئی تھی۔ گاؤں کے کچے مکان بہت دور سے دکھائی دے رہے تھے۔ عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس کی پشت پر چھوٹے چھوٹے کئی کوارٹرز بنے تھے۔ مکھن سنگھ، میجر عثمانی کو ایک کوارٹر میں لے گیا۔ ایک بوڑھا سکھ زمین پر اکڑوں بیٹھا لسی پی رہا تھا۔ مکھن سنگھ اسے اشارے سے باہر لے گیا۔ میجر عثمانی کمرے میں پرانی سی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد مکھن سنگھ اندر آیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ آتے ہی بولا۔ "اچھا بھائی دلیر سنگھ! یہاں تم مرالی پور کے چوہدری سے چھپ کر جتنے دن چاہو رہ سکتے ہو۔ تم نے بُرے وقت میں دوست سے مدد مانگی ہے۔ گھبرانا مت...... واہگرو کی قسم...... دوستی کا حق ادا کروں گا۔" اس کا بوڑھا بابا بھی اندر آگیا۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں پُتر! جیسے یہ میرا بیٹا ہے ویسے ہی تو ہے۔ اندر ہی رہنا۔ صرف رات کے وقت باہر نکلنا۔ دن میں صاحب لوگ باہر جاتے ہیں۔ سورج ڈھلنے سے پہلے آجاتے ہیں۔"

میجر عثمانی نے یونہی سرسری انداز میں پوچھا۔ "کون لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

"سرکاری آدمی ہیں، کوئی فوجی آفیسر ہے۔ اس کی ایک بیٹی بھی ساتھ ہے۔ کل چار افراد ہیں۔ ایک ان کا ڈرائیور ہے مگر رشتے دار لگتا ہے۔ اسی لیے ریسٹ ہاؤس میں اپنے ساتھ سلاتے ہیں۔ ایک بڑے صاحب کا دوست ہے۔ وہ اپنی جیپ میں سے نکلتا ہے تو ہر وقت...... کیا کہتے ہیں اسے...... ہاں دوربین، اس سے چاروں طرف دیکھتا رہتا ہے۔"

مکھن سنگھ کا بابا کچھ زیادہ ہی باتونی تھا۔ ایک سوال پر پوری کہانی سنانے بیٹھ جاتا تھا۔ مکھن سنگھ تو لسی وغیرہ پی کر چلا گیا۔ میجر عثمانی وہیں بیٹھ گیا۔ بابا بھی اپنی ڈیوٹی پر باہر چلا گیا۔ اس کے ذمے چوکیداری کا کام تھا۔ جب صاحب لوگ دو چار ماہ بعد کبھی اس طرف آتے تو اس کی ڈیوٹی شروع ہو جاتی تھی۔ ورنہ وہ بھی گاؤں میں اپنے گھر میں چارپائی پر پڑا رہتا یا برفی والے کی دکان پر جوانی کے قصے سناتا رہتا تھا۔

شام تک وہ اس چھوٹے سے کمرے کی چارپائی پر لیٹے لیٹے بیزار ہو گیا۔ وہ فوجی تھا۔ جنگ کے دنوں میں یوں پڑے رہنا اس کے لیے خودکشی کر لینے کے مترادف تھا۔ صاحب لوگ حسبِ معمول پرانی سی جیپ میں بیٹھ کر جا چکے تھے۔ میجر کو اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ ان لوگوں کی یہاں موجودگی محض تفریح نہیں ہے، بابا نے باتوں باتوں میں اسے بتا دیا تھا کہ صاحب کا نام کرنل کلدیپ کمار اور ان کی بیٹی کا نام سیتا ہے۔ وہ اپنی باتوں اور سخت لہجے سے خود بھی فوجی ہی لگتی ہے۔ بابا نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "دلیر سنگھ! وہ تو پوری کی پوری فوجی ہے۔ اس کا باپ بھی اتنے غصے میں بات نہیں کرتا، جتنا وہ بات بات پر جھڑکتی ہے مگر ہے بہت ملوک...... میں نے اپنی پوری حیاتی میں اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی۔"

میجر عثمانی کو سمیرا یاد آگئی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا میں سمیرا سے حسین اور خوب صورت لڑکی کوئی اور نہیں ہوگی۔

ہر پیار کرنے والا اپنی محبوبہ کے بارے میں ایسا ہی حسن زن رکھتا ہے مگر سیتا پر پہلی نظر پڑتے ہی وہ مان گیا تھا کہ وہ لاکھوں میں ایک ہے۔

اسے کوارٹر میں آئے دوسرا دن تھا کہ سیتا پر اس کی نظر پڑی۔ وہ اندر پڑے پڑے بیزار ہونے کے بعد تھوڑی ہوا خوری کے لیے باہر نکل آیا تھا۔ مکھن سنگھ کے بابا نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ ریسٹ ہاؤس کی حدود سے باہر نہ جائے، اس کے دشمن ضرور اسے تلاش کر رہے ہوں گے۔ بے چارے نے اپنے بیٹے کی سنائی ہوئی کہانی پر یقین کر لیا تھا۔ وہ اس کے کھانے پینے کے ساتھ ساتھ آرام کا بھی اس طرح خیال رکھ رہا تھا جیسے وہ اس کا اپنا بیٹا ہو۔ میجر عثمانی اس کی محبت سے گرویدہ ہو گیا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ دشمن کی زمین پر کوئی اس کا اتنا خیال رکھنے والا بھی ہو سکتا ہے۔

اس شام صاحب لوگ باہر گئے ہوئے تھے۔ میجر عثمانی باہر نکل آیا اور ٹہلنے لگا۔ کوارٹر کے دوسری طرف دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ڈوبتے سورج کا نظارہ بے حد دلفریب تھا۔ وہ کافی دیر تک ٹہلنے کے بعد واپس کوارٹر میں آکر لیٹ گیا۔ ابھی اسے لیٹے پندرہ بیس منٹ بھی نہیں

ہوئے تھے کہ بابا گھبرایا ہوا اندر آیا اور بولا۔ ''غضب ہو گیا...... بیٹا...... کیا تم باہر نکلے تھے؟''

اس نے چونک کر بیٹھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بابا نے فکرمند لہجے میں کہا۔ ''سیتا بی بی نے کھڑکی میں سے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ وہ مجھے بلا کر طرح طرح کے سوال کر رہی تھیں۔ ان کے سامنے جاتے ہوئے مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے...... بہت خطرناک لڑکی ہے وہ...... تت...... تم سے ملنا چاہتی ہے۔''

میجر عثمانی کے اعصاب تن گئے۔ ایک نیا خطرہ اسے اپنے اردگرد منڈلاتا دکھائی دینے لگا۔ یہی سوچ کر وہ مطمئن تھا کہ اس پورے علاقے میں اس کوارٹر سے محفوظ جگہ کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس ریسٹ ہاؤس میں کرنل کلدیپ کمار ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ یقیناً جنگ کے دنوں میں سرحد سے اندر گھس کر آنے والے جاسوسوں پر نظر رکھنے کے لیے ہی اس گاؤں کے قریب مورچا بنائے ہوئے تھے۔ میجر عثمانی نے اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''کرنل صاحب بھی اندر ہیں؟''

''نہیں، وہ جیپ لے کر نہر کے دوسری طرف گئے ہیں۔ سیتا بی بی کی طبیعت خراب تھی۔ وہ آج یہیں رک گئی تھیں ورنہ وہ بھی ہر روز ان کے ساتھ جاتی ہیں۔''

میجر عثمانی نے کہا۔ ''ایسا کرو، تم ان سے جا کر کہہ دو کہ میں چلا گیا۔ میں ابھی یہاں سے نکل جاتا ہوں۔ یہ بڑے لوگ ہیں۔ گاؤں کے چوہدریوں سے ان کے تعلقات ہوتے ہیں، ایسا نہ ہو، میں مشکل میں پھنس جاؤں۔''

''ٹھٹ...... ٹھیک ہے...... واہگرو...... خیر کرے...... لگتا ہے کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہے۔'' بابا انتہائی پریشان تھا۔

اسی وقت کوارٹر کا دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ بابا اور میجر عثمانی بُری طرح اچھلے۔ دروازے میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ کوارٹر میں دیا ٹمٹما رہا تھا، اس کی دھیمی روشنی براہِ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ لڑکی نہیں تھی۔ اسے محض لڑکی کہنا اس کی توہین تھی۔ وہ تو ایک ایسی اپسرا تھی جو شاید بھٹک کر اس طرف آنکلی تھی۔ میجر عثمانی نے تصور میں بھی نہیں سوچا تھا کہ دنیا میں کوئی ایسی حسین و جمیل لڑکی بھی ہو سکتی ہے۔ چراغ کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ ہی نہیں پورا وجود روشن ہو رہا تھا۔ بڑی بڑی کٹورا آنکھیں، لانبے اور گھنے سیاہ بال بے حد نفاست سے ترشے ہوئے، دبیز ہونٹ اور غصے سے تپتے ہوئے گلابی رخسار۔ وہ چند لمحوں تک میجر عثمانی کو گھورتی رہی پھر گرجتی ہوئی مگر نہایت میٹھی آواز میں بولی۔ ''ہونہہ...... تو تم ہو دلیر سنگھ!''

میجر عثمانی نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ بابا کی رنگت زرد ہو چکی تھی۔ سیتا نے بابا کو گھورا۔ ''تم باہر جاؤ بابا! پتاجی آئیں تو فوراً مجھے خبر کر دینا۔ ذرا میں دلیر سنگھ سے دو چار باتیں کر لوں۔''

بابا نے بے بسی سے دلیر سنگھ کی طرف دیکھا۔ سیتا نے یکبارگی دوبارہ اسے گھورا تو وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

سیتا نے ایک ڈھیلا ڈھالا پاجامہ اور اوپر ڈھیلی جرسی پہن رکھی تھی۔ میجر عثمانی کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں فکر کی پرچھائیاں تھیں۔ سیتا چند لمحوں تک اسے گھورتی رہی، پھر ذرا نرم لہجے میں بولی۔ ''بیٹھ جاؤ، اور سچ سچ بتاؤ...... کون ہو تم؟''

میجر عثمانی کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ اس نے بولنے کو منہ کھولا...... مگر سیتا تیزی سے بولی۔ ''وہ کہانی مت سنانا جو چوکیدار نے سنائی ہے...... میں جانتی ہوں تم دلیر سنگھ نہیں ہو، بہت چالاک ہو...... دلیر سنگھ کے بھیس میں یہاں چھپے ہو۔''

میجر عثمانی نے ایک طویل سانس لی مگر اتنی آسانی سے اس ہوشیار لڑکی کی چال میں آنے والا نہیں تھا۔ وہ سوچ سوچ کر دھیرے دھیرے بولا۔ ''شاید آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میرا نام دلیر سنگھ ہی ہے۔ یہاں سے تین گاؤں پرے رہتا ہوں۔''

سیتا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''بہت خوب! یہاں سے چوتھا گاؤں...... میں وہاں کے چوہدری کو جانتی ہوں...... کیا نام ہے بھلا ان کا؟''

اب میجر عثمانی کو اندازہ ہوا۔ سیتا نام کی یہ لڑکی محض لڑکی نہیں، نفسیات کی ماہر کھلاڑی ہے۔ وہ اطمینان سے بولا۔ ''چوہدری...... کرتار سنگھ...... مرالی پور نام ہے میرے گاؤں کا۔''

میجر عثمانی براہِ راست سیتا کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مرالی پور کے چوہدری سے واقف نہیں۔ اس کے ساتھ چال چل رہی تھی۔ اس نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں...... تم نے مرالی پور کا صرف نام سنا ہے۔ کرتار سنگھ نام

کا کوئی چوہدری یہاں قریب کے کسی گاؤں میں موجود نہیں......اور تم دلیر سنگھ نہیں ہو......میں کھڑکی سے تمہیں چلتے پھرتے دیکھ چکی ہوں۔ تمہاری چال سویلین والی نہیں۔ فوجی چال ہے۔ ایک فوجی لاکھ بھیس بدل لے، اپنی چال اور انداز سے مار کھا جاتا ہے۔ میں نے تمہیں ایک لمحے میں پہچان لیا تھا کہ تم......"

میجر عثمانی نے کچھ کہنا چاہا تو وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "خاموش...... میں جب بول رہی ہوں تو کسی کو بیچ میں بولنے کی اجازت نہیں......میں سیتا ہوں، بھارتیہ انٹیلی جنس کی کیپٹن ستیا۔ میں اڑتے پنچھی کے پر گن لیتی ہوں۔ تم نے جو دھوتی، کرتہ پہنا ہے، وہ بھی تمہارا نہیں۔ چوکیدار بابا کا بیٹا مکھن سنگھ ان کپڑوں میں کئی مرتبہ یہاں آچکا ہے۔ میرے سامنے سچ اگل دو......ورنہ......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

میجر عثمانی نے کہا۔ "ورنہ کیا؟"

"ورنہ میرے ڈیڈی چند منٹوں میں تمہارے منہ سے اگلوالیں گے کہ تم اصل میں کون ہو، یہاں کیسے آئے ہو اور یہ بھی بتا دیں گے کہ تمہاری چتا جلائی ہے یا دفن کیا جائے گا۔"

میجر عثمانی نے کہا۔ "میں آپ کو بتا چکا ہوں...... میں دلیر سنگھ ہوں۔ مکھن سنگھ کا دوست......اور......"

سیتا پھنکاری۔ "مکھن سنگھ......! وہ اس وقت ریسٹ ہاؤس میں بیٹھا ہے۔ تم اپنا سچ اس کے منہ سے سننا پسند کرو گے یا......؟"

میجر عثمانی کی کھوپڑی میں دھماکے ہونے لگے۔ خون کی روانی میں تیزی آگئی۔ مکھن سنگھ کا نام سنتے ہی سمجھ گیا کہ بازی پلٹ چکی ہے۔ وہ دیہاتی ان لوگوں کے سامنے اس کا بھانڈا پھوڑ چکا ہے۔ فوراً ایکشن میں آجانا چاہیے......مگر ایک لڑکی پر حملہ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

وہ پُرسکون ہوتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے، میں دلیر سنگھ نہیں ہوں۔ اب چھپانا بیکار ہے۔ بتاؤ! تم کیا چاہتی ہو؟"

سیتا پُرسکون انداز میں بولی۔ "مکھن سنگھ نے جو کچھ بتایا ہے، وہ تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔ مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش مت کرنا، تم سمجھ سکتے ہو کہ اگر میں کیپٹن سیتا ہوں تو اس کا مطلب کیا ہے؟"

وہ کمزور بدن کی لڑکی میجر عثمانی کو واضح انداز میں بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ تر نوالہ نہیں ہے اگر اس نے اس پر حملہ کیا تو وہ بھی کمزور ثابت نہیں ہوگی۔ اگر وہ اس پر قابو پا بھی لیتا ہے تو اس کے بعد اس کی مشکلات میں اضافہ ہو جاتا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہاں، میں ایک فوجی ہوں...... پاکستانی فوجی...... راستہ بھٹک کر اس طرف آگیا ہوں اور......"

سیتا تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اس کی بات اس کے لیے غیر متوقع ہو۔ یہ بات میجر عثمانی نے بھی فوری طور پر محسوس کر لی۔ اسے خود پر غصہ آرہا تھا۔ اتنی جلدی اپنی اصلیت ظاہر کر دینا بہت بڑی حماقت تھی۔ سیتا واقعی بڑی ہوشیار لڑکی تھی۔ چوبیس سال سے زیادہ عمر کی نہیں لگتی تھی مگر اس کم عمری میں بھی لگتا تھا کہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکی ہے۔

اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مجھے صرف شک تھا...... مگر......" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس وقت باہر جیپ رکنے کی آواز سنائی دی۔ میجر عثمانی کے اعصاب تن گئے۔ سیتا نے ہوشیار ہوتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈی، واپس آگئے ہیں۔ تمہاری کہانی بہت دلچسپ ہوگی۔ اگر تم نے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کی تو......"

میجر عثمانی اس کی بات نہ سمجھ سکا۔ چونک کر بولا۔ "کک......کیا مطلب......"

سیتا نے جلدی جلدی اپنا جملہ پورا کیا۔ "تم یہیں چھپے رہو، گھبرانے یا بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ اس گاؤں سے باہر آرمی کے جاسوس جگہ جگہ موجود ہیں۔ تم کہیں نہیں جا سکتے۔ اب اس دھرتی پر بھگوان کے سوا کوئی تمہیں بچا سکتا ہے......تو وہ صرف اور صرف کیپٹن سیتا ہے۔ تم یہیں رہو۔ میں کل صبح تم سے ملوں گی۔"

وہ باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر گھومی اور بولی۔ "میں نے کہا ہے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ میرا کمرا اس کھولی کے عین سامنے ہے، میں کھڑکی کھلی رکھوں گی۔ اگر تم یہاں سے نکلے تو میری نظروں سے بچ نہیں سکو گے۔ میں فوراً شور مچا کر اپنے ڈیڈی کو ہوشیار کر دوں گی۔"

میجر عثمانی نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔ "مگر تم ایسا کیوں کر رہی ہو، میری اصلیت جان چکی ہو تو پھر......؟"

کیپٹن سیتا نے کہا۔ "کل صبح بتاؤں گی۔ تمہاری زندگی کی ضمانت اسی شرط سے جڑی ہے کہ تم ادھر ادھر جانے کی کوشش مت کرنا۔" وہ باہر چلی گئی۔

میجر عثمانی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سر پکڑ کر سوچنے لگا۔ کیپٹن سیتا نے اس کے ساتھ ایسا احسان کیوں کیا؟ کیا وہ واقعی کیپٹن ہے؟ یا کوئی اور چکر ہے؟ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد مکھن سنگھ کا بابا اندر آ گیا۔ تشویش بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''میرے تو کچھ پلے نہیں پڑا...... کیا چکر ہے، وہ کہتی ہے کہ تم پر نظر رکھوں۔ تمہیں اِدھر اُدھر نہ ہونے دوں۔ اگر تم غائب ہو گئے تو وہ مجھے اور مکھن سنگھ کو جیل میں بند کرا دے گی۔''

میجر عثمانی نے بابا کی طرف دیکھا۔ پریشانی کی لہریں اس کے چہرے پر مچلتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ بولا۔ ''تم فکر مت کرو بابا...... میں کہیں نہیں جانے والا...... یہیں ہوں۔''

''مگر سیتا بی بی نے ایسا کیوں کیا؟ کیا چاہتی ہے، وہ تجھ سے؟''

''یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔'' میجر عثمانی نے جواب دیا۔ ''میرے گاؤں کے حالات پوچھتی رہی۔ گاؤں کے چوہدری کا نام پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ میں یہاں کیوں چھپا ہوا ہوں؟''

بابا نے تڑپ کر کہا۔ ''تو نے یہ تو نہیں بتا دیا کہ تو خون کر کے بھاگا ہے؟''

میجر عثمانی ہکا بکا اس کی شکل دیکھتا رہ گیا مگر اگلے ہی لمحے سمجھ گیا کہ مکھن سنگھ نے اسے یہی بتایا ہوگا۔ چھپنے کی کوئی معقول وجہ اس کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ مکھن سنگھ کی سمجھ داری کا قائل ہو گیا۔ دھیرے سے بولا۔ ''نا بابا...... میں ایسی بے وقوفی کر سکتا ہوں بھلا؟...... میں نے بات بڑھانا اچھا نہیں سمجھا۔ گاؤں سے اِدھر اپنے دوست مکھن کے پاس آ گیا۔ چوہدری اور اس کے بیٹوں کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو واپس چلا جاؤں گا۔''

''شاباش پُتر......! یہ تو نے ٹھیک کیا۔ اب میں چلتا ہوں۔ صاحب لوگ کہتے ہیں ساری رات باہر پہرا دیا کروں۔ جنگ کا زمانہ ہے۔ کوئی پاکستانی جاسوس اس طرف دکھائی دے سکتا ہے۔ ویسے اور بھی لوگ ہیں جو ٹیلے کے دوسری طرف نگرانی کرتے ہیں۔'' بابا یہ کہہ کر چلا گیا۔

میجر عثمانی سن ہو کر رہ گیا۔ اس کا سامنا کسی سے نہیں ہوا تھا۔ اگر ہو جاتا تو اس وقت پورے علاقے میں اس کی ڈھونڈ مچی ہوتی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا مگر سیتا کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ وہ کرنل کی بیٹی تھی اور انٹیلی جنس میں کیپٹن کے عہدے پر فائز...... وہ اس کی شناخت جان گئی تھی لیکن اس نے اسے پکڑوانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کوٹھڑی میں بند رہنے کا حکم دے گئی تھی۔ نہ معلوم کیا چاہتی تھی وہ...... عجیب اُلٹی کھوپڑی کی عورت تھی۔ چاہتی تو ایک لمحے میں گرفتار کرا سکتی تھی...... مگر شاید وہ ایسا چاہتی ہی نہیں تھی۔ واقعی عورت کے دماغ میں کیا ہے؟ کون جانتا ہے۔ اس کے چچا کہا کرتے تھے۔ ''عورت ایک اُلجھی ہوئی پہیلی ہے، جسے سمجھنا مرد کے بس کی بات نہیں، وہ کس وقت کیا سوچتی ہے، کوئی نہیں جان سکتا، کس وقت کیا چاہتی ہے، کوئی نہیں اندازہ لگا سکتا۔''

میجر عثمانی نے سوچا، کہیں ایسا تو نہیں وہ خود کو اکیلی اور کمزور سمجھ کر اسے یہاں محض دھمکی دے کر چھوڑ گئی ہے، اب اس کے ڈیڈی آ گئے ہیں تو ان کے ساتھ آئے گی۔ مسلح افراد کو بھی ساتھ لائے گی تاکہ گڑبڑ نہ کر سکوں۔ یہ بات ذہن میں سما رہی تھی، مگر کافی دیر ہو گئی تھی۔ اسے گرفتار کرنے کوئی نہیں آیا۔ وہ فکر مند ہو کر کوٹھڑی میں ٹہلنے لگا۔ اسے امید تھی کہ جلد یا بدیر کوئی آئے گا۔ اس نے دروازے کی جھری میں سے جھانک کر دیکھا۔ عین ریسٹ ہاؤس کے کمروں کی پچھلی کھڑکی میں کیپٹن سیتا اپنے بال کھولے کھڑی تھی، کھڑکی پوری کھلی ہوئی تھی۔ چاندنی میں اس کا چہرہ تمتما رہا تھا، وہ کوٹھڑی ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میجر عثمانی چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔ رات ساڑھے آٹھ بجے کے قریب بابا اس کے لیے کھانا لے آیا۔ ساگ، بیسن کی روٹی اور لسی...... کھانا کھا کر اس نے ڈکار لی، بابا چلا گیا تو کوارٹر بند کر کے عشا کی نماز پڑھی اور سب کچھ خدا پر چھوڑ کر سکون سے سو گیا۔

دوسرے دن نو، دس بجے کے وقت بابا اپنی سرخ سرخ آنکھوں سمیت آیا۔ وہ شاید ساری رات جاگتا رہا تھا۔ آتے ہی عجیب انداز میں بولا۔ ''سیتا بی بی نے تمہیں بلایا ہے۔ وہ ریسٹ ہاؤس میں ہے۔ کہتی ہے کھانا اسی کے ساتھ کھاؤ۔''

میجر عثمانی اچنبھے میں پڑ گیا۔ کیپٹن سیتا کا رویہ بہت عجیب تھا۔ بابا سے پوچھا۔ ''کرنل صاحب بھی ہیں؟''

''نہیں، وہ صبح سویرے ہی قریب کے گاؤں گئے ہیں۔ رات ایک پاکستانی فوجی پکڑا گیا ہے۔ راستہ بھٹک کر اس طرف آ گیا تھا۔ سنا ہے زخمی ہے۔''

میجر کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ بابا سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ''چلو۔''

بابا اسے ریسٹ ہاؤس کے مرکزی دروازے سے

اندر چھوڑ کر چلا گیا اور بولا۔ ”بی بی جی نے یہی کہا تھا۔ دھیان سے بات کرنا۔ خون والی بات غلطی سے بھی زبان پر نہ لانا......“

میجر عثمانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ بڑے سے صحن کے بعد ایک راہداری تھی جس کے دونوں طرف تین تین کمرے تھے۔ پوری عمارت میں شاید اس وقت سیتا کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ صحن کے سامنے چھپر کے نیچے میز، کرسیوں کے پاس ایک کرسی پر براجمان تھی۔ گلابی ساڑی میں وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ میجر عثمانی نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے اپنا دل ڈولتا ہوا محسوس ہوا۔

کیپٹن سیتا نے دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔ وہ بیٹھ گیا تو کیتلی میں سے چائے پیالی میں انڈیلتے ہوئے بولی۔ ”تم نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ میں ساری رات تمہارے نام کے بارے میں سوچتی رہی۔ کل رات ایک پاکستانی جاسوس پکڑا گیا ہے، زخمی ہے، ڈیڈی اسی کو دیکھنے گئے ہیں۔“

زخمی پاکستانی فوجی کا سن کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اپنا ساتھی دشمن کی قید میں جائے تو دکھ ہوتا ہے، نہ جانے اب ہندوستانی بنیے، پاک دھرتی کے جوان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے، کیسی کیسی اذیتیں دیں گے۔ وہ خود بھی خطرناک صورت حال سے دو چار تھا۔ دشمن کی سرزمین پر دشمن کی ایک آفیسر کے سامنے بیٹھا اپنے مستقبل سے بے پروا اپنے زخمی ساتھی کے بارے میں سوچ رہا تھا پھر جیسے کیپٹن سیتا نے اس کی سوچیں پڑھ لیں۔ چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”ہماری فوج اور ایجنسیوں میں ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں جو میدانِ جنگ میں لڑنے کی ہمت نہیں رکھتے مگر دشمن کا کوئی فوجی ہاتھ آجائے تو اپنی ساری بزدلی کو بہادری سمجھ کر اس پر تشدد کے پہاڑ توڑ ڈالتے ہیں۔“

میجر عثمانی نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چالاکی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”جنگ میں ایک فوجی کو ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اگر دشمن سے دو بدو لڑنا بھی پڑے تو دفاعِ وطن کے لیے وہ اپنی جان تک قربان کر سکتا ہے اور اگر دشمن کے ہاتھ لگ جائے تو ان کے ظلم و ستم سہنا فخر کی بات محسوس کرتا ہے۔ ہمارا نعرہ تو آپ جانتی ہی ہوں گی۔ ’مر گئے تو شہید، بچ گئے تو غازی......‘ ویسے ہاتھ آئے دشمن پر ظلم کرنا بہادری نہیں بزدلی ہے اور......“ کیپٹن سیتا نے اس کی بات کاٹ دی، ایک ادا سے بولی۔

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ میں حقیقت سے آنکھیں نہیں چراتی، ہم چین سے بھی لڑتے رہے ہیں اور کشمیر میں بھی پاکستانی فوجیوں سے لڑتے ہیں۔ آزادی کے بعد سے ہی یہ لڑائی جاری ہے۔ میں سچ تسلیم کرتی ہوں کہ ہماری سینا میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھاتی ہے مگر قیدیوں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ وہ ساری ہزیمت کا بدلہ قیدیوں سے لیتے ہیں۔ اب اس بے چارے زخمی فوجی کے ساتھ جو سلوک ہونے والا ہے، اس کا سوچ کر روح تک کانپ جاتی ہے۔“

میجر عثمانی کی سمجھ میں اس کی بات کچھ کچھ آرہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میں دشمن کی دھرتی پر دشمن کی ایک آفیسر کے سامنے ہوں۔ اگر بھارتی سینا اپنی بھڑاس اس طرح نکالتی ہے تو زخمی قیدی کے ساتھ بُرا اور میرے ساتھ اچھا سلوک کیوں کیا جا رہا ہے؟“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے موتیوں جیسے دانت اس کی گلابی رنگت پر اور بھی زیادہ بھلے لگ رہے تھے۔ چند لمحوں تک ہنسنے کے بعد وہ بولی۔ ”ظلم اسی پر ہوتا ہے جس پر دل برہم ہو، تم پر کوئی برہم نہیں، وہ زخمی پکڑا جا چکا ہے، تم آزاد ہو۔ ابھی شکنجے میں نہیں آئے۔ مجھے معلوم ہے تم پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی گئی تو ایک دو کو مار کر ہی مرو گے۔ میں نے مسلمانوں کی تاریخ پڑھی ہے۔ مسلم جنگجو آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالتے۔ تم بھی ایسا نہیں کرو گے، اور تمہیں کوئی ایسا کرنے پر مجبور بھی نہیں کرے گا۔“

اس کی باتیں الجھا دینے والی تھیں۔ میجر عثمانی الجھن آمیز انداز میں بولا۔ ”صاف صاف انداز میں بات کرو کیپٹن سیتا! تمہاری باتیں لچھوں کی طرح ہیں جو الجھتی ہی جا رہی ہیں، میرے ساتھ ایسی رعایت کیوں؟“

سیتا نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ”جس پر دل آجائے، اس کی جگہ قید خانہ نہیں، دل ہوتی ہے۔ میں تمہیں دیکھنے کے بعد سے بری طرح تڑپ رہی ہوں۔ جان چکی ہوں کہ تم دشمن ہو، تمہارے ساتھ دل کا رشتہ نہیں ہو سکتا، مگر دل کسی دشمنی یا دوستی کی پروا نہیں کرتا۔“

وہ بُری طرح اچھل گیا۔ کیپٹن سیتا نے ایسی بات کہہ دی تھی جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اس کا تو یہی خیال تھا کہ وہ یہاں سے واپسی میں اسے مجبور کرے گی کہ وہ پاکستان میں رہ کر بھارت کے لیے جاسوسی کرے یا اس طرح کا کوئی اور کام۔ فوج میں رہنے کی وجہ سے اسے اچھی

طرح معلوم تھا کہ ہندو شاطر پالیسی ساز، ہر وہ چال چلتے ہیں جو یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف ماضی بعید میں چلی تھیں۔ وہ مسلمانوں کی صفوں میں اپنی جوان اور پُرکشش ناریوں کا جال بچھاتے ہیں۔ انہیں رام کرنے کے لیے ہندو لڑکیوں کو تحفے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ایسے کئی واقعات دس سالہ فوجی زندگی میں اس کی نظروں کے سامنے آچکے تھے۔ اب سیتا اس سے کسی ایسی بات کے لیے اپنا جال پھینکنا چاہ رہی تھی۔ اس نے سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”کیپٹن سیتا! دشمن سے دل لگی ہوتی ہے، دل کا تعلق نہیں۔ مجھے حیرت ہے، تم نے ایسی بات کس طرح کر دی؟“

سیتا اچانک دکھی نظر آنے لگی۔ وہ بولی تو اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ”میں نے ابھی تک تمہارا نام نہیں پوچھا۔ تم فوجی دشمن کی حیثیت سے میرے سامنے ہو۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں اپنا فرض پورا کروں اور تمہیں فوری طور پر گرفتار کروا دوں، مگر میں ایسا نہیں کرسکتی۔ تم اس وقت پریشانی میں ہو، مگر میں نے ساری زندگی کانٹوں پر گزاری ہے۔ آج تک ایسا کوئی مرد میرے قریب نہیں آیا جس کو میرے دل نے اپنا کہا ہو، تم وہ پہلے مرد ہو، جسے دیکھتے ہی میرا دل دھڑکا تھا۔ عورت کے دل کی دھڑکن تین طرح کی ہوتی ہے۔ ایک دھڑکن اس کے زندہ رہنے کا ثبوت ہے۔ ایک دھڑکن خوف کی ہوتی ہے۔ خود کو خطرے میں دیکھ کر اس کا دل شدت سے دھڑکتا ہے اور تیسری دھڑکن وہ ہوتی ہے جو من چاہے محبوب کو دیکھ کر دل میں ابھرتی ہے۔ میں بہت دکھی لڑکی ہوں۔ میرے اردگرد میرا اپنا کوئی نہیں ہے۔ رشتوں کے نام پر پوری دنیا میں صرف بھگوان ہے اور......!“

میجر عثمانی نے سیتا کی بات کاٹ دی۔ ”مگر مجھے تو معلوم ہوا ہے کہ تم کرنل کی بیٹی ہو......“

”نہیں میں کرنل کی بیٹی نہیں بلکہ میں کسی کی بھی بیٹی نہیں۔ نہ میری ماں ہے نہ باپ۔ جس کے ماں، باپ نہ ہوں وہ یتیم کہلاتا ہے۔ میں نے آنکھ کھولی تو یتیم تھی۔ ایک آرمی آفیسر نے مجھے پالا پوسا، جوان کیا۔ میں اپنی مرضی سے فوج میں آگئی۔ میرے منہ بولے ڈیڈی، ممی حادثے میں ہلاک ہوگئے۔ حکومت نے مجھے غیر ملکی جاسوسوں کی نگرانی اور ان کی پکڑ دھکڑ کے معاملے میں مصروف کرنل کلدیپ کے ساتھ کیپٹن کے عہدے پر تعینات کر دیا۔ آج تین سال ہو رہے ہیں اور میں کانٹوں پر زندگی گزار رہی ہوں۔“

میجر عثمانی بولا۔ ”آپ کی اردو قابلِ رشک ہے، ہندو ہوتے ہوئے اتنی اچھی اردو بولنا کمال ہے، میں آپ کے دکھ کو سمجھ سکتا ہوں، مگر کانٹوں پر چلنے والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ جس عہدے پر ہیں وہ آپ کے معاشرے میں قابلِ عزت سمجھا جاتا ہے۔ کتنی ہی لڑکیاں آپ جیسی خودمختاری کی زندگی گزارنے کی خواہش مند ہوں گی، پھر......“

کیپٹن سیتا نے اس کی بات کاٹ دی، پھیکی ہنسی کے ساتھ بولی۔ ”قابلِ عزت......! ہمارے شعبے میں عورتوں کو ان کی صلاحیتوں کی بنیاد پر نہیں، ان کی خوب صورتی کی وجہ سے اہم عہدوں پر تعینات کیا جاتا ہے۔ ہم سے وہ کام لیے جاتے ہیں جو کسی بھی معاشرے میں صرف طوائف ہی کر کے خود کو قابلِ عزت گردانتی ہے۔ ہمارے جاسوسی کے اداروں میں افسران ایسے دلال ہوتے ہیں جو ذرا سی دولت اور کوئی میڈل حاصل کرنے کے لیے اپنی بیوی یا بیٹی کو بھی اعلیٰ افسران کے کمروں تک پہنچا دیتے ہیں۔“

”تت......تو کیا......؟“ میجر عثمانی بڑبڑایا۔

کیپٹن سیتا نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”ہاں، کرنل کلدیپ...... مجھے یہاں خوامخواہ نہیں لائے۔ میں ان کی ماتحت ہونے کے ناتے اس مہم پر ان کے ساتھ آنے پر مجبور تھی۔ کرنل کلدیپ کے ساتھ ان کے ایک دوست منتری کا ناجائز بیٹا ہے، سریندر، وہ ہمارے محکمے میں ایک پوسٹ کا مالک ہے۔ دو چار مرتبہ میرے شریر کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرچکا ہے، ایک بار مجھ سے پٹ بھی چکا ہے۔ سریندر مجھے حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اس نے کرنل کلدیپ کو اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا ہے، اپنے منتری پتا کے ذریعے کرنل کو اعلیٰ فوجی اعزاز دلانے کے وعدے پر اس نے کرنل کو مجبور کیا کہ وہ اس مہم میں مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔ یہاں آکر دوسرے ہی دن کرنل کلدیپ میرے پیروں میں گر گئے۔ وہ چاہتے ہیں کہ...... میں سریندر کو خوش کردوں...... مگر میں ایسا نہیں کرسکتی۔“

میجر عثمانی کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کیپٹن سیتا ہندو تھی، مگر مسلمان عورت کی طرح اپنی عزت بچانے کے لیے جتن کر رہی تھی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”مگر تم...... کرنل کلدیپ کی شکایت اوپر کرسکتی ہو۔ پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟“

کیپٹن سیتا کی مسکراہٹ زہریلی ہوگئی۔ وہ اٹھ کر

کھڑکی کے پاس گئی۔ باہر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر تک گم صم دھوپ میں روشن کھیتوں کو گھورتی رہی پھر پلٹ کر بولی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا یہ آسان کام ہے؟ اول تو کوئی میری بات پر یقین ہی نہیں کرے گا، پھر...... آہ...... ہماری سروس میں نیچے سے اوپر تک سب کے سب دلال بیٹھے ہیں۔ اگر یہ اسکینڈل منظر عام پر آیا تو کسی کی صحت پر اثر نہیں پڑے گا۔ ساری بدنامی میرے ہی حصے میں آئے گی۔''

میجر عثمانی کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جس کے آگے پیچھے، دائیں، بائیں ہر طرف بھیڑیے ہی بھیڑیے تھے۔ وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو، میں اس معاملے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

کیپٹن سیتا بولی۔ ''تم، تم میری بہت مدد کر سکتے ہو۔ تم مسلمان ہو، میں نے کئی مذاہب کا مطالعہ کیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ صرف مسلمان ہی کسی عورت کی عزت اور حرمت کے اصل مفہوم سے آگاہ ہوتا ہے۔ میں یہاں ان کی قیدی ہوں۔ اس ریسٹ ہاؤس سے میں اس وقت تک واپس نہیں جاسکتی، جب تک اس کمینے سریندر کی خواہش پوری نہ کردوں۔ ریسٹ ہاؤس کے باہر کرنل اور سریندر کے آدمی پہرا دیتے ہیں۔ شام کو سریندر اور کرنل کلدیپ آجاتے ہیں، مجھے قائل کرتے اور ڈراتے رہتے ہیں۔ ابھی ان کی کوششیں مجھے راضی کرنے کی حد تک ہیں، جنگ نے انہیں بھرپور موقع فراہم کردیا ہے۔ جب تک جنگ جاری رہے گی تب تک یہ دونوں یہیں رہیں گے۔ جنگ کے خاتمے پر ہمیں واپس جانا ہوگا۔ تب یہ کچھ بھی کرسکتے ہیں اور...... میں نہیں چاہتی کہ وہ وقت آئے۔ میں بہت پریشان تھی، ایسے میں تم پر نظر پڑگئی...... اور تمہارے روپ میں مجھے اپنا دیوتا نظر آگیا۔ کیا تم میری مدد نہیں کرو گے؟''

''مدد! کیسی مدد؟''

''مجھ سے شادی کرلو، میرے پتی بن جاؤ، مجھے اپنی پتنی بنالو۔'' سیتا التجائیہ انداز میں بول رہی تھی۔

میجر عثمانی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ ٹپٹا کر بولا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا، بھلا میں ایسے کس طرح کرسکتا ہوں...... اور پھر کرنل اور سریندر...... کیا وہ مجھے آسانی سے چھوڑ دیں گے؟ وہ ہم دونوں کو ہلاک کردیں گے۔ میری شناخت چھپی نہیں رہ سکے گی اور......''

کیپٹن سیتا مسکرا کر بولی۔ ''تمہارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں، میرے سامنے بھی یہی ایک راستہ ہے جس کے ذریعے میں خود کو ان بھیڑیوں سے بچا سکتی ہوں۔ میں کوئی معمولی لڑکی نہیں ہوں۔ یہ دونوں میرے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتے، انہیں معلوم ہے، میں کتنی خطرناک ہوں۔ میری مرضی کے بغیر مجھے ہاتھ بھی لگایا تو میں ان کی ہڈیوں کا سرمہ بھی بنا سکتی ہوں اور تم...... مجھے کہنا پڑ رہا ہے، تمہیں حاصل کرنے کے لیے جان بھی ہار سکتی ہوں۔ جان دے بھی سکتی ہوں، لے بھی سکتی ہوں۔ اگر تم میرا ساتھ نہیں دو گے، میری خواہش پوری نہیں کرو گے تو کرنل کلدیپ کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتادوں گی، تم اس گاؤں کی سرحد سے باہر نہیں نکل سکو گے یا تو مار دیے جاؤ گے یا پھر قیدی بنا کر ٹارچر سیل میں پہنچ جاؤ گے۔''

وہ واقعی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کا لہجہ اور انداز غمازی کررہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے اس پر آنکھ بند کرکے عمل بھی کرسکتی ہے۔ میجر عثمانی کو وہ ایک خطرناک ناگن دکھائی دینے لگی اور وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

کیپٹن سیتا بولی۔ ''سوچنے کا وقت نہیں ہے تمہارے پاس۔ سوچتے وہ ہیں جن کے پاس ایک سے زائد راستے ہوں اور تمہارے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے۔ اپنی زندگی بچانے کے لیے تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں تم سے کہہ رہی ہوں۔''

میجر عثمانی نے تلخ انداز میں کہا۔ ''تم بھول رہی ہو سیتا۔ میں تمہیں آسانی سے ہلاک کرکے فرار ہوسکتا ہوں۔ تم مرجاؤ گی تو تمہاری لاش بھی یہ نہیں بتاسکے گی کہ تمہیں مارنے والا اسی دیہات کا کوئی شخص تھا یا تمہارے دشمن ملک کا کوئی فوجی۔''

کیپٹن سیتا مسکرائی اور بولی۔ ''یہ تمہاری بہت بڑی غلطی ہوگی۔ پہلے تو تم لڑائی بھڑائی میں مجھے شکست نہیں دے سکتے۔ اگر ایسا مان بھی لیا جائے تو کیا تمہاری غیرت گوارا کرے گی کہ ایک ایسی عورت پر ہاتھ اٹھاؤ جو پہلے ہی حالات سے ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔''

میجر عثمانی نے کہا۔ ''ابھی تم کہہ چکی ہو کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ میں اس وقت حالتِ جنگ میں ہوں۔ کسی عورت پر ہاتھ اٹھانا، یقیناً مردانگی تو نہیں ہے مگر جب عورت دشمن کی خطرناک آفیسر ہو اور اس کی آواز بند کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو یہ کڑوا گھونٹ بھی پینا پڑتا ہے۔''

کیپٹن سیتا ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس

کی آنکھوں میں یک لخت پانی تیرنے لگا۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔ ”میں نے زندگی میں کسی مرد کو اپنے بدن پر ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ جوان ہوتے ہی میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میرا مالک وہی ہوگا، جو میرے دل کو بھائے گا۔ اس فیصلے کے بعد مجھے قدم قدم پر کڑے امتحانوں سے گزرنا پڑا، اب نظروں کو بھانے اور دل میں سمانے والا سامنے آیا تو دشمن وطن ہی نہیں، دشمنِ جاں بھی ہے...... مگر میں بھی کیپٹن ہونے کے ساتھ ساتھ پہلے ایک عورت ہوں۔ اب تم میرے ساتھ جو بھی سلوک کرو، اف تک نہیں کروں گی۔ چاہو تو مجھے مار کر یہاں سے نکل جاؤ، چاہو تو مجھے اپنالو، مجھے چھوڑ کر جاؤ گے تو بچ نہیں سکو گے۔“

میجر عثمانی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا، اس سے جان چھڑانا مشکل نظر آرہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید کیپٹن سیتا کو اس سے جان چھڑانا مشکل ہوتا...... وہ ایسی دلفریب حسن کی مالک تھی کہ میجر عثمانی کے ذہن سے سمیرا کا خیال نکل گیا تھا۔

اگر سوچنے کی کوشش کی جائے تو ہر مشکل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔ میجر عثمانی کے ذہن میں ایک خیال تیزی سے آیا۔ کیپٹن سیتا ہندو تھی اور وہ مسلمان یوں ان کی شادی نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”مگر ہمارے معاملے میں بہت پیچیدگیاں ہیں۔ نہ میں تمہارے بارے میں کچھ جانتا ہوں اور نہ تم میرے بارے میں۔ سوائے اس کے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ملک سے تعلق رکھتے ہیں پھر ہمارا مذہب مختلف ہے۔ میں مسلمان ہوں، تم ہندو ہو۔ ہماری شادی صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے، جب ہم میں سے کوئی ایک اپنا مذہب تبدیل کرے۔“

کیپٹن سیتا نے فوراً ساڑی کے پلو سے آنسو خشک کیے اور بولی۔ ”اس وقت تمہاری زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ دونوں ملکوں میں جنگ جاری ہے۔ جیت کسی کے بھی حصے میں آئے۔ یہ طے ہے کہ بھارت کے فوجی تمہارے ملک میں پکڑے جائیں گے تو تمہارے ملک کے بھی کچھ لوگ ہمارے قبضے میں آئیں گے۔ انہیں قید کے دوران میں جس قسم کی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑے گا، وہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہارا یہاں سے بچ کر واپس جانا بھی اب ناممکن ہے۔ اگر تم اپنے وطن کو بھول جاؤ، مذہب کو فراموش کر دو تو میں تمہیں فوج میں اعلیٰ عہدہ دلوا دوں گی۔“

میجر عثمانی بھنّا گیا۔ چہرے پر غصے کی سرخی پھیل گئی۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”میں مسلمان ہوں، مسلمان شکست تو کھا سکتا ہے، مگر بے دین نہیں ہوسکتا۔“

کیپٹن سیتا بولی۔ ”کس دنیا کی بات کرتے ہو۔ ہمارے ملک میں ایسے بے شمار مسلمان رہتے ہیں، جنہیں یہ تک معلوم نہیں کہ ان کا مذہب کیا ہے؟ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے، اسی لیے مسلمان کہلاتے ہیں اور اکثر اوقات معمولی سے فائدے کے لیے خود کو ہندو یا سیکولر بنا کر پیش کرتے ہیں۔“

میجر عثمانی نے کڑواہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ”ممکن ہے ہند کی اس دھرتی پر لوگ ایسا کر بیٹھتے ہوں، اس مٹی میں شاید کوئی تاثیر ہوگی، مگر...... میرا جنم پاک دھرتی پر ہوا ہے۔ میں مسلمان پیدا ہوا ہوں، مسلمان ہونے پر مجھے فخر ہے اور مسلمان کی حیثیت سے میں مرنا یا شہید ہونا پسند کروں گا۔ میں جارہا ہوں، تمہارے کرنل کلدیپ شام کو آئیں گے۔ میں تب تک بہت دور نکل چکا ہوں گا۔ راستے میں کوئی ہندوستانی جاسوس مل گیا تو وہ میرے ہاتھ سے جہنم میں جائے گا یا ممکن ہے میں ہی شہید ہوجاؤں، تم میرے راستے میں آنے کی کوشش مت کرو۔ تم پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے مجھے دکھ ہوگا...... اگر واقعی تم مجھے دیکھ کر دل ہار بیٹھی ہو تو مسلمان ہوجاؤ، میرے ساتھ پاکستان چلو، اور اپنے وطن کو بھول جاؤ۔“ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ کیپٹن سیتا جنونی انداز میں آگے بڑھی اور اس کے پاؤں سے لپٹ گئی۔

”بھگوان کے واسطے...... تمہیں تمہارے اللہ کا واسطہ...... مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ مجھے ان درندوں کے درمیان مت چھوڑو۔ ٹھیک ہے، میں تمہارے لیے ہندو مت ترک کر دوں گی، اسلام قبول کرلوں گی، مگر مجھے یوں مت ٹھکراؤ۔“

میجر عثمانی نے اس کو کندھے سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ”اسلام کسی مرد یا عورت کے لیے قبول نہیں کیا جاتا۔ تم نے کہا ہے کہ تم نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے...... تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو کہ......“

کیپٹن سیتا بولی۔ ”میں سب کچھ جانتی ہوں، مسلمان ہونے کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں، بے شمار لوگوں نے ماضی میں اس لیے اسلام قبول کیا کہ انہیں اس میں فائدہ نظر آیا۔ مجھے بھی اسلام میں فائدہ نظر آتا ہے۔ ہندو بن کر زندگی گزارنا دنیا میں گھاٹے کا سودا ہے۔ میں اسلام قبول کرلوں گی، میں جانتی ہوں، یہ واحد مذہب ہے جو عورت کی عزت اور حرمت کی ضمانت دیتا ہے۔ میں ابھی کلمہ پڑھ کر سچے دل سے اسلام قبول کرتی ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے کلمہ طیبہ پڑھ

لیا۔ بتاؤ، کیا اب تم ایک نومسلم لڑکی کو ہندوؤں کی زمین پر بے حرمت ہونے کے لیے تنہا چھوڑ کر جا سکتے ہو؟"

میجر عثمانی الجھ کر رہ گیا۔ کیپٹن سیتا سمجھ میں نہ آنے والی عورت تھی۔ کیا واقعی اسے اس سے محبت ہوگئی تھی یا کوئی اور بات تھی؟ مگر کوئی اور بات کیا ہو سکتی تھی؟ اس نے کیپٹن سیتا کو کاندھے سے پکڑ کر اٹھایا۔ کھڑکی سے در آنے والی سورج کی چمکتی روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ تنہائی میں کسی جوان لڑکی کا نوخیز بدن اس قدر قریب ہو تو دل بے ایمان ہو جاتا ہے۔ وہ ڈگمگا گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دودھ اور میدے سے گندھا ہوا ایسا بے مثال حسن موجود تھا کہ پختہ قوتِ ارادی کی عمارت میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ وہ ہار مانتے ہوئے بولا۔

"اسلام کے دشمن سے لڑنا جہاد ہے، تو کسی کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے لیے سہارا دینا نیکی ہے، میں یہ نیکی ضرور کروں گا مگر کسی ایسی لڑکی کے لیے نہیں، جو میرے دشمن ملک کی کیپٹن ہو اور پتھروں کو خدا بنا کر ان کی پوجا کرتی ہے۔"

کیپٹن سیتا کی آنکھوں میں ستارے جھلملا اٹھے، وہ خوش ہو کر بولی۔ "میں دل سے اسلام قبول کر چکی ہوں، اب بھارتی انٹیلی جنس کی کیپٹن سیتا نہیں، ایک عام مسلمان لڑکی ہوں۔ تم مجھے جس نام سے پکارو گے وہی اسلامی نام میری شناخت ہوگا۔ میں جانتی ہوں مسلمان عورت کے لیے اس کا شوہر مجازی خدا ہوتا ہے۔ تم نے مجھے سہارا دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اب تم جاؤ، کرنل کلدیپ سے میں تمہیں شام کو ملواؤں گی۔ کہوں گی کہ تم اس گاؤں کے رہنے والے ہو۔ اپنے بنگلے کی نگرانی کے لیے میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ دہلی پہنچ کر ہم شادی کر لیں گے۔"

میجر عثمانی نے کہا۔ "دہلی، یہ تم نے کیسی بات کہہ دی۔ تم میری دلہن ہوگی تو رخصت ہو کر میرے ساتھ پاکستان جاؤ گی۔ انڈیا تمہارا میکا اور پاکستان سسرال ہے۔ میں اپنے سسرال میں رہ کر بے غیرتی کا ثبوت نہیں دے سکتا۔"

کیپٹن سیتا بولی۔ "ابھی بات پکی ہوئی ہے۔ شادی نہیں ہوئی۔ مجھے لے جانے کے لیے تمہیں میرے گھر تک تو چلنا ہوگا۔"

"مگر تم اس منتری کے بیٹے کا کیا کرو گی؟ پھر میرے پاس کاغذات بھی نہیں ہیں۔"

کیپٹن سیتا نے کہا۔ "تم اس کی فکر مت کرو۔ تمہارے انڈین کاغذات بنوانا میرے لیے چنداں مشکل کام نہیں۔ کرنل کلدیپ تمہیں ساتھ لے جانے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوں گے۔ میں ان سے کہوں گی کہ میں منتری کے بیٹے کی خواہش پوری کرنے پر تیار ہوں، مگر یہاں نہیں۔ یہ کام دہلی میں ہوگا۔ وہ اپنی متوقع ترقی اور تمغے کے حصول کی خاطر خوشی خوشی اجازت دے دیں گے۔ ہم منتری کے بیٹے کے ساتھ دہلی روانہ ہو جائیں گے اور پھر وہاں پہنچتے ہی میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔"

کیپٹن سیتا کا منصوبہ زیادہ عمدہ نہیں تھا مگر اس صورتِ حال میں اس سے اچھی ترکیب اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ میجر عثمانی کے ذہن میں اس وقت سمیرا بیٹھی دکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور آنکھوں کے سامنے کیپٹن سیتا مسکراتی نظروں سے اس کے چہرے کو تک رہی تھی۔ اگر وہ اس کی بات نہ مانتا تو یہاں سے نکلنا آسان نہ ہوتا۔ اس سے شادی کے بعد یہ امید ہو سکتی تھی کہ وہ جنگ کے خاتمے کے بعد موقع دیکھ کر پہلے مشرقی پاکستان کی سرحد عبور کر جائیں گے اور پھر وہاں سے بہت آسانی کے ساتھ لاہور پہنچ کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ میجر عثمانی واپس اپنی کھولی میں آ گیا۔ شام کو جب کرنل کلدیپ اور اس کے ساتھ چپکا ہوا سیتا کا بھوکا اور منتری کا سپوت ریسٹ ہاؤس پہنچے تو گھنٹے بعد کیپٹن سیتا نے میجر عثمانی کو بلا لیا۔ کرنل کلدیپ بہت تیز نظروں اور ہوشیار دماغ کا مالک تھا مگر سیتا نے نہ جانے اس سے کیا بات کہی تھی کہ وہ ساری ہوشیاری بھلا کر سیتا کے آگے بچھا جا رہا تھا۔ کرنل نے رسمی تعارف کے بعد میجر عثمانی سے کہا۔ "مسٹر دلیر سنگھ! یہ کیپٹن سیتا ہیں۔ جنگ ختم ہوتے ہی ان کی سگائی میرے دوست کے بیٹے سریندر سے ہونے والی ہے۔ انہیں فوری طور پر واپس دہلی جانا ہے، سریندر ان کے ساتھ ہوں گے۔ تم آج سے ان کے خاص ملازم ہو، ان کی حفاظت کے لیے دہلی تک جاؤ گے اور کیپٹن سیتا کے بنگلے پر چوکیداری کرو گے۔"

میجر عثمانی نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا اور گنوار پن سے بولا۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہے جی، ورنہ بندہ کس قابل تھا۔ آپ فکر نہ کریں، میں بی بی جی کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دوں گا۔"

دوسرے ہی دن کرنل کلدیپ کی جیپ میں سریندر، کیپٹن سیتا اور میجر عثمانی دلیر سنگھ کے روپ میں دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ دہلی پہنچ کر سریندر نے انہیں کیپٹن سیتا کے بنگلے پر اتار دیا اور رخصت ہوتے ہوئے بولا۔ "سیتا! تم نے راستے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ اب ہماری سگائی

ہونے والی ہے۔ پورے راستے میں یہی سوچتا آیا ہوں کہ تمہارے بنگلے کی چوکیداری کے لیے پولیس کی نفری بھی بلائی جاسکتی ہے اور ویسے بھی تمہیں اس گنوار سے کسی سمجھداری کی توقع نہیں ہوسکتی تھی پھر تم اسے لاد کر اپنے ساتھ کیوں لائی ہو؟“

کیپٹن سیتا مسکرا کر بولی۔ ”میں تم سے سگائی پر رضامند ہوئی تھی۔ تمہارے ساتھ اکیلے سفر کرنے پر نہیں، تم اوپر سے بے ایمان اور اندر سے بدکردار انسان ہو۔ تمہارے ساتھ تنہا سفر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک مسلمان عورت اپنے شوہر کے ساتھ سفر کرتی ہے۔ اس لیے میں دلیر کو اپنے ساتھ لائی ہوں۔“

سریندر اچھل پڑا۔ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”کک...... کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔“

میجر عثمانی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اتنی چھوٹی سی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میں دلیر سنگھ گجر ہوں۔ تمہاری کیپٹن سیتا نے مسلمان ہوکر مجھ سے شادی کرلی ہے۔ ہمارا نکاح ہوگیا ہے اور ولیمہ کل اسی بنگلے میں ہوگا۔“

سریندر ہتھے سے اکھڑ گیا۔ تلملا کر میجر عثمانی کی طرف بڑھا۔ میجر نے اپنے نیفے میں اڑسا ہوا چمکدار خنجر نکال لیا اور غراتی آواز میں بولا۔ ”ہم دیہاتی لوگ حملہ کرنے والوں اور اپنی عزت کی طرف نظر اٹھانے والے کی گردن کاٹ دیتے ہیں۔ بہتر ہوگا گھر جاؤ، ٹھنڈا پانی پیو اور سو جاؤ۔“

خنجر دیکھ کر سریندر کا سارا غصہ کافور ہوگیا اور آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔ وہ ایسا بھاگا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ دونوں اندر گئے۔ نہادھو کر تیار ہوئے۔ ایک قریبی مسجد میں جا کر کیپٹن سیتا نے مولوی صاحب کے سامنے کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کیا۔ میجر عثمانی سے مشورہ کر کے اس کا نام طاہرہ رکھا گیا پھر اسی وقت ان کا نکاح پڑھایا گیا اور وہ مسجد سے نکل آئے۔

طاہرہ نے کہا۔ ”فوری طور پر میرے بنگلے پر واپس جانا بے وقوفی ہوگی، جب تک آپ کے کاغذات نہیں بن جاتے ہم کسی ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ وہیں ہنی مون منائیں گے اور کچھ عرصہ چھپ کر گزارنے کے بعد جب معاملہ ٹھنڈا ہوجائے گا تو جائداد بیچ کر کسی اچھی جگہ شفٹ ہوجائیں گے۔ مثلاً بمبئی وغیرہ۔“

میجر عثمانی نے کچھ نہ کہا۔ وہ ایک تھری اسٹار ہوٹل میں پہنچے۔ جنگ کی افراتفری کے باعث زیادہ تر ہوٹل ویران پڑے تھے۔ طاہرہ کو ہوٹل میں کمرا حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے اپنا سروس کارڈ دکھایا تو منیجر خود دوڑا، دوڑا آگیا۔

طاہرہ نے کہا۔ ”میں کیپٹن سیتا ہوں، فرام انٹیلی جنس بیورو، آپ کے ہوٹل میں کچھ عرصہ خاموشی سے کسی کے علم میں آئے بغیر گزارنا چاہتی ہوں، سنا ہے کہ دشمن کے جاسوس اپنی کارروائیوں کے لیے دہلی تک آچکے ہیں اور ہوٹلوں میں بھیس بدل کر رہ رہے ہیں۔“

منیجر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ جیسی سرکاری آفیسر کے ساتھ تعاون کر کے ہمیں خوشی ہوگی۔ آپ جب تک رہیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ آپ کے رہنے اور کھانے پینے کا عمدہ بندوبست ہوجائے گا۔“

انہیں تیسری منزل پر ایک نہایت عمدہ سوئٹ مل گیا۔ ایک ہفتہ کیسے گزرا۔ میجر عثمانی کو پتا ہی نہیں چلا۔ طاہرہ نے ہر ہر لمحے اتنی محبت نچھاور کی کہ میجر عثمانی کے ذہن سے سمیرا کا خیال تک نکل گیا۔ ایک رات کھانے کے دوران میجر عثمانی نے کہا۔ ”جنگ بندی کا اعلان ہونے کی باتیں ہو رہی ہیں مگر ہم بمبئی کے بجائے ڈھاکا جائیں گے اور اس کے لیے ہمیں زمینی راستہ اختیار کرنا ہوگا۔“

طاہرہ چونک کر بولی۔ ”ڈھاکا...... مم...... مگر کیوں؟“

”کیونکہ اب تم میری بیوی ہو، شادی کے بعد دلہن کا میکے میں رہنا ہمارے خاندان میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔“

طاہرہ کے ہاتھ رک گئے۔ آنکھوں کی رنگت تبدیل ہوگئی۔ کھانے سے ہاتھ کھینچ کر وہ کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ پھر باہر نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔ ”میں سمجھ گئی، ڈھاکا کے بعد تم مجھے پاکستان لے جاؤ گے اور......“

میجر نے بات کاٹ کر کہا۔ ”ہاں طاہرہ! وہاں میری ماں ہے۔ ابا ہیں، ایک خوب صورت اور پُرسکون گاؤں ہے۔ ہمارے بچے نہر کے کنارے کھیلیں گے اور......“

طاہرہ نے بات کاٹ کر کہا۔ ”اور پھر بڑے ہو کر تمہاری طرح فوجی بن کر میرے ملک کے خلاف جنگ لڑیں گے...... کیوں؟“

میجر عثمانی سناٹے میں آگیا۔ طاہرہ ایک دم کیپٹن سیتا دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ پھنکارتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور تیز لہجے میں بولی۔ ”میں تمہاری بیوی بنی ہوں، تمہارے لیے میں نے مذہب چھوڑ دیا مگر وطن چھوڑنا اور اپنے بچوں کو اپنے ہی وطن کا دشمن بنانا میرے لیے ناممکن ہے۔ تمہیں اب اس دھرتی پر میرا شوہر اور اس دھرتی کا رکھوالا بن کر

رہتا ہوگا...... بھلا اپنے وطن اور گھر کو کوئی کسی کے لیے چھوڑ سکتا ہے؟‘‘

میجر عثمانی غصے میں بولا۔ ’’بہت خوب! اس کا مطلب ہے تم نے صرف ایک ہی ہفتے میں اپنی اصلیت دکھا دی مگر تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تم اپنی دھرتی کو نہیں چھوڑ سکتیں تو میں اپنے وطن کو بھلا کیوں کر چھوڑ دوں گا؟‘‘

’’تمہیں چھوڑنا پڑے گا میجر عثمانی!‘‘ طاہرہ بولی۔ ’’کیونکہ تم اس دھرتی پر اب بھی پاکستانی فوجی ہو۔ تمہارے کاغذات بھی نہیں بنے...... تمہارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ میں نے تمہیں ٹوٹ کر چاہا، جس محبت کو نوعمری سے سینچتی آئی تھی، وہ سب کی سب تم پر نچھاور کر دی۔ اب اس کے بدلے میں تمہیں یہیں رہنا ہوگا میرے پاس۔ ویسے بھی بہت جلد تمہارا ملک اپنی شناخت کھو کر دوبارہ ہماری آغوش میں آنے والا ہے پھر ہم گھومنے پھرنے کے لیے تمہارے گاؤں چلیں گے۔‘‘

میجر عثمانی پر سکتہ ساطاری تھا۔ وہ ایک ایسے جال میں پھنس گیا تھا جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی کھوپڑی میں دھماکے ہونے لگے۔ وہ خاموشی سے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ فی الحال اس کے سوا واقعی کوئی چارہ نہ تھا۔ رات کو خبروں میں بتایا گیا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ کے خاتمے کے بعد دونوں ملکوں کی فوجیں واپس اپنی اپنی بیرکوں میں پہنچنا شروع ہو گئی ہیں۔ اس کے بعد حسبِ معمول خصوصی بلیٹن میں اس جنگ میں بھارتی فوجیوں کے کارنامے بیان کیے جانے لگے۔

میجر عثمانی کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ برابر میں طاہرہ گہری نیند سو چکی تھی اور دوسری صبح جب وہ بیدار ہوئی تو اس کا مجازی خدا کمرے سے غائب تھا۔ مسہری پر ایک کاغذ پڑا تھا جس پر لکھا تھا۔ ’’فوجیں اپنی اپنی بیرکوں میں واپس پہنچ چکی ہیں۔ ایک فوجی ہونے کے ناتے میری ذمے داری ہے کہ واپس جاؤں۔ میرے بغیر زندگی گزارنے میں تمہیں یقیناً کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ جو عورت محض اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لے، اس کے لیے دوسرا مرد ڈھونڈ لینا مشکل کام نہیں ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنے وطن ضرور پہنچوں گا یا پھر مارا جاؤں گا۔ البتہ میری روح ضرور میری دھرتی پر پہنچے گی۔ میں دشمن کی اس بے وفا مٹی پر زندہ نہیں رہنا چاہتا، جہاں عورت وفا کے نام پر کھیل کھیلتی ہے۔ تمہارا اصل روپ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہاں پیار کرنے والے پیدا ہی نہیں ہوتے۔ تم لوگوں کی رگوں میں خون نہیں، ایک غلیظ مادہ دوڑتا ہے، جو پیار سے بھرے دل کو بھی آلودہ کر دیتا ہے۔ میری دعا ہے کہ تم میرے بچے کو جنم نہ دے سکو۔ میرے لیے یہ بڑے شرم کی بات ہوگی کہ دشمن کی دھرتی پر میرے لہو سے جو پھول مہکے گا، اس کے کانٹوں کی نوک میری پاک سرزمین کی طرف ہوگی۔ تم نے محبت کا دعویٰ کیا تھا اور میں نے یقین کر لیا تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ ہندو عورت مسلمان ہو کر بھی کسی مسلمان کی نہیں ہو سکتی، خواہ وہ اس سے پیار ہی کیوں نہ کرتی ہو۔ تم نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ خاوند کا حق اور بیوی کا فرض جانتی ہو مگر صرف پڑھ لینے یا جان لینے سے نہ حق ادا ہوتا ہے، نہ فرض۔ کاش! میں نے تم پر اور تمہاری محبت پر بھروسا نہ کیا ہوتا، تمہارا مجازی خدا......‘‘

طاہرہ نے خط پڑھا اور اسے یوں لگا کہ کسی نے اس کے دل کو مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ وہ دیوانہ وار کمرے سے باہر نکلی، مگر اس کے پاکستانی محبوب کا کچھ پتا نہ تھا۔ وہ دو تین مہینے تک پورے شہر میں اس شخص کو تلاش کرتی رہی، جو اس کا ہوتے ہوئے بھی اس کا نہیں رہا تھا۔ تب انکشاف ہوا کہ وہ جاتے جاتے اپنی نشانی...... اپنی محبت کا ثبوت اس کی کوکھ میں چھوڑ گیا ہے۔ اس کا رواں رواں خوشی سے جھوم اٹھا۔ بھارت کی سرزمین پر ایک بھارتی عورت کی کوکھ میں پاکستانی خون نمو پا رہا تھا۔ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان جانے کی تیاریوں میں لگ گئی۔

☆☆☆

میجر عثمانی، دلیر سنگھ کے روپ میں ہی سفر کرتے ہوئے انبالہ پہنچا تھا۔ جب وہ انبالہ کے ہوائی اڈے کے قریب سے گزر رہا تھا تو اسے بھولی ہوئی کہانی اچانک یاد آ گئی۔ اسی جنگ کے ابتدائی دنوں میں پاکستانی پیرا کمانڈوز نے اس ہوائی اڈے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ عین ان لمحات میں جب انبالہ کے ہوائی اڈے پر بھارتی فضائیہ کے پائلٹ، آپریشن روم سے پاکستان پر تباہی نازل کرنے کے احکامات لے کر باہر نکل رہے تھے اور اپنے طیاروں میں بیٹھ کر کسی بھی لمحے اڑنے کے لیے تیار تھے...... یہ کمانڈوز مجاہد ان پر خدا کا قہر بن کر نازل ہو گئے۔ ان پر اچانک قیامت ٹوٹ پڑی تھی اور ان کے مذموم عزائم چند منٹوں میں سامانِ حرب و ضرب کے ساتھ ہی خاک کا ڈھیر بن چکے تھے۔ ان مجاہدوں میں سے بمشکل دو چار ہی زندہ اپنے وطن واپس پہنچے تھے اور باقیوں نے وہیں لڑتے لڑتے

جام شہادت نوش کرلیا تھا۔ ایک بھی ان میں سے زندہ دشمن کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔

میجر عثمانی ان سرفروشوں کو یاد کر رہا تھا جو یہاں ہزاروں میل کا سفر طے کرکے پہنچے تھے۔ صرف اس لیے کہ کفر کدے میں ایمان کی شمع روشن ہو جائے۔ اسے ان شہیدوں کے خون کی مہک آرہی تھی، جن کے لہو سے روشن ہونے والے چراغوں کی لو میں ہی آج میجر عثمانی کو اپنی منزل تلاش کرنی تھی۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ چلتا وہ اب سڑک کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اس نے چوکس بلی کی طرح سڑک کا جائزہ لینے کے بعد اسے عبور کرلیا اور پھر کھیتوں کے درمیان چلنے لگا۔ راستے میں دو تین دیہات بھی آئے مگر میجر عثمانی انہیں نظرانداز کر کے آگے نکل گیا۔ اس نے دوران تربیت اتنی مشق کی تھی کہ اس طرح مسلسل دس، پندرہ گھنٹے بھی اگر وہ چلتا رہتا تو اسے کوئی فرق نہ پڑتا۔

بالآخر آدھی رات کے بعد تھوڑی دیر ستانے کے لیے وہ ایک ٹھکانا ڈھونڈنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ یہ کسی کھیت کے درمیان بنی ہوئی جھونپڑی تھی۔ جھونپڑی کا اس نے بڑے محتاط انداز سے جائزہ لیا اور اس یقین کے ساتھ کہ آس پاس کوئی نہیں ہے، وہ اندر بچھی ہوئی کھاٹ پر کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ اس کے بازو سے بندھی گھڑی کی سوئیاں رات کے دو بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد وہ چار بجے جاگ گیا۔ جھونپڑی کے ایک کونے میں رکھے ہوئے مٹی کے گھڑے سے اس نے پانی پیا اور وضو کر کے وہیں نماز فجر ادا کی۔ اس دیارِ کفر میں گو کہ خدا کی یاد اسے پہلے سے زیادہ آنے لگی تھی لیکن اس روز نماز پڑھتے ہوئے جو روحانی سکون اس نے محسوس کیا، وہ اسے زندگی میں اس سے پہلے کبھی میسر نہیں آیا تھا۔ جب میجر عثمانی ذکر الٰہی سے فارغ ہو کر عازم سفر ہوا تو ایک ولولہ تازہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔

صبح زندگی بیدار ہونے سے پہلے وہ سڑک کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ جان بوجھ کر اس نے دو تین بسیں گزر جانے دیں اور ان کے بعد آنے والی ایک بس میں سوار ہو کر اگلے شہر پہنچ گیا۔ ایک چھوٹے سے ڈھابے پر اس نے ڈٹ کر ناشتا کیا اور دس بجے کے بعد ایک سیرگاہ میں داخل ہو گیا۔ اس سیرگاہ کے ساتھ ہی ایک سینما ہال تھا۔ وہ ٹکٹ لے کر سینما ہال میں فلم دیکھنے لگا۔

میجر عثمانی بہت احتیاط کر رہا تھا کیونکہ طاہرہ (کیپٹن بیتا) یا منتری کا بیٹا (سریندر) اس کی تلاش میں ضرور سرگرداں ہوں گے۔ یہ میجر عثمانی کی سوچ تھی، ورنہ ایسا نہیں تھا پھر بھی وہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا تھا۔ چہرے پر چھوٹی چھوٹی مونچھوں کی موجودگی اور نئی عینک نے اس کا حلیہ خاصا بدل دیا تھا۔

فلم 1965ء کی جنگ کے حوالے سے نئی نئی بنائی گئی تھی اور اس میں پاکستان کے خلاف خوب زہر اگلا گیا تھا۔ میجر عثمانی نے دیکھا فلم کے دوران کئی مرتبہ سینما ہال میں بیٹھے تماشائیوں نے ''جے ہند'' اور ''کرش پاکستان'' کے نعرے لگائے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے سارا بھارت ایک جنگی جنون میں مبتلا ہو... بلکہ ہر طرف پاکستان کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی۔

فلم دیکھ کر جب میجر عثمانی باہر نکلا تو اس کا دل خاصا بوجھل ہو رہا تھا۔ اس نے ایک دو روز میں ہی اس قوم میں ہزاروں برائیوں کے باوجود جو ایک چیز دیکھی تھی اور جسے وہ ان کی ''مشترک عادت'' کہہ سکتا تھا، وہ تھی پاکستان دشمنی...... وہ ہندو جوان پڑھ تھا، وہ جو پڑھا لکھا تھا اور وہ جو ابھی پڑھ رہا تھا، یہ سب اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ پاکستان کو تباہ کر دیں۔ ان کے سینما ہالوں، ریستورانوں، گھروں اور دفتروں کے باہر بڑے بڑے حروف میں ''کرش پاکستان''، ''کرش پاکستان'' لکھا ہوا تھا۔ اس کے برعکس اس کے اپنے ملک میں اقتدار کی سیاست کا کیا گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے؟ وہ اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔

شام کے پانچ بج رہے تھے اور میجر عثمانی کو اندھیرا پھیلنے کا انتظار تھا تاکہ وہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہو سکے۔

اس ملک میں تھوڑے دن گزارنے کے بعد ہی اسے اپنی کمزوریوں کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ان لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف اتنی نفرت پائی جاتی ہے کہ پنجابی، ہندی کو اور ہندی گجراتی کو برداشت نہیں کرتا، لیکن مسلم دشمنی میں سب ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ مسلمانوں کے خلاف بھارت کے ہر صوبے میں نفرت پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ تو پاکستان کا روئے زمین پر وجود بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

دن، رات میں ڈھلنے لگا تو میجر عثمانی نے ایک چھوٹے سے ڈھابے سے تھوڑا سا کھانا کھایا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا اور آخرکار چھپتا چھپاتا مشرقی پاکستان سے ہوتا ہوا وہ لاہور پہنچ گیا۔

☆☆☆

ادھر طاہرہ بھارت کو چھوڑ چکی تھی اور ایک ایجنٹ کے

ذریعے سرحد عبور کر کے وہ بھی لاہور پہنچ گئی تھی۔ تین چار ماہ تک دیوانگی میں اپنے محبوب شوہر کو تلاش کرتی رہی اور آخر کار اس گاؤں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی جہاں میجر عثمان عرف عثانی اپنی نئی نویلی دلہن سمیرا کو ڈولی میں بٹھا کر گھر لے آیا تھا۔

طاہرہ کو دروازے پر کھڑے دیکھ کر میجر عثمان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سمیرا کے ہاتھوں میں رچی مہندی کا رنگ ابھی گہرا تھا۔ وہ بھی میجر عثمان کے پیچھے پیچھے آگئی تھی۔

اس کے سامنے ایک شکستہ حال، نوجوان عورت کھڑی، بھیگی پلکوں سے اس کے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی جسمانی حالت بتارہی تھی کہ وہ تخلیق کے عمل سے گزرنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ اس نے دروازے کی چوکھٹ تھام کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں...... میں...... بہت تھک گئی ہوں سرتاج! مجھے اپنی بانہوں میں لے لو، میں...... میں تمہارے بچے کو جنم دینے والی ہوں...... یہ بچہ بھارتی نہیں ہے، بھارت میں رہ کر پاکستان کے خلاف نہیں لڑے گا۔ یقین کرو عثمان......! یہ اس دھرتی کا بچہ ہے اور یہیں آنکھ کھولے گا۔“

اس پر غشی طاری ہونے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ لڑکھڑا کر گرتی، میجر عثمان نے اپنی منکوحہ کو ہاتھوں میں تھام لیا۔

☆☆☆

اس واقعے کے ٹھیک چوبیس سال بعد ایک بے حد حسین و جمیل لڑکی کاندھے سے بیگ لٹکائے، ہاتھ میں نقشہ تھامے اور اپنی گھنیری پلکیں جھکائے، مقبوضہ کشمیر کے شہر اننت ناگ (اسلام آباد) میں بس سے اُتری۔ اس کے ساتھ انڈیا ٹوڈے کی ایک فیچر رائٹر پونم پانڈے بھی تھی۔ پونم ایک باکمال اور تیز طرار صحافی تھی۔ اس کے فیچر نے پورے بھارت میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ وہ ایک غیر ملکی جریدے ایشیا ٹائمز کے لیے فیچر کرتی تھی۔ ایشیا ٹائمز، شائع تو ہانگ کانگ میں ہوتا تھا، مگر پونم پانڈے اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل ایک برطانوی بزنس مین کا تعلق مجاہدین کی ایک خفیہ تنظیم سے ہے۔ مذکورہ بزنس مین اپنی آمدنی کا چوتھا حصہ فلاح و بہبود کے نام پر آزاد کشمیر کے کیمپوں میں پناہ گزین کشمیریوں پر خرچ کرتا تھا۔ اس بزنس مین سے انسانی حقوق سے متعلق ایک بین الاقوامی سیمینار کے دوران پونم پانڈے کی ملاقات ہو گئی تھی۔ پونم کو بزنس مین نے آفر کی کہ وہ ایشیا ٹائمز کے لیے بھارت کے مظلوم اور پسے ہوئے غریب اور اچھوت عوام کے حوالے سے مختلف فیچر تیار کرے۔ جس کا معاوضہ ڈالروں میں دیا جائے گا۔ پونم کے لیے ایشیا ٹائمز کے لیے بطور فری لانسر بھی لکھنا اعزاز سے کم نہیں تھا۔ لہٰذا اس کے فیچر اور مضامین تواتر سے ایشیا ٹائمز میں چھپنے لگے۔ اس کا بینک بیلنس بڑھنے لگا۔ تب ایک روز پونم کو ای میل میسج ملا کہ ایشیا کی اسپیشل نامہ نگار کرشمہ چوہدری، کشمیر میں چھٹیاں گزارنا اور سرینگر کی جھیل ڈل پر ایک تاثراتی مضمون لکھنا چاہتی ہیں۔ وہ ایک دو روز میں انڈیا پہنچ جائیں گی ”تم اپنے خصوصی تعلقات استعمال کر کے اس کرشمہ چوہدری کو سیاح ظاہر کر کے سرینگر لے جاؤ۔ اس خدمت کا معاوضہ ایک ہزار ڈالر کی صورت میں ملے گا۔ بہتر ہوگا تم بھی کسی خاص موضوع پر فیچر تیار کر ڈالو۔ ایک پنتھ دو کاج ہو جائیں گے۔“ یوں پونم پانڈے ایشیا ٹائمز کی انٹرنیشنل کرسپونڈنٹ مس کرشمہ کا استقبال کرنے کو تیار ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ کرشمہ نام کی یہ صحافی کوئی پختہ عمر اور سنجیدہ دکھائی دینے والی بردبار قسم کی عورت ہو گی، مگر جب گلابی رخساروں، دبیز ہونٹوں، لانبے بالوں اور متناسب جسم والی قدرے طویل قامت لڑکی نے اس کے قریب آ کر اُردو میں پوچھا۔

”کیا آپ ہی مس پونم پانڈے ہیں؟“ تو پونم پلکیں جھپکانا بھول گئی۔ اس کا سحر انگیز حسن اور جسمانی فیگرز اس قدر متناسب تھے کہ پونم کے دل سے آہ نکل گئی۔ ”آہ، کاش میں بھی ایسی ہوتی۔“ پھر لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے ہنگامہ خیز فیچر لکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ سب پلٹ پلٹ کر میری طرف دیکھتے۔ دیکھنے والے آگے رکھی ہوئی چیزوں سے ٹکرا جاتے اور جھینپ کر ایک بار پھر میری طرف ہی دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے۔ ”کرشمہ چوہدری“ نام ہی ایسا تھا کہ وہ اس کے مذہب کا اندازہ نہ لگا سکی۔ اس قسم کے نام مسلمانوں کے بھی ہو سکتے ہیں اور ہندوؤں کے بھی۔ مگر اس کی شخصیت میں ایسا رعب اور دبدبہ تھا کہ دو دن میں اچھی طرح گھل مل جانے کے باوجود اس سے یہ نہ پوچھ سکی کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔

تین دن بعد وہ دہلی سے ڈومیسٹک فلائٹ کے ذریعے سرینگر کے نئے ائرپورٹ سے نکل کر اننت ناگ جانے والی بس میں سوار ہو گئیں۔ پونم خود بھی سیاح کی حیثیت سے آئی تھی۔ مختصر سے سامان کے ساتھ وہ اننت ناگ کے ہوٹل ”اسٹار“ میں ٹھہر گئیں۔ یہ اس علاقے کا ایسا صاف ستھرا

جامِ شہادت نوش کرلیا تھا۔ ایک بھی ان میں سے زندہ دشمن کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔

میجر عثمانی ان سرفروشوں کو یاد کررہا تھا جو یہاں ہزاروں میل کا سفر طے کرکے پہنچے تھے۔ صرف اس لیے کہ کفر کدے میں ایمان کی شمع روشن ہو جائے۔ اسے ان شہیدوں کے خون کی مہک آرہی تھی، جن کے لہو سے روشن ہونے والے چراغوں کی لو میں ہی آج میجر عثمانی کو اپنی منزل تلاش کرنی تھی۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ چلتا وہ اب سڑک کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اس نے چوکس بلی کی طرح سڑک کا جائزہ لینے کے بعد اسے عبور کرلیا اور پھر کھیتوں کے درمیان چلنے لگا۔ راستے میں دو تین دیہات بھی آئے مگر میجر عثمانی انہیں نظرانداز کرکے آگے نکل گیا۔ اس نے دورانِ تربیت اتنی مشق کی تھی کہ اس طرح مسلسل دس، پندرہ گھنٹے بھی اگر وہ چلتا رہتا تو اسے کوئی فرق نہ پڑتا۔

بالآخر آدھی رات کے بعد تھوڑی دیر ستانے کے لیے وہ ایک ٹھکانا ڈھونڈنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ یہ کسی کھیت کے درمیان بنی ہوئی جھونپڑی تھی۔ جھونپڑی کا اس نے بڑے محتاط انداز سے جائزہ لیا اور اس یقین کے ساتھ کہ آس پاس کوئی نہیں ہے، وہ اندر بچھی ہوئی کھاٹ پر کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ اس کے بازو سے بندھی گھڑی کی سوئیاں رات کے دو بجنے کا اعلان کررہی تھیں۔ دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد وہ چار بجے جاگ گیا۔ جھونپڑی کے ایک کونے میں رکھے ہوئے مٹی کے گھڑے سے اس نے پانی پیا اور وضو کرکے وہیں نمازِ فجر ادا کی۔ اس دیارِ کفر میں گو کہ خدا کی یاد اسے پہلے سے زیادہ آنے لگی تھی لیکن اس روز نماز پڑھتے ہوئے جو روحانی سکون اس نے محسوس کیا، وہ اسے زندگی میں اس سے پہلے کبھی میسر نہیں آیا تھا۔ جب میجر عثمانی ذکرِ الٰہی سے فارغ ہو کر عازمِ سفر ہوا تو ایک ولولہ تازہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔

صبح زندگی بیدار ہونے سے پہلے وہ سڑک کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ جان بوجھ کر اس نے دو تین بسیں گزر جانے دیں اور ان کے بعد آنے والی ایک بس میں سوار ہو کر اگلے شہر پہنچ گیا۔ ایک چھوٹے سے ڈھابے پر اس نے ڈٹ کر ناشتا کیا اور دس بجے کے بعد ایک سیرگاہ میں داخل ہو گیا۔ اس سیرگاہ کے ساتھ ہی ایک سنیما ہال تھا۔ وہ ٹکٹ لے کر سنیما ہال میں فلم دیکھنے لگا۔

میجر عثمانی بہت احتیاط کررہا تھا کیونکہ طاہرہ (کیپٹن سیتا) یا منتری کا بیٹا (سریندر) اس کی تلاش میں ضرور سرگرداں ہوں گے۔ یہ میجر عثمانی کی سوچ تھی، ورنہ ایسا نہیں تھا پھر بھی وہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا تھا۔ چہرے پر چھوٹی چھوٹی مونچھوں کی موجودگی اور نئی عینک نے اس کا حلیہ خاصا بدل دیا تھا۔

فلم 1965ء کی جنگ کے حوالے سے نئی نئی بنائی گئی تھی اور اس میں پاکستان کے خلاف خوب زہر اگلا گیا تھا۔ میجر عثمانی نے دیکھا فلم کے دوران کئی مرتبہ سنیما ہال میں بیٹھے تماشائیوں نے ”جے ہند“ اور ”کرش پاکستان“ کے نعرے لگائے۔ یوں معلوم ہورہا تھا جیسے سارا بھارت ایک جنگی جنون میں مبتلا ہو... بلکہ ہر طرف پاکستان کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی۔

فلم دیکھ کر جب میجر عثمانی باہر نکلا تو اس کا دل خاصا بوجھل ہورہا تھا۔ اس نے ایک دو روز میں ہی اس قوم میں ہزاروں برائیوں کے باوجود جو ایک چیز دیکھی تھی اور جسے وہ ان کی ”مشترک عادت“ کہہ سکتا تھا، وہ تھی پاکستان دشمنی...... وہ ہندو جوان پڑھ تھا، وہ جو پڑھا لکھا تھا اور وہ جو ابھی پڑھ رہا تھا، یہ سب اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ پاکستان کو تباہ کردیں۔ ان کے سنیما ہالوں، ریستورانوں، گھروں اور دفتروں کے باہر بڑے بڑے حروف میں ”کرش پاکستان“، ”کرش پاکستان“ لکھا ہوا تھا۔ اس کے برعکس اس کے اپنے ملک میں اقتدار کی سیاست کا کیا گھناؤنا کھیل کھیلا جارہا ہے؟ وہ اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔

شام کے پانچ بج رہے تھے اور میجر عثمانی کو اندھیرا پھیلنے کا انتظار تھا تاکہ وہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہوسکے۔

اس ملک میں تھوڑے دن گزارنے کے بعد ہی اسے اپنی کمزوریوں کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ان لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف اتنی نفرت پائی جاتی ہے کہ پنجابی، ہندی کو اور ہندی گجراتی کو برداشت نہیں کرتا، لیکن مسلم دشمنی میں سب ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ مسلمانوں کے خلاف بھارت کے ہر صوبے میں نفرت پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ تو پاکستان کا روئے زمین پر وجود بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

دن، رات میں ڈھلنے لگا تو میجر عثمانی نے ایک چھوٹے سے ڈھابے سے تھوڑا سا کھانا کھایا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا اور آخرکار چھپتا چھپاتا مشرقی پاکستان سے ہوتا ہوا وہ لاہور پہنچ گیا۔

☆☆☆

ادھر طاہرہ بھارت کو چھوڑ چکی تھی اور ایک ایجنٹ کے

ذریعے سرحد عبور کر کے وہ بھی لاہور پہنچ گئی تھی۔ تین چار ماہ تک دیوانگی میں اپنے محبوب شوہر کو تلاش کرتی رہی اور آخرکار اس گاؤں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئی جہاں میجر عثمان عرف عثمانی اپنی نئی نویلی دلہن سمیرا کو ڈولی میں بٹھا کر گھر لے آیا تھا۔

طاہرہ کو دروازے پر کھڑے دیکھ کر میجر عثمان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سمیرا کے ہاتھوں میں رچی مہندی کا رنگ ابھی گہرا تھا۔ وہ بھی میجر عثمان کے پیچھے پیچھے آ گئی تھی۔

اس کے سامنے ایک شکستہ حال، نوجوان عورت کھڑی، بھیگی پلکوں سے اس کے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی جسمانی حالت بتا رہی تھی کہ وہ تخلیق کے عمل سے گزرنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ اس نے دروازے کی چوکھٹ تھام کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں...... میں...... بہت تھک گئی ہوں سرتاج! مجھے اپنی بانہوں میں لے لو۔م...... میں تمہارے بچے کو جنم دینے والی ہوں...... یہ بچہ بھارتی نہیں ہے، بھارت میں رہ کر پاکستان کے خلاف نہیں لڑے گا۔ یقین کرو عثمان......! یہ اس دھرتی کا بچہ ہے اور یہیں آنکھ کھولے گا۔“

اس پر غشی طاری ہونے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ لڑکھڑا کر گرتی، میجر عثمانی نے اپنی منکوحہ کو ہاتھوں میں تھام لیا۔

☆☆☆

اس واقعے کے ٹھیک چوبیس سال بعد ایک بے حد حسین و جمیل لڑکی کاندھے سے بیگ لٹکائے، ہاتھ میں نقشہ تھامے اور اپنی گھنیری پلکیں جھکائے، مقبوضہ کشمیر کے شہر اننت ناگ (اسلام آباد) میں بس سے اُتری۔ اس کے ساتھ انڈیا ٹوڈے کی ایک فیچر رائٹر پونم پانڈے بھی تھی۔ پونم ایک باکمال اور تیز طرار صحافی تھی۔ اس کے فیچر نے پورے بھارت میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ وہ ایک غیر ملکی جریدے ایشیا ٹائمز کے لیے فیچر کرتی تھی۔ ایشیا ٹائمز، شائع تو ہانگ کانگ میں ہوتا تھا، مگر پونم پانڈے اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل ایک برطانوی بزنس مین کا تعلق مجاہدین کی ایک خفیہ تنظیم سے ہے۔ مذکورہ بزنس مین اپنی آمدنی کا چوتھا حصہ فلاح و بہبود کے نام پر آزاد کشمیر کے کیمپوں میں پناہ گزین کشمیریوں پر خرچ کرتا تھا۔ اس بزنس مین سے انسانی حقوق سے متعلق ایک بین الاقوامی سیمینار کے دوران پونم پانڈے کی ملاقات ہوگئی تھی۔ پونم کو بزنس مین نے آفر کی کہ وہ ایشیا ٹائمز کے لیے بھارت کے مظلوم اور پسے ہوئے غریب اور اچھوت عوام کے حوالے سے مختلف فیچر تیار کرے۔ جس کا معاوضہ ڈالروں میں دیا جائے گا۔ پونم کے لیے ایشیا ٹائمز کے لیے بطور فری لانسر بھی لکھنا اعزاز سے کم نہیں تھا۔ لہٰذا اس کے فیچر اور مضامین تواتر سے ایشیا ٹائمز میں چھپنے لگے۔ اس کا بینک بیلنس بڑھنے لگا۔ تب ایک روز پونم کو ای میل میسج ملا کہ ایشیا کی اسپیشل نامہ نگار کرشمہ چوہدری، کشمیر میں چھٹیاں گزارنا اور سرینگر کی جھیل ڈل پر ایک تاثراتی مضمون لکھنا چاہتی ہیں۔ وہ ایک دو روز میں انڈیا پہنچ جائیں گی۔ ”تم اپنے خصوصی تعلقات استعمال کر کے اس کرشمہ چوہدری کو سیاح ظاہر کر کے سرینگر لے جاؤ۔ اس خدمت کا معاوضہ ایک ہزار ڈالر کی صورت میں ملے گا۔ بہتر ہوگا تم بھی کسی خاص موضوع پر فیچر تیار کر ڈالو۔ ایک پنتھ دو کاج ہو جائیں گے۔“ یوں پونم پانڈے ایشیا ٹائمز کی انٹرنیشنل کرسپونڈنٹ مس کرشمہ کا استقبال کرنے کو تیار ہوگئی۔ اس کا خیال تھا کہ کرشمہ نام کی یہ صحافی کوئی پختہ عمر اور سنجیدہ دکھائی دینے والی بردبار قسم کی عورت ہوگی، مگر جب گلابی رخساروں، دبیز ہونٹوں، لانبے بالوں اور متناسب جسم والی قدرے طویل قامت لڑکی نے اس کے قریب آ کر اُردو میں پوچھا۔

”کیا آپ ہی مس پونم پانڈے ہیں؟“ تو پونم پلکیں جھپکانا بھول گئی۔ اس کا سحر انگیز حسن اور جسمانی فیگرز اس قدر متناسب تھے کہ پونم کے دل سے آہ نکل گئی۔ ”آہ، کاش میں بھی ایسی ہوتی۔“ پھر لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے ہنگامہ خیز فیچر لکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ سب پلٹ پلٹ کر میری طرف دیکھتے۔ دیکھنے والے آگے رکھی ہوئی چیزوں سے ٹکرا جاتے اور جھینپ کر ایک بار پھر میری طرف ہی دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے۔ ”کرشمہ چوہدری“ نام ہی ایسا تھا کہ وہ اس کے مذہب کا اندازہ نہ لگا سکی۔ اس قسم کے نام مسلمانوں کے بھی ہو سکتے ہیں اور ہندوؤں کے بھی۔ مگر اس کی شخصیت میں ایسا رعب اور دبدبہ تھا کہ دو دن میں اچھی طرح گھل مل جانے کے باوجود اس سے یہ نہ پوچھ سکی کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔

تین دن بعد وہ دہلی سے ڈومیسٹک فلائٹ کے ذریعے سرینگر کے نئے ائرپورٹ سے نکل کر اننت ناگ جانے والی بس میں سوار ہوگئیں۔ پونم خود بھی سیاح کی حیثیت سے آئی تھی۔ مختصر سے سامان کے ساتھ وہ اننت ناگ کے ہوٹل ”اسٹار“ میں ٹھہر گئیں۔ یہ اس علاقے کا ایسا صاف ستھرا

ہوٹل تھا جس میں اکثر و بیشتر سیاح ہی ڈیرے ڈالتے تھے۔ ڈبل بیڈ کے لگژری کمرے میں سامان رکھ کر پونم مسہری پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''لوجی، کرشمہ صاحبہ! یہ ہیں ہم اور یہ ہے کشمیر کا پُرفضا مقام۔''

کرشمہ اس کے برابر میں بیٹھ گئی اور اپنے بال سنوارتے ہوئے بولی۔ ''کشمیر واقعی جنت نظیر ہے۔ حدِ نگاہ تک سبزہ اور ہریالی ہے...... مگر خون کی لالی بھی ہے۔''

پونم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی پھر بولی۔ ''ہاں، کچھ دہشت گردوں نے اس خوب صورت خطے کا حسن داغ دار کر دیا۔''

کرشمہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو، اپنی مٹی کی آزادی کے لیے لڑنے والے اپنے دشمن کی صفوں میں دہشت پھیلا دیتے ہیں، یہاں کے کچھ دہشت گردوں نے پوری بھارت سرکار میں خوف و ہراس پھیلا رکھا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انگریزوں سے انڈیا اور پاکستان کو آزاد کرانے کے لیے سیکڑوں، ہزاروں ہندو اور مسلمان لڑنے مرنے پر تُلے ہوئے تھے۔''

پونم پانڈے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''او گاڈ! تت...... تمہاری باتیں...... تم کشمیری اور پاکستانی دہشت گردوں کے حق میں بول رہی ہو...... تمہیں پتا نہیں، ان لوگوں نے کتنے بھارتی فوجیوں کو ہلاک کر دیا، کتنی مائیں سونی کر دیں، کتنے بچے یتیم ہو گئے؟''

کرشمہ مسکرا کر بولی۔ ''مائی ڈیئر پونم! میں نے تمہارے فیچر پڑھے ہیں۔ تمہارا تعلق تامل ناڈو سے ہے، تم نے تامل ٹائیگرز کے حق میں کئی فیچر لکھے ہیں۔ ان کے ساتھ ہونے والے مظالم پر تم بے چین ہو جاتی ہو، انہیں حریت پسند اور حقوق کی جنگ لڑنے والا کہتی ہو، یہی کچھ تو بے گناہ اور معصوم کشمیریوں کے ساتھ ہو رہا ہے اور انہی کی طرح یہ لوگ بھی ظالم اسٹیٹ سے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں، کیا تم اتنی تنگ نظر ہو کہ اپنی جنگ کو مقصد اور دوسروں کی جنگ کو فساد کہتی ہو...... تم تو لبرل مائنڈ ہو۔''

پونم کچھ نہ بولی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر کھوئے کھوئے انداز میں کہنے لگی۔ ''تت...... تم...... یہاں تفریح کرنے اور فیچر تیار کرنے نہیں آئی ہو...... کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ یہاں تمہاری آمد کا اصل مقصد کیا ہے؟''

کرشمہ چوہدری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ بات نہیں بتا سکتی۔''

''مگر کیوں؟''

''کیونکہ تم نے بھی اپنی اصلیت مجھے نہیں بتائی۔ تم نے مجھ سے یہ بات چھپائی ہے کہ تم اصل میں ''را'' کے لیے کام کرتی ہو...... کیوں؟ چھپائی ہے نا...... یہ بات!''

پونم کا رنگ سفید ہو گیا۔ ''کک...... کون ہو تم؟''

کرشمہ نے مسکرا کر کہا۔ ''میرا نام کرشمہ ہے، کرشمہ چوہدری...... اور میں پاکستان......!'' کرشمہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ پونم نے اچانک دروازے کی طرف چھلانگ لگائی تھی مگر کرشمہ اس سے بھی پھرتیلی نکلی۔ وہ بیٹھے بیٹھے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ جیسے اس کے بدن میں پارا دوڑ گیا ہو۔ اگلے ہی لمحے پونم کی چھوٹی سی چٹیا کرشمہ کے ہاتھ میں تھی۔ کرشمہ نے اپنے ہاتھ کو ایک جھٹکا دیا۔ پونم کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ اچھل کر واپس مسہری پر آ گری۔ اس نے گرتے ہی اٹھنے کی کوشش کی مگر کرشمہ کا مضبوط سول والا جوتا اس کے سینے پر آ گیا پھر کرشمہ کی سرسراتی ہوئی آواز پونم کے کانوں میں گھستی چلی گئی۔

''میڈم پونم پانڈے! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم صحافت کی آڑ میں کیا کیا گل کھلاتی رہتی ہو۔ ائرپورٹ کے واش روم میں تم نے جس جدید واچ ٹرانسمیٹر سے ایل کے کدوائی کو میرے یہاں پہنچنے کی اطلاع کی تھی۔ اس میں اب ایک مائیکرو ڈکٹا فون موجود ہے، اس کے ذریعے میں نے تمہاری ساری گفتگو سن لی تھی۔ ویسے شک تو مجھے دہلی میں تمہارے فلیٹ پر پہنچتے ہی ہو گیا تھا۔ تمہارے ٹیلی فون سیٹ کے قریب والی دراز میں جو ڈائری رکھی ہے، اس میں صحافیوں اور رپورٹرز کے بجائے صرف اور صرف را کے اعلیٰ عہدے داروں کے نمبرز ہیں۔''

پونم نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''کک...... کیسی ڈائری، وہاں کوئی ڈائری نہیں ہے۔''

کرشمہ چوہدری بولی۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو، وہاں کوئی ڈائری نہیں ہے، کیونکہ اب وہ ڈائری میرے پاس ہے...... یہ دیکھو...... یہی ہے نا؟'' کرشمہ نے پتلون کے پچھلے حصے میں اڑسی ہوئی ڈائری نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

پونم کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ ساتھ حیرت بھی نظر آنے لگی۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر اس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔

کرشمہ کہہ رہی تھی۔ ''دو سال پہلے جب لندن کے بزنس مین نے ایشیا ٹائمز کے لیے تمہارا انتخاب کیا تھا، یہ

انتخاب غلط نہیں تھا۔ تم ہی وہ لڑکی ہو جو میرے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتی ہو۔"

پونم نے سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "مشن! کیسا مشن؟ مم...... میں بھلا کس مشن میں تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں؟" وہ راہِ فرار تلاش کرنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ بری طرح مچلنے اور اس کی ٹانگ کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔

کرشمہ نے اس کے سینے پر جوتے کی ایڑی کا دباؤ بڑھا دیا اور ہنس کر بولی۔

"مچل کیوں رہی ہو، کہیں میرے پیر کا دباؤ زیادہ تو نہیں بڑھ گیا۔ ویسے بھی جسم کے اس حصے پر دباؤ بڑھنے سے زیادہ تکلیف تو ہوتی نہیں ہے۔ کان کھول کر سن لو، تم کرشمہ چوہدری کے شکنجے میں ہو، موت ہی تمہیں آزادی دلا سکتی ہے۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ جو میں کہوں، وہی کرو...... کیا نام ہے تمہارے اس منگیتر کا جو تم سے جان چھڑا کر یہاں کشمیر میں آ گیا ہے۔ ہاں، اجے...... میجر اجے...... ذرا اس کا فون نمبر تو بتانا۔"

پونم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ حیرت کے شدید جھٹکے میں اپنی قوتِ گویائی سلب کر بیٹھی تھی، وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کرشمہ چوہدری کو گھورتی رہی پھر اٹک اٹک کر بولی۔ "تت...... تمہیں اس کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟"

کرشمہ نے کہا۔ "میں سب کچھ معلوم کر کے ہی یہاں آئی ہوں...... اور میجر اجے سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟ کیا کام ہے تمہیں اس سے؟" پونم تڑپ کر بولی۔

کرشمہ نے ایک ادا سے کہا۔ "کوئی خاص کام نہیں، صرف فون پر بات کروں گی۔ سنا ہے وہ حسین لڑکیوں پر جان فدا کرتا ہے، جس خوب صورت لڑکی کو دیکھتا ہے، اس پر مرمٹتا ہے۔ خوب صورت حسیناؤں کی تلاش کا شوق ہی اسے تم سے دور کرنے کا سبب بنا ہے، کنواری لڑکیوں سے عشق کر کے، ان کے بدن کی مہک اور جوانی کا رس قطرہ قطرہ نچوڑنے اور پھر ان کی لاشیں دریا میں بہا دینے کا اسے بہت شوق ہے...... میں بھی تو دیکھوں کتنا سجیلا ہے وہ۔ اگر اس کی آواز پسند آئی تو میں اس سے ملنا پسند کروں گی۔ اسے موقع فراہم کروں گی کہ وہ کرشمہ چوہدری سے عشق کرے۔ دیکھیں تو کتنا بڑا چھیلا ہے وہ۔"

کرشمہ کی باتیں پونم کے بدن میں آگ لگا رہی تھیں۔ وہ بری طرح مچل کر کسمسائی پھر غرائی۔ "کتیا! میں تیرا منہ نوچ لوں گی۔ تجھے اس قابل ہی نہیں چھوڑوں گی کہ تو اپنا چہرہ میرے اجے کے سامنے بھی لے جا سکے۔"

کرشمہ چوہدری کا جوتا اس کے منہ پر پڑا۔ اس کے ساتھ پونم کے حلق سے چیخ نکلی اور کرشمہ کے ہاتھ میں ایک چمکدار خنجر لہراتا دکھائی دیا۔ پونم بپھر کر مغلظات بکتی ہوئی پلٹی تو چاقو کی دھار پر نظر پڑتے ہی اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ اس کا ایک گال پھٹ گیا تھا۔ رخسار سے نکل کر بہنے والا گاڑھا خون اس کی گردن تک کو چپ چپا رہا تھا۔ حالانکہ چاقو کی معمولی سی رگڑ اس کے داہنے گال پر لگی تھی۔ کرشمہ نے تیز دھار خنجر کی نوک اس کے سینے پر عین دل کے مقام پر رکھ دی اور سرد آواز میں بولی۔ "یہ خنجر گوشت بہت نفاست سے کاٹتا ہے۔ ایک لمحے میں یوں دل تک پہنچ جائے گا، جیسے موم میں سوئی اتر جاتی ہے۔"

پونم کے حلق سے بے اختیار ہلکی سی کراہ نکلی اور پھر اس نے ایک موبائل نمبر اگل دیا۔ کرشمہ نے فوراً جیب سے ایک ٹیپ نکالا اور پونم کے منہ پر چپکا دیا، تھیلے میں سے باریک سی رسی نکالی اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کرشمہ چوہدری کو تک رہی تھی جو اب سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ اس نے اپنی جیکٹ کی اوپری جیب سے ایک موبائل فون نکالا۔ پونم کا بتایا ہوا نمبر پریس کیا۔ دوسری طرف سے کال ریسیو ہوتے ہی وہ دھیرے سے بولی۔ "آہا، میجر اجے کمار! نمستے، کیسے ہیں آپ؟"

دوسری طرف سے ایک گمبھیر آواز سنائی دی۔ "آواز تو بہت رسیلی ہے، کون ہیں آپ؟"

کرشمہ چوہدری بولی۔ "آواز ہی نہیں، میں خود بھی بڑی رسیلی ہوں، آپ بھی کمال خوبیوں کے مالک ہیں، صرف آواز سن کر نام کا اندازہ لگا لیا۔"

"میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہتی ہیں، اپنا تعارف تو کرائیں، میرا نمبر آپ کو کیسے ملا؟"

"یہ بھی بتا دوں گی۔ فی الحال تو اتنا سُن لیں۔ بندی کا نام رسیلی ہے، دہلی سے آپ کی تعریفیں سنتی آ رہی ہوں۔ یقیناً آپ بہت گبرو جوان ہوں گے۔ میں نے کسی مرد کی اتنی ساری لڑکیوں سے تعریف نہیں سنی۔ کہتے ہیں آپ ایک دفعہ جس حسینہ کو دیکھ لیتے ہیں، وہ اپنا غرور خاک میں ملا دیتی ہے اور آپ ہی کے نام کی مالا جپنے لگتی ہے۔"

تعریف عورتوں ہی کو نہیں، مردوں کو بھی الو بنا دیتی ہے۔ میجر اجے کمار چوکڑی بھول گیا۔ پُراشتیاق لہجے میں

بولا۔ ''لوگ مجھے حسن پرست کہتے ہیں۔ اب اگر لڑکیاں مجھے یاد رکھتی ہیں۔ تعریف کرتی ہیں تو یہ میری خوش قسمتی ہے۔ آپ کب دیدار کرا رہی ہیں؟''

''جب آپ کہیں، میں تو آپ کے ہی چکر میں آئی ہوں۔ آپ کی عاشق پونم پانڈے کی دوست ہوں، وہ ہر وقت آپ کی باتیں کرتی رہتی ہے۔ کہتی ہے، آپ اتنے قابل ہیں کہ بے شمار آتنگ وادیوں کا سراغ لگا چکے ہیں۔ وادیِ کشمیر میں لڑکیاں آپ کے سپنے دیکھنا پسند کرتی ہیں۔''

میجر اجے کی آواز سنائی دی۔ ''پونم! یہ کس چڑیل کا نام لے دیا، اب تو اس کا فیگر ہی آؤٹ ہو چکا ہے۔ وہ تو پہلی مرتبہ میں بھی مجھے جچی نہیں تھی...... مگر آپ کی آواز بتا رہی ہے کہ...... کہ......''

کرشمہ بولی۔ ''ابھی سے تشبیہ نہ دیں۔ آمنے سامنے آئیں گے تو دل کی سچائی آنکھوں سے پڑھ لیں گے۔''

''تو پھر کب رونق بخش رہی ہیں ہمارے ویرانے کو؟''

''میں تو آپ کے ویرانے میں گلزار کھلا دوں گی، ہلچل مچا دوں گی۔ ایسی ہلچل کہ سب مدتوں یاد رکھیں گے۔ میں یہاں اسٹار ہوٹل میں ہوں...... گاڑی بھیج دیں، بند ہو تو بہتر ہے، حسن کو پردہ درکار ہوتا ہے۔ پھر پونم بھی میرے ساتھ ہے۔ وہ مشہور جرنلسٹ ہے۔ کہیں آتنگ وادی اس کو اغوا نہ کر لیں۔''

''اوہ! اس کا مطلب ہے...... وہ حرافہ بھی ہے، خیر آ جاؤ، اس کے بھی چودہ طبق روشن نہ ہو گئے تو اجے نام نہیں...... میں ابھی گاڑی بھیج رہا ہوں۔ فاصلہ زیادہ ہے دو تین گھنٹے لگ جائیں گے، گاڑی پہنچنے میں۔''

''او کے......! اب ملاقات ہو گی تو بات ہو گی۔'' اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور پونم کی طرف گھوم کر بولی۔ ''یہ تھا وہ الو جس سے تم عشق کرتی ہو، کیا تمہارے ملک میں کوئی غیرت مند آدمی فوج میں نہیں آتا؟''

پونم اوں، آں کر کے رہ گئی۔

کرشمہ بولی۔ ''چچ...... چچ...... دیکھو تو تمہارا کتنا خون بہہ گیا...... اگر تم شور نہ مچاؤ تو میں تمہاری مرہم پٹی کر سکتی ہوں۔''

پونم نے فوراً اثبات میں گردن ہلا دی۔ کرشمہ چوہدری نے اس کے منہ سے ٹیپ ہٹا دیا۔ باتھ روم سے گلاس میں پانی لے کر اس کے رخسار کا زخم صاف کیا اور اپنے پرس میں سے دوا نکال کر زخم پر لگاتے ہوئے بولی۔

''میں ہر حال میں اجے سے ملنا چاہتی ہوں، کسی بھی قیمت پر...... ایک آدھ قتل کرنا میرے لیے معمولی بات ہے، اگر تم تعاون کرو تو تمہاری زندگی کی ضمانت دی جا سکتی ہے...... ورنہ کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں میرے ساتھ جو ہو، سو ہو، لیکن تمہیں ضرور ہلاک کر دوں گی۔''

پونم کی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ وہ لرزتی آواز میں بولی۔ ''میرے ہاتھ پاؤں کھول دو، میں موت سے بہت ڈرتی ہوں، میں تمہارے ساتھ پورا تعاون کروں گی...... بھگوان کے واسطے...... مجھے کھول دو......''

کرشمہ نے اس کے ہاتھ پاؤں کی بندشیں کھول دیں اور کرسی پر آرام سے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''غسل خانے میں جا کر لباس تبدیل کر لو، اجے کی طرف سے بھیجی گئی فوجی جیپ آتی ہو گی۔''

پونم نے کمزور لہجے میں کہا۔ ''اس کا کیمپ یہاں سے بہت دور ہے، کم از کم تین گھنٹے میں گاڑی آئے گی۔''

کرشمہ ہنس پڑی۔ اس کے سفید موتیوں جیسے دانت چمکنے لگے۔ وہ بولی۔ ''کمال کی عاشق ہو۔ محبوب کی حرکتوں سے بھی ناواقف ہو۔ تمہارا گھامڑ محبوب چھ گھنٹے انتظار نہیں کرے گا۔ واکی ٹاکی سیٹ کے ذریعے سرینگر کے کسی کیمپ میں اطلاع دے کر یہاں کی گاڑی ہوٹل میں بھیجے گا۔''

اس کے لہجے میں بھرپور یقین تھا۔ پونم الجھی ہوئی خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے باتھ روم میں چلی گئی۔ ابھی وہ فراغت کے بعد باہر بھی نہیں نکلی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پونم نے باہر آ کر کہا۔ ''ویٹر ہو گا، ہم نے کھانے کے لیے کچھ نہیں منگوایا تھا، آرڈر لینے آیا ہو گا۔''

کرشمہ نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک باوردی بھارتی فوجی کھڑا تھا۔ کرشمہ پر نظر پڑتے ہی بولا۔ ''میجر اجے کمار کا پیغام ہے کہ اس کمرے کے مہمانوں کو عزت و احترام سے ٹاور کیمپ پہنچا دیا جائے، کیا آپ تیار ہیں؟''

کرشمہ کا خیال درست نکلا تھا۔ میجر اجے نے واقعی سرینگر کے کیمپ سے ایک جیپ بھیج دی تھی۔ پونم، کرشمہ چوہدری کی ذہانت پر حیران رہ گئی۔ دونوں اپنا سامان سمیٹ کر کاؤنٹر پر بقایا جات واپس لے کر باہر نکلیں۔ ہوٹل کے سامنے اندھیرے میں فوجی جیپ کھڑی تھی۔ ایک باوردی ڈرائیور مستعد بیٹھا تھا۔ انہیں ہوٹل سے لانے والا فوجی چھوٹے رینک کا آفیسر تھا۔ وہ آگے بیٹھ گیا۔ کرشمہ اور پونم خاموشی سے پچھلی نشست پر جا بیٹھیں۔ کرشمہ چوہدری

نے بیگ سے شال نکال کر ہاتھوں پر ڈال لی، پونم نے دیکھ لیا کہ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔

جیپ لگ بھگ تین گھنٹے تک چلتی رہی۔ راستے میں انہیں کئی چیک پوسٹوں پر رکنا پڑا مگر ہر بار ان کی گاڑی بغیر تلاشی کے آگے بڑھ گئی۔ دو تین بار کرشمہ کے موبائل پر بزر بجا، کرشمہ نے موبائل کی روشن اسکرین پر نمبر دیکھ کر موبائل آف کر دیا۔ پونم سرگوشی میں بولی۔ ''کون ہے؟ جس سے تم نے بات نہیں کی؟''

کرشمہ نے جوابی سرگوشی میں کہا۔ ''وہی ہے جس کے پاس جا رہے ہیں، کس قدر بے چین فطرت ہے کہ ذرا سا صبر بھی نہیں کر سکتا۔''

تین گھنٹے بعد انہیں دور اندھیرے میں ایک بلند و بالا ٹاور پر دھیمی سی سرخ روشنی نظر آ گئی۔ کرشمہ چوہدری اب چوکنی نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے اعصاب تن گئے تھے۔ آنکھوں میں بلی کی سی چمک دکھائی دینے لگی۔ کچھ دیر میں ہی فوجی جیپ ایک فوجی کیمپ میں داخل ہو گئی۔ میجر اجے کمار بے تابی سے اپنے خیمے کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ وہ لگ بھگ اٹھائیس، تیس برس کا ایک سرپھرا نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔ جیپ رکتے ہی وہ قریب آیا، پہلے اس کی نظر پونم پر پڑی۔ پونم نے منہ پھیر لیا پھر کرشمہ چوہدری کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آیا، وہ پونم کی اوٹ میں تھی۔ اس نے آہستگی سے اپنا چہرہ باہر نکالا تو میجر اجے سکتے کی سی کیفیت میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ایسا حسن اس نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سرخ یاقوتی تراشیدہ ہونٹ، ستواں ناک، میدے اور شہد سے گندھے رخسار، بڑی بڑی کٹورا آنکھیں، براؤن ڈیلے، وہ چند لمحے سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا رہا۔

کرشمہ چوہدری نے اپنا ہاتھ اس کے چہرے کے سامنے لہرایا۔ ''حسن کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا آداب کے خلاف ہے۔ کیا ایک ہی مرتبہ میں دل کی حسرت پوری کر لو گے۔'' یہ کہہ کر کرشمہ چوہدری نے پلکیں جھپکائیں اور چہرے کا زاویہ تبدیل کر لیا پھر بیگ میں سے ایک سیاہ رنگ کی اونی شال نکال کر پہلے سر لپیٹا اور پھر پچھلے حصے پر گھما کر اس کا ایک پلو چہرے کے سامنے لے آئی۔ اب اس کے اوپری ہونٹ، رخسار اور قاتل آنکھیں سامنے تھیں۔ ٹھوڑی اور اس کا تل، نچلا ہونٹ اور حسین گردن سیاہ شال کی اوٹ میں چھپ گئی تھی۔ وہ شرماتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہر لڑکی کو اسی طرح گھورتے ہو یا......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میجر اجے کمار یوں چونکا جیسے نیند سے بیدار ہو گیا ہو، جھینپتے ہوئے بولا۔ ''معاف کیجیے گا، میزبانی کے آداب بھی بھول گیا۔ تشریف لائیے...... آؤ پونم...... لگتا ہے اب تک ناراض ہو...... یہ تمہارے گال پر بینڈیج کیسی ہے؟''

پونم کے ہونٹ وا ہونے سے پہلے ہی کرشمہ بولی۔ ''ہم نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں...... کیا ہمارے لیے چھولداری کا انتظام کر دیا گیا ہے۔''

''بالکل...... بالکل...... شاندار انتظام ہے، وہ سامنے چھولداری میں کھانا بھی تیار ہے۔'' وہ انہیں اشارہ کرتے ہوئے فوجی جیپ کی طرف بڑھا۔

آفیسر سیلوٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''سر کرنل دیوا رام کہتے ہیں کہ...... آپ...... میرا مطلب ہے...... کنٹرول یور سیلف...... پیچ ایکٹی ویٹی ول بی......''

میجر اجے نے غرا کر کہا۔ ''اس دیوا رام کے بچے کو کہہ دو۔ جو کام وہ خود کرنے کا اہل نہیں، اس پر دوسروں کو روکنا، ٹوکنا اچھی بات نہیں۔ میں یہاں ایک حساس معاملے میں مصروف ہوں، مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے تو بہتر ہوگا۔''

''مگر سر!''

''کوئی اگر، مگر نہیں، اباؤٹ ٹرن! کیا تمہیں پتا نہیں ہے صرف ایک سال کے دوران میری کیا خدمات ہیں۔ آتنک وادیوں کے دو سو ٹھکانوں پر ریڈ کروائی ہے۔ پھر اگر میں تھوڑی سی بے راہ روی میں ملوث ہوں تو......''

''مگر سر!''

''آئی سے...... یو کین بی آف۔'' میجر اجے نے آفیسر کو بُری طرح جھڑک دیا تھا۔

آفیسر ہونٹ کاٹتے ہوئے واپس جیپ میں بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔

میجر اجے کمار، کرشمہ چوہدری اور پونم پانڈے کو پورے احترام کے ساتھ ایک عمدہ سی چھولداری میں لے آیا۔ تینوں نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ پونم نے چپ سادھ رکھی تھی۔ اجے نے اس کا منہ کھلوانے کی بہت کوشش کی مگر اس کی زبان نہیں ہلی۔

کھانے کے بعد کرشمہ بولی۔ ''مسٹر اجے کمار! رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''چہل قدمی...... میرا خیال ہے بستر لگ......''

کرشمہ نے بات کاٹ کر کہا۔ ''میں بستر میں جانے

سے پہلے، کھانا ہضم کرتی ہوں۔ میری خوش نصیبی ہوگی کہ آپ چہل قدمی میں میرا ساتھ دیں...... اور...... پونم تو زخمی ہے، بہتر ہوگا تم آرام کرو۔''

پونم کچھ نہ بولی۔ میجر اجے کمار کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ کرشمہ محض ایک حسین پری ہی نہیں تھی بلکہ اس کے خوابوں میں نظر آنے والی من چاہی صورت ثابت ہوئی تھی۔ خیمے سے نکل کر کرشمہ نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''پونم کے خیمے پر پہرا لگا دیں، کہیں ایسا نہ ہو وہ ہمارے پیچھے آکر شور کرے اور رنگ میں بھنگ ڈالے۔''

میجر اجے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر اس کے خوابوں کی شہزادی کھڑی تھی۔ اس نے اب تک یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے، اور یہاں آنے کا اصل مقصد کیا ہے؟ اس نے دو اہلکاروں کو بلایا اور سرگوشی میں کچھ ہدایات دیں۔ دونوں اہلکار پونم والے خیمے کے پاس جاکر چوکس کھڑے ہوگئے۔ کرشمہ اور میجر اجے پیدل ہی ایک طرف کو چل پڑے۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک نہایت بلند آہنی ٹاور کھڑا تھا۔ اس کے اوپر ایک چھوٹی سی سرخ بتی روشن تھی۔ کرشمہ نے اس کی طرف دیکھا اور حیرت سے بولی۔ ''کمال ہے...... اتنا بڑا ٹاور...... اگر اس سے کوئی جہاز ٹکرا جائے تو......؟''

میجر اجے ہنس کر بولا۔ ''ظاہر ہے حادثہ ہوجائے گا...... ویسے ایسا مشکل سے ہی ہوتا ہے۔ اوپر جو سرخ بتی کی روشنی نظر آرہی ہے، وہ طیاروں کے پائلٹ کو ہوشیار کردیتی ہے۔''

راستے میں جا بجا فوجی اہلکار کھڑے تھے، کیمپ کے دو اطراف میں کھائی تھی، ایک طرف وہ راستہ جس کے ذریعے وہ اس کیمپ میں آئے تھے جبکہ ایک جانب تاریکی، درخت اور ٹاور تھا۔ وہ ست روی سے ٹہلتے ہوئے دھیمی آواز میں باتیں کررہے تھے۔ میجر اجے کہہ رہا تھا۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ آپ پونم کی کوئی جرنلسٹ دوست ہیں اور کشمیر میں ہم فوجیوں کی حالت پر فیچر کرنے آئی ہیں۔''

کرشمہ چوہدری ہنستے ہوئے کہنے لگی۔ ''آپ.... بڑے ذہین ہیں اور باتیں بھی دلچسپ کرتے ہیں، واقعی کوئی ایک بار مل کر آپ کو فراموش نہیں کرسکتا۔''

میجر اجے بولا۔ ''ذرہ نوازی ہے، مگر سچی بات تو یہ ہے کہ آپ حسن و جمال میں بے مثال ہیں۔ اتنی حسین لڑکی تو شاید پورے کشمیر میں کوئی نہیں ہوگی۔ میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ میری زندگی میں بے شمار لڑکیاں آئی ہیں۔ ہمیں اپنی ڈیوٹی کے نام پر بہت سے ایسے کام بھی کرنا پڑتے ہیں، جن کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا مگر ڈیوٹی...... ڈیوٹی ہے۔''

''مثلاً کیسے کام۔'' کرشمہ نے پوچھا۔

میجر بولا۔ ''مجھے تو بتاتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے۔ اگرچہ آپ جرنلسٹ ہیں۔ آپ سے جو کچھ چھپایا جانا ممکن ہو، چھپانا چاہیے، مگر جب کوئی من کو بھا جائے تو اس سے چھپانا بددیانتی ہوتی ہے۔ مسلمان کشمیری لڑکیوں کی کوکھ میں ہندو بچوں کا بیج بونا ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ اگرچہ مجھے یہ ظلم محسوس ہوتا ہے مگر......''

کرشمہ چوہدری کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس قسم کی باتیں اخبارات میں وہ اکثر پڑھتی رہی تھی، مگر کسی بھارتی درندے کے منہ سے اعترافی طور پر پہلی مرتبہ سُن رہی تھی۔

اس وقت ایک فوجی جیپ زن کی آواز کے ساتھ ان کے قریب سے گزر گئی۔ اس کا رخ ٹاور کی طرف تھا۔ کرشمہ نے موضوعِ گفتگو تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ جیپ اس وقت کہاں جارہی ہے؟''

''معمول کے گشت پر...... اس میں دو اہلکار ہیں جن کی ڈیوٹی تبدیل ہورہی ہے۔ وہ ٹاور کے قریب ڈیوٹی دیں گے اور وہاں موجود دونوں اہلکار اسی جیپ میں واپس آجائیں گے۔''

''بہت اہم ہے کیا یہ ٹاور؟'' کرشمہ کا انداز معصومانہ تھا۔

''ہاں! بہت اہم۔ اس ٹاور کی تنصیب نے آتنگ وادیوں کی کمر توڑ دی ہے۔ یہ ٹاور دراصل ایک قسم کا اینٹینا ہے۔ اس کو نصب کرنے میں اسرائیل نے ہمارے ساتھ مالی تعاون کیا ہے، یہ باتیں فیچر میں لکھ مت دیجیے گا۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ میں نجی گفتگو کے دوران میں ہونے والے انکشاف آف دی ریکارڈ ہی رکھتی ہوں۔''

نجی گفتگو کا لفظ سن کر میجر اجے کمار کی آنکھوں میں چمک لہرا گئی۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتے ہوئے بولا۔ ''کشمیر میں آتنگ وادی کے ٹھکانے تلاش کرنا مشکل اور جان جوکھوں کا کام ہے مگر اس ٹاور نے اب ساری مشکلیں آسان کردی ہیں۔ کسی کو نہیں پتا کہ یہ کیا بلا ہے۔ جب آتنگ وادی اپنے شارٹ رینج اور لانگ رینج واکی ٹاکی یا وائرلیس سیٹ پر ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں تو یہ ٹاور نہ صرف وہ گفتگو کیچ کرلیتا ہے بلکہ نقشے پر اس مقام کی .... نشاندہی کردیتا ہے جہاں سے بات کی جارہی ہوتی ہے۔''

''اوہ! پھر تو یہ بہت ہی اہم ہے۔ اس کی حفاظت کا

بھی خاص انتظام کیا گیا ہوگا کہ کہیں آتنگ وادی اس پر حملہ آور نہ ہو جائیں؟''

میجر اجے نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹاور کیمپ...... ایک ایسی بھیانک جگہ ہے جہاں حملے کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرا نام ہی سن کر ارد گرد کے آتنگ وادی بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔''

کرشمہ چوہدری مسکرا کر بولی۔ ''اوہ! بہت خوب، اس کا مطلب ہے مجھے آپ کے سامنے تھر تھر کے بجائے دھڑ دھڑ کانپنا چاہیے۔''

میجر اجے کمار کے حلق سے فلک شگاف قہقہہ نکل گیا۔ وہ بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''کیسی باتیں کرتی ہیں آپ، جس کو میجر اجے نے پہلی ہی نظر میں دل میں جگہ دینے کا فیصلہ کرلیا ہو، اس کو تو راج کرنے کی ضرورت ہے...... راج کرنے کی......''

''اور اگر میں راج کرنے سے انکار کردوں تو......؟''

میجر اجے جھٹکے سے رک گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ نیچے بیٹھا اور بھیک مانگتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ایسا نہ کہیں...... مس ریسلی! مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ محبت ہوئی ہے اور......''

کرشمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''جس کی زندگی میں بے شمار لڑکیاں آئی ہوں وہ کیا جانے، محبت کیا ہوتی ہے۔ جو بے گناہ معصوم لڑکیوں کی عزت تار تار کرنے کو اپنی ڈیوٹی تصور کرتا ہو، اس کے دل میں پیار کے لیے رائی برابر جگہ نہیں ہوتی۔''

میجر اجے کمار کی حالت دیکھنے والی ہوگئی۔ تاریکی میں بھی اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ بولا تو اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''مم...... میں گنگا نہالوں گا...... اپنے دل و دماغ اور بدن کی ساری غلاظت پوتر گنگا جل سے دھولوں گا...... مگر تم ایسی بات نہ کہنا کہ میرا دل ٹوٹ جائے۔''

کرشمہ چوہدری رکی نہیں۔ ٹاور کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''میرے پیچھے آؤ۔''

وہ اپنی ساری فوجی اکڑ بھول گیا۔ سدھائے ہوئے کتے کی طرح اس کے پیچھے چلنے لگا۔ اس کو قریب آتے دیکھ کر مسلح اہلکار چوکس ہوگئے۔ قریب ہی فوجی جیپ کھڑی تھی۔ وہ پہرے دار فوجی جیپ کے قریب کھڑے ڈرائیور سے بات کررہے تھے۔ ڈرائیور ایک نوجوان سا آدمی تھا۔ وہ جیپ سے اتر کر یہ عجیب و غریب منظر دیکھنے لگا۔ سیاہ شال اوڑھے وہ لڑکی تیز تیز قدموں سے ٹاور کی طرف بڑھ رہی تھی اور ان کا میجر اجے کمار پالتو کتے کی طرح اس کے پیچھے تھا۔ میجر کی وجہ سے کسی نے کرشمہ کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ٹاور کے نیچے پہنچ کر اپنی سانس درست کرنے لگی، پھر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔

میجر اجے ہانپتے ہوئے اس کے قریب پہنچا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ''مس ریسلی! یہاں سے باہر نکلو۔ ان پتھروں کے نیچے پوری لیبارٹری ہے۔ یہ خطرناک جگہ ہے......''

کرشمہ نے پورے اطمینان کے ساتھ کہا۔ ''اہم فیصلے اہم مقام پر ہوتے ہیں۔ تم نے ابھی مجھ سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ میری زندگی کا یہ اہم لمحہ ہے۔ مجھے اہم فیصلہ کرنا ہے، کیا تم اس مقام پر کوئی اہم فیصلہ کرسکتے ہو؟''

میجر اجے کمار اس کے پیروں میں بیٹھ گیا۔ ہمت ہارتے ہوئے بولا۔ ''کہتے ہیں پہلی نظر کا سچا عشق، عاشق کو محبوبہ کا کتا بنا دیتا ہے...... میں تمہارے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اب جو تم بولو، میں وہ کروں گا۔''

کرشمہ چوہدری نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ''میں ایک...... مسلمان لڑکی ہوں، کیا تم میرے لیے اپنا دھرم چھوڑ دو گے؟''

میجر اجے کمار ایک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا۔ کرشمہ کے چہرے پر تناؤ تھا۔ وہ اندھیرے میں گھور رہی تھی مگر ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ تیزی سے حرکت میں آگئے تھے۔ شال کے پلو سے بندھا، ماچس کی ڈبیا جتنا بڑا بکس اب اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس سے پہلے کہ میجر اجے اس کی بات کا جواب دیتا...... کرشمہ چوہدری نے وہ سیاہ بکس دو پتھروں کے درمیان دراڑ میں رکھ دیا۔ اب اس کا تناؤ ختم ہوگیا تھا۔ کسی کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔

اسی وقت میجر اجے بولا۔ ''تم دھرم کی بات کرتی ہو...... میں زندگی تیاگ دینے پر تیار ہوں۔ میں نے کہا نا کہ مجھے زندگی میں پہلی بار عشق ہوا ہے۔ اب میں وہی کروں گا جو تم کہو گی مگر......''

کرشمہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اگر، مگر کی بات بعد میں، واپس چلو، کوئی لڑکی ساری باتیں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی۔ اسے کاغذ، قلم کا سہارا لینا پڑتا ہے۔''

میجر اجے کمار خوشی سے اچھل پڑا۔ کچھ دیر بعد وہ پلٹے اور چھولداری کی طرف بڑھے۔ اجے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کچھ کہنے کے لیے ابھی منہ کھول ہی رہا تھا کہ کرشمہ تیز لہجے میں بولی۔ ''میرا ہاتھ چھوڑ دو، جب تک تم میری شرط پوری نہیں کردیتے، میں تمہارے ہاتھوں کا لمس بھی برداشت نہیں کرسکتی۔''

میجر اجے نے اس کی بات سنی اَن سنی کر دی۔ اسی طرح ہاتھ پکڑے پکڑے بولا۔ ”رسیلی! میں قسم کھاتا ہوں کہ تمہارا یہ ہاتھ اب میرے ہاتھ میں آگیا ہے۔ میں اس ہاتھ کو مرتے دم تک نہیں چھوڑوں گا۔“

”تڑاخ۔“ کرشمہ کا زوردار طمانچہ میجر اجے کے گال پر پڑا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ کرشمہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ تیزی سے چھولداری کی طرف بھاگی۔ میجر اجے کمار چلایا۔ ”رکو...... رکو! بات سنو۔“

مگر کرشمہ دیوانہ وار بھاگ رہی تھی۔ اس وقت جیپ کا ڈرائیور حرکت میں آیا، اس نے سمجھنے میں دیر نہیں لگائی کہ اس اجنبی لڑکی نے ان کے میجر کی تذلیل کی ہے۔ اس نے اپنا سروس ریوالور نکالا اور کرشمہ کی طرف اس کا رخ کر کے اندھا دھند گولی چلا دی۔ ایک زوردار چھناکا ہوا۔ گولی سامنے کھڑی بے چھت فوجی جیپ کی ونڈ اسکرین کو توڑتی ہوئی انتہائی تیز رفتاری سے کرشمہ کی طرف بڑھی۔ خوش قسمتی سے اس وقت کرشمہ کو ٹھوکر لگی اور وہ گولی کی زد میں آنے سے بال بال بچ گئی۔ ونڈ اسکرین میں گولی کے سوراخ نے مکڑی کا جالا سا بنا دیا تھا۔ کرشمہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ فوجی ڈرائیور نے ایک بار پھر پستول تان کر ہالٹ کا نعرہ لگایا مگر اس وقت میجر اجے چلایا۔ ”گولی مت چلانا، فول مین! تمہیں گولی چلانے کا حکم کس نے دیا؟ خبردار گولی چلائی تو......!“

کرشمہ کھڑی ہو چکی تھی۔ میجر اجے ہانپتے ہوئے اس کے قریب آگیا۔ اس کے گال پر چھپی ہوئی انگلیوں کے نشان ملگجے اندھیرے میں بھی دکھائی دے رہے تھے۔ کرشمہ چوہدری کے چہرے پر پسینا تھا۔ میجر اجے نے کہا۔ ”گھبرانے کی ضرورت نہیں، مجھے تم سے عشق ہوا ہے اور عشق بڑا ظالم ہوتا ہے۔ تم میرے ساتھ چلو، ٹھنڈا پانی پیو اور......“

کرشمہ بولی۔ ”میں واپس جاؤں گی...... ابھی اور اسی وقت......“

”اس وقت کہاں جاؤ گی، صبح چلی جانا...... میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

کرشمہ بولی۔ ”اگر تم واقعی مجھ سے عشق کر بیٹھے ہو تو فوراً مجھے واپس اسی ہوٹل میں پہنچا دو۔ میں ایک خط دے کر جاؤں گی۔ یہ تمہارے عشق کا امتحان ہے...... خط صبح کا سورج نمودار ہونے سے پہلے مت پڑھنا۔“

میجر اجے کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ عشق بڑے بڑوں کے کس بل نکال دیتا ہے۔ جتنی دیر میں فوجی جیپ تیار کی گئی، اتنی دیر میں کرشمہ نے ایک خط لکھ کر میجر اجے کمار کے ہاتھ میں دے دیا اور بولی۔ ”پونم سو رہی ہے۔ اسے صبح تک سونے دو۔ صبح کا سورج نکلنے کے بعد خط پڑھنا اور فیصلہ کرنا۔ میں نے اس میں......“ میجر بیچ میں بول پڑا۔

”اگر تم رات کو یہیں رک جاتیں تو میں تمہاری باتیں تمہارے سامنے مان لیتا، تمہارا یہ طریقہ عجیب ہے......“

”عشق ایسے ہی عجیب امتحان لیتا ہے۔ میں ایک مسلمان لڑکی ہوں، کسی ایسی جگہ رات بسر نہیں کر سکتی، جہاں میرے بارے میں سوچنے اور ٹھنڈی آہیں بھرنے والا عاشق بیٹھا ہو۔“

میجر اجے کچھ نہ بولا۔ عشق کی مہر اس کے ہونٹوں پر لگ گئی تھی۔ کرشمہ جیپ میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔

ٹھیک تین گھنٹے بعد وہ اسلام آباد (اننت ناگ) کے اسٹار ہوٹل کے سامنے اتر کر اندر داخل ہو گئی۔

جس وقت فوجی اہلکار جیپ لے کر واپس جا رہے تھے۔ عین اسی وقت وہ ٹاور کیمپ جہاں کرشمہ کا عاشق میجر اجے کمار بھی موجود تھا، دھماکے سے اڑ گیا۔ طویل ٹاور ایک دھماکے سے زمین بوس ہو گیا۔ دھماکا اتنا خطرناک تھا کہ اننت ناگ تک کی زمین تھرا گئی۔ لوگ عمارتوں سے باہر نکل آئے۔ ایک ہجوم کھڑا تھا گلیوں اور سڑکوں پر۔ ایسے میں ہوٹل اسٹار سے سیاہ اونی شال میں لپٹی ایک لڑکی خاموشی سے نکلی اور پیدل چلتی ہوئی ایک تاریک گلی میں داخل ہو گئی۔ وہ پاکستانی سیکرٹ سروس کی اسپیشل ایجنٹ مس کرشمہ چوہدری تھی۔ 1965ء کی جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے بہادر میجر چوہدری عثمان اور بھارتی انٹیلی جنس کی سابق کیپٹن سیتا (طاہرہ عثمان) کی اکلوتی بیٹی......

یہ وہی لڑکی تھی جس کی پیدائش سے پہلے اس کی ماں نے خواب دیکھا تھا کہ پاکستانی فوج کی اولاد آگے چل کر پاکستان کے ہی خلاف کام کرے گی۔ مگر کرشمہ چوہدری نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ خون کی تاثیر ماں کی طرف سے نہیں، باپ کی طرف سے ہوتی ہے۔ وہ پاکستانی فوج کی اولاد تھی۔ بھارتی عورت کے رحم میں نمو پا کر اپنے خون کی تاثیر کیسے بھلا سکتی تھی۔ کرشمہ چوہدری آج بھی کشمیر کے محاذ پر مجاہدانہ کارنامے سرانجام دے رہی ہے۔ جنگِ ستمبر سے شروع ہونے والی اس داستان کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک یا تو کشمیر آزاد نہیں ہو جاتا یا کرشمہ شہید نہیں ہو جاتی۔

# آتشِ زن

تمکین رضا

آتشِ انتقام سرد کرنے کے لیے بعض اوقات لوگ جرم کی راہ اپنا لیتے ہیں۔ ایک انتقام گزیدہ... مردم بیزار شخص کی اشتعال انگیز کارروائی...

**بدلے وجذبات کی آگ میں جھلسے شخص کا اقدام**

آگ بجھانے کے پائپ ایلکس آٹو پارٹس کی پارکنگ لاٹ میں پھیلے پڑے تھے۔ آگ بجھ چکی تھی لیکن دھواں اب بھی اٹھ رہا تھا۔

''تمہارے خیال میں یہاں کیا واقعہ پیش آیا ہوگا؟'' آفیسر رابرٹ پیکارڈ نے بجھے ہوئے ملبے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''آگ اس سے بھی زیادہ بدتر ہوسکتی تھی۔'' فائر چیف ہیری سوئفٹ نے اپنا ہیلمٹ پیچھے کھسکاتے ہوئے

جواب دیا۔ ''یہ خوش قسمتی ہے کہ کسی نے آگ دیکھ لی اور بروقت اطلاع کردی۔''

بلڈنگ کا ایک کارنر غائب ہو چکا تھا جبکہ بقیہ حصہ پانی سے تر اور دھویں سے اٹا ہوا تھا۔

''لیکن یہ شروع کیسے ہوئی تھی؟ آگ لگنے کی وجہ مشکوک تو نہیں؟'' رابرٹ پیکارڈ نے جاننا چاہا۔

چند سال قبل آٹو پارٹس اسٹور کے مالک ایلکس مورس پر یہ الزام ثابت ہو چکا تھا کہ اس نے انشورنس کی رقم وصول کرنے کی خاطر خود ہی اپنے اسٹور کو آگ لگائی تھی اور فراڈ کرنے کے جرم میں اسے سزا بھی ہو گئی تھی۔ اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتنے کے بعد اس نے رہائی پا کر اپنا یہی کاروبار دوبارہ شروع کر دیا تھا۔

''میں نہیں سمجھتا کوئی بھی شخص دوبارہ ایسی چالبازی کی کوشش کر سکتا ہے۔'' فائر چیف نے کہا۔ ''لیکن یہ برا ہوا ہے۔ یقیناً ہم اس بارے میں مزید تحقیقات کریں گے۔'' اس نے اپنی انگلی اپنی ناک کے سائڈ پر رکھتے ہوئے آنکھ ماری۔ ''البتہ......''

''سمجھ گیا۔'' آفیسر رابرٹ پیکارڈ نے سر ہلا دیا۔ ''تھینکس۔''

پھر وہ پارکنگ لاٹ پار کر کے دوسری جانب پہنچ گیا جہاں پر کئی لوگ جمع تھے۔ ان میں اسٹور کا مالک ایلکس بھی تھا۔

ایلکس بیمار سا لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پولیس کے لکڑی کے بنے ہوئے بریکیڈ کو مضبوطی سے دبو چا ہوا تھا۔

''یہ سب بے حد ہولناک ہے! میں نے اپنا کاروبار دوبارہ سے جمانے کے لیے دن رات سخت محنت کی تھی اور اب یہ ہو گیا!''

''ہاں اب یہ ہو گیا۔'' رابرٹ نے سوالیہ لہجے میں اس کی بات کو دہرا دیا۔

''تم یہ مت سمجھو کہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق ہے!'' ایلکس نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے پہلے گڑبڑ ضرور کی تھی لیکن اب میں نے توبہ کر لی ہے اور ایک ایماندار کاروباری آدمی ہوں۔''

''کسی آدمی کو نکال باہر تو نہیں کیا تھا جو تم سے بدلہ لینا چاہتا ہو؟ ایلکس آٹو پارٹس کا کوئی رقیب؟''

ایلکس نے اپنے برابر میں کھڑے ہوئے دبلے پتلے شخص کی جانب دیکھا جس نے کمپنی کے لوگو والی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔

''تم اس وقت خاصے آگ بگولا ہوئے تھے جب میں نے تمہیں گزشتہ ہفتے یہ بتایا تھا کہ میں تمہارے کام کے اوقات میں کمی کر رہا ہوں، ڈیل۔''

ڈیل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''ہاں۔ لیکن میں ہارڈ ویئر اسٹور میں اضافی کام کر کے اپنا گزارا کر لوں گا۔ مجھے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔''

پھر ڈیل رابرٹ پیکارڈ کی جانب گھوم گیا۔ ''گزشتہ روز ہمارے یہاں ایک کسٹمر آیا تھا جو بے حد چراغ پا ہوا تھا، آفیسر۔''

''وہ کون تھا؟'' آٹو پارٹس کے مالک ایلکس نے پوچھا۔ ''اور چراغ پا کیوں ہوا تھا؟''

''فرینک ایک اور پارٹ کا اسپیشل آرڈر دے رہا تھا۔ لیکن جب میں نے اسے قیمت بتائی تو اسے وہ بہت زیادہ لگی۔ میں نے اس پر واضح کیا کہ یہ مناسب قیمت ہے کیونکہ یہ پارٹ درآمد شدہ ہے اس لیے اتنا مہنگا ہے۔ ربر کے ان بمپرز کا وزن ایک ٹن سے کم نہیں ہوگا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ کتنی جلدی برا مان جاتا ہے اور ناراض ہو جاتا ہے۔''

ایلکس نے اثبات میں سر ہلایا اور رابرٹ پیکارڈ کی جانب گھومتے ہوئے بولا۔ ''فرینک ووگل اپنی اسپورٹس کار کو اصل شکل میں لانا چاہ رہا ہے۔ اس لیے اس کے پارٹس کے لیے ہر وقت آتا رہتا ہے۔ وہ فوراً ہی مشتعل ہو جاتا ہے اور لڑنے بھڑنے میں دیر نہیں لگاتا۔''

''اس حد تک بھڑک سکتا ہے کہ تمہاری دکان کو آگ لگا دے؟'' پولیس افسر نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے ایسا تو نہیں ہے لیکن......'' یہ کہتے ہوئے ایلکس نے شانے اچکا دیے۔

☆☆☆

پولیس آفیسر کو فرینک ووگل اس پتے پر مل گیا جو ایلکس نے اسے فراہم کیا تھا۔ وہ باہر اپنے گیرج میں موجود تھا اور ایک اسٹول پر بیٹھا اپنی 1969ء کی ماڈل ایم جی بی اسپورٹس کار کے ایک حصے پر ریگ مال سے رگڑائی کر کے اس کا رنگ اتار رہا تھا۔

''ہاں، میں ایلکس کے اسٹور پر اکثر جاتا رہتا ہوں۔ میری اس سے اکثر ڈیل ہوتی رہتی ہے لیکن گزشتہ روز وہ اسٹور میں موجود نہیں تھا۔ مجھے اس کے دبلے پتلے ملازم سے بات کرنی پڑی تھی۔ وہ بڑا ٹیڑھا آدمی ہے۔

بہت لے دے کر رہا تھا۔ میں نے اسے کھری کھری سنا ڈالیں۔ حساب بے باق ہو گیا تھا تو پھر اب کیا ہوا؟ میں بھی غصے سے اکھڑ سکتا تھا؟'' فرینک نے کہا۔ ''لیکن میں آتش زن نہیں ہوں۔''

''تم ایلکس کو کب سے جانتے ہو؟'' رابرٹ پیکارڈ نے پوچھا۔

''لگ بھگ دس سال تو ہو چکے ہوں گے؟''

''کیا تم اسے ایک دوست تصور کرتے ہو؟''

''ہم ایک دوسرے کو نجی اور مفید مشورے دیتے رہے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے فرینک اسٹول پر سے اٹھ کھڑا ہوا اور جیب میں سے ایک چیتھڑا نکال کر کار پر رگڑنے لگا۔

''کیا تمہاری اس وقت بھی اس سے دوستی تھی جب وہ اس سے پہلے مشکل میں گرفتار ہوا تھا؟''

فرینک نے چیتھڑے کو اپنے تھوک سے گیلا کیا اور ایک کروم فنشنگ کو چمکانے لگا۔ ''آفیسر اگر تم یہ پوچھ رہے ہو کہ کیا میں نے اس کے پرانے کاروبار کو آگ لگانے میں اس کی مدد کی تھی تو میرا جواب نفی میں ہے۔''

آفیسر پیکارڈ نے اپنی توجہ کار کی جانب مبذول کر دی اور فرینک کو دیکھتا رہا جو پچھلے بمپر کی رگڑائی کر رہا تھا۔

فرینک نے ایک بار پھر چیتھڑے کو گیلا کیا اور بمپر کی چمک دار سطح کو مزید چمکانے لگا۔ ''اسی کو آئینے جیسی فنشنگ کہتے ہیں، سر۔'' اس نے بمپر میں اپنا عکس دیکھا اور مسکرانے لگا۔

## چٹخارے

☆ کلاس ٹیچر نے تیمور سے پوچھا۔ ''بیٹا! تم کھانا شروع کرنے سے پہلے دعا پڑھتے ہو؟''

''نہیں مس...... میری مما بہت اچھا کھانا بناتی ہیں۔''

☆ تم دونوں بھائیوں نے بلّی پر لفظ بہ لفظ ایک ہی مضمون لکھا ہے۔ یہ نقل ہے!''

''مس! ہم دونوں نے ایک ہی بلی پالی ہوئی ہے!''

☆ ''تم ایسے شخص کو کیا کہو گے جو مسلسل بولتا رہے، اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کوئی اس کی بات سن رہا ہے یا نہیں؟''

''ٹیچر!''

☆ جارج واشنگٹن نے اپنے باپ کا پسندیدہ چیری کا درخت کلہاڑی سے کاٹ دیا اور اس کا اقرار بھی کر لیا لیکن اس کے باپ نے پھر بھی اسے سزا نہیں دی...... جانتے ہو کیوں؟''

''جی مس! جارج واشنگٹن کے ہاتھ میں کلہاڑی جو تھی!''

امریکا سے جاوید کاظمی کے شگفتہ پارے

''یہ جب مکمل طور پر اپنی اصلی حالت میں آجائے گی تو اور بھی خوب صورت ہو جائے گی۔'' رابرٹ پیکارڈ نے خلوصِ دل سے کہا۔

''یقیناً۔'' فرینک نے تائید کی۔

''آفیسر رابرٹ پیکارڈ واپس ایلکس آٹو پارٹس اسٹور پر آگیا جہاں ملبا ابھی بھی سلگ رہا تھا۔ ایلکس اور ایل ملبے میں سے چیزیں چننے میں مصروف تھے۔

پیکارڈ ان کے نزدیک پہنچا اور ڈیل سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم آگ لگانے کے شبہے میں زیرِ حراست ہو۔''

''تم پاگل تو نہیں ہو۔'' ڈیل نے کہا۔ ''آگ میں نے نہیں لگائی، یہ یقیناً فرینک نے کیا ہوگا۔''

''نہیں، یہ تم نے کیا ہے۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔

''لیکن......''

''اس لیے کہ فرینک کی اسپورٹس کار کے بمپر کروم کے بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے اس کار بر کے بنے ہوئے بمپرز کی قیمت پر تم سے بحث کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہے نا؟'' پولیس آفیسر نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ڈیل! تم نے ایسا کیوں کیا؟ تم نے مجھے برباد کر دیا۔'' ایلکس نے مایوس لہجے میں کہا۔

''اس لیے کہ تم نے میرے کام کے اوقات گھٹا دیے تھے، ایلکس۔'' ڈیل پھٹ پڑا۔ ''میں غصے سے بھر گیا تھا۔''

''تمہیں پولیس اسٹیشن میں اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے خاصا وقت مل جائے گا۔'' پولیس آفیسر رابرٹ پیکارڈ نے ڈیل کو ہتھکڑی پہنا کر اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ایلکس نے افسردگی سے اپنا سر ہلایا اور پھر ملبے میں سے کارآمد اشیا چننے میں مصروف ہو گیا۔

# آوارہ گرد

قسط 42

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد ذلیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے اُنسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خداترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ناں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ”اسپیکٹرم“ کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو تلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو تلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام جھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسمِ نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو تلسی کے چندرناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو تلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندرناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو تلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچادیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ”انڈیمان“ پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا

ممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا گینگسٹر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جمائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ نانا شکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اژدھے کوریلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آ جاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کبیل دادا اس کے سامنے آ جاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کبیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھوانی انہیں انڈرورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ابول کیج بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے۔ منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہو جاتا ہے۔ داور کو قابو کر کے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا، جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر بُرد کر کے طلسمِ نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر مقامی قبائلیوں کی سرزمین اور ڈارک کیسل ان کے حوالے کر کے ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کر کے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کر دیں گے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسمِ نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔

میں نے ذرا بھی پریشانی یا کسی قسم کی گھبراہٹ کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا بلکہ اپنے چہرے پہ کھنڈی ہوئی سنجیدگی طاری کیے ان کے قریب آنے کا منتظر رہا...... البتہ میں نے ڈری سہمی پنکی کو ہولے سے کہا تھا۔

"ڈرو نہیں بیٹا! میں تمہارے ساتھ ہوں۔" میرے ذہن میں تھوڑی دیر پہلے پنکی کے کہے ہوئے یہ الفاظ ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔

"شہ...... شہزی انکل! وہ...... مم...... ماما کی جان سخت

خطرے میں ہے۔''

وہ مونچھیل شخص جو بلاشبہ راٹھور تھا، کرخت نظروں سے مجھے گھورتا ہوا گارڈ کے ساتھ تیز تیز قدم اُٹھاتا میرے نزدیک آ گیا۔

''کون ہو تم اور اس بچی کو بہلا پھسلا کر کہاں لے جانا چاہتے ہو......؟'' اس نے میرے قریب آ کر درشت اور بارعب لہجے میں پوچھا۔ میں اس کے جملوں کی مکاری کو سمجھ گیا تھا۔

''یہی سوال میں تم سے پوچھنا چاہا ہوں گا کہ تم کون ہو اور اس بچی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''شہزی انکل! ان لوگوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی میں انہیں جانتی ہوں۔'' پنکی نے فوراً عقل مندی کا مظاہرہ کیا۔ جس پر راٹھور نے اسے غصے سے گھورا بھی تھا مگر پھر فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔

تاہم میرے اس طرح پُراعتماد سے جواب دینے پر گارڈ کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ یہ معاملہ اغوا وغیرہ کا نہیں ہے، کیونکہ اس مکار راٹھور نے ابتدا میں یہی تاثر دینے کی کوشش چاہی تھی مگر جب گارڈ نے میری پُراعتماد جوابی کارروائی دیکھی تو اسے کچھ احساس ہوا تھا کہ معاملے کی نوعیت کوئی خاندانی جھگڑا ہے۔ لہٰذا فوراً ہم دونوں کے بیچ مداخلت کرتے ہوئے بولا۔

''آپ لوگ یہاں آپس میں مت اُلجھیں، بہتر ہوگا کہ ایڈمن صاحب کے آفس چلیں۔''

''چلو، میں تیار ہوں......'' میں نے کہا۔

''بے بی! تم کلاس روم میں جاؤ......'' راٹھور نے پنکی سے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''نہیں، یہ بھی ہمارے ساتھ ایڈمن کے آفس میں جائے گی۔'' میں نے راٹھور کی طرف گھور کر سرد لہجے میں کہا۔ اس مکار نے گارڈ کی طرف دیکھا جو پہلے ہی اس صورتِ حال سے پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے پنکی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''بے بی! یہ تمہارے کیا لگتے ہیں؟''

''یہ میرے انکل ہیں......! لیکن میں انہیں بالکل نہیں جانتی۔'' پنکی نے فوراً گارڈ کو جواب دیا۔ اس کا اعتماد بحال ہونے لگا تھا۔ گارڈ نے سر ہلا دیا اور راٹھور بے بسی سے دانت پیسنے لگا۔ وہ گارڈ سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر گارڈ نے ہم تینوں کو ہی ایڈمن کے آفس چلنے کا کہہ دیا اور پنکی کو اپنے ساتھ کر لیا۔

ہم ایڈمن کے کمرے میں پہنچے۔ وہ حسبِ سابق اپنے چربیلے وجود کے ساتھ کرسی پر دھنسا بیٹھا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی پہلے تو اس کے چہرے پر حیرت اور بعد میں ناگواری کے تاثرات اُبھرے۔ اس نے مجھے نظرانداز کرتے ہوئے راٹھور سے نہایت خوش خلقی سے بیٹھنے کو کہا۔ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ مجھے اس کے نظرانداز کیے جانے پر غصہ تو بہت آیا لیکن میں خود پر قابو پاتے ہوئے زبردستی ایک دوسری کرسی پر براجمان ہو گیا۔

''یہ شخص نعیمہ سعدیہ کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ یہاں سے لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔'' راٹھور نے دانستہ پنکی کا پورا نام لیتے ہوئے ایڈمن سے میری اطرف اشارہ کر کے شکایت کی۔

''یہ آدمی جھوٹ بول رہا ہے، یہ میرے شہزی انکل ہیں اور میں خود بھی ان سے ملنا چاہتی تھی۔'' پنکی نے تڑ سے جواب دیا۔ وہ بھی شاید سمجھ گئی تھی کہ ڈرنے اور سہم جانے سے اُلٹا نقصان ہی ہوگا فائدہ نہیں۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ بعض سوالوں کے پنکی خود ہی جواب دے اسی لیے میں اس کے بولنے کے انتظار میں دانستہ تھوڑی دیر کے لیے خاموشی اختیار کر لیا کرتا تھا، لیکن اب میرے بولنے کی باری تھی۔ میں نے ایڈمن کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایڈمن صاحب! میرا نام شہزاد احمد خان عرف شہزی ہے، آپ نے یقیناً اخبارات اور مختلف ٹی وی چینلز میں میرا نام اور ذکر سنا ہوگا۔ میرا خیال ہے بچی کا میرے بارے میں یہ کہنا کافی ہے۔ اس کی جان خطرے میں ہے اور میں اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔''

میری بھانپتی ہوئی نظریں ایڈمن کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس نے میری بات سنی اور بغور پنکی کے چہرے پر بھی ایک نظر ڈالی۔ میری بھانپتی ہوئی نظروں نے نمایاں طور پر محسوس کیا تھا کہ اب اس کے چہرے پر میرے لیے ناگواری اور کرختگی کے تاثرات کی جگہ اُلجھن آمیز پریشانی نے لے لی ہے۔ کیونکہ اس نے پنکی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''بے بی! اگر یہ تمہارے انکل ہیں تو پھر یہ کیا لگتے ہیں تمہارے......؟'' ایڈمن نے راٹھور کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم تو انہیں بھی انکل کہتی تھیں؟''

''آپ بھول رہے ہیں سر!'' پنکی نے فوراً ایڈمن کے چہرے کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''آپ نے کب مجھے ان کو انکل کہتے سنا......؟''

ایڈمن شہود بیگ ذرا جزبز سا ہوا اور پھر اس نے پوچھا۔ ''اگر یہ تمہارے کچھ بھی نہیں لگتے تو پھر تمہاری ممی نے

تمہیں کیوں ان کی سرپرستی میں دے رکھا ہے؟''

''یہ مما کی مجبوری ہے لیکن یہ بات مجھے پسند تھی نہ ہی میرے بھائی خرم دانش کو کہ ہم ایسے لوگوں کی سرپرستی میں ہوں جنہوں نے سرپرستی کے نام پر ہمیں قیدی بنا رکھا ہے۔'' پنکی نے ایڈمن کو پورے اعتماد سے جواب دیتے ہوئے قریب بیٹھے راٹھور کی طرف ناگوار نظروں سے دیکھا۔

''بیٹا! ایسا تمہاری مما نے تمہارے بھلے کے لیے کیا تھا۔ وہ تمہیں چھپے ہوئے دشمنوں سے بچانا چاہتی تھیں۔'' راٹھور نے پنکی کی طرف دیکھتے ہوئے اسے پچکارنے کے انداز میں کہا۔ ''چلو اُٹھو گھر چلتے ہیں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے ایڈمن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں بے بی کو لے جاسکتا ہوں ناں بیگ صاحب؟''

میں نے دیکھا شہود بیگ خود اُلجھ سا گیا تھا۔ میرے تعارف اور پنکی کی باتوں نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف نظر آتا تھا کہ اُسے ''مس گائیڈ'' کیا گیا ہے جبکہ حقیقت کچھ اور نظر آرہی تھی۔

''تم پنکی کو نہیں لے جاسکتے راٹھور......!'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ میرے منہ سے اپنا نام سن کر یقیناً چونکا ہوگا مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''میں تم سے مخاطب نہیں ہوں مسٹر شہزادو!'' راٹھور نے میری طرف گھورتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔

''چلو...... بے بی!'' راٹھور نے پنکی کا بازو پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے فوراً اس کا بڑھتا ہوا ہاتھ روک دیا۔

''میں نے کہا نا کہ تم اسے نہیں لے جاسکتے...... راٹھور!''

میری بات پر اس کے چہرے کا رنگ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس نے پھر گردن گھما کر ایڈمن شہود بیگ کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے بیگ صاحب؟ ایک غیر متعلقہ شخص مجھے بے بی کو لے جانے سے روک رہا ہے؟''

شہود بیگ کو یقیناً تصویر کے ایک رخ کا پتا تھا۔ دوسرے کا نہیں، اب جو اس نے یہ دیکھا کہ خود پنکی بھی اس وقت ...... راٹھور کے ساتھ جانے پر آمادہ نظر نہیں آرہی ہے تو وہ اُلجھ گیا پھر راٹھور کی طرف دیکھ کر بولا۔

''دیکھیے راٹھور صاحب! یہ ضرور آپ لوگوں کا کوئی خاندانی معاملہ ہوگا۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں...... بہتر ہوگا کہ آپ بے بی کی مما سے میری بات کرا دیں......''

ایڈمن کی بات پر راٹھور نے زہرناک نظروں سے اسے گھورا اور اسی لہجے میں بولا۔ ''پیسے لیتے وقت آپ کو یہ معاملہ کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا بیگ صاحب! اب آپ کو یہ خاندانی معاملہ نظر آرہا ہے؟'' اس کی بات پر شہود بیگ کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کو متغیر سا ہوا پھر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر بھی راٹھور کے لیے ناگواری کے تاثرات اُبھرے، وہ اس سے تلخ لہجے میں بولا۔

''راٹھور صاحب! غلط بات مت کریں۔ آپ نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ کچھ لوگ بے بی کی جان کے دشمن ہیں اور میں اس کی سیکیورٹی کا خصوصی طور پر خیال کروں اور وہ میں کر رہا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ نے میرے ساتھ غلط بیانی کی تھی کہ یہ معاملہ خاندانی ہے مگر مجھے اس میں مجرمانہ بو آرہی ہے۔ کیونکہ مسٹر شہزی! ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ یہ کوئی غلط کام نہیں کر سکتے۔''

جب ایڈمن نے دیکھا کہ اس کی ذات پر راٹھور کیچڑ اُچھال رہا ہے تو اس نے بھی صاف صاف یہ سب کہہ ڈالا جس پر راٹھور بھی بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے ایڈمن سے کہا۔

''بیگ صاحب! آپ نے درست اندازہ لگایا ہے، حقیقت یہی ہے کہ یہ لوگ زرخرید گرگے ہیں۔ بات بہت طویل اور گہری ہے۔ آپ یا تو بے بی کو میرے ساتھ جانے دیں یا پھر...... پولیس کو مطلع کریں، میں ان سے خود بات کرلوں گا۔''

''پولیس کو میں یہاں نہیں بلانا چاہتا۔'' شہود بیگ نے کہا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ راٹھور کی بات نے اس کا صحیح معنوں میں موڈ خراب کر ڈالا تھا۔ ''اس سے ہمارے ادارے کی بدنامی ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ آپ دونوں ہی اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرلیں۔''

''بیگ صاحب! مسئلے کا حل تو صاف ہے۔'' راٹھور نے شہود بیگ کی طرف گھور کر کہا۔ ''اب تک بے بی کو کون آپ کے کوچنگ سینٹر پک اینڈ ڈراپ کرتا رہا ہے؟ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو کیا بے بی پنکی گھر سے باہر نکل سکتی تھی؟''

شہود نے اس کی بات نظر انداز کر کے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر شہزی! آپ بے بی کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟''

''اس کے اپنے گھر...... جہاں اس کا چھوٹا بھائی خرم دانش بھی موجود ہے۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ گویا شہود بیگ کی گلوخلاصی کر ڈالی کیونکہ وہ اگلے ہی لمحے راٹھور اور

میری طرف دیکھتے ہوئے طمانیت بھرے لہجے میں بولا۔

''پھر جھگڑا کس بات کا ہے؟ آپ دونوں ہی بے بی کو لے کر جاسکتے ہو......''

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ میں نے کرسی چھوڑی اور پنکی سے کہا۔ آؤ بیٹا! چلتے ہیں......'' پنکی میرے ساتھ ہو لی۔ میں اسے لیے باہر نکلا۔ راٹھور بے بسی سے اپنے دانت کچکچاتا ہوا کوچنگ سینٹر کی عمارت سے باہر نکلا اور میں پنکی کو لے کر محتاط انداز میں سڑک کے کنارے آیا تو راٹھور نے میرے پیچھے آتے ہوئے کہا۔

''میری کار کھڑی ہے، تم بے بی کو لے کر کار میں سوار ہوسکتے ہو۔''

اس شاطر آدمی نے شاید مجھے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر تکتے ہوئے یہ بھانپ لیا تھا کہ میرے پاس کار نہیں تھی اور مجھے کسی ٹیکسی کی تلاش تھی۔

''شکریہ! میں ٹیکسی میں ہی جانا پسند کروں گا اور بے فکر رہو، میں بے بی کو لے کر سیدھا گھر پر ہی پہنچوں گا......'' میں نے کھردرے لہجے میں اس سے کہا۔ اس حقیقت کا اسے بھی شاید ادراک تھا کہ میں بھی جھوٹ نہیں بول رہا تھا اور اس ''سچ'' کی وجہ...... یقیناً پنکی کا بھائی دانی ہی تھا۔

جلد ہی مجھے ایک ٹیکسی نظر آگئی اور میں نے اسے ہاتھ دے کر روکا اور پھر عارفہ کی رہائش گاہ گلشن کالونی چلنے کا کہا۔ ٹیکسی والے نے کرایہ بتایا اور میں پنکی کو لے کر اس میں سوار ہوگیا۔ کن انکھیوں سے میں نے راٹھور کی طرف بھی دیکھا تھا جو اپنی سیاہ ہنڈا کار کی طرف لپکا تھا۔

''ٹیکسی ذرا تیز چلانا...... ہمیں جلدی پہنچنا ہے۔'' میں نے ڈرائیور سے کہا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور پنکی پسنجر سیٹ پر موجود تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی کی وجہ سے میں اور پنکی کوئی بات نہ کرسکے تھے۔ ڈرائیور ماہر تھا اور تیزی کا شوقین بھی، اس نے مین روڈ پر آتے ہی ٹیکسی کو طوفانی رفتار سے دوڑانا شروع کردیا۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا، مجھے راٹھور کی سیاہ کار نظر نہیں آرہی تھی۔ مجھے دانی کی طرف سے تشویش ہونے لگی۔ میں اول خیر سے بھی بات کرنا چاہتا تھا۔ زہرہ بانو نے مجھے جو سیل فون عارضی استعمال کے لیے دیا تھا، بدقسمتی سے اس میں کوئی خرابی ہوگئی تھی تب ہی میں نے عقبی سیٹ پر بیٹھی پنکی سے کہا۔

''پنکی! تمہارے پاس فون تو ہوگا؟''

''نہیں شہزی انکل! مما کے حکم کے مطابق ہمیں ان لوگوں نے فون کرنے کی بھی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی۔ صرف گھر پر ہی تھوڑی دیر کے لیے ہمیں سہیلیوں سے بات کرنے کے لیے فون تھمادیا جاتا تھا اور وہ سامنے موجود رہتے تھے۔'' پنکی نے جواب دیا اور میں بے اختیار اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

''کوئی ضروری بات کرنا ہے تو میرے موبائل سے کرلیں جناب!'' معاً ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ وہ خاصا بھلا مانس معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''بڑی مہربانی ہوگی بھائی! واقعی اس وقت کسی سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

''لوجی یہ...... مسئلہ ہے تو کرلیں بات......'' اس بھلے مانس انسان نے فوراً اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سیل فون نکالا اور مجھے تھمادیا۔ وہ ایک سستا سا عام سیٹ تھا مگر اس وقت یہ بھی غنیمت لگا۔ میں نے عارفہ کی رہائش گاہ کا نمبر ملایا اور فون پنکی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اپنے بھائی دانی سے بات کرو۔ اس سے کہنا کہ وہ گھر پر ہی رہے اگر کوئی اسے کہیں ساتھ لے جانے کی کوشش کرے تو کسی کے ساتھ نہ جائے ہم گھر پر ہی آرہے ہیں۔ ہمارا انتظار کرے۔''

پنکی نے فون مجھ سے لے کر گھر بات کی......

''ہیلو، جی میں بات کررہی ہوں...... پنکی! میری دانی بھیا سے بات کروادیں۔'' وہ کہنے لگی۔ میں گردن موڑے پنکی کے چہرے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ چند ثانیے دوسری جانب سے کچھ سننے کے بعد اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''میں خیریت سے ہی ہوں اور راٹھور بھی گھر پہ آرہا ہے، میری دانی سے بات کرواؤ......''

''میں تمیز سے ہی بات کررہی ہوں محترمہ آصفہ......!'' پنکی غصے میں آگئی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ دوسری طرف سے وہی عورت بات کررہی تھی جس نے چند گھنٹے پہلے مجھ سے بھی نہایت سرد لہجے میں عارفہ کی رہائش گاہ پر انٹرکام پہ بات کی تھی۔

پنکی انتظار کرنے لگی۔ ٹیکسی خاصی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ سڑک پر ٹریفک بھی تھی۔ ڈرائیور اس کے باوجود ٹیکسی کو مناسب رفتار سے دوڑا رہا تھا۔ میں نے باہر اطراف میں بھی نظر ڈالنے کی کوشش چاہی تھی مگر مجھے ہنوز راٹھور کی کار کہیں بھی دکھائی نہیں دی تھی۔

''ہیلو دانی بھیا۔'' معاً پنکی کی آواز پر میں چونکا۔ اس

نے شاید خرم دانش سے بات کرادی تھی۔ اس نے دانی سے وہی کہا جو میں نے اس سے کہا تھا، اس کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے ڈرائیور کو نہایت شکریے کے ساتھ اس کا سیل فون واپس تھما دیا۔

مجھے اس وقت اول خیر اور شکیلہ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ مجھے عارفہ کی رہائش گاہ پر اس وقت کسی بڑے معرکے کی بُو آرہی تھی۔ نجانے وہ دونوں اچانک کہاں اور کس مہم پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ موبائل فون بھی ہمارے پاس نہیں تھے۔ ایک طویل عرصہ وطن اور اپنوں سے دوری پر ابھی تک اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی بندوبست ہوسکا تھا۔

ٹیکسی جب عارفہ کی رہائش گاہ والے علاقے کے قریب پہنچی تو میں نے فوراً ڈرائیور سے کہہ کر ٹیکسی مطلوبہ سمت کی طرف گھما دی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں میرے خیال کے مطابق اول خیر اور شکیلہ کی کار کو ہونا چاہیے تھا۔ مجھے کچھ اندازہ تو تھا کہ وہ اپنی مہم سے لوٹنے کے بعد ادھر ہی آکر ٹھہریں گے۔ مگر اب بھی مجھے وہاں کوئی کار دکھائی نہ دی۔ تب میں نے ڈرائیور سے عارفہ کی رہائش کے سامنے ٹیکسی روکنے کا کہا جو اب وہاں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ہی تھی۔ ڈرائیور نے میری ہدایت کے مطابق ٹیکسی وہیں لے جا کر روک دی۔

میں یہ نہیں جان سکا تھا کہ راٹھور وہاں پہنچ چکا تھا یا نہیں......؟

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور شکریے کے ساتھ اسے رخصت کر دیا۔

میرے اعصاب یکلخت تن گئے تھے۔ مجھے یہاں بھی کسی بڑے ہنگامے کی بُو آرہی تھی۔ بات میری نہیں تھی۔ مجھے ان دونوں نوعمر بچوں کی فکر تھی کہ میں کسی بھی طرح انہیں یہاں سے نکال لے جانا چاہتا تھا جبکہ پنکی کی ماں یعنی عارفہ کی جان کو کس سے خطرہ ہوسکتا تھا، یہ معما اپنی جگہ موجود تھا، اس کی تفصیل پنکی ہی مجھے بتاسکتی تھی، جبکہ ابھی وہ خود ایک بڑے ''رسک'' سے دوچار تھی۔

اس بار اُن دونوں ''کارپرداز'' گارڈ نما مسلح افراد نے میرے ساتھ روکھے پن کا مظاہرہ کرنے سے اجتناب ہی برتا تھا، شاید انہیں فون پر ہی پہلے سے کوئی خاص قسم کی ہدایت مل چکی تھی۔ تاہم کھنڈی ہوئی سنجیدگی اپنی جگہ جوں کی توں تھی۔

ستار نامی اسی گارڈ نے اپنے ساتھی کے اشارے پر مجھے اندر آنے کا کہا۔ جیسا کہ مذکور ہوا ان سے میری پہلے بھی مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔

''کیا راٹھور صاحب پہنچ چکے ہیں......؟'' میں نے بغلی دروازے سے اندر قدم رکھتے ہوئے ستار سے پوچھا۔ پنکی میرے ساتھ تھی۔

''پہنچ چکے ہیں۔'' ستار نے اکھڑپن سے جواب دیا۔

''اس طرف آؤ۔''

اس نے پختہ روش کی طرف اشارہ کیا۔ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے اس نے پنکی کا بازو تھامنے کی کوشش چاہی تھی مگر پنکی نے بڑی ناگواری سے اپنا بازو چھڑا کے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

مجھے راٹھور کے جلدی پہنچ جانے پر خاصی حیرت ہوئی تھی، کیونکہ میں اپنی سی کوشش کے مطابق اس سے پہلے یہاں پہنچنے کی جستجو میں تھا مگر لگتا تھا انہوں نے کوئی شارٹ کٹ راستہ اپنایا تھا یا پھر کوئی ایسا راستہ جہاں ٹریفک نسبتاً کم ہوگا۔ خیر یہ زیادہ اچنبھے کی بھی بات نہیں تھی۔

ایک دیدہ زیب اور بیش قیمت لکڑی کے محرابی دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک ہال تھا جو کسی آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم کا منظر پیش کرتا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں یہاں اب ہر قسم کے حالات کے لیے تیار تھا اور میرے اعصاب کسی بھی ایسی ممکنہ کشمکش کے لیے پوری طرح تیار تھے مگر مجھے نہیں لگتا تھا کہ راٹھور میرے ساتھ ایسی کوئی جرأت کرے گا۔

ستار نامی اس گارڈ نے مجھے ابھی تک بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا مگر وہ اس بار پنکی کو ہاتھ لگانے کی جرأت کیے بغیر بولا ..''بے بی! آپ اندر اپنے کمرے میں جاؤ......''

''یہ کہیں نہیں جائے گی۔'' میں نے اس کی طرف گھورنے کے انداز میں دیکھ کر کہا اور زبردستی ایک صوفے پر دھنس کر بیٹھ گیا۔ پنکی بھی میرے ساتھ اور قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''دانی کو بلالاؤ......'' میں نے ستار کی طرف دیکھ کر کہا۔ میں نے دوبارہ راٹھور کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

''راٹھور صاحب کو آلینے دو پہلے......'' ستار نے جواب دیا اور وہیں ہمارے قریب ہی تن کر یوں کھڑا ہوگیا جیسے پہرے پر ہو۔ تب ہی پنکی نے کہا۔

''میں جا کر بھیا کو بلالاتی ہوں شہزی انکل!'' وہ یہ کہتی ہوئی ایک کمرے کی طرف دوڑ گئی۔ میں پنکی کو جانے نہیں دینا

چاہتا تھا، مگر اسے روک بھی نہ سکا۔ کن انکھیوں سے میں نے پاس اٹھ جانے کھڑے ستار کے چہرے کا جائزہ لیا۔ پنکی کے اس طرح اندر دوڑ جانے پر اس کی پیشانی پر چند سلوٹیں اُبھری تھیں اور اگلے ہی لمحے وہ اسی جانب بڑھ گیا۔

میں اس وسیع و عریض نشست گاہ میں تنہا بیٹھا رہ گیا۔ دفعتاً ہی اندر شور کی آواز پر میں چونکا۔ وہ نوعمر آوازوں کا شور تھا جس میں بھاری مردانہ آوازیں اور کسی پکی عمر کی عورت کی بھی گرماتی ہوئی آوازیں شامل تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بچے کسی بات پر ضد کر رہے ہوں۔ یک دم میرے کان کھڑے ہو گئے۔

''انکل...... انکل...... ادھر آئیں...... پل...... یز......''

اچانک ... پنکی کی چیختی چلّاتی آواز اُبھری، مجھ سے اب نہ رہا گیا، میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ صوفے سے اُٹھا اور آواز کی جانب لپکا تھا کہ اچانک دائیں بائیں جانب سے دو افراد نمودار ہوئے، میں انہیں دیکھ کر رک گیا۔ وہ دونوں میرا راستہ روکے کھڑے تھے اور ان کے ہاتھوں میں سیاہ پستل تھے، جن کی لمبی نالوں پر سائلنسر چڑھے ہوئے تھے۔ وہ بڑی جارحانہ نظروں سے ہماری طرف گھورتے جا رہے تھے۔ ایکا ایکی مجھے خطرے کی بُو محسوس ہوئی تھی۔

''میں کیا مطلب سمجھوں......؟'' میں نے قہرناک نظروں اور گونجیلی آواز میں ان سے کہا۔

''مطلب یہ کہ...... تم ادھر ہی بیٹھو گے......'' ان میں سے ایک نے کہا۔ اسی وقت دوبارہ چلّانے کی آواز ابھری...... یہ بھی دانی یا پنکی کی ہی آواز تھی، میری بے چینی انتہا کو چھونے لگی تھی اور پھر وہی ہوا جو ایسے مواقع پر میں کیا کرتا ہوں......

پل کے پل جیسے میرے وجود میں پارا دوڑ گیا۔ میری ایک ٹانگ حرکت میں آئی، دائیں جانب والے پستول بدست کو سوچنے کا موقع بھی نہ ملا اور میری لات اپنے سینے پر کھا کے وہ قالین بچھے فرش سے تقریباً چند انچ اُوپر اُچھل کر عقب میں جھولتے ہوئے گملوں سے ٹکراتا ہوا، ڈائننگ ٹیبل پر جا پڑا۔ دوسرے نے فوراً اپنے پستول کا ٹریگر دبا دیا تھا، ہلکی ''ٹرچ'' سے مشابہ آواز اُبھری تھی۔ مگر اس کا نشانہ خطا گیا۔ کیونکہ مجھے اپنی فوری حرکت پذیری کے بعد اس کی طرف سے بھی ایسی ہی جارحانہ حرکت کی توقع تھی کہ اس نے فقط اپنے پستول کا ٹریگر دبانا تھا اور وہی اس نے کیا بھی تھا، اسی سبب میں نے بیک وقت دو حرکات سے کام لیا تھا۔ پہلے والے کو لات رسید کرتے ہی میں نے اسی تیزی کے ساتھ جھکائی بھی دی تھی۔ خاموش پستول سے داغی ہوئی گولی، شاید آراستہ نشست گاہ کے کسی بیش قیمت بھاری شوپیس کو لگی جس کی چھناکے دار آواز اُبھری تھی۔ جھکائی دیتے ہی میں نے خود کو بائیں کاندھے کے رخ فرش پر گرایا اور سیدھی ٹانگ کو سوئپ کیا۔ دوسرا پستول بدست جو مجھ پر ایک اور گولی چلانے کے لیے پر تول رہا تھا، میری ٹانگ اس کی دونوں ٹانگوں سے ٹکرائی اور اگلے ہی لمحے وہ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔

پہلا والا اُٹھ کر بھیڑیئے جیسی غراہٹ سے مشابہ آواز میں مجھ پر چھلانگ لگا کر جھپٹا مگر تب تک میں نے فرش پر لیٹے لیٹے پلٹنی کھائی اور وہ ''بلینک پوائنٹ'' پر گرا۔ میں نے اس کی ریڑھ کی ہڈی پر ٹانگ رسید کر دی۔ وہ اپنے حلق سے ایک کریہہ انگیز چیخ خارج کر کے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے نے کچھ غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُٹھ کر مجھ پر ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پھینک ماری، میں بڑے آرام سے ایک طرف کو ہو گیا اور اُچھل کر ٹیبل پر پڑا، حملہ آور میری اس تیزی کو بھانپ نہ سکا اور سوچتا رہ گیا، عقدہ اس پر تب کھلا جب میں پشت کے بل ٹیبل پر پڑا اور میری دونوں لاتیں اس کے منہ پر پڑیں۔ وہ قالین بچھے فرش سے چند انچ اُچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا اور دھپ سے گرا۔ میں ٹیبل پر سے لُڑھکنی لگا کر نیچے اُترا اور دوڑا......

کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا میں جوشِ جنوں میں اسے زوردار دھماکے سے دھکا دیتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ ایک کریہہ چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی تھی جو کسی عورت کی تھی، وہ شاید دروازے کی طرف ہی آ رہی تھی اور اب دروازہ زور سے اس کی پیشانی یا سر پہ ''وج'' گیا تھا جس کے باعث بری طرح زخمی ہو کے گر پڑی تھی۔ وہ خاصی بھاری جسامت کی ایک مردمار عورت تھی۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا اور وہاں سے اب بھل بھل خون بہے چلا جا رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے پاس ایک سیاہ نال والا پستول بھی پڑا تھا جو یقیناً اسی کا ہوگا۔ سامنے مجھے خوف زدہ سے دانی اور پنکی ایک دوسرے سے لگے کھڑے نظر آ گئے جبکہ ان کے پاس ہی راٹھور کھڑا دکھائی دیا جو بڑی زہرخند نظروں سے میری جانب گھور رہا تھا۔ اس نے بھی اب پھرتی کے ساتھ پستول نکال لیا تھا۔ اس کی نال کا رخ میری جانب تھا۔

میری نظریں اس کی ٹریگر والی اُنگلی میں ایک ذرا جنبش کو فوراً بھانپ گئی تھیں، ایک دھماکا ہوا اور میں ...... پل کے پل ذرا پہلے ہی اپنی جگہ سے اُچھلا تھا۔ گولی خطا گئی اور میں اس پر جا پڑا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے ایک صوفے پر جا پڑے جو ہمارے وزن سے اُلٹ

گیا۔ اسی وقت دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں اُبھریں۔

راٹھور نے سنبھالا لیتے ہی میرے چہرے پر مُکا رسید کر دیا۔ میرے رگ و پے میں اس وقت جوشِ جنوں کا ایک آتش فشاں سا دہک رہا تھا جس نے میری دردوالی حسیات کو جلا ڈالا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں اس کے مکے کی ضرب کو پی گیا اور اپنے سر کی زوردار ٹکر اس کی ناک پر جڑ دی۔ اس کی ناک کا بانسا اندر کی طرف پچک گیا اور وہاں سے خون بہہ نکلا۔

اسے چھوڑ کر میں اُٹھا اور دروازے پر وہی دونوں بدتمیز گارڈ دکھائی دیے گئے..... مگر یہ دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا کہ دانی اور پنکی وہاں سے غائب تھے۔

''خبردار.....! کوئی حرکت مت کرنا، ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔'' ستار نامی گارڈ نے اپنی گن کا رخ میری جانب رکھتے ہوئے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔

''بچے کہاں ہیں.....؟'' میں نے اس کی دہاڑ اور دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ پہلا والا گارڈ بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''زیادہ چالاکی کی کوشش مت کرو..... کدھر غائب کر دیا ہے تم نے ان دونوں بچوں کو.....؟''

''اُلو کے پٹھو.....! یہ صحیح کہہ رہا ہے۔'' اسی وقت راٹھور کی آواز اُبھری۔ اس نے اپنی زخمی ناک پر رومال رکھا ہوا تھا جو سرخ ہورہا تھا۔ وہ ایک کرسی کا سہارا پکڑے کھڑا تھا۔

''تم جاؤ..... انہیں ڈھونڈو..... وہ ابھی ابھی بھاگے ہیں..... اور تم ستار! اِدھر ہی رہو.....''

اس کے حکم کی دیر تھی کہ پہلا والا تیزی سے پلٹ کر غائب ہوگیا۔ ستار محتاط انداز میں گن میری جانب تانے مزید قریب آگیا۔

میرا اپنا ذہن بھی تیزی سے یہی بات سوچ رہا تھا۔ پنکی نے اگر واقعی بروقت عقل اور ہوش مندی سے کام لیا تھا تو یقیناً یہ اس کا اچھا عمل تھا۔ بشرطیکہ وہ اپنے بھائی کو لے کر یہاں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو چکی ہو.....

''راٹھور صاحب! آپ ٹھیک تو ہیں ناں.....؟ کسی کو بلاؤں.....؟ آپ کی مرہم پٹی.....'' ستار نامی اس گارڈ کی آواز درمیان میں ہی رہ گئی، راٹھور نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تم اِدھر ہی ٹھہرو..... اسے اپنی جگہ سے ہلنے بھی مت دینا۔ بدبخت! لگتا ہے یہاں سب کو ڈھیر کر چکا ہے۔ مجھے بچوں کی فکر ہورہی ہے۔''

''جناب! آپ کو مرہم پٹی کرنے سے پہلے پولیس کو فون کر دینا چاہیے۔'' ستار نے مشورہ دیا۔ میں بظاہر دم بخود سا کھڑا تھا۔ میں چاہتا تو تیسرے درجے کے اس ٹٹو ستار کو بھی پچھاڑنے کی جستجو کر لیتا۔ لیکن پہلے میں دیکھنا چاہتا تھا کہ دانی اور پنکی کہاں غائب ہو گئے تھے۔

''ہرگز نہیں..... پولیس کو اس معاملے کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔ او..... تم آگئے بنٹو.....! سنبھالو اِسے..... کیا حال کر دیا ہے تمہارا بھی اس بدبخت نے.....''

راٹھور نے دروازے پر لڑکھڑاتے ہوئے اُبھرنے والے اپنے اس ساتھی کی طرف دیکھ کر کہا جسے میں تھوڑی دیر پہلے دوسرے کمرے میں اس کے ساتھی کے ساتھ ہی ڈھیر کر کے آیا تھا۔ میرے سر پہ اس وقت ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح سے میں پنکی اور دانی کو ان درندوں کے نرغے سے نکال لے جاؤں، کیونکہ جب سے مجھے پنکی نے یہاں کھیلی جانے والی کسی بھیانک سازش کے بارے میں بتایا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ ''مما کی جان خطرے میں ہے.....'' تو میری سمجھ میں یہی کچھ آتا تھا کہ سیٹھ نوید سانچے والا اتنا بے وقوف ہرگز نہیں ہوسکتا تھا کہ سرمد بابا کی وصیت کے خلاف کوئی قدم اُٹھاتا۔ بقول سرمد بابا کے سیٹھ نوید ایک نودولتیا تھا۔ اس نے اب تک شارٹ کٹ مار کے جو دولت کمائی تھی ان کے ذرائع مشکوک تھے۔ عارفہ کے گرد بھی وہ ایسا ہی جال بُننے میں مصروف تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے سرمد بابا کی وصیت کا خیال کیے بغیر عارفہ سے شادی کر ڈالی تھی اور اسے لے کر ہنی مون پہ بیرونِ ملک نکل گیا تھا اور یہاں اپنے گرگے چھوڑ گیا تھا، کیوں.....؟ اس کیوں کے آگے کے جوابات اب میرے سامنے شاید آشکارا ہونے ہی والے تھے۔

دروازے پر نمودار ہونے والے دشمن کے ساتھی کی حالت گو اب بھی ناگفتہ بہ ہی نظر آتی تھی، تاہم اس کے ایک ہاتھ میں دبے ہوئے خاموش پستول نے اسے کافی زیادہ حوصلہ مند رکھا ہوا تھا۔ ستار گارڈ بھی اس کی ہمت کو سوا کرنے کا باعث تھا۔

''باس! اسے گولی ماردوں.....؟'' وہ دروازے سے اندر آتے ہوئے میری جانب سفاکانہ نظروں سے گھورتے ہوئے راٹھور سے بولا۔

''تم یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ..... ایک نمبر کے نکمے اور ناکارہ ہو تم دونوں.....'' راٹھور حلق کے بل اپنے ہی ساتھی پر چلایا۔ ''جاؤ'' ..... وہ دونوں تیری ماں کے جنے..... کہیں

بھاگ گئے ہیں...... تلاش کرو ان دونوں شیطانوں کو...... جو جی بھی گیا ہوا ہے۔''

راٹھور کو اس طرح خود پر گرجتا برستا دیکھ کر وہ واپس پلٹ گیا۔

''اس پر کڑی نظر رکھو...... میں واش روم جا کر مرہم پٹی کا سامان دیکھتا ہوں......'' راٹھور نے ستار سے تحکمانہ کہا اور کراہتا ہوا ایک طرف چلتا بنا۔ میں نے ستار کی طرف دیکھا اور تھکے تھکے سے ہارے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

''میں یہاں کرسی میں بیٹھنا چاہتا ہوں...... تھک چکا ہوں......'' اور پھر میں نے اس کے بولنے کا انتظار کیے بغیر ہی قدم اس کرسی کی طرف بڑھائے جس راہ پر ایک چھوٹی سی پورٹیبل بچھی ہوئی تھی۔

''بیٹھ جاؤ...... مگر یاد رکھنا! کوئی غلط حرکت......'' اس کا جملہ اُدھورا رہ گیا کیونکہ اگلے ہی لمحے میں نے کرسی پر براجمان ہونے کے انداز میں اپنی دونوں ٹانگوں کو بیک وقت حرکت دی تھی کیونکہ تب میں اپنی ٹانگیں کرسی کے سامنے رکھی پورٹیبل کے نیچے چوبی رخنے میں اٹکا چکا تھا۔ نتیجے میں وہ گولی کی طرح اُڑتی ہوئی...... سیدھی اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ ضرب معمولی نہ تھی۔ ستار کی آخر تک سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ اس کے ساتھ یہ کیا ''واقعہ'' پیش آ گیا تھا۔ اس کے حلق سے کرب ناک چیخ خارج ہوئی تھی۔ ٹیبل نے اس کی پیشانی پھاڑ ڈالی تھی۔ وہ تیورا کر گرا اور بے حال سا ہونے لگا۔ میں نے سب سے پہلے اس کے پستول پر قبضہ جمایا اور...... اسی کے دستے سے اس کے سر پر وار کیا۔ وہ اوغ کی آواز نکال کے وہیں ساکت و صامت ہو گیا۔ میں پستول ہاتھ میں لیے پلٹا اور کمرے سے باہر نکلا۔

عارفہ کی اس رہائش گاہ کا چپا چپا میرا دیکھا بھالا تھا۔ میں پنکی...... دانی...... چلاتا ہوا پوری کوٹھی کا طواف کرنے لگا۔ بے شک یہ میری دیوانہ وار حرکت تھی، بچے کھچے دشمن تھی میری طرف متوجہ ہو سکتے تھے، مگر مجھے ان کی کوئی پروا نہ تھی۔

دشمن تقریباً سبھی ڈھیر ہو چکے تھے، مجھے ان سے کوئی خاص خطرہ نہ تھا۔ مجھے یقین تو تھا کہ پنکی اپنے بھائی کو لے کر کسی محفوظ جگہ چھپ گئی ہوگی۔ نیچے سب جگہ تلاشنے کے بعد جب میں اُوپری منزل دیکھنے کے لیے زینے کی طرف لپکا ہی تھا کہ مجھے بالکونی سے پنکی کی آواز سنائی دی۔

''شہزی انکل!'' میں چونکا۔

''نیچے آؤ جلدی......'' میں نے سر اُٹھا کے ان کی طرف دیکھا۔ دونوں ریلنگ سے اٹکے نیچے دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے زینے کی طرف بڑھے تھے۔ تب ہی مجھے ان کے عقب میں ایک سایہ لپکتا دکھائی دیا۔ وہ انہیں جھپٹنے کے لیے بے چین تھا، یہ یقینی طور پر ستار کا وہی ساتھی گارڈ تھا جسے راٹھور نے پنکی اور دانی کی تلاش میں بھیجا تھا۔ میں نے اسی وقت پستول والا ہاتھ سیدھا کیا اور ریلنگ کے درمیان سے اس کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ پستول پر سائلنسر تھا۔ گولی چلی تھی اور میں نے شکار کو چیخ مار کر بالکونی کے چکنے فرش پر لڑھکتے گرتے دیکھا۔ میں نے دانستہ گولی اس کی ٹانگ پر داغی تھی جو اس کی ران میں لگی تھی۔ پنکی اور دانی اپنے عقب میں کسی کی چیخ اور لڑکھڑا کر گرنے کی آواز پر ڈر سے گئے تھے مگر رکے نہیں۔ میں بھی تب تک نصف زینے طے کر چکا تھا اور وہ راستے ہی میں مجھ سے آن ملے۔ میں انہیں لیے باہر کی جانب لپکا اور پھر نہیں رکا جب تک کہ گیٹ سے باہر نہیں نکل گیا۔ میرے لیے اب سواری کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ مین روڈ یہاں سے خاصی دور تھی، کسی ٹیکسی یا رکشا کا یہاں بھی انتظار کیا جا سکتا تھا مگر یہ وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا۔ میں نے دوڑ لگا دی۔

باہر رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ بیشتر بنگلوں اور کوٹھیوں کے گیٹ پر نصب دودھیا گلوب روشن تھے۔ بیشتر علاقہ تاریک تھا۔ اچانک مجھے کسی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس اُمڈتی نظر آئیں، یہ میرے دائیں جانب سے اُبھری تھی۔ ایک خیال دشمن کا اور دوسرا خیال اول خیر اور شکیلہ کا ہی میرے ذہن میں آیا تھا۔ میں ایک طرف کسی بنگلے کی دیوار کی آڑ میں ہو کر اس طرف دیکھنے لگا۔ پنکی اور دانی میرے ساتھ تھے، میں نے انہیں اپنے پیچھے کر لیا تھا۔

میری نظریں اسی روشنی پھینکنے والی گاڑی پر مرکوز تھیں کہ میں ٹھٹکا۔ ساتھ مسرت تلے میرا دل بھی یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ وہ اول خیر کی کار تھی۔

''یہ میرے ہی ساتھی ہیں آؤ......'' میں نے اُن سے کہا۔ پنکی اور دانی کا سانس پھولا ہوا تھا مگر وہ پھر بھی میرے ساتھ دوبارہ دوڑ پڑے۔ کار ہمارے قریب آ کر رک گئی۔

''او...... خیر......'' مجھے اول خیر کی آواز سنائی دی ساتھ ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے پنکی اور دانی کو کار میں سوار کرایا اور ہانپتی ہوئی آواز میں جلدی سے بولا۔

''اول خیر! تم نیچے اُترو...... شکیلہ تم ڈرائیونگ سیٹ سنبھالو اور ان دونوں بچوں کو بیگم ولا پہنچاؤ......'' وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔

"اس وقت جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو...... وقت نہیں ہے میرے پاس...... جلدی۔" میں نے اس بار غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ دونوں نے میرا حکم بجالانے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کی۔

میں اور اول خیر جب جلدی سے واپس کوٹھی کی طرف جانے لگے تو پنکی نے مجھے آواز دی۔

"شہزی انکل! مما کے لیے کچھ کیجیے گا پلیز......! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ان کی جان سخت خطرے میں ہے۔"

میں نے پنکی کو اس سلسلے میں تسلی دی۔ دونوں کو شکیلہ کے ساتھ روانہ کرتے ہی میں نے اول خیر کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ عارفہ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ گیٹ بند کیا اور اندر آگیا۔ اول خیر حیران پریشان اِدھر اُدھر پڑے راٹھور کے گرگوں کو تکے جارہا تھا اور اس کے حلق سے "او خیر......" برآمد ہوا...... اول خیر سے ان سب کو رسی سے جکڑ کر باتھ روموں میں پھینکنے کا کہا اور خود ایک طرف کو لپکا۔

مجھے راٹھور کی تلاش تھی، جلد ہی وہ مجھے ایک کمرے میں کسی سے فون پر باتیں کرتا ہوا نظر آگیا۔ اس کی ناک پر بھدے انداز میں پٹی بندھی ہوئی نظر آرہی تھی جو اس نے خود ہی واش روم میں جاکر کی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے ریسیور پھینک کر بھاگنا چاہا مگر میں نے ایک ہی جست میں اس کے سر پر پہنچ کر اسے دبوچ لیا اور اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ بے حس و حرکت ہوگیا۔

میں نے اسے وہیں ایک بیڈ پر ڈال دیا اور اسٹینڈ پر رکھے ٹیلی فون کے نفیس سیٹ کے کریڈل سے جھولتے ہوئے ریسیور کو تھاما اور اپنے کان سے لگالیا۔

"ہیلو، ہیلو...... راٹھور! کیا ہوا......؟ تم اچانک کہاں چلے گئے......؟"

دوسری طرف سے چیختی ہوئی آواز اُبھری۔ میں یہ آواز پہچان کر چونکا۔ یہ نوید سانچے والا تھا۔ کھٹک مجھے اس بات کی ہوئی تھی کہ اس کی وائس ٹون ایسی نہیں تھی جیسی عموماً بیرونِ ممالک کسی سے بات کرتے وقت ہوتی ہے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ نوید ملک کے اندر ہی تھا، میں نے فوراً سی ایل آئی میں نمبر دیکھا اور چونک پڑا۔ ایریا اور کوڈ نمبر ملتان کا ہی تھا۔ میں نے فوراً بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"جج...... جناب! کوٹھی پر کسی نے حملہ...... کر دیا ہے، اور راٹھور صاحب اس کا شکار...... آہ......" میں نے جان بوجھ کر اپنے حلق سے کراہ خارج کی، ریسیور چھوڑا اور تھوڑی زوردار آواز میں اُٹھا خ پٹاخ کی، پھر چلّا چلّا کر...... "پکڑو شہزی کو جانے نہ پائے، دوڑو ستار اُس کے پیچھے...... وہ مجھے زخمی کر گیا ہے۔" یہ زور زور سے یہ بولنے کے بعد میں نے پھر ریسیور تھاما اور دانستہ گھٹی گھٹی اور دبی ہوئی آواز میں نوید سانچے والا اسے مخاطب ہوا۔

"جج...... جناب! ہیلو، آ...... آپ لائن پر ہیں......؟"

"ہاں...... ہاں...... میں لائن پر ہی ہوں، بولو......؟ کیا ہوا؟ کس نے حملہ کیا ہے کوٹھی پہ؟ کیا شہزی اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے حملہ......؟ راٹھور کیسا ہے؟ اور تم کون ہو......؟"

"سس...... سر! راٹھور صاحب زخمی ہو کر بے ہوش ہو چکے ہیں، باقیوں کا بھی تقریباً یہی حال ہے، میڈم کا کچھ پتا نہیں ہے، مگر دونوں بچے میرے قبضے میں ہیں۔ میں انہیں لے کر ایک اسٹور میں چھپا بیٹھا ہوں۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا......" حسبِ توقع دوسری جانب سے نوید سانچے والا کی جوشیلی آواز اُبھری...... "یہی دونوں بچے ہمارے کام کے ہیں۔ تم ایک بہت بڑے انعام کے مستحق ہو...... میں تمہیں ایک جگہ کا پتا بتارہا ہوں، لیکن...... تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم ہو کون؟"

اپنی بروقت چال پر میرا دل مسرت سے دھڑک اُٹھا تھا مگر اس کم بخت کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً جواب بناتے ہوئے اس سے کہا۔

"کمال ہے سیٹھ صاحب! آپ مجھے نہیں پہچان رہے ہیں، ہم یہاں آپ کی خاطر اپنی جانیں داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں کہ دشمنوں سے مار کھا کے ہمارا حال بُرا ہوگیا ہے۔ میں ستار کا ساتھی گارڈ ہوں اور راٹھور صاحب کا آدمی فرید ہوں۔"

"او...... اچھا...... اچھا مجھے یاد نہیں رہا ہوگا۔" وہ جلدی سے خفیف ہو کے بولا۔ "پتا نوٹ کرو......"

اس نے مجھے اس جگہ کا پتا بتادیا جو میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا۔

میں نے ایک قریب دھری میز کو اپنی ایک ٹانگ سے اُلجھا کر زور سے پٹخا کہ اس کی آواز فون پر موجود نوید بھی سن لے، اس آواز کے ساتھ ہی میں بھی زور سے چلّایا تھا۔

"کیا ہوا......؟ کیا ہوا......؟" دوسری طرف سے اس نے گھبرا کر پوچھا تھا مگر میں اپنا کام کر چکا تھا اور ریسیور کریڈل پر رکھ کے اس کا تار کاٹ دیا۔

اس کے بعد میں پلٹا۔ اول خیر تب تک سب کو رسیوں سے جکڑ کے اور انہیں ایک کمرے میں مقید کر کے میرے پاس آیا تو میں نے اسے اپنا منصوبہ بتایا۔

''وہ رذیل آدمی ضرور وہاں موجود ہوگا اور اس نے یقیناً عارفہ کو بھی یرغمال بنا رکھا ہوگا۔''

''او...... خیر کا بے! یہ تو تُو نے بڑا پالا مارا...... چل جلدی نکل چلیں...... پر یار! گاڑی......''

''گاڑیاں پورچ میں کھڑی ہیں...... آجاؤ......'' میں نے کہا۔

''او خیر......'' وہ ہولے سے بولا۔

ہم باہر پورچ میں آگئے۔ گاڑی کی چابی تلاشنے کا ہمارے پاس وقت نہ تھا، یوں بھی بغیر چابی کے گاڑی اسٹارٹ کرنا میرا ہی نہیں اول خیر کے بھی بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہماری گاڑی جو درحقیقت وہی سیاہ ہنڈا سٹی تھی، جو راٹھور کی ملکیت تھی۔ اسی کو دوڑانے لگا۔ اسٹیئرنگ پر میں ہی بیٹھا تھا اور اول خیر میری برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

میرے کانوں میں پنکی کے بار بار وہ ہراساں الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے دو بار مجھ سے کہے تھے یعنی ان کی ماں (عارفہ) کی جان خطرے میں تھی اور اس کی جان کو کس سے خطرہ ہوسکتا تھا۔ مجھ سے اور سرمد بابا سے زیادہ بہتر اور کون جان سکتا تھا۔ وہ تو دنیا میں نہیں رہے تھے اور وہی سب سے اچھی طرح اس مردود سیٹھ نوید سانچے والا کی اصلیت اور اس کے گھناؤنے مقصد سے آگاہ تھے۔ میں بھی انہی خطوط پر نوید سانچے والا کا بھیانک چہرہ پہچانے ہوئے تھا۔ عارفہ سے اس کی شادی میری توقع کے خلاف تو نہ تھی مگر سرمد بابا کی وصیت کے باوجود اس کی عارفہ سے اس قدر جلد شادی میں مجھے کسی گہری سازش کی ہی بُو آرہی تھی۔

موجودہ حالات کی کشاکشی میں مجھے جو کام فرصتِ اولین میں انجام دینا تھا، وہ میں کررہا تھا۔

سیٹھ سانچے والا زیادہ دیر تک میری چال کے جال میں پھنسا نہیں رہ سکتا تھا اسی لیے یہ کام جلد از جلد نمٹانے کا متقاضی تھا۔ اس نے اپنے جس ٹھکانے کا پتا بتایا تھا، وہ نواں چوک کے ایک مکان کا تھا۔ وہ اسٹریٹ اور مکان نمبر میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر میں طوفانی رفتار سے گاڑی بھگاتا ہوا وہاں پہنچا۔ میں نے کار مطلوبہ گلی کے ذرا نزدیک لے جاکر کھڑی کی اور اس کے بعد میں اور اول خیر نیچے اُتر آئے، ہم تیزی سے آگے بڑھے۔ میرے پاس اپنا پستول تھا جبکہ اول خیر بھی ہتھیار بدست تھا۔ ہم نواں چوک کی مشرقی سمت پر تھے۔ کار ایک جانب کھڑی کرکے ہم دونوں نیچے اُتر آئے اور سیدھا گلی میں داخل ہوگئے۔

گلی تاریک اور سنسان تھی۔ کسی ممکنہ خطرے اور احتیاط کے پیشِ نظر میں نے اول خیر کو خود سے الگ کردیا اور اسے ہدایت دی کہ وہ ذرا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آتا رہے۔

اس علاقے پر مجھے حیرت ہی ہوئی تھی۔ خاصا پسماندہ علاقہ محسوس ہوتا تھا یہ...... مزدور یا معمولی ملازمت پیشہ افراد ہی یہاں کے رہائشی معلوم ہوتے تھے۔ ایسے علاقے میں عارفہ کو یرغمال بنا کر رکھنا اور خود بھی وہیں ہونا...... باعث حیرت ہی تھا۔ تاہم اس سے نوید سانچے والا کی اصل اوقات کا پتا چلتا تھا۔ مگر اس نے عارفہ کے ساتھ دماغ بہت عیارانہ اور شاطرانہ استعمال کیا تھا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کرسکتا تھا اور بہت پہلے کرلیتا مگر میں آج تک نوید سانچے والا کی ہر سازش اور چال کو ناکام بناتا چلا آیا تھا، اگرچہ اس میں سرمد بابا کی ...... دوراندیشانہ سوچ اور تجربے کا دخل بھی تھا۔ آخری وار تو سرمد بابا نے اپنے مرنے کے بعد وصیت کی صورت میں نوید سانچے والا پر کیا تھا اور اب جبکہ نوید کو اور کچھ سجھائی نہ دیا تو اس نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے طور پر یہ انتہائی قدم اُٹھالیا تھا۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں کچھ کھڑبڑاہٹ کا احساس ہوا، میں یک دم چلتے چلتے رک کر پلٹا اور بری طرح چونک پڑا۔ مجھ سے لگ بھگ پندرہ بیس قدم پیچھے اول خیر آرہا تھا اور ہم دونوں انتہائی محتاط انداز میں گلی کی دیوار سے لگے ہوئے ہی آگے بڑھ رہے تھے، تاکہ کسی کی اتفاقیہ بھی نگاہ ہم پر نہ پڑسکے اور اگر پڑ بھی جائے تو ہم پہچانے نہ جاسکیں، لیکن میں نے دیکھا کہ اول خیر کسی کے ساتھ جنگ آزمائی میں مصروف تھا، میرا ماتھا ٹھنکا۔ گویا خطرہ آگے نہیں ہمارے پیچھے بھی دبے پاؤں چلا آرہا تھا۔ میں نے یک دم پیچھے کی جانب دوڑ لگادی۔ اول خیر اپنے حملہ آور کے ساتھ پوری طرح بھڑا ہوا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری آمد کا کسی کو علم ہوسکے۔ قریب پہنچتے پہنچتے ایک موقع پر میں نے اس نامعلوم حملہ آور کو اول خیر کے نرغے میں دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے میں بدک گیا۔ حملہ آور نے چشم زدن میں چاقو نکال لیا تھا۔ اول خیر کی شاید اس پر نگاہ نہ پڑسکی تھی۔ حملہ آور اس کے نرغے میں اپنی گردن کو چھڑانے کی کوشش میں تھا اور تب ہی مجھے اس کی خطرناک چال کا احساس ہوگیا۔ جیسے ہی اس نے اول خیر پر یہ چھپا ہوا اور اذیت ناک وار کرنا چاہا،

میں ان کے سر پر پہنچ گیا تھا اور میری لات حرکت میں آچکی تھی جو اس خطرناک حملہ آور کے پہلو پر لگی، وہ اول خیر کی آہنی گرفت سے نکل کر زمین پر لڑھکتا چلا گیا۔ اول خیر کو میری اس حرکت پر حیرت ہوئی ہوگی، مگر جب اس نے حملہ آور کے ہاتھ سے چمکتے ہوئے پھل والا مہیب چاقو بھی چھوٹ کر گرتے دیکھا تو اپنی بھویں اُچکا کر رہ گیا اور جان گیا کہ وہ حملہ آور کے ایک انتہائی سفاک وار سے بال بال بچا تھا۔

اُدھر حملہ آور نے اُٹھنے میں غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرنا چاہا تھا مگر میری دوسری لات اس کی ٹھوڑی پر پڑی تھی۔ وہ پھر اُلٹ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔

''کون ہو تم؟ سچ بتاؤ...... ورنہ اِدھر ہی تاریکی میں مارے جاؤ گے۔'' میں نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ اول خیر نے اس کا چاقو قبضے میں کر لیا تھا۔

''تم کون ہو......؟'' اس نے ہانپتے ہوئے اُلٹا سوال داغ ڈالا...... جس پر میرا دماغ بھنا گیا اور میں نے اس کے چہرے پر ایک زوردار گھونسا رسید کر ڈالا۔ اس کے حلق سے اُوغ کی کریہہ ناک آواز خارج ہوگئی۔ وہ ہانپنے لگا۔ میں نے اس بار دوسرا گھونسا اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ وہ وہیں لم لیٹ ہو گیا۔ اس کے بے حس و حرکت جسم کو میں نے کنارے پر ڈال دیا اور اول خیر کے ساتھ اب تقریباً دوڑتا ہوا اس مکان کے پاس آگیا۔ جس کے بارے میں سیٹھ نوید نے مجھے اپنا ساتھی سمجھ کر بتایا تھا اور یقیناً حفظِ ماتقدم کے تحت اسی نے ہی ایک آدمی کو باہر گلی میں کہیں پوشیدہ کھڑے ہونے کا حکم دے رکھا تھا کہ آنے والوں پر نگاہ رکھے اور وہ یہی کر رہا تھا کہ اول خیر کے ہتھے چڑھ گیا۔

ہم دروازے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ وہ ایک دم کھلا اور اس کے اندر سے دو افراد برآمد ہوئے۔ ڈیل ڈول میں یہ دونوں صحت مند تھے مگر قد و قامت میں مجھ سے دبتے ہوئے، ہمیں عین دروازے پر کھڑا دیکھ کر وہ پل کے پل ہونق سے بن گئے، مگر دوسرے ہی لمحے میں دونوں کے ہاتھ بیک وقت بغلوں کی جانب سرکے، شاید انہوں نے بغلی ہولسٹر چڑھا رکھے تھے۔ ایسے میں اول خیر اور میرا بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آنا یقینی امر تھا اور ہم دونوں ہی ان پر قہر بن کر ٹوٹے۔

انہیں رگیدتے ہوئے ہم اندر صحن میں آگئے۔ دروازہ پیچھے کھلا پڑا رہ گیا۔ اندر روشنی تھی۔ صحن پختہ اور زیادہ کشادہ نہ تھا، جبکہ باہر بچھی ایک چارپائی پر مجھے نوید ساںچے والا سگریٹ پیتا ہوا دکھائی دیا جو اس اکھاڑ پچھاڑ میں یک دم چارپائی سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور اندر ایک کمرے کی طرف بھاگا جس کا دروازہ ذرا ہی بھڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنے مدِمقابل کا سر پختہ اینٹوں والے فرش پر بجایا اور اسے بے حرکت پا کر اُٹھ دوڑا۔

نوید ابھی کمرے کے دروازے کو دھکا دے کر اندر داخل ہوا ہی تھا کہ میں اس کے پیچھے، بلکہ سر پہ ملک الموت بنا جا پہنچا۔ تب ہی اندر مجھے ایک چونکا دینے والا منظر دکھائی دیا۔ چارپائی پر عارفہ...... رسن بستہ حالت میں جکڑی لیٹی پڑی تھی۔ اس کی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی اور بال یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے اسے ہذیانی اور ہسٹریائی دورے پڑتے رہے ہوں اور وہ اپنے آپے میں نہ رہی ہو، اس کے منہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی، وہ بولنے سے بھی قاصر تھی، سرِدست نیم بے ہوشی کی حالت میں ہی نظر آتی تھی۔ اس اکھاڑ پچھاڑ میں اسے بھی کچھ ہوش آگیا تھا۔ قریب چارپائی پر ایک گن پڑی تھی، نوید ساںچے والا اسے ہی اُٹھانے کے لیے لپکا تھا کہ میں نے اسے دبوچ کر اس کا سر منجی کے ٹھوس چوبی پائے سے ٹکرا دیا۔ اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ بلند ہوئی اور خون بہہ نکلا۔

کمرے میں ایک ہی بلب روشن تھا اور اسی روشنی میں عارفہ چارپائی میں جکڑبند پڑی پھٹی پھٹی وحشت زدہ آنکھوں سے میری طرف تکے جا رہی تھی اور پھر نجانے اسے کیا ہوا کہ وہ بری طرح تڑپنے لگی، اُچھلنے لگی...... حلق سے اس کے بے معنی سی ''غوں...غاں'' بھی خارج ہونے لگی۔ بے حد قابلِ رحم حالت میں...... مجھے نظر آرہی تھی وہ اس وقت......

اُدھر...... نوید ساںچے والا اپنے پھوٹے ہوئے سر کے ساتھ پھر اپنی گن کی طرف لڑھکنے لگا، مگر میں نے اسے پھر پاؤں کی ٹھوکر رسید کر ڈالی۔ وہ پرے جا لڑکھڑایا اور دیوار سے جا لگا۔ اسی وقت اول خیر ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔ اس کی جب نظر چارپائی پر بندھی عارفہ پر پڑی تو بے اختیار اس کے حلق سے ''او خیر......'' برآمد ہوا تھا۔ اس نے ایک طرف کونے میں دبکے ہوئے زخمی نوید ساںچے والے کو بھی دیکھا۔

''اول خیر! باہر والے نمٹا لیے......؟ یا کوئی باقی ہے ابھی......؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''سب نمٹا لیے...... اب یہ بھی نمٹا دو جلدی تو نکل چلیں......'' وہ بولا۔

''کہیں نہیں جانا ہے۔ تم اِسے کھولو، میں جب تک اسے دیکھتا ہوں......'' میں نے گمبھیر لہجے میں اول خیر سے کہا

اور وہ مجھے کچھ اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا، لیکن میں تب تک نوید کی طرف قدم بڑھا چکا تھا۔ اس کی تلاشی لینے پر وہ کسمسانے لگا۔ میں نے فوراً اس کی جیب سے اس کا سیل فون نکال لیا۔ تب تک اول خیر عارفہ کو جکڑ بندوں سے آزاد کرا چکا تھا۔ اس کا آزاد ہونا تھا کہ اس نے کسی زخمی ناگن کی طرح حلق سے پھنکار جیسی آواز خارج کی، اول خیر کو بڑے زور سے ایک طرف دھکا دیا، وہ بے چارہ بھی منجی کی پائینتی پر ٹکا بیٹھا تھا کہ ایک طرف کو جا لڑھکا۔ اس حملے کے لیے وہ کب تیار تھا یا اُسے کب عارفہ سے ایسی توقع ہو سکتی تھی، اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور دھڑام سے کمرے کے فرش پر آ رہا۔ عارفہ زخمی شیرنی کی طرح چارپائی سے چھلانگ مار کر اُتری اور سیدھی نوید سانجے والا پر آ پڑی۔ اس نے نوید کے چہرے پر اپنے لانبے لانبے ناخنوں سے کھرونچے ڈال دیے۔ وہ درد و اذیت سے پہلے ہی نڈھال تھا۔ عارفہ کے تیز نکیلے ناخنوں نے اس کے مکروہ چہرے پر سرخ لکیریں کھینچ ڈالیں...... اس قدر زور لگا کر اور گویا اپنے اندر کی نفرتوں کو لاوے کی صورت اُگلتے ہوئے...... اس نے طاقت کا بھرپور استعمال اپنے تیز اور نکیلے ناخنوں سے کیا تھا کہ نوید کا چہرہ خون کی چھپڑی بن کر رہ گیا۔

یوں لگتا تھا جیسے اس کے چہرے کا سارا گوشت ہی اُدھیڑ ڈالا ہو۔ مگر عارفہ کا اُبال، طیش اور غضب ناکی پھر بھی کم نہ ہوئی تو اس نے اپنا منہ پھاڑ کر نوید کے گال پر کاٹ ڈالا، اور اس کے چہرے کا گوشت نوچنے لگی دانتوں سے...... اس کی جنونی کیفیات کو دیکھتے ہوئے میں نے عارفہ کو کاندھے سے پکڑ کر نوید سے الگ کیا۔ نوید کی چیخیں اُبل رہی تھیں۔ مگر عارفہ کا جنون، خرد کو کسی آگ کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ میرے زور لگانے پر وہ ہٹی تھی مگر پھر پاگلوں کی طرح غراتی ہوئی نوید پر پل پڑی۔ اس کا منہ خون سے سرخ ہو رہا تھا۔

''مم...... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی ذلیل، کمینے کُتّے! تیری بوٹیاں کھا جاؤں گی میں...... تیری خاطر میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ سب کو بھولا، جھٹلایا چھوڑا مگر تو نے اس کا مجھے کیا صلہ دیا۔ سوائے مجھے اب تک کھلونا بنانے کے...... اور اب میری اور میرے بچوں کی جان بھی لینے کے درپے تھا۔ میں تیری بوٹیاں کھا جاؤں گی۔'' وہ جوشِ جنوں کے مارے پاگل سی ہوئی جا رہی تھی۔ اس بار اس نے نوید کی گردن پر منہ مارا اور اگر میں نے عارفہ کو بالوں سے پکڑ کر بروقت پرے نہ کھینچ لیا ہوتا تو وہ اس کا نرخرہ اُدھیڑ ہی ڈالتی۔

تب ہی میں نے اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی اور وہ ایک طرف فرش پر پڑی ہانپنے لگی۔ ہانپنے کے دوران اس کے حلق سے عجیب سی غراہٹ سے مُشابہ آوازیں بھی خارج ہونے لگی تھیں۔ کہاں تو وہ نوید کو اپنا سب کچھ سمجھے ہوئے تھی۔ اس کی خاطر اس نے اپنے فرشتہ صفت سسر سرمد بابا کی جان لی۔ عابدہ کو اپنے مفاد اور بعد میں نوید کے ہی ایما پر امریکی درندوں کی بھینٹ چڑھایا اور آخر میں اپنے اسی محبوب کی خاطر اپنے دونوں بچوں کو بھی بھلا بیٹھی تھی، لیکن...... جب اسے اپنے محبوب کا اصل اور بھیانک چہرہ نظر آیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ کبھی کبھی محبت میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ محبت ایک طاقت ور...... جذبہ سہی، لیکن اگر یہی محبت نفرت کا لبادہ اُوڑھ لے تو پھر وہ محبت جیسے لازوال جذبے پر بھی حاوی ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ غالباً عارفہ کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

''اِسے سنبھالو اول خیر! میں تب تک کسی سے بات کر لوں......'' میں نے اول خیر سے کہا اور عارفہ کی طرف اشارہ کیا۔

''کس سے بات کرنا چاہتے ہو؟'' اول خیر نے پوچھا۔

''پولیس اسٹیشن!'' میں نے جواب دیا تو نڈھال پڑے نوید سانجے والا کے کان میں بھی یہ لفظ پڑا۔ وہ جیسے تکلیف بھلا کر بمشکل ایک ہاتھ اُٹھا کے مجھے روکنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''ٹھ...... ٹھہرو......! پپ...... پولیس کو مطلع مت کرو، شاید میرا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ میری آج سے دشمنی بھی ختم...... مجھے جانے دو، میں تمہیں منہ مانگی رقم دوں گا۔''

''او...... خیر!'' اس کی بات پر اول خیر کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا جبکہ میرے چہرے پہ ایک زہرخند مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ تب ہی میرے بجائے اول خیر نے، عارفہ کو ایک ہاتھ سے سنبھالتے ہوئے فرش پر بکھرے پڑے نوید سانجے والا سے کہا۔

''اوئے! نودولیتے سیٹھ! تیری یہ دکان داری اپنے شہزی کاکا کے سامنے نہیں چل سکتی۔ شہزی نے اگر یہ کام کرنا ہوتا تو تیری یہ آفر تو ان کے سامنے کوڑیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جو اسے پہلے بھی اس کے مقابلے میں جانے کتنی بڑی بڑی اور بار بار ملتی رہی ہیں۔ یہ اگر پیسوں کے ترازو میں تولا جا سکتا ہوتا تو آج آرام سے کسی محل میں بیٹھا عیش کی زندگی گزار رہا ہوتا۔''

''مم...... میں دس کروڑ دینے کو تیار ہوں......'' سیٹھ

نوید ہکلایا۔

''دس کروڑ جمع دس بھی کر دو تو بھی کم ہیں۔ نوید مردود سیٹھ!'' اول خیر غرایا۔ ''جانتے نہیں ہو تم کہ شہزی کس کا بیٹا ہے؟ جو نہ جھکنا جانتے ہیں نا بکنا۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''کھڑکا دے فون پولیس اسٹیشن۔''

میرے چہرے پہ ہنوز زہرخند مسکراہٹ طاری تھی۔ نوید کا سیل فون میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ ''مجھے اس کی بات سن لینے دو اول خیر......!'' میری بات پر اول خیر کے چہرے پر پہلے تو ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس کے بعد معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

''شش...... شہزی! اس کمینے کی کوئی بات مت سننا! فوراً پولیس کو فون کرو۔ مت آنا اس دغاباز کے جھانسے میں......'' عارفہ فوراً چلا کر بولی تو میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کاٹ دار طنز سے کہا۔

''بہت جلدی آپ کو اس دغاباز کی اصلیت کا پتا چلا ہے میڈم! آپ نے تو اس کے ہاتھوں میں کھیل اور کھلونا بن کر اپنے محسنوں کو بھی دغا دے ڈالا، دیکھ لو اب یہ نہ صرف تمہاری بلکہ تمہارے اُن دونوں معصوم بچوں، دانی اور پنکی کی بھی جان لینے کے درپے تھا۔''

میری بات پر عارفہ کے ستے پڑے چہرے پر ندامت اور شرمندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے بچوں کے ذکر پر فکرمندی سے بولی۔

''پپ...... پنکی اور دانی کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟''

''وہ بالکل محفوظ ہیں۔ شکر کرو کہ میں نے بروقت اس خبیث کی اس آخری سازش کا وہ تار ڈھونڈ لیا جس میں جکڑ کر یہ تم سمیت پنکی اور دانی کو بھی جکڑ ڈالنا چاہتا تھا۔''

اس کے بعد میں نے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے نڈھال سے پڑے سیٹھ نوید کی طرف دیکھا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا کہتے ہو نوید سیٹھ! اس فقیروں والی حالت میں اب تم خود کو کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''تت...... تم جو چاہو گے وہی ہو گا...... لل...... لیکن مجھے پپ...... پولیس کے حوالے مت کرو۔'' وہ گڑگڑایا۔

''تو پھر میری ایک بات کا سچ سچ جواب دو۔'' میں نے کہا۔

''میں تیار ہوں۔''

''لولوش اور وزیر جان کے بارے میں مجھے بتاؤ......''

''لولوش کچھ دنوں پہلے نیویارک میں تھا، اب وہ برمودا کے ایک جزیرے ''نکی تا'' میں اپنے محل میں رہتا ہے جبکہ وزیر جان کو اس نے کچھ عرصہ پہلے اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ اب پاکستان میں ہی کہیں موجود ہے۔'' سیٹھ نوید فرفر بتانے لگا۔ میں نے کہا۔

''تمہارے لولوش کے ساتھ کس بنیاد پر تعلقات استوار ہوئے تھے؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔ اگرچہ مجھے کچھ اندازہ تو تھا مگر اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

''اڑیسہ کمپنی کے حصص کا حصول، تمہاری موجودہ سرگرمیاں اور...... اور وہ طط...... طلسم نور ہیرا، اس سے متعلق ایک ایک رپورٹ اس تک پہنچانے کے لیے میں اس کا جاسوس بنا ہوا تھا۔''

''تو اب تک تم نے اسے کیا رپورٹ دی؟''

''وہی جو میں جانتا تھا۔ تمہاری پاکستان اور ملتان میں انٹری، نوشابہ اور چوہدری ممتاز کے خلاف جوابی پریس کانفرنس اور طلسم نور ہیرے کی حکومت کو حوالگی کے متعلق وہ سب کچھ بتا ڈالا تھا میں نے اسے۔''

''ہمم......'' میرے حلق سے پُرسوچ ہمکاری خارج ہوئی۔

''تمہارا لولوش سے رابطہ کیسے ہوتا ہے؟ فون پر یا اور کوئی ذریعہ ہے؟''

''شہزی! میں سب کچھ جانتی ہوں۔ تمہیں اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔'' عارفہ نے پھر اپنی ٹانگ اڑائی۔ میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور جھڑکا۔

''تم ابھی اپنی زبان بند رکھو۔ جب وقت آئے گا تو میں تم سے بھی پوچھ لوں گا۔'' وہ خاموش ہو گئی۔ وہ بالکل ٹوٹ چکی تھی۔ اسے اب اپنے بچوں کی فکر ہو رہی تھی۔

''ہاں! تم جواب دو میری بات کا......'' میں نے نوید کی طرف گھورا۔

''مجھے میرے بنگلے پر لے چلو...... میں وہاں تمہیں سب سچ سچ بتا دوں گا۔'' وہ بولا۔ اسی وقت اول خیر نے میرے قریب آ کر کان میں سرگوشی کی۔

''اوئے کاکے! اس کے جھانسے میں مت آنا، یہ اس وقت رنگے ہاتھوں ہماری گرفت میں ہے۔ اپنے بنگلے پر جا کر یہ پتھر کی طرح بھاری پڑ جائے گا۔ جو پوچھنا ہے اِدھر ہی پوچھ لے، پر یہ انٹرویو ہن چھیتی نال مکا لے (جلدی ختم کر لے) اس وقت اس کے سارے گماشتے ہمارے قبضے میں ہیں۔''

سیٹھ نوید کی یہ چالاکی تو میں بھی سمجھ گیا تھا۔ ''میرے پاس وقت کم ہے نوید! آخری سوال کا جواب دو......''

وہ اپنے خون آلودہ چہرے کو ہاتھ سے پونچھتا ہوا بولا۔ ''میں اب تمہارے سوالوں کے جواب اپنے بنگلے پر ہی دوں گا۔'' وہ جیسے ایک دم اڑ گیا۔

''اس کے پاس ایک بلیک بیری موبائل ہے اور اسی میں ہی لولوڈش کا پرسنل نمبر سیو ہے۔ وہ اس کی رہائش گاہ میں پڑا ہے۔'' عارفہ نے فوراً جواب دیا۔

''اوکے! تم سب جانتی ہو تو پھر وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔'' میں دانستہ یہ کہتے ہوئے بظاہر نمبر پنچ کرنے لگا۔ مگر میں یہ نوید کو دکھاوے کے لیے کر رہا تھا۔

''تت...... تم یہ نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو! اگر میں گرفتار ہو گیا تو تمہاری عابدہ بھی نہیں بچے گی۔'' اس مردود نے چلّا کر کہا۔ وہ بے بس تھا اور اب میری کمزوری سے کھیلنے لگا تھا۔ عابدہ کے ذکر پر میرے اندر ایک اذیت ناک سا چھناکا ضرور ہوا مگر میں نے بظاہر بے نیازی سے کہا۔

''وہ اس وقت لولوڈش کی قید میں نہیں، کورکوران کی جیل میں ہے۔ عارفہ اب میرے ساتھ ہے اور میں اس کے ذریعے امریکا میں بہ آسانی عابدہ کے حق میں مقدمہ لڑوں گا۔'' میں نے یہ اس کے منہ سے اُگلوانے کے لیے کہا تھا۔ جس کا فوراً خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا، کیونکہ بہت سی باتیں ایسی ہو سکتی تھیں جو نوید نے ظاہر ہے کہ عارفہ سے بھی مخفی رکھی ہوں گی۔

''ہاہا...... ہاہا......'' نوید سانچے والا نے ایک بدمست قہقہہ خارج کیا اور اسی لہجے میں بولا۔ ''بڑی خوش فہمی ہے تمہیں......''

''کیا مطلب......؟'' میں نے سیل فون اپنے چہرے سے ہٹا کر اس کی طرف چونکنے کے انداز میں دیکھا تھا۔ یہ میری اداکاری تھی۔

وہ بولا۔ ''تمہیں شاید نہیں معلوم کہ...... عابدہ کا مقدمہ سی آئی اے کے ایک خطرناک ونگ ''ٹائیگر ٹیگ'' کے سربراہ کے ہاتھ میں ہے۔ باسکل ہولارڈ نام ہے اس کا اور لولوڈش اس کا لاڈلا داماد ہی نہیں بہت سے اہم منصوبوں میں وہ اس کا دستِ راست بھی ہے۔ کورکوران کی جیل میں صرف باسکل ہولارڈ کا حکم چلتا ہے، اس بھیانک جیل کی لیڈی وارڈن مس لیڈی بوسکی ایک خرانٹ بڈھی چڑیل ہے۔ وہ ایک ریٹائرڈ آرمی آفیسر رہ چکی ہے۔ اُسے باسکل ہولارڈ یا لولوڈش جیسا کہیں گے وہ وہی کرے گی۔ تم نے طلسمِ نور ہیرا حکومت

اکتوبر 2017ء کا خوبصورت شمارہ ایک نظر میں

**یکتارا**

آسمان سے ٹوٹے ایک تارے کی روداد جس نے محبت میں خود کو فنا کر ڈالا...... آخری صفحات پر **عبدالرب بھٹی** کے قلم کی پرواز

**شام شب**

**ڈاکٹر ساجد امجد** کے قلم سے تاریخ کے خاموش اور گمشدہ لمحات کا دلفریب احاطہ

**باغی**

ایک نڈر اور بے باک انسان کے کارناموں کا اگلا پڑاؤ...... سازشوں کی گرہیں کھولتی ایک خوبصورت داستان

**وقت**

دھیرے دھیرے گزرنے والے لمحات میں طوفان کی آہٹ...... **حسام بٹ** کے خیالات کی روانی

**اس کے علاوہ**

ثمر عباس۔ محمد یاسر اعوان، محمد فاروق انجم
تنویر ریاض۔ محمد الیاس اور اسما قادری کی خوبصورت کہانیاں

پاکستان کے حوالے کر کے بہت بڑی غلطی کر ڈالی ہے۔ کیونکہ اس ہیرے کے بدلے وہ تم سے عابدہ کی واپسی کا مطالبہ کرنے والے تھے۔ لیکن خیر! طلسم نور ہیرے کا دوبارہ حصول تمہارے لیے کیا مشکل ہے، جسے تم انڈیا کے پُرخطر جنگلاتی اور دلدلی جزیرے سے اُڑا لائے ہو تو پاکستان کیا شے ہے۔"

اس مردود کے منہ سے وطنِ عزیز پاکستان کے بارے میں ایسے الفاظ سن کر میرا دماغ بھک سا اُڑ گیا۔ یہ غدارِ وطن تھا جو اپنے منہ سے اعتراف کر چکا تھا کہ وہ ملکی دشمن عناصر کا ایجنٹ بن چکا تھا۔ میں غیظ وغضب سے بپھر کر آگے بڑھا اور اپنے بوٹ تلے اس کی گردن لے کر اس کا چہرہ دیوار سے ٹکا دیا۔

"خبردار! اگر دوبارہ میرے وطن کے لیے ایسے گندے الفاظ استعمال کیے۔ تم جیسے ضمیر فروش ہی یہاں بیٹھے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ یاد رکھو! میں اپنے وطن پر ہزاروں عابدائیں قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، مگر قومی اور ملکی امانت کبھی بھی دشمنوں کے حوالے نہیں کروں گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ عابدہ بھی کبھی یہ نہیں چاہے گی کہ اس کی رہائی اور واپسی کے بدلے میں اس کے پیارے وطن کی امانت کا سودا ہو۔ وہ اس کے بدلے میں موت کو گلے لگانا پسند کرے گی۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔ میری رگوں میں کس غیور اور سرفروش باپ کا خون گردش کر رہا ہے۔"

آتشِ لہورنگ میں یہ الفاظ اس سے کہنے کے بعد میں نے اس کی گردن سے بوٹ ہٹا لیا۔

"تو پھر بھول جاؤ عابدہ کو......" نوید سانچے والا ہانپتے ہوئے بولا اور اپنی گردن مسلنے لگا۔

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ پہلے میرا ارادہ پولیس اسٹیشن فون کرنے کا تھا مگر اب اس مردود کی باتیں سن کر میں نے وہ بدل دیا اور میجر وسیم بھٹی کے دیے ہوئے ہاٹ لائن نمبر پر میں نے فون کر دیا اور مختصر الفاظ میں انہیں سب بتا ڈالا۔ اس مکان کا اتا پتا دینے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

جب نوید کو یہ پتا چلا کہ میں اسے پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے پاک رینجرز کے ایک خصوصی ونگ کے حوالے کرنے والا ہوں تو اس کی حالت پہلے سے زیادہ غیر نظر آنے لگی، وہ پاگل جنونیوں کی طرح چلّانے اور مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا جس میں عابدہ کا حوالہ بھی شامل تھا۔ میں نے کوئی پروا نہ کی اور اول خیر کو اس کتے کا منہ بند کروانے کے لیے خفیف اشارہ کر دیا۔ اس نے عارفہ کو چھوڑا اور نوید سانچے والا کی دھنائی کر ڈالی۔

اگلے ڈیڑھ سے دو گھنٹوں کے اندر اندر نوید سانچے والا اور اس کے تمام ساتھی راٹھور وغیرہ سمیت اس حساس ادارے کی گرفت میں آچکے تھے۔

اگرچہ اس میں عارفہ کا بھی مشورہ شامل تھا کہ پہلے نوید سانچے والا کے بنگلے پر جا کر وہاں سے اپنا ضروری سامان سمیٹ لیا جائے اور بلیک بیری والا وہ موبائل سیٹ بھی لے لیا جائے جس سے نوید سانچے (اور عارفہ بھی کبھی کبھی اس سے بات کر لیا کرتی تھی) لولوش سے رابطہ کرتا تھا۔ یہ ارادہ میرا بھی تھا لہٰذا ہم نے ایسا ہی کیا۔ سیٹھ نوید کا بنگلا سیل کرنے سے پہلے عارفہ نے اپنے چند کاغذات، سامان اور بلیک بیری کا وہ خاص موبائل سیٹ فون قبضے میں کر لیا تھا۔

اس کے بعد میں اور اول خیر عارفہ کو لیے بیگم ولا پہنچے تو اپنے بچوں کو سلامت دیکھتے ہی عارفہ بے اختیار ان سے لپٹ کر رو پڑی۔

اس کے بعد جب جذبات کا یہ طوفان تھما تو عارفہ میرے قدموں میں گر پڑی، لیکن میں نے اسے بازوؤں سے تھام کر کھڑا کر دیا۔ اس کا چہرہ اشکِ ندامت و شرمندگی کے باعث بری طرح سرخ ہو رہا تھا۔

"میں نے خود کو بہت گرا لیا شہزی! کہ اب تو میں اپنا سر اُٹھا کر کھڑی ہونے کے لائق بھی نہیں رہی...... کاش! میں اپنے ہاتھوں سے خود کو زندہ دفن کر ڈالتی۔ میں تو...... میں تو تم سے معافی مانگنے جیسا منہ بھی نہیں رکھتی۔ تم ایک عظیم انسان ہو، تم ہمیشہ ہی میرے ساتھ میری برائیوں کے بدلے میں بھلائی کرتے رہے، جس کا ثبوت تمہارے پاس موجود میرے یہ دو بچے ہیں۔ میں کیسی احسان فراموش نکلی کہ...... تم نے اپنی محبوب ہستی، اور اپنی محبت تک کو انسانی ہمدردی تلے قربان کر ڈالا اور میں نے کیا کیا۔ اپنے ہی محسنوں کی قبر کھودتی رہی۔ میں کیا کہوں اب شہزی کہ میرے گناہوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ...... اب تم مجھے اللہ کی خاطر معاف کر بھی ڈالو، جس کا مجھے پورا یقین بھی ہے تو تب بھی شاید ہی میرے دل کو...... میری روح کو سکون نہ مل پائے...... میں اب تاعمر ہی اپنے ضمیر کی قبر میں زندہ ہی دفن رہوں گی۔ لیکن...... پھر بھی...... کچھ بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر میں تم سے معافی کی درخواست ضرور کروں گی۔ ہو سکے تو اس بدنصیب اور آنکھوں والی ایک اندھی، ضمیر کی اپاہج اور ملعون عورت کو معاف کر دینا۔"

عارفہ یہ کہہ کر سر جھکائے میرے سامنے کھڑی رہی۔
اس وقت کمرے میں ہم سب ہی موجود تھے۔ زہرہ بانو، کبیل دادا، اول خیر، شکیلہ اور...... پنکی، دانی بھی......
کمرے کی فضا میں ایک جذبات انگیز سی رقت گھلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ سب کی نظریں اب رنجور اور شرمندہ، سر جھکائے کھڑی عارفہ سے ہٹ کر میری طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔

میں نے ایک گہری ہمکاری اپنے حلق سے خارج کی اور بالآخر اپنے سیدھے ہاتھ کے ارتعاش پر قابو پاتے ہوئے عارفہ سے مخاطب ہوا۔

''عارفہ! انسان ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتا ہے اور انسان تو ہے ہی خطا کا پتلا۔ لیکن اصل انسان وہی ہوتا ہے جو ٹھوکر کھا کر نہ صرف سنبھل جائے بلکہ سچی نیت اور دل سے اپنا محاسبہ بھی کر ڈالے تو وہ پھر خطا کار نہیں رہتا۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تم نے بغیر کسی اپنے...... بڑے اور ناقابلِ تلافی نقصان کے خود کو سنبھال لیا۔ آپ آج بھی میرے لیے اس عظیم انسان سرمد بابا کی قابلِ احترام بہو ہیں اور میری بہن بھی۔ معلوم ہے ناں آپ کو کہ سرمد بابا کے ساتھ میرا کیا رشتہ تھا اور یہ بھی پتا ہوگا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی بے حسی کے باوجود آپ کی ایک مصیبت پر...... مدد کرنے کے لیے...... اطفال گھر کے ''اولڈ ہاؤس'' سے آپ کے ہاں چلے آئے تھے۔ چھوڑیں اب اِن باتوں کو...... میں نے آپ کو معاف کیا اور اللہ سے بھی میری دست بستہ دعا ہے کہ وہ بھی معاف فرمائے۔''

میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ دھیرے سے اس کے سر سے ہٹا لیا۔ وہ میرے ان الفاظ پر بری طرح چھلک پڑی اور صوفے پر جا کے گر سی گئی۔ وہ سر جھکائے زار و قطار رو پڑی۔ پنکی اور دانی ''مما'' کہتے ہوئے اس کی جانب بڑھے تھے۔ خود میں اپنی گردن موڑے دو قدم پر رکھی ہوئی ایک کرسی پر گرنے کے انداز میں جا بیٹھا تھا۔ شکیلہ، عارفہ کو سنبھالنے کے لیے بڑھی تھی جبکہ زہرہ بانو میری جانب لپکی اور میرے قریب آ کر اپنا ایک ہاتھ ہولے سے میرے کاندھے پر رکھ کر تھپتھپانے لگی۔ ان کا انداز مجھے حوصلہ دینے کا سا تھا۔ کیونکہ میں خود بھی رنجور تھا۔

ندامتوں اور شرمندگیوں کی زیادتی کے سبب عارفہ سے مزید کچھ نہیں بولا گیا۔

شکیلہ، عارفہ کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اس نے اول خیر کو پانی کا ایک گلاس لانے کا اشارہ کیا تھا۔ جو وہ فوراً ہی قریب رکھے جگ سے بھر لایا تھا۔

کمرے کی مغموم سی فضا کچھ دیر بعد سنبھلی تو پنکی کی آواز اُبھری...... وہ اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی۔

''مما! خدا کا شکر ہے کہ آپ کی جان بچ گئی اور یہ سب کچھ شہزی انکل کی وجہ سے ہی ہوا ہے، وہ لوگ تو میری اور دانی بھائی کی جان کے بھی دشمن بن چکے تھے۔''

اس کی بات پر مجھے... اچانک یاد آیا اور میں نے پنکی کو مخاطب ہو کے کہا۔

''ہاں! پنکی بیٹا! مجھے یاد آیا، تم نے کوچنگ سینٹر میں مجھ سے یہ بات کہی تھی۔ کیا اس بات کی ہمیں تھوڑی تفصیل بتا سکتی ہو کہ تمہیں کیسے ان ساری حقیقتوں کا پتا چلا تھا؟''

سب پنکی کی طرف دیکھنے لگے، عارفہ نے بھی اب اپنا اشکبار سا چہرہ اُٹھا لیا تھا اور اپنی بیٹی کا چہرہ تکنے لگی۔

''مجھے اور دانی بھائی کو...... وہ آدمی سیٹھ نوید شروع سے ہی بالکل بھی پسند نہیں تھا۔'' پنکی بتانے لگی۔

''دودو جان (سرمد بابا) کو تو وہ آدمی زہر لگتا تھا۔ وہ جب بھی گھر آتا ہم دونوں بہن بھائیوں سے فری ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر ہم اسے بالکل بھی لفٹ نہیں کراتے تھے۔ مما ہمیں اس رویے پر ڈانٹتی تھیں۔ مگر ہم نے کوئی پروا نہ کی۔ مما نے جب اس آدمی سے شادی کر لی تو میں اور دانی مما سے ناراض ہو گئے۔ پھر جب وہ دونوں ہنی مون منانے کے لیے بیرونِ ملک جانے لگے مما نے ہمیں یہ بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ کون سے ملک جا رہے ہیں؟ کبھی تھائی لینڈ کہتے تو کبھی ہانگ کانگ...... خیر ہمیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ غصہ تو ہمیں اس وقت مما پر اور زیادہ آیا جب انہوں نے بتایا کہ وہ ہماری حفاظت کے لیے راٹھور انکل کو چھوڑے جا رہی ہیں۔ ہم نے کوئی توجہ نہ دی، پھر مما اپنے شوہر نوید کے ساتھ چلی گئیں۔

''ہمیں تو راٹھور جیسے آدمی کو دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ اس کے ہمراہ اسی قبیل کے آدمی بھی تھے۔ چار پانچ ہی تھے وہ۔ وہ سب مجھے بدمعاش نظر آ رہے تھے۔ ہماری ان سے روز تُو تُو میں میں ہونے لگی۔ ہم نے بھی ان کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ انہوں نے حفاظت کے نام پر ہمیں قیدی بنا کر رکھ دیا تھا۔ کہیں آنے جانے نہیں دیتے تھے۔ جانا ہوتا تو ان کا کوئی آدمی ساتھ ہوتا۔ دانی کو ان پر جلدی غصہ آ جاتا تھا۔ ایک دن اس نے راٹھور اور اس کے کسی آدمی کے ساتھ بدتمیزی کر ڈالی۔ انہوں نے اسے مارا تو مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا مما سے میری بات کرواؤ...... انہوں نے انکار کر دیا

اور مجھے بند کر دیا۔ تب ہی میں نے ان کے دو ساتھیوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا تھا، وہ کہہ رہے تھے کہ نجانے کب ان دونوں شیطانوں سے نجات ملے گی۔ تو دوسرے ساتھی نے کہا۔

”بہت جلد، سیٹھ صاحب اپنی نئی نویلی بیوی کو ٹھکانے لگانے ہی والا ہے۔ اس کے بعد ان دونوں شیطانوں کی (ہماری) باری آئے گی۔“

”میں بس ان کی اتنی ہی بات سن سکی تھی اور میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ مجھے ددو جان کی بات یاد آ گئی تھی جب انہوں نے مما سے ناراض ہو کے یہ نصیحت کی تھی کہ نوید تمہیں کسی دن بہت بڑا نقصان پہنچائے گا جس کی تلافی بھی ممکن نہ ہو گی، وہ ایک سازشی ذہن کا کمینہ اور عیار انسان ہے۔

”مجھے مما کی فکر ہونے لگی۔ سمجھ گئی تھی میں کہ نوید سانچے والا مما کو ہنی مون کے لیے کسی خاص مقصد کے لیے ہی لے کر گیا ہے۔۔۔۔ دانی کو حقیقت تو نہیں بتائی تھی، ایک تو اس وجہ سے کہ کہیں یہ خوف زدہ ہو کر کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے دوسرے یہ غصے اور جوش کا تیکھا ہے، کہیں بول ہی نہ دے ان کے سامنے کہ وہ ہمارے خلاف کیا سازش تیار کر رہے ہیں۔

پنکی نے اتنا بتا کر تھوڑا توقف کیا اس کے بعد مزید بتانے لگی۔

”میں نے اکثر مما اور نوید سانچے والا کو ددو جان کی وصیت کے بارے میں بھی باتیں کرتے سنا تھا۔ ان کی باتوں سے مجھے بھی اس وصیت کا علم ہو چکا تھا۔ مجھے مما اور نوید کی شادی پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ اگر نوید سانچے والا کو مما کی دولت سے کوئی غرض نہ تھی تو پھر کیوں وہ شادی کرنا چاہ رہا تھا۔ اس چالاک انسان نے مما سے یہی کہا تھا کہ اُسے ان کی دولت کی کوئی پروا نہیں ہے، وہ اب مما کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یوں مما ان پر زیادہ بھروسا کرنے لگیں اور دونوں کی شادی ہو گئی۔

وصیت کے مطابق مما کا پاپا (محمود، عارفہ کا سابقہ مرحوم شوہر) کی دولت و جائداد، جو درحقیقت ددو جان ہی کی کمائی ہوئی تھی، جس پر مما کا تصرف ختم ہو گیا، مگر بعد میں مجھے ان کی باتیں سن کر پتا چلا کہ نوید سانچے والا۔۔۔۔ شادی سے پہلے ہی مما سے پاور آف اٹارنی حاصل کر چکا تھا۔ مما اب نوید سانچے والا کے لیے ایک بے کار شے ہو چکی تھیں۔ مگر ان کا دل رکھنے اور اپنی چال کو بغیر کسی ٹکراؤ کے آگے بڑھانے کے لیے مما سے شادی رچائی تھی۔ اب نوید سانچے والا کے لیے ہم دونوں اہم تھے۔

اب اسی سلسلے میں راٹھور اور نوید سانچے والا کی آپس میں ٹیلی فون پر باتیں ہونے لگیں۔ تب ہی مجھ پر ایک اور بات کا بھی انکشاف ہوا کہ۔۔۔۔ نوید سانچے والا مما کو ہنی مون کے بہانے کسی اور ملک نہیں گیا بلکہ وہ اسی شہر میں موجود ہے۔ وہ مما کو یرغمال بنائے ہوئے ہے اور اب بہت جلد وہ ہم سے ساری دولت اپنے نام منتقل کروانا چاہتا تھا، بات نہ ماننے کی صورت میں وہ ہمیں مما کو جان سے مارنے کی دھمکی دیتا۔ اسی دن سے میں نے فرار ہونے کا منصوبہ بنا لیا، یہ اس سے اگلے دن کا ہی ذکر تھا جب شہزی انکل سے میری ملاقات ہو گئی۔“

پنکی اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔ ہم سب دم بہ خود اس کی بات سنتے چلے گئے۔ پنکی نے اپنی بات ختم کی تو عارفہ ایک بار پھر سسک اُٹھی۔ اس نے بے اختیار پنکی اور دانی کو ممتا بھرے انداز میں خود سے لگا لیا اور رُندھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میرے بچو! تم بھی مجھے معاف کر دینا۔ میں واقعی اپنی بے لگام خواہشات کے آگے تمہیں بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔ اُس مردود انسان نوید نے مجھے اپنا غلام بنا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے خلاف میں کچھ سننا ہی گوارا نہیں کرتی تھی جو میری بہت بڑی غلطی تھی۔“

”مما! آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ پنکی نے ماں سے کہا۔ ”آپ بس ہمارے ساتھ رہیں اور خوش رہیں۔ شہزی انکل کا یہ احسان تو ہم ساری زندگی نہیں بھول سکتے۔“ اس کی بات پر میں نے پنکی سے شفقت بھرے انداز میں کہا۔

”بیٹا! اس میں احسان کی کیا بات ہے، کیا تم اور دانی نہیں جانتے کہ میرا تمہارے ددو کے ساتھ کیا رشتہ تھا! اُنہوں نے مجھے اپنا منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا۔“

کچھ لمحات بوجھل سی خاموشی تلے بیت گئے۔ اس کے بعد عارفہ نے بھی اب تک کے اپنے پیش گزار حالات کے بارے میں کم و بیش وہی کچھ بتایا جو پنکی نے جرأت اور ہمت سے معلوم کیا تھا۔ تاہم عارفہ کے مطابق نوید نے اس سے اپنی چکنی چپڑی باتوں کے ذریعے پاور آف اٹارنی اپنے نام کروایا تھا اور ایسا اس نے کسی وکیل سے۔۔۔۔ مشورہ کر کے کیا تھا۔

تھوڑی دیر اور بیت چلی تو۔۔۔۔ زہرہ نے شکیلہ کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ عارفہ اور پنکی، دانی کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے بعد زہرہ بانو نے ہولے سے

مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شہزی! یہ تم نے اچھا کیا کہ عارفہ کو معاف کر دیا۔ یہ تمہارا بڑا پن ہے، لیکن شہزی! معافی تلافی کے علاوہ بھی عارفہ پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ کیا اب بھی اس کی گواہی عابدہ کے حق میں بہتر ہو سکتی ہے؟''

زہرہ بانو کی بات پر میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا اور پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''اب وہ وقت گزر چکا۔ عارفہ کی گواہی کی اب کوئی حیثیت نہیں رہی ہے۔ عابدہ کو سزا ہو چکی ہے۔ وہ تمام حقائق اور گواہیاں جو عابدہ کو بچا سکتی تھیں وہ سب پسِ پردہ ہو چکیں۔ اب صرف ایک بڑی جنگ کے ذریعے ہی عابدہ کو رہائی دلائی جا سکتی ہے۔''

''میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ عارفہ اب راہِ راست پر آ چکی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ عابدہ کے سلسلے میں اس سے کیا مدد لی جا سکتی ہے؟'' زہرہ بانو نے کہا۔

''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''میرا خیال ہے وہ کوئی خاص فائدہ نہیں دے سکتی اس سلسلے میں...... ماسوائے نوید سانچے والا اور لولوش سے متعلق چند باتوں اور رازوں کے۔''

اس دوران کبیل دادا نے شاید زہرہ بانو کے کچھ بولنے کا لمحہ بھر انتظار کیا تھا، اس کی خاموشی پر وہ ذرا کھنکھار کر بولا...... ''پہلی بات تو یہ کہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے، سیٹھ نوید بھی بالواسطہ سہی، اسپیکٹرم کا ہی ایک ایجنٹ تھا۔ بالکل ہولارڈ سے نہیں تو اس کے کم از کم اسپیکٹرم کے سربراہ لولوش سے تو ضرور رابطے تھے۔ پھر اس کا وہ خصوصی موبائل سیٹ بھی ہمارے ہاتھ لگ چکا ہے۔ جس سے وہ لولوش سے رابطے میں رہا ہے۔ لیکن بات وہی ہے۔ جو کرنا ہوگا ہمیں اپنی صوابدید پر کرنا ہوگا۔ سیٹھ نوید اب کام کا نہیں رہا۔ اس کا باب سمجھو یہاں ختم ہوا۔ خود لولوش کے لیے بھی وہ اب اتنی اہمیت کا حامل نہ رہا ہوگا۔ رہی عارفہ اور اس کے دونوں بچوں کی بات تو وہ اب آزاد ہیں اور یہ اچھی بات ہے کہ عارفہ کو ٹھوکر کھانے کے بعد ہی سہی، عقل آ گئی۔ باقی عابدہ بہن کی رہائی کا پلان وہی رہے گا جو بنایا جا چکا ہے۔'' کبیل دادا اپنی بات کہہ کر خاموش ہو رہا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہ تھا کہ کبیل دادا وہ واحد آدمی تھا جو بغیر کسی مبالغہ آرائی اور قیاس آرائی کے ٹھوس بنیادی دلیل کے ساتھ بات کرنے کا عادی تھا ورنہ خاموش رہتا تھا۔ ہم پھر بھی کچھ اندازوں اور پیش آمدہ حالات پر قیاس آرائیاں قائم کرتے تھے، مگر کبیل دادا ایسا ہرگز نہیں کرتا تھا۔ مجھے اس کی بات درست محسوس ہوئی تھی اور کسی حد تک زہرہ بانو بھی اس پر صاد ہی نظر آتی تھی۔

ہم تھوڑی دیر مزید گفتگو کے بعد عارفہ اور اس کے دونوں بچوں کی گھر روانگی سے متعلق پلان کرنے لگے۔

دو دن، تینوں ماں، بیٹا اور بیٹی بیگم ولا میں ہی رہے تھے۔ اس کے بعد میں اور اول خیر شکیلہ سمیت انہیں ان کی رہائش گاہ پر چھوڑ کر واپس ہو لیے۔

عارفہ نے کورٹ میں سیٹھ نوید سے خلع کی درخواست دے دی تھی، جبکہ اس پر مقدمہ اس کی گرفتاری کے فوراً بعد ہی دائر کر چکی تھی جس میں دھوکا، فراڈ، جعل سازی سے لے کر اس کے بچوں کا اغوا اور خود اس کے اپنے ارادۂ قتل وغیرہ شامل تھا۔

ہم تینوں بیگم ولا پہنچے تو زہرہ بانو بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی بولی۔ ''شہزی! وہ...... نوشابہ کا فون آیا تھا......''

''کیا......؟'' میں بری طرح چونکا۔

''او...... خیر!'' اول خیر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کیا کہہ رہی تھی وہ......؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھ سے زیادہ بات نہیں کی اس نے......'' زہرہ بانو بولی۔ ''کہہ رہی تھی۔ شہزاد احمد خان سے بات کرنی ہے، تمہارا سیل فون مانگ رہی تھی جو کہ ظاہر ہے، نہیں تھا۔''

''تم نے پوچھا نہیں کہ وہ کس سلسلے میں مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے؟'' شہزی نے کہا۔

''پوچھا تھا۔ اس نے نہیں بتایا، ویسے بھی اس کی آواز سن کر میرا اپنا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ میرا دل تو چاہا تھا کہ اسے کھری کھری سنا دوں مگر بڑی مشکل سے میں نے اپنے غصے پر قابو پایا۔''

''اچھا کیا تم نے اس سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔''

''وہ دوبارہ فون کرے گی۔'' زہرہ نے آخر میں بتایا۔

''لیکن سمجھ نہیں آ رہا...... اس نے فون کیوں کیا اور وہ بھی تم سے بات کرنے کے لیے......؟''

''کوئی گیدڑ بھبکی دینا ہوگی اور کس لیے کیا ہوگا؟'' اول خیر نے کہا۔

''یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دھونس جمانا چاہتی ہو......'' شکیلہ نے بھی لقمہ دیا تو اول خیر جیسے اسی کے بولنے کا منتظر تھا۔

اس کی طرف دیکھ کر بظاہر سنجیدگی سے بولا۔
''مثلاً......؟''
شکیلہ کچھ گڑبڑا سی گئی پھر اُلجھ کر بولی۔ ''مثلاً کیا مطلب؟''
''کس قسم کی دھونس......؟''
''دھونس کس قسم کی ہوسکتی ہے؟ کوئی دھمکی شمکی ہی ہو گی۔''
''دھمکی تو سمجھ میں آتی ہے، یہ شمکی کیا ہے؟''
''یہ دھمکی کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ جیسے لیکن ویکن...... اور......''
''شکیلہ، وکیلہ۔'' اول خیر نے اس کا جملہ اُچک لیا۔ وہ اُسے گھور کے بولی۔
''نام کے ساتھ اس طرح کے لاحقے وسابقے نہیں آتے...... اب ہم اول خیر کو خیر وشر کہہ دیں...... جو تم اب اس سنجیدہ محفل میں پھیلانے لگے ہو، تو یہ لفظ بالکل بھی نہیں جچے گا، بجز اس کے کہ ہم خیر اور شر کو الگ الگ معنوں میں دیکھیں......''
میں، زہرہ بانو اور کبیل دادا ان دونوں کے ''پیچ'' پڑتے دیکھ کر مسکرانے لگے۔
شکیلہ نے اپنی طرف سے اول خیر پر بڑی بھاری چوٹ ماردی تھی اور وہ اب اپنی بغلیں جھانک رہا تھا مگر دوسرے ہی لمحے بولا۔
''اچھاجی! آپ تو خاصی اُردو داں ہوگئی ہیں...... نازکی بیگم!''
''اس میں اردودانی والی کیابات ہے، کم از کم اتنی اردو تو ہر عام و خاص کو آتی ہی ہے۔ شہ مات ملتے ہی دکھانے لگے اپنی اوقات......؟ کتنی بار تم سے کہا میں نے کہ میرا نام مت بگاڑا کرو...... بلکہ کسی کا بھی نہیں بگاڑنا چاہیے، یہ گناہ ہے۔'' وہ اسے گھور کے بولی۔
''ان دونوں کا جلد ہی بندوبست کردینا چاہیے، ورنہ ان کی لڑائی کسی دن بیگم ولا کے پُرسکون ماحول میں مہابھارت چھیڑ دے گی۔'' معاً کبیل دادا نے معنی خیز لہجے میں کہا تو اول خیر نے مجھے آنکھ مار کے کبیل دادا سے کہا۔
''وڈے استاد جی! اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ تُسی بھی ہُن پالے لگ ہی جاؤ......'' اس کی بات پر میں نے دیکھا کبیل دادا کچھ گھبرا سا گیا اور چہرے سے یوں ظاہر ہونے لگا جیسے وہ اول خیر کو چھیڑ کر پچھتایا ہو، جبکہ میں نے زہرہ بانو کی طرف دُزدیدہ نظروں سے دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔
کبیل دادا کی یہ بھول تھی کہ زہرہ بانو کو اس کے دل کا حال معلوم نہیں جبکہ یہ میں جانتا تھا کہ زہرہ بانو کو کبیل دادا کا حالِ دل بھی معلوم تھا اور بہت کچھ بھی۔ اسی سبب زہرہ بانو کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی تھی۔ زہرہ بانو کے چہرے پر حیا کی لالی دیکھتے ہی میں نے فوراً اول خیر کی ہاں میں ہاں ملادی۔
''واہ، اول خیر! کبھی کبھی مذاق میں تم بڑے کام کی بات کہہ جاتے ہو...... سہرا سجانے کے معاملے میں تم اور کبیل دادا دونوں ہی خوش نصیب ہو۔''
''او خیر...... کاکے! وہ کس طرح......؟'' اول خیر نے اپنے مخصوص لہجے میں میری طرف دیکھ کر گویا جان بوجھ کر وضاحت طلب انداز میں کہا تو میں بھی جیسے موقع محل پاتے ہی یک دم بولا۔
''اس لیے کہ تم دونوں کے رشتے بیگم ولا کی اس چھت کے نیچے موجود ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے دانستہ معنی خیز انداز میں پہلے شکیلہ اور پھر آخر میں زہرہ بانو پر اپنی نظریں جمادیں۔
کبیل دادا کسی بچے کی طرح خوف زدہ سا نظر آنے لگا۔ میں نے بھی آج اس کے اندر کا برسوں پرانا خوف نکالنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ اول خیر کو میں نے ''شہ'' دینے کے لیے آنکھ ماری تو وہ بولا۔
''او خیر......! یہ ہوئی نا بات...... اب تو مقابلہ جچے ہی جچے...... عرصہ ہوا بیگم ولا میں ڈھول تاشے اور گج وج ہوئے۔'' پھر وہ حواس باختہ سے کھڑے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر مصنوعی حیرانی سے بولا۔ ''ارے وڈے استاد جی! یہ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بجنے لگے؟''
''میں ذرا آرام کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں جارہا ہوں۔'' کبیل دادا نے جب دیکھا کہ میں اور اول خیر اس کے درپے ہونے لگے ہیں تو اس نے وہاں سے کھسکنا چاہا مگر میں نے اس بار سنجیدگی سے اُسے پکارا۔
''کبیل دادا......!'' وہ میری آواز پر چونکا اور میری جانب تکنے لگا۔
''بہت آرام کرلیا تم نے...... اور بہت یک طرفہ عذاب سہہ لیا......'' میری آواز گمبھیر ہوتی چلی گئی۔ کمرے کی فضا جو کچھ دیر پہلے اول خیر اور شکیلہ کی نوک جھونک کی وجہ سے چلبلی سی ہورہی تھی، وہ اب ایک گمبھیر تا ماحول میں بدل گئی۔ کبیل دادا کا بھاری کھردرا چہرہ ایک زبردست ارتعاش

تلے نظر آنے لگا جبکہ زہرہ بانو حیرت سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ حتیٰ کہ شکیلہ اور اول خیر بھی یک ٹک میرا چہرہ تکنے لگے۔

''ہاں! کبیل دادا! محبت کی ہے تو خم ٹھونک کر اس کا اظہار بھی کرو ورنہ محبت کرو ہی مت...... اس بھول میں مت رہنا کہ تمہارے حالِ دل سے صرف ہم ہی واقف ہیں بلکہ جسے تم اپنے دل کی عمیق گہرائیوں سے چاہتے ہو، وہ بھی تمہارے اس مخفی جذبۂ دل سے واقف ہے۔''

میں نے جیسے اپنے تئیں ایک انکشاف کیا۔ کبیل دادا کی حالت دیدنی ہورہی تھی۔ اس نے ایک نظر بڑی ہمت کر کے اور ڈرتے ڈرتے قریب کھڑی زہرہ بانو پر ڈالی، جو خود میری جانب ایک نگاہ دیکھنے کے بعد اب کبیل دادا کی طرف دیکھ رہی تھی، یہی وہ لمحہ تھا جب زہرہ اور کبیل دادا کی نظریں چار ہوئی تھیں۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں کبیل دادا نے اپنی نظریں ہٹالیں۔ وہ اس سے لگتا ہی نہیں تھا کہ اپنی حیثیت میں باوقار، سنجیدہ مزاج اور دبنگ کبیل دادا ہے۔ اس وقت انجانے سے خوف تلے مرجھا کے رہ گیا تھا۔ بڑی عجیب بات تھی... کہ زہرہ بانو کی نگاہیں ہنوز کبیل دادا پر ہی جمی رہ گئی تھیں۔ شرم وحیا کی وہ لالی جیسے پل کے پل بدل کے پرکھنے والی نظر میں اُتر آئی تھی۔ ایسے میں کئی رنگ اس زہرہ نگار کے رخِ مہتاب پر چمکے تھے، جو ریشمی ڈوروں میں اُلجھے ہوئے بھی اور یادِ رفتگاں کی اَن گنت گتھیوں میں لپٹے ہوئے بھی۔ ان میں کشش و پیچ کا عذاب بھی تھا اور رنج والم کا تضاد بھی۔ کچھ رنگ پھیکے تھے اور کچھ اُجلے، مگر اُجلے رنگوں میں بے نام سی بے رونقی بھی تھی تو خوش آئند آرزوؤں کی دھنک بھی......

لمحاتی خاموشی کے بعد میں نے کبیل دادا کی کیفیاتِ دروں و بروں کو معمول پر لانے کی غرض سے اس بار براہِ راست زہرہ بانو سے مخاطب ہو کے کہا۔

''زہرہ......! ہم نے اب تک کئی محاذوں پر ایک ساتھ شامل رہتے ہوئے دشمنوں سے جنگیں لڑی ہیں اور لڑ رہے ہیں۔ ہم اچھی طرح ایک دوسرے کو جان چکے ہیں۔ ہمیں اپنے کردار و اوصاف کے سلسلے میں ایک دوسرے کو تمہید دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم میں سے کسی کی بھی سچائی اور وفاداری کا پیمانہ اب کسی بھی قسم کی کسوٹی پر پرکھنے کا محتاج نہیں رہا ہے۔ اب تو بس آنکھیں بند کر کے اپنے جس ساتھی پر بھی اُنگلی رکھو ایک ہی جواب ملے گا یعنی وفاداری اور جاں نثاری۔ زہرہ! زندگی کی یہ بھاگ دوڑ اور نفسانفسی اپنی جگہ لیکن...... انسان کو راہ میں کچھ ایسے فیصلے کرنے ہی پڑتے

## دشمنِ جاں

وہ قبر سے لپٹا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ''ہائے سرور! تم کیوں مر گئے...... ابھی تمہاری عمر ہی کیا تھی...... میری دنیا لٹ گئی...... میں برباد ہوگیا...... ہائے ہائے، کاش تم نہ مرتے......!''

وہاں سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو اس کی حالتِ زار پر ترس آگیا۔ رک کر اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''صبر کرو بھائی...... ایک دن ہر ایک کو مرنا ہے...... حوصلے سے کام لو...... مرنے والا کون تھا تمہارا؟''

''میرا تو یہ دشمن نکلا'' وہ روتے ہوئے بولا۔ ''مشکل سے اس کی قبر تلاش کی ہے...... یہ میری بیوی کا پہلا شوہر تھا۔ یہ نہ مرتا تو میری زندگی برباد نہ ہوتی...... ہائے، سرور! تم کیوں مر گئے؟''

واہ کینٹ سے عمر دراز کا واویلا

ہیں جو بے حد ضروری ہوتے ہیں...... ان کے بغیر زندگی کی تھکن زیادہ محسوس ہونے لگتی ہے...... اگر سچی محبت کرنے والے ایک ساتھی کا ساتھ ہو تو یہ سفر بہ آسانی کٹ جاتا ہے۔ پہاڑ سا سفر آسانی سے کٹ جاتا ہے، گوناگوں حالات کی کشتی اسی بادبان کے سہارے ہی تو طوفانوں کا مقابلہ کرتی ہے۔''
اتنا کہہ کر میں نے ذرا لمحے توقف کیا پھر بولا۔

''زہرہ! کبیل دادا ایک نیک شریف اور بہت وفادار انسان ہے، یہ جتنا دبنگ ہے، اندر سے اتنا ہی معصوم فطرت بھی۔ فیصلہ تمہارا ذاتی ہے مگر اس میں ہم سب کی خوشی ہے کہ...... اگر تم کبیل دادا کو اپنی زندگی کا ہم سفر اور ساتھی کے طور پر چن لو......''

وقت جیسے ایک دم تھم گیا۔ گھڑی کی سوئیاں رک گئیں۔ سانسوں کی بازگشت جیسے بہ زبان یک خاموشی چیخنے لگیں۔ کبیل دادا کا وہ راز جو اَب تک اس کے دل میں تھا آج میں نے وہ کبیل دادا کی موجودگی میں ہی زہرہ بانو کے سامنے طشت ازبام کر دیا تھا۔ آج میں نے کبیل دادا کا وہ خوف جڑ سے کاٹ پھینکا تھا جو کسی حسین ''آسیب'' کی طرح اس کے اعصاب پر سوار رہتا تھا۔ حسین اس لیے کہ وہ اس کی سرمستی میں آپوں آپ ہی مگن رہنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ اس کے عذاب میں وہ خود ہی خود ایک عجیب سی لذت محسوس کر

"اس وقت جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو...... وقت نہیں ہے میرے پاس...... جلدی۔" میں نے اس بار غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ دونوں نے میرا حکم بجالانے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کی۔

میں اور اول خیر جب جلدی سے واپس کوٹھی کی طرف جانے لگے تو پنکی نے مجھے آواز دی۔

"شہزی انکل! مما کے لیے کچھ کیجیے گا پلیز......! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ان کی جان سخت خطرے میں ہے۔"

میں نے پنکی کو اس سلسلے میں تسلی دی۔ دونوں کو شکیلہ کے ساتھ روانہ کرتے ہی میں نے اول خیر کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ عارفہ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ گیٹ بند کیا اور اندر آگیا۔ اول خیر حیران پریشان اِدھر اُدھر پڑے راٹھور کے گرگوں کو تکتے جارہا تھا اور اس کے حلق سے "او خیر......" برآمد ہوا...... اول خیر سے ان سب کو رسی سے جکڑ کر باتھ روموں میں پھینکنے کا کہا اور خود ایک طرف کو لپکا۔

مجھے راٹھور کی تلاش تھی، جلد ہی وہ مجھے ایک کمرے میں کسی سے فون پر باتیں کرتا ہوا نظر آگیا۔ اس کی ناک پر بھدے انداز میں پٹی بندھی ہوئی نظر آرہی تھی جو اس نے خود ہی واش روم میں جاکر کی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے ریسیور پھینک کر بھاگنا چاہا مگر میں نے ایک ہی جست میں اس کے سر پر پہنچ کر اسے دبوچ لیا اور اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ بے حس و حرکت ہوگیا۔

میں نے اسے وہیں ایک بیڈ پر ڈال دیا اور اسٹینڈ پر رکھے ٹیلی فون کے نفیس سیٹ کے کریڈل سے جھولتے ہوئے ریسیور کو تھاما اور اپنے کان سے لگالیا۔

"ہیلو، ہیلو...... راٹھور! کیا ہوا......؟ تم اچانک کہاں چلے گئے......؟"

دوسری طرف سے چیختی ہوئی آواز اُبھری۔ میں یہ آواز پہچان کر چونکا۔ یہ نوید سانچے والا تھا۔ کھٹک مجھے اس بات کی ہوئی تھی کہ اس کی وائس ٹون ایسی نہیں تھی جیسی عموماً بیرونِ ممالک کسی سے بات کرتے وقت ہوتی ہے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ نوید ملک کے اندر ہی تھا۔ میں نے فوراً سی ایل آئی میں نمبر دیکھا اور چونک پڑا۔ ایریا اور کوڈ نمبر ملتان کا ہی تھا۔ میں نے فوراً بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"جج...... جناب! کوٹھی پر کسی نے حملہ...... کردیا ہے، اور راٹھور صاحب اس کا شکار...... آہ......" میں نے جان بوجھ کر اپنے حلق سے کراہ خارج کی' ریسیور چھوڑا اور تھوڑی زوردار آواز میں اُٹھا خ پٹاخ کی، پھر چلاّ چلاّ کر...... "پکڑو شہزی کو جانے نہ پائے، دوڑو ستار اُس کے پیچھے...... وہ مجھے زخمی کرگیا ہے۔" یہ زور زور سے بولنے کے بعد میں نے پھر ریسیور تھاما اور دانستہ گھٹی گھٹی اور دبی ہوئی آواز میں نوید سانچے والا سے مخاطب ہوا۔

"جج...... جناب! ہیلو، آ...... آپ لائن پر ہیں......؟"

"ہاں...... ہاں...... میں لائن پر ہی ہوں، بولو......؟ کیا ہوا؟ کس نے حملہ کیا ہے کوٹھی پہ؟ کیا شہزی اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے حملہ......؟ راٹھور کیسا ہے؟ اور تم کون ہو......؟"

"بس...... سر! راٹھور صاحب زخمی ہوکر بے ہوش ہو چکے ہیں، باقیوں کا بھی تقریباً یہی حال ہے، میڈم کا کچھ پتا نہیں ہے، مگر دونوں بچے میرے قبضے میں ہیں۔ میں انہیں لے کر ایک اسٹور میں چھپا بیٹھا ہوں۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا......" حسبِ توقع دوسری جانب سے نوید سانچے والا کی جوشیلی آواز اُبھری...... "یہی دونوں بچے ہمارے کام کے ہیں۔ تم ایک بہت بڑے انعام کے مستحق ہو...... میں تمہیں ایک جگہ کا پتا بتا رہا ہوں، لیکن...... تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم ہو کون؟"

اپنی بروقت چال پر میرا دل مسرت سے دھڑک اُٹھا تھا مگر اس کم بخت کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً جواب بناتے ہوئے اس سے کہا۔

"کمال ہے سیٹھ صاحب! آپ مجھے نہیں پہچان رہے ہیں، ہم یہاں آپ کی خاطر اپنی جانیں داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں کہ دشمنوں سے مار کھا کے ہمارا حال بُرا ہوگیا ہے۔ میں ستار کا ساتھی گارڈ ہوں اور راٹھور صاحب کا آدمی فرید ہوں۔"

"او...... اچھا...... اچھا مجھے یاد نہیں رہا ہوگا۔" وہ جلدی سے خفیف ہوکے بولا۔ "پتا نوٹ کرو......"

اس نے مجھے اس جگہ کا پتا بتادیا جو میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا۔

میں نے ایک قریب دھری میز کو اپنی ایک ٹانگ سے اُلجھا کر زور سے پٹخا کہ اس کی آواز فون پر موجود نوید بھی سن لے، اس آواز کے ساتھ ہی میں بھی زور سے چلاّیا تھا۔

"کیا ہوا......؟ کیا ہوا......؟" دوسری طرف سے اس نے گھبرا کر پوچھا تھا مگر میں اپنا کام کرچکا تھا اور ریسیور کریڈل پر رکھ کے اس کا تار کاٹ دیا۔

اس کے بعد میں پلٹا۔ اول خیر تب تک سب کو رسیوں سے جکڑ کے اور انہیں ایک کمرے میں مقید کرکے میرے پاس آیا تو میں نے اسے اپنا منصوبہ بتایا۔

''وہ رذیل آدمی ضرور وہاں موجود ہوگا اور اس نے یقیناً عارفہ کو بھی یرغمال بنا رکھا ہوگا۔''

''او...... خیر کا بچہ! یہ تو تُو نے بڑا پالا مارا...... چل جلدی نکل چلیں...... پر یار! گاڑی......''

''گاڑیاں پورچ میں کھڑی ہیں...... آجاؤ......'' میں نے کہا۔

''او خیر......'' وہ ہولے سے بولا۔

ہم باہر پورچ میں آگئے۔ گاڑی کی چابی تلاشنے کا ہمارے پاس وقت نہ تھا، یوں بھی بغیر چابی کے گاڑی اسٹارٹ کرنا میرا ہی نہیں اول خیر کے بھی بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہماری گاڑی جو درحقیقت وہی سیاہ ہنڈا اسٹی تھی، جو راٹھور کی ملکیت تھی۔ اسی کو دوڑانے لگا۔ اسٹیئرنگ پر میں ہی بیٹھا تھا اور اول خیر میری برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

میرے کانوں میں پنکی کے بار بار وہ ہراساں الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے دو بار مجھ سے کہے تھے یعنی ان کی ماں (عارفہ) کی جان خطرے میں تھی اور اس کی جان کو کس سے خطرہ ہوسکتا تھا۔ مجھ سے اور سرمد بابا سے زیادہ بہتر اور کون جان سکتا تھا۔ وہ تو دنیا میں نہیں رہے تھے اور وہی سب سے اچھی طرح اس مردود سیٹھ نوید سانچے والا کی اصلیت اور اس کے گھناؤنے مقصد سے آگاہ تھے۔ میں بھی انہی خطوط پر نوید سانچے والا کا بھیانک چہرہ پہچانے ہوئے تھا۔ عارفہ سے اس کی شادی میری توقع کے خلاف تو نہ تھی مگر سرمد بابا کی وصیت کے باوجود اس کی عارفہ سے اس قدر جلد شادی میں مجھے کسی گہری سازش کی ہی بُو آرہی تھی۔

موجودہ حالات کی کشاکشی میں مجھے جو کام فرصتِ اولین میں انجام دینا تھا، وہ میں کررہا تھا۔

سیٹھ سانچے والا زیادہ دیر تک میری چال کے جال میں پھنسا نہیں رہ سکتا تھا اسی لیے یہ کام جلد از جلد نمٹانے کا متقاضی تھا۔ اس نے اپنے جس ٹھکانے کا پتا بتایا تھا، وہ نواں چوک کے ایک مکان کا تھا۔ وہ اسٹریٹ اور مکان نمبر میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر میں طوفانی رفتار سے گاڑی بھگاتا ہوا وہاں پہنچا۔ میں نے کار مطلوبہ گلی کے ذرا نزدیک لے جاکر کھڑی کی اور اس کے بعد میں اور اول خیر نیچے اُتر آئے، ہم تیزی سے آگے بڑھے۔ میرے پاس اپنا پستول تھا جبکہ اول خیر بھی ہتھیار بدست تھا۔ ہم نواں چوک کی مشرقی سمت پر تھے۔ کار ایک جانب کھڑی کرکے ہم دونوں نیچے اُتر آئے اور سیدھا گلی میں داخل ہوگئے۔

گلی تاریک اور سنسان تھی۔ کسی ممکنہ خطرے اور احتیاط کے پیشِ نظر میں نے اول خیر کو خود سے الگ کردیا اور اسے ہدایت دی کہ وہ ذرا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آتا رہے۔

اس علاقے پر مجھے حیرت ہی ہوئی تھی۔ خاصا پسماندہ علاقہ محسوس ہوتا تھا یہ...... مزدور یا معمولی ملازمت پیشہ افراد ہی یہاں کے رہائشی معلوم ہوتے تھے۔ ایسے علاقے میں عارفہ کو یرغمال بنا کر رکھنا اور خود بھی وہیں ہونا...... باعث حیرت ہی تھا۔ تاہم اس سے نوید سانچے والا کی اصل اوقات کا پتا چلتا تھا۔ مگر اس نے عارفہ کے ساتھ دماغ بہت عیارانہ اور شاطرانہ استعمال کیا تھا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کرسکتا تھا اور بہت پہلے کرلیتا مگر میں آج تک نوید سانچے والا کی ہر سازش اور چال کو ناکام بناتا چلا آیا تھا، اگرچہ اس میں سرمد بابا کی.... دوراندیشانہ سوچ اور تجربے کا دخل بھی تھا۔ آخری وار تو سرمد بابا نے اپنے مرنے کے بعد وصیت کی صورت میں نوید سانچے والا پر کیا تھا اور اب جبکہ نوید کو اور کچھ بھائی نہ دیا تو اس نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے طور پر یہ انتہائی قدم اُٹھالیا تھا۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں کچھ کھڑبڑاہٹ کا احساس ہوا، میں یک دم چلتے چلتے رک کر پلٹا اور بری طرح چونک پڑا۔ مجھ سے لگ بھگ پندرہ بیس قدم پیچھے اول خیر آرہا تھا اور ہم دونوں انتہائی محتاط انداز میں گلی کی دیوار سے لگے ہوئے ہی آگے بڑھ رہے تھے، تاکہ کسی کی اتفاقیہ بھی نگاہ ہم پر نہ پڑسکے اور اگر پڑ بھی جائے تو ہم پہچانے نہ جاسکیں، لیکن میں نے دیکھا کہ اول خیر کسی کے ساتھ جنگ آزمائی میں مصروف تھا، میرا ماتھا ٹھنکا۔ گویا خطرہ آگے نہیں ہمارے پیچھے بھی دبے پاؤں چلا آرہا تھا۔ میں نے یک دم پیچھے کی جانب دوڑ لگادی۔ اول خیر اپنے حملہ آور کے ساتھ پوری طرح بھڑا ہوا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری آمد کا کسی کو علم ہوسکے۔ قریب پہنچتے پہنچتے ایک موقع پر میں نے اس نامعلوم حملہ آور کو اول خیر کے نرغے میں دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے میں بدک گیا۔ حملہ آور نے چشم زدن میں چاقو نکال لیا تھا۔ اول خیر کی شاید اس پر نگاہ نہ پڑسکی تھی۔ حملہ آور اس کے نرغے میں اپنی گردن کو چھڑانے کی کوشش میں تھا اور تب ہی مجھے اس کی خطرناک چال کا احساس ہوگیا۔ جیسے ہی اس نے اول خیر پر یہ چھپا ہوا اور اذیت ناک وار کرنا چاہا،

"اس وقت جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو...... وقت نہیں ہے میرے پاس...... جلدی۔" میں نے اس بار غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ دونوں نے میرا حکم بجالانے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کی۔

میں اور اول خیر جب جلدی سے واپس کوٹھی کی طرف جانے لگے تو پنکی نے مجھے آواز دی۔

"شہزی انکل! مما کے لیے کچھ کیجیے گا پلیز......! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ان کی جان سخت خطرے میں ہے۔"

میں نے پنکی کو اس سلسلے میں تسلی دی۔ دونوں کو شکیلہ کے ساتھ روانہ کرتے ہی میں نے اول خیر کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ عارفہ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ گیٹ بند کیا اور اندر آ گیا۔ اول خیر حیران پریشان اِدھر اُدھر پڑے راٹھور کے گرگوں کو تکے جا رہا تھا اور اس کے حلق سے "اوخیر......" برآمد ہوا...۔ اول خیر سے ان سب کو رسی سے جکڑ کر باتھ روموں میں پھینکنے کا کہا اور خود ایک طرف کو لپکا۔

مجھے راٹھور کی تلاش تھی، جلد ہی وہ مجھے ایک کمرے میں کسی سے فون پر باتیں کرتا ہوا نظر آ گیا۔ اس کی ناک پر بھدے انداز میں پٹی بندھی ہوئی نظر آ رہی تھی جو اس نے خود ہی واش روم میں جا کر کی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے ریسیور پھینک کر بھاگنا چاہا مگر میں نے ایک ہی جست میں اس کے سر پر پہنچ کر اسے دبوچ لیا اور اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں نے اسے وہیں ایک بیڈ پر ڈال دیا اور اسٹینڈ پر رکھے ٹیلی فون کے نفیس سیٹ کے کریڈل سے جھولتے ہوئے ریسیور کو تھاما اور اپنے کان سے لگا لیا۔

"ہیلو، ہیلو...... راٹھور! کیا ہوا......؟ تم اچانک کہاں چلے گئے......؟"

دوسری طرف سے چیختی ہوئی آواز اُبھری۔ میں یہ آواز پہچان کر چونکا۔ یہ نوید سانچے والا تھا۔ کھٹک مجھے اس بات کی ہوئی تھی کہ اس کی وائس ٹون ایسی نہیں تھی جیسی عموماً بیرونِ ممالک کسی سے بات کرتے وقت ہوتی ہے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ نوید ملک کے اندر ہی تھا، میں نے فوراً سی ایل آئی میں نمبر دیکھا اور چونک پڑا۔ ایریا اور کوڈ نمبر ملتان کا ہی تھا۔ میں نے فوراً بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"جج...... جناب! کوٹھی پر کسی نے حملہ...... کر دیا ہے، اور راٹھور صاحب اس کا شکار...... آہ......" میں نے جان بوجھ کر اپنے حلق سے کراہ خارج کی' ریسیور چھوڑا اور تھوڑی زوردار آواز میں اُٹھا خ پٹاخ کی، پھر چلا چلا کر...... "پکڑو شہزی کو جانے نہ پائے، دوڑو ستار اُس کے پیچھے...... وہ مجھے زخمی کر گیا ہے۔" یہ زور زور سے یہ بولنے کے بعد میں نے پھر ریسیور تھاما اور دانستہ گھٹی گھٹی اور دبی ہوئی آواز میں نوید سانچے والا اسے مخاطب ہوا۔

"جج...... جناب! ہیلو، آ...... آپ لائن پر ہیں......؟"

"ہاں...... ہاں...... میں لائن پر ہی ہوں، بولو......؟ کیا ہوا؟ کس نے حملہ کیا ہے کوٹھی پہ؟ کیا شہزی اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے حملہ......؟ راٹھور کیسا ہے؟ اور تم کون ہو......؟"

"یس...... سر! راٹھور صاحب زخمی ہو کر بے ہوش ہو چکے ہیں، باقیوں کا بھی تقریباً یہی حال ہے، میڈم کا کچھ پتا نہیں ہے، مگر دونوں بچے میرے قبضے میں ہیں۔ میں انہیں لے کر ایک اسٹور میں چھپا بیٹھا ہوں۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا......" حسبِ توقع دوسری جانب سے نوید سانچے والا کی جوشیلی آواز اُبھری...... "یہی دونوں بچے ہمارے کام کے ہیں۔ تم ایک بہت بڑے انعام کے مستحق ہو...... میں تمہیں ایک جگہ کا پتا بتا رہا ہوں، لیکن...... تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم ہو کون؟"

اپنی بروقت چال پر میرا دل مسرت سے دھڑک اُٹھا تھا مگر اس کم بخت کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً جواب بناتے ہوئے اس سے کہا۔

"کمال ہے سیٹھ صاحب! آپ مجھے نہیں پہچان رہے ہیں، ہم یہاں آپ کی خاطر اپنی جانیں داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں کہ دشمنوں سے مار کھا کے ہمارا حال بُرا ہو گیا ہے۔ میں ستار کا ساتھی گارڈ ہوں اور راٹھور صاحب کا آدمی فرید ہوں۔"

"او...... اچھا...... اچھا مجھے یاد نہیں رہا ہوگا۔" وہ جلدی سے خفیف ہو کے بولا۔ "پتا نوٹ کرو......"

اس نے مجھے اس جگہ کا پتا بتا دیا جو میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔

میں نے ایک قریب دھری میز کو اپنی ایک ٹانگ سے اُلجھا کر زور سے پٹخا کہ اس کی آواز فون پر موجود نوید بھی سن لے، اس آواز کے ساتھ ہی میں بھی زور سے چلایا تھا۔

"کیا ہوا......؟ کیا ہوا......؟" دوسری طرف سے اس نے گھبرا کر پوچھا تھا مگر میں اپنا کام کر چکا تھا اور ریسیور کریڈل پر رکھ کے اس کا تار کاٹ دیا۔

اس کے بعد میں پلٹا۔ اول خیر تب تک سب کو رسیوں سے جکڑ کے اور انہیں ایک کمرے میں مقید کر کے میرے پاس آیا تو میں نے اسے اپنا منصوبہ بتایا۔

''وہ رذیل آدمی ضرور وہاں موجود ہوگا اور اس نے یقیناً عارفہ کو بھی یرغمال بنا رکھا ہوگا۔''

''او...... خیر کا بچہ! یہ تو تُو نے بڑا پالا مارا...... چل جلدی نکل چلیں...... پر یار! گاڑی......''

''گاڑیاں پورچ میں کھڑی ہیں...... آجاؤ......'' میں نے کہا۔

''او خیر......'' وہ ہولے سے بولا۔

ہم باہر پورچ میں آگئے۔ گاڑی کی چابی تلاشنے کا ہمارے پاس وقت نہ تھا، یوں بھی بغیر چابی کے گاڑی اسٹارٹ کرنا میرا ہی نہیں اول خیر کے بھی بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہماری گاڑی جو درحقیقت وہی سیاہ ہنڈا اکارڈ تھی، جو راٹھور کی ملکیت تھی۔ اسی کو دوڑانے لگا۔ اسٹیئرنگ پر میں ہی بیٹھا تھا اور اول خیر میری برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

میرے کانوں میں پنکی کے بار بار وہ ہراساں الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے دو بار مجھ سے کہے تھے یعنی ان کی ماں (عارفہ) کی جان خطرے میں تھی اور اس کی جان کو کس سے خطرہ ہوسکتا تھا۔ مجھ سے اور سرمد بابا سے زیادہ بہتر اور کون جان سکتا تھا۔ وہ تو دنیا میں نہیں رہے تھے اور وہی سب سے اچھی طرح اس مردود سیٹھ نوید سانچے والا کی اصلیت اور اس کے گھناؤنے مقصد سے آگاہ تھے۔ میں بھی انہی خطوط پر نوید سانچے والا کا بھیانک چہرہ پہچانے ہوئے تھا۔ عارفہ سے اس کی شادی میری توقع کے خلاف تو نہ تھی مگر سرمد بابا کی وصیت کے باوجود اس کی عارفہ سے اس قدر جلد شادی میں مجھے کسی گہری سازش کی ہی بُو آرہی تھی۔

موجودہ حالات کی کشاکشی میں مجھے جو کام فرصتِ اولین میں انجام دینا تھا، وہ میں کررہا تھا۔

سیٹھ سانچے والا زیادہ دیر تک میری چال کے جال میں پھنسا نہیں رہ سکتا تھا اسی لیے یہ کام جلد از جلد نمٹانے کا متقاضی تھا۔ اس نے اپنے جس ٹھکانے کا پتا بتایا تھا، وہ نواں چوک کے ایک مکان کا تھا۔ وہ اسٹریٹ اور مکان نمبر میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر میں طوفانی رفتار سے گاڑی بھگاتا ہوا وہاں پہنچا۔ میں نے کار مطلوبہ گلی کے ذرا نزدیک لے جا کر کھڑی کی اور اس کے بعد میں اور اول خیر نیچے اُتر آئے، ہم تیزی سے آگے بڑھے۔ میرے پاس اپنا پستول تھا جبکہ اول خیر بھی ہتھیار بدست تھا۔ ہم نواں چوک کی مشرقی سمت پر تھے۔ کار ایک جانب کھڑی کر کے ہم دونوں نیچے اُتر آئے اور سیدھا گلی میں داخل ہوگئے۔

گلی تاریک اور سنسان تھی۔ کسی ممکنہ خطرے اور احتیاط کے پیشِ نظر میں نے اول خیر کو خود سے الگ کردیا اور اسے ہدایت دی کہ وہ ذرا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آتا رہے۔

اس علاقے پر مجھے حیرت ہی ہوئی تھی۔ خاصا پسماندہ علاقہ محسوس ہوتا تھا یہ...... مزدور یا معمولی ملازمت پیشہ افراد ہی یہاں کے رہائشی معلوم ہوتے تھے۔ ایسے علاقے میں عارفہ کو یرغمال بنا کر رکھنا اور خود بھی وہیں ہونا...... باعث حیرت ہی تھا۔ تاہم اس سے نوید سانچے والا کی اصل اوقات کا پتا چلتا تھا۔ مگر اس نے عارفہ کے ساتھ دماغ بہت عیارانہ اور شاطرانہ استعمال کیا تھا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کرسکتا تھا اور بہت پہلے کرلیتا مگر میں آج تک نوید سانچے والا کی ہر سازش اور چال کو ناکام بناتا چلا آیا تھا، اگرچہ اس میں سرمد بابا کی ...... دور اندیشانہ سوچ اور تجربے کا دخل بھی تھا۔ آخری وار تو سرمد بابا نے اپنے مرنے کے بعد وصیت کی صورت میں نوید سانچے والا پر کیا تھا اور اب جبکہ نوید کو اور کچھ سجھائی نہ دیا تو اس نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے طور پر یہ انتہائی قدم اُٹھالیا تھا۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں کچھ کھڑبڑاہٹ کا احساس ہوا، میں یک دم چلتے چلتے رک کر پلٹا اور بری طرح چونک پڑا۔ مجھ سے لگ بھگ پندرہ بیس قدم پیچھے اول خیر آرہا تھا اور ہم دونوں انتہائی محتاط انداز میں گلی کی دیوار سے لگے ہوئے ہی آگے بڑھ رہے تھے، تاکہ کسی کی اتفاقیہ بھی نگاہ ہم پر نہ پڑسکے اور اگر پڑ بھی جائے تو ہم پہچانے نہ جاسکیں، لیکن میں نے دیکھا کہ اول خیر کسی کے ساتھ جنگ آزمائی میں مصروف تھا، میرا ماتھا ٹھنکا۔ گویا خطرہ آگے نہیں ہمارے پیچھے بھی دبے پاؤں چلا آرہا تھا۔ میں نے یک دم پیچھے کی جانب دوڑ لگادی۔ اول خیر اپنے حملہ آور کے ساتھ پوری طرح بھڑا ہوا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری آمد کا کسی کو علم ہوسکے۔ قریب پہنچتے پہنچتے ایک موقع پر میں نے اس نامعلوم حملہ آور کو اول خیر کے نرغے میں دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے میں بدک گیا۔ حملہ آور نے چشم زدن میں چاقو نکال لیا تھا۔ اول خیر کی شاید اس پر نگاہ نہ پڑسکی تھی۔ حملہ آور اس کے نرغے میں اپنی گردن کو چھڑانے کی کوشش میں تھا اور تب ہی مجھے اس کی خطرناک چال کا احساس ہوگیا۔ جیسے ہی اس نے اول خیر پر یہ چھپا ہوا اور اذیت ناک وار کرنا چاہا،

"اس وقت جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو...... وقت نہیں ہے میرے پاس...... جلدی۔" میں نے اس بار غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ دونوں نے میرا حکم بجالانے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کی۔

میں اور اول خیر جب جلدی سے واپس کوٹھی کی طرف جانے لگے تو پنکی نے مجھے آواز دی۔

"شہزی انکل! مما کے لیے کچھ کیجیے گا پلیز......! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ان کی جان سخت خطرے میں ہے۔"

میں نے پنکی کو اس سلسلے میں تسلی دی۔ دونوں کو شکیلہ کے ساتھ روانہ کرتے ہی میں نے اول خیر کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ عارفہ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ گیٹ بند کیا اور اندر آگیا۔ اول خیر حیران پریشان اِدھر اُدھر پڑے راٹھور کے گرگوں کو تکے جارہا تھا اور اس کے حلق سے "اوخیر......" برآمد ہوا۔ اول خیر سے ان سب کو رسی سے جکڑ کر باتھ روموں میں پھینکنے کا کہا اور خود ایک طرف کو لپکا۔

مجھے راٹھور کی تلاش تھی، جلد ہی وہ مجھے ایک کمرے میں کسی سے فون پر باتیں کرتا ہوا نظر آگیا۔ اس کی ناک پر بھدے انداز میں پٹی بندھی ہوئی نظر آرہی تھی جو اس نے خود ہی واش روم میں جاکر کی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے ریسیور پھینک کر بھاگنا چاہا مگر میں نے ایک ہی جست میں اس کے سر پر پہنچ کر اسے دبوچ لیا اور اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ بے حس و حرکت ہوگیا۔

میں نے اسے وہیں ایک بیڈ پر ڈال دیا اور اسٹینڈ پر رکھے ٹیلی فون کے نفیس سیٹ کے کریڈل سے جھولتے ہوئے ریسیور کو تھاما اور اپنے کان سے لگالیا۔

"ہیلو، ہیلو...... راٹھور! کیا ہوا......؟ تم اچانک کہاں چلے گئے......؟"

دوسری طرف سے چیختی ہوئی آواز اُبھری۔ میں یہ آواز پہچان کر چونکا۔ یہ نوید سانچے والا تھا۔ کھٹک مجھے اس بات کی ہوئی تھی کہ اس کی وائس ٹون ایسی نہیں تھی جیسی عموماً بیرونِ ممالک کسی سے بات کرتے وقت ہوتی ہے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ نوید ملک کے اندر ہی تھا۔ میں نے فوراً سی ایل آئی میں نمبر دیکھا اور چونک پڑا۔ ایریا اور کوڈ نمبر ملتان کا ہی تھا۔ میں نے فوراً بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"جج...... جناب! کوٹھی پر کسی نے حملہ...... کردیا ہے، اور راٹھور صاحب اس کا شکار...... آہ......" میں نے جان بوجھ کر اپنے حلق سے کراہ خارج کی' ریسیور چھوڑا اور تھوڑی زوردار آواز میں اُٹھا خ پٹاخ کی، پھر چلاّ چلاّ کر...... "پکڑو شہزی کو جانے نہ پائے، دوڑو ستار اُس کے پیچھے...... وہ مجھے زخمی کرگیا ہے۔" یہ زور زور سے یہ بولنے کے بعد میں نے پھر ریسیور تھاما اور دانستہ گھٹی گھٹی اور دبی ہوئی آواز میں نوید سانچے والا اسے مخاطب ہوا۔

"جج...... جناب! ہیلو، آ...... آپ لائن پر ہیں......؟"

"ہاں...... ہاں...... میں لائن پر ہی ہوں، بولو......؟ کیا ہوا؟ کس نے حملہ کیا ہے کوٹھی پہ؟ کیا شہزی اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے حملہ......؟ راٹھور کیسا ہے؟ اور تم کون ہو......؟"

"سس...... سر! راٹھور صاحب زخمی ہوکر بے ہوش ہو چکے ہیں، باقیوں کا بھی تقریباً یہی حال ہے، میڈم کا کچھ پتا نہیں ہے، مگر دونوں بچے میرے قبضے میں ہیں۔ میں انہیں لے کر ایک اسٹور میں چھپا بیٹھا ہوں۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا......" حسبِ توقع دوسری جانب سے نوید سانچے والا کی جوشیلی آواز اُبھری...... "یہی دونوں بچے ہمارے کام کے ہیں۔ تم ایک بہت بڑے انعام کے مستحق ہو...... میں تمہیں ایک جگہ کا پتا بتارہا ہوں، لیکن...... تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم ہو کون؟"

اپنی بروقت چال پر میرا دل مسرت سے دھڑک اُٹھا تھا مگر اس کم بخت کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً جواب بناتے ہوئے اس سے کہا۔

"کمال ہے سیٹھ صاحب! آپ مجھے نہیں پہچان رہے ہیں، ہم یہاں آپ کی خاطر اپنی جانیں داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں کہ دشمنوں سے مار کھا کے ہمارا حال بُرا ہوگیا ہے۔ میں ستار کا ساتھی گارڈ ہوں اور راٹھور صاحب کا آدمی فرید ہوں۔"

"او...... اچھا...... اچھا مجھے یاد نہیں رہا ہوگا۔" وہ جلدی سے خفیف ہوکے بولا۔ "پتا نوٹ کرو......"

اس نے مجھے اس جگہ کا پتا بتادیا جو میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا۔

میں نے ایک قریب دھری میز کو اپنی ایک ٹانگ سے اُلجھا کر زور سے پٹخا کہ اس کی آواز فون پر موجود نوید بھی سن لے، اس آواز کے ساتھ ہی میں بھی زور سے چلاّیا تھا۔

"کیا ہوا......؟ کیا ہوا......؟" دوسری طرف سے اس نے گھبرا کر پوچھا تھا مگر میں اپنا کام کرچکا تھا اور ریسیور کریڈل پر رکھ کے اس کا تار کاٹ دیا۔

اس کے بعد میں پلٹا۔ اول خیر تب تک سب کو رسیوں سے جکڑ کے اور انہیں ایک کمرے میں مقید کرکے میرے پاس آیا تو میں نے اسے اپنا منصوبہ بتایا۔

''وہ رذیل آدمی ضرور وہاں موجود ہوگا اور اس نے یقیناً عارفہ کو بھی یرغمال بنا رکھا ہوگا۔''

''او...... خیر کا بچہ! یہ تو تُو نے بڑا پالا مارا...... چل جلدی نکل چلیں...... پر یار! گاڑی......''

''گاڑیاں پورچ میں کھڑی ہیں...... آجاؤ......'' میں نے کہا۔

''او خیر......'' وہ ہولے سے بولا۔

ہم باہر پورچ میں آگئے۔ گاڑی کی چابی تلاشنے کا ہمارے پاس وقت نہ تھا، یوں بھی بغیر چابی کے گاڑی اسٹارٹ کرنا میرا ہی نہیں اول خیر کے بھی بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہماری گاڑی جو درحقیقت وہی سیاہ ہنڈا اسٹی تھی، جو راٹھور کی ملکیت تھی۔ اسی کو دوڑانے لگا۔ اسٹیئرنگ پر میں ہی بیٹھا تھا اور اول خیر میری برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

میرے کانوں میں پنکی کے بار بار وہ ہراساں الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے دوبار مجھ سے کہے تھے یعنی ان کی ماں (عارفہ) کی جان خطرے میں تھی اور اس کی جان کو کس سے خطرہ ہوسکتا تھا۔ مجھ سے اور سرمد بابا سے زیادہ بہتر اور کون جان سکتا تھا۔ وہ تو دنیا میں نہیں رہے تھے اور وہی سب سے اچھی طرح اس مردود سیٹھ نوید سانچے والا کی اصلیت اور اس کے گھناؤنے مقصد سے آگاہ تھے۔ میں بھی انہی خطوط پر نوید سانچے والا کا بھیانک چہرہ پہچانے ہوئے تھا۔ عارفہ سے اس کی شادی میری توقع کے خلاف تو نہ تھی مگر سرمد بابا کی وصیت کے باوجود اس کی عارفہ سے اس قدر جلد شادی میں مجھے کسی گہری سازش کی ہی بُو آرہی تھی۔

موجودہ حالات کی کشاکشی میں مجھے جو کام فرصتِ اولین میں انجام دینا تھا، وہ میں کر رہا تھا۔

سیٹھ سانچے والا زیادہ دیر تک میری چال کے جال میں پھنسا نہیں رہ سکتا تھا اسی لیے یہ کام جلد از جلد نمٹانے کا متقاضی تھا۔ اس نے اپنے جس ٹھکانے کا پتا بتایا تھا، وہ نواں چوک کے ایک مکان کا تھا۔ وہ اسٹریٹ اور مکان نمبر میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر میں طوفانی رفتار سے گاڑی بھگاتا ہوا وہاں پہنچا۔ میں نے کار مطلوبہ گلی کے ذرا نزدیک لے جاکر کھڑی کی اور اس کے بعد میں اور اول خیر نیچے اُتر آئے، ہم تیزی سے آگے بڑھے۔ میرے پاس اپنا پستول تھا جبکہ اول خیر بھی ہتھیار بدست تھا۔ ہم نواں چوک کی مشرقی سمت پر تھے۔ کار ایک جانب کھڑی کر کے ہم دونوں نیچے اُتر آئے اور سیدھا گلی میں داخل ہوگئے۔

گلی تاریک اور سنسان تھی۔ کسی ممکنہ خطرے اور احتیاط کے پیشِ نظر میں نے اول خیر کو خود سے الگ کردیا اور اسے ہدایت دی کہ وہ ذرا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آتا رہے۔

اس علاقے پر مجھے حیرت ہی ہوئی تھی۔ خاصا پسماندہ علاقہ محسوس ہوتا تھا یہ...... مزدور یا معمولی ملازمت پیشہ افراد ہی یہاں کے رہائشی معلوم ہوتے تھے۔ ایسے علاقے میں عارفہ کو یرغمال بنا کر رکھنا اور خود بھی وہیں ہونا...... باعث حیرت ہی تھا۔ تاہم اس سے نوید سانچے والا کی اصل اوقات کا پتا چلتا تھا۔ مگر اس نے عارفہ کے ساتھ دماغ بہت عیارانہ اور شاطرانہ استعمال کیا تھا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کرسکتا تھا اور بہت پہلے کرلیتا مگر میں آج تک نوید سانچے والا کی ہر سازش اور چال کو ناکام بناتا چلا آیا تھا، اگرچہ اس میں سرمد بابا کی ....دور اندیشانہ سوچ اور تجربے کا دخل بھی تھا۔ آخری وار تو سرمد بابا نے اپنے مرنے کے بعد وصیت کی صورت میں نوید سانچے والا پر کیا تھا اور اب جبکہ نوید کو اور کچھ سجھائی نہ دیا تو اس نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے طور پر یہ انتہائی قدم اُٹھالیا تھا۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں کچھ کھڑبڑاہٹ کا احساس ہوا، میں یک دم چلتے چلتے رک کر پلٹا اور بری طرح چونک پڑا۔ مجھ سے لگ بھگ پندرہ بیس قدم پیچھے اول خیر آرہا تھا اور ہم دونوں انتہائی محتاط انداز میں گلی کی دیوار سے لگے ہوئے ہی آگے بڑھ رہے تھے، تاکہ کسی کی اتفاقیہ بھی نگاہ ہم پر نہ پڑسکے اور اگر پڑ بھی جائے تو ہم پہچانے نہ جاسکیں، لیکن میں نے دیکھا کہ اول خیر کسی کے ساتھ جنگ آزمائی میں مصروف تھا، میرا ماتھا ٹھنکا۔ گویا خطرہ آگے نہیں ہمارے پیچھے بھی دبے پاؤں چلا آرہا تھا۔ میں نے یک دم پیچھے کی جانب دوڑ لگا دی۔ اول خیر اپنے حملہ آور کے ساتھ پوری طرح بھڑا ہوا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری آمد کا کسی کو علم ہوسکے۔ قریب پہنچتے پہنچتے ایک موقع پر میں نے اس نامعلوم حملہ آور کو اول خیر کے نرغے میں دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے میں بدک گیا۔ حملہ آور نے چشم زدن میں چاقو نکال لیا تھا۔ اول خیر کی شاید اس پر نگاہ نہ پڑسکی تھی۔ حملہ آور اس کے نرغے میں اپنی گردن کو چھڑانے کی کوشش میں تھا اور تب ہی مجھے اس کی خطرناک چال کا احساس ہوگیا۔ جیسے ہی اس نے اول خیر پر یہ چھپا ہوا اور اذیت ناک وار کرنا چاہا،

"اس وقت جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو...... وقت نہیں ہے میرے پاس...... جلدی۔" میں نے اس بار غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ دونوں نے میرا حکم بجالانے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کی۔

میں اور اول خیر جب جلدی سے واپس کوٹھی کی طرف جانے لگے تو پنکی نے مجھے آواز دی۔

"شہزی انکل! مما کے لیے کچھ کیجیے گا پلیز......! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ان کی جان سخت خطرے میں ہے۔"

میں نے پنکی کو اس سلسلے میں تسلی دی۔ دونوں کو شکیلہ کے ساتھ روانہ کرتے ہی میں نے اول خیر کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ عارفہ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ گیٹ بند کیا اور اندر آ گیا۔ اول خیر حیران پریشان اِدھر اُدھر پڑے راٹھور کے گرگوں کو تکتے جا رہا تھا اور اس کے حلق سے "اوخیر......" برآمد ہوا...... اول خیر سے ان سب کو رسی سے جکڑ کر باتھ روموں میں پھینکنے کا کہا اور خود ایک طرف کو لپکا۔

مجھے راٹھور کی تلاش تھی، جلد ہی وہ مجھے ایک کمرے میں کسی سے فون پر باتیں کرتا ہوا نظر آ گیا۔ اس کی ناک پر بھدے انداز میں پٹی بندھی ہوئی نظر آ رہی تھی جو اس نے خود ہی واش روم میں جا کر کی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے ریسیور پھینک کر بھاگنا چاہا مگر میں نے ایک ہی جست میں اس کے سر پر پہنچ کر اسے دبوچ لیا اور اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں نے اسے وہیں ایک بیڈ پر ڈال دیا اور اسٹینڈ پر رکھے ٹیلی فون کے نفیس سیٹ کے کریڈل سے جھولتے ہوئے ریسیور کو تھاما اور اپنے کان سے لگا لیا۔

"ہیلو، ہیلو...... راٹھور! کیا ہوا......؟ تم اچانک کہاں چلے گئے......؟"

دوسری طرف سے چیختی ہوئی آواز اُبھری۔ میں یہ آواز پہچان کر چونکا۔ یہ نوید سانچے والا تھا۔ کھٹک مجھے اس بات کی ہوئی تھی کہ اس کی وائس ٹون ایسی نہیں تھی جیسی عموماً بیرونِ ممالک کسی سے بات کرتے وقت ہوتی ہے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ نوید ملک کے اندر ہی تھا، میں نے فوراً سی ایل آئی میں نمبر دیکھا اور چونک پڑا۔ ایریا اور کوڈ نمبر ملتان کا ہی تھا۔ میں نے فوراً بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"ج...... جناب! کوٹھی پر کسی نے حملہ...... کر دیا ہے، اور راٹھور صاحب اس کا شکار...... آہ......" میں نے جان بوجھ کر اپنے حلق سے کراہ خارج کی، ریسیور چھوڑا اور تھوڑی زوردار آواز میں اُٹھا خ پٹاخ کی، پھر چلا چلا کر...... "پکڑو شہزی کو جانے نہ پائے، دوڑو ستار اُس کے پیچھے...... وہ مجھے زخمی کر گیا ہے۔" یہ زور زور سے یہ بولنے کے بعد میں نے پھر ریسیور تھاما اور دانستہ گھٹی گھٹی اور دبی ہوئی آواز میں نوید سانچے والا سے مخاطب ہوا۔

"ج...... جناب! ہیلو، آ...... آپ لائن پر ہیں......؟"

"ہاں...... ہاں...... میں لائن پر ہی ہوں، بولو......؟ کیا ہوا؟ کس نے حملہ کیا ہے کوٹھی پہ؟ کیا شہزی اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے حملہ......؟ راٹھور کیسا ہے؟ اور تم کون ہو......؟"

"س...... سر! راٹھور صاحب زخمی ہو کر بے ہوش ہو چکے ہیں، باقیوں کا بھی تقریباً یہی حال ہے، میڈم کا کچھ پتا نہیں ہے، مگر دونوں بچے میرے قبضے میں ہیں۔ میں انہیں لے کر ایک اسٹور میں چھپا بیٹھا ہوں۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا......" حسبِ توقع دوسری جانب سے نوید سانچے والا کی جوشیلی آواز اُبھری...... "یہی دونوں بچے ہمارے کام کے ہیں۔ تم ایک بہت بڑے انعام کے مستحق ہو...... میں تمہیں ایک جگہ کا پتا بتا رہا ہوں، لیکن...... تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم ہو کون؟"

اپنی بروقت چال پر میرا دل مسرت سے دھڑک اُٹھا تھا مگر اس کم بخت کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً جواب بناتے ہوئے اس سے کہا۔

"کمال ہے سیٹھ صاحب! آپ مجھے نہیں پہچان رہے ہیں، ہم یہاں آپ کی خاطر اپنی جانیں داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں کہ دشمنوں سے مار کھا کے ہمارا حال بُرا ہو گیا ہے۔ میں ستار کا ساتھی گارڈ ہوں اور راٹھور صاحب کا آدمی فرید ہوں۔"

"او...... اچھا...... اچھا مجھے یاد نہیں رہا ہو گا۔" وہ جلدی سے خفیف ہو کے بولا۔ "پتا نوٹ کرو......"

اس نے مجھے اس جگہ کا پتا بتا دیا جو میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔

میں نے ایک قریب دھری میز کو اپنی ایک ٹانگ سے اُلجھا کر زور سے پٹخا کہ اس کی آواز فون پر موجود نوید بھی سن لے، اس آواز کے ساتھ ہی میں بھی زور سے چلایا تھا۔

"کیا ہوا......؟ کیا ہوا......؟" دوسری طرف سے اس نے گھبرا کر پوچھا تھا مگر میں اپنا کام کر چکا تھا اور ریسیور کریڈل پر رکھ کے اس کا تار کاٹ دیا۔

اس کے بعد میں پلٹا۔ اول خیر تب تک سب کو رسیوں سے جکڑ کے اور انہیں ایک کمرے میں مقید کر کے میرے پاس آیا تو میں نے اسے اپنا منصوبہ بتایا۔

''وہ رذیل آدمی ضرور وہاں موجود ہوگا اور اس نے یقیناً عارفہ کو بھی یرغمال بنا رکھا ہوگا۔''

''او...... خیر کا بچہ! یہ تو تُو نے بڑا پالا مارا...... چل جلدی نکل چلیں...... پر یار! گاڑی......''

''گاڑیاں پورچ میں کھڑی ہیں...... آجاؤ......'' میں نے کہا۔

''او خیر......'' وہ ہولے سے بولا۔

ہم باہر پورچ میں آگئے۔ گاڑی کی چابی تلاشنے کا ہمارے پاس وقت نہ تھا، یوں بھی بغیر چابی کے گاڑی اسٹارٹ کرنا میرا ہی نہیں اول خیر کے بھی بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہماری گاڑی جو درحقیقت وہی سیاہ ہنڈا اسٹی تھی، جو راٹھور کی ملکیت تھی۔ اسی کو دوڑانے لگا۔ اسٹیئرنگ پر میں ہی بیٹھا تھا اور اول خیر میری برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

میرے کانوں میں پنکی کے بار بار وہ ہراساں الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے دو بار مجھ سے کہے تھے یعنی ان کی ماں (عارفہ) کی جان خطرے میں تھی اور اس کی جان کو کس سے خطرہ ہوسکتا تھا۔ مجھ سے اور سرمد بابا سے زیادہ بہتر اور کون جان سکتا تھا۔ وہ تو دنیا میں نہیں رہے تھے اور وہی سب سے اچھی طرح اس مردود سیٹھ نوید سانچے والا کی اصلیت اور اس کے گھناؤنے مقصد سے آگاہ تھے۔ میں بھی انہی خطوط پر نوید سانچے والا کا بھیانک چہرہ پہچانے ہوئے تھا۔ عارفہ سے اس کی شادی میری توقع کے خلاف تو نہ تھی مگر سرمد بابا کی وصیت کے باوجود اس کی عارفہ سے اس قدر جلد شادی میں مجھے کسی گہری سازش کی ہی بُو آرہی تھی۔

موجودہ حالات کی کشاکشی میں مجھے جو کام فرصتِ اولین میں انجام دینا تھا، وہ میں کررہا تھا۔

سیٹھ سانچے والا زیادہ دیر تک میری چال کے جال میں پھنسا نہیں رہ سکتا تھا اسی لیے یہ کام جلد از جلد نمٹانے کا متقاضی تھا۔ اس نے اپنے جس ٹھکانے کا پتا بتایا تھا، وہ نواں چوک کے ایک مکان کا تھا۔ وہ اسٹریٹ اور مکان نمبر میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر میں طوفانی رفتار سے گاڑی بھگاتا ہوا وہاں پہنچا۔ میں نے کار مطلوبہ گلی کے ذرا نزدیک لے جاکر کھڑی کی اور اس کے بعد میں اور اول خیر نیچے اُتر آئے، ہم تیزی سے آگے بڑھے۔ میرے پاس اپنا پستول تھا جبکہ اول خیر بھی ہتھیار بدست تھا۔ ہم نواں چوک کی مشرقی سمت پر تھے۔ کار ایک جانب کھڑی کرکے ہم دونوں نیچے اُتر آئے اور سیدھا گلی میں داخل ہوگئے۔

گلی تاریک اور سنسان تھی۔ کسی ممکنہ خطرے اور احتیاط کے پیشِ نظر میں نے اول خیر کو خود سے الگ کردیا اور اسے ہدایت دی کہ وہ ذرا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آتا رہے۔

اس علاقے پر مجھے حیرت ہی ہوئی تھی۔ خاصا پسماندہ علاقہ محسوس ہوتا تھا یہ...... مزدور یا معمولی ملازمت پیشہ افراد ہی یہاں کے رہائشی معلوم ہوتے تھے۔ ایسے علاقے میں عارفہ کو یرغمال بنا کر رکھنا اور خود بھی وہیں ہونا...... باعث حیرت ہی تھا۔ تاہم اس سے نوید سانچے والا کی اصل اوقات کا پتا چلتا تھا۔ مگر اس نے عارفہ کے ساتھ دماغ بہت عیارانہ اور شاطرانہ استعمال کیا تھا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کرسکتا تھا اور بہت پہلے کرلیتا مگر میں آج تک نوید سانچے والا کی ہر سازش اور چال کو ناکام بناتا چلا آیا تھا، اگرچہ اس میں سرمد بابا کی...... دور اندیشانہ سوچ اور تجربے کا دخل بھی تھا۔ آخری وار تو سرمد بابا نے اپنے مرنے کے بعد وصیت کی صورت میں نوید سانچے والا پر کیا تھا اور اب جبکہ نوید کو اور کچھ سجھائی نہ دیا تو اس نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے طور پر یہ انتہائی قدم اُٹھالیا تھا۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں کچھ کھڑبڑاہٹ کا احساس ہوا، میں یک دم چلتے چلتے رک کر پلٹا اور بری طرح چونک پڑا۔ مجھ سے لگ بھگ پندرہ بیس قدم پیچھے اول خیر آرہا تھا اور ہم دونوں انتہائی محتاط انداز میں گلی کی دیوار سے لگے ہوئے ہی آگے بڑھ رہے تھے، تاکہ کسی کی اتفاقیہ بھی نگاہ ہم پر نہ پڑسکے اور اگر پڑ بھی جائے تو ہم پہچانے نہ جاسکیں، لیکن میں نے دیکھا کہ اول خیر کسی کے ساتھ جنگ آزمائی میں مصروف تھا، میرا ماتھا ٹھنکا۔ گویا خطرہ آگے نہیں ہمارے پیچھے بھی دبے پاؤں چلا آرہا تھا۔ میں نے یک دم پیچھے کی جانب دوڑ لگادی۔ اول خیر اپنے حملہ آور کے ساتھ پوری طرح بھڑا ہوا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری آمد کا کسی کو علم ہوسکے۔ قریب پہنچتے پہنچتے ایک موقع پر میں نے اس نامعلوم حملہ آور کو اول خیر کے نرغے میں دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے میں بدک گیا۔ حملہ آور نے چشم زدن میں چاقو نکال لیا تھا۔ اول خیر کی شاید اس پر نگاہ نہ پڑسکی تھی۔ حملہ آور اس کے نرغے میں اپنی گردن کو چھڑانے کی کوشش میں تھا اور تب ہی مجھے اس کی خطرناک چال کا احساس ہوگیا۔ جیسے ہی اس نے اول خیر پر یہ چھپا ہوا اور اذیت ناک وار کرنا چاہا،

میں ان کے سر پر پہنچ گیا تھا اور میری لات حرکت میں آچکی تھی جو اس خطرناک حملہ آور کے پہلو پر لگی، وہ اول خیر کی آہنی گرفت سے نکل کر زمین پر لڑھکتا چلا گیا۔ اول خیر کو میری اس حرکت پر حیرت ہوئی ہوگی، مگر جب اس نے حملہ آور کے ہاتھ سے چمکتے ہوئے پھل والا مہیب چاقو بھی چھوٹ کر گرتے دیکھا تو اپنی بھویں اُچکا کر رہ گیا اور جان گیا کہ وہ حملہ آور کے ایک انتہائی سفاک وار سے بال بال بچا تھا۔

اُدھر حملہ آور نے اُٹھنے میں غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرنا چاہا تھا مگر میری دوسری لات اس کی ٹھوڑی پر پڑی تھی۔ وہ پھر اُلٹ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔

''کون ہو تم؟ سچ بتاؤ...... ورنہ اِدھر ہی تاریکی میں مارے جاؤ گے۔'' میں نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ اول خیر نے اس کا چاقو قبضے میں کر لیا تھا۔

''تم کون ہو......؟'' اس نے ہانپتے ہوئے اُلٹا سوال داغ ڈالا...... جس پر میرا دماغ بھنا گیا اور میں نے اس کے چہرے پر ایک زوردار گھونسا رسید کر ڈالا۔ اس کے حلق سے اُوغ کی کریہہ ناک آواز خارج ہوگئی۔ وہ ہانپنے لگا۔ میں نے اس بار دوسرا گھونسا اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ وہ وہیں لم لیٹ ہوگیا۔ اس کے بے حس و حرکت جسم کو میں نے کنارے پر ڈال دیا اور اول خیر کے ساتھ اب تقریباً دوڑتا ہوا اس مکان کے پاس آگیا۔ جس کے بارے میں سیٹھ نوید نے مجھے اپنا ساتھی سمجھ کر بتایا تھا اور یقیناً حفظِ ماتقدم کے تحت اسی نے ہی ایک آدمی کو باہر گلی میں کہیں پوشیدہ کھڑے ہونے کا حکم دے رکھا تھا کہ آنے والوں پر نگاہ رکھے اور وہ یہی کر رہا تھا کہ اول خیر کے ہتھے چڑھ گیا۔

ہم دروازے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ وہ ایک دم کھلا اور اس کے اندر سے دو افراد برآمد ہوئے۔ ڈیل ڈول میں یہ دونوں صحت مند تھے مگر قد و قامت میں مجھ سے دبتے ہوئے، ہمیں عین دروازے پر کھڑا دیکھ کر وہ پل کے پل ہونق سے بن گئے، مگر دوسرے ہی لمحے میں دونوں کے ہاتھ بیک وقت بغلوں کی جانب سرکے، شاید انہوں نے بغلی ہولسٹر چڑھا رکھے تھے۔ ایسے میں اول خیر اور میرا بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آنا یقینی امر تھا اور ہم دونوں ہی ان پر قہر بن کر ٹوٹے۔

انہیں رگیدتے ہوئے ہم اندر صحن میں آگئے۔ دروازہ پیچھے کھلا پڑا رہ گیا۔ اندر روشنی تھی۔ صحن پختہ اور زیادہ کشادہ نہ تھا، جبکہ باہر بچھی ایک چارپائی پر مجھے نوید سانچے والا سگریٹ پیتا ہوا دکھائی دیا جو اس اکھاڑ پچھاڑ میں یک دم چارپائی سے اُچھل کر کھڑا ہوگیا اور اندر ایک کمرے کی طرف بھاگا جس کا دروازہ ذرا ہی بھڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنے مدِمقابل کا سر پختہ اینٹوں والے فرش پر بجایا اور اسے بے حرکت پا کر اُٹھ دوڑا۔

نوید ابھی کمرے کے دروازے کو دھکا دے کر اندر داخل ہوا ہی تھا کہ میں اس کے پیچھے، بلکہ سر پہ ملک الموت بنا جا پہنچا۔ تب ہی اندر مجھے ایک چونکا دینے والا منظر دکھائی دیا۔ چارپائی پر عارفہ...... رسن بستہ حالت میں جکڑی لیٹی پڑی تھی۔ اس کی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی اور بال یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے اسے ہذیانی اور ہسٹریائی دورے پڑتے رہے ہوں اور وہ اپنے آپے میں نہ رہی ہو، اس کے منہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی، وہ بولنے سے بھی قاصر تھی، سرِدست نیم بے ہوشی کی حالت میں ہی نظر آتی تھی۔ اس اکھاڑ پچھاڑ میں اسے بھی کچھ ہوش آگیا تھا۔ قریب چارپائی پر ایک گن پڑی تھی، نوید سانچے والا اسے ہی اُٹھانے کے لیے لپکا تھا کہ میں نے اسے دبوچ کر اس کا سر منجی کے ٹھوس چوبی پائے سے ٹکرا دیا۔ اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ بلند ہوئی اور خون بہہ نکلا۔

کمرے میں ایک ہی بلب روشن تھا اور اسی روشنی میں عارفہ چارپائی میں جکڑبند پڑی پھٹی پھٹی وحشت زدہ آنکھوں سے میری طرف تکے جا رہی تھی اور پھر نجانے اسے کیا ہوا کہ وہ بری طرح تڑپنے لگی، اُچھلنے لگی...... حلق سے اس کے بے معنی سی ''غوں... غاں'' بھی خارج ہونے لگی۔ بے حد قابلِ رحم حالت میں...... مجھے نظر آرہی تھی وہ اس وقت......

اُدھر...... نوید سانچے والا اپنے پھوٹے ہوئے سر کے ساتھ پھر اپنی گن کی طرف لڑھکنے لگا، مگر میں نے اسے پھر پاؤں کی ٹھوکر رسید کر ڈالی۔ وہ پرے جا لڑکھڑایا اور دیوار سے جا لگا۔ اسی وقت اول خیر ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔ اس کی جب نظر چارپائی پر بندھی عارفہ پر پڑی تو بے اختیار اس کے حلق سے ''او خیر......'' برآمد ہوا تھا۔ اس نے ایک طرف کونے میں دبکے ہوئے زخمی نوید سانچے والے کو بھی دیکھا۔

''اول خیر! باہر والے نمٹا لیے......؟ یا کوئی باقی ہے ابھی......؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''سب نمٹا لیے...... اب یہ بھی نمٹا دو جلدی تو نکل چلیں......'' وہ بولا۔

''کہیں نہیں جانا ہے۔ تم اِسے کھولو، میں جب تک اسے دیکھتا ہوں......'' میں نے گمبھیر لہجے میں اول خیر سے کہا

اور وہ مجھے کچھ اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ لیکن میں تب تک نوید کی طرف قدم بڑھا چکا تھا۔ اس کی تلاشی لینے پر وہ کسمسانے لگا۔ میں نے فوراً اس کی جیب سے اس کا سیل فون نکال لیا۔ تب تک اول خیر عارفہ کو جکڑ بندوں سے آزاد کرا چکا تھا۔ اس کا آزاد ہونا تھا کہ اس نے کسی زخمی ناگن کی طرح حلق سے پھنکار جیسی آواز خارج کی، اول خیر کو بڑے زور سے ایک طرف دھکا دیا، وہ بے چارہ بھی منجی کی پائینتی پر ٹکا بیٹھا تھا کہ ایک طرف کو جا لڑھکا۔ اس حملے کے لیے وہ کب تیار تھا یا اُسے کب عارفہ سے ایسی توقع ہو سکتی تھی، اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور دھڑام سے کمرے کے فرش پر آرہا۔ عارفہ زخمی شیرنی کی طرح چارپائی سے چھلانگ مار کر اُتری اور سیدھی نوید سانپے والا پر آ پڑی۔ اس نے نوید کے چہرے پر اپنے لانبے لانبے ناخنوں سے کھرونچے ڈال دیے۔ وہ درد و اذیت سے پہلے ہی نڈھال تھا۔ عارفہ کے تیز نکیلے ناخنوں نے اس کے مکروہ چہرے پر سرخ لکیریں کھینچ ڈالیں...... اس قدر زور لگا کر اور گویا اپنے اندر کی نفرتوں کو لاوے کی صورت اُگلتے ہوئے...... اس نے طاقت کا بھرپور استعمال اپنے تیز اور نکیلے ناخنوں سے کیا تھا کہ نوید کا چہرہ خون کی چھپڑی بن کر رہ گیا۔

یوں لگتا تھا جیسے اس کے چہرے کا سارا گوشت ہی اُدھیڑ ڈالا ہو۔ مگر عارفہ کا اُبال، طیش اور غضب ناکی پھر بھی کم نہ ہوئی تو اس نے اپنا منہ پھاڑ کر نوید کے گال پر کاٹ ڈالا، اور اس کے چہرے کا گوشت نوچنے لگی دانتوں سے...... اس کی جنونی کیفیات کو دیکھتے ہوئے میں نے عارفہ کو کاندھے سے پکڑ کر نوید سے الگ کیا۔ نوید کی چیخیں اُبل رہی تھیں۔ مگر عارفہ کا جنون، خرد کو کسی آگ کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ میرے زور لگانے پر وہ ہٹی تھی مگر پھر پاگلوں کی طرح غراتی ہوئی نوید پر پل پڑی۔ اس کا منہ خون سے سرخ ہو رہا تھا۔

''مم...... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی ذلیل، کمینے کُتّے! تیری بوٹیاں کھا جاؤں گی میں...... تیری خاطر میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ سب کو بھولا، جھٹلایا چھوڑا مگر تو نے اس کا مجھے کیا صلہ دیا۔ سوائے مجھے اب تک کھلونا بنانے کے...... اور اب میری اور میرے بچوں کی جان بھی لینے کے درپے تھا۔ میں تیری بوٹیاں کھا جاؤں گی۔'' وہ جوشِ جنوں کے مارے پاگل سی ہوئی جا رہی تھی۔ اس بار اس نے نوید کی گردن پر منہ مارا اور اگر میں نے عارفہ کو بالوں سے پکڑ کر بروقت پرے نہ کھینچ لیا ہوتا تو وہ اس کا نرخرہ اُدھیڑ ہی ڈالتی۔ تب ہی میں نے اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی اور وہ ایک طرف فرش پر پڑی ہانپنے لگی۔ ہانپنے کے دوران اس کے حلق سے عجیب سی غراہٹ سے مُشابہ آوازیں بھی خارج ہونے لگی تھیں۔

کہاں تو وہ نوید کو اپنا سب کچھ سمجھے ہوئے تھی۔ اس کی خاطر اس نے اپنے فرشتہ صفت سسر سرمد بابا کی جان لی۔ عابدہ کو اپنے مفاد اور بعد میں نوید کے ہی ایما پر امریکی درندوں کی بھینٹ چڑھایا اور آخر میں اپنے اسی محبوب کی خاطر اپنے دونوں بچوں کو بھی بھلا بیٹھی تھی، لیکن...... جب اسے اپنے محبوب کا اصل اور بھیانک چہرہ نظر آیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ کبھی کبھی محبت میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ محبت ایک طاقت ور جذبہ سہی، لیکن اگر یہی محبت نفرت کا لبادہ اُوڑھ لے تو پھر وہ محبت جیسے لازوال جذبے پر بھی حاوی ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ غالباً عارفہ کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

''اِسے سنبھالو اول خیر! میں تب تک کسی سے بات کر لوں......'' میں نے اول خیر سے کہا اور عارفہ کی طرف اشارہ کیا۔

''کس سے بات کرنا چاہتے ہو؟'' اول خیر نے پوچھا۔

''پولیس اسٹیشن!'' میں نے جواب دیا تو نڈھال پڑے نوید سانپے والا کے کان میں بھی یہ لفظ پڑا۔ وہ جیسے تکلیف بھلا کر بمشکل ایک ہاتھ اُٹھا کے مجھے روکنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''ٹھ...... ٹھہرو......! پپ...... پولیس کو مطلع مت کرو، شاید میرا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ میری آج سے دشمنی بھی ختم...... مجھے جانے دو، میں تمہیں منہ مانگی رقم دوں گا۔''

''او...... خیرا!'' اس کی بات پر اول خیر کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا جبکہ میرے چہرے پہ ایک زہرخند مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ تب ہی میرے بجائے اول خیر نے، عارفہ کو ایک ہاتھ سے سنبھالتے ہوئے فرش پر بکھرے پڑے نوید سانپے والا سے کہا۔

''اوئے! نودولتیے سیٹھ! تیری یہ دکان داری اپنے شہزی کا کا کے سامنے نہیں چل سکتی۔ شہزی نے اگر یہ کام کرنا ہوتا تو تیری یہ آفر تو ان کے سامنے کوڑیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جو اسے پہلے بھی اس کے مقابلے میں جانے کتنی بڑی بڑی اور بار بار ملتی رہی ہیں۔ یہ اگر پیسوں کے ترازو میں تولا جا سکتا ہوتا تو آج آرام سے کسی محل میں بیٹھا عیش کی زندگی گزار رہا ہوتا۔''

''مم...... میں دس کروڑ دینے کو تیار ہوں......'' سیٹھ

نوید ہکلایا۔

''دس کروڑ جمع دس بھی کردو تو بھی کم ہیں۔ نوید مردود سیٹھ!'' اول خیر غرایا۔ ''جانتے نہیں ہو تم کہ شہزی کس کا بیٹا ہے؟ جو نہ جھکنا جانتے ہیں نا بکنا۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''کھڑکا دے فون پولیس اسٹیشن۔''

میرے چہرے پہ ہنوز زہرخند مسکراہٹ طاری تھی۔ نوید کا سیل فون میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ ''مجھے اس کی بات سن لینے دو اول خیر......!'' میری بات پر اول خیر کے چہرے پر پہلے تو ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس کے بعد معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

''ششش...... شہزی! اس کمینے کی کوئی بات مت سننا! فوراً پولیس کو فون کرو۔ مت آنا اس دغاباز کے جھانسے میں......'' عارفہ فوراً چلّا کر بولی تو میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کاٹ دار طنز سے کہا۔

''بہت جلدی آپ کو اس دغاباز کی اصلیت کا پتا چلا ہے میڈم! آپ نے تو اس کے ہاتھوں میں کھیل اور کھلونا بن کر اپنے محسنوں کو بھی دغا دے ڈالا، دیکھ لو اب یہ نہ صرف تمہاری بلکہ تمہارے اُن دونوں معصوم بچوں، دانی اور پنکی کی بھی جان لینے کے درپے تھا۔''

میری بات پر عارفہ کے ستے پڑے چہرے پر ندامت اور شرمندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے بچوں کے ذکر پر فکرمندی سے بولی۔

''پپ...... پنکی اور دانی کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟''

''وہ بالکل محفوظ ہیں۔ شکر کرو کہ میں نے بروقت اس خبیث کی اس آخری سازش کا وہ تار ڈھونڈ لیا جس میں جکڑ کر یہ تم سمیت پنکی اور دانی کو بھی جکڑ ڈالنا چاہتا تھا۔''

اس کے بعد میں نے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے نڈھال سے پڑے سیٹھ نوید کی طرف دیکھا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا کہتے ہو نوید سیٹھ! اس فقیروں والی حالت میں اب تم خود کو کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''تت...... تم جو چاہو گے وہی ہوگا...... لل...... لیکن مجھے پپ...... پولیس کے حوالے مت کرو۔'' وہ گڑگڑایا۔

''تو پھر میری ایک بات کا سچ سچ جواب دو۔'' میں نے کہا۔

''میں تیار ہوں۔''

''لولوش اور وزیر جان کے بارے میں مجھے بتاؤ......''

''لولوش کچھ دنوں پہلے نیویارک میں تھا، اب وہ برمودا کے ایک جزیرے ''نگی تا'' میں اپنے محل میں رہتا ہے جبکہ وزیر جان کو اس نے کچھ عرصہ پہلے اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ اب پاکستان میں ہی کہیں موجود ہے۔'' سیٹھ نوید فرفر بتانے لگا۔ میں نے کہا۔

''تمہارے لولوش کے ساتھ کس بنیاد پر تعلقات استوار ہوئے تھے؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔ اگرچہ مجھے کچھ اندازہ تو تھا مگر اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

''اڑیسہ کمپنی کے حصص کا حصول، تمہاری موجودہ سرگرمیاں اور...... اور وہ طط...... طلسم نور ہیرا، اس سے متعلق ایک ایک رپورٹ اس تک پہنچانے کے لیے میں اس کا جاسوس بنا ہوا تھا۔''

''تو اب تک تم نے اسے کیا رپورٹ دی؟''

''وہی جو میں جانتا تھا۔ تمہاری پاکستان اور ملتان میں انٹری، نوشابہ اور چوہدری ممتاز کے خلاف جوابی پریس کانفرنس اور طلسم نور ہیرے کی حکومت کو حوالگی کے متعلق وہ سب کچھ بتا ڈالا تھا میں نے اسے۔''

''ہم......'' میرے حلق سے پُرسوچ ہمکاری خارج ہوئی۔

''تمہارا لولوش سے رابطہ کیسے ہوتا ہے؟ فون پر یا اور کوئی ذریعہ ہے؟''

''شہزی! میں سب کچھ جانتی ہوں۔ تمہیں اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔'' عارفہ نے پھر اپنی ٹانگ اڑائی۔ میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور جھڑکا۔

''تم ابھی اپنی زبان بند رکھو۔ جب وقت آئے گا تو میں تم سے بھی پوچھ لوں گا۔'' وہ خاموش ہوگئی۔ وہ بالکل ٹوٹ چکی تھی۔ اسے اب اپنے بچوں کی فکر ہو رہی تھی۔

''ہاں! تم جواب دو میری بات کا......'' میں نے نوید کی طرف گھورا۔

''مجھے میرے بنگلے پر لے چلو...... میں وہاں تمہیں سب سچ سچ بتا دوں گا۔'' وہ بولا۔ اسی وقت اول خیر نے میرے قریب آکر کان میں سرگوشی کی۔

''اوئے کاکے! اس کے جھانسے میں مت آنا، یہ اس وقت رنگے ہاتھوں ہماری گرفت میں ہے۔ اپنے بنگلے پر جا کر یہ پتھر کی طرح بھاری پڑ جائے گا۔ جو پوچھنا ہے اِدھر ہی پوچھ لے، پر یہ انٹرویو بن چھیتی نال مکا لے (جلدی ختم کر لے) اس وقت اس کے سارے گماشتے ہمارے قبضے میں ہیں۔''

سیٹھ نوید کی یہ چالاکی تو میں بھی سمجھ گیا تھا۔ ''میرے پاس وقت کم ہے نوید! آخری سوال کا جواب دو......''

وہ اپنے خون آلودہ چہرے کو ہاتھ سے پونچھتا ہوا بولا۔ ''میں اب تمہارے سوالوں کے جواب اپنے بنگلے پر ہی دوں گا۔'' وہ جیسے ایک دم اڑ گیا۔

''اس کے پاس ایک بلیک بیری موبائل ہے اور اسی میں ہی لولوش کا پرسنل نمبر سیو ہے۔ وہ اس کی رہائش گاہ میں پڑا ہے۔'' عارفہ نے فوراً جواب دیا۔

''اوکے! تم سب جانتی ہو تو پھر وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔'' میں دانستہ یہ کہتے ہوئے بظاہر نمبر پنچ کرنے لگا۔ مگر میں یہ نوید کو دکھاوے کے لیے کر رہا تھا۔

''تت...... تم یہ نہیں کرسکتے۔ یاد رکھو! اگر میں گرفتار ہو گیا تو تمہاری عابدہ بھی نہیں بچے گی۔'' اس مردود نے چلّا کر کہا۔ وہ بے بس تھا اور اب میری کمزوری سے کھیلنے لگا تھا۔ عابدہ کے ذکر پر میرے اندر ایک اذیت ناک سا چھناکا ضرور ہوا مگر میں نے بظاہر بے نیازی سے کہا۔

''وہ اس وقت لولوش کی قید میں نہیں، کورکوران کی جیل میں ہے۔ عارفہ اب میرے ساتھ ہے اور میں اس کے ذریعے امریکا میں بہ آسانی عابدہ کے حق میں مقدمہ لڑوں گا۔'' میں نے یہ اس کے منہ سے اُگلوانے کے لیے کہا تھا۔ جس کا فوراً خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا، کیونکہ بہت سی باتیں ایسی ہوسکتی تھیں جو نوید نے ظاہر ہے کہ عارفہ سے بھی مخفی رکھی ہوں گی۔

''ہاہا...... ہاہا......'' نوید سانپ والا نے ایک بدمست قہقہہ خارج کیا اور اسی لہجے میں بولا۔ ''بڑی خوش فہمی ہے تمہیں......''

''کیا مطلب......؟'' میں نے سیل فون اپنے چہرے سے ہٹا کر اس کی طرف چونکنے کے انداز میں دیکھا تھا۔ یہ میری اداکاری تھی۔

وہ بولا۔ ''تمہیں شاید نہیں معلوم کہ...... عابدہ کا مقدمہ سی آئی اے کے ایک خطرناک ونگ ''ٹائیگر ٹیگ'' کے سربراہ کے ہاتھ میں ہے۔ باسکل ہولارڈ نام ہے اس کا اور لولوش اس کا لاڈلا داماد ہی نہیں بہت سے اہم منصوبوں میں وہ اس کا دستِ راست بھی ہے۔ کورکوران کی جیل میں صرف باسکل ہولارڈ کا حکم چلتا ہے، اس بھیانک جیل کی لیڈی وارڈن مس لیڈی بوسکی ایک خرانٹ بڈھی چڑیل ہے۔ وہ ایک ریٹائرڈ آرمی آفیسر رہ چکی ہے۔ اُسے باسکل ہولارڈ یا لولوش جیسا کہیں گے وہ وہی کرے گی۔ تم نے طلسم نور ہیرا حکومت


اکتوبر 2017 کا خوبصورت شمارہ ایک نظر میں

یکتارا

آسمان سے ٹوٹے ایک تارے کی روداد جس نے محبت میں خود کو فنا کر ڈالا...... آخری صفحات پر **عبدالرب بھٹی** کے قلم کی پرواز

شام شب

**ڈاکٹر ساجد امجد** کے قلم سے تاریخ کے خاموش اور گمشدہ لمحات کا دلفریب احاطہ

باغی

ایک نڈر اور بے باک انسان کے کارناموں کا اگلا پڑاؤ...... سازشوں کی گرہیں کھولتی ایک خوبصورت داستان

وقت

دھیرے دھیرے گزرنے والے لمحات میں طوفان کی آہٹ...... **حسام بٹ** کے خیالات کی روانی

اس کے علاوہ

ثمر عباس۔ محمد یاسر اعوان، محمد فاروق انجم، تنویر ریاض۔ محمد الیاس اور اسما قادری کی خوبصورت کہانیاں

تان کے حوالے کر کے بہت بڑی غلطی کر ڈالی ہے۔ للہ اس ہیرے کے بدلے وہ تم سے عابدہ کی واپسی کا طالبہ کرنے والے تھے۔ لیکن خیر! طلسم نور ہیرے کا دوبارہ حصول تمہارے لیے کیا مشکل ہے، جسے تم انڈیا کے پُرخطر علاقے اور دلدلی جزیرے سے اُڑا لائے ہو تو پاکستان کیا شے ہے۔"

اس مردود کے منہ سے وطنِ عزیز پاکستان کے بارے میں ایسے الفاظ سن کر میرا دماغ بھک سا اُڑ گیا۔ یہ غدارِ وطن تھا جو اپنے منہ سے اعتراف کر چکا تھا کہ وہ ملکی دشمن عناصر کا ایجنٹ بن چکا تھا۔ میں غیظ و غضب سے بھر کر آگے بڑھا اور اپنے بوٹ تلے اس کی گردن لے کر اس کا چہرہ دیوار سے ٹکا دیا۔

"خبردار! اگر دوبارہ میرے وطن کے لیے ایسے گندے الفاظ استعمال کیے۔ تم جیسے ضمیر فروش ہی یہاں بیٹھے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ یاد رکھو! میں اپنے وطن پر ہزاروں عابدائیں قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، مگر قومی اور ملکی امانت کبھی بھی دشمنوں کے حوالے نہیں کروں گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ عابدہ بھی کبھی یہ نہیں چاہے گی کہ اس کی رہائی اور واپسی کے بدلے میں اس کے پیارے وطن کی امانت کا سودا ہو۔ وہ اس کے بدلے میں موت کو گلے لگانا پسند کرے گی۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔ میری رگوں میں کس غیور اور سرفروش باپ کا خون گردش کر رہا ہے۔"

آتشِ لہو رنگ میں یہ الفاظ اس سے کہنے کے بعد میں نے اس کی گردن سے بوٹ ہٹا لیا۔

"تو پھر بھول جاؤ عابدہ کو......" نوید سانچے والا ہانپتے ہوئے بولا اور اپنی گردن مسلنے لگا۔

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ پہلے میرا ارادہ پولیس اسٹیشن فون کرنے کا تھا مگر اب اس مردود کی باتیں سن کر میں نے وہ بدل دیا اور میجر وسیم بھٹی کے دیے ہوئے ہاٹ لائن نمبر پر میں نے فون کر دیا اور مختصر الفاظ میں انہیں سب بتا ڈالا۔ اس مکان کا اتا پتا دینے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

جب نوید کو یہ پتا چلا کہ میں اسے پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے پاک رینجرز کے ایک خصوصی ونگ کے حوالے کرنے والا ہوں تو اس کی حالت پہلے سے زیادہ غیر نظر آنے لگی، وہ پاگل جنونیوں کی طرح چلّانے اور مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا جس میں عابدہ کا حوالہ بھی شامل تھا۔ میں نے کوئی پروانہ کی اور اول خیر کو اس کُتّے کا منہ بند کروانے کے لیے خفیف اشارہ کر دیا۔ اس نے عارفہ کو چھوڑا اور نوید سانچے والا کی دھنائی کر ڈالی۔

اگلے ڈیڑھ سے دو گھنٹوں کے اندر اندر نوید سانچے والا اور اس کے تمام ساتھی راٹھور وغیرہ سمیت اس حساس ادارے کی گرفت میں آچکے تھے۔

اگرچہ اس میں عارفہ کا بھی مشورہ شامل تھا کہ پہلے نوید سانچے والا کے بنگلے پر جا کر وہاں سے اپنا ضروری سامان سمیٹ لیا جائے اور بلیک بیری والا وہ موبائل سیٹ بھی لے لیا جائے جس سے نوید سانچے (اور عارفہ بھی کبھی کبھی اس سے بات کر لیا کرتی تھی) لولوش سے رابطہ کرتا تھا۔ یہ ارادہ میرا بھی تھا لہٰذا ہم نے ایسا ہی کیا۔ سیٹھ نوید کا بنگلا سیل کرنے سے پہلے عارفہ نے اپنے چند کاغذات، سامان اور بلیک بیری کا وہ خاص موبائل سیٹ فون قبضے میں کر لیا تھا۔

اس کے بعد میں اور اول خیر عارفہ کو لیے بیگم ولا پہنچے تو اپنے بچوں کو سلامت دیکھتے ہی عارفہ بے اختیار ان سے لپٹ کر رو پڑی۔

اس کے بعد جب جذبات کا یہ طوفان تھما تو عارفہ میرے قدموں میں گر پڑی، لیکن میں نے اسے بازوؤں سے تھام کر کھڑا کر دیا۔ اس کا چہرہ اشکِ ندامت و شرمندگی کے باعث بری طرح سرخ ہو رہا تھا۔

"میں نے خود کو بہت گرا لیا شہزی! کہ اب تو میں اپنا سر اُٹھا کر کھڑی ہونے کے لائق بھی نہیں رہی...... کاش! میں اپنے ہاتھوں سے خود کو زندہ دفن کر ڈالتی۔ میں تو...... میں تو تم سے معافی مانگنے جیسا منہ بھی نہیں رکھتی۔ تم ایک عظیم انسان ہو، تم ہمیشہ ہی میرے ساتھ میری برائیوں کے بدلے میں بھلائی کرتے رہے، جس کا ثبوت تمہارے پاس موجود میرے یہ دو بچے ہیں۔ میں کیسی احسان فراموش نکلی کہ...... تم نے اپنی محبوب ہستی، اور اپنی محبت تک کو انسانی ہمدردی تلے قربان کر ڈالا اور میں نے کیا کیا۔ اپنے ہی محسنوں کی قبر کھودتی رہی۔ میں کیا کہوں اب شہزی کہ میرے گناہوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ...... اب تم مجھے اللہ کی خاطر معاف کر بھی ڈالو، جس کا مجھے پورا یقین بھی ہے تو تب بھی شاید ہی میرے دل کو...... میری روح کو سکون نہ مل پائے...... میں اب تا عمر ہی اپنے ضمیر کی قبر میں زندہ ہی دفن رہوں گی۔ لیکن...... پھر بھی...... کچھ بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر میں تم سے معافی کی درخواست ضرور کروں گی۔ ہو سکے تو اس بدنصیب اور آنکھوں والی ایک اندھی، ضمیر کی اپاہج اور ملعون عورت کو معاف کر دینا۔"

عارفہ یہ کہہ کر سر جھکائے میرے سامنے کھڑی رہی۔

اس وقت کمرے میں ہم سب ہی موجود تھے۔ زہرہ بانو، کبیل دادا، اول خیر، شکیلہ اور...... پنکی، دانی بھی......

کمرے کی فضا میں ایک جذبات انگیز سی رقت گھلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ سب کی نظریں اب رنجور اور شرمندہ، سر جھکائے کھڑی عارفہ سے ہٹ کر میری طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔

میں نے ایک گہری ہمکاری اپنے حلق سے خارج کی اور بالآخر اپنے سیدھے ہاتھ کے ارتعاش پر قابو پاتے ہوئے عارفہ سے مخاطب ہوا۔

''عارفہ! انسان ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتا ہے اور انسان تو ہے ہی خطا کا پتلا۔ لیکن اصل انسان وہی ہوتا ہے جو ٹھوکر کھا کر نہ صرف سنبھل جائے بلکہ سچی نیت اور دل سے اپنا محاسبہ بھی کر ڈالے تو وہ پھر خطا کار نہیں رہتا۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تم نے بغیر کسی اپنے...... بڑے اور ناقابلِ تلافی نقصان کے خود کو سنبھال لیا۔ آپ آج بھی میرے لیے اس عظیم انسان سرمد بابا کی قابلِ احترام بہو ہیں اور میری بہن بھی۔ معلوم ہے ناں آپ کو کہ سرمد بابا کے ساتھ میرا کیا رشتہ تھا اور یہ بھی پتا ہوگا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی بے حسی کے باوجود آپ کی ایک مصیبت پر...... مدد کرنے کے لیے...... اطفال گھر کے ''اولڈ ہاؤس'' سے آپ کے ہاں چلے آئے تھے۔ چھوڑیں اب اِن باتوں کو...... میں نے آپ کو معاف کیا اور اللہ سے بھی میری دست بستہ دعا ہے کہ وہ بھی معاف فرمائے۔''

میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ دھیرے سے اس کے سر سے ہٹا لیا۔ وہ میرے ان الفاظ پر بری طرح چھلک پڑی اور صوفے پر جا کے گر سی گئی۔ وہ سر جھکائے زار و قطار رو پڑی۔ پنکی اور دانی ''مما'' کہتے ہوئے اس کی جانب بڑھے تھے۔ خود میں اپنی گردن موڑے دو قدم پر رکھی ہوئی ایک کرسی پر گرنے کے انداز میں جا بیٹھا تھا۔ شکیلہ، عارفہ کو سنبھالنے کے لیے بڑھی تھی جبکہ زہرہ بانو میری جانب لپکی اور میرے قریب آ کر اپنا ایک ہاتھ ہولے سے میرے کاندھے پر رکھ کر تھپتھپانے لگی۔ ان کا انداز مجھے حوصلہ دینے کا سا تھا۔ کیونکہ میں خود بھی رنجور تھا۔

ندامتوں اور شرمندگیوں کی زیادتی کے سبب عارفہ سے مزید کچھ نہیں بولا گیا۔

شکیلہ، عارفہ کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اس نے اول خیر کو پانی کا ایک گلاس لانے کا اشارہ کیا تھا۔ جو وہ فوراً ہی قریب رکھے جگ سے بھر لایا تھا۔

کمرے کی مغموم سی فضا کچھ دیر بعد سنبھلی تو پنکی کی آواز اُبھری...... وہ اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی۔

''مما! خدا کا شکر ہے کہ آپ کی جان بچ گئی اور یہ سب کچھ شہزی انکل کی وجہ سے ہی ہوا ہے، وہ لوگ تو میری اور دانی بھائی کی جان کے بھی دشمن بن چکے تھے۔''

اس کی بات پر مجھے... اچانک یاد آیا اور میں نے پنکی کو مخاطب ہو کے کہا۔

''ہاں! پنکی بیٹا! مجھے یاد آیا، تم نے کوچنگ سینٹر میں مجھ سے یہ بات کہی تھی۔ کیا اس بات کی ہمیں تھوڑی تفصیل بتا سکتی ہو کہ تمہیں کیسے ان ساری حقیقتوں کا پتا چلا تھا؟''

سب پنکی کی طرف دیکھنے لگے، عارفہ نے بھی اب اپنا اشکبار سا چہرہ اُٹھا لیا تھا اور اپنی بیٹی کا چہرہ تکنے لگی۔

''مجھے اور دانی بھائی کو...... وہ آدمی سیٹھ نوید شروع سے ہی بالکل بھی پسند نہیں تھا۔'' پنکی بتانے لگی۔

''دودو جان (سرمد بابا) کو تو وہ آدمی زہر لگتا تھا۔ وہ جب بھی گھر آتا تو ہم دونوں بہن بھائیوں سے فری ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر ہم اسے بالکل بھی لفٹ نہیں کراتے تھے۔ مما ہمیں اس رویے پر ڈانٹتی تھیں۔ مگر ہم نے کوئی پروا نہ کی۔ مما نے جب اس آدمی سے شادی کر لی تو میں اور دانی مما سے ناراض ہو گئے۔ پھر جب وہ دونوں ہنی مون منانے کے لیے بیرونِ ملک جانے لگے مما نے ہمیں یہ بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ کون سے ملک جا رہے ہیں؟ کبھی تھائی لینڈ کہتے تو کبھی ہانگ کانگ...... خیر ہمیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ غصہ تو ہمیں اس وقت مما پر اور زیادہ آیا جب انہوں نے بتایا کہ وہ ہماری حفاظت کے لیے راٹھور انکل کو چھوڑے جا رہی ہیں۔ ہم نے کوئی توجہ نہ دی، پھر مما اپنے شوہر نوید کے ساتھ چلی گئیں۔

''ہمیں تو راٹھور جیسے آدمی کو دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ اس کے ہمراہ اسی قبیل کے آدمی بھی تھے۔ چار پانچ ہی تھے وہ۔ وہ سب مجھے بدمعاش نظر آ رہے تھے۔ ہماری ان سے روز تُو تُو میں میں ہونے لگی۔ ہم نے بھی ان کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ انہوں نے حفاظت کے نام پر ہمیں قیدی بنا کر رکھ دیا تھا۔ کہیں آنے جانے نہیں دیتے تھے۔ جانا ہوتا تو ان کا کوئی آدمی ساتھ ہوتا۔ دانی کو ان پر جلدی غصہ آ جاتا تھا۔ ایک دن اس نے راٹھور اور اس کے کسی آدمی کے ساتھ بدتمیزی کر ڈالی۔ انہوں نے اسے مارا تو مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا مما سے میری بات کرواؤ...... انہوں نے انکار کر دیا

اور مجھے بند کر دیا۔ تب ہی میں نے ان کے دو ساتھیوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا تھا، وہ کہہ رہے تھے کہ نجانے کب ان دونوں شیطانوں سے نجات ملے گی۔ تو دوسرے ساتھی نے کہا۔

''بہت جلد، سیٹھ صاحب اپنی نئی نویلی بیوی کو ٹھکانے لگانے ہی والا ہے۔ اس کے بعد ان دونوں شیطانوں کی (ہماری) باری آئے گی۔''

''میں بس ان کی اتنی ہی بات سن سکی تھی اور میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ مجھے ددو جان کی بات یاد آ گئی تھی جب انہوں نے مما سے ناراض ہو کے یہ نصیحت کی تھی کہ نوید تمہیں کسی دن بہت بڑا نقصان پہنچائے گا جس کی تلافی بھی ممکن نہ ہو گی، وہ ایک سازشی ذہن کا کمینہ اور عیار انسان ہے۔

''مجھے مما کی فکر ہونے لگی۔ سمجھ گئی تھی میں کہ نوید سانچے والا مما کو ہنی مون کے لیے کسی خاص مقصد کے لیے ہی لے کر گیا ہے..... دانی کو حقیقت تو نہیں بتائی تھی، ایک تو اس وجہ سے کہ کہیں یہ خوف زدہ ہو کر کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے دوسرے یہ غصے اور جوش کا تیکھا ہے، کہیں بول ہی نہ دے ان کے سامنے کہ وہ ہمارے خلاف کیا سازش تیار کر رہے ہیں۔

پنکی نے اتنا بتا کر تھوڑا توقف کیا اس کے بعد مزید بتانے لگی۔

''میں نے اکثر مما اور نوید سانچے والا کو ددو جان کی وصیت کے بارے میں بھی باتیں کرتے سنا تھا۔ ان کی باتوں سے مجھے بھی اس وصیت کا علم ہو چکا تھا۔ مجھے مما اور نوید کی شادی پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ اگر نوید سانچے والا... کو مما کی دولت سے کوئی غرض نہ تھی تو پھر کیوں وہ شادی کرنا چاہ رہا تھا۔ اس چالاک انسان نے مما سے یہی کہا تھا کہ اُسے ان کی دولت کی کوئی پروا نہیں ہے، وہ اب مما کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یوں مما ان پر زیادہ بھروسا کرنے لگیں اور دونوں کی شادی ہو گئی۔

وصیت کے مطابق مما کا پاپا (محمود، عارفہ کا سابقہ مرحوم شوہر) کی دولت و جائداد، جو در حقیقت ددو جان ہی کی کمائی ہوئی تھی، جس پر مما کا تصرف ختم ہو گیا، مگر بعد میں مجھے ان کی باتیں سن کر پتا چلا کہ نوید سانچے والا.... شادی سے پہلے ہی مما سے پاور آف اٹارنی حاصل کر چکا تھا۔ مما اب نوید سانچے والا کے لیے ایک بے کار شے ہو چکی تھیں۔ مگر ان کا دل رکھنے اور اپنی چال کو بغیر کسی ٹکراؤ کے آگے بڑھانے کے لیے مما سے شادی رچالی تھی۔ اب نوید سانچے والا کے لیے ہم دونوں اہم تھے۔

اب اسی سلسلے میں راٹھور اور نوید سانچے والا کی آپس میں ٹیلی فون پر باتیں ہونے لگیں۔ تب ہی مجھ پر ایک اور بات کا بھی انکشاف ہوا کہ...... نوید سانچے والا مما کو ہنی مون کے بہانے کسی اور ملک نہیں گیا بلکہ وہ اسی شہر میں موجود ہے۔ وہ مما کو یرغمال بنائے ہوئے ہے اور اب بہت جلد وہ ہم سے ساری دولت اپنے نام منتقل کروانا چاہتا تھا، بات نہ ماننے کی صورت میں وہ ہمیں مما کو جان سے مارنے کی دھمکی دیتا۔ اسی دن سے میں نے فرار ہونے کا منصوبہ بنالیا، یہ اس سے اگلے دن کا ہی ذکر تھا جب شہزی انکل سے میری ملاقات ہو گئی۔''

پنکی اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔ ہم سب دم بہ خود اس کی بات سنتے چلے گئے۔ پنکی نے اپنی بات ختم کی تو عارفہ ایک بار پھر سسک اُٹھی۔ اس نے بے اختیار پنکی اور دانی کو ممتا بھرے انداز میں خود سے لگالیا اور رُندھے ہوئے لہجے میں بولی..''میرے بچو! تم بھی مجھے معاف کر دینا۔ میں واقعی اپنی بے لگام خواہشات کے آگے تمہیں بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔ اُس مردود انسان نوید نے مجھے اپنا غلام بنا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے خلاف میں کچھ سننا ہی گوارا نہیں کرتی تھی جو میری بہت بڑی غلطی تھی۔''

''مما! آپ پریشان نہ ہوں......اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' پنکی نے ماں سے کہا۔ ''آپ بس ہمارے ساتھ رہیں اور خوش رہیں۔ شہزی انکل کا یہ احسان تو ہم ساری زندگی نہیں بھول سکتے۔'' اس کی بات پر میں نے پنکی سے شفقت بھرے انداز میں کہا۔

''بیٹا! اس میں احسان کی کیا بات ہے، کیا تم اور دانی نہیں جانتے کہ میرا تمہارے ددو کے ساتھ کیا رشتہ تھا! اُنہوں نے مجھے اپنا منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا۔''

کچھ لمحات بوجھل سی خاموشی تلے بیت گئے۔ اس کے بعد عارفہ نے بھی اب تک کے اپنے پیش گزار حالات کے بارے میں کم و بیش وہی کچھ بتایا جو پنکی نے جرأت اور ہمت سے معلوم کیا تھا۔ تاہم عارفہ کے مطابق نوید نے اس سے اپنی چکنی چپڑی باتوں کے ذریعے پاور آف اٹارنی اپنے نام کروایا تھا اور ایسا اس نے کسی وکیل سے..... مشورہ کر کے کیا تھا۔

تھوڑی دیر اور بیت چلی تو...... زہرہ نے شکیلہ کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ عارفہ اور پنکی، دانی کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے بعد زہرہ بانو نے ہولے سے

مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شہزی! یہ تم نے اچھا کیا کہ عارفہ کو معاف کر دیا۔ یہ تمہارا بڑاپن ہے، لیکن شہزی! معافی تلافی کے علاوہ بھی عارفہ پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ کیا اب بھی اس کی گواہی عابدہ کے حق میں بہتر ہوسکتی ہے؟''

زہرہ بانو کی بات پر میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا اور پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''اب وہ وقت گزر چکا۔ عارفہ کی گواہی کی اب کوئی حیثیت نہیں رہی ہے۔ عابدہ کو سزا ہو چکی ہے۔ وہ تمام حقائق اور گواہیاں جو عابدہ کو بچاسکتی تھیں وہ سب پسِ پردہ ہو چکیں۔ اب صرف ایک بڑی جنگ کے ذریعے ہی عابدہ کو رہائی دلائی جاسکتی ہے۔''

''میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ عارفہ اب راہِ راست پر آچکی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ عابدہ کے سلسلے میں اس سے کیا مدد لی جاسکتی ہے؟'' زہرہ بانو نے کہا۔

''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''میرا خیال ہے وہ کوئی خاص فائدہ نہیں دے سکتی اس سلسلے میں...... ماسوائے نوید سانچے والا اور لولوش سے متعلق چند باتوں اور رازوں کے۔''

اس دوران کبیل دادا نے شاید زہرہ بانو کے کچھ بولنے کا لمحہ بھر انتظار کیا تھا، اس کی خاموشی پر وہ ذرا کھنکھار کر بولا...... ''پہلی بات تو یہ کہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے، سیٹھ نوید بھی بالواسطہ سہی، اسپیکٹرم کا ہی ایک ایجنٹ تھا۔ بالکل ہولارڈ سے نہیں تو اس کے کم از کم اسپیکٹرم کے سربراہ لولوش سے تو ضرور رابطے تھے۔ پھر اس کا وہ خصوصی موبائل سیٹ بھی ہمارے ہاتھ لگ چکا ہے۔ جس سے وہ لولوش سے رابطے میں رہا ہے۔ لیکن بات وہی ہے۔ جو کرنا ہوگا ہمیں اپنی صوابدید پر کرنا ہوگا۔ سیٹھ نوید اب کام کا نہیں رہا۔ اس کا باب سمجھو یہاں ختم ہوا۔ خود لولوش کے لیے بھی وہ اب اتنی اہمیت کا حامل نہ رہا ہوگا۔ رہی عارفہ اور اس کے دونوں بچوں کی بات تو وہ اب آزاد ہیں اور یہ اچھی بات ہے کہ عارفہ کو ٹھوکر کھانے کے بعد ہی سہی، عقل آگئی۔ باقی عابدہ بہن کی رہائی کا پلان وہی رہے گا جو بتایا جاچکا ہے۔'' کبیل دادا اپنی بات کہہ کر خاموش ہو رہا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہ تھا کہ کبیل دادا وہ واحد آدمی تھا جو بغیر کسی مبالغہ آرائی اور قیاس آرائی کے ٹھوس بنیادی دلیل کے ساتھ بات کرنے کا عادی تھا اور نہ خاموش رہتا تھا۔ ہم پھر بھی کچھ اندازوں اور پیش آمدہ حالات پر قیاس آرائیاں قائم کرتے تھے، مگر کبیل دادا ایسا ہرگز نہیں کرتا تھا۔ مجھے اس کی بات درست محسوس ہوئی تھی اور کسی حد تک زہرہ بانو بھی اس پر صاد ہی نظر آتی تھی۔

ہم تھوڑی دیر مزید گفتگو کے بعد عارفہ اور اس کے دونوں بچوں کی گھر روانگی سے متعلق پلان کرنے لگے۔

دو دن، تینوں ماں، بیٹا اور بیٹی بیگم ولا میں ہی رہے تھے۔ اس کے بعد میں اور اول خیر شکیلہ سمیت انہیں ان کی رہائش گاہ پر چھوڑ کر واپس ہولیے۔

عارفہ نے کورٹ میں سیٹھ نوید سے خلع کی درخواست دے دی تھی، جبکہ اس پر مقدمہ اس کی گرفتاری کے فوراً بعد ہی دائر کر چکی تھی جس میں دھوکا، فراڈ، جعل سازی سے لے کر اس کے بچوں کا اغوا اور خود اس کے اپنے ارادۂ قتل وغیرہ شامل تھا۔

ہم تینوں بیگم ولا پہنچے تو زہرہ بانو بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی بولی۔ ''شہزی! وہ...... نوشابہ کا فون آیا تھا......''

''کیا......؟'' میں بری طرح چونکا۔

''او...... خیر!'' اول خیر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کیا کہہ رہی تھی وہ......؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھ سے زیادہ بات نہیں کی اس نے......'' زہرہ بانو بولی۔ ''کہہ رہی تھی۔ شہزاد احمد خان سے بات کرنی ہے، تمہارا سیل فون مانگ رہی تھی جو کہ ظاہر ہے، نہیں تھا۔''

''تم نے پوچھا نہیں کہ وہ کس سلسلے میں مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے؟'' شہزی نے کہا۔

''پوچھا تھا۔ اس نے نہیں بتایا، ویسے بھی اس کی آواز سن کر میرا اپنا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ میرا دل تو چاہا تھا کہ اسے کھری کھری سنادوں مگر بڑی مشکل سے میں نے اپنے غصے پر قابو پایا۔''

''اچھا کیا تم نے اس سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔''

''وہ دوبارہ فون کرے گی۔'' زہرہ نے آخر میں بتایا۔

''لیکن سمجھ نہیں آرہا...... اس نے فون کیوں کیا اور وہ بھی تم سے بات کرنے کے لیے......؟''

''کوئی گیدڑ بھبکی دینا ہوگی اور کس لیے کیا ہوگا؟'' اول خیر نے کہا۔

''یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دھونس جمانا چاہتی ہو......'' شکیلہ نے بھی لقمہ دیا تو اول خیر جیسے اسی کے بولنے کا منتظر تھا۔

اس کی طرف دیکھ کر بظاہر سنجیدگی سے بولا۔
''مثلاً......؟''
شکیلہ کچھ گڑبڑا سی گئی پھر اُلجھ کر بولی۔ ''مثلاً کیا مطلب؟''
''کس قسم کی دھونس......؟''
''دھونس کس قسم کی ہوسکتی ہے؟ کوئی دھمکی شمکی ہی ہو گی۔''
''دھمکی تو سمجھ میں آتی ہے، یہ شمکی کیا ہے؟''
''یہ دھمکی کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ جیسے لیکن ویکن...... اور......''
''شکیلہ، وکیلہ۔'' اول خیر نے اس کا جملہ اُچک لیا۔ وہ اُسے گھور کے بولی۔
''نام کے ساتھ اس طرح کے لاحقے وسابقے نہیں آتے......اب ہم اول خیر کو خیر وشر کہہ دیں...... جو تم اب اس سنجیدہ محفل میں پھیلانے لگے ہو، تو یہ لفظ بالکل بھی نہیں جچے گا، بجز اس کے کہ ہم خیر اور شر کو الگ الگ معنوں میں دیکھیں......''
میں، زہرہ بانو اور کبیل دادا ان دونوں کے ''پیچ'' پڑتے دیکھ کر مسکرانے لگے۔
شکیلہ نے اپنی طرف سے اول خیر پر بڑی بھاری چوٹ ماردی تھی اور وہ اب اپنی بغلیں جھانک رہا تھا مگر دوسرے ہی لمحے بولا۔
''اچھاجی! آپ تو خاصی اُردو داں ہوگئی ہیں...... نازکی بیگم!''
''اس میں اردو دانی والی کیا بات ہے، کم ازکم اتنی اردو تو ہر عام و خاص کو آتی ہی ہے۔ شہ مات ملتے ہی دکھانے لگے اپنی اوقات......؟ کتنی بار تم سے کہا میں نے کہ میرا نام مت بگاڑا کرو...... بلکہ کسی کا بھی نہیں بگاڑنا چاہیے، یہ گناہ ہے۔'' وہ اسے گھور کے بولی۔
''ان دونوں کا جلد ہی بندوبست کر دینا چاہیے، ورنہ ان کی لڑائی کسی دن بیگم ولا کے پُرسکون ماحول میں مہابھارت چھیڑ دے گی۔'' معاً کبیل دادا نے معنی خیز لہجے میں کہا تو اول خیر نے مجھے آنکھ مار کے کبیل دادا سے کہا۔
''وڈے استاد جی! اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ تُسی بھی مُن پا لے لگ ہی جاؤ......'' اس کی بات پر میں نے دیکھا کبیل دادا کچھ گھبرا سا گیا اور چہرے سے یوں ظاہر ہونے لگا جیسے وہ اول خیر کو چھیڑ کر پچھتایا ہو، جبکہ میں نے زہرہ بانو کی طرف دُزدیدہ نظروں سے دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔
کبیل دادا کی یہ بھول تھی کہ زہرہ بانو کو اس کے دل کا حال معلوم نہیں جبکہ یہ میں جانتا تھا کہ زہرہ بانو کو کبیل دادا کا حالِ دل بھی معلوم تھا اور بہت کچھ بھی۔ اسی سبب زہرہ بانو کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی تھی۔ زہرہ بانو کے چہرے پر حیا کی لالی دیکھتے ہی میں نے فوراً اول خیر کی ہاں میں ہاں ملادی۔
''واہ، اول خیر! کبھی کبھی مذاق میں تم بڑے کام کی بات کہہ جاتے ہو......سہرا سجانے کے معاملے میں تم اور کبیل دادا دونوں ہی خوش نصیب ہو۔''
''اوخیر...... کاکے! وہ کس طرح......؟'' اول خیر نے اپنے مخصوص لہجے میں میری طرف دیکھ کر گویا جان بوجھ کر وضاحت طلب انداز میں کہا تو میں بھی جیسے موقع محل پاتے ہی یک دم بولا۔
''اس لیے کہ تم دونوں کے رشتے بیگم ولا کی اس چھت کے نیچے موجود ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے دانستہ معنی خیز انداز میں پہلے شکیلہ اور پھر آخر میں زہرہ بانو پر اپنی نظریں جمادیں۔
کبیل دادا کسی بچّے کی طرح خوف زدہ سا نظر آنے لگا۔ میں نے بھی آج اس کے اندر کا برسوں پرانا خوف نکالنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ اول خیر کو میں نے ''شہ'' دینے کے لیے آنکھ ماری تو وہ بولا۔
''اوخیر......! یہ ہوئی نا بات......اب تو مقابلہ جے ہی جے...... عرصہ ہوا بیگم ولا میں ڈھول تاشے اور گج وج ہوئے۔'' پھر وہ اس باختہ سے کھڑے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر مصنوعی حیرانی سے بولا۔ ''ارے وڈے استاد جی! یہ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بجنے لگے؟''
''میں ذرا آرام کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں جارہا ہوں۔'' کبیل دادا نے جب دیکھا کہ میں اور اول خیر اس کے درپے ہونے لگے ہیں تو اس نے وہاں سے کھسکنا چاہا مگر میں نے اس بار سنجیدگی سے اُسے پکارا۔
''کبیل دادا......!'' وہ میری آواز پر چونکا اور میری جانب تکنے لگا۔
''بہت آرام کر لیا تم نے...... اور بہت یک طرفہ عذاب سہہ لیا......'' میری آواز گمبھیر ہوتی چلی گئی۔ کمرے کی فضا جو کچھ دیر پہلے اول خیر اور شکیلہ کی نوک جھونک کی وجہ سے چلبلی سی ہورہی تھی، وہ اب ایک گمبھیر تا ماحول میں بدل گئی۔ کبیل دادا کا بھاری کھردرا چہرہ ایک زبردست ارتعاش

تلے نظر آنے لگا جبکہ زہرہ بانو حیرت سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ حتیٰ کہ شکیلہ اور اول خیر بھی یک ٹک میرا چہرہ تکنے لگے۔

''ہاں! کبیل دادا! محبت کی ہے تو خم ٹھونک کر اس کا اظہار بھی کرو ورنہ محبت کرو ہی مت...... اس بھول میں مت رہنا کہ تمہارے حالِ دل سے صرف ہم ہی واقف ہیں بلکہ جسے تم اپنے دل کی عمیق گہرائیوں سے چاہتے ہو، وہ بھی تمہارے اس مخفی جذبۂ دل سے واقف ہے۔''

میں نے جیسے اپنے تئیں ایک انکشاف کیا۔ کبیل دادا کی حالت دیدنی ہو رہی تھی۔ اس نے ایک نظر بڑی ہمت کر کے اور ڈرتے ڈرتے قریب کھڑی زہرہ بانو پر ڈالی، جو خود میری جانب ایک نگاہ دیکھنے کے بعد اب کبیل دادا کی طرف دیکھ رہی تھی، یہی وہ لمحہ تھا جب زہرہ اور کبیل دادا کی نظریں چار ہوئی تھیں۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں کبیل دادا نے اپنی نظریں ہٹالیں۔ وہ اس سے لگتا ہی نہیں تھا کہ اپنی حیثیت میں باوقار، سنجیدہ مزاج اور دبنگ کبیل دادا ہے۔ اس وقت انجانے سے خوف تلے مرجھا کے رہ گیا تھا۔ بڑی عجیب بات تھی... کہ زہرہ بانو کی نگاہیں ہنوز کبیل دادا پر ہی جمی رہ گئی تھیں۔ شرم وحیا کی وہ لالی جیسے پل کے پل بدل کے پرکھنے والی نظر میں اُتر آئی تھی۔ ایسے میں کئی رنگ اس زہرہ نگار کے رخِ مہتاب پر چمکے تھے، جو ریشمی ڈوروں میں اُلجھے ہوئے بھی اور یادِ رفتگاں کی اَن گنت گتھیوں میں لپٹے ہوئے بھی۔ ان میں کشش وپیچ کا عذاب بھی تھا اور رنج والم کا تضاد بھی۔ کچھ رنگ پھیکے تھے اور کچھ اُجلے، مگر اُجلے رنگوں میں بے نام سی بے رونقی بھی تھی تو خوش آئند آرزوؤں کی دھنک بھی......

لمحاتی خاموشی کے بعد میں نے کبیل دادا کی کیفیاتِ دروں و بروں کو معمول پر لانے کی غرض سے اس بار براہِ راست زہرہ بانو سے مخاطب ہو کے کہا۔

''زہرہ......! ہم نے اب تک کئی محاذوں پر ایک ساتھ شامل رہتے ہوئے دشمنوں سے جنگیں لڑی ہیں اور لڑ رہے ہیں۔ ہم اچھی طرح ایک دوسرے کو جان چکے ہیں۔ ہمیں اپنے کردار و اوصاف کے سلسلے میں ایک دوسرے کو تمہید دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم میں سے کسی کی بھی سچائی اور وفاداری کا پیمانہ اب کسی بھی قسم کی کسوٹی پر پرکھنے کا محتاج نہیں رہا ہے۔ اب تو بس آنکھیں بند کر کے اپنے جس ساتھی پر بھی اُنگلی رکھو ایک ہی جواب ملے گا یعنی وفاداری اور جاں نثاری۔ زہرہ! زندگی کی یہ بھاگ دوڑ اور نفسانفسی اپنی جگہ لیکن...... انسان کو راہ میں کچھ ایسے فیصلے کرنے ہی پڑتے

## دشمنِ جاں

وہ قبر سے لپٹا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ''ہائے سرور! تم کیوں مر گئے...... ابھی تمہاری عمر ہی کیا تھی...... میری دنیا لٹ گئی...... میں برباد ہو گیا...... ہائے ہائے، کاش تم نہ مرتے......!''

وہاں سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو اس کی حالتِ زار پر ترس آگیا۔ رک کر اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''صبر کرو بھائی...... ایک دن ہر ایک کو مرنا ہے...... حوصلے سے کام لو...... مرنے والا کون تھا تمہارا؟''

''میرا تو یہ دشمن نکلا۔'' وہ روتے ہوئے بولا۔ ''مشکل سے اس کی قبر تلاش کی ہے...... یہ میری بیوی کا پہلا شوہر تھا۔ یہ نہ مرتا تو میری زندگی برباد نہ ہوتی...... ہائے، سرور! تم کیوں مر گئے؟''

واہ کینٹ سے عمر دراز کا واویلا

ہیں جو بے حد ضروری ہوتے ہیں...... ان کے بغیر زندگی کی تھکن زیادہ محسوس ہونے لگتی ہے...... اگر سچی محبت کرنے والے ایک ساتھی کا ساتھ ہو تو یہ سفر بہ آسانی کٹ جاتا ہے۔ پہاڑ سا سفر آسانی سے کٹ جاتا ہے، گونا گوں حالات کی کشتی اسی بادبان کے سہارے ہی تو طوفانوں کا مقابلہ کرتی ہے۔''

اتنا کہہ کر میں نے ذرا لمحے توقف کیا پھر بولا۔

''زہرہ! کبیل دادا ایک نیک شریف اور بہت وفادار انسان ہے، یہ جتنا دبنگ ہے، اندر سے اتنا ہی معصوم فطرت بھی۔ فیصلہ تمہارا ذاتی ہے مگر اس میں ہم سب کی خوشی ہے کہ...... اگر تم کبیل دادا کو اپنی زندگی کا ہم سفر اور ساتھی کے طور پر چن لو......''

وقت جیسے ایک دم تھم گیا۔ گھڑی کی سوئیاں رک گئیں۔ سانسوں کی بازگشت جیسے بہ زبان یک خاموشی چیخنے لگیں۔ کبیل دادا کا وہ راز جو اَب تک اس کے دل میں تھا آج میں نے وہ کبیل دادا کی موجودگی میں ہی زہرہ بانو کے سامنے طشت ازبام کر دیا تھا۔ آج میں نے کبیل دادا کا وہ خوف جڑ سے کاٹ پھینکا تھا جو کسی جسین ''آسیب'' کی طرح اس کے اعصاب پر سوار رہتا تھا۔ جسین اس لیے کہ وہ اس کی سرمستی میں آپوں آپ ہی مگن رہنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ اس کے عذاب میں وہ خود ہی خود ایک عجیب سی لذت محسوس کر

لے خوش رہتا تھا۔
کبیل دادا کا چہرہ ہی نہیں اس کا پورا وجود ایک زبردست ارتعاش کی گرفت میں آچکا تھا۔ اور زہرہ بانو...... جیسے یکلخت کسی کڑی آزمائش کی سولی پر جھول کر رہ گئی تھی۔

''یہ ہم سب کی خواہش ہے زہرہ! زندگی کی اس کڑی دھوپ میں آبلہ پا سفر کرتے ہوئے ہم تھک سے گئے ہیں۔ بیگم ولا کے ان درودیوار... سے جو بے نام سی اُداسی ٹپکتی ہے وہ بھی کہتی محسوس ہوتی ہے کہ انہیں ایک بار پھر شادیانوں اور شادمانیوں کی ضرورت ہے۔ آپ کو خوشی مل جائے گی گویا بیگم ولا کے یہ درودیوار خوشیوں سے پیراستہ ہوجائیں گے۔ دیکھنا تم...... کبیل دادا اور تمہارا سنگم یہاں ہر طرف خوشیاں بکھیر دے گا اور تم دونوں کی زندگی میں بھی......'' میں اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

زہرہ بانو چپ کھڑی تھی۔ کبیل دادا تو بت بن گیا تھا۔ میں نے پھر کہا۔

''میری بات بری تو نہیں لگی زہرہ بانو......؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کبیل دادا نے میری طرف دیکھا اور شکایتی لہجے میں بولا۔

''یار، شہزی! یہ تُو نے اچھا نہیں کیا...... تجھے ایسے نازک وقت میں یہ موضوع نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔''

''نازک وقت......! کیسا نازک وقت......؟'' میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم تینوں امریکا روانہ ہونے والے ہو۔ یہاں اور کون ہوگا میرے سوا...... ایسے میں اگر بیگم صاحبہ کو تمہاری یہ بات بری لگ گئی اور اس نے مجھے بیگم ولا چھوڑنے کا حکم دے دیا تو......کیا ہوگا......؟''

''وڈے استاد جی! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' اول خیر نے مسکرا کر کہا۔ ''آخر کبھی تو یہ بات کہنا ہی تھی ناں بیگم صاحبہ سے...... اپڑیں شہزی کاکا کی ہی نہیں بلکہ میری اور شکیلہ کی بھی یہی خواہش تھی کہ جانے سے پہلے ہم اس عظیم فرض سے سبکدوش ہوجائیں۔''

''ہاں کبیل دادا! اول خیر ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا اس کے قریب آکر بولا اور اس کے کاندھے کو ہولے سے تھپتھپاتے ہوئے مزید کہا۔

''دیکھو! آخر تو یہ بات کہنا ہی تھی۔ خود سوچو تم۔ ہم نہیں کہیں گے تو اور کون کرتا پھر بیگم صاحبہ سے یہ بات...... تم گھبراؤ نہیں...... میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں بھی وہاں سے نکلا اور اس کمرے میں آگیا جہاں زہرہ بانو گئی تھی۔

☆☆☆

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے دبی دبی آواز ابھری۔ ''کون......؟''

''میں ہوں زہرہ......!''

''دروازہ کھلا ہے۔ آجاؤ......''

میں دھیرے سے دروازہ... دھکیل کر اندر آگیا۔ سامنے ایک کرسی پر زہرہ بانو سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا اس کے سامنے والی کرسی کو مزید اس کی جانب سرکا کر بیٹھ گیا اور اس کی طرف جھکتے ہوئے مدھم لہجے میں بولا۔

''زہرہ بانو! اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کر دینا...... لیکن میرا اللہ جانتا ہے کہ میں نے کسی اور نیت سے نہیں بلکہ سچے دوستانہ جذبے سے یہ بات کہی ہے۔ کبیل دادا کو تم بھی جانتی ہو اور میں تو اسے جانتا ہی ہوں، وہ واقعی تم سے بے حد محبت کرتا ہے، مگر اس بے چارے کی سادگی تو دیکھو کہ اتنے عرصے سے اپنی محبت کو اپنے دل تک ہی محدود کیے بیٹھا ہے۔ کبھی اس کا تمہارے سامنے اظہار نہیں کیا اور کرتا بھی کیسے؟ اس بے چارے کو ڈر تھا کہ کہیں تم ناراض ہو کے اسے خود سے دور نہ کردو...... وہ بس اسی میں خوش تھا کہ وہ چاہے تمہارا ایک ادنیٰ ساتھی ہی کی صورت سہی، تمہارے قریب تو رہے۔''

زہرہ بانو نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں چونک سا پڑا اس کا چہرہ ہی نہیں آنکھیں بھی متورم اور سرخ ہو رہی تھیں۔ ایک غبار سا تھا جو اشکوں کی صورت میں اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ بہت دھیرے سے سسکنے کے انداز میں وہ بولی۔

''شش...... شہزی! زندگی کے جس دکھ بھرے باب کو میں بند کر چکی تھی، تم نے اسے کیوں کھول دیا؟ کیا تم نہیں جانتے کہ لئیق شاہ آج بھی میرے دل میں زندہ ہے۔ میں نے خود کو اس کی یادوں کے ساتھ پیوست کردیا ہے۔ میں اس کی جگہ کسی اور کو کیسے دے سکتی ہوں؟''

''میں سب جانتا ہوں...... اور یہ بھی جانتا ہوں کہ پہلی محبت کو انسان کبھی نہیں بھلا سکتا مگر......''

''محبت بس محبت ہوتی ہے، پہلی یا دوسری نہیں...... اور جس سے کی جاتی ہے اسی تک محدود رہتی ہے۔ اس میں دائمی جدائی یا موت کا کوئی دخل نہیں ہوتا، یہ وہی محبت ہے جو مر کے بھی امر رہتی ہے۔ کیا کبیل دادا یہ سب نہیں جانتا؟ اس

کے باوجود......وہ......"

"میں سب جانتا ہوں بیگم صاحبہ!"

معاً کمرے میں ایک گمبھیر سی آواز اُبھری اور زہرہ بانو سمیت میں نے بھی چونک کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ وہاں کبیل دادا اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑا ہماری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے یوں اندر در آنے پر حیرت بھی ہوئی اور ایک طرح سے خوشی بھی۔ شاید بات اور حقیقت...... کھل جانے کے بعد...... اس کے دل اور دبے ہوئے جذبات کی شورش نے اسے بھی ہمت عطا کر ڈالی تھی جو میں چاہتا بھی تھا، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ کبیل دادا کی طرف سے بھی اعترافِ محبت ہونا چاہیے۔

اسے دیکھ کر زہرہ بانو بھی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اسے یوں ایک دم کھڑے ہوتے دیکھ کر مجھے ذرا جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ کبیل دادا کی طرف کچھ تیز سی نگاہوں سے گھور رہی تھی پھر اسی لہجے میں اس سے بولی۔

"قریب آؤ......" انداز تحکمانہ تھا۔ میرا دل کسی انجانے خدشات تلے تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کبیل دادا جو کچھ دیر پہلے دبا دبا اور کسی بچے کی طرح ڈرا ڈرا سا نظر آتا تھا اب اس کے انداز اور چہرے سے ایسا کچھ بھی نہیں جھلکتا... دکھائی دے رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے اب وہ بھی دیارِ اُلفت میں خم ٹھونک کر قدم جمانے کا ارادہ کر چکا ہو۔

کبیل دادا، زہرہ بانو کے قریب آ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیا کہا تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھ سے......؟" زہرہ بانو نے اس کے پُرمتانت چہرے پر اپنی تیز نگاہیں جماتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"یہی...... بیگم صاحبہ! کہ میں سب جانتا ہوں...... آپ کی لئیق شاہ سے محبت کو بھلا مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ لئیق شاہ تو میرا یار بے بدل تھا اور میں اس کا سایہ...... آپ دونوں کے لازم وملزوم ساتھ کا مجھے بھی اتنا ہی بھروسا تھا جتنا کہ آپ اور لئیق شاہ کو تھا۔ لئیق شاہ کی دائمی جدائی کے دکھ میں صرف آپ ہی نہیں میں بھی بجھ کر رہ گیا تھا۔ مگر ایک حقیقت یہ بھی ہے بیگم صاحبہ! کہ میں بھی آپ سے محبت کرتا ہوں۔"

وہ اتنا کہہ کر سر جھکائے خاموش ہو گیا۔ میری دھڑکتی بھانپتی نظریں زہرہ بانو کے چہرے اور اس کے اُتار چڑھاؤ کا جائزہ لینے لگیں۔ میں نے دانستہ دونوں کے بیچ خاموشی اختیار کر رکھی تھی اور چاہتا میں بھی یہی تھا کہ یہ دونوں ہی بولتے رہیں۔

"یہ کڑی حقیقت جاننے کے باوجود تم پھر بھی ایسا کہہ رہے ہو؟"

"جی ہاں بیگم صاحبہ! میں پھر بھی ایسا کہہ رہا ہوں۔"

کبیل دادا نے سر اُٹھا کے دوبارہ زہرہ بانو کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ آج کبیل دادا تمام تر حوصلے کے ساتھ زہرہ بانو کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے کبیل دادا کا برسوں پرانا چڑھا ہوا وہ خول توڑ ڈالا جس میں وہ کسی معصوم اور ڈرے سہمے بچے کی طرح سکڑا سمٹا بیٹھا تھا، اس کا ڈر ختم ہوا تو خود بخود اس کی جگہ ایک حوصلے اور ہمت نے لے لی تھی۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے زہرہ بانو سے کہہ رہا تھا۔

"لیکن...... بیگم صاحبہ! میری اس محبت کا قطعی یہ مقصد نہیں کہ میں آپ کے دل سے خدانخواستہ اپنے یار لئیق شاہ کی محبت کو نکالنا چاہتا ہوں، ہرگز نہیں، کیونکہ یہ حقیقت میں بھی جانتا ہوں کہ یہ بات ممکن ہی نہیں، بیگم صاحبہ! مجھے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کہ میں آپ کا وفادار اور جاں نثار ساتھی ہوں۔ لیکن کوشش میری یہی رہی ہے، مگر...... ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ بس، میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور یہ میں نہیں جانتا کہ کیوں کرتا ہوں...... شاید دل کے اس جذبے کو اسی لیے ہی بے اختیار کہا جاتا ہے کہ...... بس! یہ ہو جاتا ہے، کیا نہیں جاتا۔"

"یہ تمہارا کیسا جذبہ ہے کہ تم جانتے ہوئے بھی کہ لئیق کبھی بھی میرے دل سے نہیں نکل سکتا اور وہ تو مرنے کے بعد میرے دل میں زندہ ہو گیا ہے، مگر تم......" زہرہ بانو مرتعش سے لہجے میں یہ کہتے ہوئے چپ سی ہو گئی تو میں نے فوراً مداخلت کی اور کبیل دادا کی طرف دیکھ کر دھیرے سے کہا۔

"کبیل دادا! تم جاؤ......" وہ پلٹا اور واپس لوٹ گیا۔

"عجیب پاگل آدمی ہے یہ......" زہرہ بانو کہتی ہوئی دوبارہ کرسی پر جا بیٹھی۔ "یہ سارا تمہارا ہی کیا دھرا ہے......" اس نے میری طرف دیکھ کر شکوہ کیا۔ میں مسکراتے ہوئے اس کی جانب بڑھا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ آج یہ نازک اور حساس موضوع چھڑا تھا تو میں نے بھی اسے انجام تک پہنچانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

"دیکھو زہرا! اصل میں ہم سب، میں، اول خیر، شکیلہ، اماں اور ابا جی تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ کبیل دادا کو تم بھی جانتی ہو اور اب میرا خیال ہے ایک مخصوص حوالے سے تم اور بھی اسے اچھی طرح جان گئی ہو۔ اس بے چارے کی ایسی کوئی کوشش نہیں ہے کہ وہ تمہارے دل سے لئیق شاہ کی محبت

کو دور کرنا چاہتا ہے، اس سادہ لوح آدمی نے تو بہ زبانِ خود اس یقینی امر کا اعتراف بھی کرلیا ہے کہ تم لئیق شاہ کی محبت کو کبھی دل سے نہیں نکال سکتیں، لیکن اس بے چارے کی سادگی تو دیکھو وہ چاہتا کیا ہے، صرف تمہیں اور بس......''

''میں کسی کو جانتے بوجھتے ہوئے اتنے بڑے دھوکے میں نہیں رکھ سکتی شہزی!'' زہرہ بولی۔

''کبیل دادا تم سے یہ دھوکا بھی کھانے پر رضامند ہے۔'' میں کہا۔

''یہ اس کا بچکانا پن ہے۔''

''ہرگز نہیں، وہ ایک سمجھ دار اور زبان کا پکا آدمی ہے۔'' میں نے کہا اور اسے سمجھاتے ہوئے مزید کہا۔ ''دیکھو زہرہ! ہم سب کی مضبوطی اسی میں ہے کہ ہم ساتھ رہتے ہوئے اپنے رشتوں کو اپنی دوستیوں کو باہم مستحکم کریں۔ میرا تو اول خیر اور شکیلہ کا بھی شادی کروانے کا ارادہ ہے۔ زندگی کی بعض تلخ حقیقتوں کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے اور ان سے سمجھوتا کرنا اس سے بھی زیادہ ضروری۔ ایک عورت ذات کے لیے زندگی کا یہ طویل سفر بغیر ساتھی کے نہیں کٹتا زہرہ! میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ...... آپ کو ایک اچھا ساتھی مل جائے اور پھر میں مطمئن ہو کے اپنے سفر پر نکل جاؤں...... پلیز زہرہ! مان لو میری بات...... کبیل دادا کے لیے ہاں کردو...... تم دیکھنا تمہیں ایک خوشگوار تبدیلی اور مسرتوں کا احساس ہوگا۔ تم زندگی جینے لگو گی اور زندگی تمہیں۔''

''مجھے ڈر ہے کہ میں لئیق شاہ کو بھلا دوں گی۔'' اس نے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا۔

''کیا تمہاری محبت اتنی کمزور ہے کہ تم ایسا سوچ رہی ہو۔''

''یہ ایک ڈر ہے۔''

''یہ وہم ہے۔''

''وہم ہی سہی۔''

''لیکن لئیق شاہ اب دنیا میں نہیں رہا۔''

''کسی کے دنیا میں نہیں رہنے سے کیا وہ واقعی ختم ہو جاتا ہے؟ تم مسلمان ہو ناں...... کیا آخرت کی ہمیشہ والی زندگی پر یقین نہیں کرتے ؟''

''الحمدللہ...... بالکل رکھتا ہوں۔''

''میں لئیق شاہ کو اللہ سے مانگ لوں گی۔''

اس کی بات سن کر میں سکتے میں آگیا۔ کیسی عجیب عورت تھی یہ...... اور اس کی محبت اس سے زیادہ عجیب...... تب ہی میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... اگر تم یہ بات کرتی ہو تو ایسا تب ہی ممکن ہے جب تمہیں جنت ملے۔''

''میں دنیا میں رہتے ہوئے دیگر نیک لوگوں کی طرح اس کی کوشش میں مصروف رہوں گی۔''

''تب پھر تم پر اسلامی اُصولوں اور ان کی پاسداری لازم ہوگی جس میں ایک حکم یہ بھی ہے کہ اگر جوان بیوہ ہے اس کی شادی کردی جائے۔ یہی سوچ کر ہی ہاں کردو زہرہ! خدا کے لیے...... کبیل دادا کو اپنالو...... اور اپنی ریاضت کو دل میں رکھو۔ باقی اُوپر والے کے معاملات اُوپر والے پر چھوڑ دو......''

میں نے اپنی بات مکمل کی تو زہرہ کو میں نے پہلی بار کچھ سوچتے ہوئے پایا۔ اس سے کمرے کی فضا مجھے تھمی تھمی سی محسوس ہونے لگی۔

بالآخر خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد زہرہ بانو نے جیسے اپنی زندگی کا اہم فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے شہزی! اگر یہ بات ہے تو پھر تمہیں میری بھی ایک بات ماننا ہوگی۔''

''کون سی، بولو......؟'' میں نے اسے رضامند پاکر دبی دبی مسرت تلے اس سے پوچھا۔

''میری دعا ہے کہ خدا تمہیں اپنے مشن میں کامیاب کرے۔ تم امریکا سے عابدہ کے ساتھ ہی خیریت وسلامتی سے واپس لوٹو، لیکن...... میری ایک شرط ہے کہ یہ سب عابدہ کی واپسی کے بعد ہی ہوگا۔ پھر بیگم ولا میں ایک نہیں، دو نہیں، تین شادیوں کے شادیانے بجیں گے۔ دوسری بات یہ کہ اب اول خیر کی جگہ کبیل دادا تمہارے ساتھ امریکا جائے گا اور اول خیر اِدھر ہی بیگم ولا میں میرے پاس رہے گا۔''

میں ان کی آخری شرط پر ذرا چونکا۔ وہ ایسا کیوں کہہ رہی تھی؟ مگر اس پر مجھے زیادہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس ضمن میں ایک ہی بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ ایک عورت کی جس شخص سے شادی کی بات چل نکلی ہو اور اس کی ''ہاں'' کے بعد اس عورت کی حیا اس ''مرد'' کو اپنی چھت تلے رکھنے پر آڑے آرہی ہو۔ لہٰذا اس شرط کے پیچھے مجھے زہرہ بانو کا یہی مقصد کارفرما محسوس ہوا تھا۔

''میں نے تمہیں جواب دے دیا شہزی! اب مجھے اُمید ہے کہ تم میری بھی بات رکھو گے۔'' مجھے کچھ سوچتا پاکر اس نے آخر میں کہا، گویا اس موضوع پر اب وہ مزید کوئی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

ماہنامہ سرگزشت کراچی

# مرگِ ناگہاں نمبر

اس خاص شمارے میں وہ سب کچھ ہے جو
آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے۔

ان مشہور و مقبول شخصیات کی روداد جو بے وقت موت کا
شکار ہوئے جنہیں عہدِ شباب میں موت اپنے ساتھ لے گئی

جنوری 2018ء کے اس شمارے
کو آپ مجلد کرا کر رکھنے پر مجبور ہوں گے

سال کا پہلا شمارہ سب سے اہم شمارہ

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

''آجاؤ اندر...... دروازہ کھلا ہے۔'' زہرہ بانو نے ذرا اُونچی اور تحکمانہ آواز میں کہا تو ایک ملازم اندر داخل ہوا اور اس نے بتایا کہ نوشابہ کا فون آیا ہے میرے لیے۔ اس کے ہاتھ میں کارڈلیس دبا ہوا تھا۔ میں چونکا اور ہاتھ بڑھا دیا۔ نوشابہ سے بات کرنے سے پہلے میں نے اس کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر اسے دوسرے کمرے میں موجود اول خیر وغیرہ کو بلانے کا کہا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر باادب واپس لوٹ گیا۔

میں نے اسپیکر آن کر کے ہاتھ ہٹایا اور کارڈلیس کے ماؤتھ پیس پر گمبھیر آواز میں ''ہیلو'' کہا۔

''شہزاد احمد خان بات کر رہے ہیں؟'' دوسری جانب سے استفساریہ آواز اُبھری۔ نوشابہ کی آواز کو میں پہچانتا تھا۔

''جی ہاں! بات کر رہا ہوں۔'' میں نے متانت بھرے لہجے میں کہا۔

''شہزاد! مجھے معلوم ہے کہ میرا فون ریکارڈ کیا جا رہا ہو گا...... اور......'' اس نے چالاک بننے کی کوشش چاہی تو میں نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''اگر تمہیں معلوم ہے تو پھر کال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''بہت غصے میں ہو......'' اس کی طنزیہ آواز اُبھری۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے محترمہ!''

''اوہ...... اتنا بہت فالتو وقت جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننے کے بعد تو کم از کم میری بات سننے کے لیے تمہارے پاس وقت تو ہونا چاہیے۔'' اس کی طنزیہ کاٹ دار گفتگو جاری تھی۔ میں نے اسی گمبھیرتا سے جواب دیا۔

''جس وقت کو تم فالتو اور کہاں کہاں کی خاک چھاننا کہہ رہی ہو، اس کی افادیت کا اعتراف پورے ملک میں ایک بہت بڑے قومی اور فوجی اعزاز کے ساتھ کیا جا چکا ہے...... محترمہ! اور یوں عوامی اور ملکی سطح پر کسی کو محبِ وطن اور کسی کو ''بنتِ غدار'' کا خطاب بھی مل چکا ہے، جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اب تک کس نے خاک چھانی اور کس نے ملک و قوم کے لیے اپنا سب کچھ قربان کیا ہے۔''

میری اس معنی خیز جوابی کارروائی نے اس کا منہ توڑ کر رکھ دیا۔ کیونکہ دوسری جانب یک دم خاموشی چھا گئی اور یوں لگا جیسے کوئی غصے سے دانت پیس رہا ہو۔ میں نے اسے مزید جلانے کی خاطر دوبارہ کہا۔

''اپنا اصل خطابی نام سن کر آپ کہاں چلی گئیں؟ آواز نہیں آ رہی مجھے آپ کی......!''

''آواز تو میری بہت دور سے بھی تم تک پہنچ جائے گی شہزی!'' اس نے شاید غصے سے دانت پیس کر ہی جواب دیا تھا۔ ''لیکن...... اتنا یاد رکھنا...... وہ منظر ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے تازہ ہے جب میرے اکلوتے بھائی فرخ نے میری آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا۔''

''اور...... میری آنکھوں کے سامنے وہ کئی دل دوز مناظر ابھی تک رقصاں ہیں جو تمہارے قصائی باپ کے رہینِ منت ہیں۔ ان میں ایک منظر آسیہ کا بھی ہے، جسے تمہارے باپ نے اپنے زرخرید کتوں کے آگے ڈال دیا تھا۔''

''تم اس وقت چوہدری ممتاز سے نہیں نوشابہ سے مخاطب ہو۔''

''چھوڑوں گا تو میں اُسے بھی نہیں اگر تم بھی میدان کھود کر سامنے آنا چاہتی ہو تو کھلی دعوت ہے۔ لیکن تمہارے لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ تمہاری عمر گھر بسانے کی ہے، یہ سب تمہیں زیب نہیں دیتا۔''

''جس نے سینے میں انتقام کی آگ بسا رکھی ہو وہاں اب اور کوئی نہیں بس سکتا۔''

''تم جن لوگوں کے بل بوتے پر اتنا بھونک رہی ہو وہ سب میرے زیرِ نگیں ہو چکے ہیں۔''

بڑی خوش فہمی ہے تمہیں۔'' وہ استہزائیہ ہنسی کے ساتھ بولی۔ ''وہ سب پہلے سے اب زیادہ طاقت کے ساتھ تمہارے مقابلے پر آنے والے ہیں۔''

اس بار میں غصے سے دانت پیس کر رہ گیا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ چکا تھا۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ میں نے وزیر جان سے لے کر چوہدری ممتاز تک سب کو ناکوں چنے چبوائے تھے، لیکن یہ دونوں اسپیکٹرم کے مقامی سربراہوں میں سے تھے۔ اسپیکٹرم کی جڑیں انہوں نے مضبوط کر لی تھیں مگر میں نے اپنے ساتھیوں سے مل کر ان کی مقامی قیادت فنا کر ڈالی تھی۔ ان کے بہت سے ساتھی ایجنٹوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور کچھ فرار ہونے اور زیرِ زمین دبکنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

فرار ہونے والوں میں وزیر جان بھی شامل تھا جو ہنوز مفرور تھا۔ چوہدری ممتاز گرفت میں آ گیا تھا مگر ضمانت پر رہا ہوا، تاہم اب وہ اپنی جگہ محدود کر دیا گیا تھا اور اس پر بیرونِ ملک تو کیا بیرونِ شہر جانے پر بھی پابندی عائد تھی۔ نوشابہ اب اسپیکٹرم کی اس لنگڑی لولی باقیات کے بل بوتے پر ہی اکڑ رہی تھی۔

''کھلی دعوت ہے اُن کو...... آ جائیں میرے مقابلے پر...... اس بار میں نے بھی تہیہ کر رکھا ہے کسی کو زندہ نہیں

چھوڑوں گا۔‘‘ میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔

’’اسپیکٹرم ایک آکٹوپس ہے، اس کا ایک ٹینٹکل (Tentacle) توڑو گے تو اس کی جگہ دس اور نکل آئیں گے لیکن اتنا یاد رکھنا شہزی! نوشابہ بھی تمہارے لیے بہت مشکل ثابت ہوگی۔‘‘

’’یہی گیدڑ بھبکیاں سنانے کے لیے تم نے فون کیا تھا؟‘‘

’’تم نے خود ہی بحث شروع کی تھی۔ میں تو تم سے مقصد کی بات کرنا چاہتی تھی۔‘‘ اس کے سفید جھوٹ پر مجھے غصہ تو آیا مگر میں نے تحمل سے کام لیا اور کہا۔

’’تو کرو بات، اب میرے پاس وقت بالکل نہیں رہا۔‘‘

’’میں تم سے ایک اہم معاملے پر ڈیل کرنا چاہتی تھی۔‘‘

’’کیسی ڈیل......؟‘‘ میرا دل کسی خیال کے تحت یکبارگی زور سے دھڑکا۔

’’فون پر نہیں ہوسکتی۔‘‘ اس نے کہا۔

’’تو پھر بیگم ولا آجاؤ......‘‘ میں جواب دیا۔

’’میں نہیں آسکتی، میرے دو آدمی آئیں گے۔‘‘

’’ڈیل کی نوعیت بتا دو تو زیادہ بہتر ہوگا، ہوسکتا ہے تمہیں یہاں اپنے آدمی بھیجنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔‘‘

وہ میرا اشارہ بھانپ کر بولی۔ ’’ڈیل عابدہ سے متعلق ہے۔‘‘

عابدہ کے ذکر پر میرا دل دھڑکنے لگا، کچھ توقف کے بعد میں نے سنبھل کر جواب دیا۔

’’ہمم...... ٹھیک ہے، بھیج دو اپنے آدمی لیکن یاد رہے۔ اگر تم عابدہ کو میری کمزوری بنانا چاہتی ہو تو یہ تمہاری بھول ہوگی۔‘‘

’’یہ ڈیل، کچھ لو اور دو کے تحت ہوگی۔‘‘

’’عابدہ کے بدلے میں میرے پاس دینے کے لیے ایسا کچھ نہیں ہوگا جس کا تعلق میری اپنی ذات سے ہو۔‘‘

’’بات ہو جانے دو پھر دیکھتے ہیں، کیا کہتے ہو پھر......‘‘ وہ مکاری سے بولی۔

’’بھیج دو۔‘‘

’’کل شام پانچ بجے میرے دو آدمی تمہارے پاس آئیں گے۔‘‘

اس کے بعد چند سیکنڈ تک مزید بات ہوئی اور میں نے رابطہ منقطع کردیا۔

اسپیکر کی وجہ سے مجھے گفتگو دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور سب کا کم وبیش یہی خیال تھا کہ نوشابہ اسپیکٹرم میں ایک عہدے دار کی حیثیت سے شمولیت حاصل کرچکی تھی اور اب اس کا عابدہ سے متعلق کسی خفیہ ’’ڈیل‘‘ کے بارے میں بات کرنا ظاہر کرتا تھا کہ اس کے پیچھے لولوش یا باسکل ہولارڈ کا ہاتھ تھا۔ اس سلسلے میں زہرہ بانو اور اول خیر کو اعتراض تھا کہ نوشابہ کو آدمی بھیجنے سے منع کردیا جاتا، جبکہ میرا اور شکیلہ سمیت کبیل دادا کا خیال تھا کہ کم ازکم ان کی ڈیل سے متعلق بات سن لی جائے، ممکن تھا کہ ہمیں اس ڈیل کو ’’ڈمی‘‘ کرنے یا چال چلنے کا موقع مل جائے۔

نوشابہ والے موضوع کے اختتام پر زہرہ بانو اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اول خیر اور شکیلہ نے فوراً میرے گرد گھیرا ڈال لیا اور کبیل دادا سے متعلق زہرہ بانو کے عندیے کے بارے میں پوچھا تو میں نے ایک گہری سانس لے کر انہیں بتادیا۔

زہرہ بانو کی رضامندی کا سن کر کبیل دادا تو جیسے بت بن کر رہ گیا تھا جبکہ شکیلہ نے خوشی کے مارے ایک نعرہ بلند کیا مگر اب اس مہم میں اول خیر کے بجائے کبیل دادا کی جگہ لینے پر وہ بھی کچھ افسردہ محسوس ہوئی۔ تاہم زہرہ بانو کی کبیل دادا سے نکاح کی رضامندی نے اس افسردگی کو کافی حد تک کم کیا تھا اور اول خیر کو بھی اتنی ہی خوشی ہوئی تھی مگر وہ زہرہ بانو کی شرط کے آگے بجھ کر رہ گیا تھا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

’’اول خیر! اپنے وڈے استاد جی کی اتنی بڑی خوشی کی خاطر تجھے یہ قربانی تو دینا ہی پڑے گی، باقی میرے لیے تو تم دونوں ہی برابر ہو۔‘‘

’’بہت چالاک ہے تو شہزی کا کے!‘‘ اول خیر میری طرف شکایتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’اپڑیں وڈے استاد جی کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔‘‘ اس نے آخر میں اُترے اُترے چہرے کے ساتھ کبیل دادا کی طرف دیکھا۔ کبیل دادا تو جیسے ہنوز بت بنا کھڑا تھا تب ہی اول خیر نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

’’او...... خیر، وڈے استاد جی! آپ پر تو لگتا ہے شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی ہے۔ کچھ تو بولو استاد جی؟‘‘

’’میں کیا بولوں یار خیرے! شہزی نے تو مجھ پر آج ایسا احسانِ عظیم کیا ہے کہ دل چاہتا ہے اس کا ماتھا چوم لوں۔‘‘ بالآخر کبیل دادا نے ممنون بھرے لہجے میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ کہتے ہوئے وہ فرطِ جذبات ومسرت سے

میرے گلے سے آن لگا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کا کندھا تھپکا اور کہا۔

''احسان کیسا دادا......؟ یہ تو ہم ساتھیوں کا فرض تھا کہ تیرے دل کی بستی کو آباد دیکھیں۔ آج ہماری یہ خواہش پوری ہوگئی۔''

''اب یہ ساری خوشیاں عابدہ سے نتھی ہو چکی ہیں اور ہمیں پوری توجہ اس اہم ترین مشن پر مرکوز رکھنا ہوگی۔'' شکیلہ نے سنجیدگی سے کہا۔

ہم تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد آرام کرنے کے لیے اپنے کمروں کا رخ کیا۔

اگلے دن مقررہ وقت پر نوشابہ کے بھیجے ہوئے دو آدمی بیگم ولا پہنچے۔ گیٹ پر مکمل جامہ تلاشی کے بعد انہیں اندر بھیج دیا گیا۔ انہیں پہلے سے مخصوص کیے گئے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ وہ دشمن کے آدمی سہی، مگر اخلاقاً ملازم نے ان کے سامنے کھانے پینے کے لوازمات سے بھری ہوئی ٹرالی سجا دی تھی۔ مگر ان دونوں نے کسی شے کو بھی ہاتھ نہیں لگایا اور مجھ سے جلدی ملاقات کا کہا گیا۔

میں کمرے میں داخل ہوا۔ میرے ساتھ تینوں ساتھی تھے، جبکہ زہرہ بانو کو میں نے وہاں آنے سے منع کر رکھا تھا۔

میں نے ان سے ملنے کے دوران میں بہ غور جائزہ لیا تھا۔ ان میں سے ایک پختہ العمر تھا جبکہ دوسرا درمیانی عمر کا تھا۔ پکی عمر والے کا سر آدھا گنجا تھا، رنگ گورا اور قد درمیانہ تھا۔ درمیانی عمر کا آدمی دراز قامت اور گندی رنگت کا تھا۔ اس کا جسم بھی کسرتی تھا۔ دونوں ہمیں اور بالخصوص مجھے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے ملے اور پھر میرے اشارے پر صوفے پر بیٹھ گئے۔

''نوشابہ خود آجاتی تو میرا خیال تھا کہ زیادہ اچھی بات ہوتی۔ خیر......'' کہتے ہوئے میں رکا پھر مستفسر ہوا۔

''کیا بات کرنا چاہتے ہو؟'' میری بات پر وہ ذرا کسمسائے، اس کے بعد پکی عمر والے نے ہولے سے کھنکھار کر گفتگو کی ابتدا کی۔

''ہمیں اُس ڈیل سے متعلق میڈم نوشابہ نے اچھی طرح بریف کر دیا ہے۔ ہم آپ سے دوٹوک بات کریں گے اور کوشش کریں گے کہ اس ڈیل سے متعلق آپ کے سوالوں اور اُن تحفظات کا جواب دیتے ہوئے قائل بھی کر سکیں.... بہ صورتِ دیگر آپ کا جو آخری فیصلہ ہوگا، وہ ہم جا کر میڈم نوشابہ کے سامنے رکھ دیں گے۔''

وہ اتنا کہہ کر رکا۔ اس کی آواز بھاری اور کھردری تھی۔

وہ اپنے انداز و اطوار سے غیر ضروری باتوں کا جواب نہ دینے اور دوٹوک رویّہ رکھنے والا انتہائی گھاگ شخص دکھائی دیتا تھا، میری نظریں بدستور اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں میں اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

''اس وقت آپ ہماری کمزوری سے واقف ہیں اور ہم آپ کی...... لیکن اگر مشترکہ طور پر ان کمزوریوں کی نوعیت کے بارے میں بات کی جائے تو میرا خیال ہے آپ کی کمزوری کی نوعیت ہمارے مقابلے میں حاوی ہے۔ لہٰذا اس ڈیل سے آپ کو فائدہ اُٹھانے کی زیادہ ضرورت ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر رکا۔ میں اس کی مکاری سمجھ رہا تھا۔ اس نے اصل گفتگو کرنے سے پہلے نفسیاتی طور ایک طرح سے مجھے اپنے دبدبے میں لینے کی کوشش چاہی تھی۔ میں چپ رہا اور بظاہر غور سے اس کی بات سنتا رہا۔ وہ ایک سانس لے کر دوبارہ بولا۔

''ہماری کمزوری مادیت ہے اور آپ کی کمزوری کسی کی زندگی۔ فی زمانہ زندگی کو مادیت پر فوقیت حاصل ہے۔ بس! اب میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔''

یہ کہہ کر اس پختہ العمر آدمی نے کسی ''ڈکٹیشن'' کے مطابق اپنی بات گویا یہیں ختم کرتے ہوئے صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگا لی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ وہ اشارتی زبان میں جو کہنا چاہتا تھا کہہ چکا تھا اور اب مجھے اس کے جواب میں وضاحت پیش کرنا تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کا دوسرا ساتھی بول اٹھا۔

''عابدہ امریکا کی ایک خطرناک جیل میں مقید ہے۔ امریکا کی اس جیل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ گوانتانوموبے سے کم خطرناک نہیں، جہاں کا قیدی صرف ایک لاش کی صورت میں ہی باہر آتا ہے۔ طلسم نور ہیرا اور اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کوروان کی جیل میں موت کی گھڑیاں گننے والے ایک قیدی سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتے۔'' درمیانی عمر والا کسرتی بدن کا آدمی مجھ سے یہ کہنے کے بعد چپ ہوا تو اس کا پہلا ساتھی بولا۔

''اب آپ کا کیا جواب ہے؟''

بہت ہی مختصراً اور نپی تلی گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے بھی یہی انداز اپناتے ہوئے جواب میں کہا۔

''پہلی بات یہ کہ...... مادیت پرست لوگوں کے لیے بھی ان کی کمزوری مال کی صورت میں اُتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی کہ خونی رشتوں اور انسانی قدروں کی پاسداری کرنے والوں کے لیے۔ معیارات مختلف سہی مگر انفرادی طور پر قدر و

قیمت وہی ہوتی ہے۔لہٰذا اس طرح ہماری کمزوری کی اہمیت ایک ہی ہے، کسی سے کم یا زیادہ نہیں۔یعنی تمہارے لیے پیسا عزیز ہے اور ہمارے لیے کسی کی زندگی۔رہی بات طلسم نور ہیرے کی تو وہ جب تک میرے پاس تھا تو اور بات تھی، مگر اب وہ حکومت کے اختیار اور ریاست کے جائز قبضے میں جا چکا ہے، اس پر میرا یا کسی اور کا حق نہ تھا۔وہ ملک وقوم کی امانت تھا اور اپنی جگہ پر پہنچ چکا۔رہی بات اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کی تو وہ میری ملکیت ہی نہیں، ہاں! اس پر میرا ایک تصرف تھا، مگر اب وہ بھی نہیں رہا۔بجز اس کے کہ میں اس میں سے صرف پندرہ فیصد کا مالک ہوں، وہ بھی اخلاقاً...... یہ لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ یہ مجھے کسی نے منہ بولے بیٹے کی حیثیت سے دیے تھے، مگر میں انہیں قبول نہیں کروں گا۔وہ جس کی ملکیت ہیں اُسی کے اختیار میں جائیں گے۔" میں نے بھی ان کی طرح ایک بات ختم کر کے تھوڑا توقف کیا۔وہ دونوں عجیب سے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ جیسے پوچھنا چاہ رہے ہوں کہ اب کیا کرنا چاہیے؟

"آپ اس طرح ہم سے بلف کریں گے تو یہ ڈیل کیسے ہوگی؟" آخرالذکر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"میں کوئی بلف نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔"میں وہی کچھ کہہ رہا ہوں جو کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔طلسم نور ہیرے کو قومی سطح پر ڈکلیئر کر دیا ہے، جبکہ اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں سیٹھ منظور وڑائچ کی وصیت ایک ٹھوس ثبوت کے طور پر موجود ہے۔"

میری بات سن کر وہ دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔تب ہی اول الذکر نے میری طرف دیکھ کر کہا..."اگر یہ بات ہے تو ڈیل کس بنیاد پر کی جائے......؟" پہلے والے نے مکاری سے اپنی گوٹ "اسٹاپ" سے ہٹا کر مہرے خانے پر رکھ دی۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" میں نے بھی اپنے شانے اچکا دیے۔

کمرے میں لمحہ بھر کی خاموشی طاری رہی۔اس کے بعد پہلے شخص نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے ڈیل، ڈیڈلاک میں چلی گئی۔" پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تو آخرالذکر نے بھی جگہ چھوڑ دی۔ہم جوں کے توں اور بظاہر بے پروا سے بیٹھے رہے۔

"ٹھیک ہے۔" نصف گنجے سر والے نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔"ہم میڈم سے بات کر لیتے ہیں۔میرا انہیں خیال کہ ان کے پاس اور کوئی دوسرا آپشن ہو۔"

میں جانتا تھا کہ...اول الذکر مجھے اُکسانے کے لیے ایسا کہہ رہا تھا، تاکہ میں خود انہیں کوئی آپشن دوں...... لہٰذا میں نے انہیں موقع دیا اور بولا۔

"میرے پاس ایک آپشن ہے۔"

"کون سا......؟" دونوں بیک وقت میری طرف دیکھ کر بولے تھے۔صاف لگتا تھا کہ انہیں اچھی طرح یہ سکھا کر بھیجا گیا تھا کہ اس ڈیل سے متعلق بات کر کے ہی لوٹیں۔

"یہی کہ...... عابدہ کی رہائی سے متعلق اگر بے بی نوشابہ اور اس کے بیک سپورٹر کوئی مدد کر سکتے ہیں تو میں بدلے میں ان کی دشمنی فراموش کر دوں گا۔"

میں نے دانستہ نوشابہ کو "میڈم" کے بجائے "بے بی" اور "بیک سپورٹر" کا "ٹچ" لگایا تھا۔میری بات نے ان کے گھمنڈ کا تیا پانچا کر کے رکھ دیا۔وہ منہ بسور کر مصافحہ کیے بغیر لوٹ گئے۔

اُن کے جانے کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد نوشابہ کا فون آ گیا، جس کا مجھے اندازہ تھا اسی لیے میں نے پہلے ہی سے کبیل دادا کو بریف کر دیا تھا۔اسی نے فون اُٹھایا۔

"ہیلو...... کبیل دادا بول رہا ہوں۔" اس نے گمبھیر آواز میں کہا۔اسپیکر آن کر دیا تھا۔

"شہزی سے بات کراؤ......" انداز تحکمانہ تھا مگر کبیل دادا نے بھی بارعب سے لہجے میں کہا۔

"وہ اب آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتے۔آپ نے جو کہنا ہے مجھ سے کہہ دیں، میں آپ کی بات......" کبیل دادا نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ دوسری جانب سے اسموتھ ٹون کی آواز ابھرنے لگی۔کبیل دادا نے زہرخند مسکراہٹ سے فون رکھ دیا۔

"او خیر......! بڑی آکڑ ہے اس چھٹانک بھر لڑکی میں......" اول خیر نے ہولے سے تبصرہ کیا۔

☆☆☆

تین روز بعد زورآور خان آ دھمکا۔وہ ہمارے ویزے اور پاسپورٹ لایا تھا۔یہ سفری کاغذات ہمارے اصل ناموں سے تھے۔(اب اول خیر کی جگہ کبیل دادا کا نام شامل کر دیا گیا تھا، جس کے بارے میں زورآور خان کو بتا دیا گیا تھا)

مجھے تین روز بعد اپنے اصل نام کے ساتھ تھائی لینڈ ایک ٹورسٹ کی حیثیت سے روانہ ہونا تھا۔وہاں کا ویزا ایک ماہ کا تھا۔تھائی لینڈ کے ایک ہوٹل میں میرے دو دنوں کے

قیام کا بندوبست تھا۔ دوسرے روز زورآور خان کا ایک آدمی (ساتھی ایجنٹ) مجھے اپنے ساتھ لے جائے گا اور میری ایک ہفتے کے اندر اندر وہاں سے امریکا روانگی کا بندوبست کرنا اسی کے ذمے تھا جبکہ کبیل دادا اور شکیلہ دو روز بعد ہی دبئی کے لیے اسی طرح اپنے اصل ناموں سے روانہ ہوں گے اور وہاں بھی انہیں زورآور خان کا کوئی آدمی ملے گا جو اُن کے لیے بھی امریکا روانگی کا بندوبست کرے گا۔

تھائی لینڈ اور دبئی کے راستے امریکا روانگی سے متعلق زورآور خان نے کچھ ضروری کاغذات اِدھر ہی تیار کروا لیے تھے بلکہ بقول اس کے وہ پہلے سے تقریباً تیار ہی تھے، جو تھوڑی بہت کمی بیشی، جسے دانستہ رہنے دیا گیا تھا، وہ ان مذکورہ ملکوں میں موجود ہم سے ملنے والے اس کے ساتھی ایجنٹوں نے اپنے طور پر مکمل کرنا تھے۔ مجھے تھائی لینڈ سے جس انڈین نوجوان کے روپ میں روانہ ہونا تھا اس کا نام راجیش کمار تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس کے بارے میں زورآور خان ہمیں پہلے ہی بریف کر چکا تھا۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا، یہ ایک غیر معروف اور فلاپ شدہ بھارتی ایکٹر تھا، جو بعد میں بھارتی فلم انڈسٹری میں ''اسٹنٹ مین'' کے طور پر کام کرنے لگا تھا۔ اس کے جینوئین کاغذات کے مطابق وہ ایک عرصے سے تھائی لینڈ میں مقیم تھا، جہاں وہ حادثاتی طور پر منشیات کے ایک بڑے ریکٹ مافیا کے نرغے میں آکر کراس فائرنگ میں ہلاک ہو گیا تھا۔

اس ہنگامے میں اور بھی کئی لوگ مارے گئے تھے، چند ایک کی شناخت نہ ہو سکی تھی، ان میں ایک راجیش کمار بھی تھا۔ زورآور خان کے ''دو نمبر'' کی آڑ میں ایک نمبر کام کرنے والے آدمی ایسے ''غیر شناخت شدہ'' لاشوں کے سفری کاغذات کو اپنے قبضے میں کرنا خوب جانتے تھے۔ اگرچہ راجیش کمار اور میرے قد کاٹھ میں کوئی خاص فرق نہ تھا تاہم ناک نقشے کے کچھ زاویے واضح طور پر مختلف تھے۔ باقی رنگ اور آنکھیں اور بالوں کے اسٹائل میں کوئی فرق نہ تھا۔ زورآور خان کے کہنے کے مطابق تھائی لینڈ میں مقیم اس کے آدمی ان تفاوت کو دور کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

بالکل اسی طرح کبیل دادا اور شکیلہ کے بہروپ میں جو بھارتی جوڑا تھا، وہ ہنی مون منانے کے لیے بھارت سے دبئی آیا تھا۔ وہاں وہ ایک بس کے حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ بس میں آگ لگنے کی وجہ سے کئی مسافروں کی لاشیں جھلس گئی تھیں ان میں چند کی شناخت ممکن نہ ہو سکی تھی۔ مگر زورآور خان کے ''گدھ مار کا'' ساتھی جو اپنے ''کاروبار'' کے سلسلے میں ایسے مواقعوں کی تاڑ میں رہتے تھے، فوراً حرکت میں آجاتے تھے۔

ان دونوں میاں بیوی کے کاغذات بھی ان کے پاس موجود تھے۔ مرد کا نام پریم داس تھا اور بیوی کارتی دیوی تھا۔

قد و قامت کوئی خاص مسئلہ نہیں ہوتا، لیکن شکل، صورت اور رنگ و روپ کی قریب قریب مماثلت کے اتفاقات پر ہمیں اچنبھا ضرور ہوا تھا۔ ہم نے حیرت سے زورآور خان سے اس سے متعلق سوال پوچھا تھا تو اس نے حسبِ عادت بڑے معنی خیز انداز میں اپنی مٹھی میں دبی سگریٹ کا سوٹا لگا کر کہا۔

''اتفاق کیسا بابا؟ یہ پورا ایک گروہ ہے ایک منظم گروہ...... جن کا کام ہی یہی ہے اور سمجھو تو ایک طرح سے میں بھی یہاں ان کا ایک ایجنٹ ہی ہوں...... ان کے پاس ایسی البموں کی بھرمار ہے۔ جو مطلوبہ دانے قریب قریب مماثلت والے ملتے ہیں، وہ چن لیے جاتے ہیں اور باقی کی تھوڑی بہت کمی بیشی ہمارے ایکسپرٹ پوری کر لیتے ہیں۔ کام مشکل اور رسکی ضرور ہوتا ہے، مگر چل جائے تو فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے۔''

''یعنی ہمارے کام میں بھی رسک ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''بہت کم......'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے بہت تلاش اور سرکھپائی کے بعد ہی یہ تین دانے ایسے تلاش کیے ہیں جو تم تینوں پر بالکل فٹ بیٹھتے ہیں۔''

زہرہ بیگم نے زورآور خان کو معاہدے کے مطابق نصف رقم ادا کر دی۔ ہم کچھ ضروری شاپنگ میں مصروف ہو گئے۔ ہم نے اپنی طرف سے اس سارے معاملے کو خفیہ رکھنے کی اپنی سی پوری کوشش کر رکھی تھی۔ زورآور خان کو بھی اسی بات کی تاکید کر دی تھی، وہ آنے سے پہلے کال کرتا تھا اور بیگم ولا سے ہی دو آدمی اسے لانے اور چھوڑ جانے کے لیے مامور تھے۔

زورآور خان نے ہی ہماری تھائی لینڈ اور دبئی کی ٹکٹوں کا بندوبست کیا تھا۔ پہلے کبیل دادا اور شکیلہ کو روانہ ہونا تھا۔ ان کے دبئی پہنچتے ہی ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں ائرپورٹ پر زورآور خان کا آدمی ملتا جو انہیں اپنے ساتھ لے جاتا، وہاں کبیل دادا اور شکیلہ کو تین دن قیام کرنا تھا۔ ایسا سفری کاغذات اور دیگر لوازمات کی ''باقیات'' پوری کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ گویا کبیل دادا اور شکیلہ سب سے پہلے امریکا کی اس سفری اور کامیاب آزمائش سے گزرتے اور ان

دونوں کی دبئی سے بہ خیریت روانگی اور یہ تسلی ہوتے ہی کہ زور آور خان "ٹھیک" جا رہا تھا۔ پھر مجھے روانہ ہونا تھا۔

مقررہ دن پہلی روانگی تھی اس لیے اس روز مشن کی کامیابی کے لیے بیگم ولا میں ہی اجتماعی دعا کی تقریب کی گئی جس میں اماں اور ابا جان بھی شریک تھے اور دعا ماں جی نے ہی کروائی تھی۔ ماں نے بڑے دلگیر اور خضوع و خشوع سے اللہ ربّ العزت کے حضور میرے اس مشن میں کامیابی کی دعا مانگی تھی، جس سے مجھے ایک عجیب سا حوصلہ اور ہمت عطا ہوئی تھی۔ بیگم ولا کی اُوپری منزل کے ایک بڑے ہال میں عصر اور مغرب کی باجماعت نماز بھی ادا کی گئی تھی۔ جس کی امامت ابا جی نے ہی کی تھی۔ دعائیہ تقریب بھی وہیں ہوئی تھی۔ ایک دن پہلے قرآن خوانی بھی کی گئی تھی۔

کبیل دادا اور شکیلہ کی فلائٹ شام پانچ بجے کی تھی۔ انہیں ملتان انٹرنیشنل ائرپورٹ سے دبئی کے لیے روانہ ہونا تھا جبکہ مجھے لاہور سے۔ ایسا مصلحتاً کیا گیا تھا۔

ان دونوں کی روانگی کا منظر بھی بڑا جذبات انگیز اور دل گیر سا تھا۔ کبیل دادا اور شکیلہ کو بظاہر عام انداز میں ہی بیگم ولا سے رخصت کیا گیا تھا یعنی ان دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہ تھا۔ کار میں دونوں اکیلے تھے۔ کبیل دادا اسٹیرنگ پر تھا جبکہ شکیلہ اس کے برابر میں براجمان تھی۔ لیکن...... ان کی روانگی سے بیس منٹ پہلے ہی ایک اور کار مین چوراہے پر پہلے سے کھڑی تھی جس میں زہرہ بانو کے دو مسلح گارڈ موجود تھے۔ کبیل دادا اور شکیلہ کی کار ائرپورٹ کے لیے بیگم ولا سے روانہ ہوئی تو مذکورہ چوراہے پر کھڑی کار حرکت میں آ گئی۔ یہ ان کی حفاظت اور اس خدشے کے پیش نظر کیا گیا تھا کہ...... اگر کوئی کبیل دادا اور شکیلہ کی کار کا تعاقب کر رہا ہو تو وہ آخرالذکر دو افراد کی نظروں میں آ جائے۔

بہرحال مشن میں روانگی کا یہ پہلا مرحلہ بہ خیر و خوبی نمٹا لیا گیا حتیٰ کہ کبیل دادا اور شکیلہ کی فلائٹ دبئی کی طرف پرواز کر گئی۔ ان کی کار زہرہ بانو کے آدمی ائرپورٹ سے واپس بیگم ولا لے آئے۔

دبئی پہنچتے ہی کبیل دادا نے ہمیں اپنی خیریت کی اطلاع دی اور یہ بھی بتا کر تسلی کر دی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں زور آور خان کے جس آدمی نے ان سے ملنا تھا، وہ بھی مل گیا تھا۔ اب کچھ دن بعد ان کو بھارتی جوڑے کے بھیس میں امریکا روانہ ہونا تھا۔

اصل مرحلہ ابھی باقی تھا۔ بقول اول خیر اور زہرہ بانو کے اگر کبیل دادا اور شکیلہ بہ خیریت دبئی سے امریکا روانہ ہو جاتے ہیں تو سمجھو میرے لیے بھی تھائی لینڈ سے امریکا روانگی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

یہ تین سے چار دن بہت انتظار اور بے چینی میں گزر گئے اور بالآخر زور آور خان کے مذکورہ آدمی نے یہ خوش خبری سنا دی کہ کبیل دادا اور شکیلہ امریکا روانہ ہو چکے ہیں۔ ان دونوں کی روانگی سے ہمیں کافی حوصلہ ملا۔

اس کے اگلے دن کی میری لاہور روانگی کی تیاری تھی۔ بینکاک (تھائی لینڈ) کی پرواز تھائی ائر میں ٹکٹ کنفرم ہو چکی تھی۔

اس اہم مشن میں روانگی کا بالآخر یہ دوسرا مرحلہ بھی آن پہنچا۔ میری یہ روانگی تنہا تھی۔

ملتان سے پہلے تو لاہور کا چار پانچ گھنٹوں کا سفر درپیش


کراچی

ماہنامہ

پاکیزہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی...؟ پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی
ماہنامہ پاکیزہ
اپنے ہاکر سے بک کروا لیں

تھا اس کے لیے مجھے چھ سات گھنٹے پہلے ہی نکلنا تھا۔ اسی سبب میں نے روانگی سے ایک رات پہلے ہی ملتان سے لاہور پہنچنے کا پروگرام بنایا تھا۔ تاکہ کچھ گھنٹے لاہور کے کسی ہوٹل میں آرام کرنے کے بعد صبح ائرپورٹ پہنچ جاؤں۔ لہٰذا شام سے ہی میں رخصتی کی تیاری باندھنے لگا۔

اماں اور اباجی نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ زہرہ بانو کا چہرہ ستا ہوا تھا، آنکھیں نمناک سی تھیں۔ وہ بار بار اضطراری انداز میں اپنے نرم لبوں پہ زبان پھیرتی اور کچھ کہنے کی کوشش کرتی تھی لیکن شاید الفاظ گلے کی رقت میں ہی گھٹ کر رہ جاتے۔ تب میں نے ہی اس سے کہا۔

''زہرہ! میں جانتا ہوں تم میری کامیابی اور عابدہ کی بہ خیریت واپسی کی تہِ دل کے ساتھ دعا گو ہوگی، لیکن تم کو یہاں اپنا اور ماں جی اور ابوجی کا بھی خیال رکھنا۔ اول خیر یہاں موجود ہے اور دیگر ساتھی بھی۔ میں فون پر بھی رابطے میں رہوں گا۔ اب خان جی سے زیادہ روابط بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں ریاض باجوہ صاحب کا نمبر دے چکا ہوں، ان کی ضرورت پڑے تو اول خیر کو ساتھ رکھ کر ان سے بات کر لینا۔ وہ اول خیر کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔''

پھر یہی کچھ میں نے اول خیر سے بھی کہا۔ اس بے چارے کا چہرہ بھی اُترا ہوا تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ میرے ساتھ نہیں جا رہا تھا مگر میری کامیابی کا تہِ دل سے متمنی تھا۔

جب میں روانگی کے لیے قدم بڑھانے لگا تو زہرہ بانو کے تھرکتے لبوں سے بکھرے بکھرے سے الفاظ بمشکل ہی برآمد ہوئے۔

''شش...... شہزی! تم اپنا خیال رکھنا...... میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں اس نیک مقصد میں کامیاب کرے۔ تم ایک خطرناک مشن پر جا رہے ہو۔ لیکن مجھے تسلی اس بات کی ہے یہ جنگ ذاتی جنگ نہیں ہے بلکہ حق کی باطل کے خلاف جنگ ہے اور اس میں اللہ کی مدد ضرور شامل ہوتی ہے۔ کیونکہ عابدہ نے ایک انسان کی زندگی بچانے کے لیے یہ قدم اُٹھایا تھا اور تمہاری طویل جدائی کا صدمہ ہی نہیں اُٹھانا پڑا بلکہ بعد میں اس بے چاری کو ایک گھناؤنی سازش کا نشانہ بنا کر بے گناہ پھنسا دیا گیا۔''

وہ اتنا کہہ کر چپ ہوگئی۔ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''تم فکر نہ کرو زہرہ! میرا بھی اسی بات پر ایمان ہے کہ جہاں بھی نیک مقصد تھا وہاں اللہ ربّ العزت نے میری ضرور مدد فرمائی اور وہ آگے بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔''

''ایسا ہی ہوگا۔ انشاء اللہ!''

''او خیر...... کا کے!'' آخر میں اول خیر میرے گلے لگا۔ اس کا لہجہ بھی بوجھل بوجھل سا تھا۔ ''وہ آخر میں اتنا ہی کہہ سکا۔ ''راب راکھا میرے یار......!''

میرے پاس فقط ایک ہلکے سبز رنگ کا کیری (چھوٹا سا سفری ٹرالی بیگ) تھا۔ میں اکیلا ہی کار میں سوار ہوا تھا۔ زہرہ بانو اور اول خیر لاہور تک میرے ساتھ جانا چاہتے تھے، مگر میں نے کسی وجہ سے انہیں منع کر دیا۔ کچھ سیکیورٹی رسک کے پیشِ نظر اور کسی قسم کی اشتباہ انگیزی سے بچنے کے طور پر بھی میں اکیلا ہی روانہ ہونا چاہتا تھا۔ اُن دونوں آدمیوں کو بھی میں نے اپنے پیچھے آنے سے منع کر دیا تھا، دوسرے یہ کہ میں کوئی کار نہیں لے جا رہا تھا بلکہ میرا ارادہ ٹیکسی کار کرانے کا تھا۔

''ملتان سے لاہور کا سفر خاصا طویل ہے۔ مجھے عام آدمیوں کی طرح جانے دو تو زیادہ بہتر ہے، میں لاہور پہنچ کر عام سے ہوٹل میں قیام کروں گا اور اپنی خیریت اور روانگی کی بھی اطلاع کر دوں گا۔'' میں نے زہرہ اور اول خیر کی تسلی کی خاطر کہا۔

لہٰذا اسی پلاننگ کے تحت میں ملتان سے تقریباً سات بجے روانہ ہو گیا اور لگ بھگ دس بجے تک لاہور پہنچ گیا۔ کار والے کو کرایہ ادا کیا اور اپنا کیری سنبھالے قریبی ہوٹل کی راہ لی۔ وہاں پہنچ کر میں نے بیگم ولا اطلاع کر دی۔

اگلے دن صبح سویرے میں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور ٹیکسی کر کے ائرپورٹ پہنچ گیا۔

یہ میرا باقاعدہ طور پر بیرونِ ملک پہلا سفر تھا۔ ایک ایسے دیارِ غیر کا رخ کرنا جہاں میں پہلے کبھی نہیں گیا، میرے اندر ایک عجیب سی سنسنی پیدا کرنے کا سبب بن رہا تھا۔ ائرپورٹ کی اندرونی فضا میں قدم رکھتے ہی یکلخت کئی تصورات میرے اندر جاگ اٹھے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں خیالی ہواؤں کی سنگت میں سرحد پار نجانے کہاں کہاں نکل گیا ہوں۔ گویا ملکوں ملکوں پہنچ گیا ہوں۔ ایک عجیب ہی سحر ہوتا ہے ائرپورٹ کا بھی۔

اپنے وطن اور اپنے لوگوں کی اور بات ہوتی ہے۔ مانوس فضا کا اپنا پن فطری اعتماد بخشتا ہے لیکن ایک ایسے شہر

خرابہ بلکہ میں اسے ملک خرابہ ہی کہوں گا جس کا نام تھائی لینڈ تھا۔ جہاں میں کبھی نہیں گیا تھا مگر اس کے متعلق سن ضرور رکھا تھا لیکن صرف سننے سے کام نہیں چلایا جاسکتا۔ دیکھنا، مشاہدہ اور اس کے ماحول کے گردشِ ایام میں قدم رکھنا اور بات ہوتی ہے۔ پاکستان سے کئی لوگ بیرونِ ملک آتے جاتے ہوں گے۔ ان کے لیے تفریح اور خوشی کی بات ہوتی ہوگی۔ جو پہلی بار بیرونِ ممالک عازمِ سفر ہوتے ہوں، ان کے بھی جذبات میں صرف اور صرف مسرت انگیزیاں ہی پرورش پاتی ہوں گی، کیونکہ...... ان کا مطمحِ نگاہ صرف سیر سپاٹا یا کاروباری مصروفیات ہوتا ہے۔ وہ خوشی خوشی جاتے ہیں، انجوائے بھی کرتے ہیں اور اپنا کوئی کام ہو تو وہ بھی خوش اسلوبی سے نمٹا آتے ہیں۔ جبکہ...... میرا معاملہ اور تھا۔ بدقسمتی سے میں اس قسم کی مسرتیں اور خوشیاں کشید کرنے سے قاصر ہی تھا بلکہ اس کے برعکس میرا دل ہی نہیں پورا وجود وسوسہ انگیز اور اندیشناک خیالات کی زد میں تھا۔ کیونکہ میں گھومنے پھرنے کی نیت سے جا رہا تھا نہ ہی کسی کاروباری سلسلے میں کہ چلو اس بہانے باہر کی دنیا بھی دیکھ لی جائے۔ میرا مسئلہ گمبھیر تھا۔ میں ایک جنگ لڑنے جا رہا تھا۔ جنگ بھی کیسی کہ جہاں پہلے ہی سے میرے ازلی دشمن دانت نکوسے مجھے بھنبھوڑ ڈالنے کے لیے تیار بیٹھے تھے اور جیسے میں خود کو ان کے سامنے پلیٹ میں پیش کرنے جا رہا تھا۔ ٹائیگر فیک، باسکل ہولارڈ اور لولودش...... میری راہ کے سب سے بڑے کانٹے بلکہ خطرناک پھندے تھے۔

بلاشبہ حالات نے جن ہنگاموں میں اب تک میری پرورش کی تھی، ان کی نوعیت کچھ اور تھی۔ حتیٰ کہ انڈیا اور انڈیمان کے دلدلی اور خطرناک اندھیارے جنگلوں میں ہونے والی میری خوں ریز جنگ کی بھی، مجھے اس نئی جنگ کے مقابلے میں کوئی حیثیت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جس میں خدا نے مجھے سرخرو کیا تھا اور مجھے اپنی یا اپنے کسی عزیز ساتھی کے جانی نقصان سے محفوظ رکھا تھا۔ تب ہی میری سوچوں کا رخ کبل دادا اور شکیلہ کی طرف چلا گیا اور میرا دم گھٹنے لگا۔ میں اس سے آگے سوچنے کا اہل ہی نہیں رہا۔

ائرپورٹ کی فضا میں قدم رکھتے ہی ان آسیبی خیالات سے چھٹکارا پانا میرے لیے دوبھر ہو گیا تو میں نے پلاسٹک گلاس میں اپنے لیے چائے لی اور ایک طرف کھڑا ہو کے اس کی چسکیاں لینے لگا۔

”جو ڈر گیا، وہ مر گیا......“

معاً ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے یونہی چونک کر گردن گھمائی۔ وہ تین کھلنڈرے سے نوجوانوں کا گروپ تھا۔ ان میں ایک الٹرا ماڈرن لڑکی تھی، جس نے چست جینز اور اس پر پنک کلر کا ٹائٹ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ پینٹ کی بیلٹ سے اس نے ایک چرمی انولپ اٹرس رکھا تھا۔ باقی دو پاکستانی لڑکے تھے۔ لڑکی کے سلسلے میں پتا نہیں کیوں مجھے شبہ تھا کہ وہ ملکی نہیں تھی، شاید اس لیے کہ میں نے حال ہی میں ایک بڑا عرصہ انڈیا میں گزارا تھا، کیونکہ اس کے نقوش مجھے انڈین محسوس ہوئے تھے، بالخصوص اس کی آنکھیں اور ناک نقشہ تو بھارتی خواتین جیسا ہی لگتا تھا، تاہم اس کی سانولی رنگت میں بڑی کشش تھی۔ اس نے اپنے سیاہ بالوں کی چٹیا کر رکھی تھی۔ دونوں لڑکے امیرزادے نظر آتے تھے اور پتا چلتا تھا کہ یہ بھارتی دوشیزہ ان کی کوئی مشترکہ فرینڈ تھی، خاصی خوبصورت اور شوخ و شنگ نظر آتی تھی۔

ممکن تھا وہ کوئی پاکستانی ہندو لڑکی ہو اور یہیں کی رہائشی ہو، جبکہ دوستی اس نے امیرزادوں سے کر رکھی ہو۔ نظر ایسا ہی آتا تھا کہ ان امیرزادوں کے ساتھ اس لڑکی کی خوب گاڑھی جمتی تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ سیر سپاٹے کے لیے تھائی لینڈ جا رہے تھے۔ پاکستانی امیرزادوں کے لیے یوں بھی تھائی لینڈ اور بالخصوص بینکاک عیش پرستی کے لیے بہت آسان اور سہل جگہ تھی۔

”جو ڈر گیا، وہ مر گیا۔“ والا جملہ دو لڑکوں میں سے ایک نے ادا کیا تھا۔ لڑکی تو شاید اردو نہیں سمجھتی تھی، مگر شاید لڑکے نے اپنے ساتھی لڑکے کو سنانے کے لیے یہ لفظ کہا تھا۔

وہ شوخیاں اور خوش گپیاں کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اُن کا یہ پھینکا ہوا جملہ میری سماعتوں میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

”صحیح تو کہہ رہا تھا۔“ میں سر جھٹک کر ہنسا۔ میں ڈر نہیں رہا تھا۔ ڈر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں، ان میں ایک قسم بزدلی اور کم ہمتی کی بھی ہوتی ہے اور ایک کسی کے احترام میں ڈرنا ہوتا ہے۔ جیسے ماں باپ یا بڑا بھائی وغیرہ۔ تیسری قسم اندیشناک وسوسہ ہوتی ہے، جہاں سے بے نام خوف دل میں کسی غبار آلود دھوئیں کی طرح اُٹھتا ہے۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ اللہ کا نام لیا اور ٹائم ہوتے ہی ڈیپارچر کی طرف بڑھ گیا۔

دیواروں اور چھت پر نصب مختلف النوع اسپیکرز سے ہدایات اور اعلانات کی صورت روایتی سی آوازیں گونج رہی تھیں۔

بالآخر امیگریشن ڈیسک سے گزر کر جب میں نے

بورڈنگ سے فراغت پاکر تھائی ائرویز کے 777 بوئنگ کے اندر قدم رکھا تو ایسا ہی لگا جیسے میں بینکاک پہنچ گیا ہوں۔ بڑا پُرسکون اور ایک عجیب دبدبے والا ماحول تھا۔ اکانومی کلاس کی سیٹوں پر اگرچہ ملکی غیر ملکی براجمان تھے، مگر جہاز کا تھائی عملہ مخصوص ٹریڈیشنل یونیفارم میں الگ ہی بہار دکھا رہا تھا۔ فلائٹ اٹینڈنٹ سے لے کر اسٹیورڈ اور بالخصوص نرم و نازک سی دُبلی پتلی ائرہوسٹس پریوں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ یہ نیلے رنگ کی صاف ستھری اور نفیس یونیفارم میں ملبوس تھیں۔

ایسی ہی ایک اپسرا مثل تھائی ہوسٹس نے دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ میری سیٹ کی طرف رہنمائی کی اور میں ایک گہری سی سانس خارج کرتا ہوا براجمان ہوگیا۔ میں تھوڑا نروس سا ہوا تھا مگر جلد ہی سنبھل گیا۔ اب میں اپنے اندر ایک انوکھا اعتماد محسوس کر رہا تھا۔

میری سیٹ کھڑکی کے قریب تھی۔ تین رویہ سیٹوں کے سلسلے میں درمیان کی رو تنگ تھی، جبکہ دائیں بائیں کھڑکیوں کے ساتھ دو دو سیٹیں تھیں۔ ایسی ہی ایک سیٹ پر میں اپنا قبضہ جما چکا تھا۔ دروازہ لاک ہوتے ہی باوردی عملے کی معمولی سی ہلچل ہوئی، جسے پیشہ ورانہ حرکات و سکنات سے ہی تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ پیجنگ سسٹم پر پرواز اور تحفظ کے بارے میں رسمی اور روایتی سے اعلانات ہونا شروع ہوگئے۔

نو اسموکنگ کے سائن جل چکے تھے اور اس کے ساتھ ہی سیٹ بیلٹ باندھنے کی ہدایات جاری ہوئیں، جو میری طرح نئے تھے، ان کی مدد خوش الحان و دلکش مسکراہٹوں والی ہوسٹس کر رہی تھیں، مگر میں اپنی سیٹ بیلٹ خود ہی باندھ چکا تھا۔

جہاز میں ہلکی سی گھرگھراہٹ پیدا ہونا شروع ہو چکی تھی اور وہ رن وے پر ٹیکسی کرنے لگا تھا۔ ائرپورٹ کے سرے پر موجود کنٹرول ٹاور سے شاید اجازت لینے کے لیے وہ ذرا رکا تھا۔ اس کے بعد اس نے رن وے کا رخ کیا اور اس کی رفتار بتدریج بڑھتی چلی گئی، معمولی جھٹکے محسوس ہو رہے تھے۔ رفتار کی آخری نہج پر پہنچتے ہی جہاز کا اگلا حصہ اُٹھا اور تھوڑی دیر بعد ہی طائر لاہوتی کی طرح یہ آہنی پرندہ فضاؤں میں پرواز کر گیا۔

☆☆☆

اس سے لاہور کی فضاؤں سے گہرے سفید بادل اتنے نیچے آئے ہوئے تھے کہ زمین چھوڑنے کے کچھ ہی دیر بعد ہمارا طیارہ ان ہلکی بدلیوں میں سے گزرنے لگا۔

جہاز غیر محسوس انداز میں اپنی مطلوبہ بلندی کی طرف اُٹھتا جا رہا تھا۔ بڑھتی ہوئی اس بلندی کا اندازہ نیچے زمین کے مناظر دیکھ کر ہوتا تھا۔ اس کے بعد جب جہاز کا رخ سیدھا ہوا تو عملہ حرکت میں آگیا۔ وہ مشروبات اور دیگر لوازمات کی ٹرے لیے مسافروں کی خدمت میں جت گئے۔

میرے ساتھ والی نشست خالی تھی۔ یہ ممکن تھا کہ وہ خالی ہی ہو، کیونکہ کوئی وہاں ہوتا تو اب تک براجمان ہو چکا ہوتا۔ میں نے شکر کیا کہ چلو اچھا ہوا کھلا ڈلا ہو کے بیٹھوں گا حالانکہ سیٹیں یوں بھی آرام دہ اور کھلی کھلی تھیں۔ تاہم پھر بھی میں نے اس پیاری سی تھائی ہوسٹس سے پوچھ ہی لیا جس نے اخلاقاً قدرے خم ہوتے ہوئے مشروبات سے سجی ٹرے میری طرف بڑھائی تھی۔

”کیا یہ نشست واقعی خالی ہے؟“ مسکرا کر کہتے ہوئے میں نے اپنے لیے ایک لیمن جوس کا گلاس اُٹھا لیا۔ سوال میں نے انگریزی میں ہی کیا تھا۔

”ہوسکتا ہے......“

”ہوسکتا ہے۔“ میں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ تب ہی جواب میں اس نے بھی مسکراتے ہوئے انگریزی میں ہی بتایا کہ یہ آدمی اپنے کسی جاننے والے کے ساتھ بیٹھا ہے، اس کی برابر والی سیٹ بھی خالی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ وہیں بیٹھا رہے۔

وہ...... مجھ سے پچھلی سیٹ کے مسافروں کو سرو کرنے لیے سیدھی ہوئی اور قدم بڑھایا ہی تھا کہ بولی۔

”او...... میرا خیال ہے وہ آرہا ہے۔“ کہہ کر وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئی، میں نے آنے والے کو دیکھنا گوارا نہ کیا اور لیمن جوس کے یکے بعد دو گھونٹ بھر کے کھڑکی سے باہر کی فضا دیکھنے لگا۔

تب ہی کوئی میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ٹھیک اسی وقت میرے کانوں سے ایک بھرائی ہوئی سی آواز ٹکرائی جس پر لمحے بھر کو مجھے کچھ شناسائی کا گمان گزرا تھا۔

”تھائی لینڈ کا سفر مبارک ہو مسٹر شہزاد احمد خان عرف شہزی......!“

میں نے ٹھٹک کر گردن گھما کے اس کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے پورے طیارے میں بھونچال آگیا ہو......

**خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ**

اس وقت صبح کے دس بج چکے تھے۔ اگرچہ یہ سردیوں کا موسم تھا مگر مطلع صاف ہونے کی وجہ سے سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا جس کی وجہ سے گراہم اور جارڈن کو بھی اپنے چہروں پر دھوپ کی خوشگوار تمازت کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ دونوں اپنے گھر کے باہر چھوٹے سے لان میں بیٹھے کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ اُن کے چہروں سے پریشانی مترشح تھی۔ گراہم اور جارڈن دونوں بھائی تھے اور

# ناکام کامیابی

**شاکر لطیف**

زندگی بہتے پانی کے مانند ہمیں اِدھر سے اُدھر بہا کے لے جاتی ہے... تقدیر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیتی ہے... ہم ان دونوں کے درمیان اسیر ہو کر دہشت ناک آوازیں سنتے ہیں اور صرف اپنے راستے میں کھڑی رکاوٹوں اور دیواروں کو دیکھتے ہیں... ایسے ہی دو بھائیوں کی زندگی کے دردناک اوراق... وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئے... اپنی زندگی کو پُرسکون و پُرآسائش بنایا... مگر اچانک ہی ایسی لہر اٹھی کہ زندگی کے خوب صورت پل روٹھ گئے... اور سب کچھ بکھر گیا... وہ چاہتے تھے کہ زندگی لوٹ آئے...

**ہار کے جیت جانے والے ناکام کامیاب پرستوں کا پُرلطف ماجرا......**

غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے اکیلے ہی رہائش پذیر تھے۔ گراہم کی عمر اکتیس برس تھی۔ وہ جارڈن سے ایک برس چھوٹا تھا۔ وہ دونوں امریکی شہری تھے اور امریکی شہریت رکھتے تھے مگر امریکا ان کا آبائی وطن نہیں تھا۔ ان کا آبائی وطن اور جنم بھومی امریکا کی ہمسایہ ریاست میکسیکو تھی۔ وہاں سے وہ تقریباً دس برس پہلے اپنے والدین کی وفات کے بعد نئے مستقبل کی تلاش میں امریکا آئے تھے۔ کیونکہ یہاں روزگار کے مواقع زیادہ تھے۔ امریکی شہریت حاصل کرنے کے لیے انہیں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے، یہ ایک الگ کہانی تھی۔ بہرحال انہوں نے امریکا میں سخت محنت کی اور یہاں اپنا ایک چھوٹا سا ذاتی گھر بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اب وہ دونوں سنجیدگی سے اس بارے میں سوچنے لگے تھے کہ شادی کرلیں۔ شاید وہ اپنے اس فیصلے پر عمل بھی کر گزرتے مگر اچانک وقت نے ایسی کروٹ لی کہ وہ اپنا ارادہ ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انہیں اپنے ایک نئے کاروبار میں شدید نقصان کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کاروبار میں وہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے بعد برباد کر چکے تھے۔ اتنا بڑا نقصان شاید ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ گویا وہ آسمان سے یکلخت زمین پر آگرے تھے۔ پیسے اپنے ہوتے تو شاید وہ یہ نقصان برداشت کر بھی لیتے مگر ان کی پریشانی کی اصل وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے گھر کی ضمانت پر بینک سے قرضہ لے کر یہ بزنس شروع کیا تھا اور اب قرضہ واپس کرنا تھا۔ بینک کے پاس ان کے گھر کی نیلامی کا قانونی حق موجود تھا۔ اب سے کچھ دیر پہلے انہیں بینک کی جانب سے قانونی نوٹس موصول ہوا تھا جس میں قرض کی مع سود واپسی کی آخری تاریخ دی گئی تھی بصورت دیگر بینک ان کے گھر کی نیلامی کا عمل شروع کر دیتا۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

”میرے خیال میں مکان کی فروخت کے سوا ہماری جان چھوٹنے کا کوئی حل نہیں ہے۔“ جارڈن نے کافی دیر کی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

”اس اطلاع کا شکریہ۔“ گراہم نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

”میں نے تمہیں سمجھایا بھی تھا کہ گولڈ میں رقم انویسٹ مت کرو مگر تمہاری عقل پر پردہ پڑ گیا تھا۔“ گراہم کا استہزائیہ لہجہ سن کر جارڈن کو بھی غصہ آگیا۔

”سب کچھ تمہاری مرضی سے ہی ہوا تھا۔“ گراہم نے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم چاہتے تو اپنا حصہ الگ کر سکتے تھے مگر تمہارے دل میں بھی لالچ تھا اور پھر یہ حقیقت ہے کہ اس میں لگائے گئے پیسے بڑی تیزی سے دگنے ہوتے ہیں۔ اب یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ جس وقت ہم نے گولڈ میں انویسٹ کیا، اس کی چڑھتی ہوئی قیمتیں یکلخت گرنا شروع ہو گئیں اور بتدریج گرتی ہی چلی گئیں حتیٰ کہ ہمارا سارا سرمایہ ڈوب گیا۔“

”اپنی کوتاہیوں اور حماقتوں کا الزام قسمت کے سر تھوپ دینا تمہاری پرانی عادت ہے۔“ جارڈن کا غصہ بدستور برقرار تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس بزنس میں زیادہ تر لوگوں نے نقصان ہی اٹھایا ہے۔ تم مان کیوں نہیں لیتے کہ ہم نے لالچ میں آکر ایک غلط بزنس میں انویسٹ منٹ کر دی تھی۔“

”شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔“ گراہم نے اس بار تفہیمی لہجہ اختیار کرلیا۔ ”مگر اب ایک دوسرے کو کوسنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ عنقریب ہمارا یہ گھر بھی بک جائے گا۔ ہمیں اب نئے سرے سے محنت کرنا ہوگی پھر سے اپنی زندگی بنانا ہوگی۔“

”اور اس کے لیے مزید دس برس لگ جائیں گے۔“ جارڈن نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ”گویا ہماری دس برس کی سابقہ محنت اکارت گئی۔ ہم پھر اسی جگہ پہنچ گئے جہاں دس برس پہلے تھے۔“ گراہم نے جارڈن کی بات کا جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اسی لمحے گھر کے سامنے رکنے والی گاڑی نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ گاڑی سے اسی بینک کا منیجر برآمد ہوا جس کے وہ مقروض تھے۔ اس کا نام براؤن تھا۔ وہ دونوں اسے ذاتی طور پر بھی جانتے تھے، براؤن ایک پُرخلوص شخص تھا اس نے پوری ایمانداری سے ان دونوں کی بینک کے قرضے کی واپسی کو یقینی بنانے کے لیے کوشش کی تھی حتیٰ کہ انہیں بینک کی طرف سے ایک ماہ کی اضافی مہلت بھی لے کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گراہم اور جارڈن، براؤن کی تہ دل سے عزت کرتے تھے۔ ہنس مکھ براؤن تقریباً ان کا ہم عمر ہی تھا۔

”لو بھئی براؤن بھی آگیا۔“ جارڈن نے اسے دیکھ کر گراہم سے کہا۔ ”لگتا ہے وہ ہمارے لیے کوئی بُری خبر لے کر آیا ہے۔“

”ہمیں تمام بُری خبریں پہلے سے ہی مل چکی ہیں۔“ گراہم نے جواب دیا۔ ”مگر براؤن کیوں آیا ہے؟ بینک کا نوٹس تو ہمیں پہلے سے ہی موصول ہو چکا ہے۔“

"ہیلو برادرز کیسے ہو؟" براؤن نے کہا اور پھر ان کے قریب موجود ایک خالی کرسی پر براجمان ہوگیا۔

"ہم ٹھیک ہیں۔" گراہم نے مسکرا کر جواب دیا پھر بولا..."تم اپنی سناؤ؟ کیسے آنا ہوا؟"

"میں نے سوچا تم سے مل کر پوچھوں کہ بینک کا قرض واپس کرنے کا کوئی بندوبست ہوا؟" براؤن نے کہا۔"میرا خیال ہے کہ تمہارا یہ گھر اتنی مالیت کا تو ہے کہ بینک اسے فروخت کر کے اپنا سارا قرضہ مع سود کے وصول کر سکے۔"

"ہمیں نوٹس میں اس بارے میں متنبہ کیا جا چکا ہے۔" جارڈن نے منہ بناتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

"تو پھر کیا پیسوں کا کوئی انتظام ہوا؟" براؤن نے استفسار کیا۔

"نہیں۔" جارڈن نے افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔"لگتا ہے تم لوگ ہمارے اس گھر کو نیلا کروا کر ہی دم لوگے۔"

"مجبوری ہے دوست۔" براؤن پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔"میں چاہتے ہوئے بھی اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔ کیونکہ میں اس بینک کا منیجر ہوں، مالک نہیں۔"

"ہمیں تمہارے خلوص پر شک نہیں ہے دوست۔" گراہم نے اس کی بات کا جواب دیا۔"تم نے اس معاملے میں ہماری ہر ممکن مدد کی ہے۔ یہ ہماری کوتاہی ہے کہ ہم قرضہ واپس کرنے میں ناکام رہے ہیں جس کا خمیازہ بھی ہمیں بھگتنا پڑے گا۔"

"میرے پاس تمہارے مسئلے کا ایک حل موجود ہے۔" براؤن نے پُراسرار سے انداز میں کہا تو گراہم اور جارڈن چونک پڑے۔

"کون سا حل؟" جارڈن نے پُراشتیاق لہجے میں سوال کیا۔

براؤن نے اس کی بات کا فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا بس خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ بات کرنے کے بارے میں تذبذب کا شکار ہو۔

"کیا بات ہے، براؤن تم خاموش کیوں ہو گئے؟" اسے اس حالت میں دیکھ کر گراہم نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"کیا میں تم دونوں پر اعتماد کر سکتا ہوں؟" براؤن نے قدرے توقف کے بعد کہا۔"میرے پاس تم دونوں کے لیے ایک کام ہے اگر تم اس کام کو کرنے کی ہامی بھر لو تو بدلے میں تمہیں دو لاکھ ڈالرز کی خطیر رقم حاصل ہوگی، تمہارا بینک کا قرضہ تو صرف پچاس ہزار ڈالر ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو، کھل کر بات کرو۔" گراہم نے تیز لہجے میں کہا۔"تمہاری آفر ہمارے لیے غیر متوقع اور حیران کن ہے۔" دو لاکھ ڈالرز کی رقم کا سن کر میں اتنا اندازہ تو لگا ہی سکتا ہوں کہ یہ آفر کسی غیر قانونی کام کے متعلق ہوگی۔" "تم ہم پر بھروسا کر سکتے ہو، زیادہ سے زیادہ ہم اس کام کو کرنے سے انکار کر دیں گے مگر اس بات کی گارنٹی ہم دے سکتے ہیں کہ یہ بات راز میں رہے گی۔"

"گراہم ٹھیک کہہ رہا ہے براؤن۔" جارڈن نے گراہم کی تائید کرتے ہوئے کہا۔"ہم تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائیں گے۔ اگرچہ ہم دونوں بھائیوں نے امریکا میں رہتے ہوئے کبھی قانون شکنی نہیں کی ہے مگر پھر بھی ہم جاننا چاہتے ہیں کہ دو لاکھ ڈالر ہمیں کیسے حاصل ہو سکتے ہیں؟"

"تم دونوں ٹھیک سمجھے ہو دوستو....." براؤن نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔"اتنی بڑی رقم کسی قانونی کام سے اتنی جلدی کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ میں پوری صاف گوئی سے یہ بتا دوں کہ جو کام میں تم لوگوں سے کروانا چاہتا ہوں، نہ صرف غیر قانونی ہے بلکہ انتہائی سنگین جرم بھی ہے۔"

"مگر اس کام کے لیے تمہاری نظرِ انتخاب ہم پر ہی کیوں پڑی۔ کیا تمہیں اس بات کا یقین تھا کہ ہم کوئی جرم کرنے پر تیار ہو جائیں گے؟" گراہم نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"مجبوری...... میرے دوست مجبوری۔" براؤن نے مسکرا کر جواب دیا۔"تم اس وقت مجبور ہو اور یہ ایسے حالات ہوتے ہیں جب انسان کوئی بڑا فیصلہ کر گزرتا ہے۔ تمہیں پیسوں کی اشد ضرورت ہے اور میرے پاس تمہارے اس مسئلے کا حل موجود ہے۔ میں نے تم سے جھوٹ نہیں بولا۔ سیدھی اور صاف بات کی ہے۔ رضامند ہونا یا نہ ہونا تمہاری مرضی پر منحصر ہے اگر تم انکار کر دو گے تو میں خاموشی سے واپس چلا جاؤں گا اور تم سے امید رکھوں گا کہ ہمارے درمیان اس موضوع پر جو بھی بات ہوئی، اسے یکسر بھلا دو گے۔"

"تم کام تو بتاؤ۔" جارڈن نے تجسس آمیز لہجے میں کہا۔"ہم فی الحال یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ کام کی نوعیت جاننے

کے بعد ہم رضامند ہوں گے یا نہیں۔ ہم جرائم پیشہ نہیں ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے گھر کو نیلامی سے بچانے کے لیے ہم ہر حد عبور کرسکتے ہیں۔''

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' براؤن نے تعریفی لہجے میں کہا۔''بہرحال اب اصل بات کی طرف آتے ہیں۔ جیسا کہ تم جانتے ہو کہ میں پارٹ ٹائم ایک بہت بڑے لارڈ کے گھر ملازمت کرتا ہوں۔ روزانہ بینک سے فارغ ہو کر ان کے گھر چلا جاتا ہوں اور ان کے بزنس کے معاملات کی ٹیکس ریٹرن وغیرہ تیار کرتا ہوں......

''لارڈ جوناتھن کا شمار اس شہر کے چند امیر ترین لوگوں میں ہوتا ہے، مجھے ان کے پاس کام کرتے تقریباً تین سال ہو گئے ہیں۔ لارڈ جوناتھن مجھ پر بے حد اعتماد کرتے ہیں، اتنا اعتماد کہ ان کے سیف کی چابیاں بھی میرے پاس رہتی ہیں۔''

''اور تم نے ان کی اعتماد شکنی کا فیصلہ کرلیا ہے؟'' جارڈن قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔

''شاید تم ٹھیک ہی سمجھے ہو۔'' براؤن ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔''آج کے دور میں پیسا انسان کی ضرورت بن چکا ہے اور پھر جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس سے لارڈ جوناتھن کی دولت مندی پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا اگر تمہارے اور میرے تمام معاشی مسائل حل ہوجائیں گے۔''

''مگر ہمیں کرنا کیا ہے؟'' اس بار گراہم نے گفتگو میں مداخلت کی۔

''تمہیں لارڈ کے گھر سے ایک قدیم مورتی حاصل کرنی ہے۔ یہ مورتی لارڈ کے سیف میں موجود ہے۔ یہ گوتم بدھ کی ایک قدیم اور چھوٹی سی مورتی ہے، اس کا سائز صرف چار سے پانچ انچ ہے۔ مٹھی بھر اس مورتی کو آسانی سے جیب میں ڈالا جاسکتا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی قیمت تمہاری سوچ سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ یہ انتہائی قدیم نوادرات میں شمار ہوتی ہے۔ یہ مورتی لارڈ جوناتھن کا خاندانی ورثہ ہے اور نسل در نسل ان کے خاندان میں چلی آرہی ہے۔ اس مورتی کو میں کہاں اور کیسے فروخت کروں گا، یہ میرا مسئلہ ہے مگر تمہیں دو لاکھ ڈالرز مورتی حاصل کرتے ہی مل جائیں گے۔ اس کے علاوہ ایڈوانس میں بھی کچھ رقم مل جائے گی۔ اس رقم سے تم وقتی طور پر اپنے گھر کی نیلامی کو ملتوی کراسکتے ہو مگر یاد رکھو اس کام کو تمہیں چند دنوں کے اندر ہی سرانجام دینا ہے کیونکہ اس ویک اینڈ پر لارڈ جوناتھن اس مورتی کو اپنے بڑے بھائی لارڈ ٹموتھی کے حوالے کردیں گے۔ لارڈ ٹموتھی اس شہر میں نہیں رہتے۔ ان کا شمار امریکا کے چند بڑے اور مانے ہوئے آثار قدیمہ کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ ایک دفعہ یہ مورتی اُن کے پاس منتقل ہوگئی تو پھر اسے چوری کرنا ناممکن ہوجائے گا۔''

''اگر ہم یہ کام کرنے کے لیے رضامند ہو بھی جاتے ہیں تو لارڈ کے بنگلے سے اتنی سخت سیکیورٹی کی موجودگی میں ہم یہ مورتی کیسے حاصل کرسکتے ہیں۔ میں کئی مرتبہ اُن کے بنگلے کے سامنے سے گزرا ہوں، وہ بنگلا کم اور قلعہ زیادہ نظر آتا ہے۔'' گراہم نے الجھن زدہ لہجے میں سوال کیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' براؤن نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔''لارڈ کا گھر واقعی میں ایک قلعہ ہے۔ وہاں ہمہ وقت انتہائی سخت سیکیورٹی موجود رہتی ہے وہاں چوری یا ڈکیتی کی کوئی بھی واردات کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی مگر میں تمہیں یہ بتا چکا ہوں کہ اس ویک اینڈ پر لارڈ جوناتھن اپنے بھائی کے پاس جارہے ہیں۔ تاکہ یہ قدیم مورتی ان کے حوالے کی جاسکے۔ وہ اپنی ذاتی گاڑی پر روانہ ہوں گے اور اس وقت ان کے ہمراہ صرف ان کا ڈرائیور ہوگا۔ اگر تم یہ کام کرنے کے لیے رضامند ہوجاتے ہو تو تمہیں راستے میں ہی اس واردات کو سرانجام دینا ہوگا۔ تم کسی سنسان سڑک پر انہیں روک کر گن پوائنٹ پر یہ مورتی چھین سکتے ہو۔ میں لارڈ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کبھی بھی اس مورتی کو اپنی جان پر ترجیح نہیں دیں گے، گن دیکھتے ہی اپنے پاس موجود ہر قیمتی چیز تمہارے حوالے کردینے پر تیار ہوجائیں گے۔ تمہیں مورتی کے ساتھ لارڈ کے پاس موجود تمام رقم بھی چھین لینی ہے تاکہ پولیس اس واردات کو عام سی روڈ ڈکیتی کا شاخسانہ سمجھے۔ آج کل اس شہر میں اسٹریٹ کرائم بہت عام ہیں اور اس سلسلے میں چھوٹے موٹے کافی گروہ متحرک ہیں۔ یہ واردات بھی انہی کے کھاتے میں چلی جائے گی۔''

''مگر اس طرح تو لارڈ ہمارے چہرے دیکھ لیں گے؟'' گراہم نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''شناخت سے بچنے کے لیے میں تمہیں اسلحے کے ساتھ ساتھ چہرے پر پہننے والے ربڑ کے ماسک بھی فراہم کردوں گا۔'' براؤن نے سنجیدگی سے جواب دیا۔''اس کے علاوہ تم فنگر پرنٹس کے نشانات سے بچنے کے لیے ہاتھوں پر ربڑ کے دستانے استعمال کرسکتے ہو۔ ایک دفعہ تم مورتی لے کر نکل گئے تو مجھے یقین ہے کہ پولیس تمہارا سراغ لگانے

میں ناکام رہے گی۔ واردات کے لیے تم اپنی کھٹارا کار استعمال کرسکتے ہو بس اس وقت نمبر پلیٹ تبدیل کرلینا۔ اس علاقے میں اس ماڈل کی گاڑیاں عام ہیں، اس لیے محض ماڈل کے ذریعے پولیس تم تک نہیں پہنچ سکے گی۔''

''اوکے ہم نے تمہارا پلان سن لیا ہے۔'' گراہم نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مگر ہم فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے۔ ہمیں سوچنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں کل تم سے دوبارہ ملنے کے لیے آؤں گا۔'' براؤن نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''کل تک اس بارے میں فیصلہ کرلینا کیونکہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ یاد رکھنا زندگی میں کچھ حاصل کرنے کے لیے بڑے فیصلے ناگزیر ہوتے ہیں اور زندگی میں کامیابی بھی ایسے افراد کے قدم چومتی ہے جن میں کچھ کرگزرنے کا حوصلہ ہو۔'' یہ کہتے ہوئے براؤن نے ان دونوں سے مصافحہ کیا اور اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ وہاں سے جا چکا تھا۔

''گراہم کیا تم واقعی سنجیدگی سے اس کے ساتھ بات چیت کررہے تھے؟'' براؤن کے جاتے ہی جارڈن نے سوال کیا۔

''کیا اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ ہے؟'' گراہم کے جواب نے اسے وقتی طور پر لاجواب کردیا۔

''مگر یہ ایک سنگین جرم ہے۔ اگر ہم پکڑے گئے تو نہ جانے کتنا عرصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنا پڑے گا۔'' جارڈن متفکر لہجے میں بولا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم نہیں پکڑے جائیں گے۔'' گراہم نے پُرزور لہجے میں جواب دیا۔ ''اس راز کو امریکا میں کوئی نہیں جانتا کہ جب ہم میکسیکو میں تھے تو ہمارا شمار بھی وہاں کے جرائم پیشہ افراد میں ہوتا تھا۔ گن پوائنٹ پر کسی کو لوٹ لینا ہمارے لیے کوئی نیا کام تو نہیں ہے؟''

''وہ پرانی بات ہے۔'' جارڈن ناصحانہ لہجے میں بولا۔ ''امریکا آتے ہوئے ہم نے اپنے ماضی کو ہمیشہ کے لیے فراموش کردیا تھا۔ یہاں ہم نے کبھی قانون شکنی نہیں کی؟''

''مگر اب کرنی پڑے گی۔'' گراہم نے مسکرا کر کہا۔ ''انسان کا ماضی کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ہمارا تاریک ماضی ایک بار پھر ہمارے سامنے آکھڑا ہوا ہے۔ ویسے میں تمہاری رضامندی کے بغیر حامی نہیں بھروں گا مگر یہ اچھی طرح سوچ لینا کہ ہمیں اپنے گھر کو نیلامی سے بچانا ہے۔ کیا ہم براؤن کو انکار کرنے کے متحمل ہوسکتے ہیں؟ اس کے بعد ہماری زندگی کس قدر مشکل ہوجائے گی اس کا اندازہ ہے تمہیں؟ ہماری دس برس کی محنت ضائع ہوجائے گی۔ اگر قسمت نے ہمیں اپنی ڈوبتی کشتی بچانے کا ایک موقع فراہم کرہی دیا ہے تو کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

''میں فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔ میرے اعصاب تمہاری طرح مضبوط نہیں ہیں۔'' جارڈن بدستور کشمکش کی کیفیت سے دوچار تھا۔

''ٹھیک ہے تو پھر آج رات اچھی طرح سوچ لو جو فیصلہ تمہارا ہوگا وہی میرا بھی ہوگا۔'' گراہم نے حتمی لہجہ اپناتے ہوئے کہا۔

جارڈن نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے اپنی کرسی سے اٹھا اور گھر کے اندر چلا گیا جبکہ گراہم پُرخیال نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

اس رات جارڈن دیر تک جاگتا رہا اور اسی وجہ سے صبح دیر سے بھی اٹھا۔ اس نے کچن میں جاکر اپنے لیے چائے بنائی اور پھر چائے کا کپ لے کر گھر سے باہر نکل آیا۔ حسب توقع لان میں گراہم موجود تھا۔ جارڈن اس کے سامنے موجود کرسی پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ گراہم نے اس کی آمد پر کسی خاص ردِعمل کا مظاہرہ نہ کیا، اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب تھی اور وہ اس کے مطالعے میں مشغول تھا۔

''میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔'' قدرے توقف کے بعد جارڈن کے حلق سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

''کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟'' گراہم نے کتاب ٹیبل پر رکھتے ہوئے استفسار کیا، اس کے لہجے میں تجسّس کا عنصر نمایاں تھا۔

''یہی کہ ہم یہ کام کریں گے۔'' جارڈن نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے رات بھر اس بارے میں سوچا ہے۔ شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے تھے کہ ہم براؤن کو انکار کرنے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔''

''گڈ۔'' گراہم تعریفی لہجے میں بولا۔ ''مجھے تم سے یہی امید تھی اور مجھے یقین ہے کہ ہم ناکام بھی نہیں ہوں گے۔ ویسے بھی ہم اس کام میں اناڑی نہیں ہیں۔''

''ہاں۔'' جارڈن پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''ہمارے پاس اور کوئی چانس نہیں ہے ہمیں ہر صورت اس واردات کو کامیابی کے ساتھ منطقی انجام تک پہنچانا ہوگا۔

براؤن بھی آج ہماری مرضی جاننے کے لیے آئے گا۔ ہم رضامندی ظاہر کردیں گے۔ اس نے کہا تھا کہ واردات کے لیے استعمال ہونے والا اسلحہ اور ماسک وغیرہ وہ ہمیں فراہم کرے گا اور ساتھ ہی ایڈوانس میں رقم بھی دے گا۔''

''ہاں۔'' گراہم نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ بینک میں کھانے کے وقفے کے دوران میں ہم سے ملنے آئے گا۔ ہم آج اس سے فائنل بات کریں گے.... فی الحال ہمیں اس کی آمد کا انتظار کرنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔'' جارڈن نے بس اتنا کہنے پر ہی اکتفا کیا۔ تاہم فیصلے پر پہنچنے کے بعد اب وہ خود کو خاصا ایزی محسوس کررہا تھا۔ شاید اس لیے کہ رات بھر کے ذہنی تذبذب اور کشمکش سے چھٹکارا مل گیا تھا۔

گراہم کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ تقریباً ایک بجے کے قریب براؤن کی گاڑی لان کے سامنے آکر رکی۔ بینک میں لنچ بریک کا بھی وقت تھا۔

''ہیلو برادرز کیسے ہو؟'' اس نے قریب آکر کرسی پر بیٹھتے ہوئے حسبِ معمول انہیں برادرز کے صیغے سے ہی مخاطب کیا۔

''ہم ٹھیک ہیں۔'' گراہم نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر تم لوگوں نے کیا فیصلہ کیا۔'' براؤن تمہید باندھے بغیر فوراً ہی اصل مدعا کی جانب آگیا۔ شاید اب وہ بھی فوری طور پر ان دونوں کا فیصلہ سننے کا خواہاں تھا۔

''ہم دونوں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ ہم یہ کام کریں گے۔'' اس بار جارڈن نے اس کی بات کا جواب دیا۔

''یہ ہوئی نامردوں والی بات۔'' براؤن نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم دونوں اس کام کو کرنے کی حامی بھر لوگے۔ اب آگے کا کیا پلان ہے؟''

''آگے کا پلان ہم نہیں تم بتاؤ گے براؤن۔'' جارڈن نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ ہمیں ایڈوانس پیمنٹ اور اسلحہ وغیرہ کب تک مل جائے گا؟''

''یہ کام کل ہی ہوجائے گا مگر یاد رکھنا کہ اسلحہ صرف ڈرانے کے لیے استعمال کرنا ہے، چلانے کے لیے نہیں، تاہم ناگزیر حالات میں تم فیصلہ کرنے میں آزاد ہو۔ اس ویک اینڈ پر لارڈ صبح ناشتے کے فوراً بعد ہی اس مورتی کو لے کر لارڈ ٹموتھی کی طرف روانہ ہورہے ہیں۔ تمہیں اپنی گاڑی میں ان کا تعاقب کرنا ہے اور پھر جہاں مناسب موقع اور جگہ نظر آئے، ان کی گاڑی کے آگے اپنی گاڑی کھڑی کر کے انہیں رکنے پر مجبور کردینا ہے۔ اس کے بعد گن پوائنٹ پر لارڈ سے وہ مورتی اور ان کا پرس حاصل کرنا ہے۔ میں تمہیں پہلے بھی بتاچکا ہوں کہ اس واردات کو روڈ ڈکیتی کا شاخسانہ قرار دینا ضروری ہے اور یہ اسی صورت ممکن ہے جب تم مورتی کے ساتھ ساتھ کیش بھی لوٹ لو۔ مورتی حاصل کرنے کے بعد تم اسے اپنے پاس محفوظ رکھو گے۔ میں فوری طور پر تم سے رابطہ نہیں کروں گا۔ کیونکہ ممکن ہے پولیس واردات کے بعد لارڈ کے ملازمین پر بھی شک کرے۔ چند دن کے بعد میں تمہیں رقم ادا کرکے مورتی وصول کرلوں گا۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم۔''

''مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ لارڈ صبح ناشتے کے بعد اپنے گھر سے روانہ ہوں گے؟'' گراہم نے استفسار کیا۔

''لارڈ خاندان میں کچھ اصول رائج ہیں۔'' براؤن نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ان کے خاندان میں یہ رواج ہے کہ جب وہ اپنے کسی عزیز کے ہاں بطور مہمان جاتے ہیں تو دوپہر کے کھانے کے وقت جاتے ہیں۔ لارڈ ٹموتھی دوسرے شہر میں رہائش پذیر ہیں۔ لارڈ جوناتھن صبح ناشتے کے بعد گھر سے نکلیں گے تو ہی دوپہر کے وقت وہاں پہنچ پائیں گے۔ انہوں نے لارڈ ٹموتھی کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی ہے۔ اب ان کا پروگرام کسی صورت ملتوی نہیں ہوگا۔ تم اس دن ان کے بنگلے کے باہر اپنی کار میں ان کے نکلنے کا انتظار کرسکتے ہو۔ جیسے ہی وہ نکلیں، ان کا تعاقب شروع کردینا اور پھر موقع دیکھتے ہی اپنا کام کرگزرنا۔ واردات والے دن تم موبائل فون پر مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کروگے کیونکہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ پولیس لارڈ کے تمام ملازمین کے فون ریکارڈ چیک کرے گی۔'' براؤن نے ان دونوں کو تفصیل سے سارا منصوبہ سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مگر تم اس سے پہلے بھی تو موبائل فون کے ذریعے ہم سے رابطے میں رہے ہو، اس ریکارڈ کا کیا کروگے؟'' جارڈن نے پوچھا۔

''اس کے لیے میرے پاس ایک معقول توجیہہ موجود ہے۔'' براؤن نے جواب دیا۔ ''میں کہہ سکتا ہوں کہ میں بینک کے قرض کی واپسی کے سلسلے میں تم لوگوں سے رابطے میں تھا اور یہ بات حقیقت پر مبنی ہے مگر ویک اینڈ پر ہمارا آپس کا موبائل فون پر رابطہ پولیس کو شک میں مبتلا کرسکتا ہے۔ ویسے میں صرف ایک امکانی بات کررہا ہوں، ضروری نہیں ایسا ہو لیکن ہمیں از خود احتیاط کرنی چاہیے۔''

''اوکے تو پھر تم کل ہمیں ایڈوانس پیمنٹ اور واردات میں استعمال ہونے والا دیگر ضروری سامان فراہم کردو۔ باقی کا کام ہمارا ہے۔'' گراہم نے کہا۔

''تو پھر مجھے اجازت دو۔'' براؤن نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی مجھے تمہارے لیے اسلحے اور پیسوں کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ اپنی کھٹارا گاڑی کا انجن وغیرہ بھی چیک کروالینا ایسا نہ ہو کہ یہ لارڈ کی گاڑی کو پکڑ ہی نہ پائے۔ وہ جدید ماڈل کی کار ہے اور لارڈ کے ڈرائیور کو گاڑی تیز رفتاری سے چلانے کی عادت ہے۔''

''تم اس معاملے میں بے فکر رہو، یہ کھٹارا تمہاری توقع سے بھی زیادہ تیز رفتار ہے۔'' گراہم نے اس بار ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تو پھر کل شام ملتے ہیں۔'' براؤن نے ان دونوں سے مصافحہ کیا اور پھر اپنی کار کی جانب بڑھ گیا جبکہ وہ دونوں خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ اس ویک اینڈ پر وہ ایک ایسا رسک لینے جارہے تھے جس کی ناکامی کی صورت میں وہ انجام سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔

اگلے چند دن انہوں نے خاصی مصروفیت میں گزارے۔ براؤن نے وعدے کے مطابق انہیں رقم اور اسلحے کے ساتھ ساتھ چہرے پر پہننے کے لیے ماسک وغیرہ بھی فراہم کردیے تھے۔ انہوں نے بینک کو وہ رقم دے کر وقتی طور پر اپنے گھر کی نیلامی بھی روک لی تھی۔ آخر کار ویک اینڈ بھی آگیا۔ اس وقت صبح کے آٹھ بج چکے تھے۔ آج انہیں یہ واردات سرانجام دینی تھی۔ جواب ان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ لارڈ کے بنگلے کی جانب روانہ ہوگئے۔ اپنی کھٹارا کار کی نمبر پلیٹ وہ پہلے ہی تبدیل کرچکے تھے۔ ان کے کوٹ کی جیبوں میں اسلحہ اور ماسک وغیرہ بھی موجود تھے۔ براؤن نے ایک دن پہلے انہیں کنفرم کردیا تھا کہ لارڈ جوناتھن کے پروگرام میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس نے انہیں لارڈ کی گاڑی کا نمبر بھی بتا دیا تھا۔ لارڈ جوناتھن اس شہر کی ایک معروف شخصیت تھی۔ اس لیے وہ لارڈ پیلس سے اچھی طرح واقف تھے۔ گراہم گاڑی ڈرائیو کررہا تھا جبکہ جارڈن اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر موجود تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ لارڈ کے بنگلے کے قریب پہنچ گئے۔ اب انہیں لارڈ کی گاڑی کے نکلنے کا انتظار کرنا تھا۔ گراہم نے اپنی گاڑی ایک جگہ پر کھڑی کردی تاہم اس نے گاڑی کچھ اس طرح سے پارک کی تھی کہ وہ دونوں لارڈ کے بنگلے کے مین گیٹ پر بہ آسانی نظر رکھ سکتے تھے۔

براؤن نے ہمیں بتایا تھا کہ لارڈ جوناتھن، اپنے بھائی سے ملنے کے لیے عام طور پر جنگل سے ملحق روڈ کا ہی استعمال کرتے ہیں کیونکہ یہ شارٹ کٹ ہے۔

تقریباً ساڑھے نو بجے کے قریب بنگلے کا مین گیٹ کھلا اور اس میں سے ایک پُرشکوہ مرسیڈیز برآمد ہوئی تو وہ دونوں چونک کر سیدھے ہوگئے۔

''یہ لارڈ ہی کی گاڑی ہے۔'' ایک لمحے کے بعد جارڈن نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں۔'' گراہم نے بھی اس کی توثیق کردی اور پھر اپنی گاڑی اسٹارٹ کرکے اسے دھیمی رفتار سے لارڈ کی مرسیڈیز کے پیچھے لگا دیا۔ تاہم ابھی ان کا مرسیڈیز کو روکنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ فی الحال ان کا ارادہ جنگل سے ملحق سڑک تک لارڈ کی گاڑی کا پیچھا کرنے تک ہی محدود تھا۔ اس وقت وہ جس روڈ پر لارڈ کی گاڑی کا پیچھا کررہے تھے، یہ ایک معروف شاہراہ تھی اور صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے یہاں ٹریفک کا خاصا رش تھا۔ تیز رفتاری سے گاڑی چلانا ممکن ہی نہ تھا اس لیے ٹریفک دھیمی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد جنگل سے ملحق سڑک نمودار ہوئی تو گراہم اور جارڈن کے اعصاب تن گئے۔ کیونکہ اب کام کا وقت شروع ہوگیا تھا مگر کچھ آگے جاتے ہی وہ بری طرح چونک پڑے۔ ایک طرف سے سڑک بند تھی اور اس پر بورڈ آویزاں تھا کہ آگے کام ہورہا ہے جنگل سے ملحق راستہ اختیار کریں۔ یہی وجہ تھی کہ تمام ٹریفک اسی شاہراہ پر گامزن تھا۔

''یہ تو ہمارے حق میں بہتر نہیں ہوا، ہم تو سمجھے تھے کہ جنگل سے ملحق روڈ پر لارڈ کو لوٹنا آسان ہوگا مگر اس رش میں تو یہ کام خاصا مشکل لگتا ہے۔'' جارڈن نے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد پریشان کن لہجے میں کہا۔

''اب جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔'' گراہم نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''ہمیں اسی روڈ پر لارڈ سے وہ مورتی حاصل کرنا ہوگی۔''

''مگر ٹریفک میں کار کو نکال کر فرار ہونا خاصا مشکل ثابت ہوگا ہم پھنس جائیں گے۔'' جارڈن نے غیر مطمئن لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا نا اب جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ اپنے چہرے پر ماسک اور ہاتھوں میں دستانے پہن لو۔'' یہ کہتے ہوئے گراہم نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھاما اور دوسرے ہاتھ سے کوٹ کی جیب سے دستانے اور ماسک نکال کر پہن

لیے۔ جارڈن نے بھی اس کی تقلید کی۔ اسے گراہم کے دوٹوک لہجے سے اندازہ ہوگیا تھا کہ اب وہ ایکشن میں آنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اگرچہ وہ موجودہ صورتِ حال سے مطمئن نہیں تھا مگر اب اس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا اور پھر وہ گراہم کی ضدی طبیعت سے بھی بخوبی واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گراہم اب پیچھے نہیں ہٹے گا۔

اسی لمحے راستہ پاتے ہی گراہم نے اپنی کار تیزی سے آگے بڑھائی اور لارڈ جوناتھن کی مرسیڈیز کے بالکل برابر آگیا۔ شکار کو نشانے پر پاتے ہی اس نے اسٹیئرنگ کو خفیف سا جھٹکا دیا اور اپنی کار مرسیڈیز کے ساتھ ٹکرا دی۔ مرسیڈیز کے بریک چرچرائے اور وہ ایک زوردار جھٹکے سے رک گئی۔ پلک جھپکنے میں ٹریفک کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ لمحہ بھر میں وہ پوری روڈ ہی بلاک ہو گئی تھی۔ رواں دواں ٹریفک میں وہ ساری تبدیلیاں چشم زدن میں رونما ہوئی تھیں۔

اسی لمحے مرسیڈیز کے پچھلے دروازے سے بغیر ٹائی لگائے ایک بیش قیمت سوٹ پہنے لارڈ جوناتھن برآمد ہوئے۔ ان کے چہرے پر برہمی کے تاثرات تھے شاید انہیں ابھی تک معاملے کی سنگینی کا ادراک نہیں تھا، وہ اسے کوئی عام سا روڈ ایکسیڈنٹ ہی سمجھ رہے تھے۔ اس اثنا میں جارڈن اور گراہم بھی اپنے ریوالور نکال کر گاڑی سے باہر آچکے تھے۔ انہوں نے لارڈ کے سر پر پہنچنے میں دیر نہ لگائی۔ لارڈ کا ڈرائیور بھی گاڑی سے باہر نکل آیا تھا۔ ان کے ماسک زدہ چہروں اور ہاتھوں میں موجود ریوالور دیکھ کر لارڈ جوناتھن کے چہرے پر ہلکی سی فکرمندی کے تاثرات عود آئے اسی دوران جارڈن نے یکلخت اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور پھر پے در پے تین ہوائی فائر داغ دیے۔ فائرنگ کی آواز سنتے ہی پیچھے موجود ٹریفک میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ کچھ کار والوں نے اپنی گاڑیاں پیچھے ہٹانے کے چکر میں دوسری کاروں سے ٹکرا دیں۔ گراہم جیسے ہی لارڈ جوناتھن کے قریب پہنچا انہوں نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے مگر گراہم کے تیور کچھ اور ہی تھے۔ اس نے قریب جاتے ہی اپنا ریوالور ہاتھ میں الٹا پکڑا اور پھر اس کی ایک زوردار ضرب لارڈ کے سر پر رسید کر دی۔ لارڈ تیورا کر زمین پر جا گرے۔ وہ ایک ہی ضرب سے بے ہوش ہو چکے تھے۔ جارڈن نے یہی سلوک ان کے ڈرائیور کے ساتھ بھی کیا، وہ بھی ایک طرف بے ہوش پڑا تھا۔

گراہم نے تیزی سے زمین پر بے ہوش پڑے لارڈ جوناتھن کی تلاشی لینی شروع کر دی اور پھر اُن کے کوٹ کی جیب سے ایک پیتل کی چھوٹی سی مورتی اور ان کا پرس برآمد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے پرس اور مورتی اپنی سائڈ جیب میں منتقل کی اور پھر تیزی سے اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔ ”جارڈن کار میں بیٹھو۔“ اس نے چیختے ہوئے کہا اور خود ڈرائیورنگ سیٹ سنبھال لی، اس دوران جارڈن بھی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ گراہم نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی، مگر اس میں اسے بری طرح ناکامی ہوئی۔ اس نے دیوانہ وار سیلف مارنا شروع کر دیا۔ اگر گاڑی اسٹارٹ ہو جاتی تو ان کے سامنے اتنی سڑک خالی تھی کہ وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ پھنسی ہوئی ساری ٹریفک پچھلی جانب تھی مگر ان کی کھٹارا کار نے اتنے اہم موقع پر ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

”یہ گاڑی اسٹارٹ کیوں نہیں ہو رہی، اس طرح تو ہم پھنس جائیں گے۔“ جارڈن نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

”شاید لارڈ کی گاڑی کو سائڈ مارتے ہوئے اس میں کوئی فنی خرابی ہو گئی ہے۔“ گراہم نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی اپنی کوشش بدستور جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بھی پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔ ان کے پیچھے موجود گاڑیاں آپس میں ٹکرا کر ابھی تک پھنسی ہوئی تھیں جبکہ آگے موجود گاڑیاں راستہ ملتے ہی نکل رہی تھیں۔ فائرنگ کی آواز نے سب کو باور کرا دیا تھا کہ یہاں ڈکیتی کی کوئی واردات ہو رہی ہے۔ اس لیے کسی نے اپنی کار سے نکل کر آگے آکر صورتِ حال کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اسی لمحے انہیں اپنے عقب میں پولیس کی سائرن بجاتی گاڑیوں کی آواز سنائی دی تو ان کے دل اچھل کر حلق میں آ گئے۔ شاید کسی نے یہاں ہونے والے غیر معمولی واقعے کی اطلاع پولیس کو کر دی تھی یا پھر پولیس والے کہیں قریب ہی موجود تھے اور فائرنگ کی آواز نے انہیں اس جانب متوجہ کر دیا تھا۔ بات جو بھی تھی پولیس کی آمد جارڈن اور گراہم کے لیے کوئی اچھا شگون نہیں تھا غنیمت یہ تھی کہ وہ اپنی گاڑیوں کو اس پھنسی ہوئی ٹریفک میں آگے لانے سے قاصر تھے تاہم اگر وہ اپنی گاڑیوں سے نکل کر پیدل آگے بڑھتے تو ان کے لیے جارڈن اور گراہم تک پہنچنا زیادہ مشکل نہ تھا ایسی کسی بھی ناگہانی صورت حال میں ان دونوں کے بچنے کے امکانات معدوم ہو جاتے۔

”گاڑی سے نکل کر جنگل کی طرف اندر بھاگو ہمیں اب

پیدل فرار ہونا پڑے گا۔'' گاڑی اسٹارٹ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوتے دیکھ کر گراہم نے تیز لہجے میں کہا۔

''مگر......'' جارڈن نے کچھ کہنا چاہا۔

''جلدی کرو۔'' گراہم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ وقت بحث کا نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ جارڈن نے بھی اس کی تقلید کی۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور ابھی تک موجود تھے۔ وہ دونوں ایک سائڈ سے دوڑتے ہوئے جنگل کی طرف بڑھے۔ لارڈ جوناتھن اور ان کا ڈرائیور ابھی تک سڑک پر بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ انہیں اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں تو انہوں نے بھی تیز رفتاری سے جنگل کی جانب دوڑ لگا دی۔

''رک جاؤ۔'' جیسے ہی وہ گھنے درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچے انہیں اپنے عقب میں آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی فضا ایک ہوائی فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ پولیس والوں نے انہیں روکنے کے لیے وارننگ فائر کیا تھا مگر وہ دونوں رکے بغیر جنگل کے اندر داخل ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ تعاقب میں آنے والے پولیس کے افراد اب ان پر گولی چلانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے مگر درختوں کے جھنڈ میں داخل ہونے کے بعد وہ دونوں فوری طور پر پولیس کے نشانے سے دور ہو گئے تھے۔

وہ مسلسل اور سرپٹ دوڑے چلے جا رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے ان کی سانسیں پھولنے لگی تھیں مگر رکنے کا وقت نہیں تھا۔ اسی لیے وہ مسلسل آگے بڑھتے ہوئے پولیس کی دسترس سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

مگر پھر ایک جگہ انہیں رکنا پڑا۔ ان کے راستے میں جنگل کے درمیان بہنے والی ندی حائل ہو چکی تھی۔ ندی کا بہاؤ دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے تیر کر پار کرنا اتنا آسان نہ ہوگا۔

''گراہم گاڑی کی وجہ سے ہم پکڑے جائیں گے۔'' جارڈن نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان گراہم کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔ ''اگرچہ ہم نے اس کی نمبر پلیٹ تبدیل کر رکھی ہے مگر پولیس آسانی سے گاڑی کے رجسٹریشن نمبر کے ذریعے ہم تک پہنچ جائے گی۔''

''میں جانتا ہوں۔'' گراہم نے اپنی بے ترتیب سانسوں کو بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر ہمارے پاس گاڑی چھوڑ کر بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔''

''مگر اب اس مصیبت کا کیا کریں؟'' جارڈن نے ندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگرچہ ہم دونوں اچھے تیراک ہیں مگر اس کا بہاؤ ضرورت سے زیادہ تیز ہے، بھاگنے کی وجہ سے ہم اپنی بہت سی طاقت پہلے ہی ضائع کر چکے ہیں۔''

گراہم نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کتوں کے بھونکنے کی آواز نے انہیں اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ دونوں تیز رفتاری سے دوڑنے کے باعث وقتی طور پر تو اپنے تعاقب میں دوڑنے والے پولیس کے افراد کی دسترس سے دور ہو گئے تھے مگر اب انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ پولیس کے پاس کتے بھی ہیں اور اب کتوں کی مدد سے پولیس کچھ ہی دیر میں ان تک پہنچ جائے گی۔ شاید ندی میں چھلانگ لگانے کے سوا ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ کتوں سے بچنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ انہوں نے اپنے ریوالور ایک طرف پھینکے اور اپنی ساری قوت مجتمع کرتے ہوئے ندی میں چھلانگ لگا دی۔ ندی میں تیرنا واقعی میں خاصا مشکل ثابت ہوا مگر جب انسان کی جان پر بنی ہو تو وہ اس صورتِ حال سے نکلنے کے لیے اپنا پورا زور لگا دیتا ہے۔ انہوں نے بھی ندی کی تیز موجوں کو تیر کر پار کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کر دی اور آخر کار اسے پار کرنے میں کامیاب رہے مگر ندی پار کرتے ہی ان کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ بے اختیار کنارے پر ہی ڈھیر ہو گئے۔ انہیں اپنی بے ترتیب سانسیں اور اوسان بحال کرنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا مگر شاید ان کے پاس وقت ختم ہو چکا تھا۔ اسی لمحے کچھ پولیس والے ندی کے دوسری طرف سے بھی نمودار ہو گئے۔ شاید ان کا تعاقب کرنے والوں نے انہیں وائرلیس پر ندی کے دوسری طرف بلوایا تھا تا کہ انہیں دونوں اطراف سے گھیرا جا سکے اور پولیس اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی۔

''ہالٹ، اپنے چہرے سے ماسک اتار دو اور ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔ تم دونوں ہمارے نشانے پر ہو اگر کوئی حرکت کی تو ہم گولی چلانے سے دریغ نہیں کریں گے۔'' ایک پولیس والے نے تحکمانہ آواز میں کہا۔

گراہم اور جارڈن نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کھڑے ہو کر اپنے ماسک اور دستانے اتار کر ایک طرف پھینکے اور پھر ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ اب مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ پکڑے جا چکے تھے۔ فرار کی ساری راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ کچھ ہی دیر

میں انہیں ہتھکڑیاں لگا کر باقاعدہ گرفتار کرلیا گیا۔

مگر اس دوران میں ایک عجیب بات ہوئی۔ ان کی تلاشی لینے والوں کو ان کی جیبوں سے لارڈ کا بٹوا تو مل گیا مگر کوئی مورتی نہ مل سکی۔ پولیس کو اس وقت تک صحیح طرح ادراک نہ ہوسکا تھا کہ لارڈ کا ڈکیتی کے دوران کیا کیا سامان چوری ہوا ہے۔ انہیں بعد میں لارڈ کے بیان سے یہ پتا چلا کہ ان کی ایک نہایت قیمتی مورتی بھی یہ دونوں ڈکیت لے اُڑے تھے مگر تلاشی کے دوران اپنی جیب سے مورتی برآمد نہ ہونے پر گراہم بھی حیران و پریشان رہ گیا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے لارڈ سے مورتی حاصل کرنے کے بعد فرار ہونے کی عجلت میں اسے اپنی سائڈ جیب میں ڈالا تھا۔ پولیس کو بٹوا تو مل گیا تھا مگر شاید وہ مورتی ان کے جنگل میں سرپٹ بھاگنے کے دوران یا ندی میں تیرتے ہوئے کہیں گر کر کھو گئی تھی۔ پولیس نے بعد میں بھی اس مورتی کو جنگل میں اور ندی میں غوطہ خوروں کے ذریعے تلاش کرنے کی کوشش کی مگر انہیں ناکامی ہوئی۔ ویسے بھی گراہم اور جارڈن کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ مورتی ان سے کہاں کھوئی ہے؟ اس لیے وہ پولیس کو اس جگہ کی نشاندہی کرنے میں ناکام رہے۔ وہ ڈکیتی کی اس واردات میں نہ صرف بری طرح ناکامی سے دوچار ہوئے تھے بلکہ وہ نایاب اور قیمتی مورتی بھی گنوا بیٹھے تھے۔

ان پر مقدمہ چلا۔ لارڈ جوناتھن نے بھی مورتی کی گمشدگی کے بعد اس مقدمے کی پیروی میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی جبکہ جارڈن اور گراہم اپنے وکیل کے مشورے کے بعد عدالت میں مورتی کے بارے میں پولیس کو دیے گئے اپنے اعترافی بیان سے بھی منحرف ہو گئے۔ مورتی پولیس کے برآمد کردہ مسروقہ مال میں موجود نہیں تھی۔ لہٰذا انہیں لارڈ سے رقم لوٹنے کے جرم میں سزا سنادی گئی۔ کیونکہ پولیس کے پاس ان کا کوئی کرمنل ریکارڈ موجود نہیں تھا اس لیے عدالت نے بھی ان کے ساتھ نرمی برتتے ہوئے صرف دو سال کی سزا سنائی۔

وہ براؤن کے ساتھ کیے گئے اپنے حلف پر قائم رہے اور انہوں نے آخری وقت تک پولیس کے سامنے اس کا نام نہ لیا۔ تاہم جیل یاترا کے دوران میں انہیں ہمیشہ براؤن سے یہ گلہ رہا کہ وہ ان سے جیل میں ایک دفعہ بھی ملاقات کے لیے نہیں آیا۔ ان کی قید کے دوران بینک نے ان کا مکان نیلام کر کے اپنا قرضہ وصول کرلیا۔ اس لیے دو سال بعد جب وہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد جیل سے رہا ہو کر آئے تو بالکل قلاش و کنگال ہو چکے تھے۔

واپس آ کر انہوں نے بڑی مشکل سے ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کیا اور پھر ایک فیکٹری میں معمولی اجرت پر کام کرنے لگے۔ زندگی اب بہت کٹھن اور دشوار ہو گئی تھی۔ انہوں نے اب براؤن سے ملنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ نئے سرے سے اپنی زندگی بنائیں گے مگر وقت گزرنے کے ساتھ انہیں اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ پیسے کے بغیر زندگی کس قدر مشکلات سے دوچار ہو جاتی ہے۔ انہیں جیل سے چھوٹے اب دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

آج چھٹی کا دن تھا اور وہ دونوں اپنے فلیٹ پر ہی موجود تھے اسی لمحے کسی نے فلیٹ کی گھنٹی بجائی تو وہ دونوں چونک پڑے۔ یہاں آس پاس ان کی کسی سے بھی واقفیت نہ تھی۔ وہ اس علاقے میں دو ماہ پہلے ہی آئے تھے اس لیے ان کے ملاقاتیوں کی تعداد بھی تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔

’’جارڈن ذرا دیکھنا تو دروازے پر کون ہے۔‘‘ گراہم نے کہا تو جارڈن کاہلی کے ساتھ سامنے موجود صوفے سے اٹھا اور پھر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

’’براؤن تم......‘‘ دروازے پر اس کی حیرت زدہ آواز ابھری تو براؤن کا نام سن کر گراہم بری طرح چونک اٹھا۔ اسی لمحے براؤن، جارڈن کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا لیکن وہ جس شخصیت کے ہمراہ تھا، اسے دیکھ کر گراہم بے اختیار اچھل پڑا۔

’’لارڈ جوناتھن آپ۔‘‘ اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکل پایا۔ جارڈن بھی ایک طرف حیران و پریشان کھڑا تھا۔ براؤن کے ہمراہ لارڈ جوناتھن کی آمد نے اسے بھی بری طرح چونکا دیا تھا۔

لارڈ جوناتھن خاموشی سے کھڑے ہوئے تھے تاہم ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

’’کیا تمہارے ہاں مہمانوں کو بیٹھنے کے لیے نہیں کہا جاتا۔‘‘ براؤن نے کہا تو ہونق صورت بنائے کھڑے گراہم اور جارڈن کو بھی گویا ہوش آ گیا۔

’’آئی ایم سوری۔‘‘ گراہم نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ ’’آپ دونوں تشریف رکھیں‘‘ اس نے سامنے موجود صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو لارڈ

جوناتھن اور براؤن صوفے پر بیٹھ گئے۔
''لگتا ہے تم دونوں کے مالی حالات خاصے مخدوش ہو چکے ہیں۔'' براؤن نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ویسے شاید تم دونوں بھول رہے ہو کہ یہ تمہارا اپنا فلیٹ ہے اس لیے کھڑے رہنے کے بجائے بیٹھ جاؤ۔''

''اوہ آئی ایم سوری۔'' گراہم اور جارڈن کے منہ سے بیک وقت نکلا اور پھر وہ دونوں بھی ایک طرف موجود صوفے پر بیٹھ گئے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ ابھی تک ذہنی طور پر سنبھل ہی نہ پائے تھے۔ براؤن کا لارڈ جوناتھن کے ہمراہ ان کے فلیٹ میں آنا انہیں کسی صورت ہضم نہیں ہو پارہا تھا۔

''ویسے اپنی اس حالت کے تم خود ذمّے دار ہو۔'' براؤن دوبارہ بولا۔ ''اگر تم مورتی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو پورے دو لاکھ ڈالر کے مالک بن جاتے مگر تم نے الٹے پسٹل کی ضرب لگا کر لارڈ جوناتھن کا سر تو پھاڑ دیا اور مورتی بھی لے اُڑے مگر بھاگتے ہوئے اسے کہیں کھو دیا اور پکڑے گئے۔''

گراہم اور جارڈن، براؤن کی باتیں سن کر ششدر رہ گئے۔ لارڈ جوناتھن اس کے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے جبکہ وہ ان کے سامنے ہی یہ تمام باتیں کر رہا تھا۔

''براؤن یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' گراہم نے چور نگاہوں سے لارڈ جوناتھن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں تم دونوں کو اصل کہانی سنانی ہی پڑے گی۔'' براؤن نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ ڈکیتی کا یہ سارا پلان میرا نہیں تھا بلکہ یہ سارا منصوبہ لارڈ جوناتھن نے ہی بنایا تھا۔''

''کیا؟'' گراہم اور جارڈن نے یک زبان ہو کر کہا۔ یہ انکشاف ان پر کسی بم کی طرح گرا تھا۔

لارڈ جوناتھن ایک طرف خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر بدستور مسکراہٹ رقصاں تھی۔ تاہم انہوں نے ابھی تک گفتگو میں مداخلت نہیں کی تھی۔

''ہاں۔'' براؤن نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''اب میں تمہیں اصل کہانی سناتا ہوں۔ یہ مورتی لارڈ کی خاندانی مورتی تھی اور کئی نسلوں سے ان کے خاندان کے پاس تھی۔ ایک طرح سے یہ لارڈ کا خاندانی ورثہ تھی۔ یہ کئی برسوں سے لارڈ جوناتھن کی تجوری میں موجود تھی مگر پھر لارڈ سے ملنے نیپال سے ان کے ایک پرانے دوست آئے۔ لارڈ کے یہ دوست نیپال کی رائل فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔ لارڈ جوناتھن نے یہ مورتی انہیں دکھائی۔ انہیں یہ مورتی بہت پسند آئی اور انہوں نے لارڈ کو اتنی بڑی آفر دی کہ لارڈ انگشت بدنداں رہ گئے۔ لارڈ کے دوست اس مورتی کو خریدنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ نیپال کی رائل فیملی سے تعلق رکھتے تھے اس لیے پیسا ان کے لیے ہاتھ کا میل تھا۔ لارڈ جوناتھن بھی ایک خاندانی آدمی ہیں۔ وہ بھلا اپنا خاندانی ورثہ فروخت کرنے پر کیسے آمادہ ہو جاتے مگر وہ کہتے ہیں ناکہ مجبوری انسان کو اپنے اصول توڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ لارڈ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ انہیں اپنے ذاتی کاروبار میں سخت نقصان کا سامنا تھا اور بینک کا قرضہ بھی چکانا تھا۔ اس لیے انہوں نے خاموشی سے یہ مورتی اپنے اس نیپالی دوست کو فروخت کر دی۔ اس طرح وہ اپنے سارے معاشی مسائل حل کرنے میں کامیاب رہے مگر مسئلہ یہ تھا کہ لارڈ جوناتھن کے گھر میں اکثر اوقات ان کے عزیز ملنے کے لیے آتے رہتے تھے اور مورتی دیکھنے کی بھی فرمائش کرتے تھے۔ لارڈ نے اس مسئلے کا یہ حل نکالا کہ ایک ہو بہو ویسی ہی نقلی مورتی تیار کروالی اور جب بھی ان کا کوئی عزیز مورتی دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتا تو اسے وہ نقلی مورتی دکھا دی جاتی۔ اسے اس مہارت سے ڈیزائن کیا گیا تھا کہ لارڈ کے کسی عزیز کو بھی شک نہ ہوا کہ یہ مورتی نقلی ہے۔ مگر پھر اچانک لارڈ جوناتھن کے بڑے بھائی لارڈ ٹموتھی نے اس مورتی کو مانگ لیا۔ وہ اب اپنے خاندانی ورثے کو اپنے پاس رکھنے کے خواہاں تھے۔ لارڈ ٹموتھی پھیپھڑوں کے لاعلاج مرض میں مبتلا تھے اور اس دنیا میں چند ماہ کے مہمان تھے۔ اس لیے لارڈ جوناتھن کے لیے ان کی اس خواہش کو ٹالنا ناممکن تھا۔

''لارڈ جوناتھن آج تک اپنے دوسرے عزیزوں کو تو نقلی مورتی دکھا کر مطمئن کرتے آرہے تھے لیکن لارڈ ٹموتھی کے معاملے میں ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ ان کا شمار اس ملک کے چند مانے ہوئے آثارِ قدیمہ کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ وہ پہلی ہی نظر میں پہچان لیتے کہ مورت نقلی ہے۔

''لارڈ جوناتھن کے لیے یہ بڑی مشکل صورتِ حال تھی۔ اگر ان کے خاندان میں یہ بات کھل جاتی کہ وہ اصلی مورتی فروخت کر چکے ہیں تو ان کی بڑی بدنامی ہوتی۔

انہوں نے خود کو اس بدنامی سے بچانے کے لیے یہ سارا پلان بنایا۔ میں ان کا انتہائی قابلِ اعتماد آدمی تھا اس لیے لارڈ نے اپنا منصوبہ مجھ سے ڈسکس کیا۔ ہمیں اب اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے چند آدمیوں کی ضرورت تھی۔ تم دونوں ان دنوں خاصے معاشی مسائل میں گھرے ہوئے تھے تمہارا گھر بھی نیلام ہونے والا تھا اس لیے میری نظرِ انتخاب تم پر آٹھہری۔ مجھے یقین تھا کہ تم یہ کام کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ گے اور میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ ویسے میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ گن پوائنٹ پر لارڈ آسانی سے وہ مورتی تمہارے حوالے کر دیں گے۔ تم نے خوامخواہ انہیں زخمی کر ڈالا۔''

لارڈ بھی اس منصوبے میں شامل تھے یہ بات تم ہمیں پہلے بھی تو بتا سکتے تھے۔'' جارڈن نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''ہرگز نہیں۔'' براؤن کے بجائے اس بار لارڈ جوناتھن خود بولے۔ ''اس طرح ڈکیتی کی اس واردات میں مصنوعیت کی جھلک نمایاں ہو جاتی جبکہ میں اس واردات کو فطری رنگ دینا چاہتا تھا۔ بہرحال یہ اتفاق تھا کہ وہ نقلی مورتی جنگل میں بھاگتے ہوئے تمہاری جیب سے کہیں گر گئی اور پولیس کو تلاشی کے باوجود نہ مل سکی۔ اگر وہ مورتی پولیس کو مل جاتی تو میرا سارا پلان ہی فیل ہو جاتا۔ اس مورتی کی گمشدگی نے میرے منصوبے کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ میرا اصل مقصد تو اپنے بھائی لارڈ ٹموتھی کو یہ باور کروانا تھا کہ وہ مورتی اب ہمارے پاس نہیں رہی اور میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ میرے بھائی نے اس بات پر یقین کر لیا کہ وہ مورتی ڈاکو لے اُڑے تھے اور پھر ان سے جنگل میں کہیں کھو گئی۔ تمہاری جیل میں قید کے دوران چھ ماہ پہلے لارڈ ٹموتھی بھی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے اس لیے اب میں بھی آزاد ہوں۔ اگر رائل فیملی سے تعلق رکھنے والا میرا دوست اس مورتی کو منظرِ عام پر لے بھی آئے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ میں اس سلسلے میں صرف اپنے مرحوم بھائی لارڈ ٹموتھی کو جواب دہ تھا اور وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ تم نے پکڑے جانے کے باوجود اپنے حلف کی پاسداری کی اور پولیس کے سامنے براؤن کا نام نہیں لیا۔ اگر تم براؤن کا نام لے لیتے تو ہمیں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔'' لارڈ نے سہل انداز میں تمام روداد بیان کی۔

''یہی وجہ تھی کہ میرے اور براؤن کے دل میں تم دونوں کی بہت عزت اور قدر ہے۔ براؤن تم دونوں سے جیل میں کبھی ملنے اس لیے نہ آسکا کہ اس طرح وہ پولیس کی نظروں میں آجاتا۔ میں نے جان بوجھ کر اس کیس کی عدالت میں پیروی کرتے ہوئے عدم دلچسپی کا مظاہرہ بھی اسی لیے کیا تھا اور تمہیں صرف دو سال کی قید ہوئی۔ تمہارے جیل سے چھوٹنے کے بعد ہم نے تم لوگوں سے فوراً رابطہ نہیں کیا کیونکہ ہمیں خطرہ تھا کہ کہیں پولیس تمہاری نگرانی تو نہیں کر رہی تبھی ہم تم سے ملنے آئے ہیں تاکہ تمہیں بتا سکیں کہ تم ناکام رہ کر بھی کامیاب رہے ہو۔ ایسے میں تمہیں تمہارا حصہ نہ دینا زیادتی ہوگی۔ براؤن، گراہم اور جارڈن کو دو لاکھ ڈالر کی رقم دے دو۔'' لارڈ نے بات کرتے ہوئے براؤن کو حکم دیا تو براؤن نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک پیکٹ نکالا اور سامنے موجود ٹیبل پر رکھ دیا۔

''اب ہمیں اجازت دو۔'' لارڈ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ لارڈ کو کھڑا ہوتے دیکھ کر براؤن کے ساتھ ساتھ گراہم اور جارڈن بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

''لارڈ جوناتھن آپ چائے تو پی کر جایئے۔'' گراہم نے پُرزور لہجے میں کہا۔

''شکریہ دراصل مجھے کہیں جانے کی جلدی ہے۔'' لارڈ نے جواب دیا۔ ''ویسے میرا تم دونوں کو مشورہ ہے کہ اس رقم کو لے کر کہیں دور چلے جاؤ اگر اس علاقے میں یکلخت تمہارا لائف اسٹینڈرڈ تبدیل ہوا تو یہاں کی پولیس دوبارہ تمہارے بارے میں مشکوک ہو جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے لارڈ فلیٹ کے خارجی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ براؤن بھی ان کے ہمراہ تھا جبکہ گراہم اور جارڈن ان دونوں کو دروازے تک چھوڑنے ساتھ گئے۔ دروازہ بند کرتے ہی وہ دونوں ڈرائنگ روم میں واپس آگئے۔ جارڈن نے پھرتی سے ٹیبل پر موجود پیکٹ اٹھا کر کھولا تو اس میں سو سو ڈالر کے نوٹوں کی دو گڈیاں موجود تھیں۔ ''گراہم مجھے یقین نہیں آرہا کہ ہم پھر سے امیر ہو گئے ہیں۔'' جارڈن نے چہکتے ہوئے کہا۔

''یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا۔'' گراہم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''مگر یہی حقیقت ہے۔ ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہم نے اپنے گھر کو نیلامی سے بچانے کے لیے جو جُوا کھیلا تھا، ہم ہار چکے ہیں مگر آج پتا چلا کہ ہم تو ناکام رہ کر بھی کامیاب رہے ہیں......''

# بھونک

سلیم انور

کُتّوں کا بھونکنا ہر شخص کو ناگوار گزرتا ہے... مگر کبھی کبھی ان کُتّوں کا بھونکنا سودمند بھی ثابت ہوتا ہے... آس پاس رہنے والی پڑوسنوں کے درمیان پائی جانے والی ہم آہنگی و یگانگت... وہ ایک دوسرے کی خیرخواہ و غمگسار تھیں... اچانک ایک پڑوسن غائب ہوگئی... جس نے قریبی پڑوسن کو تشویش میں مبتلا کردیا...

**اس عورت کا وجدان جو جانوروں کی نبض شناس تھی......**

**مارتھا** پیمبرٹن نے ڈنر کی گندی پلیٹیں ڈش واشر میں رکھ دیں اور سیدھا ہوتے ہوئے اپنی کمر تھام لی۔ شام ہوتے ہی دبے دبے مگر مسلسل آزار دینے والے درد میں ہمیشہ اضافہ ہونے لگتا تھا۔ ڈاکٹر موریس نے تاکید کی تھی کہ اب چونکہ برف باری کا سیزن اختتام کو پہنچ چکا تھا اور نیو انگلینڈ میں موسم بہار سے ملتے جلتے موسم کی آمد ہوچکی تھی، اسی لیے کمر کی تکلیف سے نجات پانے کے لیے اسے اپنی پہلے سے معمول کی چہل قدمی کا آغاز کردینا چاہیے۔

وہ کچن سے نکل کر ٹی وی روم میں چلی گئی جہاں ہیرالڈ اپنی آرام کرسی پر اونگھ رہا تھا۔

''میں واک کے لیے جارہی ہوں، ڈیئر۔'' مارتھا نے ہیرالڈ سے کہا۔ ''کیا تم نے چانسی کی زنجیر دیکھی ہے؟''

ہیرالڈ بدستور خراٹے لیتا رہا۔ البتہ مارتھا کا پوڈل نسل کا کتا چانسی اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

''یپ...... یپ...... یپ!'' چانسی نے کچن کے فرش کی ٹائلوں پر دائرے میں رقص کرنا شروع کردیا۔

مارتھا نے جھاڑو والے خانے میں رکھی ہوئی چانسی کی زنجیر اٹھائی اور اس کا ایک سرا چانسی کے گلے میں موجود پٹے سے منسلک کردیا۔ پھر وہ دونوں دروازے کی جانب چل دیے۔

گھر سے باہر نکل کر وہ صاف ستھرے بیرونی لان میں رک گئی۔ شام کے دھندلکے سے پہلے کا وقفہ اس کے لیے دن کا پسندیدہ ترین وقت تھا۔ ہر شے دھیمی ہو جاتی تھی۔ زندگی کے تقاضے اتنے پُرزور نہیں رہتے تھے۔ حتیٰ کہ ہوا بھی ہلکی پھلکی محسوس ہوتی تھی۔

اس نے زنجیر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔ چانسی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

موسم بہار میں دھندلکے کے وقت چہل قدمی اس کا لگا بندھا معمول تھا۔ کبھی کبھار وہ راستے میں کسی پڑوسی کی پھولوں کی کیاریوں اور پھولوں سے لدی ڈالیوں کو سراہنے کے لیے رک جاتی تھی۔ یا ان سے خوش گوار ماحول میں خیریت دریافت کرنے کھڑی ہو جاتی تھی۔ لیکن یہ ملاقات خاصی مختصر ہوتی تھی۔

برسوں سے اس کی بلاک میں رہنے والوں سب ہی سے شناسائی تھی۔ مقامی گارڈن کلب کی سیکریٹری کی حیثیت سے وہ پڑوسیوں کو کلب کی منعقد کردہ تقریبات میں حصہ لینے کی ترغیب دیا کرتی تھی جیسے ونڈو بکس اور ہالیڈے ریتھ ڈیکوریٹنگ مقابلے بازی۔ اس زمانے میں فیملیز برسوں اپنے گھروں میں رہائش پذیر رہتی تھیں۔

مارتھا پیمبرٹن نے نسلوں کو پروان چڑھتے دیکھا تھا۔ اب تو ایسا لگتا تھا جیسے ہر مکان صرف راستے کا ایک چھوٹا اسٹیشن ہے جہاں مکین ستانے کے لیے رکتے ہیں اور ابھی معاہدے کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوتی کہ وہ آگے بڑھ جاتے ہیں۔

جلد ہی وہ اس قطار میں پہنچ گئی جہاں جدید طرز کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ڈیویلپر نے اس خالی زمین کو خرید لیا تھا جس کے ساتھ تین مکانات بھی بنے ہوئے تھے۔ اس نے مکان ڈھا دیے تھے۔ نئے تعمیر شدہ مکانات جدید فیشن اور نمائشی طرز کی آرائش کے حامل تھے جیسے آرائشی منارے، اطالوی طرزِ تعمیر کی نوکلاسکی انداز کی کھڑکیاں، ملٹی ڈیکس اور گاڑیوں کے چار چار گیراج۔

مارتھا ان ماڈل ہومز میں سے ایک کے باہر رک گئی اور بیرونی لمبی سی کھڑکی سے اندر جھانکنے لگی۔ اندر اس کی نگاہ ایک بڑے سے ٹی وی اسکرین پر پڑی۔ اسکرین اتنا بڑا تھا جیسے کوئی مووی ڈرائیو ان ہوتا ہے!

وہ مبہوت کھڑی اس بڑے سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی کہ چانسی اچھلتا کودتا اس مکان کے نفاست سے تراشیدہ لان میں چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ مارتھا اسے پکارتی، چانسی نے اپنی ایک ٹانگ اٹھائی اور گھاس کے ہموار قطعہ پر فارغ ہو گیا۔

”ناٹی بوائے!“ مارتھا نے سرگوشی کے انداز میں اسے ڈانٹ پلائی اور مکان کی جانب سے اپنی نظریں ہٹاتے ہوئے چانسی کی زنجیر کو ایک جھٹکا دیا۔ پھر چھوٹے چھوٹے تیز قدموں سے آگے کی جانب بڑھ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد مارتھا قصبے کے اس حصے میں پہنچ گئی جہاں قدیم آبادی تھی۔ اس نے اپنی رفتار ہلکی کر دی۔ اب وہ ناہموار فٹ پاتھ پر سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہی تھی۔ پیپل کے ایک پرانے درخت کی بڑی جسامت والی جڑیں ابھر کر زمین سے باہر نکل آئی تھیں جن کی وجہ سے فٹ پاتھ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔

برسوں قبل شہری انتظامیہ نے فٹ پاتھ کی ازسرِنو تعمیر کے منصوبے کا اعلان کیا تھا۔ بدقسمتی سے اس منصوبے میں درختوں کی کٹائی کا عمل بھی شامل تھا۔

مارتھا نے اس کٹائی کے عمل کی مخالفت کی تھی۔ اس مخالفت میں اسے لوریٹا فیئر بینک کا تعاون بھی حاصل ہو گیا تھا جو اس پرانے رہائشی علاقے کی ایک دولت مند بیوہ تھی۔ وہ دونوں سٹی ہال کے ان اجلاسوں کی سماعت میں پیش ہو چکی تھیں جن میں ٹاؤن انجینئر نے اعلان کیا تھا کہ شہری انتظامیہ پیپل کے درخت ہٹائے بغیر نئے فٹ پاتھ تعمیر کرنے سے قاصر ہے۔

حوصلہ مند مارتھا نے انتظامیہ کو دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے پیپل کے درخت کاٹنے کے بارے میں کوئی عملی قدم اٹھایا تو وہ خود کو کسی بھی درخت کے ساتھ زنجیروں سے باندھ لے گی۔ گو اس کی اس دھمکی کو سٹی ہال خاطر میں نہیں لایا تھا، لیکن اس کی دھمکیوں نے لوریٹا فیئر بینک کو خاصا متاثر کر دیا تھا اور اس کے بعد سے یہ دونوں خواتین سہیلیاں بن گئی تھیں۔

اسی اثنا میں مارتھا نے ایک پولیس پٹرول کار کو لوریٹا کے مکان کے سامنے رکتے دیکھا تو اپنی رفتار تیز کر لی۔

فٹ پاتھ پر ایک دبلی پتلی ادھیڑ عمر عورت اپریل کے اس دھندلکے میں شستی کھڑی پولیس پٹرول کار کی سمت بے تابی سے ہاتھ لہرا رہی تھی۔

”کیا تم ہی وہ پڑوسن ہو جس نے ڈکیتی کی واردات کی رپورٹ کی ہے؟“ شیرف ڈون ڈنبر نے پولیس کار میں سے سوال کیا۔ ساتھ ہی اس کی نگاہ مارتھا کی جانب بھی اٹھ گئی جو ان کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اسے جھرجھری آگئی۔

مارتھا خود کو ایک شوقیہ سراغ رساں سمجھتی تھی۔ وہ مختلف

کیسوں میں اپنی رائے کا اظہار کرنے کے لیے پولیس اسٹیشن فون کرتی رہتی تھی۔ گو شیرف اس کی رائے کا مذاق اڑا دیتا تھا لیکن اس نے کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کیا تھا کہ مارتھا کی دی ہوئی ٹپس متعدد پیچیدہ کیسوں کے حل کرنے میں انتہائی اہمیت کی حامل ثابت ہوئی تھیں۔

”میں نے ہی فون کیا تھا، شیرف۔“ اس عورت نے کہا۔ ”میں مسز بکسبائی ہوں اور میں اس مکان میں رہتی ہوں۔“ اس نے برابر کے کیپ اسٹائل سفید مکان کی جانب اشارہ کیا۔ ”میں نے یہ فون مسز لوریٹا فیئر بینک کے بارے میں کیا تھا۔ اس کا مکان وہ ہے۔“ اس نے مدھم سرخ ٹائلوں والی چھت کے مکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مکان سدا بہار جھاڑیوں کی ایک لمبی قطار میں چھپا ہوا تھا اور چھت کے سوا مکان کم ہی عیاں تھا۔ ”وہ عمر رسیدہ ہے اور مجھے کوئی آئیڈیا نہیں کہ وہ کہاں ہے۔“

اس سے پیشتر کہ شیرف کچھ کہتا، مارتھا کی تیز باریک آواز ساکت فضا میں گونج اٹھی۔ ”یاہو، شیرف ڈنبر! کیا کوئی مسئلہ ہے؟“

شیرف ہچکچاتے ہوئے پولیس کار سے نیچے اتر آیا اور مارتھا کو اپنی جانب بڑھتے دیکھنے لگا۔ مارتھا نے پوڈل نسل کے کتے کی زنجیر تھامی ہوئی تھی جس کے گلے کے پٹے میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ کتے کے بالوں کی رنگت اپنی مالکن کے بالوں کے مانند ہلکی ارغوانی تھی۔ کتا اپنی باریک آواز میں مسلسل بھونکے چلا جارہا تھا حتیٰ کہ مارتھا نے اسے ڈانٹ پلائی۔ ”ہش، چانسی!“

جب چانسی خاموش ہوگیا تو شیرف ڈنبر گویا ہوا۔ ”صورتِ حال میرے کنٹرول میں ہے، مسز پیمبرٹن۔ یہ پولیس کے معمول کا معاملہ ہے۔ تمہیں اپنی چہل قدمی میں خلل ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

مارتھا نے شیرف کی بات نظرانداز کرتے ہوئے مسز بکسبائی کو مخاطب کیا۔ ”میں نے نوٹ کیا ہے کہ تم مسز لوریٹا فیئر بینک کے مکان کی جانب متوجہ تھیں۔ میں امید کرتی ہوں کہ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟“

”ہاں، کچھ ایسا ہی معاملہ لگتا ہے۔“ مسز بکسبائی نے جواب دیا۔ ”اس سے پہلے میں مسز فیئر بینک کے کتے کے عقبی صحن میں بھونکنے سے چوکنا ہوگئی تھی۔ جبھی میں نے دیکھا کہ اس کے مکان کے بیسمنٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے حال ہی میں دور تک نگاہ رکھنے کے لیے مکان کے عقبی حصے میں ایک مینارہ تعمیر کرایا تھا۔ میں یہی سمجھی کہ مزدور بیسمنٹ کا دروازہ کھلا چھوڑ گئے ہیں اور مسز فیئر بینک کا کتا ولی اسی وجہ سے باہر آگیا تھا۔“

”تمہارا مطلب مونٹی ہے۔“ مارتھا نے تصحیح کی۔ ”اس کتے کا نام مونٹی ہے۔“

شیرف ڈنبر مسز بکسبائی کی جانب گھوم گیا۔ ”کیا تم مکان کے اندر گئی تھیں؟“ اس نے پوچھا۔

اس سوال پر مسز بکسبائی کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”میں تنہا اندر جانے سے ہچکچا رہی تھی۔ اس کھلے ہوئے دروازے سے مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ سو میں نے اپنے بیٹے پریسٹن کو فون کرکے بلا لیا۔“ اس نے ایک جھرجھری سی لی اور اپنے سویٹر کو سمٹا لیا۔

”آگے بتاؤ۔“ شیرف نے کہا۔ ”تم نے کیا دیکھا؟“

”ہم دونوں مکان میں ایک ساتھ داخل ہوئے اور بیسمنٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر کچن میں چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے مسز فیئر بینک کو آوازیں دیں لیکن ہمیں کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر ہم نے اوپری منزل کو چیک کرنے کا فیصلہ کیا۔“

”اور پھر تم لوگ اوپر گئے؟“ مسز بکسبائی کے ہچکچانے پر مارتھا نے سوال کیا۔

تب شیرف ڈنبر بے ساختہ مارتھا کی جانب گھوم گیا۔

---

شوہر نامدار نے ”گھر کی حاکمیت“ نامی کتاب کا آخری باب ختم کرتے ہی بستر سے اچھل کر کچن کا رخ کیا اور گونجیلی آواز میں بیوی سے کہا۔ ”آج سے تم میرے لیے روز شاندار کھانا بناؤ گی، بستر صاف کروگی، میرا غسل خانہ صاف کروگی، میرا بدن دباؤ گی، میرے کپڑے استری کروگی کیونکہ آج سے اس گھر میں میرا اور صرف میرا حکم چلے گا۔ میں نہا دھو کر نکلوں گا تو جانتی ہو کہ مجھے بے داغ کپڑے پہنانا کس کی ذمّے داری ہوگی؟“

بیوی کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس نے گرج کر کہا۔ ”تمہارا دماغ چل گیا ہے یا شاید تمہارا آخری وقت قریب آگیا ہے...... تمہیں بے داغ لباس تو کوئی غسال ہی پہنائے گا...... تمہارا حکم مانے میری جوتی!“

ملتان سے بشریٰ افضل کی للکار

---

''مسز پیمبرٹن، اگر تم برا نہ مانو تو سوالات پوچھنا میری ذمے داری ہے۔''

''میں اور میرا بیٹا اوپری منزل پر چلے گئے۔'' مسز بکسبائی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''جب ہم بیڈروم میں پہنچے تو وہاں دیکھا کہ ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ درازیں نکلی ہوئی اور فرش پر الٹی پڑی تھیں۔ ہر شے فرش پر بکھری ہوئی تھی۔ تب میری نگاہ خالی جیولری بکس پر پڑی جو مسز فیئر بینک کے بیڈ پر پڑا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے مسز بکسبائی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''اور گھر میں مسز فیئر بینک کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔''

''پھر تم نے کیا، کیا؟'' شیرف ڈنبر نے پُرسکون لہجے میں سوال کیا۔ وہ ساتھ ہی اپنی نوٹ بک پر کچھ لکھتا بھی جا رہا تھا۔

''میں نے اس کے بیڈروم کے فون سے پولیس کو اطلاع کر دی۔'' مسز بکسبائی نے بتایا۔

یہ سن کر مارتھا نے ایک سرد آہ بھری۔ ''کتنے شرم کی بات ہے۔ لوریٹا کے پاس چاندی کے قدیم خاندانی اثاثوں کے ساتھ موروثی جیولری بھی تھی۔ میں بارہا اس سے کہہ چکی تھی کہ وہ ان قیمتی اشیا اور جیولری کو کسی سیف ڈپازٹ بکس میں رکھوا دے۔ لیکن اس نے میری نہیں سنی۔''

''تمہارا معلومات فراہم کرنے کا شکریہ، مسز پیمبرٹن۔'' شیرف ڈنبر نے اپنی نوٹ بک ایک جھٹکے سے بند کرتے ہوئے کہا۔ ''اب میں مسز بکسبائی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ گھوم گیا۔ ''کیا تم نے مسز فیئر بینک کی پراپرٹی پر کسی کو منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا؟ کوئی بھی جو حال ہی میں وہاں تاک جھانک کر رہا ہو؟''

مسز بکسبائی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''یقیناً وہاں مزدور تو دکھائی دیے تھے لیکن انہوں نے منارہ کا کام کئی دن پہلے مکمل کر لیا تھا۔ اب یہ محلہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ بوڑھی مسز فیئر بینک ہر کسی پر اعتبار کرتی تھی۔ جو کوئی بھی اس کے دروازے پر کوئی شے فروخت کرنے آتا تھا تو وہ اسے گھر کے اندر بلا لیتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ مارچ کے کڑکڑاتے جاڑے میں، میں نے اسے کوٹ کے بغیر باہر منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ بے چاری بڑھیا کو ماہرانہ رکھوالی کی ضرورت تھی۔''

''اوہ، مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔'' مارتھا نے کہا۔ ''لوریٹا کے پاس اس کا پالتو رکھوالا کتا مونٹی موجود تھا۔ وہ ایک عمدہ ساتھی ہے۔ وہ مل کر اپنی دیکھ بھال کر رہے تھے۔''

''کاش میں نے اس کے بیٹے کو پہلے بلا لیا ہوتا۔'' مسز بکسبائی نے کہا۔ ''اور اب وہ گم ہو گئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ٹہلتے ہوئے اپنے مکان کے عقب میں مرطوب زمین کی طرف نکل گئی ہو۔ وہ دلدلی زمین ہے۔'' مسز بکسبائی نے اپنی جیب میں سے ایک ٹشو پیپر نکالا اور اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔ ''امید ہے کہ ہمیں زیادہ دیر نہیں ہوئی ہو گی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس بے چاری بڑی بی کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔''

''اس کے بیٹے کے بارے میں کیا کہو گی؟'' شیرف ڈنبر نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''اس کا بیٹا ایلیٹ فیئر بینک کیپ کوڈ میں ایک اوشیانو گرافک انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر ہے۔'' مارتھا نے بتایا۔ ''وہ بہت مصروف آدمی ہے۔ لوریٹا کبھی اسے زحمت دینا گوارا نہیں کرتی تھی۔''

''کیا تمہارے پاس اس کا پتا ہے؟'' شیرف ڈنبر نے ان دونوں عورتوں کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میرے پاس ہے شیرف۔'' مسز مارتھا پیمبرٹن نے مسز بکسبائی کو کہنی سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ کر بتایا۔ ''لیکن میرے گھر پر ہے۔ اگر تم مجھے اپنی کار میں واپس لے جاؤ تو!''

''شکریہ مسز پیمبرٹن، پلیز پٹرول کار کے پاس میرا انتظار کرو۔ میں یہاں تمام چیزیں لاک کر کے آتا ہوں۔''

وہ تینوں اپنی اپنی راہ ہو گئے۔

شیرف ڈنبر مسز لوریٹا فیئر بینک کے مکان کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے عقبی لان میں پھولوں کی کیاریوں اور شوخ سبز رنگ کے پتوں کی نباتاتی کھاد کے چوڑے بارڈر کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنا سیل فون نکالا اور اپنے اخذ کردہ نتائج سے کسی کو باخبر کرنے لگا۔

مسز لوریٹا کے مکان کو محفوظ کرنے کے بعد وہ اپنی پولیس پٹرول کار کے پاس آ گیا جہاں مارتھا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کار میں سوار ہونے سے پہلے وہ مارتھا سے گویا ہوا۔ ''میڈم، اگر تم برا نہ مانو تو اس کتے کو عقبی نشست پر بٹھا دو۔''

مارتھا نے پوڈل کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ ''چانسی اجنبی کاروں میں سفر کرنے سے نروس ہو جاتا ہے۔''

''میڈم پلیز، یہ ضابطے کی خلاف ورزی ہو گی۔''

مارتھا نے بڑبڑاتے ہوئے چانسی کو عقبی نشست پر بٹھا دیا۔ پھر خود فرنٹ پسنجر سیٹ پر جا بیٹھی۔ ''بے چارے مونٹی کا کیا ہو گا؟'' اس نے لوریٹا کے مکان کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں اینیمل کنٹرول سے بات کروں گا۔'' شیرف ڈنبر نے جواب دیا۔ ''ہم اس وقت تک انتظار کریں گے جب تک ہمیں یہ یقین نہیں آجاتا کہ مسز فیئر بینک کے ساتھ کیا واقعہ پیش

آیا ہے۔ اب تک تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ کسی سے ملنے گئی ہوگی۔"

کچھ دیر بعد ہی پولیس پٹرول کار مارتھا کے مکان کے سامنے رک گئی۔ مارتھا نے نیچے اتر کر عقبی نشست سے اپنے پالتو کتے کو گود میں اٹھالیا۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ اندر چلوں؟" شیرف ڈنبر نے پوچھا۔

"خدا کے لیے، نہیں۔ اگر ہیر الڈ نے اپنے دروازے پر ایک پولیس افسر کو دیکھ لیا تو وہ غش کھا کر گر پڑے گا۔" یہ کہتے ہوئے مارتھا نے چانسی کے اگلے دونوں پنجے اٹھائے اور انہیں الوداع کہنے کے انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولی۔ "چانسی، اچھے شیرف کو گڈ بائی کہہ دو۔"

شیرف ڈنبر دوسری جانب دیکھنے لگا۔ "میں انتظار کر رہا ہوں، مسز پیمبرٹن۔"

پانچ منٹ بعد مارتھا پلٹ آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ وہ پولیس پٹرول کار کی اگلی نشست پر براجمان ہو گئی۔

"ایلیٹ فیئر بینک کا پتا یہ رہا۔" اس نے وہ کاغذ شیرف کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس پر اس کا فون نمبر بھی لکھا ہوا ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ تم اسے فون کرو، میری ایک درخواست ہے۔"

"وہ کیا؟"

"جب تم مسز فیئر بینک کے گھر واپس جاؤ تو اس کے بیڈ روم کے فون پر انگلیوں کے نشانات حاصل کرنے کے لیے پوڈر چھڑکنے کا یقین کر لینا۔"

شیرف اس بات پر آنکھیں پھاڑے مارتھا کو دیکھنے لگا۔ "میں یہ کیوں کروں؟"

"اس لیے کہ تمہیں فون سیٹ پر انگلیوں کے کوئی نشانات نہیں ملیں گے۔ خاص طور پر مسز بکسبائی کے انگلیوں کے نشانات جبکہ وہ تمہیں ملنے چاہئیں، آخر کار اس نے کہنا ہے کہ اس نے تمہیں کال کرنے کے لیے بیڈ روم کا فون استعمال کیا تھا۔ میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ جیولری بکس کو لوٹنے کے بعد وہ اپنے دستانے اتارنا بھول گئی تھی۔ اگر اس نے بیڈ روم کے فون سے کال کی تھی جیسا کہ اس کا کہنا ہے تو پھر اس کی انگلیوں کے نشانات فون سیٹ پر لازمی ہونے چاہئیں۔"

شیرف اپنے دیدے گھمانے لگا۔ "انگلیوں کے نشانات کا پایا نہ جانا کسی کو بھی مجرم ٹھہرانے کے لیے کافی نہیں ہے، مسز پیمبرٹن۔ تم پولیس کا کام میرے اوپر کیوں نہیں چھوڑ دیتیں؟"

"اس کے علاوہ مزید اور بھی ہے، شیرف۔ مثال کے طور پر کیا تم نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ کس طرح مسز بکسبائی نے لوریٹا کا تذکرہ کرتے ہوئے فعل ماضی استعمال کیا تھا؟ اس نے کہا تھا 'بے چاری بڑھیا کو ماہرانہ رکھوالی کی ضرورت تھی' گویا کہ اسے معلوم تھا مسز فیئر بینک پہلے ہی مر چکی ہے۔"

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ بات کہتے ہوئے اس کی زبان پھسل گئی ہوگی۔" یہ کہہ کر شیرف ڈنبر نے اپنی پٹرول کار کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔ اس امید کے ساتھ کہ اس کی کار میں سوار اس کی پسنجر اس کا اشارہ سمجھ جائے گی اور کار سے نیچے اتر جائے گی۔

لیکن مارتھا نے اپنی بات جاری رکھی۔ "جب تم پولیس اسٹیشن واپس پہنچو تو مسز بکسبائی کے بیٹے پریسٹن بکسبائی کا ریکارڈ چیک کر لینا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خاصے مجرمانہ ریکارڈ کا حامل ہے۔"

اس سے قبل کہ شیرف کوئی جواب دیتا، مارتھا بولی۔ "اور جب تم یہ چیک کر رہے ہو گے تو اپنے آدمیوں میں سے کسی کو لوریٹا کے عقبی لان کے نوتعمیر شدہ منارے کے اطراف کی کیاریوں کی کھدائی کرنے بھیج دینا۔ خاص طور پر ان کیاریوں کی جن پر پتوں کی نئی نباتی کھاد موجود ہے۔"

"میں ایسا کیوں کروں؟"

"لوریٹا فیئر بینک گارڈن کلب کی برسوں سے صدر رہی ہے۔ وہ کبھی بھی پتوں کی مصنوعی رنگین نباتی کھاد خرید ہی نہیں سکتی۔ خاص طور پر سبز رنگ کا اس قدر گھناؤنا شیڈ!"

شیرف نے ایک لمبی آہ بھری اور بولا۔ "اگر تم اپنی بات مکمل کر چکی ہو، مسز پیمبرٹن تو میں اجازت چاہوں گا۔ مجھے اسٹیشن پہنچ کر اپنی رپورٹ داخلِ دفتر کرنی ہے۔"

"یقین کرو شیرف، مجھے ابتدا ہی سے اس عورت پر شبہ ہو گیا تھا۔" مارتھا نے کہا۔

"کون سی عورت پر؟"

"مسز بکسبائی پر...... اور کس عورت پر؟ میں اس کی نیت اسی لمحے بھانپ گئی تھی جب اس نے یہ کہا تھا کہ وہ عقبی لان میں مونٹی کے بھونکنے سے چوکنا ہو گئی تھی۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو، مسز پیمبرٹن؟" شیرف نے زچ ہو کر پوچھا۔

"یہ بالکل سیدھی سی بات ہے، شیرف۔ لوریٹا کا پالتو کتا مونٹی بسنجی (Basenji) نسل کا ہے۔ اور بسنجی نسل کے کتے کبھی نہیں بھونکتے!"

❋ ❋

# بامحاورہ

منظر امام

اب تک ہزارہا کہانیاں قاری پڑھ چکیں ہوں گے... لیکن اس طرح کی کہانی ان کی نظروں سے نہیں گزری ہوگی... انسانوں میں پیمانہ' محبت کے زاویے اور تغیرات... جانوروں کی زندگی کو لاحق خطرات سے آگاہ کرتی خوب صورت بامحاورہ... بامروت اور باوقار تحریر...

**شگفتہ شگفتہ...... دھیرے دھیرے انداز**

**میں دل کو گرماتی...... لبھاتی...... کھلکھلاتی کہانی......**

ایسوپ کی بہت مشہور کہانی ہے۔ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا۔

پہلے تو آپ کی یاددہانی کے لیے وہ کہانی سنا دوں۔ پھر اس پر موجودہ یعنی آج کے حالات میں یہ کہانی کس طرح لکھی جاتی۔

بہت سے چوہے ایک جگہ جمع ہوئے بلکہ چوہوں کے راجا نے ایک میٹنگ بلائی تھی کہ بلی کے خطرے سے کیسے نمٹا جائے۔ راجا نے کہا۔ ''میرے پیارے چوہو تم تو جانتے ہو کہ بلی ہماری کتنی بڑی دشمن ہے۔ اس کی وجہ سے ہم بے موت مارے جاتے ہیں۔ پچھلے ہفتے وہ میرے خالہ زاد کو کھا گئی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے سب کو ختم کر دے گی۔ یہ میٹنگ اسی لیے بلائی گئی ہے کہ سب مل کر ترکیب سوچیں کہ بلی سے کیسے نمٹا جائے۔''

ایک چوہے نے کہا۔ ''مہاراج میرے ذہن میں زبردست ترکیب ہے۔''

''وہ کیا ہے؟'' راجا نے پوچھا۔

''مہاراج جس طرح انسانوں میں خودکش ہوتے ہیں۔ اسی طرح چوہوں میں بھی کچھ خودکش تیار کیے جائیں۔ جو جا کر بلی سے لپٹ جائیں۔ اس طرح وہ چوہا تو ختم ہو ہی جائے گا لیکن بلی بھی ختم ہو جائے گی۔''

''اور ایسا چوہا کون ہوگا جو اپنی قوم کے لیے جان دینے کو تیار ہو جائے؟'' راجا نے پوچھا۔

''سرکار۔'' دوسرے چوہے نے کہا۔ ''سرکار! آپ چونکہ اس قوم کے محافظ ہیں۔ ہم سب کے راجا ہیں اس لیے یہ کام آپ کو کرنا چاہیے۔''

راجا ایک لمحے کے لیے چکرا کر رہ گیا۔ پھر اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''میرے بچو۔ میں تو خود بھی چاہتا ہوں کہ اپنی قوم پر قربان ہو جاؤں۔ جان دے دوں اپنی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میرے بعد اس قوم کو کون سنبھالے گا۔ تم تو دیکھ رہے ہو کہ ہماری سلطنت کتنی وسیع ہے۔ کم از کم پچاس ہزار بل ہیں ہمارے پاس۔ میرے مرتے ہی ان بلوں میں بغاوت شروع ہو جائے گی۔ تم ایک دوسرے سے لڑنے لگو گے۔ اسی لیے فی الحال میرا مرنا مناسب نہیں ہے۔ کوئی اور ترکیب بتاؤ۔''

ایک اور چوہے نے کہا۔ ''سرکار، کیوں نا ہم بلی کے گلے میں گھنٹی باندھ دیں؟''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''سرکار ہمیں فوراً بلی کے آنے کا پتا چل جائے گا اور ہم ہوشیار ہو جائیں گے۔ اِدھر اُدھر چھپ جائیں گے۔''

''واہ واہ، یہ بہت اچھی ترکیب ہے۔ اے نوجوان چونکہ یہ ترکیب تم نے پیش کی ہے اسی لیے یہ کام تمہارے سپرد کیا جاتا ہے۔''

ترکیب پیش کرنے والے چوہے کی سٹی گم ہو گئی۔

راجا نے پھر کہا۔ ''تم کو یہ اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ تم چوہوں کی قوم میں کتنے پاپولر ہو جاؤ گے اور جہاں تک میرا سوال ہے تو میں تمہیں اپنا وزیر بنا دوں گا۔''

سب چوہے پھر واہ واہ کرنے لگے۔
راجا نے پوچھا۔ ''کیا تم سبھوں کو یہ ترکیب پسند آئی ہے؟''
''جی سرکار۔'' سب نے کہا۔ ''اس طرح ہمیشہ کے لیے ہماری قوم محفوظ ہو جائے گی۔''
''جس نوجوان نے یہ ترکیب پیش کی ہے، وہ ایک عقلمند چوہا معلوم ہوتا ہے۔'' راجا نے کچھ سوچ کر کہا۔
''جی سرکار! اس میں کیا شک ہے۔'' سب نے کہا۔
''چونکہ وہ عقلمند ہے۔ اس لیے ہم اسے بلی کے ہاتھوں ضائع نہیں کرنا چاہتے۔'' راجا نے کہا۔ ''اس کے مشورے آئندہ بھی ہم ہمارے کام آتے رہیں گے۔ اسی لیے یہ ذمے داری کسی اور کو دی جاتی ہے۔ اب بتاؤ تم میں سے کون گھنٹی باندھے گا؟''
سب ایک دوسرے کی صورتیں دیکھنے لگے۔ اسی وقت بلی کی میاؤں سنائی دی۔ سب سے پہلے راجا بھاگا۔ اس کے ساتھ وہ چوہا جس نے تجویز دی تھی۔ ذرا سی دیر میں وہاں کوئی بھی نہیں رہا تھا۔
سبق...... ایسے دعوے نہ کیا کرو...... جس پر عمل نہ کر سکو۔
یہ تو بھی ذرا سی ترمیم کے ساتھ ایسوپ کی کہانی۔ آپ کو یاد آ گئی ہوگی۔ اب ذرا اس کہانی کو دوسرے انداز سے سنیں۔

☆☆☆

سکندر پہلوان کی لڑکی بہت خوب صورت تھی۔ محلے کا ہر نوجوان اس کے چکر میں رہتا تھا۔
لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس سے اظہار کر سکے۔ دو تین لڑکوں نے ہمت کی تھی تو وہ کئی مہینوں تک اسپتال ہی میں رہے تھے۔ سکندر پہلوان نے اتنے دھوبی پاٹ مارے تھے کہ ان کے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔ اس کے بعد سناٹا ہو گیا تھا۔
سکندر پہلوان کی خوب صورت لڑکی رقیہ خود اس صورت حال سے پریشان رہا کرتی تھی۔ وہ اپنی سہیلی سے کہا کرتی۔ ''زینت ایسا لگتا ہے کہ میں ساری زندگی اسی طرح گھر میں بیٹھی رہوں گی۔''
''وہ کیوں؟''
''تم تو دیکھتی ہو نا۔ ابا کسی کو میرے قریب ہی نہیں آنے دیتے۔'' رقیہ نے کہا۔ ''ایک دو نوجوانوں نے ہمت بھی کی تو ابا نے مار مار کر ان کا کیا حشر کیا تھا۔''
''ارے وہ تو اسی محلے کے لوفر لونڈے تھے۔''

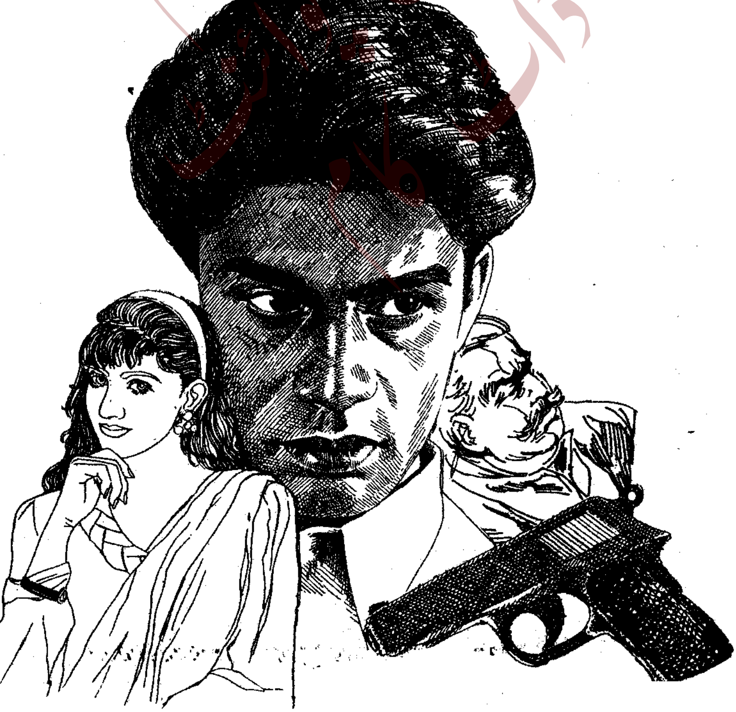

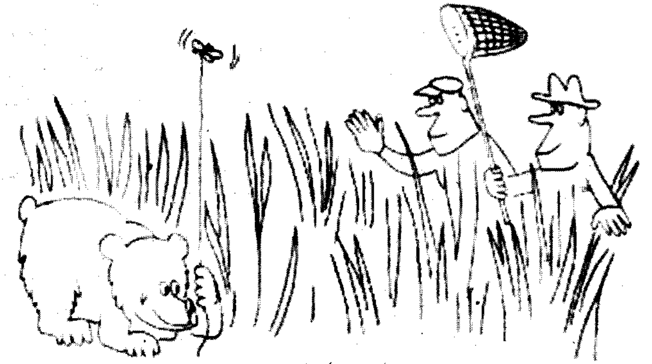

شکاریوں کا شکار

زینت نے کہا۔

''لوفر نہیں تھے۔ بس بے پروا سے تھے لیکن کوئی ذمّے داری آجاتی تو وہ پوری بھی کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ پڑھے لکھے بھی تھے۔ گھر بھی اچھا تھا لیکن کیا کروں۔ میری تو قسمت ہی خراب ہے۔ ابا ہی ایسے ہیں۔''

رقیہ اداس ہوگئی۔

جس وقت رقیہ اپنی سہیلی سے یہ باتیں کررہی تھی۔ اس وقت محلے کے ہوٹل میں محلے کے نوجوانوں کی بھی میٹنگ ہورہی تھی۔ یہ میٹنگ رقیہ ہی کے حوالے سے تھی۔ کچھ دیر پہلے برکت چاچا نے آکر ان نوجوانوں کو جھنجوڑ دیا تھا۔

برکت چاچا ایک ملنگ قسم کے انسان تھے۔ ان کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی لیکن محلے کے ہر لڑکے کو اپنا بیٹا اور ہر لڑکی کو اپنی بیٹی سمجھتے تھے۔ کسی کے ساتھ کوئی پرابلم ہو، برکت چاچا اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتے تھے۔

وہ سب کے سب اس وقت ہوٹل میں ہی بیٹھے تھے جب برکت چاچا داخل ہوئے۔ وہ سیدھے ان لڑکوں کے پاس آئے تھے۔

''کیا تم میں سے کسی کو احساس ہے کہ اس محلے میں آگ جل رہی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''ہم نہیں سمجھے چاچا۔''

''میں سکندر پہلوان کی بیٹی کی بات کررہا ہوں۔'' برکت چاچا نے کہا۔ ''وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہت نیک، بہت سمجھ دار، بہت مہذب، دنیا بھر کی خوبیاں ہیں اس میں۔ لیکن وہ ابھی تک گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے بیٹھے رہنے کا عذاب پورے محلے کو بھگتنا ہوگا۔''

''لیکن ہم کیا کرسکتے ہیں چاچا۔ اس بے چاری کا باپ ہی ایسا ہے۔''

''ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تم میں سے کسی کا رشتہ اس کے گھر جاتا۔ کیونکہ محلے کی بیٹی سب کی ذمّے داری ہوتی ہے۔''

''چاچا، میرے گھر سے رشتہ گیا تھا۔'' اکرم نے بتایا۔ ''خود میری اماں لے کر گئی تھی۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''سکندر کہنے لگا کہ لڑکا پہلے مجھ پر قابو پا کر دکھائے اور جب میں مان لوں گا کہ اس میں اتنی ہمت اور طاقت ہے تو پھر اس کی شادی کردوں گا۔ مجھے بھی اپنی بیٹی کو گھر میں بٹھائے رکھنے کا شوق نہیں ہے لیکن یہ میری شرط ہے۔''

''بہت بدنصیب آدمی ہے۔'' برکت چاچا نے کہا۔

''اس طرح وہ آدمی پورے محلے پر عذاب لے کر آئے گا۔''

''میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔'' ایک نوجوان نے کہا۔

''بتاؤ، کیا ترکیب ہے؟''

''ہم میں سے کوئی سکندر کے پاس جائے اور اسے آرام آرام سے سمجھانے کی کوشش کرے۔'' اس نے کہا۔

''سوال تو یہی ہے کہ کون اس کے پاس جائے؟''

''یہ تو بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے والی بات ہو

گئی۔" کسی نے کہا۔ "کون گھنٹی باندھے گا؟"

"میں باندھوں گا۔" کسی طرف سے آواز آئی۔

سب چونک کر دیکھنے لگے۔

وہ ایک دُبلا پتلا لیکن مہذب اور پڑھا لکھا نوجوان تھا۔

وہ اپنی میز سے اٹھ کر ان لوگوں کے پاس آگیا۔

"میرا نام اسلم ہے۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔ "ہمیں اس محلے میں آئے پندرہ دن ہوئے ہیں۔ میری کسی سے دوستی نہیں تھی لیکن آج شاید آپ لوگوں سے ہوجائے۔"

"کیوں نہیں۔" افضل گرم جوشی سے بولا۔ "ہمیں اپنا دوست ہی سمجھیں۔"

"بیٹے، کیا تم کو معلوم ہے کہ ہم کس کے بارے میں باتیں کررہے تھے؟" برکت چاچا نے پوچھا۔

"جی محترم! آپ لوگوں کی باتیں میں نے بھی سنی تھیں۔" اس نے کہا۔ "میں چونکہ خود بھی اس لڑکی کو دیکھ چکا ہوں اسی لیے میں نے مداخلت کرنے کی ہمت کی ہے۔ میں ایک شریف انسان ہوں۔ ایک فرم میں ایک اچھی پوسٹ پر ہوں۔ یہ میں اس لیے بتارہا ہوں کہ آپ سب مجھے کوئی لوفر نہ سمجھیں۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، بہت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں اور بہت سیریس ہوں۔ میں نے اس لڑکی کو دیکھا ہے اور مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ ایک شریف لڑکی ہے۔ اب آپ لوگوں سے پتا چلا کہ اس کا باپ اس کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔"

"یار تم کو اس محلے میں آئے ابھی صرف پندرہ دن ہوئے ہیں اور تم نے اندازہ لگالیا کہ ہم کس لڑکی کی بات کررہے ہیں۔" منیر نے کہا۔

"جی ہاں۔ کیونکہ آپ میں سے کسی نے اس لڑکی کے باپ کا حوالہ دیا تھا۔ اس سے میں نے پہچانا ہے۔"

"سوال پھر وہی ہے کہ تم کو یہ سب کیسے معلوم؟" منیر نے پوچھا۔

"میں ایک دن محلے کی ایک دکان پر سودا لینے گیا تھا۔ وہاں وہ لڑکی بھی آئی ہوئی تھی۔ اس لڑکی کے ہاتھ میں کچھ سامان تھا جو اتفاق سے شاپر کے پھٹ جانے کی وجہ سے مجھ پر گر پڑا اور میرے کپڑے خراب ہوگئے۔ اس پر اس لڑکی نے اتنی بار معذرت کی کہ خود میں شرمندہ ہوکر رہ گیا۔ اس وقت اس دکاندار نے اس لڑکی کا بیک گراؤنڈ بتایا تھا پھر اس وقت آپ حضرات کی باتیں سنیں تو اندازہ ہوگیا۔"

بات صاف ہوگئی تھی۔

"بیٹے تم نے یہ کیوں کہا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی تم باندھو گے؟" برکت چاچا نے پوچھا۔

"محترم بات یہ ہے کہ میری والدہ میرے لیے رشتہ تلاش کررہی ہیں۔" اس نے بتایا۔ "وہ لڑکی مجھے اچھی لگی ہے۔ اسی لیے میں نے یہ بات کہہ دی تھی۔"

"یعنی تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں۔ بشرطیکہ یہاں کسی کو اعتراض نہ ہو۔"


قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کورنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

''نہیں بھائی اعتراض کیسا۔ ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ اس کی زندگی بن جائے۔ اگر تمہارے حوالے سے ہو جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔'' افضل نے کہا۔

''ہاں بیٹے، تم مجھے معقول اور سنجیدہ نظر آئے ہو۔'' برکت چاچا نے کہا۔ ''لیکن اس کا باپ ایک عجیب مزاج کا انسان ہے۔ اس کی جو شرط ہے اس نے اس طرح خود اپنی بیٹی کے پیروں پر کلہاڑی ماردی ہے۔''

''محترم! پریشان نہ ہوں۔ میرا دوست میرے لیے اس سکندر کے گلے میں گھنٹی باندھے گا۔'' اسلم نے کہا۔

''کیا مطلب؟ کون ہے تمہارا دوست؟''

''ہے جناب۔ اس نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا۔'' اسلم نے بتایا۔ ''ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے۔ میری خاطر وہ اس سکندر کو قابو میں کرلے گا۔''

''کیا اس دور میں بھی ایسے جاں نثار دوست ہوتے ہیں؟'' منیر نے پوچھا۔

''کیوں نہیں ہوتے، میرے پاس تو ہے۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ سکندر اسی سے اپنی بیٹی کا رشتہ کردے۔'' کسی نے کہا۔ ''اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔'' اسلم کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ''میرے دوست کو میرے لیے قربانی دینی ہوگی۔''

''چلو بیٹا، میں تو تمہارے اور تمہارے دوست کے لیے دعا ہی کرسکتا ہوں۔'' برکت چاچا نے کہا۔

''محترم کیا آپ نے اس سرپھرے انسان کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی؟'' اسلم نے پوچھا۔

''درجنوں بار، لیکن وہ سمجھتا ہی نہیں ہے۔''

''لیکن میرا دوست اس کو سمجھا دے گا، اس کی بات کوئی ٹال نہیں سکتا۔''

''چلو خدا کرے ایسا ہی ہو۔''

''ایسا ہی ہوگا محترم۔ میں اپنے دوست کی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

''لیکن گلے میں گھنٹی باندھنے والا خود ہی امیدوار ہو گیا تو......''

''نہیں، اسے شادی نہیں کرنی۔'' اسلم نے کہا۔ ''بس آپ لوگ میری کامیابیاں دیکھتے جائیں۔''

ایک ہفتے کے بعد محلے کے ان نوجوانوں نے دیکھا کہ اسلم اور رقیہ ایک دوسرے سے باتیں کررہے تھے۔ دونوں ایک دکان کے پاس کھڑے تھے اور ہنس ہنس کر باتیں ہو رہی تھیں۔ یہ نوجوان پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

''یار اس بندے نے تو اپنا کام دکھانا شروع کردیا ہے۔'' کسی نے کہا۔

''ہاں اسے یہ تو کرنا ہی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس لڑکی کے قریب ہوتا جائے گا اور ویسے بھی رقیہ سے اپنی ملاقات کی کہانی بتا چکا ہے کہ یہ ملاقات ایک دکان ہی پر ہوئی تھی۔''

''میری تو دعا ہے کہ خدا اسے اس مشن میں کامیاب کردے۔'' منیر نے کہا۔

''کیا بات ہے۔ اس کے حق میں دعا کررہے ہو؟''

''نہیں یار، اس کے حق میں نہیں۔ اس بے چاری رقیہ کے حق میں۔'' منیر نے کہا۔

''ابھی تو اس نے رقیہ سے بات کی ہے۔ اصل مرحلہ گلے میں گھنٹی باندھنے والا ہوگا۔ اس وقت دیکھتے ہیں، وہ کتنے پانی میں ہے۔'' افضل نے کہا۔

افضل کی طرف دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ ایک بار اس نے بھی کوشش کی تھی لیکن سکندر پہلوان نے جب کشتی کی بات کی تو بے چارہ الٹے قدموں واپس آگیا تھا۔ اس وقت سے وہ ہر دم رقیہ کی اچھی قسمت کی دعائیں ہی مانگتا رہتا تھا۔

دو دن بعد وہ نوجوان ہوٹل میں آکر ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔

''ہاں بھائی سنا ہے، بہت اچھے جا رہے ہو۔'' منیر نے کہا۔

''بس آپ لوگ دعا کرتے رہیں کہ یہ مرحلے آسان ہوجائیں۔'' اس نے کہا۔

اور صرف تین دنوں کے بعد انہیں دوسری خبر یہ ملی کہ رقیہ اور اسلم دونوں ایک پارک میں دیکھے گئے ہیں۔

اب تک تو معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ لڑکا اور لڑکی جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اسی طرح مختلف اسپاٹ پر ان کی ملاقاتیں ہوا کرتی ہیں۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ اصل مرحلہ ابھی تو شروع ہی نہیں ہوا تھا۔

ایک شام وہ پھر ہوٹل آگیا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ ''دوستو! مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی مل گئی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اور وہ کون سی خوشی ہے؟''

''رقیہ جیسی لڑکی کی محبت مل گئی ہے۔ وہ ایسی لڑکی ہے کہ جس کو مل جائے وہ خوش نصیب ہوگا۔''

"یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔" منیر نے کہا۔ "ورنہ اس محلے میں اور بھی لڑکیاں ہیں۔ ہم کسی کے لیے اتنا سیریس نہیں ہیں جتنا اس کے لیے ہیں اور اس کی بھلائی چاہتے ہیں۔"

"دوستو! میرا دوست تو پہلے ہی دن بلی کے گلے میں گھنٹی باندھ دیتا لیکن میں نے سوچا کہ پہلے اس لڑکی کو تو دیکھ لیں، سمجھ لیں۔ جس کے لیے اتنی محنت کروں گا۔ اپنے دوست کو زحمت دوں گا اور اب یقین ہو گیا ہے کہ اس لڑکی کو حاصل کرنا گھاٹے کا سودا نہیں ہوگا۔ اسی لیے میں نے یہ سوچ لیا ہے کہ اب دیر نہیں کرنی۔ یہ کام کل ہی کر ڈالنا ہے۔"

"یار تم اپنے دوست سے ہم کو بھی تو ملواؤ۔" منیر نے کہا۔

"ضرور، میں یہ کام کرلوں۔ پھر تم لوگوں سے ملوا دوں گا۔"

تیسری شام وہ پھر آگیا۔

"یارو! کام تو کل ہی ہو جاتا لیکن وہ اس کا باپ کہیں گیا ہوا تھا۔ میرا دوست بھی مایوس ہو گیا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دلایا ہے کہ فکر مت کرو۔ آج نہیں تو پھر سہی۔"

سب دوست ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئے۔ لیکن چوتھے دن انہیں ایک اور خبر مل گئی۔

یہ خبر اب تک کی خبر سے زیادہ حیرت انگیز تھی۔

محلے ہی کا ایک نوجوان یہ خبر لے کر آیا تھا۔ وہ بہت پُرجوش ہو رہا تھا۔ "یارو! اس بندے نے تو سکندر کو نکیل ڈال دی ہے۔"

سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "وہ کیسے؟"

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ سکندر پہلوان اس کی بائیک دھو رہا تھا۔" اس نے بتایا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" منیر حیران ہوا۔

"میں بتا رہا ہوں نا۔ اور وہ خود کھڑا ہوا سکندر کو آرڈر دے رہا تھا کہ اس طرح دھونا ہے۔ اس طرح صفائی کرنی ہے، وغیرہ وغیرہ۔"

"اور سکندر اس کی بات مان رہا تھا؟" افضل حیرت سے بولا۔

"ہاں بھائی، ایسا ویسا؟ اچھا بیٹے اچھا بیٹے کہتا جا رہا تھا۔"

"یار یہ تو سمجھ میں نہیں آتا۔ سکندر جیسا بپھرا ہوا سانڈ کیسے قابو میں آگیا؟"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اسلم مسکراتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوا۔ "یارو میں تم سب کو ایک خبر دینے آیا ہوں۔"

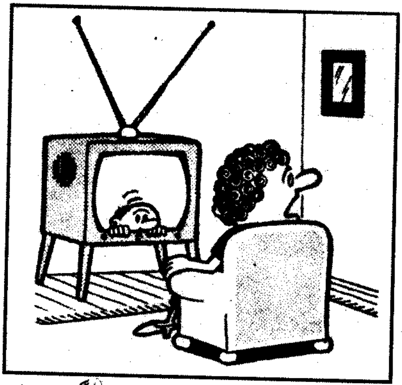

جیف! جلدی آکر تصویر ٹھیک کردو ورنہ بچہ نیچے گر جائے گا

اس نے بتایا۔ "اگلے ہفتے رقیہ سے میری منگنی ہے۔"

"کیا؟" سب حیران رہ گئے تھے۔

"ہاں یارو! آج تو سکندر انکل نے میری بائیک بھی دھوئی ہے۔"

"لیکن یہ کیسے ہو گیا؟" منیر بولا۔

"یار تم نے بلی کے گلے میں گھنٹی کیسے باندھ دی۔" افضل نے پوچھا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ میرا دوست ناممکن کو بھی ممکن کر دیتا ہے۔ یہ اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔ میرا دوست اگر اس زمانے میں ہوتا نا جب چوہے بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی پلاننگ کر رہے تھے تو بلی خود ہی اپنی گردن حاضر کر دیتی کہ لو بھائی باندھ دو گھنٹی۔"

"بھائی میرے ایسا کون سا دوست ہے۔ تم اس سے ملوا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔ ابھی ملوا دیتا ہوں۔"

اسلم نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنی جیب سے ایک ٹی ٹی نکال کر میز پر رکھ دی۔ "یہ ہے میرا دوست۔ اگر یہ اس زمانے میں ہوتا تو چوہا چیونٹی تک بلی کے گلے میں گھنٹی باندھ سکتی تھی۔"

سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

ایسوپ کی کہانی کا سبق چاہے کچھ بھی ہو۔ لیکن اس کہانی کا سبق یہ ہے کہ اگر کسی قوم کو زندہ رہنا ہے تو اسے طاقتور بننا ہوگا۔ کیونکہ

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

# بلیک میلر

عکسِ فاطمہ

بعض اوقات ذرا سی بے اعتدالی اور عام سی بے احتیاطی بڑی مصیبت کا سبب بن جاتی ہے... وہ اس کا ہدف تھے اور ان سبھی کو اپنے اَن دیکھے دشمن کی چال سے نجات حاصل کرنی تھی... مگر اچانک ایک ساتھی ان سے جدا ہو گیا...

**دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے والے بلیک میلر کا قصہ......**

شرمین غصے میں تھا اور کسی پر بھی پھٹ پڑنے پر پوری طرح تیار تھا۔

اس نے آج صبح ہی سُنا تھا کہ پوسٹ آفس اس کے سگھڑ دادا کی خدمات کے سلسلے میں ایک نیا یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کر رہا ہے۔ یہ انتہائی شاندار خبر تھی...... ماسوائے اس کے کہ شرلاک ہومز کا نیا ٹکٹ افسانوی کرداروں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے سلسلے کی ایک کڑی تھا جبکہ شرمین ہر کسی کو جو اس کی بات سُن لیتا تھا، یہی بتا چکا تھا کہ اس کا دادا کسی طور پر افسانوی کردار نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا انسان اور نامور سراغ رساں گزرا تھا۔

شرمین پُروقار انداز میں چلتا ہوا پوسٹ آفس کی مین بلڈنگ میں داخل ہوا تو اسے کاؤنٹر پر صرف تین افراد دکھائی دیے جو سٹی پوسٹ ماسٹر پر چیخ چلا رہے تھے۔ اس غیر معمولی سراغ رساں نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا۔ وہ اس کا ہمسایہ ہیری تھا۔

ہیری نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی طرف بُلا لیا۔ ”یہ شرمین ہومز ہے۔“ اس نے سراغ رساں کا تعارف دوسروں سے کراتے ہوئے بتایا۔ ”اس کی رہائش میپل اسٹریٹ پر ہے۔“

”معاملہ کیا ہے؟“ شرمین نے پوچھا۔

”شرمین، ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ پوسٹ آفس بکس نمبر 447 کس نے کرائے پر لے رکھا ہے؟“

”میں یہ معلومات افشا نہیں کر سکتا۔“ پوسٹ ماسٹر نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

”تم لوگ یہ کیوں جاننا چاہتے ہو؟“ شرمین نے اپنے ہمسائے سے پوچھا۔

”کیا ہم اس پر اعتبار کر سکتے ہیں؟“ گروپ میں شامل خاتون نے سرگوشی کے لہجے میں پوچھا۔

”قطعی طور پر۔“ ہیری نے جواب دیا۔ ”یہ ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہے۔“

وہ تینوں شرمین کو ایک جانب لے گئے تاکہ ذاتی طور پر اپنی صورتِ حال اس کے گوش گزار کر سکیں۔

”مجھے آج صبح ایک نامعلوم خط موصول ہوا ہے۔“ عورت نے بتایا۔ اس نے اپنا تعارف بہ طور جوائس کرایا۔ ”یہ بلیک میلر کا پیغام تھا۔ وہ بلیک میلر میری کچھ باتیں جانتا ہے...... بُری باتیں۔ خط میں مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں

ہر ماہ پوسٹ بکس نمبر 447 پر پانچ ہزار ڈالر بھیج دیا کروں۔ میں یہاں یہ جاننے کے لیے آئی ہوں کہ وہ بلیک میلر کون ہے؟''

''میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔'' ہیری نے قدرے جھینپتے ہوئے کہا۔'' مجھے علم نہیں کہ بلیک میلر کو اس بارے میں کیسے پتا چلا۔ میں جب یہاں پہنچا تو میں نے جوائس کو پہلے سے یہاں موجود پایا جو اس پوسٹ بکس نمبر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔''

''میں یہاں اس کے ایک منٹ یا کچھ ہی دیر بعد پہنچا تھا۔'' دوسرے شخص نے کہا۔'' میرا نام بل ہے اور ہم سے یہ مت کہنا کہ ہم پولیس کے پاس چلے جائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ پولیس کو ہماری کمزوریوں کا علم ہو جو کہ بلیک میلر کے علم میں ہیں اس لیے میں بلیک میلر کو ادائیگی کرنے کو ترجیح دوں گا۔''

''تم لوگوں کے خیال میں بلیک میلر کو تم لوگوں کے رازوں کا علم کیونکر ہوا ہوگا؟'' شرمین نے پوچھا۔

''مجھے معلوم نہیں۔'' جوائس نے کہا۔'' ہم سب ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہم سب ایک ہی قسم کی سرگرمی میں ملوث رہے ہوں۔ وہی سرگرمی جس کی بنا پر ہمیں بلیک میل کیا جارہا ہے...... لیکن یہ صرف میرا قیاس ہے۔''

شرمین کو اس صورتِ حال سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی لیکن اسے کچھ زیادہ اُمید نہیں تھی۔ اگر تم لوگوں نے بلیک میلر کی شناخت دریافت کر لی تب بھی تمہارے لیے بہتر ثابت نہیں ہوگا جب تک تم لوگ پولیس کے پاس نہ جاؤ۔''

''ہوسکتا ہے کہ ہم اس بارے میں خود ہی کچھ کر سکیں۔'' ہیری نے غیر واضح طور پر کہا۔'' یعنی کہ ہم اس معاملے کو خود اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔''

بل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔'' اگر تمہارے پاس کوئی آئیڈیا ہو کہ ہم بلیک میلر کو کس طرح پکڑ سکتے ہیں مسٹر شرمین تو تم بس اپنے اس پڑوسی کو بتا دینا۔ ہم اسے اپنے فون نمبرز دے دیتے ہیں۔''

شرمین کو ان لوگوں کی جانب سے زیادہ پریشانی لاحق نہیں تھی۔ ایمانداری کی بات یہ تھی کہ اس کے خیال

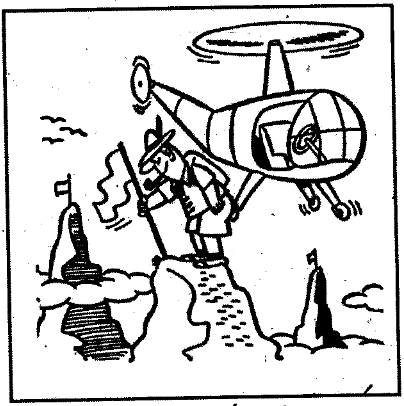

کوہ پیمائی کا جدید انداز!

میں یہ لوگ کوئی غیر قانونی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔

لیکن اسی شام اس نے خبرنامے میں قتل کی ایک واردات کے بارے میں سنا تو سٹپٹا گیا۔

اس کے پڑوسی ہیری کو اندرونِ شہر کی ایک تنگ گلی میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ مقامی نیوز کاسٹر کے مطابق اس کا کسی سے جھگڑا ہوا تھا اور ہیری کو اس کی اپنی گن سے نہایت قریب سے گولی ماری گئی تھی۔

شرمین نے ٹی وی بند کر دیا اور اندھیرے میں بیٹھ کر غور کرنے لگا۔ کیا ہیری نے واقعی وہ قدم اٹھا لیا تھا جس کی اس نے دھمکی دی تھی؟ کیا اس نے بلیک میلر کو شناخت کر لیا تھا اور اپنی گن لے کر اس کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا تھا؟

شرمین مزید چند منٹ تک اس معاملے پر غور کرتا رہا، پھر اس نے اپنا فون اٹھایا اور اس کے اسپیڈ ڈائل پر نمبر ون کا بٹن دبایا۔

”سارجنٹ ولسن؟ میں نے سنا ہے کہ تمہارے لیے ایک اور قتل کی واردات رونما ہو چکی ہے۔ اگر مجھ سے ہو سکا تو میں اس معاملے میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

☆☆☆

شرمین ذہنی خلفشار کی کیفیت میں پولیس اسٹیشن پہنچا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سیدھا سارجنٹ ولسن کے دفتر میں داخل ہو گیا۔

اس سے قبل کہ سارجنٹ اسے ہیلو کہتا، شرمین بول پڑا۔ ”میں خود کو الزام دیتا ہوں۔ ہیری میرا ہمسایہ تھا۔ میں اس معاملے کے تانے بانے جوڑ سکتا تھا۔“

”خود کو الزام مت دو۔“ سارجنٹ ولسن نے کہا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہیری کو بلیک میل کیا جا رہا ہے؟“

”مجھے معلوم تھا۔“

”اوہ!“ سارجنٹ ولسن یہ سن کر کنفیوز ہو گیا۔ ”کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اسے کیوں بلیک میل کیا جا رہا تھا؟“

شرمین نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”ہم نے ہیری کی ذاتی ڈائری تلاش کر لی ہے۔ اس سے پتا چلا ہے کہ اس نے گزشتہ سال اپنی کمپنی کی عمارت کو خود آگ لگائی تھی تاکہ بیمے کی رقم بٹور سکے۔ اس حقیقت کا علم کسی کو نہیں تھا ماسوائے اس شخص کے جو اسے بلیک میل کر رہا تھا۔“

”مجھے خود سے آگ لگانے کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔“ شرمین نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ”البتہ بلیک میلر خود کو بل کہتا تھا۔ ہیری کو یہ بات پتا تھی اور وہ اس پر حملہ کرنے نکل کھڑا ہوا۔ میرا اندازہ ہے کہ بل نے ذاتی تحفظ میں یہ قدم اٹھایا ہوگا۔“

”دلچسپ!“ سارجنٹ ولسن نے کہا۔ ”تم بل نامی اس شخص کو کیسے جانتے ہو؟“

”میں اس کے بارے میں کچھ بتا سکتا ہوں۔“ شرمین نے بتایا۔ ”میرا قیاس ہے کہ وہ املاک کو عمداً آگ لگانے والے اسکواڈ میں شامل تھا۔ اسی لیے وہ اس آگ کی نوعیت کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ وہ جوائس نامی ایک عورت کو بھی بلیک میل کر رہا تھا۔ جب بل اپنے پوسٹ آفس بکس کو چیک کرنے کے لیے وہاں پہنچا تو اس نے ہیری اور جوائس کو پہلے سے وہاں موجود پایا لہٰذا اس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ بھی بلیک میلر کا ایک شکار ہے۔“

”اور ہیری کو بل کے بارے میں کیسے پتا چلا کہ وہی بلیک میلر ہے؟“ ولسن نے پوچھا۔

”یہ وہ بات ہے جو مجھے معلوم ہونی چاہیے تھی لیکن معلوم نہ ہو سکی۔ جب ہیری نے ہمارا تعارف کرایا تھا تو ہیری نے بل سے کہا تھا کہ میں میپل اسٹریٹ پر رہتا ہوں۔ بل کو بظاہر ہیری کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ مگر ہیری نے مجھے اپنا ہمسایہ بتایا۔ یوں بل کو علم ہو گیا کہ ہیری بھی میپل اسٹریٹ پر رہتا ہے۔“

# فرار

محمد فاروق انجم

کسی بھی واردات کی کامیابی کا انحصار منصوبہ بندی پر ہوتا ہے... قتل و غارت... ڈکیتی اور جان و مال کے دشمن گروہ کی مجرمانہ کارروائیاں... ان کی دہشت اور وحشت کے سامنے ہر شخص سرنگوں تھا... مگر اس بار قانون کے رکھوالوں نے ٹھان لی تھی کہ ہر صورت اس گروہ کو کیفرِکردار تک پہنچانا ہے... قانون کے محافظوں اور مجرموں کے درمیان کھیلی جانے والی آنکھ مچولی کا سنسنی خیز تیز رفتار احوال...

**ان مجرموں کی کوششیں جو فرار کے راستوں پر گامزن تھے**

اس نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا، اپنے سامنے پڑی فائل کو بند کیا اور جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک طرف ہینگ کیا کوٹ اتار کر پہننے کے بعد میز پر پڑا اپنا موبائل فون اٹھایا پھر انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر اپنے گنجے اور عمر رسیدہ سیکریٹری سے کہا۔

''میں جا رہا ہوں۔ شاید میری شام تک واپسی ہو اور ممکن ہے کہ میں دوبارہ آفس نہ آؤں...... جو کال آئے اسے نوٹ کر لینا اور میری آج کی ملاقاتیں کل پر ڈال دو......''

اس نے اپنے گنجے سیکریٹری کا کوئی جواب سنے بغیر ریسیور رکھا اور اپنے کمرے کے اس دروازے سے باہر نکل گیا جو دوسری طرف کھلتا تھا۔ اس طرف بھی اس کا اسٹاف بیٹھتا تھا لیکن اس کا گنجا سیکریٹری دوسری طرف براجمان ہوتا تھا۔

اس کا نام جمیل تھا اور وہ اپنے نام کی طرح ہی حسین و جمیل تھا۔ اس کی گارمنٹس فیکٹری تھی اور وہ ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ اس کی بیوی نگہت پڑھی لکھی اور خوبصورت تھی لیکن وہ جمیل پر شک کرنا اپنا بنیادی حق سمجھتی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر ہر وقت یہی بات سوار رہتی تھی کہ جمیل کا چکر دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہے۔ آفس سے لیٹ ہوجانے پر اس کا خیال کسی اور طرف جانے کے بجائے اس بات پر مرکوز ہوجاتا تھا کہ جمیل کسی لڑکی کے ساتھ کہیں گھوم رہا ہوگا۔ پھر وہ جمیل کو ہر دس منٹ کے بعد فون کرکے دریافت کرتی رہتی تھی کہ وہ کہاں ہے، کیا کررہا ہے، کب تک آئے گا۔ واقعی تم مصروف ہو، میرے ساتھ جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو......؟؟ وغیرہ وغیرہ۔

جمیل اگر کسی میٹنگ میں مصروف ہوتا تھا تو اس کے لیے نگہت کو جواب دینا مشکل ہوجاتا تھا۔ بار بار فون آنے پر وہ مسکرا کر دھیمے لہجے میں اسے بتانے کی کوشش کرتا کہ وہ کیا کررہا ہے۔ وہ اس کا فون نہیں کاٹ سکتا تھا ورنہ نگہت ہنگامہ کھڑا کردیتی۔ نگہت کے سامنے دب کر رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب جمیل کا کاروبار بحران کا شکار ہوا تھا تو نگہت نے اپنے امیر باپ سے پیسے لاکر اسے دیے تھے جو نگہت کے باپ نے یہ کہہ کر واپس نہیں لیے تھے کہ یہ پیسے نگہت کے ہی تھے۔

ایک دن اچانک نگہت اس کے آفس آگئی تو وہ اس وقت دم بخود رہ گئی جب اس نے جمیل کی سیکریٹری کے طور پر ایک خوبصورت لڑکی کو کرسی پر براجمان دیکھا۔

اس آفس میں نگہت کا آنا کسی اور کے لیے کوئی اہمیت رکھتا تھا یا نہیں لیکن بے چاری سیکریٹری کے روزگار پر نگہت کی آمد ایسی بھاری گزری کہ نگہت کے مجبور کرنے پر جمیل کو اسے اسی وقت نوکری سے فارغ کرنا پڑا اور اس کی جگہ اس گنجے سیکریٹری کو وہ سیٹ دینی پڑی جس پر خوبصورت لڑکی براجمان ہوتی تھی۔

جب سے وہ گنجا سیکریٹری کی کرسی پر آیا تھا جمیل کا تو کئی بار اسے کوئی کام کہنے کو بھی دل نہیں کرتا تھا۔

نگہت نے اپنے شوہر جمیل کو گھڑیوں کی سوئیوں میں قید رکھا ہوا تھا۔ کتنے بجے آفس جانا ہے۔ کب گھر سے تیار ہوکر جائے گا، اور کس وقت اسے واپس آنا ہے، یہ سب طے تھا۔ جمیل اپنا کام اس طے شدہ شیڈول میں کرتا تھا۔ شروع میں ہونے والی دقت اب ختم ہوگئی تھی اور کام روٹین پر آگیا تھا۔

جمیل بہت کم دوستوں کی طرف جاتا تھا۔ جب بھی جاتا تو نگہت کے دیے ہوئے وقت کے مطابق اسے واپس بھی آنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات تو جیسے ہی جمیل اپنے کسی دوست کی طرف جانے کی بات کرتا تو نگہت کو فوراً اپنی کسی بہن، یا بھائی کی طرف جانا یاد آجاتا اور وہ اسے لے کر وہاں چلی جاتی اور کچھ نہیں تو اسے اپنے بھائی کی اکلوتی پانچ سالہ بیٹی کومل سے ملنا یاد آجاتا۔ وہ کومل سے بہت پیار کرتی تھی اور جب اس کا دل چاہتا وہ کومل کو اپنے گھر لے آتی۔ کومل بھی نگہت سے بہت مانوس تھی۔

صبح ناشتے کی میز پر نگہت نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا تھا۔ ''آج دوپہر کا کھانا ہم ایک ساتھ کھائیں گے۔''

''تم میرے آفس میں آؤ گی؟'' اس کی بات سنتے ہی جمیل نے جلدی سے پوچھا۔

''میں کیوں آفس آؤں گی۔'' اس نے منہ بنایا۔

''تو پھر؟'' جمیل نے سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کردیں۔

''تم دوپہر کو گھر آجاؤ گے۔ ہم ایک ساتھ کھانا کھائیں گے۔'' نگہت کہتے ہوئے مسکرائی۔

جمیل نے اٹکتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔ ''اس کی کوئی خاص وجہ...... میرا مطلب ہے کہ آج کچھ خاص پک رہا ہے۔ یا پھر کچھ مہمان آرہے ہیں؟''

''کوئی مہمان نہیں آرہا ہے۔ کھانا پکانے والی کو اپنے کسی عزیز کی شادی پر جانا ہے، وہ ابھی چلی جائے گی۔ اس لیے آج کھانا میں بنارہی ہوں۔'' نگہت نے بتایا۔

''تم کیوں بنارہی ہو...... ہم بازار سے کھانا منگوالیں گے۔'' جمیل جانتا تھا کہ نگہت اتنی اچھی کک نہیں ہے اس لیے اس نے کہا۔

''میں خود کھانا بناؤں گی۔ تم وقت پر آجانا، ہم ایک ساتھ کھانا کھائیں گے۔'' نگہت نے دوٹوک کہہ دیا تھا۔

جمیل نے سوچ لیا تھا کہ اب اسے نگہت کا بنایا ہوا کچا پکا کھانا کھا کر صبر کے ساتھ ساتھ اس کی تعریف بھی کرنی پڑے گی۔

''ایسا نہ کریں کہ ہم لنچ کہیں باہر ہوٹل میں کریں؟''

ایک بار پھر جمیل نے کوشش کی کہ کسی طرح سے وہ اس کا بتایا ہوا کھانا کھانے سے بچ جائے۔

''میں نے کہہ دیا کہ کھانا میں تیار کروں گی اور ہم ایک ساتھ کھانا کھائیں گے۔ ٹھیک تین بجے۔ کتنے بجے؟'' نگہت نے کہہ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''تین بجے۔'' جمیل نے اس کا بتایا ہوا وقت دہرایا۔

''تین کا مطلب تین ہی ہے۔ کوئی اہم میٹنگ آجائے۔ کچھ ہوجائے مگر تم کو تین بجے ڈائننگ ٹیبل پر موجود ہونا ہے۔'' نگہت کے لہجے میں تحکم بھی تھا۔ جمیل نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

تین بجے سے پہلے گھر پہنچنے کے لیے جمیل پونے دو بجے اپنی سیٹ سے اٹھ گیا تھا۔ اس کا تیسرے فلور پر آفس تھا۔ وہ لفٹ کی طرف بڑھا تو لفٹ کے دروازے پر چسپاں نوٹس دیکھ کر اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ لکھا تھا کہ لفٹ خراب ہے۔

وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور تقریباً سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے وہ نیچے اترا تو اس کی سانس پھول چکی تھی۔ اپنی گاڑی کے پاس پہنچ کر اس نے جیسے ہی لاک کھولنے کے لیے چابی گھمائی اس کی نظر اگلے ٹائر پر پڑی، وہ پنکچر تھا۔

''شِٹ......!'' جمیل نے غصے سے اپنے پیر کی ٹھوکر ٹائر پر ماری۔ وہ چاہتا تو ابھی ٹائر بدلوا سکتا تھا لیکن وہ وقت بچانا چاہتا تھا۔ اس نے چابی چوکیدار کو دیتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے آفس سے کسی کو بھیجے گا، اسے چابی دے دینا۔ وہ سڑک کی طرف چلنے لگا۔ سامنے ہی خالی ٹیکسی مل گئی۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی بولا۔

''نئی کالونی وائی بلاک......''

ٹیکسی ڈرائیور کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی اور وہ پتلا سا شخص تھا۔ اس نے فوراً ٹیکسی اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ پیچھے بیٹھے ہوئے جمیل نے اپنی گھڑی پر وقت دیکھا۔ وہ آرام سے گھر پہنچ سکتا تھا۔ اس کے آفس سے گھر تک کا سفر محض بیس منٹ کا تھا۔ اب وہ تین بجے سے پہلے اپنے گھر پہنچ جائے گا۔ اس کی بیوی نگہت خوش ہوجائے گی۔

اچانک ڈرائیور کو ٹیکسی کی رفتار آہستہ کرنی پڑی۔ سامنے گاڑیوں کا ازدحام دکھائی دے رہا تھا۔ دور تک ٹریفک تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اپنے آگے کھڑی کار کے پیچھے ٹیکسی کھڑی کر دی۔ جبکہ اس سے آگے والی کار بیک ہو رہی تھی۔ اچانک اس کی ٹیکسی رکنے پر وہ کار بھی رک گئی۔

''کیا ہوا ہے......؟'' جمیل نے پوچھا۔

''آگے کوئی جلوس ہے اور سڑک بلاک کی ہوئی ہے۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں بلاک کی ہے؟'' جمیل نے سامنے اسکرین سے دور تک جھانکنے کی کوشش کی۔

''یہاں جس کی مرضی ہوتی ہے وہ سڑک بلاک کر کے احتجاج شروع کر دیتا ہے۔'' ٹیکسی ڈرائیور مسکرا رہا تھا۔

ان سے آگے والی قیمتی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کا نام کالی تھا۔ وہ ایک زیرک ڈرائیور تھا۔ اس کار کی پچھلی سیٹ پر براجمان شخص کا نام ضرغام بھائی تھا جو جرائم کی دنیا کا بادشاہ تھا۔

ضرغام نے جرائم کی دنیا میں اس وقت قدم رکھا تھا جب وہ ابھی نوجوان تھا۔ وہ نڈر تھا اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے جرائم کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ پولیس اور ضرغام کے درمیان آنکھ مچولی کا کھیل شروع ہوگیا تھا لیکن ضرغام جرم کرنے سے پیچھے نہیں ہٹا۔ وہ دہشت کی علامت بن گیا تھا اور کوشش کے باوجود وہ پولیس کے ہاتھ نہ آیا تھا۔

ضرغام کو گرفتار کرنے کا اوپر سے بھی بہت دباؤ تھا چنانچہ پولیس نے رفتہ رفتہ اس کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب ضرغام نے ایسی صورتِ حال دیکھی تو وہ زیرِزمین چلا گیا۔ پھر اس کا کسی کو نشان نہیں ملا۔ وہ اپنے آدمیوں کے ذریعے سے جرائم کراتا رہا، لیکن پولیس نے اس کی تلاش جاری رکھی تھی اور اس کے خلاف بہت سے ثبوت بھی جمع کر لیے تھے۔

زیرک پولیس نے ضرغام کو بل سے باہر نکالنے کے لیے ایسا تاثر دینا شروع کر دیا کہ جیسے وہ دوسرے کاموں میں مصروف ہو کر ضرغام کو بھول چکی ہے۔ جب ضرغام نے حالات بہتر دیکھے تو وہ بل سے باہر نکلنے لگا اور پھر اس نے ایک بینک لوٹنے کا پلان بنا لیا۔

اس بینک ڈکیتی میں وہ خود شامل ہوا اور بینک کے عملے کو اس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے یرغمال بنا لیا لیکن اچانک ایک چوکیدار نے اپنی جان پر کھیلتے ہوئے ضرغام کو قابو کرنے کی کوشش کی تو ضرغام کا نقاب اتر گیا۔ کیمرے میں اس کا چہرہ عیاں ہوگیا۔ اس نے چوکیدار کو مارنے کے لیے گولیاں چلا دیں۔ پولیس کی آمد پر ضرغام کو وہ واردات نامکمل چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

ضرغام تو بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس کے دو آدمی پولیس کی گرفت میں آ گئے جن کی مدد سے پولیس نے ضرغام کے ہر خفیہ ٹھکانے پر چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ بینک ڈکیتی کے دوران جو اس کی فلم بنی تھی اس سے اس کا چہرہ واضح ہو گیا تھا۔ جس چہرے کو ضرغام نے چھپالیا تھا اب اس کی تصویریں پولیس اسٹیشن میں موجود تھیں۔ ضرغام کو ایک بار پھر بل میں گھسنا پڑا۔

ضرغام کے لیے چھپ کر رہنا بہت مشکل تھا۔ جیسے ہی حالات کچھ ٹھیک ہوئے اس نے ملک سے فرار کی تیاری شروع کر دی۔ اس کے لیے ملک سے فرار ہونا ناگزیر ہو گیا تھا۔

جس سڑک پر ان کی کار کھڑی تھی، وہ ائرپورٹ کی طرف جاتی تھی اور ضرغام ملک سے فرار ہونے کی تیاری میں تھا۔ اس نے باہر جانے کے لیے پانی کی طرح پیسا بہا دیا تھا اگر اس سڑک پر احتجاج کرنے والے جمع نہ ہوتے تو اس وقت وہ ائرپورٹ پہنچ چکا ہوتا۔

ضرغام بھیس بدل کر ائرپورٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے سر کے بال بڑھے ہوئے تھے جو کندھوں تک لٹک رہے تھے۔ اس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔ بہترین کوٹ اور پینٹ کے ساتھ اس نے آسمانی رنگ کی ٹائی باندھی ہوئی تھی۔ اس کی توند باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس کی مونچھیں ہلکی اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی جس میں سفید بال زیادہ دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے ہونٹ موٹے تھے اور وہ پُروقار انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔

پولیس کا مخبر یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ ضرغام بھیس بدل کر ملک سے فرار ہو رہا ہے۔ اس کی رپورٹ پر اس وقت ائرپورٹ کے راستے پر پولیس سادہ لباس میں موجود تھی۔ لیکن یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ضرغام کسی گاڑی میں ہے بھی کہ نہیں...... مخبر نے معلومات حاصل کی تھی اس کے مطابق اسے اس وقت اس سڑک پر ہونا چاہیے تھا۔

ٹریفک کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس جم غفیر میں پولیس سادہ لباس میں ہوشیار موجود تھی اور وہ مخبر بھی کسی ضرغام کے چہرے کا متلاشی تھا۔ اس کی رپورٹ غلط نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اس نے وہ معلومات بڑی ہوشیاری سے حاصل کی تھی۔

اچانک کار میں بیٹھے ہوئے ضرغام نے کہا۔ ''سکندر پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے ابھی تک واپس نہیں آیا۔ تم ایسا کرو کہ کار یہاں سے نکالو اور دوسری سڑک پر ڈال کر بس اسٹینڈ کی طرف لے چلو۔ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کوئی گڑبڑ ہے۔''

''سکندر کا انتظار کریں کہ نکلیں؟'' کالی نے پوچھا۔

''تمہارے کار موڑتے ہوئے وہ بھی آ جائے گا۔ تم جلدی سے نکلنے کی کرو۔'' ضرغام نے کہہ کر دائیں بائیں دیکھا۔

کالی نے کار بیک کرنی چاہی تو پیچھے وہ ٹیکسی کھڑی تھی جس میں جمیل بیٹھا تھا۔ کالی غصے سے کار سے باہر نکلا اور اس نے ٹیکسی ڈرائیور کی سائڈ کا شیشہ اپنی انگلیوں سے بجایا تو ٹیکسی ڈرائیور نے شیشہ نیچے کر کے اس سے پوچھا۔

''جی جناب، کیا بات ہے؟''

''دیکھ نہیں رہے تھے کہ میں کار بیک کر رہا تھا اور تم نے پیچھے ٹیکسی کھڑی کر دی۔'' کالی اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں نے دیکھا نہیں تھا۔'' ڈرائیور منمنایا۔

''ٹیکسی پیچھے کرو۔'' اس نے رعب سے کہا۔

ڈرائیور نے بیک مرر میں دیکھا اس کے پیچھے بھی ٹریفک رک گئی تھی اور رش کافی بڑھ گیا تھا۔ جمیل بھی بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ڈرائیور نے ناچاری سے اس آدمی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''پیچھے بھی ٹریفک ہے۔''

اچانک کالی نے دروازہ کھولا اور ڈرائیور کو گریبان سے پکڑ کر باہر کھینچتے ہوئے بولا۔ ''تیری وجہ سے اب ہم اپنی کار پیچھے نہیں کر سکتے۔''

بے چارے ڈرائیور کو دیکھ کر جمیل بھی کار سے باہر نکلا اور ڈرائیور کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے بھائی اس غریب ڈرائیور کا کیا قصور ہے۔''

''تم کون ہو......؟'' اس نے جمیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں پسنجر ہوں اور یہ غریب ڈرائیور ہے......''

جمیل نے اس کا لب و لہجہ دیکھا تو آہستہ سے بولا۔

''اسے بولو کہ اپنی ٹیکسی پیچھے کرے ورنہ برا ہو جائے گا۔'' کالی کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئی تھیں۔

جمیل نے ڈرائیور سے کہا۔ ''چلو آؤ اور اپنی ٹیکسی پیچھے کر لو۔''

ڈرائیور نے اپنی ٹیکسی کے پیچھے دیکھا تو دور تک قطار لگی ہوئی تھی۔ اگر وہ تین، چار فٹ اپنی ٹیکسی پیچھے کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ اپنی کار بیک کر کے موڑ سکتا تھا کیونکہ ساری ٹریفک ایک طرف کھڑی تھی اور سڑک کی دوسری

جانب ٹریفک رواں دواں تھی۔

ڈرائیور نے جمیل کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہا ہو کہ وہ اپنی ٹیکسی پیچھے کیسے کرے۔ جمیل نے اسے اشارہ کیا کہ وہ پہلے ٹیکسی میں بیٹھ جائے پھر وہ اسے سمجھائے گا کہ کیا کرنا ہے، ورنہ جو شخص اس کے ساتھ کھڑا ہے وہ یقیناً اس کا منہ توڑ دے گا۔

ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھال لی۔ جمیل بھی پیچھے بیٹھ گیا جبکہ کالی بھی اپنی کار میں بیٹھ چکا تھا۔

”تم ٹیکسی گھماؤ اور اسے دوسری طرف لے جاؤ۔ دوسری سڑک پر ٹریفک رواں دواں ہے۔ ٹریفک کا رخ اس طرف ہو رہا ہے، اس سے پہلے کہ اس طرف سے نکلنا بھی مشکل ہو جائے تم جلدی کرو۔“ جمیل نے کہتے ہوئے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

ڈرائیور کے لیے اپنی ٹیکسی کو ایک فٹ پیچھے کرنا بھی مشکل تھا۔ کیونکہ پیچھے ٹریفک تھی اور اب وہ سب دوسری سڑک کی طرف جانے کے لیے اپنا اسٹیئرنگ گھما رہے تھے۔

ابھی ڈرائیور جائزہ ہی لے رہا تھا کہ آگے والی کار یکدم بیک ہوئی اور وہ ٹیکسی کے ساتھ ایک جھٹکے سے ٹکرائی اور ساتھ ہی کالی نے ایکسیلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا اور کوشش کرنے لگا کہ ٹیکسی کو دھکیل کر پیچھے لے جائے۔ جیسے ہی کالی نے ٹیکسی کو پیچھے کی طرف دھکیلا ٹیکسی پچھلی کار سے ٹکرائی اور کاروں کے درمیان جو خالی جگہ تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ ہر کار دوسری کار سے ٹکرا گئی، ایک ساتھ کاروں کے ہارن بجنے شروع ہو گئے اور فضا میں شور برپا ہو گیا۔

جمیل کے دماغ میں جانے کیا آیا کہ وہ یکدم سے کار سے نکلا اور اپنے آگے کھڑی کار کی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف جھک کر بولا۔

”صبر کرو پیچھے ایک انچ کا فاصلہ نہیں ہے۔“ جمیل نے ابھی اپنی بات مکمل ہی کی تھی کہ اس کی نظر کار کی پچھلی سیٹ پر براجمان ضرغام پر پڑی۔ وہ پُروقار انداز میں بیٹھا تھا۔ جمیل اس کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

”سر آپ انہیں سمجھائیں کہ پیچھے جگہ نہیں ہے اور......“ اس سے پہلے کہ جمیل اپنی بات مکمل کرتا۔ یکدم ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان عجلت میں بیٹھتے ہی بولا۔

”نکلو...... فوراً نکلو...... پولیس کے آدمی چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور انہوں نے ہماری کار ٹریس کر لی ہے، اگر ہم اس جگہ سے نکل نہ سکے تو پولیس ہمیں پکڑ لے گی......“ وہ اپنی بات کہتے کہتے چپ ہو گیا کیونکہ اس کی نظر اچانک جمیل پر پڑ گئی تھی۔ پولیس کا سن کر جمیل کے بھی کان کھڑے ہو گئے تھے۔

”اسے اندر بیٹھا لو۔“ ضرغام نے فوراً جمیل کی طرف اشارہ کیا۔ ایک لمحے میں کالی نے پستول نکالا اور اس کا رخ جمیل کے سینے کی طرف کرتے ہوئے اس کا بازو پکڑ کر درشت لہجے میں حکم دیا۔ ”جلدی بیٹھو......“

اچانک پستول کا رخ اپنی طرف دیکھ کر جمیل گھبرا گیا۔ ضرغام نے دوسرے نوجوان کو اشارہ کیا وہ بجلی سی تیزی سے باہر نکلا اور ضرغام کی طرف کا دروازہ کھول کر جمیل کو کار میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا اور اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کالی نے اپنے ہاتھ میں پکڑا پستول ضرغام کی طرف بڑھا دیا اور ضرغام نے پستول لے کر جمیل کی پسلی کے ساتھ لگا دیا۔

ضرغام بولا۔ ”جیسے بھی ہو یہاں سے نکلو......“

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ کوئی ہمارے درمیان ہے جو پولیس کا مخبر ہے، میرے شک پر کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔“ وہ نوجوان بولا۔ جس نے آکر پولیس کی اطلاع دی تھی، اس کا نام سکندر تھا۔

”یہ بات بعد میں کریں گے فی الحال اس جگہ سے نکلو۔“ ضرغام کی نگاہیں دائیں بائیں گھوم رہی تھیں۔

اس کے ساتھ ہی کالی نے کار کو پیچھے کیا اور ایک زور دار جھٹکا لگا۔ پھر اس نے اسٹیئرنگ گھمایا اور کمال پھرتی سے اس نے کار کا رخ موڑ کر دوسری سڑک کی طرف کر لیا۔ ٹریفک کا رخ کیونکہ اس طرف ہو گیا تھا پھر بھی کالی کمال مہارت سے کار کو اس رش میں داخل کر کے اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اس کی کار کس سے ٹکرا رہی ہے وہ جگہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ جب دوسری کار والوں نے دیکھا کہ اس کار کا ڈرائیور گاڑی کے ٹکرانے کی کوئی پروا نہیں کر رہا ہے تو وہ خود ہی اپنی کار بچانے کے لیے اسے راستہ دینے لگے تھے۔

جمیل سوچ رہا تھا کہ وہ بیٹھے بٹھائے کس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اس کے دماغ میں کیا بات آئی تھی کہ وہ ٹیکسی سے نکل کر اس پاگل ڈرائیور کو سمجھانے چلا گیا تھا۔ پولیس کا سن کر اسے شک ہونے لگا تھا کہ معاملہ ٹھیک نہیں ہے اور یہ تینوں جرائم پیشہ ہیں۔ جمیل کے لیے یہ سمجھنا بھی مشکل تھا کہ اس شخص نے اسے اپنے ساتھ کیوں بٹھا لیا تھا۔

کالی بڑی مہارت سے کار چلاتا اور اپنا راستہ بناتا

ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ضرغام نے پستول جمیل کی پسلی کے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں دائیں بائیں گھوم رہی تھیں لیکن وہ جمیل سے غافل نہیں تھا۔

سکندر نے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پولیس کی گاڑی ہمارے پیچھے ہے اور اس گاڑی میں سادہ لباس میں اہلکار بیٹھے ہیں......''

''بس اس سڑک سے نکل گیا تو پھر پولیس ہمیں چھو بھی نہیں سکے گی۔'' کالی کار چلاتے ہوئے بولا۔

سکندر نے ضرغام سے پوچھا۔ ''آپ نے اسے کیوں اپنے ساتھ بٹھالیا ہے؟''

''اسے بٹھانا ضروری تھا۔ ضرورت پڑنے پر ڈھال کا کام بھی دے گا اور اگر اس کی لاش سڑک پر پھینکیں گے تو پولیس اسے ہمارا ساتھی سمجھ کر اس پر بھی تفتیش شروع کردے گی۔ کہانی میں ٹوئسٹ آجائے گا۔''

جمیل نے ضرغام کی بات سنی تو اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینا آگیا تھا اور دل کی دھڑکن منتشر ہونے لگی تھی۔

اچانک کالی نے پوری قوت سے اپنے پیر کا دباؤ بریک پر بڑھادیا اور اس تیز رفتار کار کے رکتے ہوئے ٹائر چیخنے لگے اور اندر بیٹھے ہوئے ہر فرد کو شدید جھٹکا لگا۔ جمیل کا سر اگلی سیٹ کی پشت سے ٹکرا گیا جبکہ ضرغام اور سکندر نے اپنے آپ کو بڑی ہوشیاری سے سنبھال لیا تھا۔

ان کی کار کے عین سامنے ایک ساتھ دو کاریں سڑک پر اس طرح سیدھی کھڑی تھیں کہ ان کے لیے راستہ بند ہوگیا تھا۔ اگر کالی عین وقت پر بریک نہ لگاتا تو ان کی کار پولیس کی کھڑی ان دونوں کاروں کے ساتھ ایک دھماکے سے ٹکرا جاتی۔

''پولیس نے ہمیں چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے......'' سکندر چلّایا۔ ساتھ ہی ایک ایک پولیس والا تیزی سے بھاگتا ہوا، ضرغام کی کار کی طرف بڑھا۔

کالی نے کار روکتے ہی اسٹیئرنگ گھمایا اور اس کا رخ ایک طرف نکلتی سڑک پر ڈال دیا۔ اس سڑک پر جاتے ہی کالی نے کار کی رفتار تیز کردی۔ پیچھے بھاگ کر آنے والا شخص پیچھے ہی رہ گیا۔

''اب بتائیں کس طرف جانا ہے؟'' کالی نے پوچھا۔

''پولیس جانے کس روپ میں کہاں کہاں موجود ہوگی۔ مخبر نے ہماری پوری خبر دی ہے۔'' سکندر کو شدید غصہ آرہا تھا۔

''اس صورتِ حال میں ہم اپنے کسی ٹھکانے پر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔'' ضرغام سوچنے لگا۔

''تو پھر گاڑی سڑک پر ہی گھماتا رہوں۔'' کالی نے کار بائیں جانب موڑ لی۔

''تمہارا گھر کس طرف ہے؟'' اچانک ضرغام نے جمیل سے پوچھا۔

جمیل اپنی فکر اور سوچوں میں گم تھا۔ ضرغام کے اچانک پوچھنے پر وہ یکدم چونکا۔ اس نے سامنے دیکھا تو کار کا رخ اس کی کالونی کی طرف تھا۔ وہ راستہ اسی طرف جارہا تھا جس طرف اس کا گھر تھا۔ جمیل ابھی سوچ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے، ضرغام نے قہر آلود لہجے میں پھر دہرایا۔

''میں نے پوچھا ہے کہ تمہارا گھر کس طرف ہے؟''

ضرغام کا لہجہ ایسا تھا کہ جمیل ... گھبرا گیا اور خوفزدہ لہجے میں بولا۔ ''میرا گھر اسی طرف ہے۔ یہی سڑک سیدھی میری کالونی کو جاتی ہے۔''

''بتاؤ کس طرف جانا ہے؟'' ضرغام نے پوچھا۔

جمیل نے تھوک نگل کر اپنا خشک حلق تر کیا اور انہیں اپنے گھر کا پتا سمجھانے لگا۔ کالی کار کو بڑی رفتار سے گھمارہا تھا۔ سامنے اس کالونی کا گیٹ دکھائی دیا جس میں جمیل کا گھر تھا۔ کالونی کا گیٹ کھلا ہوا تھا اور پاس کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ اس کالونی میں چوکیدار رات کو آتا تھا۔ جیسے ہی کار گیٹ کے پاس پہنچی ضرغام نے کالی کو کچھ ہدایت کی اور کالی گاڑی کو کالونی کے اندر لے جانے کے بجائے کچھ آگے لے گیا اور بریک لگادیا۔

''اس کار کو کہیں چھوڑ کر سکندر کے موبائل پر رابطہ کرنا۔'' ضرغام نے تیزی سے کہا۔ ایک ساتھ دو دروازے کھلے اور ضرغام کے ساتھ سکندر بھی باہر نکل آیا۔ جمیل نے دیکھا تو وہ بھی باہر نکل آیا۔ کالی کار آگے لے گیا اور محلے کی ایک گلی میں داخل ہوگیا۔ لیکن آگے جاتے ہی ایک گلی سے پولیس کی ایک کار نمودار ہوئی جس میں بیٹھے پولیس والے کالی کی کار کو تلاش کررہے تھے، انہیں دیکھتے ہی کالی نے کار کی رفتار بڑھادی اور پولیس کی کار اس کے تعاقب میں لگ گئی۔

☆☆☆

جمیل کا گھر جس کالونی میں تھا اس کے ساتھ اس جیسی دو اور کالونیاں بھی تھیں۔ تینوں کالونیاں چاردیواری کے

اندر اور الگ الگ تھیں۔ شروع میں اس جگہ صبح و شام چوکیدار ہوتے تھے پھر جیسے ہی تینوں کالونیوں کے پلاٹ بک ہو گئے اور مکانات بننا شروع ہو گئے کالونی بنانے والوں نے چوکیدار ہٹا لیے اور اب کالونیوں میں رہنے والوں نے اپنی مدد آپ کے تحت رات کے لیے چوکیدار رکھے تھے۔

''اسے لے کر آگے آگے چلو......'' ضرغام نے سکندر سے کہا اور سکندر نے اس کا بازو پکڑ کر پھنکارتے ہوئے کہا۔

''کوئی بھی حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔ مجھے اپنے گھر لے چلو...... سمجھے۔''

جمیل پہلے ہی ڈرا ہوا تھا اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جمیل اسے اپنے گھر کی طرف لے کر چل پڑا۔ ان کے پیچھے ضرغام تھا، وہ لنگڑاتے ہوئے ایسے چل رہا تھا جیسے اس کی ایک ٹانگ معذور ہو۔

سکندر اور جمیل آگے تھے جبکہ ضرغام ان سے پندرہ فٹ پیچھے تھا۔ جمیل کا گھر آ گیا تھا۔ گھر کے سامنے پہنچ کر جمیل رک گیا۔

''یہ تمہارا گھر ہے؟'' سکندر نے پوچھا۔

''ہاں۔'' جمیل نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تمہارے گھر میں کون کون ہے؟'' سکندر نے اگلا سوال کیا۔

''میں اور میری بیوی ہے بس۔'' جمیل نے جواب دیا۔ سکندر نے اشارہ کیا کہ وہ دروازہ کھلوائے۔

اس نے پہلے اپنی گھڑی پر وقت دیکھا ساڑھے تین بج چکے تھے۔ پھر اس نے ڈور بیل پر اپنی شہادت کی انگلی رکھی اور اپنی انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ ادھر بیل ہوئی اور ادھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ سامنے جمیل کی بیوی نگہت کھڑی تھی۔

نگہت نے پہلے جمیل اور پھر اس کے ساتھ کھڑے سکندر کی طرف دیکھا۔ نگہت شاید بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن جمیل کے ساتھ کسی اجنبی کو دیکھ کر وہ چپ ہو گئی اور سوالیہ نگاہوں سے جمیل کی طرف دیکھنے لگی۔

''میری کار پنکچر ہو گئی تھی......'' جمیل نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ سکندر جلدی سے بول پڑا۔

''انہوں نے مجھ سے لفٹ لی، مجھے پیاس لگی ہوئی ہے اور میں نے ان سے کہا کہ اگر مجھے ایک گلاس پانی کا پلا دیں تو آپ کی مہربانی ہو گی۔''

نگہت نے اپنے چہرے پر بادلِ ناخواستہ خفیف سی مسکراہٹ عیاں کی اور دروازہ چھوڑ دیا۔ وہ دونوں تیزی سے اندر گئے ان کے پیچھے ضرغام بھی سرعت سے داخل ہو گیا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ نگہت نے ضرغام کو نہیں دیکھا تھا۔ اچانک ایک دوسرے اجنبی کو اپنے گھر میں دیکھ کر اس کی خیرہ نگاہیں اس پر جم گئیں اور پہلا خیال یہی بجلی کی طرح اس کے دماغ میں کوندا کہ شاید وہ دونوں ڈاکو ہیں اور گھر میں داخل ہونے سے قبل انہوں نے جمیل کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔

جب وہ تینوں چلتے ہوئے گھر کے دروازے تک پہنچے...... تو جمیل کے بالکل سامنے والے گھر کے ٹیرس پر ایک طرف کھڑا شمس سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کا کام ہی تاکا جھانکی تھا اور جب وہ کوئی غیر معمولی چیز دیکھ لیتا تھا تو پھر اس کے پیٹ میں اس بات کا ابال اٹھنے لگتا تھا کہ وہ کسی طرح سے یہ جان لے کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اور جب تک وہ جان نہیں لیتا تھا اسے چین نہیں آتا تھا۔ اب جس طرح سے وہ تینوں گھر کے اندر داخل ہوئے تھے شمس جاننے کے لیے بے قرار ہو گیا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ شمس کے لیے دوسری تشویش کی بات یہ تھی کہ جو شخص لنگڑاتا ہوا چلا آ رہا تھا وہ گھر کے اندر داخل ہونے کے لیے بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔

نگہت نے ایک نظر سکندر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''یہ بھی آپ کے ساتھ ہیں......؟''

''جی محترمہ میں بھی ان کے ساتھ ہوں۔'' ضرغام نے کہتے ہوئے اپنی آنکھوں پر جمی ہوئی عینک اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ اس نے اپنا کوٹ دوسری طرف اچھال دیا، پھر اس نے اپنی شرٹ کے بٹن کھولے اور شرٹ اتار کر دوسری طرف پھینک دی۔ اس کے پیٹ پر پلاسٹک کا بنا ہوا مٹکا سا باندھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کمر کی طرف لے جا کر بیلٹ کھولی اور وہ مٹکا سا اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ جمیل دیکھ رہا تھا وہ موٹا دکھائی دینے والا شخص یکدم سے اسمارٹ ہو گیا تھا۔ نگہت بھی حیران تھی کہ وہ دونوں کون ہیں اور وہ کر کیا رہا ہے۔

''تم مجھے اپنی کوئی اچھی سی شرٹ لا دو۔'' ضرغام نے جمیل سے کہا۔

جمیل جو ہکا بکا کھڑا تھا اچانک چونکا اور کسی روبوٹ کی طرح اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو سکندر بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس نے اپنا پستول اپنے کوٹ کی جیب میں رکھا ہوا تھا اور پستول کو گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ جب دونوں کمرے میں چلے گئے تو ضرغام نے نگہت کی طرف

...ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔
ضرغام نے ایک لمبی سانس اندر کھینچی اور پھر سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''مزے دار کھانے کی خوشبو آرہی ہے۔کیا پکایا ہے؟''
''کون لوگ ہو تم......؟'' نگہت نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔
ضرغام نے ایک نظر نگہت کی طرف دیکھا اور اپنی نقلی مونچھیں کھینچ کر ایک طرف پھینک دیں۔ پھر اس نے اپنی داڑھی بھی اتار دی اور ساتھ ہی اس نے منہ میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا تو اس کے موٹے ہونٹ اپنی اصل حالت میں آگئے، اب نگہت کے سامنے ایک اسمارٹ کلین شیو آدمی کھڑا تھا۔ جو اپنی شکل وصورت سے جرائم کی دنیا کا مکروہ انسان لگتا ہی نہیں تھا۔ لیکن اس کے سر پر کئی قتل، ڈکیتیوں اور اغوا کے مقدمات تھے۔
اسی اثنا میں جمیل اور سکندر بھی آگئے۔ جمیل کے ہاتھ میں ہلکے آسمانی رنگ کی شرٹ تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ شرٹ ضرغام کی طرف بڑھاتا وہ ضرغام کو مونچھ داڑھی سے مبرا دیکھ کر اسی جگہ رک گیا۔
ضرغام نے سکندر اور جمیل کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور نگہت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ضرغام...... کا نام سنا ہوگا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی خبر میرے حوالے سے اخبار کی زینت بنی ہوتی ہے۔ مجھ پر کئی مقدمات ہیں۔ قتل، لوٹ مار، اغوا برائے تاوان، اور چند دن پہلے ہونے والی ایک بڑی بینک ڈکیتی کی واردات میں بھی میرا نام شامل ہے۔''
نگہت کو یاد آیا کہ اس نے نیوز چینلز پر کئی بار ضرغام کا نام کسی نہ کسی حوالے سے سنا تھا۔ وہ کسی حد تک اس کے بارے میں جانتی تھی۔
''آج میں ائرپورٹ جا رہا تھا۔ میری پوری تیاری تھی۔ بھیس بھی میں نے خوب بدلا تھا مگر اس احتجاج کی وجہ سے ہم رش میں پھنس گئے اور پہلی بار مجھے یہ پتا نہیں چل سکا کہ ہمارے درمیان کوئی ایسا مخبر تھا جو پولیس کا آدمی تھا اور ملک سے فرار ہونے کی خبر اس نے پولیس کو دے دی تھی۔ خیر مخبر کو تو ہم تلاش کر ہی لیں گے اور اس کا جو حشر ہوگا وہ بھی دیکھ لے گا۔'' ضرغام کے لہجے میں سفاکی آگئی تھی۔
ضرغام نے شرٹ لے کر پہن لی۔ دونوں کا ایک ہی سائز تھا۔ موٹا اور بھدا نظر آنے والا ضرغام بدل کر اسمارٹ دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ پھر بولا۔ ''وہ انسپکٹر بڑا ضدی ہے۔ پریس کانفرنس میں اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ مجھے پکڑ کر دم لے گا۔ میں نے بھی قسم کھائی تھی کہ اس کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ وہ مجھ تک پہنچ ہی گیا...... اگر فرار کا موقع نہ ملتا تو شاید وہ مجھے پکڑ لیتا......''
اس کی بات سن کر جمیل اور نگہت نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ضرغام نے پھر کہا۔
''اب چوہے بلی کا کھیل شروع ہو چکا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ مجھے پکڑنے کے لیے وہ پاگل کتے کی طرح پورے شہر میں گھوم رہا ہوگا اور میں بھی اس کے ہاتھ نہیں آؤں گا، اسے دکھا دوں گا کہ ضرغام ملک سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔'' ضرغام نے کہہ کر چاروں طرف دیکھا اور پھر پوچھا۔ ''اس گھر میں ٹیلی فون ہے۔''
''نہیں......'' جمیل نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔
ضرغام نے سکندر کو اشارہ کیا اور وہ پورے گھر کی تلاشی لینے لگا۔ اس نے ایک ایک کمرا دیکھا اور پھر واپس آکر بولا۔ ''گھر میں ٹیلی فون نہیں ہے۔''
''ان کے موبائل فون لے لو۔'' ضرغام نے حکم دیا اور سکندر فوراً ان کی طرف بڑھا۔ جمیل اور نگہت نے اپنا اپنا موبائل فون سکندر کے حوالے کر دیا۔
ضرغام نے دونوں موبائل فون لے کر نگہت کا موبائل فون آف کر کے اسے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ پھر اس نے دائیں بائیں دیکھا تو اسے گول ڈائننگ ٹیبل دکھائی دی جس کے اردگرد چار کرسیاں تھیں اور ڈائننگ ٹیبل پر کھانا سجا ہوا تھا۔
''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے میں کھانا کھاؤں گا۔'' ضرغام کہتا ہوا ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ جبکہ جمیل اور نگہت ناچاری سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔
☆☆☆
کالی بڑی مہارت سے کار چلاتے ہوئے گلیوں سے ہوتا ہوا سڑک پر نکل آیا تھا۔ اس کے پیچھے پولیس کی گاڑیاں تھیں جو اچانک دائیں بائیں سے نکل آئی تھیں۔ لیکن کالی کی مہارت ایسی تھی کہ وہ ان کو دھوکا دے کر دور کہیں نکل گیا اور اس نے ایک جگہ کار روک دی۔ اس نے ڈگی کا بٹن دبایا اور برق رفتاری سے باہر نکل کر ڈگی کھولی اور اندر سے ایک بریف کیس نکال کر ڈگی بند کرتے ہی ایک طرف دوڑ لگا دی۔ سامنے بازار تھا جہاں لوگوں کا جم غفیر تھا وہ اس ہجوم کا حصہ بن کر چلنے لگا۔

جس سڑک پر پولیس کی دو گاڑیوں میں سے اہلکار باہر نکل کر متلاشی نگاہوں سے کالی کی کار کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے،اس سڑک کے اوپر بل کھاتا ایک طویل پُل تھا۔اس پل کے اوپر جنگلے کے ساتھ لگا انسپکٹر منصور کھڑا دور تک دیکھ رہا تھا۔

وہ اس وقت سیاہ پینٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے آنکھوں پر گرین کلر کے شیشوں کی عینک لگائی ہوئی تھی۔اس کے سلکی بال ہوا سے اڑ رہے تھے۔انسپکٹر منصور اپنے محکمے کا فخر تھا۔وہ جس کام کو کرنے کی ٹھان لیتا تھا تو پھر وہ اس سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔ضرغام کو پکڑنے کے لیے پولیس افسران ناکام ہو چکے تھے۔اب انسپکٹر منصور نے اس کو پکڑنے کا ذمہ خود لیا تھا۔وہ کئی ماہ سے اس کے پیچھے تھا اور اس نے بڑی محنت سے ضرغام کے آدمیوں میں سے ہی ایک مخبر پیدا کیا تھا۔

مخبر کی اطلاع پر انسپکٹر منصور نے پوری منصوبہ بندی کی تھی لیکن بھیس بدلا ہونے کی وجہ سے ضرغام کو شناخت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ایک فون کال نے انسپکٹر منصور کو ضرغام کی گاڑی کا پتا بتا دیا تھا لیکن وہ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

انسپکٹر منصور کے ساتھ دو پولیس اہلکار کھڑے تھے۔ اچانک انسپکٹر منصور کا موبائل بجا اور اس نے جیب سے نکال کر موبائل کان سے لگا لیا۔

''کیا خبر ہے؟''انسپکٹر منصور نے پوچھا۔

''وہ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔'' دوسری طرف سے بتایا گیا۔

''اس کی تلاش جاری رکھو۔اس کے جس جس ٹھکانے کا علم ہے وہاں پولیس بھیجو...... مجھے شک ہے کہ وہ اپنے کسی ٹھکانے پر نہیں گیا ہوگا۔کیونکہ پولیس اس کے ٹھکانوں پر جائے گی تو وہ اپنے کسی ٹھکانے کی طرف جانے کا رخ نہیں کرے گا۔پناہ کی تلاش میں وہ ہمیں کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔''انسپکٹر منصور نے اطمینان سے کہا۔

دوسری طرف سے مؤدب آواز آئی۔ ''اوکے سر......''

''میں بھی اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اسے پکڑ نہیں لیتا۔''انسپکٹر منصور نے مصمم ارادے سے کہا اور فون بند کر دیا۔

ابھی انسپکٹر منصور نے فون اپنی پینٹ کی جیب میں رکھا ہی تھا کہ ایک سفید کار تیزی سے آئی اور اس کا دوست فرخ اس کے پاس آ کر بولا۔''آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''میرے ساتھ آ جاؤ۔''انسپکٹر منصور کہتا ہوا اپنی کار کی طرف بڑھا۔اس نے ڈرائیور سے کہا وہ پچھلی کار میں بیٹھ کر آفس پہنچے۔انسپکٹر منصور نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور اس کے برابر میں فرخ بیٹھ گیا۔کار آگے بڑھ گئی۔

''ہاں بولو کیا بات ہے۔''

''ہم جس کار کا پیچھا کر رہے تھے،وہ کار اس علاقے میں داخل ہوئی تھی جو تین کالونیوں کے نام سے مشہور ہے۔ جب ہم اس کار کی تلاش میں دوبارہ کار تک پہنچے تو کار میں صرف ڈرائیور بیٹھا ہوا تھا۔جبکہ اس کار کے اندر تین افراد تھے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تین افراد اس علاقے میں کہیں اتر گئے تھے۔ہم اس کار کا تعاقب کرنے لگے کہ اگر وہ کار والا ہمارے ہاتھ آ گیا تو ہم ان تین تک بھی پہنچ جائیں گے لیکن وہ بھی بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔'' فرخ کے لہجے میں تاسف تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ اسی کار میں ضرغام تھا۔اور وہ لوگ اس علاقے میں کہیں روپوش ہیں۔''انسپکٹر منصور نے کہتے ہی آگے سے یوٹرن لیا اور کار کا رخ اس علاقے کی طرف کر دیا۔

''تم نے اس کار کو کہاں دیکھا تھا؟''انسپکٹر منصور نے پوچھا۔

''اندر محلے کی گلی میں۔''فرخ نے بتایا۔

انسپکٹر منصور کار اس طرف لے گیا۔وہ گنجان آباد علاقہ تھا۔مکانات کی قطاریں اور گلیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد انسپکٹر منصور نے کہا۔

''اس محلے میں جگہ جگہ اپنے آدمی پھیلا دو۔کوئی وردی میں نہ ہو اور یہ کام ابھی کرو۔وہ سب اسی علاقے میں کہیں ہوں گے۔''انسپکٹر منصور کی ہدایت سنتے ہی فرخ نے اپنا موبائل فون نکال لیا۔

☆☆☆

ضرغام ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔اس کے پاس سکندر کھڑا تھا جبکہ جمیل اور نگہت ایک طرف صوفے پر بیٹھے تھے اور ان کی نگاہیں ضرغام کی طرف مرکوز تھیں۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی ضرغام بولا۔''ہم یہاں زیادہ وقت رک نہیں سکتے اس لیے یہاں سے نکلنے کی سوچو۔''

''کالی نے ابھی رابطہ نہیں کیا ہے۔''سکندر بولا۔

''مجھے اپنے شیر پر یقین ہے کہ وہ ان کے ہاتھ نہیں

آئے گا۔'' ضرغام نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

اچانک سکندر کے فون پر بیل ہوئی' اس نے فون کان سے لگایا۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد وہ ضرغام سے سرگوشی میں بولا۔

''پولیس میں موجود ہمارے نمک حلال کا فون تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ پولیس کو شک ہے ہم اس علاقے میں کہیں روپوش ہیں۔ انہوں نے اس علاقے میں اپنے آدمی پھیلا دیے ہیں۔''

''کالی کو فون کرو کہ وہ کہاں ہے۔ اور اسے بھی یہاں بلا لو۔'' ضرغام نے کہا اور سکندر موبائل فون لے کر ایک طرف چلا گیا۔

ضرغام دائیں بائیں ٹہلنے لگا۔ وہ کچھ سوچ بھی رہا تھا۔ جبکہ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے جمیل اور نگہت کی آنکھیں ضرغام کے ساتھ دائیں بائیں گھوم رہی تھیں۔

اچانک جمیل نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ خطرہ ٹل چکا ہوگا۔ آپ لوگ چلے جائیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔ ہم پولیس کو بالکل بھی اطلاع نہیں کریں گے۔''

ضرغام نے رک کر گھور کر اس کی طرف دیکھا کہ جمیل کے ساتھ ساتھ نگہت بھی خوفزدہ ہوگئی تھی۔

اسی وقت سکندر پاس آگیا۔ ''کالی سے بات ہوئی ہے۔ وہ بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ وہ کار کسی جگہ چھوڑ کر ادھر آرہا ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔''

''وہ میرا شیر ہے۔ مجھے اطمینان تھا کہ وہ ان کے ہاتھ نہیں آئے گا۔'' ضرغام خوش ہوگیا۔ پھر وہ جمیل کی طرف گھوما۔ ''تمہارے پاس کار ہے۔''

''ہاں ہے۔'' جمیل نے بلا تامل جواب دیا۔

''کہاں کھڑی ہے؟'' ضرغام نے پوچھا۔

''وہ میرے آفس میں کھڑی ہے، پنکچر ہوگئی تھی۔'' جمیل بولا۔

''ابھی آفس فون کرو کہ تمہاری کار پنکچر لگوا کر کوئی یہاں چھوڑ دے۔ ابھی کال کرو۔'' ضرغام نے کہا اور فون جمیل کی طرف بڑھا دیا۔ جمیل نے کانپتے ہاتھ سے فون پکڑا اور نمبر ملا کر کان سے لگا لیا۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔

''دیکھو ظفر میری کار نیچے کھڑی ہے۔ اس کا پنکچر لگوا کر ابھی میرے گھر لے کر آجاؤ۔ کار کی چابی میں چوکیدار کے پاس چھوڑ آیا تھا۔'' جمیل نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ ضرغام نے اس کے ہاتھ سے فون لے لیا۔

''اب مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔ میری ٹکٹ رات دس بجے کی بُک ہے۔ کیسے بھی مجھے رات دس بجے سے پہلے ائرپورٹ پہنچنا ہے۔'' ضرغام ٹہلتے ہوئے بولا۔ اچانک اس کے قدم رک گئے۔ اس کی نگاہیں ایک طرف منجمد ہوگئیں۔ اس کے چہرے پر حیرت عیاں ہوئی اور وہ شیلف کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک فوٹو فریم تھا۔ اس نے وہ فریم اٹھایا اور غور سے دیکھنے لگا۔ پھر وہ جمیل اور نگہت کی طرف بڑھا۔

''اس سے تم دونوں کا کیا تعلق ہے......؟'' ضرغام کی آواز میں حیرت تھی اور اس کی آنکھوں کی چمک دوچند ہوگئی تھی۔

جمیل اور نگہت نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جمیل کے ساتھ نگہت اور اس کے ساتھ انسپکٹر منصور کھڑا تھا۔ وہ تینوں تصویر میں مسکرا رہے تھے۔

''یہ میرا بھائی ہے۔'' نگہت نے جواب دیا تو ضرغام کے چہرے پر خوشگوار حیرت کے ساتھ مسکراہٹ آگئی۔

''انسپکٹر منصور تمہارا بھائی ہے؟ سگا بھائی؟'' ضرغام نے پُرجوش انداز میں پوچھا۔

''جی ہاں...... سگا بھائی ہے۔'' نگہت نے پھر جواب دیا۔

''سنا تم نے سکندر...... انسپکٹر منصور اس کا سگا بھائی ہے۔ کیا حسین اتفاق ہے۔'' ضرغام ہنسا اس کا ساتھ سکندر نے بھی دیا۔ جبکہ جمیل اور نگہت متحیر ان دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

پھر اچانک ضرغام نے پوچھا۔ ''کیا تم دونوں اپنا اپنا نام بتانا پسند کرو گے؟''

دونوں نے اپنا اپنا نام بتا دیا اور ضرغام کی طرف دیکھنے لگے، جبکہ ضرغام کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

کالی بھی جمیل کے گھر پہنچ گیا تھا۔ جس ڈائننگ ٹیبل پر نگہت نے کھانا لگایا تھا اب اس پر مختلف قسم کا اسلحہ سجا ہوا تھا۔ کالی کے ہاتھ میں جو بریف کیس تھا ضرغام کے کہنے پر اس نے وہ اسلحہ نکال کر میز پر رکھا تھا۔ یہ محض انہوں نے جمیل اور نگہت پر وحشت طاری کرنے کے لیے کیا تھا تا کہ وہ دونوں غلطی سے بھی کوئی ایسی حرکت نہ کر دیں جس سے وہ کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔

''گاڑی کہاں چھوڑ کر آئے ہو؟'' ضرغام نے پوچھا۔

''گاڑی اس جگہ سے بہت دور ہے۔'' کالی نے

جواب دیا۔

''اچھا کیا تم نے۔'' ضرغام نے کہا، پھر جمیل اور نگہت کی طرف نگاہ ڈال کر بتایا۔ ''انسپکٹر منصور مسز جمیل کا بھائی ہے۔''

''اچھا......'' کالی کے منہ سے بھی حیرت سے نکلا۔

''دیکھو کیسا اتفاق ہوا ہے کہ جمیل ہمیں ایسے ہی رش میں مل گیا اور میں نے اسے یہ سوچ کر اپنی کار میں بٹھا لیا کہ شاید فرار کی صورت میں اس شخص کو ڈھال بنانا پڑے اور ہم اس کے گھر پہنچ گئے۔ اس انکشاف نے تو مجھے خوش کر دیا کہ وہ انسپکٹر مسز جمیل کا بھائی ہے۔'' ضرغام بولا۔

''اس میں بھلا خوش ہونے والی کیا بات ہے۔'' نگہت نے تیز لہجے میں کہا۔

ضرغام چلتا ہوا اس کے پاس گیا اور نگہت کی طرف جھک کر بولا۔ ''اب اس ملک سے مجھے تم فرار کراؤ گی۔''

''میں کیسے فرار کرا سکتی ہوں۔'' نگہت کا لہجہ وہی تھا۔

''وہ میں بتاؤں گا کہ تم مجھے کیسے فرار کرا سکتی ہو۔ میرے کہنے پر تم عمل کرو گی تو انسپکٹر منصور میری مٹھی میں آ کر ایسا الجھ جائے گا کہ مجھے اس ملک سے فرار ہونے میں آسانی ہو جائے گی۔'' ضرغام کا لہجہ دھیما اور معنی خیز تھا۔ جمیل بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''آپ کرنا کیا چاہتے ہو؟'' جمیل اپنی حیرت کو زیادہ دیر دبا نہیں سکا۔

ضرغام نے پہلے تو متانت سے جمیل کی طرف ایسے دیکھا جیسے اس کا بیچ میں بولنا اسے ناگوار لگا ہو اور پھر اس کے ہونٹوں پر زہر آلود مسکراہٹ آ گئی۔ وہ بولا۔ ''میری ایک ٹکٹ رات دس بجے کی فلائٹ میں بھی بک ہے۔ جو ہم نے اسی لیے کرائی تھی تا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہو جائے تو میں دوسری فلائٹ کے لیے کوشش کر سکوں۔ مجھے انسپکٹر منصور کے ہاتھ نہیں آنا ہے۔ اس ملک سے فرار ہونا ہے۔ اور فرار میں تم دونوں میری مدد کرو گے۔ اگر میرے کہنے پر چلتے رہے تو ٹھیک ہے ورنہ مجھ سے سفاک شخص شاید ہی تم دونوں کو کبھی زندگی میں ملا ہو۔'' یکدم سے ضرغام کے لہجے میں تغیر آ گیا تھا اور وہ اس انداز میں بولا تھا کہ جمیل اور نگہت کانپ گئے تھے۔ اپنی بات کہنے کے بعد اس کی سرخ اور خوفناک آنکھیں دونوں کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔ جمیل اور نگہت نے اپنی نگاہیں دائیں بائیں پھیر لی تھیں۔

ضرغام، سکندر اور کالی ایک طرف بیٹھے آہستہ آواز میں یہ منصوبہ بندی کر رہے تھے کہ وہ منصور کی عقابی نگاہوں اور اس کے بچھائے ہوئے جال سے بچ کر کیسے فرار ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

ساری منصوبہ بندی ہو چکی تھی۔ انہیں کیا کرنا تھا انہوں نے سوچ لیا تھا۔ ضرغام کے کہنے پر سکندر نے اپنے خاص آدمی سے رابطہ کیا تو اس سے پتا چلا کہ ان کے تقریباً تمام ٹھکانوں پر پولیس نے چھاپے مارے ہیں۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ انسپکٹر منصور نے ضرغام کے لیے زمین تنگ کرنے کی پوری تیاری کی ہوئی تھی۔

ان کے پاس وقت کم تھا۔ اس لیے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضرغام چلتا ہوا جمیل اور نگہت کے پاس گیا اور ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ابھی کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ اچانک بیل ہوئی اور وہ سب چونک گئے۔

سب کی نظریں دروازے کی جانب مرکوز ہو گئی تھیں۔ ضرغام نے اشارہ کیا، سکندر نے بازو پکڑ کر جمیل کو کھڑا کیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''جا کر دیکھو کون ہے۔ کوئی حرکت کی تو تمہاری بیوی کے سر پر گولی مار دوں گا۔''

جمیل نے نگہت کی طرف دیکھا اور دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''سر میں آپ کی گاڑی لے کر آیا ہوں۔'' باہر سے آواز آئی۔

جمیل نے ضرغام کی طرف دیکھا اور ضرغام نے اثبات میں سر ہلایا تو جمیل نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اس سے چابی لی اور گاڑی کے بارے میں پوچھ کر اسے رخصت کر دیا۔ پھر دروازہ مقفل کر کے کار کی چابی ایک طرف رکھ کر نگہت کے پاس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر تک خاموشی رہی اور پھر ضرغام کی نگاہیں نگہت کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''انسپکٹر منصور تمہارا سگا بھائی ہے۔ یہ اتفاق مجھے بہت پسند آیا ہے کہ میں انسپکٹر منصور کی بہن کے گھر میں پناہ لے کر بیٹھا ہوں۔ دیکھو ہمارے پاس وقت کم ہے اور مجھے فرار ہونا ہے۔ مسز جمیل اب تم کو وہی کرنا پڑے گا جیسا میں کہوں گا۔''

''اسے کیا کرنا ہوگا؟'' نگہت سے پہلے جمیل نے مضطربانہ انداز میں سوال کر دیا۔ ضرغام نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور جمیل سہم کر رہ گیا۔ ضرغام نے ایک بار پھر اپنی توجہ نگہت کی طرف کی۔

''آپ نے سنا مسز جمیل کہ میں نے کیا کہا ہے۔''
''مجھے کیا کرنا ہوگا۔'' نگہت نے پوچھا۔
''بس ایک کام کرنا ہے۔ تم اپنے بھائی انسپکٹر منصور کے گھر جاؤ گی اور اس کی اکلوتی پانچ سالہ بیٹی کو یہاں لے آؤ گی۔ ظاہر ہے تم اس کی پھوپو ہو اس لیے وہ تمہارے ساتھ بچی کو جانے سے بالکل بھی نہیں روکیں گے۔ بچی یہاں آجائے گی اور پھر سکندر تمہارے بھائی کو فون کر کے بتائے گا کہ بچی اس کے قبضے میں ہے اور وہ اس سے تاوان مانگے گا۔ تمہارا بھائی اس معاملے میں الجھ جائے گا۔ کیونکہ وہ اپنی بیٹی سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ اس کی توجہ بٹ جائے گی۔ اور اس علاقے میں مجھے ڈھونڈتے ہوئے اس کے آدمیوں کو میں پیچھے ہٹانے کا ایسا انتظام کروں گا کہ میرا راستہ صاف ہوجائے گا۔'' ضرغام نے تفصیل سے بتایا۔
''میں یہ نہیں کرسکتی۔'' نگہت نے گھبرائی ہوئی آواز میں انکار کردیا۔
''تم کیا نہیں کرسکتیں؟'' ضرغام نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جمادیں۔
''میں اپنے بھائی کی بیٹی کو یہاں نہیں لاسکتی۔ میں اپنی بھتیجی کو تم لوگوں کے حوالے نہیں کرسکتی۔'' نگہت نے کہا۔
''تمہیں ایسا کرنا پڑے گا۔'' ضرغام نے پراطمینان انداز میں کہا۔
''مجھ سے یہ بالکل بھی نہیں ہوگا۔'' نگہت کی سانس تیز ہوگئی تھی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا تھا جبکہ جمیل بھی مضطرب ہوگیا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ضرغام کے خوف سے وہ چپ تھا۔
ضرغام نے ایک بار پھر نگہت کا انکار سن کر سکندر کو اشارہ کیا اور سکندر بجلی سی تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے جانے کہاں سے ایک لمبے پھل والا خنجر نکال لیا تھا اور جمیل کے پیچھے جاتے ہی اس نے تیز دھار خنجر جمیل کی شہ رگ پر رکھ دیا کہ جمیل تو گھبرایا ہی لیکن نگہت کی بھی خوف سے چیخ نکل گئی۔
''گھبراؤ نہیں...... یہ صرف پرومو ہے۔ اگر اب تم نے انکار کیا اور میرا کام کرتے ہوئے کسی کو بتایا کہ ہم تمہارے گھر میں ہیں جمیل ہمارے قبضے میں ہے تو یہ تیز دھار خنجر جمیل کی گردن پر ایسے چلے گا جیسے ایک ماہر استاد بلیک بورڈ پر چاک سے لکیر کھینچتا ہے۔ فرق یہ ہوگا کہ بلیک بورڈ پر لکیر کھینچنے سے چاک اپنا سفید نشان چھوڑتا چلا جاتا ہے جبکہ جمیل کی گردن پر یہ خنجر ایسا سرخ نشان چھوڑے گا کہ پھر تمہارے پاس اس کی خوبصورت یادیں رہ جائیں گی۔''
ضرغام کا لہجہ دھیما لیکن انتہائی خطرناک تھا۔ نگہت کی آنکھوں میں خوف مترشح تھا۔
''چھوڑ دو اسے...... آپ جمیل کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔'' نگہت جلدی سے بولی۔
''یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ تم جمیل کو بچاتی ہو، یا اسے مرنے کے لیے ہمارے رحم وکرم پر چھوڑ دیتی ہو۔'' ضرغام نے کہا۔
نگہت نے ضرغام کی وحشت ناک آنکھوں میں دیکھا اور اس کے سفاک لہجے پر غور کرنے کے بعد کہا۔''جب میں بھائی کی بیٹی کو لاکر تمہارے حوالے کروں گی تو بھائی یہ نہیں سمجھے گا کہ میں تم لوگوں کے ساتھ ملی ہوئی ہوں، یا تم لوگوں نے یہ کام مجھ سے کسی نہ کسی مجبوری میں کرایا ہے۔ کیونکہ ان کا دماغ بہت سوچتا ہے اور وہ فوراً بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔''
''انسپکٹر منصور کی کھوپڑی کے اندر اگر دماغ ہے تو ہم نے بھی اپنی کھوپڑیوں میں بھوسا نہیں بھرا ہوا۔ ہم اس سے کہیں گے تمہاری بیٹی اور تمہاری بہن ہمارے قبضے میں ہے۔ ہم اس سے تم دونوں کا تاوان مانگیں گے۔ اسے الجھائیں گے اور اس الجھن میں مجھے شہر سے نکلنا ہے۔ اور یہ تھوڑی ظاہر کرنا ہے کہ یہ کام ہم نے کیا ہے۔''
دونوں چپ تھے۔ ضرغام پھر بولا۔''اب تم منصور کے گھر جانے کی تیاری کرو۔ میرے یہ دونوں آدمی تمہارے ساتھ ہوں گے تم منصور کی بیٹی کو لے کر ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جانا اور یہ تم دونوں کو یہاں لے آئیں گے۔ پھر تمہارے فون پر ہی انسپکٹر منصور سے باتیں ہوں گی۔'' ضرغام سفاک لہجے میں بولا۔''یاد رکھنا اگر تم نے کوئی ایسا اشارہ دیا جس سے مجھے شک ہوا کہ تم نے منصور کو بتادیا ہے تو میں جمیل کی شہ رگ کاٹ دوں گا۔ مجھ سے کسی رحم کی امید مت رکھنا۔''
اس کی بات سن کر نگہت کانپ گئی۔''لیکن آپ لوگ میری بھتیجی کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔'' نگہت نے ڈرتے ہوئے کہا۔
''میرا مقصد اسے نقصان پہنچانا نہیں ہے بلکہ منصور کو الجھا کر پریشان کرکے فرار ہونا ہے۔ اب تم جانے کی تیاری کرو۔'' ضرغام نے تحکمانہ لہجہ اختیار کرلیا۔
''لیکن ہم اس کے ساتھ کیسے جائیں گے۔ باہر پولیس کے آدمی بکھرے ہوئے ہیں اور تعاقب کے دوران

دلچسپ و دلگداز تحریروں سے سجا اکتوبر 2017ء کا دل فریب شمارہ

ماہنامہ

# پاکیزہ

کراچی

**شیریں حیدر** اور **رفعت سراج** کے قسط وار ناول

---

**سیما رضا ردا** کا منی ناول **ہم کو عبث بدنام کیا** اختتامی مراحل میں

---

**اسما قادری** کی ایک نہایت شاندار تحریر...... **بد صورت**

---

**هما بیگ، نیلم احمد بشیر** اور **صبیحہ شاہ** کی خصوصی تحریریں

---

**نگہت سیما** کا خوب صورت اندازِ بیاں...... پُرلطف ناولٹ **صیدِ ضیافت** کی صورت

---

دینی معلومات پر مبنی پُر عقیدت مضامین

ماضی کی اداکارہ **دیبا** کی

ہونہار فنکارہ صاحبزادی **مدیحہ رضوی**

سے دل پذیر ملاقات

**سحر ساجد** کی اچھوتی تحریر...... **عنان گیر** مکمل ناول کی صورت

اس کے علاوہ

**عقیلہ حق، ثمر کاظمی، سحرش فاطمہ، طیبہ عنصر مغل،**

**ہاجرہ ریحان** و دیگر ماہر افسانہ نگاروں کی خوب صورت کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ مسحور کُن شاعری، خوش ذائقہ تراکیب، متاثر کن تراشے اور بہت کچھ صرف آپ جیسے پُرذوق پڑھنے والوں کے لیے

وہ ہماری شکلوں کو دیکھ چکے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے ہمارے تصویری خاکے بھی بن چکے ہوں۔'' سکندر نے آہستہ سے کہا تو ضرغام سوچ میں پڑ گیا۔

''تم اکیلی ہی چلی جاؤ۔'' ضرغام نے سوچنے کے بعد کہا

''مجھے کار چلانی نہیں آتی۔'' نگہت بولی۔

ضرغام الجھن میں پڑ گیا اور پھر کالی سے بولا۔ ''کالی تم اس کے ساتھ جاؤ۔ اس علاقے سے تم کسی نہ کسی طرح نکل ہی جانا۔ واپسی پر اسے اس علاقے سے پیچھے چھوڑ دینا اور اس کے ہاتھ سے موبائل فون لے لینا۔ یہ ٹیکسی میں اس جگہ پہنچ جائے گی۔ تم سڑکوں پر گھومتے ہوئے میری ہدایت پر انسپکٹر منصور کو فون کر کے بہن اور بیٹی کا تاوان مانگنا۔ ہمارا کھیل شروع ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' کالی نے اثبات میں سر ہلایا۔

ضرغام نے نگہت کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''یاد رکھنا یہ تمہیں اس علاقے کے باہر سے ٹیکسی میں بٹھائے گا۔ تم زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں یہاں پہنچ جاؤ گی۔ کالی تم کو ٹیکسی میں بٹھا کر مجھے کال کردے گا۔ اگر تم بیس منٹ میں یہاں نہ پہنچیں تو میں جمیل کو ماردوں گا۔'' ضرغام کی بات نے ان دونوں کے اندر سراسیمگی بھر دی۔

ضرغام، سکندر اور کالی کو ایک طرف لے جا کر بولا۔ ''یہ اس کی بیٹی کو ہمارے پاس لائے گی تو پہلے ہم انسپکٹر منصور سے تاوان مانگیں گے اور پھر اسے مجبور کریں گے کہ وہ تاوان لے کر خود آئے جب وہ خود آئے گا تو ہم اسے اغوا کر کے اس کے پھیلے ہوئے آدمیوں کو واپس بلا کر اس شہر سے نکل جائیں گے۔''

ضرغام کی بات سن کر دونوں ہولے سے مسکرا دیے۔

☆☆☆

ضرغام کے کہنے پر سکندر نے جمیل کو کرسی کے ساتھ اچھی طرح سے باندھ دیا تھا۔ ضرغام نے نگہت کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کیسے اور کیا کرے گی۔

نگہت کا دل کانپ رہا تھا اس کے لیے یہ کام بہت مشکل تھا لیکن جمیل کی زندگی کا سوال تھا۔ اور پھر اس نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ اس کی بھتیجی کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔

نگہت نے جاتے ہوئے جمیل کی طرف دیکھا اور پھر اس کے پاس جا کر پیار بھرے لہجے میں بولی۔ ''تم فکر مت کرنا۔ تمہاری زندگی کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔''

''تم اپنا خیال رکھنا۔''

''سوری جمیل......''

''سوری کس بات کی؟''

''میں تم پر ایسے ہی شک کرتی رہی اور تم پر خواہ مخواہ اپنا رعب جمانے کی کوشش میں بھی رہی اور تمہارے معاملات میں دخل اندازی بھی کرتی رہی۔'' نگہت کو اچانک احساس ہو گیا تھا۔

''تم ایسا مت سوچو۔'' جمیل نے ایک نظر نگہت کے عقب میں کھڑے ضرغام کی طرف دیکھ کر کہا جو ان کی باتوں کو غور سے سُن کر مسکرا رہا تھا۔

''اب کچھ اور اعتراف کرنے نہ بیٹھ جانا۔ جلدی نکلو۔'' ضرغام نے مداخلت کی اور نگہت جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی۔

کالی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ نگہت نے پچھلی سیٹ پر بیٹھنا چاہا تو کالی نے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔ نگہت ناگوار سا منہ بنا کر کالی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کالی نے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

انسپکٹر منصور کے آدمی اس محلے کے اردگرد پھیل کر کسی نہ کسی طرح معلومات لے رہے تھے اور اس سڑک پر جو لوگ مامور تھے وہ ایک جگہ بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان میں سکندر کا مخبر بھی بیٹھا تھا۔ اس کا چائے کے کھوکھے پر بیٹھنا کالی کے حق میں بہتر ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

جمیل کرسی کے ساتھ بندھا اپنے سامنے کھڑے ضرغام کی طرف دیکھ رہا تھا جو اپنے ریوالور کی گولیاں چیک کر رہا تھا۔ سکندر دوسری طرف کھڑا کھڑکی کا تھوڑا سا پردہ ہٹا کر باہر دیکھ رہا تھا۔ سکندر کی نظر میں اس گھر کا عقب تھا۔

اچانک تیز بیل نے تینوں کو چونکا دیا۔ تینوں نے ایک ساتھ دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد پھر اسی انداز میں بیل ہوئی۔ ضرغام نے سوالیہ نگاہوں سے جمیل کی طرف دیکھا اور پھر اس کی گردن دروازے کی طرف گھوم گئی۔

ضرغام نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔ ''کون ہوسکتا ہے؟''

''مجھے کیا معلوم۔'' جمیل نے جواب دیا۔

ضرغام نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر ہل ہوئی۔ ضرغام نے ریوالور اپنی پینٹ کی جیب میں ٹھونسا اور

دبے قدموں دروازے کے پاس چلا گیا۔ سکندر اپنے دونوں ہاتھوں میں ریوالور لیے ہوشیار کھڑا تھا۔ ضرغام نے جمیل کو اشارہ کیا کہ وہ پوچھے کون ہے۔

''کون ہے؟'' جمیل نے بلند آواز میں پوچھا۔

''میں شمس الدین...... دروازہ کھولو جمیل۔'' باہر سے آواز آئی۔ ضرغام نے سوالیہ نگاہوں سے جمیل کی طرف دیکھا جیسے وہ اس سے پوچھ رہا ہو یہ کون ہے۔

جمیل نے اپنے ہونٹوں کو ہلاتے ہوئے خاموشی سے بتایا۔ ''میرا ہمسایہ......'' باہر سے پھر شمس کی آواز آئی۔ ''جمیل کیا بات ہے تم دروازہ کیوں نہیں کھول رہے ہو۔ مجھے تم سے ضروری بات پوچھنی ہے۔ تمہارے گھر کون لوگ آئے ہوئے ہیں اور نگہت بھابی ابھی کس کے ساتھ گئی ہیں۔ اور وہ لنگڑا آدمی کون تھا جو تمہارے گھر میں آیا تھا......''

ضرغام نے یہ سنا تو اس کے قدم اسی جگہ رک گئے۔ اس نے متانت سے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی گہری ہوگئی۔

شمس الدین کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی لیکن وہ اتنی عمر کا لگتا نہیں تھا۔ اس نے تین شادیاں کی تھیں اور وہ اس قدر اذیت پسند تھا کہ اس کی تینوں بیویاں اس سے طلاق لے کر جا چکی تھیں اور اب وہ چوتھی شادی کے لیے پر تول رہا تھا۔ گھر میں اکیلا تھا۔ کچھ پراپرٹی تھی جو اس نے کرائے پر دے رکھی تھی۔ کوئی دوسرا کام کاج نہیں تھا اس لیے اس کا زیادہ وقت بالکونی میں گزرتا تھا جہاں وہ اس طرح سے بیٹھتا تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے اور اس کی نظر سے کوئی بچ کر جا نہ سکے۔

شمس میں ایک خامی یہ بھی تھی کہ وہ جب کسی بات کو جان لیتا تھا تو اس کی حقیقت جاننے کے لیے مضطرب ہوجاتا تھا۔ یہی بے چینی اسے جمیل کے گھر تک لے آئی تھی اور ضرغام کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی کہ کوئی ان کے بارے میں اتنی معلومات رکھے کہ جمیل کے گھر میں کون آیا ہے اور کون گیا ہے۔

ضرغام نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے شمس کھڑا تھا۔ اچانک جمیل کے بجائے اپنے سامنے کسی اجنبی کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔

''اندر آجایئے......'' ضرغام نے تمیز دار لہجے میں بات کی۔ شمس اندر چلا گیا۔ پیچھے سے ضرغام نے دروازہ بند کردیا۔ شمس کی نظر جونہی سامنے کرسی پر بندھے جمیل پر پڑی تو اس کے لیے ایک اور حیران کن بات تھی پھر جونہی اس نے دریافت کرنے کے لیے عقب میں گھوم کر دیکھا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، کیونکہ ضرغام کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اس کی نال بالکل سیدھی شمس کے ماتھے کی طرف تھی۔

''چپ چاپ پیچھے ہوجاؤ اور اپنے منہ سے کوئی آواز نہ نکالنا۔'' ضرغام نے زہر آلود لہجے میں کہا۔ شمس ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا حلق خشک ہوگیا تھا۔

''مسٹر جمیل مجھے اس کے بارے میں بتاؤ کہ یہ کون ہے، کہاں رہتا ہے اور اس کے گھر میں اور کون کون ہے۔'' ضرغام نے پوچھا تو جمیل نے جلدی سے اس کے بارے میں وہ حقیقت بتادی جو بھی جانتے تھے۔ اس کے بارے میں جان کر ضرغام نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ یہ اکیلا رہتا ہے۔ اور تاک جھانک کی عادت ہے۔ بہت بُری بات ہے۔ سب سے بری بات تو یہ ہے کہ تم نے ہم کو اس گھر میں آتے اور جاتے ہوئے دیکھا۔ یہ بات تم نے اور کس کو بتائی ہے؟''

''م...... میں نے کسی کو نہیں بتائی۔'' شمس کی سانس پھول چکی تھی اور دل کی دھڑکن منتشر ہو رہی تھی۔

''ہمارے بارے میں تمہارا جان لینا اچھا نہیں ہے۔ تم ہمارے لیے مشکل کھڑی کرسکتے ہو۔''

''میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ آپ مجھے جانے دیں۔'' شمس نے جلدی سے کہا۔

''اب یہ ممکن نہیں ہے۔ میری کمزوری یہ ہے کہ میں کوئی ثبوت چھوڑا نہیں کرتا۔'' ضرغام نے کہا اور جانے کب اس نے ایک تیز دھار چھوٹی سی چھری نکالی اور سرعت سے اس کا ہاتھ گھوما اور ایک لمحے میں شمس کی گردن پر کٹ کا نشان دکھائی دینے لگا اور وہ کٹ یکدم سے سرخ ہونے لگا۔ شمس تڑپنے لگا۔ اس کی گردن سے خون تیزی سے بہنے لگا۔ ایک دم سے وہ نیچے فرش پر گرا اور تڑپنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد شمس کا جسم بے جان ہوگیا۔ جمیل کے لیے کسی انسان کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتا دیکھنا پہلا واقعہ تھا۔ اس کی خوفزدہ آنکھیں پھیل چکی تھیں۔ دل کی دھڑکن ایسے تیز ہوگئی جیسے وہ ابھی پھٹ جائے گا۔

شمس کو موت کی وادی میں پہنچا کر ضرغام نے اپنی چھری کو شمس کے کپڑوں سے صاف کیا اور اطمینان سے چلتا ہوا فریج کے پاس پہنچا، بوتل نکال کر اس نے غٹاغٹ پانی پیا اور جمیل کے پاس آتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مرنا ضروری تھا۔ ورنہ یہ ہم کو مروا دیتا۔ میں اپنے جرم کا ثبوت نہیں

چھوڑتا۔

ضرغام نے اطمینان سے ایک طرف بیٹھے ہوئے سامدرا کی طرف دیکھا اور سکندر اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کمبل تھا۔ اس نے شمس کی لاش کو اس کمبل میں لپیٹا اور جمیل سے پوچھا۔ ''اس گھر میں اسٹور روم ہے۔''

جمیل نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔ ''وہ سامنے......''

سکندر لاش کو کھینچ کر اس اسٹور روم میں لے گیا۔ پھر اس نے کپڑے سے فرش اچھی طرح سے صاف کیا اور خون آلود کپڑا اسٹور روم میں پھینک کر دروازہ بند کردیا۔ جمیل کو لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ کس بے دردی سے ضرغام نے شمس کو قتل کردیا تھا اور اس کے چہرے پر کوئی ملال بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

کالی نے کار انسپکٹر منصور کے گھر سے کافی فاصلے پر کھڑی کردی تھی۔ وہاں سے انسپکٹر منصور کے گھر کا پیدل پندرہ منٹ کا راستہ تھا۔ جس جگہ کالی نے کار کھڑی کی تھی وہ ایک پلازا... کی پارکنگ تھی۔ اس جگہ بہت سی کاریں کھڑی تھیں۔ وہ کار ان کاروں کا ایک حصہ بن گئی تھی۔

''میں اس جگہ کھڑا ہوں۔ کام کر کے جلدی آجانا۔'' کالی نے کہا تو کانپتے ہاتھوں سے کار کا دروازہ کھول کر نگہت باہر نکل گئی۔

نگہت کے قدم اپنے بھائی کے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا ایک ایک قدم ایک من کا ہو گیا ہو۔ اس کا دل مسلسل دھڑک رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ کچھ ایسا ہو جائے کہ اسے اپنی بھتیجی کو ان ظالموں کے پاس نہ لے جانا پڑے۔

نگہت سوچتے ہوئے گھر کے دروازے تک پہنچ گئی۔ بیل دی تو دروازہ چوکیدار نے کھولا۔ نگہت سلام کرتی ہوئی اندر بڑھی تو چوکیدار نے نگہت کے عقب میں نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''گھر میں اس وقت کوئی نہیں ہے۔''

''کہاں گئے ہیں؟'' نگہت نے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ کومل کے ساتھ مارکیٹ گئی ہیں۔'' چوکیدار نے بتایا۔

''کتنی دیر ہوئی ہے؟''

''ابھی کوئی پندرہ منٹ پہلے گئی ہیں۔'' چوکیدار نے بتایا اور نگہت سوچنے لگی۔

''آپ بیٹھ جائیں......'' چوکیدار نے کہا۔

''نہیں میں چلتی ہوں۔'' نگہت واپس مڑی اور چوکیدار یہ دیکھتا رہا کہ نگہت پیدل ہی جارہی ہے۔ جبکہ نگہت جب بھی جمیل کے بغیر آئی تھی وہ رکشا یا ٹیکسی میں آتی تھی۔ چوکیدار نے اندر جا کر گیٹ بند کرلیا۔

وہ تیز قدم اٹھاتی واپس کار تک آئی اور بیٹھتے ہی بولی۔ ''گھر میں کوئی نہیں ہے۔ بھابی اپنی بیٹی کے ساتھ مارکیٹ گئی ہیں۔''

''جھوٹ بول رہی ہو کہ سچ۔'' کالی نے اسے گھورا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' نگہت نے بلا تامل کہا۔

''اپنی بھابی کو فون کرو اسے پوچھو کہ وہ کہاں ہے۔ پھر اسے کہو کہ تم کو بھی کچھ شاپنگ کرنی ہے اس لیے وہ تمہارا انتظار کرے۔'' کالی نے کہا تو نگہت شش و پنج میں پڑ گئی کہ وہ کیا کرے۔ آخر کار اس نے دوبارہ مجبور کرنے پر منصور کی بیوی شائستہ کا نمبر ملایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی رابطہ ہو گیا۔ حال چال پوچھنے کے بعد اس نے کہا۔ ''تم شاپنگ کے لیے نکلی ہو کیا؟''

''ہاں مجھے کچھ خریداری کرنی تھی۔'' شائستہ کی آواز آئی۔

''میں ابھی گھر آئی تھی۔ مجھے بھی کچھ خریدنا تھا۔ تم کہاں ہو میں بھی ابھی پہنچتی ہوں۔'' نگہت نے کہا۔

شائستہ نے بتادیا کہ وہ کہاں ہے۔ فون بند کرنے پر جیسے ہی نگہت نے بتایا کہ وہ کہاں ہے کالی نے ایک جھٹکے سے کار وہاں سے نکالی۔ وہ دس منٹ کے بعد اس شاپنگ سینٹر سے کچھ فاصلے پر موجود تھے۔

''فوراً واپس آنا۔'' کالی نے جلدی سے کہا۔

نگہت نے ناگواری سے سر ہلایا اور کار سے باہر نکل گئی۔ وہ شاپنگ سینٹر کی طرف جارہی تھی۔ ایک بار پھر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہونا شروع ہو گئی تھی۔

وہ شہر کا بڑا شاپنگ سینٹر تھا۔ نگہت شاپنگ سینٹر میں داخل ہو کر متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھتی ہوئی اس جگہ پر پہنچی تو وہاں شائستہ موجود تھی۔ اس کی پانچ سالہ بیٹی کومل اس کے ساتھ تھی۔ دونوں خندہ پیشانی سے ایک دوسری سے ملیں پھر نگہت نے کومل کو اپنی گود میں اٹھالیا اور اسے پیار کرنے لگی۔

''تمہیں کیا خریدنا ہے؟'' شائستہ نے پوچھا۔

''سچ کہوں تو مجھے کچھ بھی نہیں خریدنا۔ کومل سے ملنے کو میرا بہت دل چاہ رہا تھا۔ میں گھر گئی تو پتا چلا کہ تم شاپنگ

کے لیے آئی ہو، میں نے سوچا کہ اب گھر سے نکل ہی آئی ہوں تو جہاں تم ہو وہاں پہنچ جاتی ہوں۔'' نگہت نے کہا۔

''چلو اچھا ہوا کہ تم آگئیں۔ اب کومل سے خوب مل لو۔ میری کلاس فیلو کوثر مجھے مل گئی تھی۔ وہ بھی یہاں شاپنگ کر رہی ہے۔ وہ مجھے اپنے گھر لے جانے کی ضد کر رہی ہے۔ اس کا گھر یہاں پاس ہی ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔''

''میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے تم اکیلی ہی چلی جاؤ۔ میں تو کومل کو لینے آئی تھی، میں اسے لے کر جا رہی ہوں۔ تم کوثر کے ساتھ خوب گپ شپ کرنا۔'' نگہت نے کہا۔ کومل کو بھی اپنی پھوپو سے اتنا پیار تھا کہ وہ اس کی گود میں چڑھ جاتی تو پھر اترتی نہیں تھی۔

اسی وقت کوثر بھی وہاں آگئی۔ نگہت اس سے پہلے بھی شائستہ کے گھر میں کوثر سے مل چکی تھی۔ دونوں میں علیک سلیک ہوئی۔ کوثر نے کہا۔ ''میں نے اپنی شاپنگ مکمل کر لی ہے، اب تم دونوں میرے ساتھ چلو۔''

''مجھے تو کام ہے۔ تم دونوں چلی جاؤ۔ میں کومل کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔ آج خوب باتیں کریں گے اور ایک ساتھ کھیلیں گے۔ رات کو ہم کومل کو چھوڑنے آجائیں گے۔'' نگہت نے کہا۔

کوثر نے ایک دو بار اصرار کیا کہ وہ اس کے ساتھ چلے لیکن نگہت نے مسکراتے ہوئے انکار کر دیا۔ شائستہ کو ابھی کچھ خریداری کرنی تھی اس لیے وہ خریداری کرنے لگیں، جبکہ نگہت، کومل کو اٹھائے شاپنگ سینٹر سے باہر چلی گئی۔

نگہت، کومل کو گود میں اٹھائے گھبرائی ہوئی اور خوفزدہ اپنی کار کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کا کئی بار دل چاہا کہ وہ کہیں بھاگ جائے لیکن جمیل، ضرغام کی گرفت میں تھا اس لیے وہ کہیں بھاگ بھی نہیں سکتی تھی اور کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ جونہی وہ کار کے پاس پہنچی۔ کالی نے دروازہ کھولا اور وہ کار میں بیٹھ گئی۔ کالی نے کار بیک کی اور اس جگہ سے کار نکال کر لے گیا۔

''یہ بات یاد رکھنا کہ تم لوگ ہم تینوں میں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔ اس کی آڑ میں تم تینوں کو جہاں فرار ہونا ہے ہو جانا۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔'' نگہت نے ٹھوس لہجے میں دونوں کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''ہمیں صرف فرار ہونا ہے۔ تم تینوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا۔ ہم اس گڑیا کو چھوئیں گے بھی نہیں۔ یہ آپ کی گود میں رہے گی۔'' کالی نے کہہ کر نگہت کے فون سے ضرغام کو اطلاع دی۔

''کام ہو گیا ہے۔''

کالی نے کار کی رفتار قدرے تیز کی ہوئی تھی۔ آگے چوک سے مڑتے ہوئے رش تھا۔ کالی نے کار چوک سے دائیں موڑی تو بائیں جانب انسپکٹر منصور اپنی کار میں موجود سرخ بتی پر کھڑا تھا۔ اس نے کار میں واضح دیکھا کہ نگہت کی گود میں کومل ہے، جبکہ وہ کار چلانے والے کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ انسپکٹر منصور جاتی ہوئی کار کو گردن گھما کر دیکھتا رہا۔ کار جمیل کی تھی۔

اچانک سبز بتی روشن ہو گئی اور اس جانب جانے کا راستہ بند ہو گیا جس طرف نگہت کی کار گئی تھی اور انسپکٹر منصور کا راستہ کھل گیا۔

انسپکٹر منصور سیدھا چلا گیا اور اس نے آگے جا کر کار روک لی۔ اس نے اپنے موبائل فون سے نگہت کا نمبر ملایا لیکن وہ بند جا رہا تھا۔ کیونکہ کالی نے بات کرنے کے بعد فون بند کر دیا تھا۔ پھر اس نے شائستہ کا نمبر ملایا۔ اس کا موبائل فون اس کے ہینڈ بیگ میں تھا اور وہ ہینڈ بیگ بیڈ پر پڑا تھا جبکہ شائستہ اپنی دوست کوثر کے ڈریسنگ روم میں اس کے وہ نئے کپڑے دیکھ رہی تھی جو اس نے اپنے بھائی کی شادی کے لیے بنوائے تھے۔

انسپکٹر منصور نے جمیل کا نمبر ملایا تو وہ بھی آف تھا۔ انسپکٹر منصور کے ماتھے پر تشویش کی سلوٹیں ابھریں اور اس نے کار آگے بڑھا دی۔ اس کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف تھا۔ وہ ضرغام کو گرفتار کرنے کے لیے پُرجوش تھا اور ابھی بھی وہ اپنے ان اہلکاروں کا جائزہ لے کر آرہا تھا جو ضرغام کی گرفتاری کے لیے اہم جگہوں پر پھیلے ہوئے تھے۔

☆☆☆

سلیم کاظمی مقامی اخبار کا کرائم رپورٹر تھا۔ وہ انسپکٹر منصور کا اچھا دوست بھی تھا۔ جس وقت ضرغام کی کار جمِ غفیر کا حصہ بنی ہوئی تھی تو سلیم اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھا قریب ہی ٹریفک میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کی اچانک نظر کالی پر پڑی اور پھر اس کی نظر اس کے ساتھ بیٹھے سکندر پر پڑی۔ چند ماہ قبل ان دونوں نے ایک نوجوان پر اس کے سامنے گولیاں چلائی تھیں۔ سلیم نے اپنے تئیں ان کو بہت تلاش کیا تھا لیکن وہ بھی اسے دکھائی نہیں دیے تھے۔ اب اچانک وہ اس کے سامنے تھے۔ اس نے گاڑی کے پیچھے دیکھا تو اسے ایک موٹا شخص بیٹھا دکھائی دیا، اس کے ساتھ بیٹھا ہوا نوجوان کچھ پریشان

دکھائی دے رہا تھا۔

سلیم کا ان سے کچھ فاصلہ تھا لیکن اس کے پاس جدید کیمرا تھا۔ سلیم نے سرعت سے تین تصویریں لیں اور ابھی وہ مزید تصویر لینا چاہتا تھا کہ اسے خیال آیا کہ انسپکٹر منصور، بدنام زمانہ جرائم پیشہ ضرغام کی تلاش میں ہے کہیں یہ ضرغام ہی تو نہیں ہے۔

یہ خیال آتے ہی اس نے انسپکٹر منصور کا نمبر ملایا اور رابطہ ہوتے ہی اسے اس گاڑی کا نمبر بتاتے ہوئے اپنا شک ظاہر کیا۔ اس دوران کالی نے اس جگہ سے نکلنے کی کوشش میں اس کی موٹر سائیکل کو ٹکر بھی ماردی اور وہ نیچے گر گیا جس کی وجہ سے اسے کافی چوٹیں آئیں اور اس کے لیے اٹھ کر چلنا بھی مشکل ہو گیا۔ ایک فرشتہ صفت شخص نے اسے اور اس کی بائیک کو اٹھا کر اسپتال پہنچا دیا تھا۔

جیسے ہی انسپکٹر منصور پولیس اسٹیشن اپنے کمرے میں پہنچا اس کا دستِ راست سب انسپکٹر فیاض ہاتھ میں ایک خاکی لفافہ پکڑے آ گیا۔ اس نے وہ لفافہ انسپکٹر منصور کی طرف بڑھاتے ہوئے بتایا۔

”یہ لفافہ مجھے سلیم کاظمی کرائم رپورٹر نے دیا ہے۔ اس نے آپ کو فون پر اطلاع دی تھی کہ اسے شک ہے کہ اس کار میں ضرغام بھیس بدل کر بیٹھا ہے۔“

انسپکٹر منصور نے لفافہ کھولا تو اندر آٹھ بائی دس سائز کی تین تصویریں تھیں۔ یہ وہی تصویریں تھی جو سلیم نے کالی، سکندر، ضرغام اور جمیل کی کار میں بیٹھے ہوئے کھینچی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر انسپکٹر منصور کے لیے سب سے زیادہ چونکنے کی بات یہ تھی کہ اس کار میں جمیل بھی موجود تھا۔

”جمیل کا ان سے کیا تعلق ہے......؟“ انسپکٹر منصور کے ذہن میں پہلا حیران کن سوال ابھرا۔

اچانک انسپکٹر منصور کا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے اسکرین پر دیکھا کوئی غیر مانوس نمبر تھا۔

☆☆☆

کالی نے کار ایک طرف کھڑی کی اور فون پر ضرغام کو اطلاع دینے کے بعد نگہت کو باہر نکلنے کا کہا... پھر بولا۔

”تمہارے پاس بیس منٹ ہیں۔ اگر اکیس منٹ کے بعد تم اسے لے کر گھر نہیں پہنچیں تو جمیل کو ہمیشہ کے لیے کھو دو گی۔“

نگہت تیزی سے ایک رکشا والے کی طرف بڑھی جبکہ کالی اس جگہ سے کار نکال کر لے گیا۔ نگہت رکشا میں سوار ہوئی اور رکشے کا رخ اس کی کالونی کی طرف ہو گیا۔ نگہت کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ رکشا جب کالونی کے اندر داخل ہوا تو سادہ لباس میں پولیس اہلکار ایک جنرل اسٹور پر کھڑا بوتل پی رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ رکشا کے اندر ایک خاتون کسی بچی کے ساتھ براجمان ہے۔ رکشا آگے گزر گیا اور وہ اہلکار پھر بوتل کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر جنرل اسٹور کے مالک سے اپنے انداز میں بات چیت کرنے لگا۔

نگہت اپنی بھتیجی کو گلے سے لگائے گھر میں داخل ہوئی تو وہ بُری طرح سے گھبرائی ہوئی تھی۔ اس سے بھی کہیں زیادہ گھبراہٹ اور خوف میں جمیل مبتلا تھا۔ جمیل کے خوف کی وجہ وہ قتل تھا جو اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے گھر میں ہوا تھا جو ابھی تک اس کے دل ودماغ سے محو نہیں ہوا تھا جبکہ ضرغام بے فکر بیٹھا تھا۔

”واہ زبردست......! تم اپنی بھتیجی کو لے آئی ہو۔ بہت خوشی ہوئی۔ اب آئے گا مزہ۔“ ضرغام خوش ہو گیا۔

نگہت سیدھی جمیل کے پاس چلی گئی اور بولی۔

”اب جمیل کو کھول دو۔“

ضرغام نے مسکراتے ہوئے سکندر کو اشارہ کیا اور اس نے جمیل کو کھول دیا۔ جمیل کی دھڑکن ابھی تک تیز تھی۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ وہ نگہت کو بتانا چاہتا تھا کہ ضرغام ان کی سوچ سے بھی کہیں زیادہ سفاک ہے۔

”کیا ہوا ہے؟ تم بہت خوفزدہ ہو؟ کچھ کہا ہے انہوں نے؟“ نگہت اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

جمیل نے گردن گھما کر ضرغام کی طرف دیکھا جو اب ان کے پاس آ گیا تھا۔ اس نے گھوم کر کومل کو دیکھا جو نگہت کے کندھے سے لگی سو رہی تھی۔

”اچھا ہے کہ یہ سو رہی ہے۔ تم اسے کمرے میں لٹا دو۔“ ضرغام نے کہا اور نگہت اسے لے کر کمرے میں چلی گئی۔ نگہت نے اطمینان سے کومل کو بستر پر لٹایا، اس کے چھوٹے چھوٹے جوتے اتار کر بیڈ کے ایک طرف رکھ دیے اور اس پر کمبل ڈال دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ کمرے سے باہر نکلی اور دروازہ بند کر دیا۔

”دیکھو میں نے اپنے وعدے کے مطابق اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔“ ضرغام کہہ کر سکندر کی طرف مڑا۔ سکندر نے اشارہ پاتے ہی اپنی جیب سے ایک پرانا اور سستا سا موبائل فون نکالا اور نگہت کی طرف بڑھا کر کہا۔

”منصور کا نمبر ملا کر مجھے دے دو۔“

نگہت نے نمبر پش کر کے موبائل فون واپس سکندر کو دے دیا۔ کچھ دیر بیل جاتی رہی اور پھر جونہی رابطہ ہوا

دوسری طرف سے منصور کی آواز آئی۔

”ہیلو......“

”انسپکٹر منصور بول رہے ہو؟“ سکندر نے اپنی آواز بدل کر پوچھا۔

”ہاں بول رہا ہوں۔ آپ کون بول رہے ہو؟“ انسپکٹر منصور نے کہا۔

”میں تیرا باپ بول رہا ہوں۔“ اچانک سکندر نے کرخت لہجے میں بات شروع کی۔”تمہاری بہن اور تمہاری بیٹی میرے پاس ہے۔ دونوں کو میں نے پچاس لاکھ روپے کے لیے اغوا کیا ہے۔“

انسپکٹر منصور نے سنا تو ایک دم سے اسے جھٹکا سا لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جب اس نے نگہت کو کار میں بیٹھے دیکھا تھا۔

”کون بول رہے ہوتم؟“ انسپکٹر منصور نے پوچھا۔

”راکیش بول رہا ہوں۔ نہیں امتیاز نام ہے میرا...... نہیں نہیں یہ بھی نہیں میرا نام ڈیوڈ ہے...... خیر چھوڑو تم کو میرے نام سے کیا مطلب...... مجھے پچاس لاکھ روپے چاہئیں...... یہ لو اپنی بہن سے بات کرو۔“ سکندر نے فون نگہت کی طرف بڑھا دیا، فون دینے سے قبل اس نے فون کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔ نگہت کو پہلے ہی ضرغام نے سمجھا دیا تھا کہ اسے کیسے بات کرنی ہے اور کیا کہنا ہے۔

”منصور بھائی...... ہم دونوں ان کے قبضے میں ہیں، اچانک انہوں نے ہمیں گاڑی سمیت اغوا کر لیا ہے......“ نگہت نے پریشانی سے کہا۔

”پریشان نہیں ہونا...... بالکل نہیں گھبرانا......“ ابھی منصور کہہ ہی رہا تھا سکندر نے نگہت کے ہاتھ سے فون لے کر اس کا اسپیکر بند کر دیا اور بولا۔

یاد رکھنا زیادہ ہوشیاری مت دکھانا۔ ہمیں ان کو تکلیف دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، ہمارا مطلب ان کے بدلے تاوان لینے سے ہے۔ لیکن اگر تم نے ہمارا حکم نہ مانا اور کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو ان کی زندگی کی ضمانت ہم نہیں دے سکتے۔ دوبارہ فون کرتا ہوں۔“ سکندر نے کہہ کر فون بند کر دیا اور ساتھ ہی اس نے فون بھی آف کر دیا۔

اسی وقت سکندر کو اس کے مخبر کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس کے آدمی اس علاقے میں پھیل چکے ہیں اور ان تین کالونیوں میں بھی پولیس کے آدمی ہیں۔ اگر آپ لوگ اس علاقے میں کہیں ہو تو محتاط ہو جاؤ۔


دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

مخبر کی بات سن کر سکندر نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"ان بے وقوفوں کو تلاش کرنے دو اس علاقے میں...... ہم اس جگہ کہیں بھی نہیں ہیں۔ لیکن تم مجھے مسلسل خبر دیتے رہو گے۔"

رابطہ منقطع ہونے کے بعد سکندر نے ساری بات ضرغام کو بتائی تو ضرغام کے ماتھے پر سوچوں کی سلوٹیں اُبھر آئیں۔ وہ سوچنے لگا کہ اب وہ اس علاقے سے کیسے فرار ہوگا؟

☆☆☆

جونہی فون کال بند ہوئی منصور نے اپنے اہلکار کو پہلی والی بات اس فون کے بارے میں کی اور اس کے بعد اس نے شائستہ کو کال کی۔ تھوڑی دیر کے بعد شائستہ سے رابطہ ہوا تو منصور نے اس انداز میں پوچھا کہ اس کے لہجے سے شائستہ کو یہ شک نہ پڑے کہ کوئی معاملہ رونما ہوگیا ہے۔

"تم کہاں ہو شائستہ......"

"میں شاپنگ کے لیے آئی تھی کہ مجھے میری پرانی دوست کوثر مل گئی۔ وہ مجھے زبردستی اپنے گھر لے گئی تھی۔ آپ کیا گھر آئے ہیں؟"

"نہیں، میں اپنے آفس میں ہوں۔ اچھا...... کومل ٹھیک ہے۔ وہ بور تو نہیں ہو رہی تم دونوں کی باتوں سے۔" انسپکٹر منصور نے کہا۔

شائستہ ہنسی۔ "دراصل نگہت گھر ملنے کے لیے آئی تھی۔ مجھ سے رابطہ ہوا تو میں نے بتایا کہ میں اس جگہ شاپنگ سینٹر میں ہوں۔ وہ بھی یہاں آگئی اور وہ کومل کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ رات کو چھوڑنے آجائے گی۔"

"ٹھیک ہے...... نگہت کو کومل سے پیار بھی بہت ہے۔ وہ خود ہی چھوڑنے آجائے گی تم فکر نہ کرنا۔"

"مجھے کیا فکر ہے۔ پانچ سال شادی کے بعد اولاد جیسی نعمت سے محرومی کی وجہ سے وہ کومل کو لے جاتی ہے۔ خدا ہماری نگہت کو بھی اولاد جیسی نعمت دے۔" شائستہ نے متانت سے کہا۔

"جمیل بھی ساتھ تھا کیا؟"

"نہیں وہ اکیلی تھی، باہر گاڑی میں ہو تو مجھے معلوم نہیں۔" شائستہ نے جواب دیا۔

"تم اپنا خیال رکھنا، اوکے بائے۔" انسپکٹر منصور نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

انسپکٹر منصور سوچنے لگا کہ نگہت اور کومل کو اغوا کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ کیا یہ کام ضرغام گروپ کا ہے؟ لیکن ضرغام کے تقریباً ہر ٹھکانے پر اس کی پولیس کے اہلکاروں نے یلغار کی ہوئی ہے اور وہ سب تتر بتر ہیں اور جس علاقے میں ضرغام کے ہونے کا شک ہے وہاں اس نے اپنے آدمیوں کا جال بچھایا ہوا ہے۔ وہ اسے گرفتار کرنے کے لیے پوری کوشش میں ہیں۔ اس لیے یہ کام ان کا نہیں ہوسکتا ہے۔ یہ کوئی اور لوگ ہیں۔

ایک بار پھر انسپکٹر منصور نے وہی تصویریں اٹھالیں اور ان کو غور سے دیکھنے کے بعد اس کی نگاہیں جمیل پر جم گئیں۔ جس وقت جمیل کی تصویر لی گئی تھی وہ سامنے دیکھ رہا تھا اور اس کے ساتھ بیٹھا ہوا وہ شخص بھی نظر آرہا تھا جو حلیے سے کچھ مشکوک دکھائی دے رہا تھا۔

"جمیل کا ان لوگوں کے ساتھ کیا تعلق ہے۔" انسپکٹر منصور نے ایک بار پھر اپنے آپ سے کہا۔ انسپکٹر منصور مزید سوچنے لگا۔ شائستہ نے بتایا تھا کہ نگہت اکیلی آئی تھی۔ جمیل کی کار میں وہ اگر اکیلی آئی تھی تو کیسے......؟ کیونکہ نگہت کو تو کار چلانی ہی نہیں آتی۔ نگہت کو اس نے جمیل کی کار میں ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ ڈرائیور کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ کار بھی جمیل کی تھی اور یقیناً کار جمیل ہی چلا رہا ہوگا۔ اگر جمیل ساتھ تھا اور اغوا کاروں نے نگہت اور کومل کو اغوا کر لیا تھا تو جمیل کہاں ہے؟ اگر جمیل ان کے پاس ہے تو اغوا کرنے والے نے صرف نگہت اور کومل کا ہی ذکر کیوں کیا؟ اور اگر جمیل ان کے ساتھ نہیں ہے تو پھر جمیل نے اس سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔

جمیل کا ان لوگوں کے ساتھ ہونا، اچانک کومل اور نگہت کا اغوا ہونا...... کیا یہ کوئی ڈراما ہو رہا ہے؟ کہیں جمیل اس کی ناک کے نیچے جرائم پیشہ لوگوں کا حصہ تو نہیں ہے؟ اس کا کاروبار پہلے بھی نقصان کا شکار ہوگیا تھا اور اسے پیسوں کی ضرورت پڑ گئی تھی جو اس کے والد نے دیے تھے۔ کیا اب بھی اسے کوئی نقصان ہوگیا ہے اور اس نے اس بار پیسا اس طریقے سے لینے کا راستہ اختیار کیا ہے اور نگہت اس کا ساتھ دے رہی ہے؟

انسپکٹر منصور سوچتے ہوئے کچھ مضطرب سا ہوگیا تھا۔

☆☆☆

ضرغام نے جمیل کی طرف دیکھ کر کہا۔ "مجھے تمہارا اچھا سا سوٹ چاہیے۔ مجھے بتا دو کہ تمہارے کپڑے کہاں ہوتے ہیں۔"

"میرے کمرے میں الماری ہے۔ وہاں میرے

سوٹ لٹکے ہوئے ہیں۔'' جمیل نے بتایا تو ضرغام اندر چلا گیا جبکہ سکندر ایک ہاتھ میں پستول لیے بیٹھا رہا۔

''کیا بات ہے تم بہت گھبرائے ہوئے ہو؟'' نگہت نے آہستہ سے پوچھا۔

''یہ بہت ظالم لوگ ہیں۔'' جمیل بولا۔

''وہ تو دکھائی ہی دے رہے ہیں۔'' نگہت نے کہہ کر اپنا نچلا ہونٹ چبایا۔

''ہمارے اسٹور روم میں ایک لاش پڑی ہے۔'' جمیل نے اچانک انکشاف کیا تو نگہت کی سنتے ہی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ خیرہ نگاہوں سے جمیل کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس نے وہی سنا ہے جو جمیل نے ابھی کہا ہے۔

''کک...... کیا کہا ہے تم نے؟''

''ہمارے اسٹور روم میں لاش پڑی ہے۔'' جمیل نے آہستہ سے دہرایا۔

''کس کی......؟'' نگہت کی...... نگاہیں جمیل کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور خوف اس کے چہرے سے مترشح تھا۔

''ہمارے ہمسائے شمس کی۔'' جمیل نے بتایا۔

''میری آنکھوں کے سامنے ضرغام نے اس کا گلا کاٹ کر اسے قتل کیا تھا۔'' ایک بار پھر جمیل اس قتل کے بارے میں سوچ کر کانپ گیا تھا۔

''وہ یہاں کیا کرنے آیا تھا؟''

''اپنی عادت سے مجبور وہ یہ جاننے کے لیے آ گیا تھا کہ تم کن کے ساتھ گئی ہو...... اور ضرغام نے اسے مار دیا۔'' جمیل نے کہتے ہوئے خوف سے نگہت کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نگہت کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ ''مجھے خوف آنے لگا ہے۔ یہ سوچ کر میرا جسم کانپ رہا ہے کہ ہمارے گھر میں لاش پڑی ہوئی ہے۔ کہیں یہ ہمیں بھی نقصان نہ پہنچا دیں۔''

''تم ڈرو نہیں خدا بہتر کرے گا۔'' جمیل نے اسے حوصلہ دیا۔ نگہت نے اپنا دوسرا ہاتھ جمیل کے ہاتھ کے اوپر رکھ دیا۔ سکندر ان کی طرف ہی دیکھ رہا تھا لیکن کچھ فاصلے پر بیٹھے ہونے کی وجہ سے وہ ان کی کوئی بات واضح نہیں سن سکا تھا۔

جمیل اور نگہت کے گھر میں ایسا سناٹا تھا جیسے موت کی دہشت پھیلی ہوئی ہو۔ وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی جگہ ساکت سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔

جب ضرغام باہر نکلا تو اس نے اپنا لباس تبدیل کر لیا تھا۔ وہ بہترین پینٹ، کوٹ میں ملبوس تھا اور اس نے گلابی رنگ کی ٹائی بھی باندھ رکھی تھی۔ ضرغام کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ کوئی بہت بڑا بزنس مین ہو۔ جمیل کا سوٹ ضرغام کے جسم پر بالکل فٹ تھا۔

''میں تیار ہوں۔ کالی سے میری دو بار بات ہو چکی ہے۔ اس نے منصور کو الجھا دیا ہے۔ منصور نے اس سے ایک گھنٹا مانگا ہے رقم کا انتظام کرنے کے لیے۔'' کچھ دیر کے بعد ضرغام پھر بولا۔ ''اس اغوا کا ڈراما رچانے کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کیونکہ شک کی بنیاد پر انسپکٹر منصور کے آدمی اس علاقے میں موجود ہیں اور میرا نکلنا مشکل دکھائی دے رہا ہے۔''

''آپ نے انسپکٹر منصور کو پکڑ کر اسے ڈھال بنا کر نکلنے کا پلان کیا تھا۔ اگر وہ ہمارے قبضے میں آ جائے تو ہمارے کہنے پر خود ہی ساری پولیس اس علاقے سے ہٹا لے جائے گا۔'' کالی نے کہا۔

''میں نے پلان تو کر لیا تھا لیکن یہاں سے ہم نکلیں گے تو انسپکٹر منصور کو اغوا کریں گے۔'' ضرغام الجھن کا شکار تھا۔

''انسپکٹر منصور کی بیٹی کے سر پر پستول رکھ کر اسے ڈھال بنا کر نکل چلتے ہیں۔'' سکندر نے تجویز دی۔

''اس سے پولیس مقابلہ ہوگا۔ میں اس کی بیٹی کو مار دوں گا اور وہ لوگ مجھے مار دیں گے۔ میں یہاں سے زندہ فرار ہونا چاہتا ہوں۔'' ضرغام نے کہا۔ اچانک ضرغام ایک خیال کے آتے ہی جمیل سے مخاطب ہوا۔ ''تم اپنے کسی دوست سے ابھی گاڑی منگوا سکتے ہو؟''

''ابھی......؟'' جمیل اس کی طرف دیکھ کر سوچنے لگا۔

ضرغام نے سیخ پا ہو کر اسے گھورا۔ ''سوچنے کا وقت نہیں ہے، مجھے فوراً جواب دو۔''

''ہاں منگوا سکتا ہوں۔'' جمیل نے جلدی سے گھبرا کر کہا۔ نگہت بھی سہم گئی تھی۔

''ابھی فون کرو اور اس سے گاڑی منگواؤ۔ دس منٹ میں وہ گاڑی لے کر آ جائے۔ فوراً...... جلدی کرو۔'' ضرغام نے کہہ کر اس کا فون اس کی طرف بڑھایا۔ جمیل نے کانپتے ہاتھوں سے ایک نمبر ملا کر اپنے منیجر سے بات کی اور اسے فوراً گاڑی اس کے گھر چھوڑنے کی ہدایت کر دی۔

ضرغام نے اس سے موبائل فون لیا اور سکندر کو ایک

طرف لے جا کر آہستہ سے بولا۔ ''ہم دونوں اور انسپکٹر منصور کی بیٹی کار کی ڈکی میں بیٹھ جائیں گے۔ دونوں میاں بیوی کار میں ہوں گے۔ کوئی ان پر شک بھی نہیں کرے گا۔ اور اگر کسی نے ان کی کار روک بھی لی تو نگہت اتنا کہے گی کہ وہ انسپکٹر منصور کی بہن ہے اور وہ کار جانے دیں گے۔ اس طرح ہم فرار ہو جائیں گے۔''

''یہ اچھا آئیڈیا ہے۔'' سکندر مسکرایا۔

ضرغام نے جمیل اور نگہت کو بتایا کہ وہ کیسے گاڑی کی ڈکی میں بیٹھیں گے۔ ان کے ساتھ کومل ہوگی۔ اگر انہوں نے کسی اشارے سے یہ بتایا کہ ہم ڈکی میں ہیں تو وہ لوگ ڈکی بعد میں کھولیں گے ہم کومل کو گولی پہلے مار دیں گے۔ یہ سن کر جمیل اور نگہت کا جسم ایک بار پھر کانپ گیا۔

نگہت تیز لہجے میں بولی۔ ''ہم تم دونوں کو اس علاقے سے نکال کر جہاں تم چاہو گے پہنچا دیں گے۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ تم پولیس کے ہاتھ آتے ہو کہ نہیں۔ ہم کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے جس سے کومل کو کوئی خراش بھی آئے۔''

نگہت کا گھبرایا اور خوفزدہ چہرہ دیکھ کر ضرغام مسکرایا اور بولا۔ ''مجھے تمہاری بات پسند آئی......''

☆☆☆

ضرغام کی ہدایت پر کالی نے انسپکٹر منصور کو آدھا گھنٹا دیا تھا کہ وہ اس دوران پچاس لاکھ روپے کا انتظام کرلے پھر وہ کال کرے گا اور اسے پیسے لے کر اس جگہ آنا ہوگا جہاں وہ بلائے گا اور اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ اس کی بہن اور بیٹی کو مار دے گا۔

اب انسپکٹر منصور کے پاس ایک گھنٹا تھا۔ اس دوران وہ جمیل اور نگہت کے گھر کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا جمیل کا تعلق جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ ہے؟

اپنی گاڑی کی طرف جاتے ہوئے اس نے پہلے اپنے دستِ راست فرخ سے رپورٹ لی جو اس علاقے میں پھیلی ہوئی پولیس کی کمان کر رہا تھا۔ اس سے بات چیت کرنے کے بعد اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی جمیل کو فون کیا لیکن جمیل کا فون بند تھا۔

انسپکٹر منصور نے کار کو تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑانا شروع کر دیا۔ اسی راستے پر جمیل کا آفس تھا۔ وہ سیدھا جمیل کے آفس پہنچا۔ سامنے جمیل کا گنجا سیکریٹری بیٹھا تھا۔ وہ جانتا کہ انسپکٹر منصور کا جمیل کے ساتھ کیا تعلق ہے۔

''جمیل صاحب اندر ہیں......؟''

''جی نہیں، وہ جا چکے ہیں۔''

''کتنی دیر ہوئی ہے انہیں گئے ہوئے۔''

''جی وہ تقریباً دو سوا دو بجے چلے گئے تھے۔''

انسپکٹر منصور نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔ وہ جاتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

جمیل کی ہدایت کے مطابق اس کے منیجر کا ڈرائیور کار لے کر آ گیا تھا۔ کار گیراج میں کھڑی کر کے جمیل کے کہنے پر وہ چلا گیا۔ ضرغام نے نگہت کو حکم دیا کہ وہ کومل کو اٹھا کر لے آئے۔ نگہت، کومل کو لے آئی۔ ضرغام کے کہنے پر سکندر نے کومل کو نگہت سے لینا چاہا تو نگہت نے ہمت سے کام لیتے ہوئے سخت الفاظ میں کہا۔

''ہم کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ جہاں تم نے کہا ہے وہاں تک ہم تم دونوں کو چھوڑ دیں گے لیکن کومل کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔''

''ہم تم سے بھی زیادہ محتاط ہیں۔ تم کومل کو لے کر آئیں، میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ آگے بھی ایسا ہی ہوگا لیکن اگر ہماری ڈکی کھلی تو میں گرفتار ہونے سے پہلے اسے مار دوں گا۔''

''کسی حالات کے پیشِ نظر اگر ہمیں اس جگہ سے کار بھگانی بھی پڑی تو میں کار بھگا کر لے جاؤں گا۔'' جمیل نے کہا۔

''ٹھیک ہے اب جلدی کرو۔'' ضرغام نے کہا تو نگہت نے کومل کو سکندر کے حوالے کر دیا جو اب نیند سے بیدار ہو رہی تھی۔ سکندر کے ہاتھ میں ایک رومال تھا جس پر اس نے بے ہوشی کی ہلکی سی دوائی رومال پر لگائی ہوئی تھی۔ اس نے غیر محسوس انداز میں رومال کومل کے منہ پر رکھ دیا اور کومل بے ہوشی کی دنیا میں چلی گئی۔ سکندر نے وہ رومال اسی جگہ فرش پر گرا دیا۔

وہ چاروں گیراج میں چلے گئے۔ ضرغام اور سکندر کومل کو لے کر ڈکی میں بیٹھ گئے۔ ضرغام کے دونوں ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ ضرغام نے ڈکی پوری بند نہیں کی تھی۔ ایک ہلکے سے رخنے سے وہ باہر بھی دیکھ سکتا تھا اور ہوا بھی آتی جاتی رہتی۔

جمیل نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ نگہت، جمیل کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی اور کار آہستہ آہستہ کالونی کے گیٹ کی طرف جانے لگی۔ اچانک دائیں طرف سے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل نکلی اور اس سے پہلے کہ

...ل کی کار سے ٹکراتی، جمیل نے فوراً اسٹیئرنگ گھمایا، وہ ...ل ...ار بھی اپنے آپ کو بچاتے ہوئے نکل گیا لیکن ...لی کار کا دایاں ٹائر مین ہول کے اوپر پڑا تو مین ہول کا ...ھکن ایک دھماکے سے ٹوٹ گیا اور کار کا وہ پہیا مین ...ول کے اندر جا پڑا۔ پوری کار میں ہلچل برپا ہوگئی۔ ضرغام ...اگر ڈکی کو سنبھالا نہ ہوتا تو جس طرح سے جھٹکا لگا تھا ڈکی ...ہو جاتی۔ وہ حیران تھے کہ اچانک کیا ہوگیا جبکہ جمیل اور ...کے لیے ان سے بھی زیادہ پریشان کن بات تھی کہ اگر ...جگہ کوئی گڑبڑ ہوگئی تو سفاک ضرغام، کومل کو جان سے مار ...گا۔

☆☆☆

انسپکٹر منصور کی کار ہوا سے باتیں کرتی ہوئی اس کالونی کے گیٹ تک پہنچی جہاں جمیل کا گھر تھا۔ انسپکٹر منصور کی کار گیٹ سے داخل ہوئی اور سیدھی جمیل کے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ راستے میں فرخ نے چلتے ہوئے انسپکٹر منصور کو دیکھا تو وہ چلتے ہوئے رک گیا۔ لیکن انسپکٹر منصور نے اسے ایسا اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے کام پر توجہ رکھے۔

کالونی کی جس سڑک پر انسپکٹر منصور کی کار جا رہی تھی اس کی دوسری طرف جمیل کی کار گٹر میں پھنسی ہوئی تھی۔ انسپکٹر منصور نے کار جمیل کے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور پیدل ہی گھر کے دروازے تک پہنچ گیا۔

اس نے دائیں بائیں کا جائزہ لیا اور دروازے کو ہلکا سا دھکا لگایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ انسپکٹر منصور فی الحال بیل نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ گھوم کر گیٹ کی طرف چلا گیا۔ وہ دائیں بائیں دیکھتا ہوا گیٹ کے پاس گیا۔ اس نے گیٹ کو ہاتھ لگایا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ انسپکٹر منصور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اندر چلا گیا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اس نے مین دروازے کے پاس اندر کچھ سننے کی کوشش کی، جب کچھ سنائی نہ دیا تو اس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ اندر کے منظر نے اسے چونکا دیا۔

انسپکٹر منصور اندر چلا گیا۔ فرش پر وہ سارا سامان بکھرا ہوا تھا جو ضرغام نے اپنا بھیس بدلنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ وہ رومال بھی انسپکٹر منصور کی نظر سے نہیں بچ سکا تھا جس پر بے ہوشی کی دوا لگی ہوئی تھی۔ وہ سب دیکھ کر انسپکٹر منصور کے منہ سے نکلا۔

''شٹ...... اس کا مطلب ہے کہ ضرغام اس گھر میں تھا۔ جمیل کے ساتھ۔''

انسپکٹر منصور نے بیڈروم میں جھانکا، اس نے غور سے اندر کا جائزہ لیا، کچھ دیر تک اس کی نگاہیں ایک جگہ ٹکی رہیں اور پھر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا اور جب وہ اسٹور روم میں گیا تو وہ چونک گیا۔ کیونکہ وہاں ایک لاش پڑی تھی۔ اس کے بعد انسپکٹر منصور نے ہاتھ میں ریوالور لے کر سارے گھر کی تلاشی لی اور اپنے موبائل فون سے کسی کا نمبر ملانے لگا۔ وہ تیزی سے اپنی کار کی طرف بھی جا رہا تھا۔

☆☆☆

جمیل اور نگہت ایک ساتھ کار سے باہر نکلے۔ انہوں نے دیکھا کہ کار کا ٹائر گٹر کے اندر تھا۔ جمیل نے دائیں بائیں دیکھا۔ سامنے دو پولیس کے اہلکار ان کی طرف آرہے تھے۔ دونوں نے کیونکہ وردی نہیں پہنی ہوئی تھی اس لیے جمیل کے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ پولیس والے ہیں۔ ان میں ایک فرخ تھا۔

جمیل گاڑی کو دیکھنے کے بہانے پیچھے ڈکی کے پاس چلا گیا۔ اور آہستہ سے بولا۔ ''گاڑی کا ٹائر گٹر میں چلا گیا ہے۔''

''جلدی سے نکالو۔'' ضرغام نے دانت پیسے۔

اس دوران وہ دونوں اہلکار ان کے پاس آگئے۔

''کیا ہوگیا ہے۔'' فرخ نے پوچھا۔

''ٹائر پھنس گیا ہے۔'' جمیل نے کہا۔

''کوئی بات نہیں ہم زور لگاتے ہیں۔'' دونوں کہہ کر جھکے اور پھر ان کے ساتھ جمیل بھی شامل ہوگیا اور تینوں نے زور لگا کر گاڑی کا وہ حصہ اوپر اٹھایا اور ٹائر مین ہول سے نکال کر سڑک پر رکھ دیا۔ اس دوران فرخ کا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے سیدھا ہوتے ہوئے موبائل فون نکالا اور کال سننے کے لیے ایک طرف چلا گیا۔

''آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔'' جمیل نے ممنون انداز میں کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ بولا۔

جمیل اور نگہت گاڑی میں بیٹھ گئے۔ فرخ، انسپکٹر منصور کی کال سن رہا تھا۔ اچانک فرخ کو لگا کہ جیسے گاڑی کی ڈکی کھلی ہوئی ہے۔ وہ کال سنتے ہوئے کار کی طرف بڑھنے لگا۔ خفیف رخنے سے ضرغام دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت کار اسٹارٹ ہوئی اور جیسے ہی کار آگے بڑھی، سامنے اسپیڈ بریکر تھا۔ اس کو عبور کرتے ہوئے کار کو ایک جھٹکا سا لگا اور ڈکی اوپر کو ہوئی اور فرخ نے دیکھا کہ اندر کوئی ہے۔ وہ چلّایا۔

"رکو...... اپنی گاڑی روکو......"

جمیل نے بھی بیک مرر سے دیکھ لیا تھا کہ دونوں آدمی اس کے پیچھے بھاگے ہیں۔ اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ فرخ کے کان سے موبائل فون لگا ہوا تھا اس نے فوراً اس بات کی اطلاع انسپکٹر منصور کو کردی۔ انسپکٹر منصور اپنی کار میں بیٹھا اور کار ایک جھٹکے سے اس طرف بڑھا دی جس طرف کا فرخ نے کہا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر منصور طوفانی انداز میں کار لے کر وہاں پہنچا تو وہ دونوں اہلکار وہاں موجود تھے۔ انسپکٹر منصور کے کار روکتے ہی دونوں کار میں بیٹھ گئے۔

"انہوں نے ابھی گیٹ عبور کیا ہے......" فرخ نے بتایا۔ "ڈکی میں کوئی ہے۔"

"گاڑی چلانے والے مرد اور عورت کا حلیہ بتاؤ۔"

انسپکٹر منصور نے پوچھا تو فرخ دونوں کا حلیہ بتانے لگا۔ فرخ جو حلیہ بتا رہا تھا وہ جمیل اور نگہت جیسا تھا۔ انسپکٹر منصور نے ڈیش بورڈ کھول کر اندر سے وہ تینوں تصویریں نکال کر فرخ کی طرف بڑھا کر پوچھا۔

"وہ حلیے والا اس تصویر میں ہے کیا۔"

فرخ نے تصویروں کو دیکھا اور پھر جمیل کی تصویر دیکھتے ہی وہ چلایا۔ "یہ کار چلا رہا تھا......"

"ان تصویروں کو ڈیش بورڈ میں رکھ دو۔" انسپکٹر منصور نے کہا اور سڑک پر اس کی کار کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ ان کی متلاشی نگاہیں اس نمبر کی کار کو تلاش کر رہی تھیں جو فرخ نے بتایا تھا۔ انسپکٹر منصور کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا کہ جمیل اور نگہت کب سے ضرغام کی دنیا کا حصہ ہیں؟

پورے شہر کی پولیس کو اس نمبر کی گاڑی کی اطلاع ہوگئی تھی۔ انسپکٹر منصور کی ہدایت پر گاڑی کے مالک کا پتا چلا لیا تھا۔ پولیس والے جمیل کے منیجر تک پہنچ گئے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ گاڑی جمیل نے اپنے گھر پر منگوائی تھی۔

انسپکٹر منصور کو رپورٹ ہوگئی تھی۔ انسپکٹر منصور نے سوچا کہ جمیل کے پاس اپنی ذاتی کار ہے پھر اس نے اپنے منیجر کی کار کیوں منگوائی تھی۔ کہیں اس کی اپنی کار کسی اور کام میں مصروف تو نہیں ہے؟ نگہت بھی تو جمیل کی کار میں بیٹھ کر کوئل کو لے کر جا رہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ نگہت نے بتایا تھا کہ انہیں گاڑی سمیت اغوا کرلیا ہے۔ اس دوران کالی کا فون آگیا۔ اس نے پوچھا۔ "پیسوں کا انتظام ہوگیا ہے۔"

دروازے کی گھنٹی بجی۔ خانم نے دروازہ کھولا تو دو نوجوان شانوں پر تھیلے لٹکائے نظر آئے۔ وہ کپڑے دھونے کا پاؤڈر بیچنے آئے تھے۔ خانم نے انکار کر کے غصے سے دروازہ بند کیا مگر دروازہ پوری طرح بند نہ ہوا۔

انہوں نے دوبارہ ذرا زور دے کر دروازہ بند کرنا چاہا ایک نوجوان نے منہ سے بلی کی آواز نکالی، دروازہ پھر بھی قدرے کھلا رہا۔

خانم نے تیسری بار دروازے پر طبع آزمائی کرتے ہوئے نیچے نظر ڈالی تو دیکھا کہ ایک نوجوان نے اپنا جوتا دروازے میں اڑایا ہوا تھا۔ دروازہ دبتے ہی نوجوان نے پھر بلی کی آواز نکال کر خانم کو چڑایا۔

وہ برہم ہوکر غرائیں۔ "یہ کیا حرکت ہے، اپنا جوتا ہٹاؤ ورنہ میں کچل دوں گی۔ اور یہ تم بلی کی آوازیں کیوں نکال رہے ہو؟"

"محترمہ! یہ آوازیں میں نہیں، آپ کی بلی نکال رہی ہے جسے میں نے اپنا جوتا پھنسا کر کچلنے سے بچایا ہوا ہے...... اسے ہٹالیں، دروازہ بند ہوجائے گا ورنہ وہ بے چاری دروازے میں دب کر مرجائے گی!"

سلمیٰ آغا، نواب شاہ

"ہاں ہوگیا ہے۔" انسپکٹر منصور نے بلا تامل کہہ دیا۔

"زبردست...... وہ پیسے مجھے پہنچا دو۔"

"کہاں پہنچانے ہیں؟" انسپکٹر منصور اس کی بات بڑے انہماک سے سن رہا تھا۔ اور اس نے کار کے شیشے بھی چڑھا دیے تھے۔

"تم سول اسپتال کے مین دروازے پر پہنچو۔" کالی نے کہہ کر فون بند کرنا چاہا۔

"کیا تم سول اسپتال کے گیٹ کے پاس ہو؟" انسپکٹر منصور نے پوچھا۔

"ہاں ہوں۔ تم ابھی پیسے لے کر پہنچو۔" اس نے جلدی سے کہہ کر فون بند کردیا۔

انسپکٹر منصور نے کار ایک طرف روکی اور ایک کاغذ پر

...ل ی ار سے ٹکراتی، جمیل نے فوراً اسٹیئرنگ گھمایا، وہ
...ل وار بھی اپنے آپ کو بچاتے ہوئے نکل گیا لیکن
...ل ی ار کا دایاں ٹائر مین ہول کے اوپر پڑا تو مین ہول کا
...ھان ایک دھماکے سے ٹوٹ گیا اور کار کا وہ پہیا مین
...ول سے اندر جا پڑا۔ پوری کار میں ہلچل برپا ہوگئی۔ ضرغام
...ے اگر ڈکی کو سنبھالا نہ ہوتا تو جس طرح سے جھٹکا لگا تھا ڈکی
...ھل جاتی۔ وہ حیران تھے کہ اچانک کیا ہوگیا جبکہ جمیل اور
...ت کے لیے ان سے بھی زیادہ پریشان کن بات تھی کہ اگر
...جگہ کوئی گڑبڑ ہوگئی تو سفاک ضرغام، کومل کو جان سے مار
...گا۔

☆☆☆

انسپکٹر منصور کی کار ہوا سے باتیں کرتی ہوئی اس کالونی کے گیٹ تک پہنچی جہاں جمیل کا گھر تھا۔ انسپکٹر منصور کی کار گیٹ سے داخل ہوئی اور سیدھی جمیل کے گھر کی طرف ...منے لگی۔ راستے میں فرخ نے چلتے ہوئے انسپکٹر منصور کو ...یکھا تو وہ چلتے ہوئے رک گیا۔ لیکن انسپکٹر منصور نے اسے ایسا اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے کام پر توجہ رکھے۔

کالونی کی جس سڑک پر انسپکٹر منصور کی کار جا رہی تھی اس کی دوسری طرف جمیل کی کار گٹر میں پھنسی ہوئی تھی۔ انسپکٹر منصور نے کار جمیل کے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور پیدل ہی گھر کے دروازے تک پہنچ گیا۔

اس نے دائیں بائیں کا جائزہ لیا اور دروازے کو ہلکا سا دھکا لگایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ انسپکٹر منصور فی الحال ...ل نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ گھوم کر گیٹ کی طرف چلا گیا۔ وہ دائیں بائیں دیکھتا ہوا گیٹ کے پاس گیا۔ اس نے گیٹ کو ہاتھ لگایا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ انسپکٹر منصور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اندر چلا گیا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اس نے مین دروازے کے پاس اندر کچھ سننے کی کوشش کی، جب کچھ سنائی نہ دیا تو اس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ اندر کے منظر نے اسے چونکا دیا۔

انسپکٹر منصور اندر چلا گیا۔ فرش پر وہ سارا سامان بکھرا ہوا تھا جو ضرغام نے اپنا بھیس بدلنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ وہ رومال بھی انسپکٹر منصور کی نظر سے نہیں بچ سکا تھا جس پر بے ہوشی کی دوا لگی ہوئی تھی۔ وہ سب دیکھ کر انسپکٹر منصور کے منہ سے نکلا۔

''شٹ...... اس کا مطلب ہے کہ ضرغام اس گھر میں تھا۔ جمیل کے ساتھ۔''

انسپکٹر منصور نے بیڈ روم میں جھانکا، اس نے غور سے اندر کا جائزہ لیا، کچھ دیر تک اس کی نگاہیں ایک جگہ ٹکی رہیں اور پھر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا اور جب وہ اسٹور روم میں گیا تو وہ چونک گیا۔ کیونکہ وہاں ایک لاش پڑی تھی۔ اس کے بعد انسپکٹر منصور نے ہاتھ میں ریوالور لے کر سارے گھر کی تلاشی لی اور اپنے موبائل فون سے کسی کا نمبر ملانے لگا۔ وہ تیزی سے اپنی کار کی طرف بھی جا رہا تھا۔

☆☆☆

جمیل اور نگہت ایک ساتھ کار سے باہر نکلے۔ انہوں نے دیکھا کہ کار کا ٹائر گٹر کے اندر تھا۔ جمیل نے دائیں بائیں دیکھا۔ سامنے دو پولیس کے اہلکار ان کی طرف آرہے تھے۔ دونوں نے کیونکہ وردی نہیں پہنی ہوئی تھی اس لیے جمیل کے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ پولیس والے ہیں۔ ان میں ایک فرخ تھا۔

جمیل گاڑی کو دیکھنے کے بہانے پیچھے ڈکی کے پاس چلا گیا۔ اور آہستہ سے بولا۔ ''گاڑی کا ٹائر گٹر میں چلا گیا ہے۔''

''جلدی سے نکالو۔'' ضرغام نے دانت پیسے۔

اس دوران وہ دونوں اہلکار ان کے پاس آگئے۔

''کیا ہوگیا ہے۔'' فرخ نے پوچھا۔

''ٹائر پھنس گیا ہے۔'' جمیل نے کہا۔

''کوئی بات نہیں ہم زور لگاتے ہیں۔'' دونوں کہہ کر جھکے اور پھر ان کے ساتھ جمیل بھی شامل ہوگیا اور تینوں نے زور لگا کر گاڑی کا وہ حصہ اوپر اٹھایا اور ٹائر مین ہول سے نکال کر سڑک پر رکھ دیا۔ اس دوران فرخ کا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے سیدھا ہوتے ہوئے موبائل فون نکالا اور کال سننے کے لیے ایک طرف چلا گیا۔

''آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔'' جمیل نے ممنون انداز میں کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ بولا۔

جمیل اور نگہت گاڑی میں بیٹھ گئے۔ فرخ، انسپکٹر منصور کی کال سن رہا تھا۔ اچانک فرخ کو لگا کہ جیسے گاڑی کی ڈکی کھلی ہوئی ہے۔ وہ کال سنتے ہوئے کار کی طرف بڑھنے لگا۔ خفیف رخنے سے ضرغام دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت کار اسٹارٹ ہوئی اور جیسے ہی کار آگے بڑھی، سامنے اسپیڈ بریکر تھا۔ اس کو عبور کرتے ہوئے کار کو ایک جھٹکا سا لگا اور ڈکی اوپر کو ہوئی اور فرخ نے دیکھا کہ اندر کوئی ہے۔ وہ چلایا۔

"رکو...... اپنی گاڑی روکو......"

جمیل نے بھی بیک مرر سے دیکھ لیا تھا کہ دونوں آدمی اس کے پیچھے بھاگے ہیں۔ اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ فرخ کے کان سے موبائل فون لگا ہوا تھا اس نے فوراً اس بات کی اطلاع انسپکٹر منصور کو کردی۔ انسپکٹر منصور اپنی کار میں بیٹھا اور کار ایک جھٹکے سے اس طرف بڑھا دی جس طرف کا فرخ نے کہا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر منصور طوفانی انداز میں کار لے کر وہاں پہنچا تو وہ دونوں اہلکار وہاں موجود تھے۔ انسپکٹر منصور کے کار روکتے ہی دونوں کار میں بیٹھ گئے۔

"انہوں نے ابھی گیٹ عبور کیا ہے......" فرخ نے بتایا۔ "ڈکی میں کوئی ہے۔"

"گاڑی چلانے والے مرد اور عورت کا حلیہ بتاؤ۔"

انسپکٹر منصور نے پوچھا تو فرخ دونوں کا حلیہ بتانے لگا۔ فرخ جو حلیہ بتا رہا تھا وہ جمیل اور نگہت جیسا تھا۔ انسپکٹر منصور نے ڈیش بورڈ کھول کر اندر سے وہ تینوں تصویریں نکال کر فرخ کی طرف بڑھا کر پوچھا۔

"وہ حلیے والا اس تصویر میں ہے کیا۔"

فرخ نے تصویروں کو دیکھا اور پھر جمیل کی تصویر دیکھتے ہی وہ چلایا۔ "یہ کار چلا رہا تھا......"

"ان تصویروں کو ڈیش بورڈ میں رکھ دو۔" انسپکٹر منصور نے کہا اور سڑک پر اس کی کار کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ ان کی متلاشی نگاہیں اس نمبر کی کار کو تلاش کر رہی تھیں جو فرخ نے بتایا تھا۔ انسپکٹر منصور کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا کہ جمیل اور نگہت کب سے ضرغام کی دنیا کا حصہ ہیں؟

پورے شہر کی پولیس کو اس نمبر کی گاڑی کی اطلاع ہوگئی تھی۔ انسپکٹر منصور کی ہدایت پر گاڑی کے مالک کا پتا چلا لیا تھا۔ پولیس والے جمیل کے منیجر تک پہنچ گئے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ گاڑی جمیل نے اپنے گھر پر منگوائی تھی۔

انسپکٹر منصور کو رپورٹ ہوگئی تھی۔ انسپکٹر منصور نے سوچا کہ جمیل کے پاس اپنی ذاتی کار ہے پھر اس نے اپنے منیجر کی کار کیوں منگوائی تھی۔ کہیں اس کی اپنی کار کسی اور کام میں مصروف تو نہیں ہے؟ نگہت بھی تو جمیل کی کار میں بیٹھ کر کومل کو لے کر جا رہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ نگہت نے بتایا تھا کہ انہیں گاڑی سمیت اغوا کرلیا ہے۔ اس دوران کالی کا فون آگیا۔ اس نے پوچھا۔ "پیسوں کا انتظام ہوگیا ہے۔"

دروازے کی گھنٹی بجی۔ خانم نے دروازہ کھولا تو دو نوجوان شانوں پر تھیلے لٹکائے نظر آئے۔ وہ کپڑے دھونے کا پاؤڈر بیچنے آئے تھے۔ خانم نے انکار کر کے غصے سے دروازہ بند کیا مگر دروازہ پوری طرح بند نہ ہوا۔

انہوں نے دوبارہ ذرا زور دے کر دروازہ بند کرنا چاہا ایک نوجوان نے منہ سے بلی کی آواز نکالی، دروازہ پھر بھی قدرے کھلا رہا۔

خانم نے تیسری بار دروازے پر طبع آزمائی کرتے ہوئے نیچے نظر ڈالی تو دیکھا کہ ایک نوجوان نے اپنا جوتا دروازے میں اڑایا ہوا تھا۔ دروازہ دبتے ہی نوجوان نے پھر بلی کی آواز نکال کر خانم کو چڑایا۔

وہ برہم ہو کر غرائیں۔ "یہ کیا حرکت ہے، اپنا جوتا ہٹاؤ ورنہ میں کچل دوں گی۔ اور یہ تم بلی کی آوازیں کیوں نکال رہے ہو؟"

"محترمہ! یہ آوازیں میں نہیں، آپ کی بلی نکال رہی ہے جسے میں نے اپنا جوتا پھنسا کر کچلنے سے بچایا ہوا ہے...... اسے ہٹالیں، دروازہ بند ہوجائے گا ورنہ وہ بے چاری دروازے میں دب کر مرجائے گی!"

سلمیٰ آغا، نواب شاہ

"ہاں ہوگیا ہے۔" انسپکٹر منصور نے بلا تامل کہہ دیا۔

"زبردست...... وہ پیسے مجھے پہنچا دو۔"

"کہاں پہنچانے ہیں؟" انسپکٹر منصور اس کی بات بڑے انہماک سے سن رہا تھا۔ اور اس نے کار کے شیشے بھی چڑھا دیے تھے۔

"تم سول اسپتال کے مین دروازے پر پہنچو۔" کالی نے کہہ کر فون بند کرنا چاہا۔

"کیا تم سول اسپتال کے گیٹ کے پاس ہو؟" انسپکٹر منصور نے پوچھا۔

"ہاں ہوں۔ تم ابھی پیسے لے کر پہنچو۔" اس نے جلدی سے کہہ کر فون بند کردیا۔

انسپکٹر منصور نے کار ایک طرف روکی اور ایک کاغذ پر

ا ی ی ا ر سے ٹکراتی، جمیل نے فوراً اسٹیئرنگ گھمایا، وہ
ار بھی اپنے آپ کو بچاتے ہوئے نکل گیا لیکن
ا ی ی ا ر کا دایاں ٹائر مین ہول کے اوپر پڑا تو مین ہول کا
ڈھکن ایک دھماکے سے ٹوٹ گیا اور کار کا وہ پہیا مین
ہول کے اندر جا پڑا۔ پوری کار میں ہلچل برپا ہوگئی۔ ضرغام
نے اگر ڈکی کو سنبھالا نہ ہوتا تو جس طرح سے جھٹکا لگا تھا ڈکی
ہو جاتی۔ وہ حیران تھے کہ اچانک کیا ہوگیا جبکہ جمیل اور
کے لیے ان سے بھی زیادہ پریشان کن بات تھی کہ اگر
جگہ کوئی گڑبڑ ہوگئی تو سفاک ضرغام، کومل کو جان سے مار
گا۔

☆☆☆

انسپکٹر منصور کی کار ہوا سے باتیں کرتی ہوئی اس کالونی کے گیٹ تک پہنچی جہاں جمیل کا گھر تھا۔ انسپکٹر منصور کی کار گیٹ سے داخل ہوئی اور سیدھی جمیل کے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ راستے میں فرخ نے چلتے ہوئے انسپکٹر منصور کو دیکھا تو وہ چلتے ہوئے رک گیا۔ لیکن انسپکٹر منصور نے اسے ایسا اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے کام پر توجہ رکھے۔

کالونی کی جس سڑک پر انسپکٹر منصور کی کار جا رہی تھی اس کی دوسری طرف جمیل کی کار گٹر میں پھنسی ہوئی تھی۔ انسپکٹر منصور نے کار جمیل کے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور پیدل ہی گھر کے دروازے تک پہنچ گیا۔

اس نے دائیں بائیں کا جائزہ لیا اور دروازے کو ہلکا سا دھکا لگایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ انسپکٹر منصور فی الحال دخل نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ گھوم کر گیٹ کی طرف چلا گیا۔ وہ دائیں بائیں دیکھتا ہوا گیٹ کے پاس گیا۔ اس نے گیٹ کو ہاتھ لگایا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ انسپکٹر منصور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اندر چلا گیا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اس نے مین دروازے کے پاس اندر کچھ سننے کی کوشش کی، جب کچھ سنائی نہ دیا تو اس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ اندر کے منظر نے اسے چونکا دیا۔

انسپکٹر منصور اندر چلا گیا۔ فرش پر وہ سارا سامان بکھرا ہوا تھا جو ضرغام نے اپنا بھیس بدلنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ وہ رومال بھی انسپکٹر منصور کی نظر سے نہیں بچ سکا تھا جس پر بے ہوشی کی دوا لگی ہوئی تھی۔ وہ سب دیکھ کر انسپکٹر منصور کے منہ سے نکلا۔

"شٹ...... اس کا مطلب ہے کہ ضرغام اس گھر میں تھا۔ جمیل کے ساتھ۔"

انسپکٹر منصور نے بیڈروم میں جھانکا، اس نے غور سے اندر کا جائزہ لیا، کچھ دیر تک اس کی نگاہیں ایک جگہ ٹکی رہیں اور پھر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا اور جب وہ اسٹور روم میں گیا تو وہ چونک گیا۔ کیونکہ وہاں ایک لاش پڑی تھی۔ اس کے بعد انسپکٹر منصور نے ہاتھ میں ریوالور لے کر سارے گھر کی تلاشی لی اور اپنے موبائل فون سے کسی کا نمبر ملانے لگا۔ وہ تیزی سے اپنی کار کی طرف بھی جا رہا تھا۔

☆☆☆

جمیل اور نگہت ایک ساتھ کار سے باہر نکلے۔ انہوں نے دیکھا کہ کار کا ٹائر گٹر کے اندر تھا۔ جمیل نے دائیں بائیں دیکھا۔ سامنے دو پولیس کے اہلکاران کی طرف آرہے تھے۔ دونوں نے کیونکہ وردی نہیں پہنی ہوئی تھی اس لیے جمیل کے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ پولیس والے ہیں۔ ان میں ایک فرخ تھا۔

جمیل گاڑی کو دیکھنے کے بہانے پیچھے ڈکی کے پاس چلا گیا۔ اور آہستہ سے بولا۔ "گاڑی کا ٹائر گٹر میں چلا گیا ہے۔"

"جلدی سے نکالو۔" ضرغام نے دانت پیسے۔

اس دوران وہ دونوں اہلکار ان کے پاس آگئے۔

"کیا ہوگیا ہے۔" فرخ نے پوچھا۔

"ٹائر پھنس گیا ہے۔" جمیل نے کہا۔

"کوئی بات نہیں ہم زور لگاتے ہیں۔" دونوں کہہ کر جھکے اور پھر ان کے ساتھ جمیل بھی شامل ہوگیا اور تینوں نے زور لگا کر گاڑی کا وہ حصہ اوپر اٹھایا اور ٹائر مین ہول سے نکال کر سڑک پر رکھ دیا۔ اس دوران فرخ کا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے سیدھا ہوتے ہوئے موبائل فون نکالا اور کال سننے کے لیے ایک طرف چلا گیا۔

"آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔" جمیل نے ممنون انداز میں کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔

جمیل اور نگہت گاڑی میں بیٹھ گئے۔ فرخ، انسپکٹر منصور کی کال سن رہا تھا۔ اچانک فرخ کو لگا کہ جیسے گاڑی کی ڈکی کھلی ہوئی ہے۔ وہ کال سنتے ہوئے کار کی طرف بڑھنے لگا۔ خفیف رخنے سے ضرغام دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت کار اسٹارٹ ہوئی اور جیسے ہی کار آگے بڑھی، سامنے اسپیڈ بریکر تھا۔ اس کو عبور کرتے ہوئے کار کو ایک جھٹکا سا لگا اور ڈکی اوپر کو ہوئی اور فرخ نے دیکھا کہ اندر کوئی ہے۔ وہ چلّایا۔

''رکو......اپنی گاڑی روکو......''

جمیل نے بھی بیک مرر سے دیکھ لیا تھا کہ دونوں آدمی اس کے پیچھے بھاگے ہیں۔ اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ فرخ کے کان سے موبائل فون لگا ہوا تھا اس نے فوراً اس بات کی اطلاع انسپکٹر منصور کو کردی۔ انسپکٹر منصور اپنی کار میں بیٹھا اور کار ایک جھٹکے سے اس طرف بڑھا دی جس طرف کا فرخ نے کہا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر منصور طوفانی انداز میں کار لے کر وہاں پہنچا تو وہ دونوں اہلکار وہاں موجود تھے۔ انسپکٹر منصور کے کار روکتے ہی دونوں کار میں بیٹھ گئے۔

''انہوں نے ابھی گیٹ عبور کیا ہے......'' فرخ نے بتایا۔ ''ڈکی میں کوئی ہے۔''

''گاڑی چلانے والے مرد اور عورت کا حلیہ بتاؤ۔'' انسپکٹر منصور نے پوچھا تو فرخ دونوں کا حلیہ بتانے لگا۔ فرخ جو حلیہ بتا رہا تھا وہ جمیل اور نگہت جیسا تھا۔ انسپکٹر منصور نے ڈیش بورڈ کھول کر اندر سے وہ تینوں تصویریں نکال کر فرخ کی طرف بڑھا کر پوچھا۔

''وہ حلیے والا اس تصویر میں ہے کیا۔''

فرخ نے تصویروں کو دیکھا اور پھر جمیل کی تصویر دیکھتے ہی وہ چلایا۔ ''یہ کار چلا رہا تھا......''

''ان تصویروں کو ڈیش بورڈ میں رکھ دو۔'' انسپکٹر منصور نے کہا اور سڑک پر اس کی کار کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ ان کی متلاشی نگاہیں اس نمبر کی کار کو تلاش کر رہی تھیں جو فرخ نے بتایا تھا۔ انسپکٹر منصور کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا کہ جمیل اور نگہت کب سے ضرغام کی دنیا کا حصہ ہیں؟

پورے شہر کی پولیس کو اس نمبر کی گاڑی کی اطلاع ہوگئی تھی۔ انسپکٹر منصور کی ہدایت پر گاڑی کے مالک کا پتا چلا لیا تھا۔ پولیس والے جمیل کے منیجر تک پہنچ گئے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ گاڑی جمیل نے اپنے گھر پر منگوائی تھی۔

انسپکٹر منصور کو رپورٹ ہوگئی تھی۔ انسپکٹر منصور نے سوچا کہ جمیل کے پاس اپنی ذاتی کار ہے پھر اس نے اپنے منیجر کی کار کیوں منگوائی تھی۔ کہیں اس کی اپنی کار کسی اور کام میں مصروف تو نہیں ہے؟ نگہت بھی تو جمیل کی کار میں بیٹھ کر کومل کو لے کر جا رہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ نگہت نے بتایا تھا کہ انہیں گاڑی سمیت اغوا کرلیا ہے۔ اس دوران کالی کا فون آگیا۔ اس نے پوچھا۔ ''پیسوں کا انتظام ہوگیا ہے۔''

دروازے کی گھنٹی بجی۔ خانم نے دروازہ کھولا تو دو نوجوان شانوں پر تھیلے لٹکائے نظر آئے۔ وہ کپڑے دھونے کا پاؤڈر بیچنے آئے تھے۔ خانم نے انکار کر کے غصے سے دروازہ بند کیا مگر دروازہ پوری طرح بند نہ ہوا۔

انہوں نے دوبارہ ذرا زور دے کر دروازہ بند کرنا چاہا ایک نوجوان نے منہ سے بلی کی آواز نکالی، دروازہ پھر بھی قدرے کھلا رہا۔

خانم نے تیسری بار دروازے پر طبع آزمائی کرتے ہوئے نیچے نظر ڈالی تو دیکھا کہ ایک نوجوان نے اپنا جوتا دروازے میں اڑایا ہوا تھا۔ دروازہ دبتے ہی نوجوان نے پھر بلی کی آواز نکال کر خانم کو چڑایا۔

وہ برہم ہو کر غرائیں۔ ''یہ کیا حرکت ہے، اپنا جوتا ہٹاؤ ورنہ میں کچل دوں گی۔ اور یہ تم بلی کی آوازیں کیوں نکال رہے ہو؟''

''محترمہ! یہ آوازیں میں نہیں، آپ کی بلی نکال رہی ہے جسے میں نے اپنا جوتا پھنسا کر کچلنے سے بچایا ہوا ہے......اسے ہٹالیں، دروازہ بند ہوجائے گا ورنہ وہ بے چاری دروازے میں دب کر مرجائے گی!''

سلمیٰ آغا، نواب شاہ

''ہاں ہوگیا ہے۔'' انسپکٹر منصور نے بلا تامل کہہ دیا۔

''زبردست......وہ پیسے مجھے پہنچادو۔''

''کہاں پہنچانے ہیں؟'' انسپکٹر منصور اس کی بات بڑے انہماک سے سن رہا تھا۔ اور اس نے کار کے شیشے بھی چڑھا دیے تھے۔

''تم سول اسپتال کے مین دروازے پر پہنچو۔'' کالی نے کہہ کر فون بند کرنا چاہا۔

''کیا تم سول اسپتال کے گیٹ کے پاس ہو؟'' انسپکٹر منصور نے پوچھا۔

''ہاں ہوں۔ تم ابھی پیسے لے کر پہنچو۔'' اس نے جلدی سے کہہ کر فون بند کردیا۔

انسپکٹر منصور نے کار ایک طرف روکی اور ایک کاغذ پر

[illegible] سے ٹکراتی، جمیل نے فوراً اسٹیئرنگ گھمایا، وہ [illegible] بھی اپنے آپ کو بچاتے ہوئے نکل گیا لیکن [illegible] دایاں ٹائر مین ہول کے اوپر پڑا تو مین ہول کا [illegible] ایک دھماکے سے ٹوٹ گیا اور کار کا وہ پہیا مین [illegible] کے اندر جا پڑا۔ پوری کار میں ہلچل برپا ہوگئی۔ ضرغام [illegible] اگر ڈکی کو سنبھالا نہ ہوتا تو جس طرح سے جھٹکا لگا تھا ڈکی [illegible] جاتی۔ وہ حیران تھے کہ اچانک کیا ہوگیا جبکہ جمیل اور [illegible] کے لیے ان سے بھی زیادہ پریشان کن بات تھی کہ اگر [illegible] کوئی گڑبڑ ہوگئی تو سفاک ضرغام، کومل کو جان سے مار [illegible] گا۔

☆☆☆

انسپکٹر منصور کی کار ہوا سے باتیں کرتی ہوئی اس کالونی [illegible] گیٹ تک پہنچی جہاں جمیل کا گھر تھا۔ انسپکٹر منصور کی کار گیٹ سے داخل ہوئی اور سیدھی جمیل کے گھر کی طرف [illegible] منے لگی۔ راستے میں فرخ نے چلتے ہوئے انسپکٹر منصور کو [illegible] یکھا تو وہ چلتے ہوئے رک گیا۔ لیکن انسپکٹر منصور نے اسے ایسا اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے کام پر توجہ [illegible] کھے۔

کالونی کی جس سڑک پر انسپکٹر منصور کی کار جا رہی تھی اس کی دوسری طرف جمیل کی کار گٹر میں پھنسی ہوئی تھی۔ انسپکٹر منصور نے کار جمیل کے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور پیدل ہی گھر کے دروازے تک پہنچ گیا۔

اس نے دائیں بائیں کا جائزہ لیا اور دروازے کو ہلکا سا دھکا لگایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ انسپکٹر منصور فی الحال [illegible] نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ گھوم کر گیٹ کی طرف چلا گیا۔ وہ [illegible] ائیں بائیں دیکھتا ہوا گیٹ کے پاس گیا۔ اس نے گیٹ کو ہاتھ لگایا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ انسپکٹر منصور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اندر چلا گیا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اس نے مین دروازے [illegible] کے پاس اندر کچھ سننے کی کوشش کی، جب کچھ سنائی نہ دیا تو اس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ اندر کے منظر نے اسے چونکا دیا۔

انسپکٹر منصور اندر چلا گیا۔ فرش پر وہ سارا سامان بکھرا ہوا تھا جو ضرغام نے اپنا بھیس بدلنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ وہ رومال بھی انسپکٹر منصور کی نظر سے نہیں بچ سکا تھا جس پر بے ہوشی کی دوا لگی ہوئی تھی۔ وہ سب دیکھ کر انسپکٹر منصور کے منہ سے نکلا۔

''شٹ...... اس کا مطلب ہے کہ ضرغام اس گھر میں تھا۔ جمیل کے ساتھ۔''

انسپکٹر منصور نے بیڈروم میں جھانکا، اس نے غور سے اندر کا جائزہ لیا، کچھ دیر تک اس کی نگاہیں ایک جگہ ٹکی رہیں اور پھر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا اور جب وہ اسٹور روم میں گیا تو وہ چونک گیا۔ کیونکہ وہاں ایک لاش پڑی تھی۔ اس کے بعد انسپکٹر منصور نے ہاتھ میں ریوالور لے کر سارے گھر کی تلاشی لی اور اپنے موبائل فون سے کسی کا نمبر ملانے لگا۔ وہ تیزی سے اپنی کار کی طرف بھی جا رہا تھا۔

☆☆☆

جمیل اور نگہت ایک ساتھ کار سے باہر نکلے۔ انہوں نے دیکھا کہ کار کا ٹائر گٹر کے اندر تھا۔ جمیل نے دائیں بائیں دیکھا۔ سامنے دو پولیس کے اہلکاران کی طرف آ رہے تھے۔ دونوں نے کیونکہ وردی نہیں پہنی ہوئی تھی اس لیے جمیل کے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ پولیس والے ہیں۔ ان میں ایک فرخ تھا۔

جمیل گاڑی کو دیکھنے کے بہانے پیچھے ڈکی کے پاس چلا گیا۔ اور آہستہ سے بولا۔ ''گاڑی کا ٹائر گٹر میں چلا گیا ہے۔''

''جلدی سے نکالو۔'' ضرغام نے دانت پیسے۔

اس دوران وہ دونوں اہلکار ان کے پاس آ گئے۔

''کیا ہوگیا ہے۔'' فرخ نے پوچھا۔

''ٹائر پھنس گیا ہے۔'' جمیل نے کہا۔

''کوئی بات نہیں ہم زور لگاتے ہیں۔'' دونوں کہہ کر جھکے اور پھر ان کے ساتھ جمیل بھی شامل ہوگیا اور تینوں نے زور لگا کر گاڑی کا وہ حصہ اوپر اٹھایا اور ٹائر مین ہول سے نکال کر سڑک پر رکھ دیا۔ اس دوران فرخ کا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے سیدھا ہوتے ہوئے موبائل فون نکالا اور کال سننے کے لیے ایک طرف چلا گیا۔

''آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔'' جمیل نے ممنون انداز میں کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ بولا۔

جمیل اور نگہت گاڑی میں بیٹھ گئے۔ فرخ، انسپکٹر منصور کی کال سن رہا تھا۔ اچانک فرخ کو لگا کہ جیسے گاڑی کی ڈکی کھلی ہوئی ہے۔ وہ کال سنتے ہوئے کار کی طرف بڑھنے لگا۔ خفیف رخنے سے ضرغام دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت کار اسٹارٹ ہوئی اور جیسے ہی کار آگے بڑھی، سامنے اسپیڈ بریکر تھا۔ اس کو عبور کرتے ہوئے کار کو ایک جھٹکا سا لگا اور ڈکی اوپر کو ہوئی اور فرخ نے دیکھا کہ اندر کوئی ہے۔ وہ چلایا۔

"رکو...... اپنی گاڑی روکو......"

جمیل نے بھی بیک مرر سے دیکھ لیا تھا کہ دونوں آدمی اس کے پیچھے بھاگے ہیں۔ اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ فرخ کے کان سے موبائل فون لگا ہوا تھا اس نے فوراً اس بات کی اطلاع انسپکٹر منصور کو کردی۔ انسپکٹر منصور اپنی کار میں بیٹھا اور کار ایک جھٹکے سے اس طرف بڑھا دی جس طرف کا فرخ نے کہا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر منصور طوفانی انداز میں کار لے کر وہاں پہنچا تو وہ دونوں اہلکار وہاں موجود تھے۔ انسپکٹر منصور کے کار روکتے ہی دونوں کار میں بیٹھ گئے۔

"انہوں نے ابھی گیٹ عبور کیا ہے......" فرخ نے بتایا۔ "ڈکی میں کوئی ہے۔"

"گاڑی چلانے والے مرد اور عورت کا حلیہ بتاؤ۔"

انسپکٹر منصور نے پوچھا تو فرخ دونوں کا حلیہ بتانے لگا۔ فرخ جو حلیہ بتا رہا تھا وہ جمیل اور نگہت جیسا تھا۔ انسپکٹر منصور نے ڈیش بورڈ کھول کر اندر سے وہ تینوں تصویریں نکال کر فرخ کی طرف بڑھا کر پوچھا۔

"وہ حلیے والا اس تصویر میں ہے کیا۔"

فرخ نے تصویروں کو دیکھا اور پھر جمیل کی تصویر دیکھتے ہی وہ چلایا۔ "یہ کار چلا رہا تھا......"

"ان تصویروں کو ڈیش بورڈ میں رکھ دو۔" انسپکٹر منصور نے کہا اور سڑک پر اس کی کار کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ ان کی متلاشی نگاہیں اس نمبر کی کار کو تلاش کر رہی تھیں جو فرخ نے بتایا تھا۔ انسپکٹر منصور کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا کہ جمیل اور نگہت کب سے ضرغام کی دنیا کا حصہ ہیں؟

پورے شہر کی پولیس کو اس نمبر کی گاڑی کی اطلاع ہوگئی تھی۔ انسپکٹر منصور کی ہدایت پر گاڑی کے مالک کا پتا چلا لیا تھا۔ پولیس والے جمیل کے منیجر تک پہنچ گئے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ گاڑی جمیل نے اپنے گھر پر منگوائی تھی۔

انسپکٹر منصور کو رپورٹ ہوگئی تھی۔ انسپکٹر منصور نے سوچا کہ جمیل کے پاس اپنی ذاتی کار ہے پھر اس نے اپنے منیجر کی کار کیوں منگوائی تھی۔ کہیں اس کی اپنی کار کسی اور کام میں مصروف تو نہیں ہے؟ نگہت بھی تو جمیل کی کار میں بیٹھ کر کومل کو لے کر جارہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ نگہت نے بتایا تھا کہ انہیں گاڑی سمیت اغوا کرلیا ہے۔ اس دوران کالی کا فون آگیا۔ اس نے پوچھا۔ "پیسوں کا انتظام ہوگیا ہے۔"

دروازے کی گھنٹی بجی۔ خانم نے دروازہ کھولا تو دو نوجوان شانوں پر تھیلے لٹکائے نظر آئے۔ وہ کپڑے دھونے کا پاؤڈر بیچنے آئے تھے۔ خانم نے انکار کر کے غصے سے دروازہ بند کیا مگر دروازہ پوری طرح بند نہ ہوا۔

انہوں نے دوبارہ ذرا زور دے کر دروازہ بند کرنا چاہا ایک نوجوان نے منہ سے بلی کی آواز نکالی، دروازہ پھر بھی قدرے کھلا رہا۔

خانم نے تیسری بار دروازے پر طبع آزمائی کرتے ہوئے نیچے نظر ڈالی تو دیکھا کہ ایک نوجوان نے اپنا جوتا دروازے میں اڑایا ہوا تھا۔ دروازہ دبتے ہی نوجوان نے پھر بلی کی آواز نکال کر خانم کو چڑایا۔

وہ برہم ہو کر غرائیں۔ "یہ کیا حرکت ہے، اپنا جوتا ہٹاؤ ورنہ میں کچل دوں گی۔ اور یہ تم بلی کی آوازیں کیوں نکال رہے ہو؟"

"محترمہ! یہ آوازیں میں نہیں، آپ کی بلی نکال رہی ہے جسے میں نے اپنا جوتا پھنسا کر کچلنے سے بچایا ہوا ہے...... اسے ہٹالیں، دروازہ بند ہوجائے گا ورنہ وہ بے چاری دروازے میں دب کر مرجائے گی!"

سلمیٰ آغا، نواب شاہ

"ہاں ہوگیا ہے۔" انسپکٹر منصور نے بلا تامل کہہ دیا۔

"زبردست...... وہ پیسے مجھے پہنچادو۔"

"کہاں پہنچانے ہیں؟" انسپکٹر منصور اس کی بات بڑے انہماک سے سن رہا تھا۔ اور اس نے کار کے شیشے بھی چڑھا دیے تھے۔

"تم سول اسپتال کے مین دروازے پر پہنچو۔" کالی نے کہہ کر فون بند کرنا چاہا۔

"کیا تم سول اسپتال کے گیٹ کے پاس ہو؟" انسپکٹر منصور نے پوچھا۔

"ہاں ہوں۔ تم ابھی پیسے لے کر پہنچو۔" اس نے جلدی سے کہہ کر فون بند کردیا۔

انسپکٹر منصور نے کار ایک طرف روکی اور ایک کاغذ پر

پھر وہ کاغذ فرخ کی طرف بڑھا کر ایک ہدایت کی اور کار سے باہر نکل کر تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔

...ری طرف جاتے ہوئے اس نے اپنے موبائل فون سے ...ں کو کال کر کے موبائل فون کان سے لگالیا۔ انسپکٹر منصور ...نے کار آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

ضرغام نے ڈکی کے اندر ریوالور کا دستہ اتنے زور سے مارنا شروع کیا کہ جمیل نے کار کی رفتار آہستہ کر دی اور پھر ایک طرف کار روک دی۔

ان کی کار اس وقت کینال روڈ پر ایک طرف کھڑی تھی۔ ٹریفک رواں دواں تھی۔ باہر کا جائزہ لیتے ہوئے ضرغام نے سوچا کہ اس جگہ باہر نکلنا ممکن نہیں ہے۔ جمیل بھی اس انداز میں پیچھے آگیا جیسے وہ کار کے اس حصے کو چیک کر رہا ہو۔ اندر سے ضرغام نے حکم دیا۔

''کار کسی ویران سی گلی، یا سڑک پر لے جاؤ، جلدی کرو۔ کسی چوراہے کی طرف مت لے کر جانا۔''

کار میں بیٹھ کر جمیل نے کار اس جگہ سے ایک دوسری سڑک پر ڈال دی اور وہاں سے وہ ایسی گلی میں چلا گیا جہاں سے گزر شاذ و نادر تھا۔ ہلکے سے رکنے سے جائزہ لینے کے بعد ضرغام اور سکندر ڈکی سے باہر نکل آئے۔ سکندر نے کومل کو اٹھایا ہوا تھا۔

''جلدی سے ٹیکسی لے کر آؤ'' ضرغام کہہ کر بونٹ کی طرف بڑھا اور اس نے بونٹ کھول لیا۔ جیسے کار میں خرابی پیدا ہو گئی ہو۔ سکندر، کومل کو لے کر کار میں بیٹھ گیا پھر اس نے نگہت کو بھی کار میں بیٹھنے کے لیے کہا، وہ بھی کار میں بیٹھ گئی۔ جبکہ جمیل پھر سڑک کی طرف چلا گیا۔

جب تک جمیل ٹیکسی نہیں لے آیا۔ ضرغام بونٹ کھول کر انجن پر ایسے ہی جھکا رہا جیسے وہ کار کا نقص دور کر رہا ہو۔ ٹیکسی کے آتے ہی اس نے سکندر کو اشارہ کیا۔ جمیل کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔

''اپنی بیوی کو لے کر چپ چاپ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ۔''

وہ چاروں ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

''ہم شہر گھومنا چاہتے ہیں۔ ایسا کرو کہ پہلے ہمیں اس شہر کی اچھی عمارتیں دکھاؤ'' ضرغام نے کہا اور ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ سکندر بیٹھا تھا۔ اس نے بیٹھنے سے پہلے بے ہوش کومل کو نگہت کے حوالے کر دیا تھا۔ نگہت کی دانست میں کومل سوئی ہوئی تھی۔ پیچھے ضرغام، جمیل ...ت بیٹھے تھے۔ ٹیکسی شہر کی سڑکوں پر چلنے

لگی تھی۔ ضرغام سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ نگہت کے فون سے کالی کی کال آگئی۔ ضرغام نے فون کان سے لگا کر آہستہ آواز میں بات کی۔

''ہاں بولو۔''

''اس نے پیسوں کا انتظام کر لیا ہے۔ میں نے اسے سول اسپتال پہنچنے کے لیے کہا ہے۔''

''اب تم سب کچھ چھوڑ کر میرے پاس پہنچو۔ کھیل بگڑ چکا ہے۔'' ضرغام نے ہدایت کی۔

''میں کہاں آؤں، اسی گھر میں؟''

''وہ ہم نے چھوڑ دیا ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟''

''میں گھومتے ہوئے ریلوے اسٹیشن آگیا تھا۔ کار پارکنگ میں کھڑی کر کے اندر گھوم پھر رہا ہوں۔''

''ہم بھی وہاں پہنچتے ہیں۔ کوئی ٹرین لے کر نکل جائیں گے۔''

''بہتر ہے آپ یہاں نہ آئیں۔ یقیناً پولیس کے آدمی اس جگہ بھی موجود ہوں گے۔ ابھی پانچ منٹ کے بعد کراچی کے لیے ایک ٹرین نکل رہی ہے۔ وہ ٹھیک پچاس منٹ کے بعد نور پور جنکشن پر پہنچے گی۔ اس جگہ وہ پندرہ منٹ رکے گی۔ آپ کار سے اس جگہ پہنچ جائیں۔ وہاں سے ٹرین میں سوار ہو کر کراچی چلے جائیں۔''

''یہ اچھا آئیڈیا ہے۔ تم گاڑی لے کر عجائب گھر کی عمارت کے سامنے آجاؤ۔''

''میں گاڑی لے کر وہاں پہنچتا ہوں۔ جمیل ساتھ ہی ہے ناں۔''

''وہ ساتھ ہی ہے۔ تمہارے پاس گاڑی بھی اسی کی ہے۔ ہم آسانی سے وہاں پہنچ جائیں گے۔''

''میں آرہا ہوں۔'' کالی نے فون بند کرتے ہی نگہت کا فون آف کیا اور ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے چپکے سے موبائل فون ڈسٹ بن میں پھینک کر باہر نکل گیا۔ جیسے ہی وہ پارکنگ میں کھڑی کار میں بیٹھا وہ یکدم چونک گیا۔

☆☆☆

جمیل کے منیجر کی کار کے پاس پولیس پہنچ گئی تھی۔ انسپکٹر منصور کو بھی اس کی اطلاع کر دی تھی۔ وہ اس وقت اپنی کار سڑک کے کنارے کھڑی کیے اندر بیٹھا تھا۔ اچانک اس کے موبائل فون پر فرخ کی کال آئی اور دوسری طرف سے وہ غور سے بات سننے لگا۔ جب اس نے اپنی بات مکمل کر لی تو انسپکٹر منصور کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی۔

☆☆☆

وہ ٹیکسی پندرہ منٹ سے عجائب گھر کی عمارت سے کچھ آگے ایک طرف کھڑی تھی۔ ضرغام مضطرب کالی کا انتظار کررہا تھا۔ اس جگہ سے ریلوے اسٹیشن دور نہیں تھا اور کالی کو اس جگہ پہنچنے میں اتنا وقت نہیں لینا چاہیے تھا۔

نگہت کو تشویش تھی کہ کومل اتنی گہری نیند کیسے سوسکتی ہے۔ وہ اس کو ہلا رہی تھی۔ نگہت کے چہرے پر پریشانی عیاں تھی۔

''اسے کیا ہوگیا ہے۔ یہ اتنی دیر تک اتنی گہری نیند نہیں سوسکتی...... اسے کیا ہوگیا ہے......؟'' نگہت پریشانی کے عالم میں بولنے لگی۔

''اسے کچھ نہیں ہوا، یہ سورہی ہے۔'' سکندر نے کہا۔

''یہ سونہیں رہی...... اسے کچھ ہوگیا ہے......'' نگہت چلائی۔ جمیل بھی دیکھنے لگا۔ ضرغام کو کالی کے نہ پہنچنے کی پریشانی تھی۔

''کسی ڈاکٹر کے پاس چلو...... ٹیکسی کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو......'' نگہت نے چلاتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ ضرغام جو پہلے ہی کالی کے انتظار میں پہلو بدل رہا تھا اس نے یکدم سے ریوالور نکالا اور نگہت پر تان کر چلایا۔

''بند کرو شور...... کچھ نہیں ہوا اسے......''

نگہت سہم کر چپ ہوگئی اور ڈرائیور کے ریوالور دیکھ کر اوسان خطا ہوگئے۔ ضرغام کو بھی یکدم سے احساس ہوا کہ اس نے ڈرائیور کے سامنے ریوالور نکال لیا ہے۔ اس نے ایک نظر ڈرائیور کی طرف دیکھا جو گردن گھما کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک دم سے ضرغام کی نگاہیں اپنی طرف دیکھ کر اس نے جلدی سے گردن دوسری طرف کرلی۔ وہ بھی ڈر گیا تھا۔

''کالی ابھی تک نہیں پہنچا......'' سکندر نے بول کر خاموشی توڑی۔ ''وہ اتنی دیر نہیں کرسکتا...... ٹیکسی آگے لے جاؤ اور آگے سے یوٹرن لے کر واپس اس جگہ آؤ۔'' ضرغام نے کہا تو ڈرائیور نے کانپتے ہاتھوں سے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور آہستہ رفتار میں آگے لے گیا۔ آگے سے یوٹرن لے کر واپس اسی سڑک پر آکر اسی جگہ ٹیکسی رک گئی۔ اچانک ایک کار آگے آکر رکی اور اندر سے انسپکٹر منصور باہر نکلا۔

جونہی ٹیکسی کے اندر بیٹھے ان چاروں نے انسپکٹر منصور کو دیکھا وہ دنگ رہ گئے۔ ضرغام نے ایک جھٹکے سے کومل کو نگہت کی گود سے کھینچا اور ریوالور ان پر تان کر چلایا۔

''باہر نکلو تم دونوں...... جلدی ورنہ اسے ماردوں گا......'' نگہت اور جمیل فوراً ٹیکسی سے باہر نکل گئے۔

''ٹیکسی بھگا کر لے جاؤ......'' ضرغام نے چلا کر اگلا حکم ٹیکسی ڈرائیور کو دیا۔ تب تک پیچھے سے آکر ایک پولیس والے نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور ضرغام کو پکڑ لیا۔ اس دوران سکندر نے اپنا پستول نکال لیا۔ لیکن اس کا چہرہ ضرغام کی طرف تھا اس لیے اسے یہ پتا نہیں چل سکا کہ اس کی طرف کا دروازہ کھلتے ہی ایک صحت مند شخص نے اسے اپنی گرفت میں کرلیا ہے۔

☆☆☆

ضرغام اور اس کے دونوں ساتھی گرفتار ہوگئے تھے۔ سب کچھ واضح ہوگیا تھا کہ جمیل اور نگہت کیسے اس کے چنگل میں آگئے تھے۔ ایک سوال سب کے دماغ میں تھا یہاں تک کہ ضرغام بھی سوچ رہا تھا کہ اچانک انسپکٹر منصور ان تک کیسے پہنچ گیا۔

تب انسپکٹر منصور نے مسکراتے ہوئے انکشاف کیا۔

''جب مجھے کالی کی کال آئی کہ رقم لے کر سول اسپتال کے گیٹ کے پاس پہنچوں تو مجھے کچھ شک ہوا۔ کیونکہ جب وہ بات کررہا تھا تو اس وقت بیک گراؤنڈ سے ٹرین کے تیز ہارن کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ریلوے اسٹیشن پر ہی کہیں ہے۔ میں نے فرخ کو جمیل کی گاڑی کا نمبر لکھ کر دیا اور تاکید کہ وہ اس آدمی کو تلاش کرنے کے بجائے اس گاڑی کو تلاش کرے۔ فرخ نے اسی وقت ریلوے اسٹیشن پر موجود اپنے اہلکاروں کو فون کیا اور فرخ کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ گاڑی پارکنگ میں کھڑی تلاش کرچکے تھے۔ جب کالی گاڑی میں بیٹھا تو وہ پکڑا گیا اور اس سے ہم نے فوراً اپنے انداز میں اگلوالیا کہ ضرغام کہاں ہے۔''

''لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ ضرغام کا آدمی ہے۔ نگہت اور کومل کو اغوا کرنے والے کوئی اور نہیں ضرغام ہی ہے؟'' جمیل نے پوچھا۔

انسپکٹر منصور نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا۔ ''میں تمہارے گھر تلاشی لینے گیا تھا۔ وہاں پر میں نے بہت سا سامان بکھرا دیکھا، ایک رومال پر بے ہوشی کی دوا لگی بھی دیکھی۔ لیکن جب میں تمہارے بیڈروم میں گیا تو مجھے بیڈروم میں کومل کے جوتے پڑے دکھائی دیے تھے۔ تب میں سمجھ گیا کہ یہ ضرغام کا کھیل ہے۔ پھر سب کچھ میرے دماغ میں واضح ہونے لگا اور اس طرح ہم ضرغام تک پہنچ گئے۔'' انسپکٹر منصور کہہ کر مسکرایا۔

# انتخاب

## کبیر عباسی

پھل دار درخت کو پھلوں سے لدنے کے لیے کہیں زیادہ سختیاں اور دشواریاں سہنی پڑتی ہیں... دریا دل دولت مند کی اذیت بدنصیب مفلس کے دکھ سے زیادہ خوف ناک ہوتی ہے... احساسات کی لرزشوں... دل کی جنبشوں اور حقائق کی تلخیوں سے لبریز کہانی کے انوکھے سنسنی خیز موڑ۔ اس دولت مند شخص کی کہانی... جس کی زندگی کا محور مرکز زر و زمین تھا... ہر قدم محض دولت کے حصول کے لیے اٹھتے تھے... چاہے راہ میں کتنے ہی دلوں کو توڑنا پڑے... وہ لوگوں کے احساسات وجذبات سے کھیلتا تھا... مگر اس بار تقدیر نے اس کے جذبات و احساسات کو للکارا تھا...

**دو چیزوں میں سے کسی ایک کا انتخاب......اس کا کڑا امتحان تھا**

گردن پہ انگلیوں کا دباؤ، بڑھتا جا رہا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے چیخنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر آواز گلے میں ہی گھٹ کے رہ گئی۔ میں اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن جسم نے دماغ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جسم کی ساری توانائی سلب ہو گئی ہو۔ اس سے پہلے کہ میں موت کی وادی میں اتر جاتا، میری آنکھ کھل گئی۔

زیرو واٹ کی مدھم روشنی میں، میری نظر ایک اجنبی چہرے پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں انتہا کی وحشت تھی۔ میرا دماغ جیسے جھرجھری لے کے مکمل بیدار ہو گیا تھا۔ وہ مجھ پر سوار تھی۔ میں چونکا، گویا یہ خواب نہیں تھا۔ اس کی نازک انگلیاں جیسے گردن میں گڑی جا رہی تھیں۔ میری موٹی گردن اس کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی ورنہ میرا دم کب کا گھٹ چکا ہوتا۔ میں نے اس کے بازوؤں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کے جھٹکا دیا۔ ایک ہی جھٹکے سے میری گردن آزاد ہو گئی۔

اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔ ”تم قاتل ہو۔ میرے بچوں کے قاتل...... میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔“

میں اسے بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ گویا وہ بدلے کی آگ میں سلگ رہی تھی۔ اس آگ میں وہ مجھے جلا کے بھسم کر دینا چاہتی تھی۔

اس نے چلّاتے ہوئے یکدم مجھ پہ پھر حملہ کر دیا۔ اب وہ میرا منہ نوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے ہسٹریا کا میرے پاس ایک ہی علاج تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر تھپڑ مارا۔ وہ بیڈ پر گر کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ میں دکھ آمیز بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب حقیقت میں ہوا تھا۔ یہ واقعہ اختتام تھا میری پہلی زندگی کا......

☆☆☆

میرا نام فلک شبیر ہے۔ چند برس پہلے میری زندگی ایسی ہی تھی جیسی کسی عام شخص کی ہوتی ہے۔ چھوٹا سا پُرسکون اور محبت بھرا آشیانہ، جسے میں نے اور میری بیوی رومانہ نے محبت کے خون سے سینچا تھا۔ میں زیادہ دولت مند تو نہیں تاہم ہمارا شمار خوشحال لوگوں میں ہوتا تھا۔ ہماری کُل دولت ہمارے دو بچے تھے۔ سمیر ڈیڑھ سال کا تھا جبکہ ماہا تین سال کی۔

میں اسلام آباد کے ایک بڑے پراپرٹی آفس میں بطور ڈیلر جاب کرتا تھا۔ تنخواہ تو معمولی سی ہی تھی۔ اصل کمائی کمیشن کی صورت میں تھی۔

میرا باس سکندر بخت شہر کا نامی گرامی بلڈر تھا۔ اس کی کمپنی ”سکندر بلڈرز اینڈ پراپرٹی ڈیلرز“ شہر بھر میں ایک ساکھ رکھتی تھی۔ پراپرٹی کی خرید وفروخت کے علاوہ وہ شہر کے نواحی علاقوں میں اونے پونے داموں زمینیں خرید کے وہاں ہاؤسنگ سوسائٹیز تعمیر کراتا تھا۔

ہاؤسنگ سوسائٹیز میں تیار ہونے والے گھر عام طور پر قسطوں میں بیچے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ گھر کرائے پر بھی چڑھا دیے جاتے۔ میرا کام عام طور پر گھروں کو بکوانے کے علاوہ کرائے پر بھی چڑھانا تھا۔ نئی زمینوں کے سودے میں بھی میری خدمات حاصل کی جاتیں۔ بعض اوقات ہم کسی بڑی زمین کا سودا کرتے تو اس میں کچھ ایسے گھر یا پلاٹس بھی آجاتے جن کے مالکان وہ فروخت کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ ایسے لوگوں سے ڈیلنگ میں مجھے خصوصی مہارت حاصل تھی۔

سکندر بخت کے ملازمین میں میری طرح کے اور بھی کئی ڈیلر تھے مگر میں اپنی صلاحیتوں کے باعث اس کی آنکھ کا تارا تھا۔ وہ مجھے ملازم سے زیادہ ایک دوست کے طور پر اہمیت دیتا تھا۔ میں ڈیلر کم مشیر زیادہ تھا۔ وہ پراپرٹی کے متعلق کوئی بھی فیصلہ میری مشاورت کے بغیر نہیں کرتا تھا۔

سکندر بخت اور میرے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا مگر اس کے باوجود ہماری خوب نبھ رہی تھی۔ وہ انتہائی موقع پرست، خودغرض اور لالچی شخص تھا۔ جبکہ میں فطرتاً شریف اور اپنے کام سے عشق کرنے والا شخص تھا۔ مجھ سے پہلے وہ اپنی من چاہی زمینیں طاقت کے زور پر حاصل کرتا تھا جس کے باعث اس کا بیشتر وقت تھانے اور کچہری کے چکر لگاتے گزر جاتا۔ عام طور پر وہ ایسے کیس جیت تو جاتا مگر اسے پیسہ پانی کی طرح بہانا پڑتا، جو خواری ہوتی وہ الگ تھی۔ میرے نزدیک لوگوں کو سودے کے لیے تیار کرنا ایک فن ہے۔ مشکل قسم کے لوگ جو کسی کی مٹھی میں نہ آتے، انہیں رام کرنے کا مزہ ہی الگ تھا۔ انہیں قائل کرنے کے لیے میں ہر طرح کی فنکاری جائز سمجھتا تھا۔ میرے آنے کے بعد ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ سکندر کو کوئی زمین چھیننا پڑی ہو۔ چاہے طریقہ کوئی بھی ہوتا، میں لوگوں کو تیار کر ہی لیتا تھا۔ مجھے اپنے اس کام سے عشق تھا۔ یہ سب کرتے ہوئے میں یہ نہیں جانتا تھا کہ سکندر کا مجھ پر حد سے زیادہ اعتماد ہی ایک دن مجھے لے ڈوبے گا۔

☆☆☆

صبح نو بجے الارم کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ صبح اٹھنا میرے لیے دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔ میں خود پر حاوی نیند کو ”ٹکڑے ٹکڑے“ کر کے بھگاتا تھا۔ آج بھی میں ایسا ہی کرتا مگر یکدم میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ آج تو 22 دسمبر تھی۔ اس دن میں کیسے سو سکتا تھا؟ آج کی تاریخ میرے لیے انتہائی اہم تھی۔ آج سکندر بخت کو انتہائی اہم سودا کرنا تھا اور میں ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ ہوتا۔

اس سودے کی یاد آتے ہی میری نیند یکدم سے اُچاٹ ہوگئی۔ اس دن کا تو میں کئی ماہ سے بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ آج کا دن میرا تھا۔ اس دن کے لیے میں کئی ماہ سے تیاری کر رہا تھا۔ میں نے سستی کو خیر باد کہا اور چستی سے پلنگ

سے چھلانگ لگادی۔
میں واش روم سے نکلا تو بیوی الماری سے میرے کپڑے نکال رہی تھی۔
''آج جلدی اٹھ گئے آپ؟'' وہ بیڈ پر کپڑے رکھ کے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
''ہاں، آج بہت اہم کام کرنا ہے۔'' میرا لہجہ کوشش کے باوجود کھویا کھویا سا تھا۔
اس نے مجھ سے نظریں چرالیں۔''اللہ آپ کو کامیاب کرے۔'' وہ دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔
''آمین۔'' میں زیرِلب بولا۔
ناشتے کے دوران وہ مجھے غور سے دیکھتی رہی۔ میں جب اس کی طرف متوجہ ہوتا تو وہ نظریں چرالیتی۔
''کیا بات ہے روبی، تم کچھ پریشان لگ رہی ہو۔'' آخر میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔
''آپ...... آپ سکندر کو چھوڑ نہیں سکتے؟'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔
''نہیں، میں اسے بھلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟'' میرا لہجہ سپاٹ تھا۔
''آپ کا کیا خیال ہے، آپ جو کچھ اس کے ساتھ کر رہے ہیں۔ وہ ٹھیک ہے؟'' اس بار بھی وہ نظریں نہیں ملا پائی تھی۔
''تم بتاؤ، اس میں غلط کیا ہے؟'' میں نے الٹا سوال کیا۔
''پتا نہیں، میں آپ کے لیے چائے لے کے آتی ہوں۔'' وہ بات بدلتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
میں اسے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ مجھے کافی عرصے سے جاب چھوڑنے کا کہہ رہی تھی مگر یہ جاب نہ صرف میرا عشق تھا بلکہ اب میری مجبوری بھی تھی۔
چائے پی کے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ روبی نے میرا بریف کیس لا کے دیا.... میں اسے ساتھ لپٹاتے ہوئے بولا۔
''تم فکر مت کیا کرو جان، میں کچھ غلط نہیں کر رہا۔ جو کچھ بھی کر رہا ہوں، بہت سوچ سمجھ کے کر رہا ہوں۔''
''اللہ آپ کو کامیاب کرے۔'' اس نے ایک بار پھر میرے حق میں دعا کی۔
وہ یہ دعا نہ بھی کرتی تو میں جانتا تھا کہ کامیابی میرے نصیب میں لکھ دی گئی ہے۔

☆☆☆

میں سکندر بخت کے ساتھ سیاہ مرسیڈیز کی عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ گاڑی کا کنٹرول سفید یونیفارم میں ملبوس شوفر کے ہاتھ میں تھا۔
سکندر کے چہرے پر ایسے ہی تاثرات تھے جو سب کچھ پالینے والے شخص کے چہرے پر ہونے چاہئیں۔ میں اس کے چہرے کو بغور دیکھتا رہا۔ وہ میری نظروں کے ارتکاز سے بے خبر باہر کے نظاروں میں گم رہا۔ اچانک ہی موسم نے اپنے تیور بدل لیے تھے۔
ہم طے شدہ وقت پر اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ وکیل ہم سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ ہم تینوں ملک رمضان کے شاندار دفتر میں پہنچے تو وہ اپنے وکیل اور پارٹنرز سمیت ہمارا منتظر تھا۔ موسم اچانک ہی رنگ بدل چکا تھا۔ برسات شروع ہو رہی تھی۔
''آیئے سکندر صاحب، میرا تو خیال تھا بارش کے باعث شاید آپ کچھ لیٹ ہو جائیں مگر آپ تو وقت کے پابند نکلے۔'' ملک رمضان ہمارا استقبال کرتے ہوئے خوش خلقی سے گویا ہوا۔
''نہیں بھئی آج کا دن بہت اہم تھا...... ہم دیر کیسے کر سکتے تھے۔'' سکندر نے کہا۔
ملنے ملانے کے بعد جب ہم اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو ملک رمضان بولا۔
''چائے مناسب رہے گی یا کافی؟''
''چائے کافی بعد میں پہلے ضروری کارروائی ہو جانی چاہیے۔'' سکندر بے تابی سے بولا۔
''جیسے آپ کی مرضی۔'' ملک رمضان کندھے اچکا کے بولا۔ اس نے فوراً ہی انٹرکام پر سیکریٹری کو ضروری ہدایات جاری کیں۔
سکندر نے جو نئی ہاؤسنگ سوسائٹی تعمیر کرائی تھی، وہ پوری کی پوری ملک رمضان نے خرید لی تھی۔ یہ سودا کرانے میں میرا اہم کردار تھا۔
سکندر ہاؤسنگ سوسائٹی کو نام سمیت بیچنے پر تیار نہیں تھا مگر اس سودے کی جو قیمت لگی تھی، وہ سن کے سکندر دنگ رہ گیا تھا۔ یہ قیمت تقریباً اس قیمت کے مجموعے کے برابر تھی جو ہم گھروں کو قسطوں میں بیچ کے حاصل کرتے۔
آج فائنل ہونا تھا۔ سودے سے متعلق تمام کاغذات تیار تھے۔ دونوں فریقین کے بس دستخط ہونا باقی تھے۔ اس کے بعد ملک رمضان چالیس کروڑ روپے سکندر کے اکاؤنٹ میں آن لائن منتقل کر دیتا۔ آج کے دن ہی ملک رمضان ایک

ماہ کے لیے کاروبار کے سلسلے میں باہر چلا جاتا۔
آخر وہ وقت آن پہنچا۔ سکندر نے فائل اٹھائی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔
سکندر دستخط کرنے ہی لگا تھا کہ اس کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے ناگواری سے جیب سے فون نکالا۔ اسکرین پر نظریں پڑتے ہی اس کے چہرے پر الجھن بھرے تاثرات نمودار ہو گئے۔ میں بغور اس کی حرکات کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کر کے سیل کان سے لگا لیا۔
دوسری طرف کی بات سن کے اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ''کب...... کیسے؟''
وہ درمیان میں اس طرح کے مختصر سے جملے بول رہا تھا۔ اس کے چہرے پر طاری پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ملک رمضان اور اس کے ساتھیوں کے چہرے پر بھی اُلجھن تیرنے لگی تھی۔
''میں...... میں ابھی آتا ہوں۔'' وہ لرزتی آواز میں بولتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
''سوری، ایک ایمرجنسی ہو گئی ہے، مجھے جانا ہو گا۔'' اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔
اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ کوئی بہت ہی گمبھیر معاملہ ہے تبھی وہ اتنا اہم سودا چھوڑ کے جانے کے لیے تیار ہو گیا مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اسے جانے دیتا۔ وہ بھی اس وقت جب میری کامیابی صرف چند دستخط کی دوری پر تھی۔
''سر، آپ نے ایک دستخط ہی تو کرنا ہے۔ وہ کر کے چلے جائیے گا۔'' میں سپاٹ انداز میں بولا۔
وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''سر، آپ تو ہمیں بھی کہتے رہتے ہیں کہ سب سے پہلے کام ہوتا ہے۔ گھر کے مسائل اور دیگر ایمرجنسی کو کام سے اہم نہیں سمجھنا چاہیے۔'' میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔
اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے شعلہ بھڑکا۔ مجھے لگا کہ وہ اچانک ہی مجھ پر پھٹ پڑے گا مگر اس نے خود کو تیزی سے سنبھالا۔ اگلے ہی لمحے وہ پُرسکون ہو چکا تھا۔ ''لاؤ فائل، میں دستخط کر دیتا ہوں۔'' اس نے ٹیبل پر رکھی فائل تھام لی۔
ملک رمضان کے چہرے پر پھیلی بے چینی، سکون میں تبدیل ہو گئی، یہی حال میرا بھی تھا۔ دستخط کرنے کے بعد وہ جانے لگا تو میں نے اسے ایک بار پھر روک لیا۔
''رقم کی اپنے اکاؤنٹ میں منتقلی کی تصدیق کے بعد آپ جائیے گا۔'' میرا لہجہ اس بار بھی سپاٹ تھا۔ وہ مجھے بے بسی سے دیکھ کے رہ گیا۔
چند لمحوں بعد ہم اکٹھے رخصت ہو رہے تھے۔ واپسی پر سکندر بے چین تھا۔ میں اس کی حالت سے بے خبر فاتحانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

گاڑی میں بیٹھتے ہی سکندر نے ڈرائیور کو آندھی طوفان کی طرح گھر پہنچنے کی تاکید کی۔ ڈرائیور حتی الامکان تیزی سے ڈرائیو کر رہا تھا مگر اس کے باوجود سکندر کے چہرے پر چھائی بے چینی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔
''سر، مسئلہ کیا ہے؟ مجھے بتانا پسند کریں گے آپ؟''
میرا خیال تھا وہ خود ہی مجھ سے اپنا مسئلہ شیئر کرلے گا۔ جب کافی دیر تک اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی تو میں نے خود ہی پوچھ لیا۔
وہ تذبذب کے عالم میں مجھے دیکھنے لگا۔ اسے کشمکش کا شکار دیکھ کے میں نے اس کے ہاتھ پہ نرمی سے ہاتھ رکھا۔
''ٹرسٹ می، سر۔''
''میرے گھر سے کال آئی تھی۔'' وہ اتنا بتا کے پھر رک گیا۔ وہ جیسے فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے اپنے راز سے آگاہ کرنا مناسب تھا یا نہیں۔ میں منتظر نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔
چند لمحات کے توقف کے بعد وہ تھکے تھکے انداز میں بولا۔ ''ارمغان کو اغوا کرلیا گیا ہے۔''
میں چونکا۔ ''کب؟'' ارمغان اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔
''ڈرائیور اسے اسکول سے لے کے گھر جا رہا تھا۔ وہ سگنل پر رکا تو کوئی اجنبی بندہ کار میں سوار ہو گیا۔ اس نے گن پوائنٹ پر ڈرائیور کو راستہ تبدیل کرنے کے لیے کہا۔ شہر سے باہر جا کے اس نے ڈرائیور کو بے ہوش کر دیا اور ارمغان کو کہیں لے گیا۔ ڈرائیور کو ہوش آیا تو اس نے گھر اطلاع دی۔ مجھے میری بیوی نے کال کر کے بتایا ہے۔'' اس نے دھیمی آواز میں ساری تفصیل بتا دی۔
''کمال ہے۔ ڈرائیور نے کیا کار لاک نہیں کی ہوئی تھی۔ مجھے تو وہ خود ملوث لگ رہا ہے؟''
''شاید وہ کار لاک کرنا بھول گیا ہو یا ہو سکتا ہے تمہارا اندازہ درست ہو۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔
''اب گیارہ بجنے والے ہیں۔ کیا وہ دو گھنٹے تک بے ہوش رہا۔ اس نے اتنی دیر سے کیوں اطلاع دی؟'' مجھے سمجھ

نہیں آرہی تھی کہ اس موقع پر مجھے کس طرح کا ردِعمل دینا چاہیے۔ سو میں الٹے سیدھے سوالات پوچھے جارہا تھا۔

''یہ سب تو گھر پہنچ کے ہی پتا چل سکتا ہے۔ ویسے بھی ان سب باتوں سے اہم میرے لیے ارمغان کی بخیریت واپسی ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''آپ فکر نہ کریں۔ زیادہ چانس ہے کہ اسے تاوان کے لیے اغوا کیا گیا ہوگا۔ ایسے لوگوں کو اگر بروقت تاوان مل جائے تو وہ بچوں کو بخیریت گھر پہنچا دیتے ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' اس نے تھکے سے انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔

سکندر کے گھر میرا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ مجھے اس گھر میں، گھر کے فرد کی سی اہمیت حاصل تھی۔ ہم گھر پہنچے تو کہرام برپا تھا۔ سکندر کی بیوی دھاڑیں مار مار کے رو رہی تھی۔ اس کی ایک بہن اسے سنبھالنے کی کوشش کررہی تھی۔ سکندر کو دیکھتے ہی اس کی بیوی چلانے لگی۔

''یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے۔ آپ سے دشمنی نکالنے کے لیے کسی نے میرے معصوم بیٹے کو اغوا کیا ہے۔ کچھ بھی ہو اسے واپس لے کے آئیں۔ اسے کچھ ہوگیا کہ تو میں کبھی آپ کو معاف نہیں کروں گی۔''

سکندر کے چہرے پر برہمی کے تاثرات نمودار ہوئے تاہم اس نے خود کو قابو میں رکھا۔

''تم تسلی رکھو۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔'' سکندر کی بیوی کی حالت بہت خراب لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کے میری آنکھوں میں بھی نمی آگئی۔

''تم لوگوں نے اور کسی کو ارمغان کے اغوا کے بارے میں تو نہیں بتایا؟'' سکندر کے مخاطب اپنی بیوی اور سالی تھے۔

''نہیں، آپ کے سوا میں نے اور کسی کو نہیں بتایا۔ جب ڈرائیور نے مجھے ارمغان کے اغوا کا بتایا تو شبانہ اِدھر ہی تھی۔'' اس کی بیوی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''ٹھیک ہے۔ یہ خبر فی الحال اپنے آپ تک رکھو۔ ملازموں کو بھی منع کردو کہ یہ خبر لیک نہ ہونے پائے۔ جتنے زیادہ لوگوں کو پتا چلے گا اتنی پیچیدگی بڑھے گی۔'' سکندر نے انہیں تنبیہہ کی۔

''شبانہ، تم اس کا خیال رکھو۔ میں ارمغان کی واپسی کے لیے کچھ کرتا ہوں۔'' وہ اپنی سالی کو کہتے ہوئے باہر نکل آیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کے وہ مجھ سے مشورہ طلب کرنے انداز میں بولا۔

''میرا تو دماغ ہی نہیں کام کررہا۔ تم بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''پہلے ڈرائیور کو بلوا کے ساری تفصیل تو پوچھیں۔ ویسے بھی جب تک اغوا کنندگان کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ ہم کچھ نہیں کرسکتے۔''

اس نے ایک ملازم کو ڈرائیور کو بلوانے کے لیے بھیج دیا۔

ڈرائیور نے وہی ساری کہانی سنا دی جو ہمارے علم میں آچکی تھی۔

''تم نے دروازہ لاک کیوں نہیں کیا تھا؟'' میں درشتگی سے بولا۔

''صاحب، میں نے دروازہ لاک کردیا تھا۔ راستے میں ارمغان بابا نے ہی دروازہ اِن لاک کیا ہوگا۔'' وہ کانپتے ہوئے بولا۔

''تم اغوا کنندہ کا حلیہ بتا سکتے ہو؟''

''میں صرف ایک نظر ہی اسے دیکھ سکا تھا۔ اس نے سر پر اونی ٹوپی چڑھا رکھی تھی اور...... چہرے پر وائٹ ماسک چڑھا رکھا تھا۔'' وہ خوف کے باعث بے ربط انداز میں بول رہا تھا۔

''تم نے اتنی دیر سے اطلاع کیوں دی۔'' میں ظاہر ہے پولیس والا تو تھا نہیں مگر کوشش کررہا تھا کہ ایسے ہی سوالات پوچھوں جو پولیس والے اس سے پوچھ سکتے تھے۔ مجھے ڈرائیور مشکوک لگ رہا تھا۔

''صاحب، وہ مجھے پستول دکھا کے شہر سے باہر لے گیا تھا۔ نو بجے کے قریب اس نے ایک ویران روڈ پر مجھے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ میں نے گاڑی روکی ہی تھی کہ اس نے میرے سر پہ کوئی چیز ماری۔ مجھے ہوش آیا تو گاڑی خالی تھی اور میری جیب بھی۔ وہ میرا پرس اور موبائل بھی لے گیا تھا۔ میری طبیعت ذرا سنبھلی تو میں فوراً واپس آیا۔ گھر پہنچتے ہی میں نے بیگم صاحبہ کو سب بتا دیا۔'' اس نے ساری تفصیل بتادی۔ اس کی کہانی میں بظاہر کوئی جھول نظر نہیں آرہا تھا۔ تاہم فوری طور میں کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر تھا۔

''اس نے تمہارے سر پہ کہاں ضرب لگائی تھی۔ اِدھر آکے دکھاؤ۔''

اس نے پاس آکے اپنا سر دکھایا۔ اس کے سر کے عقبی حصے پر کافی بڑا سا گومڑ بنا ہوا تھا۔ اس کی کہانی ٹھیک ہی لگ رہی تھی۔

”اوکے تم جاؤ مگر یہ بات اور کسی کو پتا نہیں چلنی چاہیے۔“ میں نے اسے تنبیہہ کی۔

سکندر مجھے ڈرائیور سے تفتیش کرتے ہوئے خاموشی سے دیکھتا رہا تھا۔ مجھے اس کے اس ردِعمل سے حیرت ہوئی تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ وہ ڈرائیور کو دیکھتے ہی آپے سے باہر ہوجائے گا اور میرے سامنے ہی اسے دھنک کے رکھ دے گا مگر......

آج مجھے سکندر کا ایک نیا روپ نظر آرہا تھا۔ ہر وقت دبنگ انداز میں بولنے والا، ملازموں کو جھڑکنے والا، کبھی نہ ہار ماننے والا سکندر میرے سامنے ہوتا تھا اور آج ایک ہی جھٹکے نے اس کے سارے کس بل نکال دیے تھے۔ اولاد کی محبت شے ہی ایسی ہے کہ اولاد مصیبت میں ہو تو طاقتور سے طاقتور شخص بھی ڈھے جاتا ہے۔

”ہوسکتا ہے یہ اغواکاروں سے ملا ہوا ہو مگر میرے خیال میں جب تک ان کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں ہوتا ہم کچھ نہیں کرسکتے۔“ ڈرائیور کے جانے کے بعد میں نے اپنی رائے دی۔ سکندر جواب میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ اس کا سیل بجنے لگا۔ اسکرین پر نظر ڈالتے ہی اس کے چہرے پر بےچینی پھیل گئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف بات کرنے لگا۔ میں اس کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ یک طرفہ مکالموں سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ اغواکاروں کی طرف سے ہی کال ہے۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کال بند کرکے وہ دھماکا کرنے کے سے انداز میں بولا۔

”اغواکار چالیس کروڑ مانگ رہے ہیں۔“ میں اپنی نشست پر اچھل پڑا۔

”چالیس کروڑ......؟“ اتنی بڑی رقم کا سن کے میری آنکھیں پھٹ گئیں۔

”ہاں چالیس کروڑ اور وہ بھی صرف ایک گھنٹے کے اندر۔“ اس کے لہجے میں بےیقینی تھی۔

”آپ نے کیا کہا انہیں؟“

”میں کیا کہہ سکتا تھا۔ اس نے بس اپنی ہدایات دیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آج میرے اکاؤنٹ میں چالیس کروڑ روپے منتقل ہوئے ہیں۔ انہوں نے بس اتنا کہا کہ وہ چالیس کروڑ روپے میں ایک گھنٹے کے اندر نکلوالوں۔ وہ مجھے ایک گھنٹے بعد پھر کال کریں گے۔ اگر میں نے اس وقت تک رقم نہ نکلوائی تو آدھے گھنٹے کے اندر وہ میرے بیٹے کا ایک کٹا ہوا بازو مجھ تک پہنچا دیں گے۔“ اس کی آواز بھرّا گئی۔ میں بھی دو بچوں کا باپ تھا۔ اتنی سفاکانہ دھمکی سن کے میرا دل بھی لرز گیا۔

”یہ تو کوئی بہت ظالم لوگ معلوم ہورہے ہیں۔ آپ نے کیا سوچا؟“ میری آواز بھی بھرّا چکی تھی۔

”میرے پاس ان کی بات ماننے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ گو کہ چالیس کروڑ روپے ایک خطیر رقم ہے، یہ انہیں دے کے میرا تو دیوالیا نکل جائے گا مگر دوسری طرف میرے جگر کا ٹکڑا ان کی تحویل میں ہے۔“ وہ بےبسی سے بولا۔

”تو آپ کے خیال میں انہیں چالیس کروڑ روپے دے دینے چاہئیں؟“ میں بےیقینی سے بولا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ اس کی آنکھوں میں کشمکش کے آثار تھے۔

اچانک اس کے سیل کی بیپ بجی۔ ”اس نے ویڈیو بھیجی ہے۔“ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

ارمغان ایک بیڈ پہ سویا نظر آرہا تھا۔ اس کا ایک بازو پھیلا ہوا تھا۔ اس کی کلائی کے ساتھ ایک گھڑی نما آلا بندھا ہوا تھا۔ اس آلے میں وقت لحہ بہ لحہ کم ہوتا جارہا تھا۔ پس منظر میں اغواکار سفید ماسک پہنے اپنی سرد آواز کے ساتھ بولتا جارہا تھا۔

”تمہارے بیٹے کی کلائی میں ایک کم طاقت کا بم بندھا ہوا ہے۔ اس پر چلتا وقت تم دیکھ سکتے ہو۔ اگر اس وقت کے اندر تم نے چالیس کروڑ روپے میرے حوالے نہ کیے تو بم پھٹ جائے گا اور تمہارے بیٹے کا بازو ہمیشہ کے لیے الگ ہوجائے گا۔“

سکندر سرتاپا کانپنے لگا۔

”میں اسے ابھی یہ رقم دے دیتا ہوں مگر ارمغان کی واپسی کے بعد میں انہیں پاتال کی گہرائی سے بھی نکال لاؤں گا۔ انہیں اندازہ نہیں کہ ان کا واسطہ اس بار کس شخص سے پڑا ہے۔“ وہ دھیمے لہجے میں بول رہا تھا مگر اس کی آواز اور لہجے میں شعلوں کی سی لپک تھی۔

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ ارمغان کی واپسی تک ہم مجبور ہیں۔ اس کے بعد انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ آپ یہ بتائیں انہوں نے کس نمبر سے کال کی تھی؟ یہ نمبر ان تک پہنچنے کی کڑی بن سکتا ہے۔“

”وہ بہت ہوشیار ہیں۔ انہوں نے میرے ڈرائیور کے نمبر سے ہی کال کی ہے۔ شاید اسی لیے وہ اس کا موبائل لے گئے تھے۔ خیر جو بھی ہو میں دیکھ لوں گا ان کی ہوشیاری بھی، پہلے ایک بار مجھے میرا بیٹا تو واپس ملے۔“ اس بار بھی

اس کی آواز طیش سے لرز رہی تھی۔

بینک برانچ سکندر کے گھر سے صرف دس منٹ کی مسافت پر تھی۔ یہ کارپوریٹ برانچ تھی مگر اس کے باوجود اتنی بڑی رقم کا بینک میں ہونا مشکل ہی تھا۔ منیجر نے مطلوبہ رقم کا ہماری مرضی کے نوٹوں میں بندوبست کیا۔ اس کام کے لیے اسے ایک گھنٹے کے لگ بھگ وقت لگ گیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم چالیس کروڑ روپے نکلوا چکے تھے۔ یہ تمام نوٹ پانچ ہزار کی گڈیوں پر مشتمل تھے۔ ہم نے ان کے سیریل نمبرز بھی منیجر سے لے لیے تھے۔ وہ کچھ مشکوک تو ہوا مگر سکندر اکثر و بیشتر بڑی بڑی رقوم اپنے اکاؤنٹ سے نکلواتا رہتا تھا اس لیے اس نے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی۔

یہ رقم ایک بڑے سوٹ کیس میں ہی آسکتی تھی جو ہم ساتھ لائے تھے۔ بینک کے گارڈ نے سوٹ کیس گاڑی میں رکھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھے ہی تھے کہ سکندر کا سیل بجنے لگا۔

اس نے کال سن کے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا کہا۔ ڈرائیور نے گاڑی سائڈ پر لگا دی۔

''تم ایسا کرو کہ ٹیکسی سے گھر چلے جاؤ۔'' سکندر کے کہتے ہی ڈرائیور گاڑی سے اتر گیا۔ سکندر کے کہنے پر ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھال لی۔

''اغوا کار جانے کس طرح ہماری جاسوسی کر رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہم نے بینک سے پیسے نکلوا لیے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ ڈرائیور کو گاڑی سے اتار دوں۔ وہ پھر اگلی ہدایات جاری کرے گا۔'' وہ تھکے ہوئے انداز میں بولا۔

میں نے بغیر کچھ کہے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں اپنے گرد و پیش پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اگر کوئی گاڑی ہمارے تعاقب میں تھی بھی تو میں اندازہ نہیں کر سکا تھا۔ سکندر فون پر ہدایات لے کے میری... رہنمائی کر رہا تھا۔ اغوا کار بہت ہوشیار تھے۔ وہ کسی ایک جگہ پہنچنے کو کہتے۔ ہم ادھر جوں ہی پہنچتے ان کی طرف سے کال آجاتی۔ اس بار وہ شہر کے دوسرے کونے میں پہنچنے کا کہتے۔ ہم اغوا کاروں کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ تین گھنٹے میں پورا پنڈی اسلام آباد چھان چکے تھے۔ سکندر کے ضبط کا پیمانہ آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ وہ کئی بار گھر کال کر کے اپنی بیوی کو تسلی دے چکا تھا۔ اس نے فی الحال کسی کو نہیں بتایا تھا کہ اغوا کاروں نے اس سے چالیس کروڑ روپے مانگے ہیں۔

اتنی دیر کی خواری سے میرا بھی برا حال ہو رہا تھا۔ آخر کار اغوا کاروں کو ہم پر رحم آ ہی گیا۔ اس بار ان کی کال آئی تو انہوں نے ہمیں گاڑی ایک پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر کے خود ٹیکسی میں گھر چلے جانے کے لیے کہا۔

ان کا کہنا تھا کہ وہ رقم محفوظ ٹھکانے پر پہنچانے کے بعد اپنی تسلی کریں گے۔ اس کے بعد وہ ارمغان کو کسی جگہ پہ فون کر کے بتا دیں گے۔

میں نے گاڑی کو ان لاک کیا اور سکندر کے ساتھ اتر آیا۔ کچھ دیر کے بعد ہم ٹیکسی میں گھر کی طرف جا رہے تھے سکندر مضطرب نظر آرہا تھا۔ میرا بھی تقریباً یہی حال تھا۔

☆☆☆

بدن تھکن سے چور تھا۔ میں اب گھر جانا چاہ رہا تھا مگر اس حالت میں سکندر کو چھوڑ کے جانا بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ سکندر مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کے خود اندر چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر جمی تھکن پہلے سے بڑھ چکی تھی۔

''علیشا کی حالت بہت خراب ہے۔ میں نے اُسے یقین دلایا ہے کہ کچھ ہی دیر میں ارمغان ہمارے بیچ ہوگا مگر وہ مطمئن نہیں ہوئی۔'' وہ تھکے ہوئے انداز میں بولا۔

''وہ ماں ہے۔ وہ بیٹے کو دیکھے بغیر کیسے مطمئن ہو سکتی ہے۔'' میں دھیمے انداز میں بولا۔

''پریشان تو میں بھی کم نہیں ہوں۔ میں نے تو فوراً چالیس کروڑ اغوا کاروں کے حوالے کر دیے ہیں۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنی حالت سنبھالے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''آپ فکر نہ کریں، کچھ وقت کی تو بات ہے۔ انشاء اللہ ارمغان جلد واپس آجائے گا۔''

''انشاء اللہ!'' وہ دھیمے لہجے میں اتنا ہی کہہ سکا۔

''آپ انہیں فون تو کریں۔ اب تک وہ رقم دیکھ کے اپنی تسلی کر چکے ہوں گے۔''

اس نے نمبر ملایا مگر توقع کے مطابق نمبر بند جا رہا تھا اب ہمارے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ بھوک کے مارے برا حال ہو رہا تھا مگر میں سکندر کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ آخر اللہ اللہ کر کے اغوا کاروں کی کال آ ہی گئی میں نے سکندر کو اسپیکر آن کرنے کا کہا۔

''تمہاری گاڑی جہاں تم نے کھڑی کی تھی۔ وہیں کھڑی ہے۔ کسی سے منگوا لو۔'' دوسری طرف سے آواز ابھری۔

''اور میرا بیٹا......؟'' سکندر بیتابی سے بولا۔

''وہ بھی دیکھ لینا ہو سکتا ہے گاڑی میں ہی ہو۔'' وہ ہنسا۔

''تم بتا کیوں نہیں دیتے ہو، گاڑی میں ہے یا نہیں؟'' سکندر ہذیانی انداز میں بولا۔

''تم جاکے دیکھ کیوں نہیں لیتے کہ وہ گاڑی میں ہے یا نہیں۔'' وہ لطف لینے والے انداز میں بولا۔ یہ شخص اذیت پسند لگ رہا تھا جو اس طرح سکندر کو اذیت دے کے اپنی تسکین چاہ رہا تھا۔

''ہاں، اگر وہ گاڑی میں نہ ہوا تو گاڑی کی ڈکی دیکھنا نہ بھولنا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

سکندر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ''ڈکی میں کیا مطلب؟ دیکھو میں نے تمہیں منہ مانگی رقم دے دی ہے۔ اب اگر میرے بیٹے کو کچھ ہوا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''وہ تو میں جانتا ہوں کہ تم سے برا کوئی نہیں۔ تم برے نہ ہوتے تو آج شاید میں تمہارے ساتھ یہ برائی نہ کرتا۔'' اس نے اتنا کہہ کے فون بند کر دیا۔

سکندر ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا۔ جب اسے اندازہ ہوا کہ دوسری طرف سے کال کاٹ دی گئی ہے تو اس نے زیرِلب ایک غلیظ گالی بکی۔

''چلو چل کے ارمغان کو لے آتے ہیں۔'' اس کے چہرے پر طیش اور اضطراب کے ساتھ ساتھ امید جھلک رہی تھی۔

''گاڑی یا ارمغان کو؟'' میں نے سادہ سے انداز میں سوال کیا۔

اس نے شاکی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''ظاہر ہے ارمغان بھی گاڑی میں ہوگا۔'' وہ پرامید تھا جبکہ اغوا کار کی باتیں سن کے مجھے لگ رہا تھا کہ اگر وہ گاڑی میں ہوا بھی تو شاید زندہ سلامت نہیں ہوگا۔

☆☆☆

بارش رک چکی تھی۔ اب یخ بستہ ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے میرے دانت سردی کی شدت سے بجنے لگے۔ سکندر بھی کانپ رہا تھا مگر اس وقت اس کی جو حالت تھی وہ سردی گرمی سے بالکل بے نیاز تھا۔

ہم نے ڈرائیور کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ وہ میری ہدایات کے مطابق گاڑی کو منزل کی طرف بڑھانے لگا۔ سکندر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُڑ کے اس جگہ تک پہنچ جاتا۔ اس کے چہرے پر چھایا اضطراب سوا ہو چکا تھا۔ راستے میں کوئی گاڑی آگے آجاتی تو سکندر مغلظات بکنے لگتا۔ میں اسے راستے بھر تسلی دیتا رہا۔

ڈرائیور نے گاڑی پارکنگ میں لگائی ہی تھی کہ سکندر چھلانگ مار کے گاڑی سے اتر گیا۔ اس نے پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی دیکھ لی تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے گاڑی سے لپکا۔ رگوں میں اترنے والی سردی نے میرا استقبال کیا۔ گاڑی کے پُرحدت ماحول میں اس سردی کا پتا تک نہ تھا۔

سکندر بے تابی سے باہر سے گاڑی کے اندر جھانک رہا تھا۔ میں نے پاس پہنچ کے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ بدک کے پیچھے ہٹا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک لحظے کے لیے اطمینان کا تاثر ابھرا۔ اگلے ہی لمحے وہ پھر سے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب چکا تھا۔

''اس......اس میں تو کوئی نہیں ہے۔'' وہ اٹکتے ہوئے بمشکل بولا۔ میں نے ایک لمحے میں گاڑی کے اندر جھانک کے دیکھ لیا تھا۔ گاڑی کسی بھی ذی نفس کے وجود سے خالی تھی۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے تسلی دی۔ ''وہ ڈکی میں ہوگا۔''

وہ میری بات سنتے ہی ڈکی کی طرف بھاگا۔

''یہ......یہ تو لاک ہے۔'' وہ ٹوٹے پھوٹے لہجے میں بولا۔

''ایک سیکنڈ میں لاک کھولتا ہوں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ گاڑی کا فرنٹ ڈور اَن لاک تھا۔ گاڑی کی چابی اگنیشن سوئچ میں لگی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے ڈکی کا لاک کھولا۔

سکندر نے ایک جھٹکے سے ہی ڈکی کھول دی تھی۔ اب وہ سکتہ زدہ انداز میں ڈکی کے اندر جھانک رہا تھا۔ پھر میں نے اسے گرتے دیکھا۔ میں چلتا ہوا پیچھے آیا۔ سکندر دل پر ہاتھ...... رکھ کے مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے پانی لانے کے لیے کہا۔ ہمارے گرد لوگوں کا جمگھٹا لگنا شروع ہو گیا تھا۔

''لگتا ہے، انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔'' مجمع میں سے کوئی بولا۔

میں نے سکندر کی گردن میں ہاتھ ڈال کے اسے بٹھایا۔ اتنے میں ڈرائیور کہیں سے پانی کی ایک بوتل لے آیا تھا۔ میں نے سکندر کو پانی پلایا۔ پانی پی کے اس کی حالت کچھ سنبھل گئی۔

''اس نے دھوکا کیا ہے میرے ساتھ۔ مار دیا میرے بیٹے کو۔'' وہ بے ربط انداز میں بول رہا تھا۔

میں تسلی دینے والے انداز میں اس کی کمر تھپکنے لگا۔

اس کا جملہ سن کے لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ لوگوں کی آنکھوں میں اس کے لیے ہمدردی تھی۔ میں نے انہیں نظرانداز کرتے ہوئے، گاڑی کی ڈکی کھولی۔

... ایک پلاسٹک شیٹ پڑی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ... اٹھائی۔ سکندر لرزتے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا۔ شیٹ ... ہی میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ... لی۔ ڈکی خالی تھی۔

سکندر کے چہرے پر بھی لمحے بھر کے لیے سکون ابھرا۔

''یہ کیوں کر رہا ہے ایسا میرے ساتھ؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''لگتا ہے وہ کوئی پرانا بدلا چکا رہا ہے آپ سے۔'' میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''پرانا بدلہ؟ میں نے تو کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔'' وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔

''ہاں۔ ہمیں احساس ہی کب ہوتا ہے جب ہم کسی کا کچھ بگاڑ رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں تو کسی بھی بگاڑ کا تبھی احساس ہوتا ہے جب کوئی ہمارا کچھ بگاڑتا ہے۔'' میرا لہجہ فلسفیانہ تھا۔ وہ اچنبھے سے مجھے دیکھتا رہ گیا۔

ہم گاڑی میں واپس بیٹھے ہی تھے کہ اس کا سیل بجنے لگا۔ کال سنتے ہوئے اس کا چہرہ امید کی روشنی سے روشن تر ہو گیا۔

''ارمغان گھر پہنچ چکا ہے۔'' کال کاٹ کے وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

''کس کی کال تھی؟'' میں نے شیشے کے پار دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اغوا کار کی۔'' اس کا جواب سن کے میرے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ میرا خیال تھا کہ اس بار بھی اغوا کار اس کے ساتھ کھیل ہی رہا تھا تاہم اس کے چہرے پر چھائی پُرامید خوشی دیکھ کے میں نے اپنے خیالات کے اظہار سے گریز کیا۔

''گاڑی تیز چلاؤ نا۔'' وہ راستے بھر مجھے یہ کہتا آیا تھا۔ میں نے گاڑی گیٹ پر روکی ہی تھی کہ سکندر گاڑی سے اتر گیا۔ چوکیدار گیٹ کھول رہا تھا۔

''ارمغان کہاں ہے؟'' سکندر چوکیدار سے ہی پوچھنے لگا۔ وہ غریب ہمدردی سے اسے دیکھنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ سکندر نے اس کا گریبان پکڑ کے اسے جھنجوڑا۔ ''میں پوچھ رہا ہوں ارمغان کہاں ہے؟''

''صاحب جی، میں نہیں جانتا۔'' وہ خوفزدہ سے انداز میں بمشکل اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

میں گاڑی کو پورچ میں پارک کر کے اس کے پاس آ گیا۔ اس کا شور و غل سن کے اندر سے سکندر کی بیوی اور سالی بھی باہر آ گئیں۔ ان کی نظروں میں بھی وہی سوال مچل رہا تھا جو سکندر چوکیدار کو جھنجوڑ کے پوچھ رہا تھا۔

☆☆☆

میں رات تک بھوکے پیٹ سکندر کے ساتھ رہا تھا۔ ان لوگوں کو تو بھوک پیاس کا احساس ہی نہیں تھا مگر ان کی پریشانی میرے لیے اتنی بڑی نہیں تھی کہ مجھے بھوک پیاس کا احساس مٹ جاتا۔

سکندر کا چہرہ امید و یاس کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جب بھی سیل بجتا وہ بے چینی سے سیل کی اسکرین پر نگاہ ڈالتا۔ اگلے ہی پل اس کے چہرے پر چھائی امید مایوسی میں تبدیل ہو جاتی۔

اس کے رشتے داروں کو بھی ارمغان کے اغوا کا پتا لگ چکا تھا۔ کچھ اس کے گھر آ گئے تھے اور کچھ فون پر ہی تفصیلات طلب کر رہے تھے۔ وہ حیرانی کا اظہار کر رہے تھے کہ چالیس کروڑ روپے لینے کے باوجود اس نے ابھی تک بچے کو چھوڑا کیوں نہیں۔ اب سب اسے مشورہ دے رہے تھے کہ وہ پولیس کو مطلع کر دے۔ اس نے اگلی صبح تک انتظار کا فیصلہ کیا۔ اگر اگلی صبح تک بھی ارمغان واپس نہ آتا تو وہ پولیس کو مطلع کر دیتا۔

حالات و واقعات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ کوئی انتقامی کارروائی ہے۔ سکندر نے اپنی زندگی میں دوست کم بنائے تھے اور دشمن زیادہ۔ اتنے زیادہ دشمنوں میں اصل دشمن کو ڈھونڈنا بھوسے میں سوئی ڈھونڈنے کے مترادف تھا۔

چند گھنٹوں کے انتظار کے کرب نے اسے بالکل ... دیا تھا۔ اگر یہ انتظار عمر بھر... پہ محیط ہو جاتا تو جانے اس کا ... حشر ہوتا۔

میں اس کے انتظار میں مزید ساجھے داری نہیں کر ... تھا۔ عشا کی اذانیں ہونے لگیں تو میں اسے انتظار میں ... کے اپنے گھر آ گیا۔ جہاں میری بیوی اور بچے میرے ... تھے۔

☆☆☆

''کیا رہا؟'' میری بیوی نے مجھے دیکھتے ہی پہلا ... بھی کیا۔

''پہلے کھانا تو دو پھر ساری تفصیل بتاتا ہوں۔'' ... تھکن سے چور لہجے میں بولا۔

''اتنا تو بتا دیں کہ کامیابی ہوئی یا نہیں۔ میں ... انتظار کی سولی پر ٹنگی رہی۔ آپ نے مجھے بھی فون کر ...

منع کیا ہوا تھا اور خود بھی فون کرنا گوارا نہ کیا۔'' وہ شکوہ کناں انداز میں بولی۔

''میں تو اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا مگر......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ میری طرف منتظر نظروں سے دیکھتی رہی مگر میں اسے نظرانداز کرتے ہوئے واش روم میں گھس گیا۔

فریش ہونے کے بعد میں نے بچوں کو دیکھا۔ ماہا اور سمیر دونوں سو رہے تھے۔ میں نے انہیں پیار کیا اور ڈائننگ ٹیبل پر آگیا۔

کھانے کھاتے ہوئے بھی رومی منتظر نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں اسے نظرانداز کرتے ہوئے کھانا کھاتا رہا۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے اسے ساری تفصیل بتائی۔

''میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ سکندر کو چھوڑ دیں۔ ہمارے بچے بھی ہیں خدانخواستہ ان پر بھی برا وقت آسکتا ہے۔''

''شٹ اپ۔'' میں دہاڑا۔ ''خبردار کبھی آئندہ بچوں کے بارے میں ایسی بات کی تو......'' میری آواز طیش سے کانپ رہی تھی۔ اس کے ایک ہی جملے نے مجھے اندر تک لرزا دیا تھا۔ یہ آشیانہ ہم نے بڑی مشکل سے تعمیر کیا تھا۔ اس کے متعلق ایسی منفی بات بھلا میں کیسے برداشت کرسکتا تھا۔

وہ میرے غصے سے سہم گئی۔ اس کے بعد اس نے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اس کا جملہ لیٹنے کے بعد بھی میرے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح بجتا رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن صبح صبح ہی سکندر کی کال آگئی۔ وہ مجھے اپنے گھر بلا رہا تھا۔ میں اس کے گھر پہنچا تو ڈرائنگ روم میں دو پولیس آفیسرز سکندر کے ساتھ بیٹھے تھے۔

سکندر غم کی اس گھڑی میں بھی مجھ سے بہتر انداز میں ملا مگر پولیس والوں نے مجھے کوئی خاص لفٹ نہیں کرائی۔ ان کا انداز روکھا ہی تھا۔ سکندر نے ان سے میرا تعارف کرایا۔

''اچھا تو یہ ہیں فلک صاحب، آپ کے سیکریٹری کم مشیر۔'' ایس ایچ او بولا۔ اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

میں نے اس کے لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کے نام کی پٹی پر نگاہ ڈالی۔ اس کا نام راؤ اسلم تھا۔

''جی راؤ صاحب...... میں خود سے زیادہ اس پر اعتبار کرتا ہوں۔'' سکندر کا جواب سن کے میرے اندر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

''اچھا تو فلک صاحب...... آپ کل پورا دن ان کے ساتھ رہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ کس کی کارروائی ہے؟'' اس بار وہ معتدل لہجے میں بولا تھا۔

''اس بارے میں تو میں کچھ نہیں اندازہ کر پایا کہ یہ کس کی کارروائی ہے۔ اتنا اندازہ ضرور ہے یہ جو بھی ہے اس نے سکندر صاحب سے کوئی پرانا بدلہ چکایا ہے۔'' میں پُر اعتماد انداز میں بولا۔

''یہ بات آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' وہ تیکھے انداز میں بولا۔

''اغوا کار نے جب کل فون پہ گاڑی کا پتا بتایا تھا تو سکندر صاحب نے اسپیکر آن کر دیا تھا۔ وہ ساری گفتگو میں نے بھی سنی تھی۔ وہ سکندر صاحب سے کہہ رہا تھا کہ اگر تم اتنے برے نہ ہوتے تو میں تمہارے ساتھ برائی نہ کرتا۔ اب آپ بتائیں اس جملے سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے؟'' میرا لہجہ بھی آخر میں قدرے تیکھا ہوگیا۔

''سکندر صاحب، آپ بتائیں آپ کے خیال میں اتنی بڑی دشمنی آپ سے کون کرسکتا ہے؟'' اس نے مجھ پر سے توجہ ہٹا کے سکندر سے پوچھا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بزنس کی وجہ سے لاتعداد لوگ میرے مخالف ہوسکتے ہیں۔ میری تو ہمیشہ کوشش رہی کہ میری طرف سے کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو، لیکن کسی کے دل میں میرے حوالے سے کوئی شکایت پیدا ہو بھی گئی ہو تو میں میرے علم میں نہیں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ اس کا منافقانہ جواب سن کے میرے لبوں پر لحظہ بھر کے لیے طنزیہ مسکراہٹ ابھری تھی جو میں نے فوراً چھپا لی۔ اس نے بے شمار لوگوں سے ان کی زمینیں ہتھیائی تھیں اور کہہ رہا تھا کہ میری کوشش رہی ہے کہ کبھی میری طرف سے کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔

''کل کے سودے کا آپ دونوں کے علاوہ کس کو پتا تھا؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''اس کے بارے میں تو میرے دفتر کے بہت سے لوگ جانتے تھے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

''یہ بھی کہ کل آپ کو چالیس کروڑ روپے وصول کرنے ہیں؟'' وہ چالیس کروڑ روپے پہ زور دے کے بولا۔

''ہاں، چند لوگوں کو یہ بھی پتا تھا کہ سودا چالیس کروڑ روپے میں ہو رہا ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''ملک رمضان کے متعلق کیا خیال ہے۔ کیا وہ چالیس کروڑ روپے واپس ہتھیانے کے لیے ایسا کرسکتا ہے؟''

''میرا تو نہیں خیال کہ وہ صرف چالیس کروڑ روپے

ایسی مجرمانہ کارروائی کرے گا۔ اس کے لیے یہ اتنی بڑی رقم تو نہیں۔ ویسے بھی اگر وہ ایسا کرتا تو پیسے ملنے کے بعد بیٹے کو چھوڑ دیتا۔ اس سے میری کوئی دشمنی تو نہیں جو وہ مجھے یوں اذیت دیتا۔"

"ہم......" اس نے ہنکارا بھرا۔ "اب تو بس ایک ڈرائیور ہی بچا ہے جو مجرموں تک پہنچانے کی امید بن سکتا ہے۔" اسلم پرسوچ لہجے میں بولا۔ اس کے ساتھ ایک ایس پی رینک کا پولیس آفیسر بیٹھا تھا۔ وہ بغور ہمارے تاثرات جانچ رہا تھا۔ اس نے ایک لفظ تک نہیں بولا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے منہ میں زبان ہی نہیں۔

"ٹھیک ہے آپ اسے گرفتار کر کے لے جائیں۔ اسے اچھی طرح ٹھوک بجا کے دیکھ لیں، ہوسکتا ہے وہ ان لوگوں کے ساتھ ملوث ہو۔"

سکندر کے یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جاتے ہوئے وہ سکندر کے ڈرائیور کو گرفتار کر کے لے گئے تھے۔ میرے آنے سے پہلے وہ اس سے بیان لے چکے تھے۔ ڈرائیور کی بیوی اور بچوں کا واویلا سن کے مجھے اپنی بیوی کی بات ٹھیک لگی تھی۔ مجھے واقعی سکندر کو چھوڑ دینا چاہیے تھا۔

☆☆☆

پولیس کی تفتیش چلتی رہی۔ ارمغان کی تصاویر شہر بھر میں بانٹ دی گئی تھیں۔ کیبل اور اخبارات میں اس کی گمشدگی کے اشتہارات دیے گئے لیکن ارمغان کا کوئی اتا پتا نہیں مل سکا۔ اغواکار بھی چالیس کروڑ روپے لے کے جیسے سکندر کو بھول ہی گیا تھا۔ اس نے بھی اس کے بعد کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ روز بروز اس کی واپسی کے امکانات معدوم ہوتے چلے جارہے تھے۔

سکندر نے اپنے تمام دشمنوں کے نام بھی پولیس کو دے دیے تھے۔ پولیس انہیں چیک کر رہی تھی۔ ڈرائیور پر انہوں نے تشدد کے پہاڑ توڑ دیے تھے مگر وہ مزید کچھ نہیں بتا سکا تھا۔ مجبوراً پولیس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ اسے اپنی نظروں میں رکھے ہوئے تھے۔

سکندر کے اپنے آدمی بھی اپنی جگہ اغواکاروں اور ارمغان کو تلاش کرتے رہے۔ انہوں نے ہر اس شخص کو چیک کر لیا تھا جس سے ماضی میں کسی قسم کی چپقلش رہی تھی۔ انہوں نے لاتعداد لوگوں کو اغوا کر کے ان پر تشدد کیا مگر ارمغان کو نہیں ملنا تھا، نہیں ملا۔

لوگوں کو اغوا اور ان پر تشدد ہوتا دیکھ کے میرا دل ہولتا رہتا۔ میں اس کا قریبی ساتھی تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں مجھے بھی نشانہ نہ بنا لیا جائے تاہم خیریت گزری اور پورا سال بیت گیا۔

سکندر کو بھی آہستہ آہستہ صبر آ گیا تھا۔ اب وہ کاروبار پر پھر سے مکمل توجہ دے رہا تھا۔ چالیس کروڑ کا نقصان بہت بڑا تھا۔ ارمغان کے اغوا کے بعد کاروبار بالکل ٹھپ پڑا تھا۔ یہ نقصان الگ تھا۔ سکندر نے ارمغان کی تلاش میں پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ یہ سارے نقصانات پورا کرنے کے لیے کاروبار پہ توجہ دینا ضروری تھا۔ سکندر ایک ہی جھٹکے میں بہت نیچے آ گیا تھا۔ کل تک جو لوگ سکندر کو جھک جھک کے ملتے تھے ان کے انداز میں بے گانگی صاف نظر آنے لگی تھی۔

21 دسمبر کو سکندر بہت اداس تھا۔ ہم دفتر میں بیٹھے تھے۔ وہ اداسی سے بولا۔ "کل ارمغان کو ہم سے بچھڑے پورا سال ہو جائے گا۔ پتا نہیں وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔"

"خدا سے اچھے کی امید رکھیں۔ ہوسکتا ہے کل ہی ارمغان آپ کو واپس مل جائے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

اس کی آنکھوں میں امید کے چراغ جلنے لگے۔

"کاش ایسا ہی ہو۔ ایک سال بہت ہوتا ہے کسی کو تڑپانے کے لیے۔"

"آپ اچھے کی امید رکھیں۔ اگر وہ زندہ ہے تو ہوسکتا ہے کل اغواکار اسے واپس کر دیں۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔" وہ پُرامید انداز میں بولا۔

امید زندگی ہے مگر لاحاصل امید میں موت ہے۔ جس طرح سلو پوائزن دھیرے دھیرے انسان کو موت کی طرف دھکیل کے لے جاتی ہے اسی طرح لاحاصل امید بھی انسان کی سانسیں تیزی سے کم کرتی چلی جاتی ہے۔ میں یہ بات سکندر کو نہیں سمجھا سکتا تھا، سو اسے آس کا جگنو تھما دیا تھا۔

وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ 22 دسمبر اس کی زندگی میں خوشیاں لانے کے بجائے ایک بار پھر اسے دکھوں کی راہ گزر پہ چلنے کے لیے مجبور کرنے والا ہے۔ اس نے بھی کسی سے اسی تاریخ کو خوشیاں چھین لی تھیں۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ یہ دن اس کے لیے کوئی خوشی لاتا۔ یہ دن ہمیشہ کے لیے اس کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بننے والا تھا۔

☆☆☆

اس بار 22 دسمبر کو چھٹی تھی۔ میں سکون سے دس بجے اٹھا۔ باہر مطلع ابر آلود تھا۔ میں بچوں سے کھیلتا رہا۔ رومی نے میری پسند کا کھانا تیار کیا تھا۔ لنچ ہم نے کئی دن بعد اکٹھے کیا تھا۔ لنچ کے بعد میں پھر سے بچوں کے ساتھ لگ گیا۔ ماما کی

توتلی باتیں سنتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ زندگی کتنی... خوبصورت ہے۔

مجھے سکندر کا خیال آیا۔ یہ زندگی اس وقت میرے لیے خوبصورت تھی۔ اس کے لیے تو اس کی زندگی دنیا میں ہی جہنم کے مانند ہو چکی تھی۔ اس کا خیال آنا تھا کہ اس کا فون آ گیا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ اس نے مجھے فوراً اپنے گھر پہنچنے کا کہا تھا۔

میں نے کال سن کے روی کی طرف معذرت طلب نظروں سے دیکھا۔ ''سوری ڈیئر، مجھے جانا ہوگا۔''

''سکندر کی کال تھی نا؟'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

میں نے اس سے نظریں چرا لیں۔ ''ہاں، لگتا ہے اسے پھر سے میری ضرورت پڑ گئی ہے۔''

''وہ آپ پر اتنا اعتماد کرتا ہے۔ اپنے ذاتی مسائل بھی آپ سے شیئر کرتا رہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کا یہی اعتماد ہی آپ کے لیے مشکل کا باعث نہ بن جائے۔'' اس کے لہجے میں اندیشے بول رہے تھے۔

''تم فکر نہ کرو۔'' میں اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔

کچھ ہی دیر میں، میں سکندر کے گھر پہنچ چکا تھا۔ یہاں تقریباً ویسا ہی ماحول بنا ہوا تھا جیسا آج سے ٹھیک ایک سال پہلے میں نے دیکھا تھا۔ سکندر کی بیوی علیشا دہاڑیں مار مار کے رو رہی تھی۔ سکندر اسے سنبھالنے کی کوشش میں خود ہلکان ہوا جا رہا تھا۔ اس جیسے سخت دل انسان کو بھی اولاد کے دکھ نے پگھلا دیا تھا۔ میں نے پہلی بار اسے روتے دیکھا۔

اس بار بھی 22 دسمبر ان پر بھاری پڑا تھا۔ اس بار ان کی سات سالہ بیٹی عینا گھر سے غائب ہو گئی تھی۔

☆☆☆

سکندر نے پولیس کو بھی بلا لیا تھا۔ میں پولیس کی گاڑی کے ساتھ ساتھ ہی سکندر کے گھر پہنچا۔ پولیس والوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا تھا۔ میں سکندر کو لے کے ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ پولیس والوں میں ایک راؤ اسلم ہی تھا۔ اس کے ساتھ سب انسپکٹر فرید خان موجود تھا۔ جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو وہ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔

ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''مجھے افسوس ہے سکندر صاحب۔'' راؤ اسلم نے سکندر سے ہاتھ ملاتے ہوئے رسمی جملہ بولا۔

سکندر خاموش رہا۔ کچھ دیر تک سب خاموشی سے بیٹھے رہے۔ آخر اس خاموشی کو اسلم نے ہی توڑا۔

''یہ واقعہ کیسے ہوا، آپ کچھ تفصیل بتانا پسند کریں گے؟'' اس کا مخاطب سکندر تھا۔

''آپ کو شاید یاد ہو کہ پچھلے سال 22 دسمبر ہی کو میرا بیٹا اغوا ہو گیا تھا۔ پورا برس بیت گیا ہمیں اس کی راہ تکتے مگر وہ لوٹ کے نہیں آیا۔ آج کے دن صبح سے ہی ہمارے گھر سوگواریت چھائی تھی۔ میں تو بیڈ روم سے باہر ہی نہیں نکلا۔ میں اور میری بیوی پورا دن ہی اس کی تصویریں دیکھتے رہے اور اس کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ ہم دونوں پُرامید تھے کہ شاید اغواکار کے دل میں خدا رحم ڈال دے اور آج کے دن ہی وہ ہمارا بیٹا ہمیں واپس کر دے۔

''لنچ ہم سب گھر والے ایک ساتھ ہی کرتے ہیں۔ جب ہم لنچ کے لیے بیٹھے تو پتا چلا کے عینا غائب ہے۔ ہمارا یہی خیال تھا کہ وہ گھر میں ہی کہیں ہوگی لیکن پورا گھر چھان مارنے کے باوجود عینا نہیں ملی تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ عینا سے چھوٹی بہن ضوفشاں نے بتایا کہ وہ کافی دیر پہلے باہر دکان پر گئی تھی اس کے بعد واپس نہیں آئی۔

''میں نے دکان سے پتا کرایا تو اتنا ہی معلوم چلا کہ وہ دکان سے چیز لے کے گھر کی طرف چل پڑی تھی۔ پورے محلے میں ڈھونڈنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ اغواکار کا انتقام ابھی پورا نہیں ہوا۔ وہ مجھے اور تڑپانا چاہتا ہے۔'' آخر میں اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''گیٹ پر کیا چوکیدار موجود نہیں تھا؟'' اسلم نے سوال کیا۔

''وہ اپنے کیبن میں بیٹھا رہتا ہے۔ گھر کے افراد چھوٹے گیٹ سے اندر باہر آتے جاتے رہتے ہیں۔ اسے تبھی زحمت کرنا پڑتی ہے جب کوئی گاڑی اندر لانا چاہ رہا ہو، یا باہر لے جانا چاہ رہا ہو۔ یا عام طور پر کسی مہمان کی آمد کے وقت وہ خود دروازہ کھولتا ہے۔'' اس نے تفصیل سے وضاحت کی۔

''تو کیا چوکیدار نے آپ کی بیٹی کو باہر جاتے دیکھا تھا؟''

''باہر جاتے ہوئے تو دیکھا تھا لیکن بقول اس کے اس نے یہی سوچا کہ شاید وہ اس کی بے خبری میں واپس اندر آ گئی ہو۔ اس لیے اس نے اس کے غیاب کا نوٹس نہیں لیا۔''

''چوکیدار نے اسے باہر جانے سے منع نہیں کیا؟''

''نہیں۔ میں نے اسے منع کر رکھا ہے کہ بچے جب چاہیں باہر جا رہے ہوں، وہ انہیں جانے دیا کرے۔''

''سکندر صاحب، اسی تاریخ کو آپ کا بیٹا اغوا ہوا۔ کم سے کم آج کے دن تو آپ کو اپنے بچوں کی سیکیورٹی کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔'' اسلم سخت لہجے میں بولا۔

''میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اغوا کار اس بار بھی میری تاک میں ہے۔ میں تو الٹا اس خوش امیدی کا شکار ہو رہا تھا کہ ہوسکتا ہے آج پورا برس گزر جانے کے بعد وہ میرا بیٹا مجھے واپس کر دے۔'' اس کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی۔

''میں نے پچھلی بار بھی آپ سے کہا تھا کہ یہ کارروائی آپ کے کسی دشمن نے کی ہے۔ دشمن بھی وہ جس کو ماضی میں آپ سے کوئی تکلیف پہنچ چکی ہے۔ میں نے آپ سے ایسے لوگوں کی لسٹ مانگی تھی۔ آپ کی فراہم کردہ لسٹ میں شامل تمام لوگوں کو ہم نے چیک کیا مگر میرا نہیں خیال کہ ان میں سے کوئی شخص اس کام میں ملوث ہوسکتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے مل جائیں اور باقی دونوں بچے بھی محفوظ رہیں، تو آپ کو مجھے ایسے تمام لوگوں کی لسٹ فراہم کرنا ہوگی، جن کو ماضی میں آپ سے کوئی بھی تکلیف پہنچ چکی ہو۔'' اس کا انداز اٹل تھا۔ جیسے لسٹ کے بغیر وہ بچوں کو ڈھونڈ ہی نہیں پائے گا۔

سکندر اُسے بے بسی سے دیکھ کے رہ گیا۔

''دیکھیں سکندر صاحب، آپ جانتے ہیں کہ پولیس کی گاڑی شک کے پیٹرول سے ہی چلتی ہے۔ جب تک ہمیں آپ کے دشمنوں کا اندازہ نہیں ہوگا ہم کچھ نہیں کر پائیں گے۔ اگر آپ اپنے دشمن کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو ایسے لوگوں کی لسٹ فراہم کرنا ہی ہوگی۔ جن کو ماضی میں آپ سے کوئی تکلیف پہنچ چکی ہو۔''

''میرے خیال میں پچھلے چھ سات سال سے تو میری طرف سے کسی کے ساتھ ایسی کوئی زیادتی نہیں ہوئی کہ کوئی میرے ساتھ ایسا سلوک کرے۔ ہاں اس سے پہلے زمینوں کے معاملے میں میری بہت سے لوگوں کے ساتھ اَن بن چلتی رہی ہے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

''یہ اَن بن یا جنگ جو آپ کی اُن کے ساتھ چلتی رہی، قانونی تھی یا آپ اپنے طور پر یہ جنگ چلاتے رہے؟'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''زیادہ تر تو ایسے معاملات عدالت میں ہی حل ہوئے۔ ہاں کچھ لوگوں نے شاید میری زیادتی کو چپ چاپ سہہ بھی لیا تھا۔ انہوں نے میرے خلاف کوئی کیس نہیں کیا تھا۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔

میں نے حیرانی سے اسے اپنی زیادتیوں کا اعتراف کرتے دیکھا۔ اس نے لوگوں کے ساتھ جو بھی زیادتیاں کی تھیں اسے تو کبھی ان کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔ آج جب ''زبردست'' ''زیردست'' بن گیا تھا تو اسے اپنی زیادتیاں یاد آ رہی تھیں۔

''آپ ان کے ساتھ کیا زیادتی کرتے رہے تھے؟''

''اگر وہ اپنی زمین بیچنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے تو میں انہیں طاقت کے زور پہ زمین بیچنے پہ مجبور کر دیتا تھا مگر میرے خیال میں یہ کوئی اتنا بڑا ظلم نہیں کہ کوئی مجھ سے اتنا بھیانک انتقام لے اور وہ بھی اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد۔'' بیٹی کے اغوا کے بعد تو سکندر بالکل ہی ڈھے گیا تھا۔ اب وہ ہر سوال کا جواب فرفر دے رہا تھا۔

''آپ کا ظلم کتنا بڑا تھا یہ تو وہی لوگ جانتے ہوں گے جن کے سر سے آپ نے چھت چھینی۔'' اسلم کے لہجے میں تلخی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

''لیکن اتنا عرصہ گزرنے کے بعد؟'' سکندر نے بے بسی سے ہاتھ پھیلائے۔ اس کے چہرے پہ چھائی لاچاری دیکھ کے بے اختیار مجھے اس پہ ترس آنے لگا۔

''ہوسکتا ہے، آپ کے ظلم کا شکار کوئی بچہ جوان ہونے کے بعد اپنا حساب لے رہا ہو۔'' اسلم کے لہجے میں کوئی ایسی عجیب سی بات تھی کہ میں نے سکندر کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتے دیکھیں۔

''آپ 22 دسمبر کو ذہن میں رکھیں۔ کیا اس دن آپ نے کسی کے ساتھ کوئی زیادتی کی؟ کسی کا گھر یا زمین چھینی؟ کسی کے خلاف اس تاریخ کو کوئی کیس جیتا؟ یا کوئی اور ظلم؟''

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دنیا میں لوگوں کے ساتھ ظلم کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ظلم کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اس دن انہیں اپنے مظالم کا حساب دینا ہوگا۔ سکندر بھی طاقت کے نشے میں چور لوگوں پہ ظلم پہ ظلم کرتا جا رہا تھا۔ اسے بھی اپنے ظلم کا احساس تک نہیں ہوا تھا نہ ہی آئندہ ہونا تھا مگر قدرت کی ستم ظریفی اسے ایسے مقام پر لے آئی تھی کہ وہ اپنا محاسبہ خود کرنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔ اسے اپنی زیادتیوں کی لسٹ خود تیار کرنی تھی اور وہ بھی پوری ایمانداری سے۔ وہ چاہ کے بھی اس میں ڈنڈی نہیں مار سکتا تھا۔

آج کے دن اس کی بیٹی اغوا ہوئی تھی۔ یہ اس کے لیے قیامت کا دن تھا۔ آج ہی اسے اپنے گناہوں کی لسٹ تیار کرنا پڑ رہی تھی۔ یہ اس کا یوم حساب بھی تھا۔

☆☆☆

اسلم ملازمین سے بیانات لے کے چلا گیا تھا۔ سکندر کو امید تھی کہ اغوا کار اس سے رابطہ کر کے شاید تاوان طلب کرے مگر میرا خیال اس سے مختلف تھا۔ اس کو تاوان کے طور پر جو کچھ لینا تھا پچھلی بار لے لیا تھا لیکن تاوان لے کے بھی اس نے ارمغان کو نہیں چھوڑا تھا۔ اب اگر وہ تاوان مانگتا بھی تو سکندر اسے نہ دیتا۔ اسے اس چیز کا اندازہ تھا۔ اس لیے وہ تاوان مانگ کے اپنا وقت ضائع نہیں کر رہا تھا۔ بغیر رابطہ کیے وہ سکندر کو زیادہ اذیت دے سکتا تھا جو اس کا اصل مقصد تھا۔

پولیس کے جانے کے بعد ہم دفتر آ گئے تھے۔ اب ہم دفتر میں بیٹھے سکندر کے ان مظالم کی لسٹ تیار کر رہے تھے۔ وہ ظلم جو اس نے 22 دسمبر کو لوگوں پہ کیے تھے۔

یہ ظلم ہمارے معاشرے میں اتنے عام ہیں کہ اب سہنے والے بھی چپ چاپ ہی برداشت کرتے چلے جاتے ہیں اور کرنے والوں کو کبھی احساس تک نہیں ہوتا۔

سکندر کو بھی زندگی بھر احساس تک نہ ہوتا، مگر اسے اپنا حساب دنیا میں ہی دینا پڑ گیا تھا۔ ارمغان کے اغوا کے وقت اس نے اپنے یہ سارے مظالم پولیس سے چھپا لیے تھے۔ اس نے اپنے لوگوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنے ظلم کے شکار لوگوں پر مزید ظلم ڈھائے تھے، لیکن اسے حاصل کچھ نہیں ہوا تھا۔

اس نے پرانی فائلز نکلوالی تھیں۔ جن لوگوں کے ساتھ ان کے کیسز چلتے رہے تھے۔ ان کا ریکارڈ تو اسے مل گیا تھا مگر باقی زیادتیاں تلاش کرنے کے لیے اسے اپنی یادداشت کو کھنگالنا تھا۔

میں ڈائری پکڑ کے بیٹھا تھا۔ وہ مجھے اپنے مظالم کی تفصیل بتاتا جا رہا تھا۔

''22 دسمبر 2005ء، میں نے اعتزاز حسن نامی ایک شخص سے ایک کنال کے پلاٹ کا کیس جیتا تھا۔ میں نے اس سے یہ پلاٹ خریدنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے اپنا پلاٹ بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے پلاٹ کے جعلی کاغذات تیار کرا لیے۔ میں نے اس پر تعمیرات شروع کیں تو اعتزاز نے عدالت سے اسٹے لے لیا۔ چھ ماہ تک کیس چلتا رہا۔ جج میرا دوست تھا، کچھ میں نے اس پر خرچا کیا تو اس نے فیصلہ میرے حق میں دے دیا۔ عدالت کے احاطے میں اعتزاز مجھ سے ملا۔ اس کا جملہ آج مجھے یاد آ رہا ہے۔ اس نے کہا تھا۔

''دنیا میں جج بک جاتے ہیں، فیصلے بدل جاتے ہیں، انصاف گم ہو جاتا ہے مگر یاد رکھنا روزِ حساب نہ تم جج خرید سکو گے اور نہ ہی فیصلہ تبدیل کرا سکو گے۔ انصاف جو دنیا میں گم ہو گیا ہے اس دن مجھے ضرور مل جائے گا۔'' وہ یہ کہہ کے رکا نہیں تھا۔

میں اس کے ان جملوں کو سن کے ہنس دیا تھا۔ وہ اٹھارہ بیس سال کا جذباتی نوجوان تھا۔ لگتا تھا یہ شخص فلمیں بہت دیکھتا ہے۔ میں نے اس کے متعلق یہی رائے قائم کی تھی۔ میں اسے بھول ہی گیا تھا مگر آج مجھے اس کا جملہ لفظ بہ لفظ یاد آ رہا ہے۔'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بول رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا اس کے حلق میں نمی گھل رہی ہے۔

میں دل ہی دل میں حالات کی ستم ظریفی پہ ہنس دیا۔ حالات کیسے ذہن میں اس شخص کے جملوں کو بھی تر و تازہ کر دیتے ہیں جسے آپ ہمیشہ کے لیے اپنے ذہن سے کھرچ چکے ہوتے ہیں۔

میں نے ڈائری میں یہ واقعہ اور اس سے متعلق وہ ساری تفصیلات لکھ دیں جس کی ضرورت پولیس کو پڑ سکتی تھی۔

''22 دسمبر 2006ئ۔ میں سائٹ پر موجود... کام چیک کر رہا تھا کہ اچانک ایک عورت نے آ کے میرا گریبان پکڑ لیا۔ وہ چلّا چلّا کے مجھے بددعائیں دے رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میرے ساتھیوں نے اسے مجھ سے الگ کیا۔ وہ ان کے قابو میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ میرے ایک ساتھی نے اسے زور سے پیچھے دھکیلا۔ وہ پیچھے جا گری۔ اس کا سر دیوار کے نکیلے سرے سے ٹکرایا۔ اس کے سر سے خون جاری ہو گیا۔ وہ خون آلود چہرے کے ساتھ بولی تھی۔ ''تو نے میرے بچوں کے سر سے سایہ چھینا۔ خدا تیرے بچوں کے سر پر بھی سایہ نہیں رہنے دے گا۔''

اس نے اور بھی بہت اول فول بکا تھا مگر میں اسے نظر انداز کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ کے چلا گیا تھا۔'' وہ تھکے تھکے انداز میں بول رہا تھا۔

میں نے سارا واقعہ ڈائری میں لکھا۔

''اس عورت کا نام؟'' میرا سوال سن کے اس نے سیل جیب سے نکال لیا۔

''ٹھیکیدار اس کا نام بتا سکتا ہے۔'' بیل جانے کے دوران اس نے مجھے بتایا۔

میں منتظر نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ گویا ہوا۔ ''سکینہ...... وہ بیوہ تھی۔ اس کے تین بچے بھی تھے۔ وہ کرائے کے گھر میں رہتی تھی۔ میں نے اس کے جس

... ایا تھا۔ وہ اس پر مکان تعمیر کرنے کے لیے پیسے ... تھی۔ وہ اور اس کے بچے پورا دن لفافے بناتے ... تھے۔ جو وہ شام کو کسی جگہ بیچ آتی۔ ٹھیکیدار کو وہ یاد تھی۔ اس نے مجھے یہ سب تو بتا دیا ہے مگر اس واقعے کے بعد اس ... سکینہ یا اس کے بچوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا۔“

میں نے سکینہ کے ساتھ ٹھیکیدار کا نام، پتا اور فون نمبر سکندر سے پوچھ کے ڈائری پہ لکھ دیا۔

”ان دونوں نے اپنا فیصلہ خدا پہ چھوڑ دیا تھا۔ میرا نہیں خیال کہ آپ کے بچوں کے اغوا میں یہ ملوث ہو سکتے ہیں۔“

”پتا نہیں، میں تو بس اپنے گناہوں کو یاد کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہا ہوں۔“ وہ عجیب سے انداز میں بولا۔ ارمغان کے اغوا کے بعد سکندر کافی بدل گیا تھا مگر آج بیٹی کے اغوا کے بعد تو وہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔ بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے...... میں بس یہی سوچ سکا۔

اب وہ تیسرے واقعے سے متعلق بتا رہا تھا۔

”دسمبر میں اس سے ملتا جلتا واقعہ ایک اور بار بھی میرے ساتھ رونما ہوا تھا۔ مجھے ٹھیک تاریخ تو یاد نہیں مگر مہینہ دسمبر کا ہی تھا۔ اس بار پندرہ سولہ سالہ نوجوان نے میرا گریبان پکڑ لیا تھا۔ اس نے مجھے مارنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ میرے ساتھیوں نے بڑی مشکل سے اسے مجھ سے الگ کیا تھا۔ وہ مغلظات بک رہا تھا اور بار بار مجھے مارنے کے لیے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ مجبوراً میرے ساتھیوں کو اسے سبق سکھانا پڑا تھا۔ انہوں نے اسے مار مار کے لہولہان کر دیا لیکن اس کے باوجود وہ مغلظات بکنے سے باز نہیں آیا تھا۔ اسے ایک لڑکے نے آ کے سہارا دے کے اٹھایا تھا۔ مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ وہ اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے مجھ سے کچھ کہا نہیں تھا۔ مگر جن نگاہوں سے اس نے مجھے گھورا تھا وہ میں آج تک بھول نہیں پایا۔ ان آنکھوں میں بے پناہ نفرت تھی، اور غیظ و غضب کی ایسی آگ بھڑک رہی تھی جو سب کچھ جلا کے بھسم کر دیتی ہے۔ وہ اپنے بھائی کو اٹھا کے وہاں سے لے گیا تھا لیکن اس کی نگاہوں نے کئی دن تک مجھے بے چین رکھا تھا۔“

”یہ لڑکا ہو سکتا ہے آپ کے بچوں کے اغوا میں ملوث ہوں۔ ان کا نام پتا آپ کے علم میں ہے؟“ میں پُرسوچ انداز میں بولا۔

”بڑے لڑکے کو نصیر کے نام سے سب پکار رہے تھے۔ اس کے علاوہ میں ان کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“ وہ بے بسی سے بولا۔

میں نے دیگر لوگوں کے جو اُدھر موجود تھے نام، پتے، سکندر سے پوچھ کے ڈائری میں اس واقعے کے ساتھ لکھ دیے۔

اب 22 دسمبر سے متعلق تین افراد ہو گئے تھے جو مشکوک تھے اور ان تینوں میں ایک قدرِ مشترک تھی۔ ان تینوں کے موجودہ حالات کے متعلق کوئی کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ یہ صرف ایک تاریخ کی بڑی زیادتیاں تھیں جو سکندر نے لوگوں سے روا رکھی تھیں۔ اگر اسے اپنی پوری زندگی کی زیادتیوں کی لسٹ تیار کرنا پڑ جاتی تو......

یہ خیال آتے ہی میرے لبوں پر تلخ سی مسکراہٹ ابھری۔ فی الحال تو اسے صرف ایک تاریخ کی غلطیوں کا حساب دینا پڑ رہا تھا۔ ایک روز ایسا بھی آنا تھا جب اسے اپنی ہر غلطی کا حساب دینا تھا۔

ایک فائل کے صفحات کو الٹتے پلٹتے سکندر اپنی سیٹ سے اچھل پڑا۔

”تمہیں پتا ہے ناں کاروبار میں میرا سب سے بڑا حریف کون ہے؟“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”یوں تو آپ کے بہت سے کاروباری حریف ہیں مگر ان میں سب سے کینہ پرور اور آپ سے خار کھانے والا شخص میرے خیال میں تو وحید صدیقی ہی ہے۔“

”ہاں بالکل تم نے ٹھیک پہچانا۔ ہماری رقابت کا آغاز پتا ہے کس تاریخ کو ہوا تھا؟“

”22 دسمبر کو؟“ میرا انداز سوالیہ تھا۔

”بالکل، میں نے جو پہلی بڑی اراضی خریدی تھی اس میں یہ بھی دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے بعد میں مجھ سے بھی وہ زمین خریدنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اسے زمین بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ زمین میں نے 22 دسمبر ہی کو خریدی تھی۔“

”ہم...... پھر تو ہو سکتا ہے وہ اس طرح اپنا انتقام لے رہا ہو۔ اسے تو دوہرا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک تو آپ سے انتقام لے کے اس کی انا کو تسکین مل سکتی ہے اور دوسرا آپ اولاد کی پریشانی میں کاروبار کو بھرپور توجہ نہیں دے پائیں گے تو مارکیٹ میں اس کا ایک حریف اور وہ بھی سب سے بڑا حریف کم ہو جائے گا۔“ میں پُرسوچ انداز میں بولا۔

”میں نے اس کا نام پہلے بھی پولیس کو لکھوا دیا تھا۔ اس وقت تو اس کا نام بس میں نے بطور دشمن لکھوایا تھا مگر اب اس کے خلاف ہمیں مضبوط جواز بھی میسر آ گیا ہے۔“ وہ ...

سے بولا۔

میں نے ڈائری میں اس کے متعلق ساری تفصیلات بھی لکھ دیں۔ 22 دسمبر کی تاریخ جانے کیوں میرے دماغ میں چبھ رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اس دن کوئی اور بھی اہم واقعہ رونما ہوا تھا۔ یکایک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

''ملک رمضان کو ہم نے 22 دسمبر ہی کو ہاؤسنگ سوسائٹی بیچی تھی ناں۔'' میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

''ہاں، اور اسی دن ارمغان اغوا ہوا تھا۔'' میرا سوال سن کے اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی تھی۔

''اس نے یہ سودا 22 دسمبر ہی کو کرنے پہ خاصا زور دیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ 22 دسمبر کو ایک ماہ کے لیے باہر چلا جائے گا۔ میں نے اسے 22 دسمبر سے پہلے سودا فائنل کرنے کا کہا تھا لیکن وہ نہیں مانا۔ کہہ رہا تھا پھر سودا اس کی آمد کے بعد کیا جائے۔ وہ جانتا تھا کہ ہم ہر صورت اس کے جانے سے پہلے سودا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اس نے 22 دسمبر ہی کو وقت کم ہونے کے باوجود سودا فائنل کیا۔ ہم اس کے پاس ہی موجود تھے جب آپ کو ارمغان کے اغوا کی اطلاع ملی۔ آپ نے کہا تھا کہ کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے، مجھے جانا پڑے گا لیکن اس نے آپ سے ایمرجنسی کے حوالے سے ایک لفظ تک نہیں بولا تھا۔ نہ اس وقت نہ آپ کے دستخط کرنے کے بعد جب ہم روانہ ہو رہے تھے۔'' میں پُرجوش انداز میں بولا۔

''ٹھیک لیکن، اس کے لیے یہ تاریخ کیوں اہم ہوسکتی ہے؟'' اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

''یہ تو چیک کرنا پڑے گا۔''

ہم رات دس بجے تک اُدھر ہی بیٹھے رہے۔ ملک رمضان بھی مشکوک تھا لیکن وہ ایسا کیوں کرسکتا تھا اس کا جواب ہمیں نہیں مل سکا تھا۔

باہر نکلے تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ مطلع صبح سے ابر آلود تھا مگر بارش اب برسنا شروع ہوئی تھی۔ ہم گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے بھیگ گئے۔

واپسی پر بھی ہم ایسے لوگوں کے متعلق گفتگو کرتے رہے جو 22 دسمبر کے حوالے سے مشکوک ہوسکتے تھے۔

وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ دفتر وہ میری گاڑی میں گیا تھا۔ اب میں اسے اس کے گھر ڈراپ کر کے اپنے گھر چلا جاتا۔

کھڑکی کے شیشے کے ساتھ سر ٹکائے وہ گہری سوچ میں گم تھا۔ دفعتاً وہ جوش سے بولا۔

''22 دسمبر کو تو......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا، وہ کچھ نہیں بولا۔

''آپ کچھ بتا رہے تھے کہ 22 دسمبر کو......؟''

''کچھ نہیں...... وہ ایک پرسنل معاملہ تھا'' اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہتے ہوئے پھر سر شیشے کے ساتھ ٹکا لیا۔

میں نے اسے مزید نہیں کریدا۔

میں نے سے گھر ڈراپ کیا۔ جب میں جانے لگا تو وہ میری طرف جھک کے بولا۔

''ایک بات یاد رکھنا۔'' میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے پہ اکتفا کیا۔

''دنیا میں تم واحد ہو جسے میں دوست مانتا ہوں۔ میں تم پر خود سے زیادہ اعتماد کرتا ہوں۔'' وہ ہر ایک لفظ پُرزور دے کے بولا تھا۔

میں مسکرایا۔ ''میں جانتا ہوں۔ آپ کو یہ یاد کرانے کی ضرورت کیوں پڑی؟''

''میں خود کو تنہا پا رہا ہوں۔ میرا ساتھ نہ چھوڑنا۔'' وہ بھیگے لہجے میں کہتا ہوا اندر کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ اور کہنا چاہتا ہے مگر کچھ سوچ کے اس نے اپنی بات بدل دی تھی۔ اس کا رویہ عجیب ہو رہا تھا۔ میں واپسی پہ اس کے رویّے کا تجزیہ کرتا رہا۔ مجھے اس کے رویّے کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔

جس شخص کا دوسرا بچہ ایک سال کے وقفے کے سے اغوا ہو چکا ہو۔ اس کے رویّے کو تو ماہر نفسیات کے لیے سمجھنا مشکل تھا، میں کیسے اس کا رویہ سمجھ سکتا تھا؟

☆☆☆

''بہت دیر لگا دی آپ نے؟'' رومی نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔ اس کی آنکھوں میں فکرمندی نظر آرہی تھی۔

''سکندر کو اس کے گناہوں کی لسٹ تیار کرانے میں مدد کر رہا تھا۔'' میرے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کیا مطلب؟'' اس کی آنکھوں میں اُلجھن تیری۔

''مطلب کھانا کھاتے ہوئے بتاؤں گا۔'' میں مسکرایا۔

''اوکے، آپ فریش ہو کے آجائیں، جب تک میں کھانا لگا دیتی ہوں۔''

کھانا کھانے کے دوران میں نے اسے سکندر کی بیٹی

کے اغوا کا بتایا۔ توقع کے مطابق وہ میرے متعلق فکرمند ہو گئی۔

''آپ کو اس سارے چکر میں ملوث ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ بس اپنے کام سے کام رکھیں تو زیادہ بہتر نہیں۔'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

میں نے اس کا لہجہ نظرانداز کیا اور کہا۔ ''میں تو بس اس کی مدد کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''مجھے ڈر ہے کہیں یہ مدد آپ ہی کو نہ مہنگی پڑ جائے۔''

''تم فکر نہ کرو میری جان، وہ مجھ پہ بقول اس کے وہ اپنے آپ سے بھی زیادہ اعتماد کرتا ہے۔'' میرے لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''وہ ایسی باتیں کہہ کے بس آپ کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ میرا مشورہ آپ کو یہی ہے کہ بس کام کے سوا اس سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں۔''

''استعمال تو ہر شخص ہی دوسرے کو کر رہا ہے۔ میں اسے استعمال کر رہا ہوں۔ وہ مجھے استعمال کر رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے دنیا میں تمام انسانوں میں بس ایک رشتہ ہے۔ مفاد کا رشتہ۔'' میرا لہجہ فلسفیانہ تھا۔

''اچھا زیادہ فلسفہ نہ جھاڑیں۔ میری بات پر غور کریں۔ اس کی حد سے زیادہ قربت آپ کو مشکوک بھی کر سکتی ہے۔'' وہ یہ کہہ کے اٹھ گئی۔ میں اس کی بات پر غور کرنے لگا۔

☆☆☆

رومی کا اندیشہ ٹھیک ثابت ہوا تھا۔ پچھلے دو تین دن سے میں جہاں جا رہا تھا۔ ایک سرخ رنگ کی خیبر کو اپنے عقب میں پا رہا تھا۔ اس میں ایک شخص بیٹھا ہوتا تھا۔ جو جانے پولیس کا آدمی تھا یا سکندر کا۔ وہ جو بھی تھا مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا نہ اس کے تعاقب سے مجھے کوئی فرق پڑ رہا تھا۔ میری زندگی تو آج کل بس اپنے اور سکندر کے گھر کے علاوہ دفتر تک محدود تھی۔

سکندر نے ڈائری راؤ اسلم کے حوالے کر دی۔ وہ اب ان ''مظلومین'' کو بطور ''ملزمان'' تلاش کر رہا تھا۔

ہمارے سسٹم کی خرابی دیکھیں۔ ایک شخص خود اپنے جرائم کا اعتراف کر رہا تھا مگر پولیس اسے پکڑنے کے بجائے ان لوگوں کی تلاش میں تھی جن پر اس نے ظلم کیا تھا۔ صرف اس لیے کہ انہوں نے ایف آئی آر نہیں درج کرائی تھی۔ وہ لوگ معاشرے کے پسے ہوئے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

اسلم ان تمام لوگوں سے مل رہا تھا جن کی مدد سے مشکوک افراد کا پتا لگایا جا سکتا تھا۔ وحید صدیقی کو بھی چیک کیا جا رہا تھا لیکن مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ اس کی ان کوششوں کا کوئی نتیجہ نکلے گا۔

سکندر کو بھی آہستہ آہستہ صبر آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کے اغوا کو اپنے گناہوں کی سزا سمجھتے ہوئے قبول کر لیا تھا۔

یہ تقریباً دو ہفتے بعد کی بات ہے۔ اسلم دفتر میں سکندر سے ملنے آیا۔ میں بھی سکندر کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس نے ایک تصویر سکندر کو دکھائی۔ وہ تصویر کو بغور دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں پہچان کی رمق بیدار ہوئی تھی۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''یہ...... یہ تو نصیر اور اس کا بھائی لگ رہے ہیں۔''

''جی آپ نے ٹھیک پہچانا۔ یہ نصیر اور شبیر ہیں۔ یہ دونوں بھائی وہی ہیں۔ جن کے گھر پر آپ نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ اپنی ماں کو لے کے دوسرے شہر چلے گئے تھے۔ ان کی ماں مر چکی ہے۔ اب دونوں کا اٹھنا بیٹھنا جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ ہے۔ نصیر ایک دفعہ چوری کے جرم میں گرفتار بھی ہو چکا ہے۔ یہ پچھلے دو سال سے اسی شہر میں دیکھے جا رہے ہیں۔ ان دنوں وحید صدیقی کے ساتھ ان کا کافی اٹھنا بیٹھنا ہے۔'' اس کی باتیں سن کے سکندر کی آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔

اس کی بات مکمل ہوئی تو وہ بے تابی سے بولا۔ ''یہ بات ہے تو آپ ان دونوں کو گرفتار کر لیں۔ آپ کے پاس تو پتھر بھی بولنے لگتے ہیں، یہ بھی اپنے جرائم کا اعتراف کر لیں گے۔ آپ کی باتیں سن کے تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے بچوں کے اغوا میں یہ اور وحید دونوں ملوث ہیں۔''

''فی الحال تو میں نے ان پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ جوں ہی ان کے حوالے سے کوئی مشکوک بات سامنے آئی، میں ان پر ہاتھ ڈال دوں گا۔''

''میرے خیال میں آپ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آپ انہیں گرفتار کر کے ان سے سب پوچھ کیوں نہیں لیتے؟''

ایس ایچ او کے چہرے پہ ناگواری کے تاثرات ابھرے۔ ''میں اپنا کام بہتر سمجھتا ہوں۔ آپ کے پاس بس میں ان کی پہچان کے لیے حاضر ہوا تھا۔ اب میں چلتا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''لگتا ہے آپ کو میری بات بری لگ گئی ہے۔ آپ یہ یاد رکھیں کہ میں ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوا، اپنے بچے کی جدائی برداشت کر رہا ہوں۔ اب مجھ سے مزید صبر نہیں

ہوتا۔" وہ اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"صبر تو آپ کو کرنا ہی ہوگا۔ آپ کو اپنا بویا ہوا ہی کاٹنا پڑ رہا ہے۔" اس کا جملہ سن کے سکندر کو چپ لگ گئی۔

☆☆☆

میرا تعاقب بدستور جاری تھا مگر میں حسبِ معمول اپنی تمام سرگرمیاں سرانجام دے رہا تھا۔ سکندر ہر روز اسلم سے فون پر پوچھتا کہ اس نے نصیر اور اس کے بھائی کو گرفتار کیا ہے یا نہیں۔ ہر بار اسے جواب نفی میں ملتا۔ آخر ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

دوپہر کو لنچ کے بعد میں دفتر میں آ کے بیٹھا ہی تھا کہ سکندر آدھمکا۔ "چلو، وحید صدیقی سے ملنے چلتے ہیں۔" وہ چھوٹتے ہی بولا۔

"کیوں، خیریت؟" میں نے حیرانی سے استفسار کیا۔

"ہاں، ہاں خیریت ہی ہے، تم چلو میرے ساتھ۔"

راستے میں اس نے بتایا کہ اسے اپنے ذرائع سے پتا چلا ہے کہ نصیر اور شبیر اس وقت وحید صدیقی کے پاس ہیں۔

"تو، آپ انہیں اٹھوا لیتے ناں۔ خود ان کے پاس جانے کی کیا ضرورت؟" میرے لہجے میں خفیف سا طنز تھا جو اس نے محسوس ہی نہیں کیا۔

"وہ لوگ اب اتنے کمزور نہیں رہے کہ انہیں اتنی آسانی سے اٹھوایا جاسکے۔ جرائم کی دنیا میں وہ ٹھیک ٹھاک نام کما چکے ہیں۔" اس کے انداز میں بے بسی دیکھ کے مجھے عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔ وقت گاڑی کے پہیے کی طرح ہوتا ہے کبھی انسان کو عروج پہ لے جاتا ہے اور کبھی اپنے ہی تلے روند دیتا ہے۔

سکندر کا بھی برا وقت شروع ہوگیا تھا، وقت اسے اپنے قدموں تلے روند رہا تھا۔ نصیر اور شبیر کا وقت انہیں عروج پہ لے گیا تھا۔ بازی پلٹ چکی تھی۔ کل کا حاکم کل کے مجبوروں کے سامنے آج مجبور ہوگیا تھا۔

"وحید سے ان کا کیا چکر چل رہا ہے؟" میں نے موضوع تبدیل کردیا۔

"پتا نہیں، بظاہر تو زمین ہی کا چکر چل رہا ہے۔ وہ وحید سے کوئی زمین خریدنے۔۔۔ کی کوشش کررہے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے وحید ان کے دل میں موجود میری نفرت کو، میرے خلاف استعمال کررہا ہے۔" وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

وحید کا دفتر زیادہ دور نہیں تھا۔ ڈرائیور نے ہمیں دس منٹ میں ہی وہاں پہنچادیا۔ وحید اور سکندر کے تعلقات بظاہر ٹھیک ہی تھے۔ وہ کہیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آجاتے تو دعا سلام کرلیتے تھے مگر درپردہ دونوں ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے۔

ہمیں گارڈ نے دفتر سے باہر ہی روک لیا۔ "صاحب میٹنگ میں ہیں۔"

گارڈ کی بات سن کے سکندر نے گالی بکی۔ "میٹنگ میں ہے تو ہم لابی میں انتظار کرلیں گے۔ ہمیں اندر تو جانے دو۔" وہ جارحانہ انداز میں بولا۔

گارڈ پر اس کے لہجے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ "صاحب نے آپ کو لابی میں بھی بٹھانے سے منع کیا ہے۔" وہ سکندر کے آگے ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

سکندر اپنی اتنی بے عزتی برداشت نہ کرسکا۔ بیٹی کے اغوا کے بعد ویسے بھی وہ ڈپریس رہنے لگا تھا۔ اس کا ڈپریشن ظاہر ہوگیا۔ وہ مغلظات بکنے لگا۔ اس کا شور سن کے اندر سے دو افراد باہر نکلے۔ میں نے ان کی تصاویر دیکھ رکھی تھیں۔ یہ نصیر اور شبیر ہی تھے۔

"کیا بات ہے، کدھر گھسے جارہے ہو؟" نصیر نے سکندر کو پیچھے دھکیلا جو دروازہ کھلتے ہی اندر جانے لگا تھا۔

سکندر کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے سکتہ زدہ رہ گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پہچان کی رمق دیکھی۔ اگلے ہی پل اس کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔ اس نے سکندر کو ایک اور دھکا دیا۔ سکندر لڑکھڑا کے پیچھے گیا۔ نصیر نے اس کے گال پہ زوردار تھپڑ جڑ دیا۔ میں نے اس کے ہونٹوں سے خون رستے دیکھا۔ وہ غیظ وغضب سے مغلوب ہو کے نصیر پہ پل پڑا۔ نصیر اب چودہ پندرہ سال کا لڑکا نہیں تھا۔ اس نے سکندر کی خوب دھلائی کی۔ وہ لہولہان ہوگیا۔ لوگوں کا جمگھٹا لگنا شروع ہوگیا تھا۔ وہ سب سکندر کی پٹائی ہوتے دیکھ رہے تھے مگر کوئی اسے چھڑانے کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں، میں نے سکندر کے ڈرائیور کو بھی تماشا دیکھتے دیکھا۔

میں نے اسے چھڑانے کی کوشش کی تو شبیر نے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میں بس اتنا کہہ سکا۔

"اس کو روکو۔ یہ انہیں جان سے ماردے گا۔"

"نہیں مارے گا جان سے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

سکندر اب زمین پہ گرچکا تھا۔ نصیر نے اس کے سر پہ ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔ "آج میں نے تم سے اپنا آدھا بدلہ لے لیا۔ انتظار کرنا، میں جلد آؤں گا، اپنی زمین واپس لینے۔"

شبیر نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ میں بھاگتا ہوا سکندر کے پاس گیا۔ اس کا سر اٹھا کے اپنی گود میں رکھا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ نصیر اور شبیر دفتر کے دروازے میں کھڑے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ ان کے عقب میں مجھے وحید صدیقی کا مطمئن اور مسرور چہرہ نظر آیا۔

وقت نے اپنے آپ کو دہرایا تھا۔ کل کے مظلوم نے کل کے ظالم سے آج اپنا بدلہ لے لیا تھا۔ کل سکندر کے ساتھ کھڑے بہت سے لوگوں نے اپنے خون میں لت پت پڑے نصیر کو ہمدری کی نظر سے بھی دیکھا ہوگا مگر آج تماشائیوں کی نظروں میں مجھے ہمدردی کے بجائے تضحیک اور نفرت نظر آئی۔ وہ سکندر کو پٹتے دیکھ کے خوش ہوئے تھے۔ عام تماشائیوں کا یہ رویہ دیکھ کے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ سکندر کے مظالم سے پورا شہر واقف تھا۔ وہ سب اس سے نفرت کرتے تھے اور شاید مجھ سے بھی......

☆☆☆

شام کو میں اور سکندر نصیر کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے تھانے پہنچے۔ ہمارے ساتھ دو گن مین بھی تھے جو سکندر نے اپنے تحفظ کے لیے ساتھ رکھ لیے تھے۔

وہ اسی وقت تھانے میں رپورٹ کرانے آنا چاہتا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے رضامند کر کے میں پہلے اسپتال لے کے گیا۔ اسپتال سے مرہم پٹی کرانے کے بعد ہم سیدھا تھانے آئے تھے۔ سکندر نے میڈیکل رپورٹ بھی بنوالی تھی۔

ہم تھانیدار کے کمرے میں داخل ہوئے تو چونک گئے۔ نصیر اور شبیر اُدھر ہی بیٹھے تھے۔ وحید بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ اسلم کے ساتھ بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ ان کے قہقہوں کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔ اس بے تکلفانہ ماحول کو دیکھتے ہی سکندر کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے خود کو قابو کیا اور پھر پورے طمطراق سے کمرے میں داخل ہوا۔

اسلم ہمیں دیکھ کے گڑبڑا کے کھڑا ہوگیا۔ ”آئیں سکندر صاحب، میں ابھی آپ کو فون کر کے بلوا رہا تھا۔“

”کیوں؟“ سکندر تیکھے لہجے میں بولا۔

”یہ لوگ آپ کے خلاف ٹریس پاس کی رپورٹ درج کرانے آئے تھے۔ میں انہیں سمجھا رہا تھا کہ یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں، میں ابھی سکندر صاحب کو بلوا کے سمجھا دیتا ہوں۔“

میں نے سکندر کے چہرے پہ گہری ہوتی نفرت دیکھی۔ ”تم مجھے نہ سمجھاؤ، انہیں سمجھاؤ۔ یہ کل کے پلے میرے دشمن کی ذرا سی شہ ملنے پہ کیسے بدمعاش بنے پھرتے ہیں۔“

اسلم کے چہرے پر ناگواری کا سایہ لہرایا تاہم اس نے خود کو قابو میں رکھا۔ ”آپ بیٹھ کے مہذب انسانوں کی طرح بات کریں۔“ اس کے لہجے میں چبھن تھی۔

سکندر غصے سے بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی میڈیکل رپورٹ اس کی طرف بڑھائی۔ ”ان لوگوں نے مجھے پر تشدد کیا ہے۔ میں ان کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے آیا ہوں۔“ وہ نفرت بھری نظروں سے ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کول سکندر صاحب کول...... آپ نے زبردستی ان کے دفتر میں گھسنے کی کوشش کی تھی۔ میں اگر رپورٹ درج کروں تو پہلے آپ کے خلاف کروں گا مگر بہتر ہے آپ لوگ اپنا مسئلہ افہام و تفہیم سے حل کر لیں۔“ اس کے لہجے میں چھپی تنبیہ صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں نے سکندر کے چہرے پر غصہ ابھرتے دیکھا جو تیزی سے بے بسی میں ڈھل گیا۔

اب میری انٹری ضروری ہو گئی تھی۔ ”اسلم صاحب، ہم نے زبردستی اندر داخل ہونے کی کوشش ہرگز نہیں کی تھی۔ گارڈ نے بتایا تھا کہ وحید صاحب میٹنگ میں مصروف ہیں۔ ہم تو بس دیگر مہمانوں کی طرح لابی میں بیٹھ کے ان کا انتظار کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جو سکندر صاحب کے ساتھ مار پیٹ کی، انہیں اس پر معذرت طلب کرنا ہوگی۔ ورنہ ہم ایف آئی آر درج کرائے بغیر نہیں جائیں گے۔“ میرا لہجہ اٹل تھا۔

میری بات سن کے اسلم بولا۔ ”میں خود ان سے یہی کہہ رہا تھا کہ سکندر صاحب آج کل پریشان ہیں۔ اگر وہ پریشانی کے عالم میں گندی گندی گالیاں دے بھی رہے تھے تو انہیں برداشت کر لینا چاہیے تھا۔“ اس کے لہجے میں طنز تھا۔ میں نے سکندر کا چہرہ متغیر ہوتے دیکھا۔ میں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”جی یہ جس پریشانی میں ہیں، اللہ ایسی پریشانی کسی دشمن کو بھی نہ دے۔“ میں ان تینوں کی طرف دیکھ کے چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”لابی میں ہرا یرا غیرہ بیٹھ سکتا ہے۔ انہوں نے گارڈ سے کہہ کے ہمیں لابی تک میں بیٹھنے سے منع کیا۔ ہم ان کے معزز مہمان تھے۔ ہمارے ساتھ انہوں نے جو سلوک کیا، اس کے بعد یہ کم از کم گالیوں کے حقدار تو بنتے ہی تھے۔“ میرے لہجے میں خفیف سا طنز تھا۔ وہ تینوں ابھی تک خاموشی سے بیٹھے تھے۔ انہیں بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ان کی ترجمانی تھانیدار خود جو کر رہا تھا۔

ناں یہ میرے کہنے پر آپ سے معافی مانگ لیں ... آپ لوگ ایک دوسرے کے سامنے نہیں آئیں ... لوگوں کی وجہ سے شہر میں امن و امان کا کوئی مسئلہ ... میں یہ بھول جاؤں گا کہ سکندر صاحب ماضی میں ... خان رہ چکے ہیں۔'' اس کا انداز اٹل تھا۔ میں نے ... کے چہرے پہ حیرت پھیلتی دیکھی۔ اسے یقین نہیں آرہا ... ایک معمولی تھانیدار اس سے اس لہجے میں بھی بات کر ... ہے۔

وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ سکندر بے یقینی سے انہیں باہر جاتا دیکھتا رہا۔ نصیر اس کے کان میں جھک کے بولا ''ہماری زمین ہمیں واپس نہ ملی تو اپنے باقی دونوں بچوں کو جتنے چاہے پردوں میں چھپا کے رکھو، وہ بھی ادھر ہی پہنچ جائیں گے جہاں تمہارے بڑے دو بچے پہنچ چکے ہیں۔''

اس کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ میرے علاوہ وہ دھمکی تھانیدار نے بھی سن لی ہوگی مگر اس نے ظاہر ایسے کیا تھا جیسے اس نے یہ دھمکی سنی ہی نہیں۔ پتا نہیں وہ انہیں ''حق'' پہ دیکھ کے ان سے ہمدردی جتا رہا تھا یا اسے اس ہمدردی کا ''صلہ'' مل چکا تھا۔

میں نے سکندر کا رنگ فق ہوتے دیکھا۔ مجھے لگا کہ وہ سب کچھ بھول کے ادھر ہی نصیر پر پل پڑے گا، میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ اس نے چونک کے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔

نصیر تھانے میں، تھانیدار کے سامنے اسے دھمکی دے کے پورے دبدبے سے چلتا ہوا رخصت ہو گیا۔ سکندر بے بسی سے اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

واپسی پر سکندر بے حد غصے میں تھا۔ وہ ان تینوں کے علاوہ اسلم کے بارے میں بھی مغلظات بک رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسلم رقم لے کے بک گیا ہے تبھی اس کا رویہ ان کے ساتھ ہمدردانہ ہے۔ میں بھی اس سے متفق تھا لیکن ہم بے بس تھے۔

یہ چند سال پہلے ہی کی بات تھی کہ تھانے کا تقریباً سارا ...عملہ سکندر کے آگے بچھا رہتا تھا۔ اس نے انہیں خوش رکھا ہوا تھا اور نتیجے میں...... غیر قانونی کاموں میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ میری آمد کے بعد سین تبدیل ہو گیا تھا۔ میں ان تمام اخراجات کو غیر ضروری سمجھتا تھا۔ میں نے سکندر کو وہ سارے کام طریقے سے کرنا سکھا دیے تھے جو وہ پہلے بدمعاشی سے کرتا تھا۔ اب اسے، پولیس والوں کو ان کا حصہ دینے کی ضرورت نہیں رہی تھی مگر اس کے باوجود وہ اس کا احترام کرتے تھے کیونکہ اس کے پاس پیسے کی طاقت تھی۔ جو فی زمانہ سب سے بڑی طاقت ہے۔

آج پہلی بار سکندر کو احساس ہوا تھا کہ اس کی ''عزت'' کرنے والی پولیس آج اس کے خلاف ہو چکی ہے کیونکہ اس کے پاس پیسے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ اس کے دشمن اس سے زیادہ طاقتور ہو گئے تھے۔ اب تھانے والے ان کی مٹھی میں تھے کیونکہ وہ ان کی مٹھی گرم رکھنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ سکندر یہ استطاعت کھو چکا تھا۔

یہ دکھ سکندر کے لیے بہت بڑا تھا۔ حاکم سے محکوم، طاقتور سے کمزور، خاص سے عوام کا یہ سفر شاید کسی کے لیے بھی قابلِ برداشت نہیں ہوتا، سکندر کے لیے بھی یہ قابلِ برداشت نہیں تھا۔ وہ سارا راستہ گالیوں کی صورت میں اپنے اس غم کا مداوا کرنے کی کوشش میں لگا رہا تھا۔ میں نے اسے بولنے دیا۔ آخر کار وہ یہ حقیقت بھی قبول کر ہی لیتا۔

اب سکندر کی آمدنی کرایوں اور قسطوں سے حاصل ہونے والی رقم ہی رہ گئی تھی۔ گو کہ یہ رقم ماہانہ لاکھوں میں بنتی تھی مگر اس سے صرف اخراجات پورے ہو سکتے تھے کوئی نیا پروجیکٹ شروع نہیں ہو سکتا تھا۔ چالیس کروڑ روپے کا جھٹکا اتنا بڑا تھا کہ اس کے بعد وہ کوئی نیا پروجیکٹ شروع نہیں کر سکا تھا۔ نئے پروجیکٹ کے لیے زمین تو اس کے پاس تھی لیکن اس کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت تھی۔ سکندر کو ڈوبتا دیکھ کے اس کے سارے یار دوستوں نے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ اب سرمائے کی واحد صورت بینک لون ہی رہ گیا تھا۔ ان دنوں ہم اسی کی کوشش کر رہے تھے کہ سکندر کی بیٹی غائب ہو گئی تھی۔ اب پھر سارا کام ٹھپ پڑا تھا۔

یہ اگلے دن کی بات ہے، ہم دفتر میں بیٹھے تھے نصیر اور شبیر کی آمد کی اطلاع ملی۔ سکندر کا پارا ہائی ہو گیا۔ وہ انہیں اپنے گارڈز سے پٹوانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا۔

''اب ہم اتنے طاقتور نہیں رہے ہیں۔ اب دشمنوں سے سمجھوتا کرنا ہماری مجبوری ہے۔'' وہ واقعی میری بات مان گیا لیکن یہ حقیقت قبول کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ اس کے لیے اسے وقت چاہیے تھا اور ایسے جھٹکے بھی جیسا اسے کل لگا تھا۔ انسان ایسی مٹی سے بنا ہے کہ جب تک اسے جھٹکا نہ لگے اسے عبرت حاصل نہیں ہوتی۔

نصیر اور شبیر کی چال میں اکڑ تھی۔ سکندر اپنی نشست پر

بیٹھے معاندانہ نظروں سے گھورتا رہا۔ وہ دونوں آئے اور اس کے سامنے رکھی کرسیوں پر پھیل کے بیٹھ گئے۔ ان کا انداز فلمی تھا۔

نصیر نے میز پر رکھا پیپر ویٹ اٹھالیا۔ وہ اب اسے گھما کے اوپر پھینک کے کیچ کر رہا تھا۔ اس کا انداز استہزائیہ تھا۔

''ہمارا تمہاری طرف کچھ قرض بنتا ہے۔ ہم وہ لینے آئے ہیں۔'' نصیر نے یہ مکالمہ بالکل کسی ایکشن فلم کے ہیرو کی طرح کہا تھا۔ پیپر ویٹ سے کھیلنا اس نے جاری رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ شبیر سنجیدہ لگ رہا تھا۔ وہ گہری نظروں سے سکندر کو دیکھے جا رہا تھا۔

''کیسا قرض؟'' سکندر کے لہجے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنے کھولتے ہوئے خون پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔

''وہ جو تم نے ہم سے چھینا تھا۔ آج اس کی واپسی کا دن آگیا ہے اور وہ بھی سود سمیت......'' نصیر نے پیپر ویٹ رکھ دیا۔ اب وہ سکندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے سرد لہجے میں بول رہا تھا۔ میں نے سکندر کے چہرے کی رنگت متغیر ہوتے دیکھی۔

سکندر میرا باس ہونے کے ساتھ ساتھ دوست بھی تھا۔ اس کی ذہنی حالت آج کل ایسی نہ تھی کہ وہ کسی مناسب انداز میں جواب دے پاتا۔ اب میرا بولنا ضروری ہوگیا تھا۔

''آپ پہیلیاں نہ بجھوائیں، کھل کے بات کریں۔'' میں نے لہجے میں حسبِ ضرورت درشتگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''تم چھچھ گیری نہ کرو، اپنے کام سے کام رکھو۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ میں نے بمشکل خود کو کنٹرول کیا۔

''سر، آپ بتائیں، ان کا مسئلہ کیا ہے؟'' میں ان کا سارا مسئلہ جانتا تھا تاہم میں نے انجان بنتے ہوئے سکندر سے سوال کیا۔

اس نے میرا سوال نظر انداز کیا اور نصیر سے بولا۔

''میرے بچے کہاں ہیں؟''

''بچے تمہارے ہیں، پوچھ رہے ہو ہم سے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

''تم میرے بچے واپس کر دو، میں تمہاری زمین کی قیمت تمہیں ادا کر دوں گا۔'' اس کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ میں نہیں۔

''او کے، تم ہماری زمین کی قیمت ہمیں دو، سمجھو تمہارے بچے تمہیں واپس مل گئے۔'' نصیر کی بات سن کے میری آنکھوں میں حیرت ابھری۔ کیا... بچے واقعی اُن لوگوں نے اغوا کیے ہیں؟ یہ بات میرے لیے ناقابلِ یقین تھی۔

''میں پہلے اپنے بچوں کو دیکھنا چاہوں گا۔''

''دیکھ لینا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

سکندر کی آنکھوں میں اُمید کی چمک ابھری۔ ''کہاں ہیں وہ؟''

نصیر نے گھڑی دیکھی۔ ''چار بجنے والے ہیں۔ میرا خیال ہے گھر ہی پر ہوں گے۔ تم جا کے دیکھ لینا۔ زیادہ بے چینی ہو رہی ہے تو ابھی جا کے دیکھ لو۔'' اس کی بات سن کے میں سمجھ گیا۔ وہ سکندر کے جذبات سے کھیل رہا تھا۔ سکندر کی سمجھ میں ابھی بھی اس کی بات نہیں آئی تھی۔ وہ تو خوش امیدی کے سنہری باغ میں بھٹک رہا تھا۔

''کیا مطلب؟ وہ آگئے ہیں واپس؟'' اس کی آنکھوں میں بے یقینی بھی تھی اور امید بھی۔ مجھے اس پر بے اختیار ترس آیا۔

''آگئے ہوں گے نا، اسکولوں میں دو بجے تک تو چھٹی ہو ہی جاتی ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

سکندر الجھا۔ ''کیا مطلب۔''

''مطلب یہ کہ تمہارے دو بچے تمہارے پاس ہیں، تمہارے گھر میں۔ ہماری زمین جب تم نے چھینی تو اس کی قیمت دس لاکھ روپے تھی۔ آج اس کی مارکیٹ ویلیو تیس لاکھ ہے لیکن ہمیں تم سے پچاس لاکھ لینے ہیں۔ اگر یہ پچاس لاکھ ہمیں آج ہی نہ ملے تو تمہارے بچے تمہیں اپنے گھر نہیں ملیں گے۔'' نصیر یکدم ہی تیز انداز میں بولا تھا۔ اس کا بھائی ابھی تک خاموشی سے بیٹھا تھا۔

سکندر کی آنکھوں میں جلتی اُمید یکدم ہی بجھ گئی۔

''دیکھو میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ میں خود اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس پچاس لاکھ کی مالیت کا ایک پلاٹ ہے، میں وہ تمہیں دے دیتا ہوں مگر خدا کے لیے میرے بچوں کو چھوڑ دو۔ یہ دیکھو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔'' اس نے باقاعدہ ان دونوں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ آنسو اس کے رخساروں سے بہہ رہے تھے۔

میں نے ان دونوں کے چہرے پہ حیرت کے ساتھ ہمدردی ابھرتے دیکھی۔ ''تمہارے بچے ہمارے پاس نہیں ہیں۔'' اس بار نصیر نرم لہجے میں بولا تھا۔

''تو پھر کہاں ہیں وہ؟'' وہ بے بسی سے چلّایا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ .... سینے پر رکھ لیا تھا۔ اس کی پیشانی پسینے

ہونے لگی۔

''لگتا ہے اسے ہارٹ اٹیک ہو رہا ہے۔'' شبیر پہلی بار کچھ بولا تھا۔

میں بھاگا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ میں نے اسے پانی پلانے کی کوشش کی مگر پانی اس کی باچھوں پہ رسنے لگا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا۔ ان دونوں نے میری مدد کی۔ ہم نے اسے گاڑی میں ڈالا۔ میں پچھلی نشست پر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس کا سر میری گود میں تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سارے راستے میں اس کی خیریت کی دعا مانگتا رہا۔ یہ دعا میرے دل سے نکل رہی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ قبول نہ ہوتی۔

☆☆☆

سکندر کو انجائنا کا ہلکا سا اٹیک ہوا تھا۔ جو اس کے لیے مبارک ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد نصیر اور شبیر نے اپنی زمین کی واپسی کا تقاضا نہیں کیا تھا۔

سکندر نے ان کے سامنے کفارے کی بات کی تھی۔ وہ انہیں پچاس لاکھ مالیت کا پلاٹ دینا چاہ رہا تھا۔ میرا خیال تھا وہ اس معاملے میں سنجیدہ ہے لیکن اس کے بعد نہ اس نے اس بارے میں کوئی بات کی تھی نہ ہی وہ لوگ واپس آئے تھے۔ پتا نہیں انہیں سکندر پر ترس آ گیا تھا یا وہ کسی اور مصروفیت میں الجھ گئے تھے۔

میرا خیال تھا سکندر بدل گیا ہے۔ اس میں سے اکڑ اور غرور تو کسی حد تک نکل گیا تھا، مگر کینہ اور لالچ ہنوز ابھی باقی تھا۔ اس میں جو تبدیلی نظر آتی تھی، وہ وقتی ہوتی تھی۔

کچھ عرصے بعد مجھے اپنے تعاقب میں نظر آنے والی گاڑی، نظر آنا بند ہو گئی تھی۔ وہ شاید میری طرف سے مطمئن ہو گئے تھے۔ پولیس اور سکندر کے ساتھی پوری تندہی سے عینا اور ارمغان کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھے مگر کامیابی ان سے ہنوز روٹھی ہوئی تھی۔

سکندر ایک نیا پروجیکٹ شروع کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کے لیے اسے پچاس کروڑ کے لگ بھگ رقم کی ضرورت تھی۔ اس نے بینک میں لون کے لیے جتنی رقم کی درخواست کی تھی، اس میں سے آدھی منظور ہو گئی تھی۔ بقیہ رقم کے لیے اس نے کچھ زمینیں بیچنے کا فیصلہ کیا۔ ان زمینوں میں سے ایک وسیع قطعہ اراضی بھی موجود تھا۔ نصیر اور شبیر اس کے خریدار کے طور پر سامنے آئے۔ وہ ہمیں مارکیٹ ریٹ دے رہے تھے لیکن اب سکندر کو علم ہوا تو اس نے زمین..... بیچنے سے انکار کر دیا۔

مجھے اس کے فیصلے سے حیرت ہوئی، کہاں تو وہ انہیں مفت میں پچاس لاکھ کا پلاٹ دینا چاہ رہا تھا اور کہاں مارکیٹ ریٹ کے مطابق انہیں زمین بیچنے سے انکار کر رہا تھا۔ میں نے اسے قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔ وہ کتے کی اس دُم کی طرح تھا جو سو سال نلکی میں پڑے رہنے کے بعد بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔

زمین کے سودے کی ابھی بات چیت چل رہی تھی کہ ''ایک اور'' ۲۲ دسمبر آ گیا۔ سکندر اس حوالے سے فکر مند تھا کہ اغوا کار کی کال آ گئی۔

میں اس وقت سکندر کے ساتھ ہی دفتر میں بیٹھا تھا۔ اغوا کار کی آواز سنتے ہی اس نے اسپیکر آن کر دیا۔

''کیسے ہو سکندر صاحب؟'' وہ طنزیہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''جی رہا ہوں۔ تمہارا اگر یہ خیال تھا کہ میں دو بچوں کے بنا جی نہیں پاؤں گا تو یہ تمہاری بھول تھی۔ تم دیکھ لو میں آج بھی جی رہا ہوں۔ بھرپور طریقے سے جی رہا ہوں۔ تم مجھے توڑ نہیں سکے۔ تم مجھے جانتے نہیں ہو۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولتا چلا جا رہا تھا۔

دوسری طرف سے اغوا کار کا قہقہہ بلند ہوا تو سکندر کو یکدم ہی بریک لگ گئے۔

''میں جانتا ہوں تمہیں۔ تم اتنی آسانی سے نہیں سدھرو گے۔ تمہیں ابھی مزید جھٹکوں کی ضرورت ہے۔''

''کیا مطلب؟'' سکندر اپنے آپ پر قابو پا چکا تھا اس بار وہ تشویش سے بولا۔

''مطلب یہ کہ کل 22 دسمبر ہے۔ تمہارے لیے روزِ قیامت...... اور وہ بھی ایسا روزِ قیامت جو ہر سال تمہارے لیے آ جاتا ہے۔ کل اپنی بیٹی ضوفشاں کو سات پردوں میں چھپا کے رکھو یا چاہے اس کی سیکیورٹی کے لیے پوری فوج کا بندوبست کر کے رکھو کل وہ وہیں پہنچ جائے گی جہاں اس کے باقی دونوں بہن بھائی ہیں۔'' وہ جو بھی تھا بہت دھیمے لہجے میں بول رہا تھا مگر اس کی آواز میں ایسا عجیب سا تاثر تھا کہ میری ریڑھ کی ہڈی سنسنا اٹھی تھی۔ سکندر کو بھی چپ لگ گئی تھی۔ میں نے اس ٹھنڈے موسم میں بھی اس کی پیشانی پر پسینہ ابھرتے دیکھا۔

''کہاں ہیں میرے دونوں بچے؟'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''جہاں کل تمہارا تیسرا بچہ ہوگا۔'' وہ ہنسا۔ اگلے ہی پل وہ کال کاٹ چکا تھا۔ سکندر نے فوراً وہ نمبر واپس ملایا مگر

نمبر بند جا رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ہم تھانے میں نئے تھانیدار کے پاس بیٹھے تھے۔اس نے اس کی بیٹی کی سیکیورٹی کی بھرپور یقین دہانی کرائی تھی۔سکندر اس بار پُر امید تھا کہ نہ صرف اس کی بیٹی اغوا ہونے سے بچ جائے گی بلکہ اغوا کار بھی پکڑا جائے گا۔اس کے پکڑے جانے کے بعد اس کے دونوں بچوں کے ملنے کے چانس بھی روشن تھے بشرطیکہ وہ زندہ تھے......

میں نے اغوا کار کے دعوے بھی سنے تھے اور سکندر کی اُمید بھی دیکھی تھی۔اب میں دیکھنا چاہ رہا تھا کہ اس بار کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔

☆☆☆

اس بار کا 22 دسمبر بہت مختلف سا تھا۔ہر طرف چمکیلی سی دھوپ پھیلی تھی۔اتنی ٹھنڈ میں دھوپ کی حدت خوشگوار لگ رہی تھی۔میں صبح دس بجے سکندر کے گھر پہنچ گیا۔مجھے گیٹ پر ہی روک لیا گیا۔ایک پولیس والا میری طرف بڑھا۔''آپ براہِ کرم نیچے اتر آئیں۔'' اس نے مہذب انداز میں مجھے کہا۔

میں نے عادتاً پولیس والے کا بیج دیکھا۔اس کا نام اعتزاز حسن تھا۔یہ نام مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا تاہم یاد نہیں آرہا تھا کہ یہ نام میں نے کب سنا ہے۔

''کیوں، آفیسر خیریت ہے ناں؟'' میں نے ایک کانسٹیبل کو آفیسر کہہ کے اسے خوش کرنے کی کوشش کی۔وہ خوش کم ہوا، پھیل زیادہ گیا۔

''جی، آپ تو سکندر صاحب کے قریبی دوست ہیں۔جانتے ہوں گے کہ سکندر صاحب کو آج ہی کی تاریخ میں بیٹی کے اغوا کی دھمکی ملی ہے۔''

''جی میں یہ تو جانتا ہوں مگر یہ نہیں جانتا کہ سکندر صاحب کے قریبی دوست کو گاڑی سے اترنے کے لیے کیوں کہا جا رہا ہے؟'' میرا جملہ طنزیہ تھا لیکن میں نے حتی المکان کوشش کی تھی کہ میرا لہجہ نارمل رہے۔

''ہم اندر داخل ہونے والے یا باہر نکلنے والے شخص اور گاڑی کی تفصیلی کے بعد ہی انہیں گزرنے کی اجازت دیتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں معمولی سا روکھا پن میں نے صاف محسوس کیا تاہم میں نے اپنی جرح جاری رکھی۔

''باہر نکلنے والوں کی تلاشی کی تو وجہ سمجھ آتی ہے۔اندر جانے والوں کی تلاشی تو محض ڈیوٹی پوری کرنا ہی ہے؟'' میرا انداز سوالیہ تھا۔

میرا سوال سن کے اس کی آنکھوں میں بیزاری کی رمق چھلکی۔''ہم کچھ بھی بلا وجہ نہیں کر رہے، ہم سکندر صاحب کی بیٹی کے اغوا کی کوشش ناکام کرنے کے لیے ہی یہ سب کر رہے ہیں۔'' اس نے شاید بڑی مشکل سے اپنے احساسات کو ....زبان تک لانے سے روکا تھا۔

میں گاڑی سے اتر آیا۔ایک اور پولیس والے نے آگے بڑھ کے میری جامہ تلاشی لی۔اعتزاز گاڑی کی تلاشی لے رہا تھا۔اس نے سیٹیں تک اٹھا کے دیکھ لی تھیں۔جانے اسے کس چیز کی تلاش تھی۔ڈکی کی تلاشی کے بعد اس نے مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔

اندر بھی سیکیورٹی سخت تھی۔داخلی دروازے پر مجھے ایک بار پھر تلاشی دینی پڑی۔یہاں مجھے ایک لیڈی کانسٹیبل بھی نظر آئی۔

سکندر کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔مجھے دیکھ کے اس کی آنکھوں میں چمک ابھری۔''آؤ بھئی، بڑی دیر کر دی تم نے۔تمہیں دیکھ کے مجھے سہارے کا احساس ہوتا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''اصل سہارا تو بس خدا کا ہوتا ہے۔یہ دنیاوی سہارے تو کسی وقت بھی دھوکا دے سکتے ہیں۔'' میں فلسفیانہ انداز میں بولا۔

وہ تلخی سے مسکرایا۔''یہ تو ہے مگر اس کے باوجود تمہارے بغیر میں خود کو بہت کمزور اور ناتواں محسوس کرنے لگتا ہوں۔تمہاری موجودگی میرے لیے تقویت کا باعث ہے۔''

میں اسے لیے سیکیورٹی چیک کرنے لگا۔علیشا اپنے دونوں بچوں سمیت اپنے بیڈ روم میں تھی۔بیڈ روم دوسری منزل پر تھا۔کمرے کے اندر داخل ہونے کا ایک ہی راستہ یعنی دروازہ تھا اور وہ اندر سے لاک تھا۔میری فرمائش پر سکندر نے دروازہ کھول کے اندر سے کمرے کا تفصیلی معائنہ کرایا۔

علیشا کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔دو تین سال پہلے وہ چالیس سال کی عمر میں بھی تیس کی نظر آتی تھی۔مگر ان دو تین سالوں نے اس سے اپنا خراج وصول کیا تھا۔اس کی آنکھوں کے گرد حلقے چھائے تھے۔چہرے کی جھریوں کے باعث وہ اپنی عمر سے بڑی ہی نظر آرہی تھی۔

وہ اپنے ڈیڑھ سالہ بیٹے کو گود میں اٹھائے بیٹھی تھی۔ضوفشان بار بار باہر جانے کی ضد کر رہی تھی، علیشا اسے منع کرتے ہوئے جھنجلا رہی تھی۔

سکندر نے مجھے بتایا کہ وہ دونوں میاں بیوی رات بھر

جاگ کے اپنے بچوں کی حفاظت کرتے رہے ہیں۔ پوری رات خوف کے عالم میں جاگتے ہوئے میں گزارنے کے باعث علیشا چڑچڑی ہو رہی تھی۔

میں نے کمرے کی کھڑکی چیک کی۔ کھڑکی ٹیرس پر کھل رہی تھی۔ میں ٹیرس پر آ گیا۔ ٹیرس کے ساتھ سپاٹ دیوار تھی۔ سامنے ہی گیٹ نظر آ رہا تھا جس پر پولیس والے چوکس کھڑے تھے۔ میرے خیال میں ادھر سے اندر آنا اور ایک چار پانچ سال کی بچی کو لے کے نکلنا ناممکن تھا۔

کمرے میں ایک اور دروازہ بھی کھل رہا تھا، یہ واش روم تھا۔ واش روم بھی ہر طرح سے محفوظ تھا۔ اس کے چھوٹے سے روشن دان سے کسی کا بھی داخلہ ممکن ہی نہیں تھا۔ میں باہر نکل آیا۔

سکندر ضوفشاں کو بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ باہر جانا ہے۔

آخر کار تنگ آ کے سکندر اسے لے کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ علیشا کے چہرے پر تشویش چھا گئی۔ ''اسے لے کے باہر تو جا رہے ہیں مگر اس کا خیال رکھنا'' وہ چڑچڑے پن سے بولی۔

''تم فکر نہ کرو، میں اسے بس لان تک لے کے جا رہا ہوں۔'' سکندر نے اسے مطمئن کیا۔

سکندر، ضوفشاں کو لے کے باہر کی طرف بڑھ گیا۔ میں راہ داری سے گزر کے سیڑھیوں تک پہنچا۔ یہ سیڑھیاں اوپر چھت پر جا رہی تھیں۔ چھت کے آغاز پر بنے دروازے کو اندر سے کنڈی لگی تھی۔ میں نے کنڈی کھولی اور چھت پر آ گیا۔ یہاں دو مسلح پولیس والے ٹہل رہے تھے۔ میں انہیں چوکس رہنے کی ہدایت کر کے باہر آ گیا۔ میرے چہرے پر فکرمندی کے تاثرات تھے۔ سکندر لان میں ضوفشاں کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ سائیکل چلا رہی تھی۔ مجھے فکرمند دیکھ کے سکندر بولا ''کیا بات ہے، تم پریشان نظر آ رہے ہو؟''

''پریشان تو نہیں' فکرمند ضرور ہوں۔ اتنی سخت قسم کی سیکیورٹی میں وہ اسے کیسے اغوا کرے گا؟''

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ''یہ اس کی پریشانی ہے تمہیں اس پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''میں اغوا کار کے ذہن سے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے منصوبے کو ناکام کرنے کے لیے ہمیں اس کے ذہن سے سوچنا پڑے گا۔'' میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہاں یہ تو تم نے بڑے پتے کی بات کی ہے۔ اس کے منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے اس کے ذہن سے سوچنا ہو گا۔'' اس نے تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے مسکرانے پہ اکتفا کیا۔

''پھر تم نے کیا سوچا۔ تم اغوا کار ہوتے تو کیسے اسے اغوا کرتے؟'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''اتنی سخت سیکیورٹی میں یہ ممکن نہیں۔ میں اغوا کار ہوتا تو یہ رسک ہی نہ لیتا۔'' وہ میری بات سُن کے مطمئن نظر آنے لگا اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔

☆☆☆

لنچ ہم نے اکٹھے ہی کیا تھا۔ پولیس والے بھی باری باری آ کے کھانا کھا گئے تھے۔ اعتزاز کو دیکھ کے ایک بار پھر میرے ذہن میں کھلبلی سی ہوئی تھی۔ میرا ذہن اسے مشکوک قرار دے رہا تھا مگر وہ کیوں مشکوک تھا، یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ یہ ڈرائنگ روم نیچے والی منزل پر تھا۔ پورچ سے گزر کے سب سے پہلے ڈرائنگ روم کا دروازہ ہی نظر آتا تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پہ عمارت کا داخلی دروازہ تھا۔ اس دروازے سے آگے ایک وسیع لاؤنج تھا۔ لاؤنج سے سیڑھیاں اوپر والی منزل پر جا رہی تھیں۔

اس داخلی دروازے پر صبح دو پولیس والے تعینات تھے جن میں ایک لیڈی کانسٹیبل بھی تھی لیکن اب مجھے وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔

ضوفشاں ہمارے ساتھ تھی۔ وہ سکندر کے ساتھ بہت زیادہ اٹیچ تھی۔ سکندر چاہتا تھا وہ بیڈروم میں ہی رہے مگر وہ اس کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

ہم صوفوں پہ بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ اب سکندر کے چہرے پہ چھایا اضطراب کافی کم ہو گیا تھا۔ وہ قدرے ریلیکس لگ رہا تھا۔ ضوفشاں اس کی گود میں ہی کھیلتے ہوئے سو گئی۔ اس نے اسے اٹھا کے صوفے پہ ہی لٹا دیا۔

کھانا کھانے کے باعث مجھ پہ سستی سی طاری ہو رہی تھی۔ یہی حال سکندر کا بھی لگ رہا تھا۔ وہ تو رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ ہم دونوں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے۔ میں نیم غنودگی میں تھا کہ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ نیم غنودگی میں انسان کا لاشعور فعال ہو جاتا ہے۔ عام طور پر اس حالت میں ایسی باتیں یاد آ جاتی ہیں جو.... پورا دن سوچنے پر بھی آپ کو یاد نہیں آ رہی ہوتیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مجھے یک دم یاد آ گیا تھا کہ اعتزاز کون ہے۔

میری آنکھ ایک جھٹکے سے کھل گئی۔ سکندر نشست کے

ساتھ ٹیک لگا کے سو رہا تھا۔ ''سر'' میں ہیجانی انداز میں بولا۔ اس نے ہڑبڑا کے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں دہشت تھی۔ اس نے فوراً اپنے ساتھ لیٹی ضوفشاں پر نظر ڈالی۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ پُرسکون نظر آنے لگا۔

''تم نے مجھے پکارا۔'' وہ بے یقینی سے بولا۔

''جی۔ آپ شاید سو گئے تھے۔''

''اوہ ہاں۔'' وہ پریشانی سے بولا۔ ''مجھے ایسا لگا تھا جیسے خواب میں کسی نے مجھے آواز دی ہو۔''

''گیٹ پہ ایک پولیس والا پہرا دے رہا ہے۔ اس کا نام اعتزاز حسن ہے، آپ نے اسے پہچانا؟''

میرا سوال سُن کے وہ الجھن بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''22 دسمبر کو آپ نے ایک کیس جیتا تھا......''

وہ میری بات کاٹ کے بولا۔ ''یہ پولیس والا وہ اعتزاز ہے؟'' اس کی آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت تھی۔

''میں نہیں جانتا۔ مجھے تو یہ نام مشکوک لگا اس لیے آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ ہمارے ساتھ جیسے حالات بیت رہے ہیں، ہمیں اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔''

''پتا نہیں، میں نے کسی پولیس والے کو غور سے نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے یہ وہی ہو، کیا خیال ہے اسے بلا لیا جائے؟''

میں جواب دینے ہی لگا تھا کہ میری نظر کھڑکی سے باہر پڑی۔ ایک پولیس والا لاؤنج کا دروازہ کھول کے اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کے میری آنکھوں میں الجھن ابھری۔ اس وقت کسی پولیس والے کا اوپر کیا کام ہو سکتا تھا۔

سکندر مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری نظروں کا تعاقب کیا تاہم اتنی دیر میں وہ نگاہ سے اوجھل ہو چکا تھا۔

''کیا بات ہے، تمہاری نظر ایک ہی جگہ کیوں ٹھہر گئی ہے؟'' وہ مشکوک سے انداز میں بولا۔

''مجھے ایسا لگا ہے جیسے اعتزاز ابھی اوپر گیا ہے۔'' میرا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

''کیا......؟'' سکندر چلّایا۔ اگلے ہی لمحے وہ کمرے سے باہر تھا۔ میں نے اس کے پیچھے جانے کا سوچا مگر پھر کچھ سوچ کے رک گیا۔ اس کمرے میں ضوفشاں اکیلی تھی۔ میں اسے چھوڑ کے سکندر کے پیچھے کیسے جا سکتا تھا؟

جب کافی دیر تک سکندر واپس نہ آیا تو میں کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ میں اوپر پہنچا تو سکندر تمام کمروں کی تلاشی لے چکا تھا۔ ''ادھر تو کوئی نہیں ہے۔ میں نے سارے واش رومز تک دیکھ لیے ہیں۔'' وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''ہو سکتا ہے وہ کہیں چھپ گیا ہو؟'' میں نے خیال آرائی کی۔

''میں نے تمام ممکنہ جگہیں دیکھ لی ہیں جہاں کوئی چھپ سکتا تھا۔ تمہاری سوتے ہوئے آنکھ کھلی تھی، مجھے لگتا ہے تمہیں نظر کا دھوکا ہوا ہے۔'' میں نے کندھے اچکائے۔

''ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔''

ہماری آواز سن کے علیشا باہر نکل آئی۔

''ضوفی کہاں ہے؟'' ہمیں اکیلے دیکھ کے وہ بولی۔

''وہ نیچے سو رہی ہے۔'' سکندر نے جواب دیا۔

''وہ نیچے سو رہی ہے تو آپ ادھر کیا کر رہے ہیں؟'' وہ غصے سے بولی۔

سکندر نے اسے معذرت طلب نظروں سے دیکھا اور ہم واپس نیچے آ گئے۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ہم ہکا بکا رہ گئے۔ جس صوفے پر ہم ضوفشاں کو لٹا کے گئے تھے، وہ خالی تھا۔

سکندر زور سے چلّایا۔ ''ضوفی......''

وہ اتنے زور سے چلّایا تھا کہ گیٹ پر کھڑا ایک پولیس والا بھی بھاگا ہوا اندر آ گیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ یہ اعتزاز نہیں تھا۔

''ضوفی کہاں ہے؟'' سکندر لرزیدہ آواز میں مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

پولیس والا بھی سوالیہ انداز میں مجھے ہی دیکھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم ضوفی کو ادھر لٹا کے گئے تھے مگر وہ اب ادھر نہیں۔

''اس اغوا کار نے اپنا دعویٰ پورا کر دیا۔ تم لوگ نااہل ہو سارے۔ سب اس کے ساتھ ملے ہوئے ہو۔ میرے دشمن ہو تم سب۔ دفع ہو جاؤ۔'' وہ ہذیانی انداز میں چلانے لگا۔

پولیس والا تیزی سے باہر نکل گیا۔

''آپ فکر نہ کریں۔ وہ باہر نہیں جا سکتا۔ ادھر ہی اندر کہیں ہوگا۔ پولیس والے اسے ڈھونڈ لیں گے۔'' میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''یہ کیا ڈھونڈیں گے ........ یہ تو خود اس کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔''

پولیس والا اندر آیا۔ ''سر، گیٹ سے کوئی باہر نہیں گیا۔ چار دیواری کے اوپر باڑ لگی ہے۔ میں نے بغور اس کا معائنہ

کرلیا ہے۔ وہ بھی معلوم ہے۔ ادھر سے کوئی باہر نہیں گیا۔ اب یہی ہوسکتا ہے کہ وہ بھی ہے اندر ہے۔ ابھی اسے ہم ڈھونڈ نکالیں گے۔'' اس نے ساری تفصیل بتائی۔

''اعتزاز حسن کہاں ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''اس کی تو ڈیوٹی پوری ہوگئی تھی۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی گیا ہے۔'' میں نے سکندر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی نظر آرہی تھی۔

''وہی میری بیٹی کو لے کے گیا ہے۔'' سکندر چلّایا۔

پولیس والے کی آنکھوں میں ہمدری اور ناگواری کے ملے جلے تاثرات اُبھرے۔ ''سر، ایسا ممکن نہیں ہے۔ آپ مجھے اس کمرے کی تلاشی کی اجازت دیں گے؟'' وہ یہ کہتے ہوئے واش روم میں گھس گیا۔ سکندر کو جانے کیا سوجھی وہ صوفوں کے نیچے جھانکنے لگا۔

''وہ...... وہ......'' اس کی کانپتی ہوئی آواز اُبھری۔ میں نے جھک کے نیچے دیکھا تو چونک گیا۔ ضوفشاں صوفے کے نیچے پڑی تھی۔

''ماردیا اس نے میری بیٹی کو...... وہ کہہ رہا تھا کہ آج میری بیٹی کو وہیں پہنچا دے گا جہاں میرے باقی دونوں بچے ہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کردیا۔ ماردیا اسے......'' وہ ہذیانی انداز میں بولے جارہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کے میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

پولیس والا واش روم سے نکل آیا تھا۔ ہمیں فرش پہ لیٹا دیکھ کے اس کی حیرانی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے صوفے کے نیچے اشارہ کیا۔ اس نے جھک کے نیچے دیکھا۔ نیچے کا منظر دیکھ کے وہ جھٹکے سے سیدھا ہوا۔ اس نے صوفہ کھسکا کے آگے کیا۔ اب وہ آگے بڑھ کے ضوفشاں یا شاید اس کی لاش کو اٹھا رہا تھا۔ اسے اٹھاتے ہی وہ خوشی سے بولا۔ ''یہ زندہ ہے۔'' سکندر اسے بے یقینی سے دیکھنے لگا۔

اسی لمحے ہم نے دل دہلا دینے والی چیخیں سنیں۔ ہم چونک گئے۔ یہ علیشا تھی۔ جو چلاتے ہوئے نیچے آرہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ بولی۔ ''واصب......'' وہ اتنا کہہ کے دہلیز پہ ہی گرگئی۔ ہم ہکا بکا اس کے بے ہوش وجود کو دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

علیشا کو چلاتے دیکھ کے سارے پولیس والے ایک ہی جگہ جمع ہوگئے تھے۔ سکندر، علیشا کو اٹھا کے صوفے پہ لے گیا۔ اب وہ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ مجھے سب بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں کیا کروں۔

پولیس والے خود حیران نظر آرہے تھے۔ ضوفشاں کا بے ہوش وجود ابھی تک پولیس والے کی گود میں تھا۔ اس نے، اسے بھی صوفے پر لٹایا اور اس پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ وہ فوراً ہی جاگ کے رونے لگی۔

علیشا نے بھی کسمسا کے آنکھیں کھول لی تھیں۔ وہ چند لمحے تک خالی خالی نظروں سے سکندر کو دیکھتی رہی۔ دفعتاً اس کی آنکھوں میں ہراس نظر آنے لگا۔ ''واصب...... واصب اپنے کارٹ میں نہیں ہے۔'' وہ یکدم ہی چلائی تھی۔ سکندر اسے چھوڑ کے اوپر کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کے اس نے کارٹ میں جھانکا۔ کارٹ خالی تھا۔ وہ بیڈ کے نیچے جھانکنے لگا۔ اسے لگ رہا تھا کہ جس طرح ضوفشاں صوفے کے نیچے سے مل گئی تھی اسی طرح واصب بھی کہیں سے مل جائے گا مگر پورا کمرا چھان مارنے کے باوجود واصب نہیں ملا۔ سکندر اپنے بال نوچنے لگا۔ ظالم کی رسی خدا نے کھینچ لی تھی اور بہت زور سے کھینچی تھی۔

☆☆☆

اس وقت کل چھ پولیس والے موجود تھے۔ دو کی ڈیوٹی چھت پر تھی اور دو کی گیٹ پر۔ باقی دو پولیس والے مکان کے اطراف میں ڈیوٹی کررہے تھے۔

پوچھ گچھ کے بعد پتا چلا کہ اتنی دیر میں صرف ایک ملازمہ ہی گھر سے باہر گئی تھی۔ آج کے دن باقی تمام ملازمین کو چھٹی دے دی گئی تھی۔ صرف ایک ملازمہ موجود تھی جس نے دن کے وقت تمام لوگوں کے لیے کھانا تیار کیا تھا۔ کھانا تیار کرنے کے بعد وہ برتن دھونے لگی تھی۔ جب وہ باہر نکلی تھی تو گیٹ پر اعتزاز اور ایک اور پولیس والا ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اعتزاز تو چلا گیا تھا مگر وہ دوسرا پولیس والا ابھی بھی ادھر ہی موجود تھا۔ ملازمہ نے جاتے ہوئے ان سے رسمی سی بات چیت بھی کی تھی۔ پولیس والے کے بقول وہ خالی ہاتھ تھے۔ اس نے کوئی بچہ نہیں اٹھایا ہوا تھا۔

میں نے ملازمہ کو دیکھا تھا۔ اس نے بڑی سی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ وہ اگر اس کے اندر چھوٹے بچے کو لے جاتی تو کسی کو پتا نہ چلتا۔

انسپکٹر نے سکندر سے ملازمہ کا ریکارڈ مانگا۔ گھر میں ملازم عام طور پر علیشا ہی رکھا کرتی تھی۔ وہ اس وقت اپنے حواس میں نہیں تھی۔ حواس میں تو سکندر بھی نہیں تھا لیکن اس نے کسی قدر خود کو سنبھالا ہوا تھا۔ وہ ملازمین کی فائل اٹھا لے

لے آیا۔ فائل سے ملازمہ کے گھر کا پتا اور فون نمبر بھی مل گیا۔

اس کا نام صفیہ تھا۔ یہ ایک جواں سالہ عورت تھی جو سکندر کے گھر سے چار پانچ کلومیٹر دور ایک کچی بستی میں رہتی تھی۔

انسپکٹر اویس نے اس کا نمبر ملایا۔ وہ بند جا رہا تھا۔ اس نے دو پولیس والے اس کے گھر کی طرف روانہ کردیے۔ وہ بائک پر گئے تھے۔ دس، پندرہ منٹ بعد ہی ان کی کال آ گئی کہ صفیہ کے گھر تالا پڑا ہوا ہے۔ پڑوسیوں سے پوچھ گچھ پہ معلوم ہوا کہ صفیہ اپنی ماں کے ساتھ ادھر اکیلی رہتی تھی۔ وہ ایک دن پہلے ہی کہیں چلی گئی تھی۔

صفیہ رات کو سکندر کے گھر ہی رکی تھی۔ حاصل کردہ معلومات کے تناظر میں کہا جا سکتا تھا کہ واصب کے اغوا میں صفیہ ہی ملوث ہے۔ کیوں کا جواب ایک ہی لفظ ہو سکتا تھا، صفیہ کی ماں کا نام...... یعنی، سکینہ۔ اس نام سے میں اور سکندر تو نتیجہ اخذ کر سکتے تھے لیکن شاید یہ پولیس والے نہیں۔

سکینہ کا نام سنتے ہی سکندر کے چہرے پہ زردی کھنڈ گئی تھی۔ شاید یہ وہی سکینہ تھی جس کی زمین آٹھ دس سال پہلے سکندر نے ہتھیائی تھی۔ سکندر کے سارے دشمن اچانک ہی سامنے آ گئے تھے۔ پتا نہیں یہ اتفاق تھا، کسی قسم کی منصوبہ بندی یا مشیتِ ایزدی...... کہ سکندر کے سارے دشمنوں نے اکٹھے ہی اس کے خلاف ہلا بول دیا تھا۔ سکندر کو بالکل چپ لگ گئی تھی۔

☆☆☆

میں اپنے گھر میں کھانے کی ٹیبل پر بیٹھا اپنی بیوی کو دن بھر کی کارگزاری سنا رہا تھا۔ وہ سب سن کے افسردہ نظر آنے لگی۔

''اب کیا ہوگا؟'' اس نے سوال کیا۔

''اب یہ کہانی اپنے کلائمکس پہ پہنچ چکی ہے۔ اس کے بعد اس کا ''دی اینڈ'' ہی ہونا ہے۔'' میرے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

''ہاں، اس کا ''دی اینڈ'' اب ہو ہی جانا چاہیے۔ سکندر کی طرح میری روح بھی سولی پہ اٹکی ہوئی ہے۔'' وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

''تمہارا کیا خیال ہے، اس کہانی کا ''دی اینڈ'' کیا ہوگا؟''

''کچھ بھی ہو میں بس چاہتی ہوں کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔'' وہ یہ کہہ کے برتن اٹھانے کے بہانے اٹھ گئی۔ میں اس کی بات سمجھ گیا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ ہاں جن کے ساتھ

## اداکارہ چھمک چھلو کے انکشاف

میری صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے زیارتوں پر جانا چاہتی ہوں اور حج کرنے کی بھی خواہش ہے مگر حج کے لیے محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ میں تمہارے بھائی کو ساتھ لے جانا چاہتی تھی مگر وہ شام کو زنانہ کپڑے پہن کر نکل جاتا ہے اور اگلے روز صبح واپس آتا ہے تو سو جاتا ہے اور اس وقت تک سویا رہتا ہے جب تک دوبارہ اس کے کام پر جانے کا وقت نہیں ہو جاتا۔ ویسے تو ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے مگر میں سمجھتی ہوں کہ وہ اپنا ٹیلنٹ ضائع کر رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم کسی ٹی وی چینل والے سے بات کر کے کسی پروگرام کی کمپیئرنگ اسے دلوا دو تم دیکھنا کہ بڑے بڑے سیاست داں، منسٹر اور چیف منسٹر بھی اس پروگرام میں سفارش کروانے آئیں گے۔ اسے لوگوں کے دل موہنے کے انداز تم سے کہیں زیادہ آتے ہیں۔

عطاءالحق قاسمی کی تصنیف مصیبت نامے سے انتخاب

زیادتی ہو چکی تھی، اس کی تلافی ضرور ہونی چاہیے تھی۔

☆☆☆

علیشا اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ سکندر اسے اسپتال لے گیا تھا۔ وہ سکندر کی چیرہ دستیوں سے آگاہ تھی لیکن اس نے کبھی سکندر کو ان سے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اسے کیوں روکتی، اس طرح جو دولت وہ حاصل کر رہا تھا وہ اس کے اور اس کی اولاد ہی کے کام تو آ رہی تھی۔ اس نے کبھی ان معصوموں کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا جن کے سر سے سکندر سایہ چھین لیتا تھا۔ آج تقدیر نے جب پلٹ کے وار کیا تھا تو وہ اپنے حواس ہی کھو بیٹھی تھی۔

سکندر نے صبح صبح مجھے فون کر کے اسپتال پہنچنے کا کہا۔ میں اسپتال پہنچا تو خلافِ توقع اسے کافی خوش پایا۔

وہ مجھے لے کے ایک سنسان گوشے میں آ گیا۔ اس نے اپنا سیل میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے سیل لیا، یہ ایک ویڈیو تھی جو وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا۔ ویڈیو کا پہلا سین دیکھ کے میں اچھل پڑا۔ اس ویڈیو کے تین کردار تھے۔ اب مجھے سکندر کی خوشی کی وجہ سمجھ آ گئی تھی۔

ویڈیو ختم ہوئی تو میں نے سکندر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''دنیا میں صرف تم ہی ہو جس پر میں اتنا اعتماد کرتا ہوں۔'' مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

وہ کچھ لمحات کے توقف کے بعد بولا۔ ''تمہیں میرا ایک آخری کام کرنا ہوگا۔ اس کے بعد میں کبھی تم سے کسی کام کا نہیں کہوں گا۔'' وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

اس نے تاثرات سے میری رضامندی جان لی تھی۔

اب وہ مجھے میرے آخری کام کے بارے میں بتا رہا تھا۔

☆☆☆

سکندر نے جو آخری کام مجھے سونپا تھا، وہ نمٹاتے نمٹاتے مجھے مہینے سے اوپر لگ گیا۔ کام ختم ہوتے ہی سکندر کو اس کا نتیجہ بھی مل گیا اور اس کے وہ سارے ''دشمن'' بھی جو اس کے بچوں کے اغوا میں ملوث تھے، اپنے ''انجام'' کو پہنچ گئے۔

اب سکندر مجھے اور کوئی کام بتاتا یا نہ بتاتا وہ میرے کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ اب اپنی بیوی کی خواہش کے مطابق اسے چھوڑنے کا وقت آ گیا تھا لیکن اس سے پہلے... اس سے ایک ملاقات...... آخری ملاقات ضروری تھی۔

یہ فروری کا مہینہ تھا۔ درختوں پر ننھی ننھی کونپلیں نکل آئی تھیں۔ کچھ درختوں پر پھول نکلنا شروع ہو گئے تھے جو بہار کی آمد کا پتا دے رہے تھے۔ یہ بہار میری زندگی میں بھی آ گئی تھی۔ بہت عرصے بعد میں خود کو مطمئن اور پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔

آج صبح ہی سے تیز بارش برس رہی تھی۔ آج کے دن میں نے سکندر سے آخری ملاقات طے کی تھی۔

رومی نے مجھے الوداع کیا تو حسبِ معمول اس کے چہرے پہ فکر سجی تھی۔ اس فکر نے پچھلے چند سال سے مسلسل اس کے چہرے کا گھیراؤ کیا ہوا تھا۔ وہ مطمئن اسی وقت ہوتی جب میں گھر موجود ہوتا۔ میں نے اسے ساتھ لپٹا لیا۔ ''آج سکندر سے میری آخری ملاقات ہے۔ تم مجھے ہر وقت کہتی تھی نا کہ سکندر کو چھوڑ دیں تو آج میں اسے چھوڑ رہا ہوں۔'' میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کے نرمی سے کہہ رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔

''تمہارے کہنے پہ میں سکندر کو چھوڑ رہا ہوں، میرے کہنے پہ تم ایک چیز چھوڑو گی؟'' میرے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''کیا؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''فکر...... تم فکرمند ہونا چھوڑ دو۔'' وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ آج اس نے خاص انداز میں بالوں کو باندھا ہوا تھا...... اور بہت معصوم و دلکش لگ رہی تھی۔

''اب فکر چھوڑو اور مجھے مسکراتے ہوئے الوداع کرو۔'' میں مصنوعی خفگی سے بولا۔

''آج کے دن میں آپ کو مسکراتے ہوئے کیسے الوداع کر سکتی ہوں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی تھی۔

میں نے اس کے ہونٹوں کو اپنے ہاتھوں سے پھیلایا۔ اس کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں دونوں طرف پھیل گئے۔ میں شریر سے انداز میں بولا۔ ''ایسے۔''

اس کی آنکھوں میں کوئی چمک نہیں جاگی۔

میں اسے اس کے حال پہ چھوڑ آیا۔

سکندر میری بتائی ہوئی جگہ پر کھڑا تھا۔ بارش سے بچنے کے لیے اس نے چھتری لے لی تھی۔ میں نے گاڑی اس کے قریب لے جا کے روک دی۔

''یار عجیب بندے ہو تم۔ یہ آخری ملاقات کا کیا مطلب ہے آخر؟'' وہ گاڑی میں بیٹھتے ہی بولا۔ اس کے لہجے سے جھنجلاہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے پُراسرار انداز میں مسکرانے پہ اکتفا کیا۔

''تمہاری اس آخری ملاقات کی ضد کی وجہ سے میں علیشا کو اکیلے چھوڑ کے، اس برستی بارش میں آنے پر مجبور ہو گیا۔''

''آپ نے غلط نہیں کیا۔'' میں مسکرایا۔ ''بھابی کیسی ہیں؟'' اگلے ہی لمحے میں نے موضوع بدل دیا۔

''واصب کے آنے سے کافی بہتر ہو گئی ہے لیکن جو کچھ ہم سے چھن گیا، اس کے بعد وہ اتنی جلدی مکمل ٹھیک تو نہیں ہو سکتی نا۔'' وہ افسردگی سے بولا۔

''ابھی منع نہیں کیا انہوں نے آپ کو آنے سے؟''

''نہیں وہ سو رہی تھی۔ میں تو اس کی بے خبری میں آ گیا۔'' حسبِ منشا و توقع جواب سن کے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

''آپ آج کل کیسا محسوس کر رہے ہیں؟'' میں نے اس کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ایک بادشاہ فقیر بننے کے بعد کیسا محسوس کر سکتا ہے؟'' وہ تلخی سے بولا۔

''میرا مطلب تھا اپنے دشمنوں سے چھٹکارے کے بعد؟''

''کیا فائدہ، انہوں نے مجھے چھوڑا بھی تو میرا سب کچھ لے کے چھوڑا۔'' اس کے لہجے میں تنفر تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔

''انہوں نے تو آپ سے اپنا حق ہی لیا ہے۔ اپنی زیادتیوں کی تھوڑی سی ہی سہی تلافی کر کے آپ کو سکون نہیں

ملا؟‘‘

وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔’’انہوں نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا اور تم پوچھ رہے ہو کہ مجھے سکون نہیں ملا۔‘‘

’’آپ بھی لوگوں سے ان کا سب کچھ چھینتے رہے۔ ان کی تکلیف کا احساس تو ہوا ہوگا آپ کو؟‘‘ آج آخری ملاقات تھی۔ آج ہر طرح کا سوال جائز تھا۔

’’میں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں چھینا۔ میں مارکیٹ ریٹ کے مطابق قیمت ادا کرتا تھا۔ اس کے باوجود کوئی اپنی زمین یا گھر نہ بیچتا تو میرے پاس اور چارہ ہی کیا تھا۔‘‘ وہ ناگواری سے بولا۔

میں اس کے فلسفے پہ حیران رہ گیا۔ گویا ابھی تک اسے اپنے کیے پہ ندامت نہیں ہوئی تھی۔

’’چھینا تو انہوں نے مجھ سے سب کچھ ہے۔ میری اولاد میری دولت سب کچھ چھین لیا انہوں نے مجھ سے۔ میں معاف تو نہیں کروں گا انہیں۔‘‘

میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ عجیب بندہ تھا وہ...... پل میں تولہ پل میں ماشہ...... کبھی مجھے لگتا اسے اپنے مظالم کا احساس ہوگیا ہے۔ اب وہ سدھر گیا ہے لیکن جلد ہی وہ کوئی ایسی حرکت کر دیتا کہ میں اپنا خیال بدلنے پر مجبور ہو جاتا۔ میرا تو خیال تھا وہ تلافی کر رہا ہے۔ وہ تو سب مجبوری میں کر رہا تھا۔ اتنے جھٹکے اسے سدھار نہیں سکے تھے۔ لگتا تھا ہدایت اس کی قسمت میں ہی نہیں لکھی۔ پتا نہیں یہ آخری ملاقات اب کیا رنگ لانے والی تھی۔

☆☆☆

اغوا کار نے اسے ایک ویڈیو سینڈ کی تھی۔ جس میں اس کے تینوں بچے خوش و خرم ایک دوسرے سے کھیل رہے تھے۔ وہ تو ان پہ فاتحہ پڑھ چکا تھا۔ انہیں زندہ سلامت دیکھ کے وہ نہال ہوگیا۔ اسے یہ تینوں بچے مل سکتے تھے لیکن ایک قیمت ادا کرنے کے بعد۔

وہ قیمت پوری کرنے کے لیے اسے اپنی تمام پراپرٹی بیچنی پڑتی۔ اس نے مجھ سے ساری پراپرٹی فروخت کرنے کا کہا تھا۔ اس کے بعد اس کے پاس کام کرنے کے لیے کوئی رقم ہی نہ بچتی۔ وہ اپنے مستقبل سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے میرے اس کام کو ’’آخری کام‘‘ کہا تھا۔

ایک مہینے کی محنت کے بعد میں اس کی مطلوبہ رقم جمع کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے ذاتی گھر کے علاوہ دو گھر بھی بچ گئے تھے۔ یہ گھر کرائے پر لگے تھے۔ ان کا ماہانہ کرایہ ساٹھ ہزار آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ ابھی ایسے بھی کئی گھر تھے جو بک تو گئے تھے لیکن ان کی اقساط آ رہی تھیں۔

مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ سکندر پر یہ محاورہ صادق آ رہا تھا۔ اس سے سب کچھ چھن چکا تھا مگر اس کے باوجود اسے ماہانہ لاکھوں مل رہے تھے۔

اس کی پراپرٹی بیچ کے مجھے چھ کروڑ روپے حاصل ہوئے تھے۔ اس رقم پہ تین پارٹیوں کا حق تھا۔ نصیر، سکینہ اور اعتزاز کا...... یہ کہنا تھا اغوا کار کا۔ اغوا کار نے اسے کہا تھا کہ چھ کروڑ کی ادائیگی کے بعد نہ صرف اسے اس کے بچے واپس مل جاتے بلکہ اس کی زیادتیوں کی بھی کسی قدر تلافی ہو جاتی۔

اغوار کار کے بقول اس نے سکندر کے دشمنوں کو استعمال کیا تھا۔ اب وہ انہیں دو دو کروڑ دے دیتا تو سکندر کا پیچھا ہمیشہ کے لیے ان سے چھوٹ جاتا۔

سکندر نے میرے توسط سے چھ کروڑ ان تک پہنچا دیے تھے۔ اپنے بچوں کو زندہ سلامت دیکھ کے اسے یقین آ گیا تھا کہ اگر اب تک اغوا کار نے انہیں زندہ رکھا ہوا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اغوار کار واقعی اسے واپس کرنا چاہتا ہے۔ پہلے کی طرح اس بار وہ دھوکا نہیں دے گا۔

اس کا اندازہ درست نکلا۔ اسے اس کا بیٹا واصب مل گیا۔ اغوا کار کے بقول اگر سکندر ان تینوں کے خلاف کچھ عرصے تک کوئی کارروائی نہ کرتا تو اسے باقی دونوں بچے بھی مل جاتے۔ گویا وہ دونوں فی الحال ضمانت کے طور پر اغوا کار کے پاس تھے۔ سکندر اپنے دونوں بچوں کی واپسی تک مجبور تھا۔

’’یہ تم کہاں جا رہے ہو؟‘‘ سکندر کی آواز سن کے میں اپنے خیالات سے باہر آ گیا۔ ہم شہر سے باہر آ گئے تھے۔ میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے وقت دیکھا۔ دو بجنے میں ایک منٹ باقی تھا۔

معاً سکندر کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے الجھن بھرے انداز میں کال ریسیو کی۔ چند سیکنڈز بات کرنے کے بعد اس نے سیل میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

’’اغوا کار کی کال ہے، وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔‘‘ وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

میں نے آنکھوں میں حیرت بھری۔’’مجھ سے؟‘‘

وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے سیل کان سے لگا لیا۔ بات کرنے کے بعد سکندر کا سیل میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔

وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
''آپ کے لیے بہت بڑی خوش خبری ہے۔'' میں مسکراتے ہوئے بولا۔
''کیا؟'' اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔
''آپ کو انتخاب کا موقع دیا گیا ہے۔'' میرا لہجہ اسرار بھرا تھا۔ اس کی الجھن سوا ہوگئی۔
''کس چیز کا انتخاب؟''
''آپ کو اپنے چالیس کروڑ یا دو بچوں میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہے۔ آپ کے پاس صرف پندرہ منٹ بچے ہیں۔'' میں پُراسرار انداز میں بولا۔
''کیا مطلب؟'' وہ اپنی سیٹ پر اچھل پڑا۔
میں اس وقت ایک کھلے میدان کے سرے پہ پہنچ چکا تھا۔ میں نے گاڑی میدان کی طرف موڑ کے روک دی۔
''اغوا کار نے مجھے دو پتے بتائے ہیں۔ ایک پہ آپ کے دونوں بچے ہیں اور دوسرے پتے پہ آپ نے دو سال پہلے جو چالیس کروڑ روپے اغوا کار کو دیے تھے وہ اسی حالت میں رکھے ہیں۔ اغوا کار کہتا ہے پندرہ منٹ تک آپ کی یہ دونوں چوائسز ادھر ہی رہیں گی۔ پندرہ منٹ بعد دونوں اس جگہ سے ہٹا دی جائیں گی۔ آپ کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ بتائیں، آپ کیا حاصل کرنا چاہیں گے۔ اپنی اولاد یا اپنے چالیس کروڑ روپے؟'' یہ ایک ڈرامائی سچویشن تھی۔ وہ حیران نظر آنے لگا۔
''وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔'' اسے حیران پریشان دیکھ کے میں نے اسے یاد دلایا۔
چند لمحات سوچ بچار میں مصروف رہنے کے بعد وہ بولا۔ ''بچوں کی طرف چلو۔'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔
اس نے پیسوں کے مقابلے میں انسانیت کا انتخاب کیا تھا گویا بچوں کی محبت پیسوں کی محبت کے آگے جیت گئی تھی۔
میں نے اطمینان سے گاڑی آگے بڑھا دی۔
''ایک منٹ......'' اس کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
''تمہارے خیال میں مجھے کس چیز کا انتخاب کرنا چاہیے؟'' وہ تذبذب کے عالم میں بولا۔
میں سکتہ زدہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ کیا چالیس کروڑ روپے میں اتنی بڑی طاقت تھی کہ اس کے لیے انتخاب مشکل ہو گیا تھا؟
''انتخاب کا حق آپ کو ملا ہے۔ مجھے آپ جہاں کہیں گے میں لے جاؤں گا۔'' میں نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ میرے لہجے سے ناگواری کا اظہار نہ ہو۔
''میرے خیال میں مجھے چالیس کروڑ روپے کا انتخاب کرنا چاہیے۔'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ میں اچنبھے سے اسے دیکھنے لگا۔
''انسان کے لیے اس چیز کی قیمت زیادہ ہوتی ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی۔ میرے پاس دو بچے ہیں۔ جو دو نہیں رہے ان کے بغیر رہنا تو ویسے بھی ہم نے سیکھ ہی لیا ہے لیکن دولت کے بغیر رہنا...... یہ ہمارے لیے زیادہ مشکل ہو گا۔ پچھلے چند دن ہم نے جس کرب میں گزارے ہیں، اس کے بعد ہمیں دولت کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہوا ہے۔ اب یہ چالیس کروڑ چھوڑنا میرے لیے آسان نہیں ہوگا۔ چاہے مقابلے میں میرے بچے ہی کیوں ناں ہوں۔'' وہ عجیب سے انداز میں بولتے ہوئے وضاحتیں دینے لگا۔ میں اس کی اتنی ''پریکٹیکل سوچ'' پر حیران رہ گیا۔
''نہیں نہیں...... میرا انتخاب چالیس کروڑ روپے ہے، تم ادھر چلو۔'' وہ یکدم ہی ہذیانی انداز میں چلانے لگا۔ اس نے کہنے کو یہ کہہ تو دیا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں ابھی بھی کشمکش کے آثار تھے۔
مجھے لگ رہا تھا کہ وہ چند لمحوں بعد پھر سے اپنا انتخاب بدلنے والا ہے۔

☆☆☆

میں نے اسے اس کی منزل پر پہنچا دیا تھا۔ وہ اپنے ''انتخاب'' کو دیکھتے ہی دوڑا۔ وہ اس کے ساتھ لپٹ کے رونے لگا تھا۔ کبھی وہ اسے چومتا کبھی اسے اپنے ساتھ لپٹا لیتا۔ وہ اپنے آپ میں نہیں لگ رہا تھا۔
دو سال کی جدائی تھوڑی نہیں ہوتی۔ اسے سنبھلنے میں کچھ وقت تو لگنا ہی تھا۔ کچھ دیر میں اسے قرار آ گیا۔ وہ مجھ سے بولا۔ ''میں انہیں لے جا سکتا ہوں ناں؟''
''نہیں۔'' میں سختی سے بولا۔ وہ مجھے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میرا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک سیاہ رنگ کا پستول تھا۔ اس کی حیرانی سوا ہوگئی۔
''تم...... تم یہ کیا کر رہے ہو؟'' صدمے سے اس کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔
''وہی جو تم جیسے شخص کے ساتھ کرنا چاہیے۔'' میں سفاکی سے بولا۔
''کیا مطلب؟'' اس کی آنکھوں میں خوف اُتر آیا۔
''مجھے بھی ایک بار بچوں اور پیسوں میں سے کسی ایک چیز کے انتخاب کا موقع ملا تھا۔ میرا انتخاب میری

دولت، میری اولاد تھی مگر تم نے میرا انتخاب بدل دیا تھا۔ مجھے نہ وہ چند لاکھ روپے مل سکے تھے نہ ہی اپنی اولاد...... آج یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تمہیں تمہارا ''انتخاب'' لے جانے دوں۔'' مجھے اپنی آواز خود اجنبی لگ رہی تھی۔ وہ خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''میں...... میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھ پا رہا؟'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

میرا ذہن ماضی کے جنگل میں بھٹکنے لگا۔

☆☆☆

سکندر کا مجھ پر حد سے زیادہ اعتماد ہی مجھے لے ڈوبا تھا اور اسے بھی اسی اعتماد نے ہی ڈبویا تھا۔

۲۲ دسمبر کا وہ بھیانک دن میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا تھا۔ اس دن میں ایک بڑی پارٹی کو پلاٹس دکھانے کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہ لوگ دوسرے شہر سے آئے تھے۔ انہیں یہاں زمین کے ریٹ کا بھی درست اندازہ نہیں تھا۔ وہ بہت سے پراپرٹی ڈیلرز سے مل چکے تھے لیکن کوئی انہیں مطلب کی زمین نہیں دکھا سکا تھا۔

کسی نے انہیں سکندر کا پتا بتایا۔ سکندر کے پاس ان کی ضرورت کے مطابق دو پلاٹس موجود تھے۔ سکندر سے انہوں نے فون پر رابطہ کیا۔ وہ اس وقت دوسرے شہر میں تھا۔ اس نے انہیں مجھ سے ملنے کا کہا۔ اس نے مجھے کال کر کے ساری تفصیل بتائی۔

''پارٹی تگڑی ہے۔ مارکیٹ ریٹ سے کچھ اوپر بھی دے دیں گے۔ تم ہر صورت آج ان سے بیعانہ لے لینا۔'' آخر میں اس نے کہا تھا۔

پلاٹ انہیں پسند آگئے تھے۔ اسلام آباد میں موجود ایک ایک کنال کے ان دو پلاٹوں کی قیمت چار کروڑ تھی۔ میں نے انہیں قیمت پانچ کروڑ بتائی تھی۔ بحث کے بعد وہ چار کروڑ چالیس لاکھ تک پہنچ آئے تھے۔ میں انہیں ساڑھے چار کروڑ فائنل کر رہا تھا۔ اتنا مجھے بھی یقین ہو گیا تھا کہ وہ پلاٹ خرید لیں گے۔ سکندر کی کال آئی تھی تو میں نے اسے بھی یہ ساری تفصیل بتا دی تھی۔

ہم اسی بحث میں مشغول تھے کہ میرا سیل بجنے لگا۔ یہ رومانہ کی کال تھی۔ ''فوراً گھر پہنچیں۔ بچے گر کے زخمی ہو گئے ہیں۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کے بمشکل بول رہی تھی۔ اس کے لہجے میں کرب نمایاں تھا۔ میرے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میں اس سے تفصیل پوچھنے...لگا تھا کہ اس نے کال کاٹ دی۔

''سوری، ایک ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ مجھے جانا ہوگا۔'' میری بات سن کے ان کے چہرے پہ ہمدردی کے بجائے ناگواری کا سایہ نمودار ہوا۔

''ہم بہت دور سے آئے ہیں۔ یہ سودا فائنل کر کے آپ چلے جانا۔'' ان میں سے ایک شخص بولا تھا۔ میں اسے کوئی جواب دینے ہی لگا تھا کہ سکندر کی کال آگئی۔ میں نے اسے ساری صورتِ حال بتائی۔ اس کا جواب سن کے میں حیران رہ گیا۔

''دیکھو یہ سنہری موقع ہے۔ تم اسے ضائع نہ کرو۔ تم ڈرائیور کو بھیج دو۔ وہ انہیں اسپتال لے جائے گا۔'' وہ مجھے سمجھانے لگا۔

''لیکن......'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''چار بیس سے اوپر جتنے میں پلاٹ بیچو گے اس کے آدھے پیسے تمہارے۔ اب ویسے بھی ڈیل فائنل تو ہو چکی ہے۔ تم نے بس بیعانہ ہی تو لینا ہے۔'' اس کی بات سن کے میں تذبذب میں پڑ گیا۔

''سکندر صاحب آپ میری مجبوری شاید سمجھ نہیں رہے۔ میرے بچے اور بیوی جانے کس حال میں ہیں۔ مجھے فوراً پہنچنا ہوگا۔'' اس کی پیشکش بہت مناسب تھی۔ میرا لہجہ کمزور پڑنے لگا۔

اس نے میرے لہجے میں چھپی کمزوری پہچان لی۔ اس بار وہ زیادہ جارحانہ لہجے میں بولا۔ ''جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جو یہ سب حاصل کیا ہے، بہت سی قربانیاں دے کے حاصل کیا ہے۔ دولت حاصل کرنے کے لیے جذبات قربان کرنا پڑتے ہیں ویسے بھی تم ڈاکٹر نہیں ہو، ڈرائیور انہیں اسپتال پہنچا دے گا۔ تمہیں میں نے جو آفر دی ہے اس پہ سوچو۔''

چار چالیس پہ وہ تیار تھے۔ گویا کمیشن کے علاوہ دس لاکھ مجھے فوری مل رہے تھے۔ مجھے صرف چند منٹ مزید ہی تو انہیں دینے تھے۔ میں نے سکندر کے ڈرائیور کو پتا سمجھا کے اپنے گھر بھیج دیا۔ اولاد کی محبت کے مقابلے میں لالچ جیت گیا تھا۔

میں نے ڈرائیور کو بھیج تو دیا تھا لیکن میرا دل بے چین ہو رہا تھا۔ میں نے ان کی قیمت پر سودا فائنل کر دیا۔ وہ مطمئن نظر آنے لگے۔ میں نے انہیں بیعانے کی رقم بتائی۔ انہوں نے چیک لکھ کے دے دیا۔ سکندر بیعانے کے طور پر بھی چیک وصول نہیں کرتا تھا۔ اس نے ہمیں بھی چیک وصول کرنے سے منع کیا ہوا تھا۔ میں نے ان سے کیش رقم کا تقاضا کیا۔

انہوں نے مجھے بینک تک ساتھ چلنے کا کہا۔ اُدھر

میرے بچے جانے کس حال میں تھے۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اڑ کے ان تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں نے دفتر سے ایک آدمی ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔

میری گاڑی ڈرائیور لے گیا تھا۔ ٹیکسی ڈھونڈتے ڈھونڈتے مجھے کافی وقت لگ گیا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کے میں نے رومانہ کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو ہی نہیں کی۔ میں نے ڈرائیور کو کال کی۔ وہ میرے گھر کا راستہ ہی بھول گیا تھا۔ وہ جہاں تھا میں نے اسے ادھر ہی رکنے کے لیے کہا۔

بیس منٹ بعد میں اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔ ٹیکسی والے کو فارغ کرتے ہی میں اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ ڈرائیور کو میں نے ساتھ والی سیٹ پہ کر دیا تھا۔ اس دن میں نے تیز رفتاری کے سارے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔

گاڑی گیٹ پہ لگاتے ہی میں اندر کی طرف دوڑا۔ گھر میں ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی میری نظر اپنے ہی خون میں لہولہان اپنے دونوں بچوں پہ پڑی۔ انہیں اس حال میں دیکھ کے میرے جسم سے جیسے ساری توانائی کسی نے نچوڑ لی۔ میں گرتا چلا گیا۔

پاس ہی رومانہ بے ہوش نظر آ رہی تھی۔ میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں ڈرائیور بھی اندر آ چکا تھا۔ وہ اندر کا منظر دیکھ کے ششدر رہ گیا۔ اس نے مجھے پانی پلایا تو میری حالت کچھ سنبھلی۔

ہم دونوں نے مل کے ان تینوں کو گاڑی میں ڈالا۔ کچھ دیر میں ہی ہم اسپتال پہنچ چکے تھے۔ انہیں ایمرجنسی میں لے گئے۔ رومانہ کے سر پہ چوٹ آئی تھی۔ وہ زیادہ تشویشناک نہیں تھی۔ وہ جلد ہی ہوش میں آ گئی۔ وہ ہوش میں آتے ہی بچوں کے متعلق پوچھنے لگی۔ میں نے اسے جھوٹی تسلی دی۔ میرے پوچھنے پہ وہ مجھے روتے ہوئے تفصیل بتانے لگی۔

”بچے سو رہے تھے۔ میں غسل کرنے لگی۔ جب میں غسل کر کے باہر نکلی تو بچے کمرے میں نہیں تھے۔ میں انہیں آوازیں دیتی ہوئی باہر آئی تو ماہا، سمیر کا ہاتھ پکڑے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ آواز سن کے ماہا پلٹی۔ اسی لمحے سمیر کا توازن خراب ہوا اور وہ نیچے گرنے لگا۔ ماہا بھی خود کو سنبھال نہیں سکی۔ وہ بھی نیچے لڑھک گئی۔ میں چیخیں مارتی ہوئی بھاگی۔ وہ دونوں سیڑھیوں پہ لڑھکتے ہوئے نیچے پہنچ چکے تھے۔ ان کے سر سے بہتا خون دیکھ کے میرے تو قدموں سے جان ہی نکل گئی۔ میرے پاؤں گیلے تھے۔ سیڑھیوں سے تیزی سے نیچے اترتے ہوئے میرا پاؤں پھسلا۔ میرا سر ریلنگ سے ٹکرایا اور میں نیچے گر گئی۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ مجھ پہ بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو قابو میں رکھا۔ لینڈ لائن فون تھوڑے ہی فاصلے پہ رکھا تھا۔ میں گھسٹ کر اس تک پہنچی۔ آپ سے بات کرتے ہی میں اپنا ہوش کھو چکی تھی۔“

میں اسے تسلی دے کے باہر نکل آیا۔ دونوں بچے آئی سی یو میں تھے۔ میں ان کی صحت یابی کی دعا مانگنے لگا۔

میں آئی سی یو کے سامنے بے چینی سے ٹہل رہا تھا کہ ڈاکٹر باہر نکلا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ہمدردی جاگی۔ اس کے تاثرات دیکھ کے میں گھبرا گیا۔

وہ میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے بولا۔ ”آئی ایم سوری...... آپ نے کچھ دیر کر دی۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ہم آپ کے بچوں کو بچا نہیں سکے۔“ وہ اور بھی جانے کیا کہہ رہا تھا۔ میرے ذہن میں تو بس ایک ہی جملہ ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔ ”آپ نے کچھ دیر کر دی۔“ اگر میں سکندر کے کہنے پہ لالچ میں نہ پڑتا۔ ڈرائیور کے بجائے خود چلا جاتا تو میں اپنے بچوں کی جان بچا سکتا تھا۔ میرے لالچ نے میرے بچوں کی جان لے لی تھی۔

ڈاکٹر مجھے تسلی دے کے چلا گیا تھا۔ میں سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ میرا سیل بجنے لگا تو میرا سکتہ ٹوٹا۔ یہ سکندر کی کال تھی۔ میرے کال ریسیو کرتے ہی وہ غصے سے کہنے لگا۔ ”بیعانہ لیے بغیر کدھر مر گئے تم، وہ دونوں بیعانہ دیے بغیر ہی چلے گئے۔“ پہلی بار میں نے غیر ذمے داری دکھائی تھی۔ پہلی ہی بار وہ مجھ سے اس لہجے میں بولا تھا۔

میں دھیمی آواز میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ”میں اپنے زخمی بچوں کو لے کے اسپتال آیا ہوا ہوں۔“

”بچے زخمی ہی ہوئے تھے کوئی مر تو نہیں گئے تھے۔“

اس کی آواز جیسے زہر میں بجھی تھی۔ میرے دل پہ گھاؤ لگا۔ یہ لفظوں کا گھاؤ تھا، جو کبھی بھر نہیں سکا۔

”وہ مر گئے ہیں۔“ پتا نہیں کیسے یہ جملہ میں نے کہا تھا۔ یہ جملہ سنتے ہی دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی۔

☆☆☆

وہ مجھے سکتہ زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ آنسو میرے گلے میں ہی گھٹ کے رہ گئے تھے۔ میں چند لمحات تک کچھ بول ہی نہیں سکا۔

وہ مجھے خاموش دیکھ کے بولا۔ ”اچھا، تو تم یہ سب مجھ سے بدلہ لینے کے لیے کر رہے ہو؟“

”اس میں اس بے چارے کا کوئی قصور نہیں۔ یہ تو تمہارا ملازم تھا۔ تمہارا دیا کھاتا تھا۔ تم سے غداری کیسے کر سکتا

تھا۔ یہ سب میں نے کیا ہے۔'' وہ اچانک ہی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ سکندر کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب ہوگئیں۔

''تم......'' وہ اپنی جگہ اچھلنے پہ مجبور ہوگیا۔ اس کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہوگئیں۔

''ہاں، میں۔'' اس کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی مگر اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

''تم......تم نے میرے ساتھ یہ سب کیا؟'' اسے جیسے اس بات کا یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ نازک سا پیکر اس کے ساتھ یہ سب کرسکتا تھا۔

''ہاں میں نے ہی ارمغان کو اغوا کیا تھا۔ یہ میں ہی تھی جس نے تم سے چالیس کروڑ روپے لیے تھے۔'' وہ دھماکا کرنے والے انداز میں بولی۔

''لیکن......فون پر تو کوئی مرد مجھ سے بات کرتا رہا تھا۔'' حیرانی اس کی آنکھوں میں جم گئی تھی۔

''تو کیا مرد کی آواز نکالنا مشکل ہے۔'' وہ اس بار مردانہ آواز میں بولی تھی۔ وہ ایک پروفیشنل نقال تھی۔

''میرے بچے اتنے عرصے تک تم نے کہاں رکھے؟'' وہ تڑپ کے بولا تھا۔

''اسی گھر کے تہ خانے میں......یہاں انہیں ہر سہولت حاصل تھی۔ سوائے آزادی کے۔''

''اگر یہ سب تم کررہی تھی تو وہ نصیر، شبیر، صفیہ، سکینہ، اعتزاز......ان سب کا کیا چکر تھا؟'' وہ جیسے آج اپنے ساری الجھنیں سلجھالینا چاہتا تھا۔

''عینا کے اغوا کے بعد تم نے ان سب کے نام خود دیے تھے۔ میں نے سوچا جہاں میں اپنا بدلہ لے کے سکون حاصل کررہی ہوں ایسے ہی تمہارے کچھ مزید دشمنوں کو بھی سکون پہنچاؤں۔ ان کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی بھی کچھ تلافی ہو۔ وہ سب کمزور لوگ تھے۔ میں ان کی طاقت بن گئی۔ ہم سب نے مل کے تمہیں عرش سے فرش پہ لا پھینکا۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولی۔

''تم اس کے ساتھ ملے ہوئے تھے؟'' اس بار وہ مجھ سے مخاطب ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی ہلکورے لے رہی تھی۔

''یہ بس مجھے ضروری معلومات پہنچاتا رہا۔ اسے تو کبھی میرے منصوبے کی تفصیل تک نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بس ضوفشاں کو بے ہوش کرکے صفیہ کو تھمانے کی کوشش کی تھی۔ یہ اس کا موقع بھی نہیں نکال سکا۔ اس نے تمہیں پریشان کرنے کے لیے تمہاری بیٹی کو صوفے کے پیچھے چھپا دیا تھا۔ اس کے اغوا میں ناکامی کے بعد میں نے صفیہ کو بیک اپ پلان پہ عمل کرنے کا کہہ دیا تھا۔ وہ واصب کو اٹھا لائی۔ اس کا بس اتنا ہی کردار تھا۔ تمہاری اصل قبر میں نے کھودی ہے۔'' وہ زہریلے انداز میں مسکرائی۔

''تم نے کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟'' اس کا سارا تن فن نکل چکا تھا۔ وہ بے بسی سے بولا۔

وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ میں ایک بار پھر ماضی کی راکھ کریدنے لگا۔

☆☆☆

شام تک میرے بچوں کی تدفین ہوگئی۔ سکندر بھی جنازے پر آیا تھا۔ اس نے چند رسمی جملے بولے۔ ''میں نے کچھ دیر کردی تھی ورنہ ان کی زندگی بچ سکتی تھی۔'' میں نے اسے کچھ جتلانے کی کوشش کی تھی۔

''ان کی زندگی اتنی ہی تھی، تم پہلے بھی پہنچ جاتے تو انہیں نہیں بچا سکتے تھے۔'' اس نے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی مگر میں مطمئن نہیں ہوسکا تھا۔

میں احساسِ جرم کا شکار ہو رہا تھا۔ ہر وقت میرے لبوں پہ یہی جملے رہتے۔ کاش میں کچھ دیر نہ کردیتا......کاش میں اس دن سکندر کا فون ہی نہ سنتا......کاش میں سکندر کی بات نہ مانتا۔

رومانہ کو چپ لگ گئی تھی۔ پہلے دن وہ دھاڑیں مار مار کے روتی رہی تھی مگر اس کے بعد جیسے اس کی آنکھوں کے سوتے ہمیشہ کے لیے خشک ہوگئے تھے۔ وہ ہر وقت عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتی رہتی۔ مجھے اس کی آنکھوں سے خوف آتا۔

اس واقعے کے کوئی ہفتے بعد کی بات ہے۔ میں سو رہا تھا کہ میں نے اپنے گلے پہ کسی کے ہاتھ محسوس کیے۔ میں نیند میں تھا۔ میں نے اسے خواب سمجھا۔ میرا دم گھٹنے لگا تو میری آنکھ کھل گئی۔ میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ رومانہ میرے اوپر سوار میرا گلا دبا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ اپنے آپ میں نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے اس کے بازو پکڑ کے ایک جھٹکے سے اپنی گردن سے ہٹا دیے۔ وہ جیسے یکدم ہوش میں آگئی۔ وہ چلاتے ہوئے پھر میری طرف لپکی۔ ''تم قاتل ہو میرے بچوں کے۔ تم قاتل ہو......'' وہ ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی۔ میں نے اس کے منہ پہ تھپڑ مارا۔ وہ بے یقینی سے مجھے گھورنے لگی۔ اگلے ہی پل وہ بیڈ پہ گر کے رونے لگی تھی۔

میری آنکھیں بھی بھر آگئیں۔ مجھ سے محبت کرنے والی بیوی نے آج میرا گلا گھونٹ کے مارنے کی کوشش کی تھی۔ یہ معمولی نہیں تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ یہ تو ابھی آغاز ہے۔

صبح وہ بالکل تر و تازہ لگ رہی تھی۔ رات والے واقعے کا شائبہ تک اس کی آنکھوں میں نہیں تھا۔ میں اس کی حالت دیکھ کے مطمئن ہو گیا۔ وہ ناشتا تیار کر رہی تھی۔ میں ڈائننگ ٹیبل پہ ناشتے کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے پیاس لگی۔ ٹیبل پہ پانی نہیں رکھا تھا۔ فریج کچن میں تھا۔ میں کچن کی طرف بڑھ گیا۔ رومانہ میری چائے کے کپ میں ایک چھوٹی سی بوتل سے سیاہ رنگ کے قطرے ٹپکا رہی تھی۔ میں اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ اس نے بوتل سے قطرے ٹپکانے کے بعد اسے کیبنٹ میں رکھا۔ وہ بالکل گم صم لگ رہی تھی۔

کیا میری بیوی اس بار زہر دے کے مجھے مارنا چاہ رہی تھی؟ رات والے واقعے کے باعث میں یہ نتیجہ اخذ کرنے پہ مجبور تھا۔

میں نے ہاتھ مار کے چائے گرادی۔ وہ کچن کی طرف جاتے ہوئے پلٹی۔ چائے کا کپ نیچے پڑا دیکھ کے اس کی آنکھوں میں مایوسی اُبھری۔ وہ بغیر کچھ کہے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہ گیا۔

وہ ناشتا کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے کیبنٹ سے وہ بوتل نکال لی۔ اس پہ کسی قسم کا کوئی لیبل نہیں لگا تھا۔ میں نے لیبارٹری میں جا کے اس کا ٹیسٹ کرایا۔ نتیجہ میری توقع کے مطابق تھا۔ اس کے باوجود نتیجہ سن کے میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی تھی۔ یہ ایک انتہائی سریع الاثر زہر تھا۔ جس کے قطرے اس نے میری چائے میں ٹپکائے تھے۔ پتا نہیں یہ زہر اس نے حاصل کہاں سے کیا تھا؟

اس کی دوسری کوشش بھی ناکام ہو گئی تھی لیکن کب تک......؟ وہ اگر مسلسل کوشش کرتی رہتی تو ایک دن کامیابی اس کو مل ہی جاتی۔ مجھے اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرنا تھا۔

میں گھر پہنچا تو وہ گھر میں نہیں تھی۔ میں نے اس کے موبائل پہ کال کی، تو کسی مرد نے کال ریسیو کی۔ ''آپ کی بیوی سکندر صاحب پہ قاتلانہ حملے کے جرم میں پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔'' اس کا جملہ سن کے میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔

میں بھاگا بھاگا تھانے پہنچا۔ سکندر بھی ادھر ہی بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ دفتر کے سامنے گاڑی سے اترا ہی تھا کہ رومانہ نے چھری سے اس پہ حملہ کر دیا۔ اسے سکندر پہ لپکتے ہوئے، اس کے ڈرائیور نے دیکھ لیا۔ اس نے بروقت رومانہ کا بازو پکڑ لیا۔ ورنہ چھری سیدھی سکندر کے سینے میں پیوست ہو چکی ہوتی۔ اپنا وار خالی جاتے دیکھ کے وہ آپے سے باہر ہو گئی کیونکہ وہ سکندر کو اپنے بچوں کا قاتل سمجھتی تھی۔

''سر، وہ پاگل ہو چکی ہے۔ وہ دو دفعہ مجھے بھی مارنے کی کوشش کر چکی ہے۔'' میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے زہر کی بوتل اور رپورٹ دکھائی۔

سکندر نے میری درخواست پہ اس کے خلاف ایف آئی آر درج نہیں کرائی۔ میری درخواست بھی اس نے ایک شرط پہ مانی تھی کہ میں دفتر کو وقت دوں گا۔ اپنے بچوں کی موت کے بعد میں ایک دن بھی دفتر نہیں گیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔

میں نے اسے ایک پرائیویٹ دماغی امراض کے اسپتال میں داخل کرا دیا۔ وہ اب خطرناک ہو چکی تھی۔ اس کا اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ واپسی پہ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ایک ہفتے میں ہی ہمارا محبت بھرا آشیانہ اجڑ کے رہ گیا تھا۔ ایک ہفتہ پہلے ہی کی بات تھی، اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے میں نے لحد میں اتارا تھا۔ اتنے بڑے دکھ کو ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ مجھے اپنی محبوب بیوی کو مجبوراً.... ....مینٹل ہاسپٹل میں داخل کرانا پڑا۔

خالی گھر مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ تنگ آ کے میں نے دفتر جانا شروع کر دیا۔ میں کام اب بھی سکندر کے ساتھ کرتا تھا لیکن اب میں نے لوگوں کو بدمعاشی سے قائل کرنا چھوڑ دیا تھا۔ سکندر مجھ سے نالاں تھا۔ وہ مجھے سمجھاتا کہ فی زمانہ سب سے بڑی اخلاقیات پیسہ ہی ہے۔ پیسے کے بغیر انسان کچھ نہیں۔ سارے رشتے پیسے کی بدولت ہیں۔ میں اس سے متفق نہیں تھا۔ اس نے اولاد کا دکھ نہیں سہا تھا۔ اس لیے وہ ایسا سوچتا تھا۔

غم کی اس گھڑی میں مجھے مرینہ عرف رومی نے بہت سہارا دیا۔ وہ سکندر کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ وہ پہلے بھی میرا خیال رکھتی تھی مگر بچوں کی موت کے بعد وہ میرا خاص خیال رکھنے لگی تھی۔ وہ بوٹے سے قد کی ایک دلکش لڑکی تھی۔ اس کی سانولی رنگت میں انوکھی کشش تھی۔ لیکن اس کی خوبصورتی سے زیادہ اس کے خلوص نے مجھے متاثر کیا۔ اس کی فطرت محبت سے گندھی تھی۔ میں تنہا تھا، اس کے قریب ہوتا چلا گیا۔

رومانہ کی حالت بہتر ہونے کے بجائے بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی آپے سے باہر ہونے لگتی۔ مجبوراً میں نے اسپتال جانا چھوڑ دیا تھا۔ فون پر اس کی حالت کے

متعلق مجھے پتا چلتا رہتا تھا۔ اسے زیادہ تر ٹرنکولائزر کے زیرِ اثر رکھا جارہا تھا۔

جب اس کی یاد مجھے زیادہ بے چین کرتی تو میں اسے دیکھنے چلا جاتا مگر اس وقت جب وہ سو رہی ہوتی تھی۔

مرینہ تیزی سے میرے قریب آئی تھی۔ سکندر سمیت مجھے سب دوست اس سے شادی کا مشورہ دے رہے تھے۔ رومانہ کی طرف سے میں مایوس ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے شادی کرلی۔

سال بعد ہی ہمارے گھر پیارے سے بیٹے نے جنم لیا۔ میں نے اس کا نام سمیر رکھا۔ ڈیڑھ سال بعد بیٹی پیدا ہوئی۔ اس کا نام ہم نے ماہا رکھا۔ ہمارے پہلے دنوں بچوں کے نام بھی یہی تھے۔ بس پہلے ماہا بڑی تھی اور سمیر چھوٹا۔ مرینہ یہ سب جانتی تھی۔ اس نے ان ناموں پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میری زندگی پہلے جیسی ہوگئی تھی لیکن میں پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

اس دوران رومانہ کی حالت بہت بہتر ہوگئی تھی۔ اسے اب پاگل پن کے دورے پڑنا کم ہوگئے تھے۔ مجھ سے اب وہ بات بھی کرلیا کرتی تھی۔ میں اسے اپنی شادی کے متعلق بتانا چاہتا تھا مگر میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ ایک دن میں اس کے پاس گیا تو وہ بہت دن بعد مجھ سے غصے میں بولی۔

''تم میرے پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

میں اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ ''تم مجھے بھول جاؤ۔ ایسا کرو تم شادی کرلو۔'' اس کے مشورے نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس وقت میں شادی کر چکا تھا۔ تاہم میری کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔

اگلی ملاقات میں، میں نے اسے بتایا کہ میں نے شادی کرلی ہے۔ اس کی آنکھوں میں حسرت سی ابھری تاہم بظاہر اس نے خوشی کا اظہار کیا۔

اب اسے اسپتال میں رہتے چار سال ہو چکے تھے۔ وہ بظاہر ٹھیک ہی لگتی تھی لیکن کبھی کبھار اچانک اسے پھر سے دورہ پڑ جاتا تھا اس حالت میں ہمیشہ وہ اسپتال سے فرار ہونے کی کوشش کرتی۔ ساتھ ہی وہ چلاتی جاتی۔ ''میں اپنے بچوں کے قاتل کو معاف نہیں کروں گی۔''

ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ بدلہ لینے کی خواہش اس کے دل میں جڑ پکڑ چکی ہے۔ اس کے ذہن میں کوئی ایسی گرہ لگ چکی ہے کہ جب تک وہ اپنے بچوں کے قاتل کو تڑپتا ہوئے نہیں دیکھے گی، اسے سکون نہیں مل سکے گا۔ میں ڈاکٹر کی بات سن کے سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔ کیا مجھے تڑپتا دیکھ کے ہی اسے سکون مل سکتا تھا؟

میں نے اس حوالے سے... بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس بار میں اس سے ملا تو وہ بظاہر نارمل لگ رہی تھی۔

ہم اسپتال کے لان میں بیٹھے تھے۔ وہ بغور پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مجھے بے اختیار اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی وحشت تھی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے سوال کیا۔ ''تم اب بھی مجھے اپنے بچوں کا قاتل سمجھتی ہو؟''

اس نے نظریں اٹھا کہ مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سمندر کی سی گہرائی تھی۔ اس گہرائی میں پتا نہیں کون سے طوفان مچل رہے تھے۔ جب وہ بولی تو اس کا لہجہ پُرسکون تھا۔ ''پتا نہیں، ان کے قاتل تم تھے، سکندر تھا یا میں خود؟''

''تم خود کو بھی ان کا قاتل سمجھتی ہو؟'' میں نے حیرانی سے سوال کیا۔

''ہاں، میں بے پروائی نہ کرتی تو شاید وہ جان سے نہ جاتے۔'' اس کے لہجے میں پچھتاوے بول رہے تھے۔

''تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ تم خود کو خواہ مخواہ اذیت مت دو۔'' میں اس کا جواب سن کے تڑپ ہی اٹھا تھا۔

''میں کیا کروں؟ مجھے سکون نہیں ملتا۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''تم سب کو معاف کردو، خود کو بھی، مجھ کو بھی اور سکندر کو بھی۔ تمہیں سکون مل جائے گا۔''

''سب کو میں کیسے معاف کرسکتی ہوں۔ میں نے اذیت سہہ لی۔ تم نے بھی سہہ لی۔ سکندر کو کیا فرق پڑا؟'' اس کی آنکھوں میں وحشت بڑھ گئی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

''میں تمہیں معاف کر دوں گی۔ بس میری ایک خواہش پوری کردو۔'' وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

''میں اس شرط کے بدلے میں تمہاری ہر خواہش پوری کرسکتا ہوں۔'' میں نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔

''مجھے یہاں سے باہر نکالو۔ میں سکندر کو بھی اولاد کے غم میں تڑپتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس کے بغیر مجھے سکون نہیں مل سکتا۔'' وہ وحشت ناک انداز میں بولی۔

''تم کیا کرنا چاہتی ہو اس کے ساتھ؟'' میرے سوال کے جواب میں اس نے اپنا سارا منصوبہ بتا دیا تھا۔ وہ گزشتہ برسوں سے سکندر کو سزا دینے کے لیے ہی کچھ سوچتی رہی تھی۔

۲۲ دسمبر کو ہم نے اپنے منصوبے پہ عمل شروع کر دیا۔ تقدیر نے بھی ہمارا پورا ساتھ دیا تھا۔ کچھ اور لوگ بھی ہمارے ساتھ ملتے گئے یوں ہم سب مل کے سکندر کو اس مقام پر لے آئے

تھے جہاں اس نے ایک دفعہ مجھے کھڑا کیا تھا۔

☆☆☆

''میرا قصور اتنا بڑا نہیں تھا جتنی تم نے مجھے اذیت دی۔'' وہ ساری بات جان کے بولا۔

''تمہارا قصور تم کیا جانو...... تمہارے اندر تو انسانیت نام کی کوئی شے موجود ہی نہیں۔'' وہ تنفر سے بولی۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ تم نے تو خود ان پیسوں کے لیے میرے معصوم بچوں کو اغوا کیا۔ تمہارے اندر انسانیت ہے؟'' وہ تیز لہجے میں بولا۔

''میں نے یہ سب پیسوں کے لیے نہیں کیا۔ میں نے تو یہ سب تمہیں احساس دلانے کے لیے کیا تھا کہ سب کچھ پیسہ نہیں ہوتا۔ رشتے پیسے سے اہم ہوتے ہیں۔ ویسے بھی میں نے ان کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا۔ ان کا ہر طرح خیال رکھا ہے۔ وہ میرے ساتھ بہت اٹیچ ہو چکے ہیں۔'' وہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔ وہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔

''اگر تم میں انسانیت ہوتی تو تم، ان کا انتخاب کرتے؟'' وہ سوٹ کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''تم کیا جانو، یہ میں نے کتنی مشکل سے حاصل کیے تھے۔ میں کوئی منہ میں سونے کا چمچ لے کے نہیں پیدا ہوا تھا۔ بہت غربت دیکھی میں نے...... چھوٹی چھوٹی چیزوں کو میں ترستا رہا...... بڑی محنت اور قربانیوں کے بعد میں نے یہ سب حاصل کیا۔ جو تم نے سب چھین لیا۔'' اس کے لہجے سے عجب درد جھلک رہا تھا۔ میں نے رومانہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی کہانی سے بالکل متاثر نہیں لگ رہی تھی۔

وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''میرے بچے میرے حوالے کردو۔'' اس کے لہجے سے امید جھلک رہی تھی۔

''اس کے لیے تمہیں انہیں چھوڑنا ہوگا۔'' اس کا اشارہ سوٹ کیس کی طرف تھا۔ ''تم کسی ایک ہی چیز کا انتخاب کر سکتے ہو۔'' اس کا انداز اٹل تھا۔

''اچھا! پھر میں یہ لے جانا چاہوں گا۔'' اس نے سوٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں نے حیرانی سے رومانہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

''میں جاؤں؟'' وہ بے یقینی سے بولا۔

''ہاں...... جاؤ۔'' وہ عجیب سے انداز میں بولی۔ میں اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔

''یہ...... بھی لے جاؤں میں؟'' اس کا اشارہ سوٹ کیس کی طرف تھا۔

''ہاں...... یہ بھی لے جاؤ۔'' وہ اسی انداز میں بولی۔

وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔ چند لمحات کے بعد اس نے سوٹ کیس اٹھالیا۔ اب وہ دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں حیرانی سے کبھی اسے اور کبھی رومانہ کو دیکھتا۔

دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے مڑ کے عقب میں دیکھا۔ رومانہ نے اپنا پستول والا ہاتھ بلند کیا۔ اس کی انگلی ایک لمحے کے لیے ٹریگر پر کانپی۔ میں نے اس کے چہرے پہ تذبذب کے آثار دیکھے۔

سکندر کی نظر رومانہ کے ہاتھ میں موجود خاموش پستول پہ پڑی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ اس کے ہونٹ کانپے۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اس کی پیشانی سے خون کا فوارہ بلند ہوتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس چھوٹ گیا۔ جھٹکا لگنے سے اس کی زپ ٹوٹ گئی۔ اس سے نوٹ نکل کے باہر پھیل گئے۔ سکندر لہرایا۔ اگلے ہی پل وہ نیچے گرے نوٹوں کے اوپر گر چکا تھا۔ اس نے حسرت سے نوٹوں کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک ہاتھ نوٹوں کی گڈی کی طرف بڑھایا۔ اس نے گڈی اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ اس کو گرفت میں نہیں لے پایا۔ اس کا ہاتھ خالی رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں ایک ہی جگہ ساکت ہوگئیں۔ ان آنکھوں میں حسرت جیسے جمی رہ گئی تھی۔ ایک اور سکندر خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔

رومانہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ سرتاپا کانپ رہی تھی۔ اس نے پستول پھینکا اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا۔ اب وہ پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ میں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ پھیلا کے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ میرے سینے سے لگ کے ہچکیاں لینے لگی۔ میں اس کی کمر تھپکنے لگا۔ میرے احساسات بہت عجیب سے ہو رہے تھے۔

چند لمحات کے بعد اس نے سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ میرا دل کٹ کے رہ گیا۔

''کیسا سنگدل شخص تھا یہ جس نے اپنی اولاد کے مقابلے میں ان کاغذ کے ٹکڑوں کا انتخاب کیا۔'' اس کی آواز درد سے بوجھل تھی۔ میں کچھ نہ کہہ سکا۔

آج کے دور میں ہم میں سے تقریباً ہر شخص کا انتخاب یہ کاغذ کے نوٹ ہی ہیں۔ کبھی ان کے بدلے ہم اپنا آپ بیچ دیتے ہیں تو کبھی ایمان...... سکندر نے اگر اپنی اولاد بیچ دی تھی تو اس میں حیرت کی کیا بات تھی۔

سکندر جیسے سنگدل شخص کے انجام نے دکھی کر دیا تھا۔